جاسوسی ڈائجسٹ

جلد 46 • شمارہ 04 • اپریل 2016 • زرِسالانہ 800 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 60 روپے •

خط و کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 229 کراچی 74200 • فون 35895313 (021) فیکس 35802551 (021) E-mail:jdpgroup@hotmail.com

مدیرِ اعلیٰ
عذرا رسول

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول • مقامِ اشاعت: C-63 فیز II ایکس ٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا، مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

صدرِ اعلیٰ

چینی نکتہ چینی

عزیزانِ من... السلامُ علیکم!

اپریل 16ء کا شمارہ حاضر ہے۔ مارچ کے حوالے سے ہر چینل پر سرِ شام دکانیں سجانے والے بہت سے ماہرین ذو معنی تبصرے اور قیاس آرائیاں کرتے نظر آئے لیکن اب ان کی تمام خواہشات اور توقعات پر اوس پڑ گئی ہے مگر اس ماہ کا آخری اتوار بہت خونچکاں ثابت ہوا... داتا کی نگری کہے جانے والے شہر لاہور کے بہت سے باسیوں کو خون میں نہلا دیا گیا... مرنے اور زخمی ہونے والوں میں خواتین، بچے اور ضعیف بھی شامل تھے جن کا قصور صرف یہ تھا کہ ہفتے وار تعطیل کے دن، دل بہلانے کے لیے گلشن پارک گئے تھے... اس ہولناک حقیقت سے بے خبر کہ وہاں قزاق اجل ان کی گھات میں ہے... عقل حیران ہے کہ یہ بے محابا خوں ریزی کب اور کہاں رکے گی... پیرس حملوں کے مرکزی ملزم کی گرفتاری کے چار دن بعد برسلز میں خوفناک دہشت گردی ہوئی... یہاں بلوچستان میں را کا ایک ایجنٹ پکڑا جاتا ہے جس کے اعترافات چشم کشا بلکہ ہوش ربا ہیں اور اس کی گرفتاری کے بعد لاہور میں خون کی ہولی کھیلی جاتی ہے۔ کہیں یہ دلدوز سانحہ اس گرفتاری پر را کا جوابی وار تو نہیں ہے... یہ تھیوری اپنی جگہ، باعثِ تشویش یہ ہے کہ ایسے ملک دشمن ہر کارے خود صرف منصوبہ سازی کرتے ہیں اور اصل تباہ کاری کے لیے ہماری ہی صفوں میں سے خریدے گئے ضمیر فروشوں کو استعمال کرتے ہیں... بس دعا ہی کی جاسکتی ہے کہ ربِ العزت جملہ مرحومین کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے، زخمیوں کو جلد صحتِ کاملہ سے نوازے، ارضِ پاک کے چپے چپے کو امن و امان کا گہوارہ بنائے اور ہم سب کو صراطِ مستقیم پر چلنے کی ہدایت دے... یہ سب ہوتا رہے گا، جانے والے اب کبھی لوٹ کر نہیں آئیں گے... جن کے پیارے، دلارے چلے گئے، ان کے لیے ہمارا دل بہت دکھی ہے... چلتے ہیں اپنی محفل میں جہاں دکھ سکھ کے بہت سے ساتھی آپ کے منتظر ہیں...

میانوالی سے نادر سیال کی حوصلہ افزائی ”جاسوسی ڈائجسٹ مجھے بہت دیر سے موصول ہوتا ہے لیکن اب تو مجھے ایسا لگتا ہے جیسے مجھ سے جاسوسی ناراض ہو، کیونکہ تین چار ماہ ہو گئے ہیں بہت ستانے لگا ہے۔ ایک سال کا معاوضہ میں آپ لوگوں کو ایڈوانس پہنچاؤں گا اور میرے پتے پر آپ جاسوسی اور سسپنس بھیج دیا کریں۔ ایسا کوئی طریقہ ہو تو جناب ضرور بتادیں آپ کی نوازش ہوگی۔ (800 روپے منی آرڈر یا ڈرافٹ سے ادارے کو ارسال کر کے آپ سالانہ خریدار بن سکتے ہیں۔ پرچہ رجسٹرڈ ڈاک سے آپ کے پتے پر ملتا رہے گا) میری 20 اپریل کو 23 ویں سالگرہ بھی ہے۔ اب دوستوں کی محفل میں چلتے ہیں۔ دوستوں کی نذر ایک شعر کروں گا۔

خوشیوں کا دور بھی کبھی آہی جائے گا نادر
غم بھی مل رہے ہیں تمنا کیے بغیر

بلقیس خان صاحبہ دعاؤں میں یاد رکھنے کا شکریہ۔ تپش وہیں پر ہوتی ہے جہاں آگ لگی ہو، بلقیس خان آپ کا تبصرہ لاجواب تھا۔ نوال اینڈ مشال، سب سے پہلے تو آپ لوگوں کو مشال کی شادی مبارک ہو۔ میری طرف سے مشال کے لیے ڈھیروں ڈھیر دعائیں اور مبارک باد۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ جس طرح شادی کے بعد انگیلی کراچی غائب ہوئی مشال بھی نہ غائب ہو جائے، ہاہاہا۔ مرحا گل، آپ کا تبصرہ بھی لاجواب تھا۔ محمد صفدر معاویہ، آپ مجھے بھول ہی گئے پر آپ مجھے یاد ہو کیونکہ خانیوال کا سوہن حلوہ میں بہت شوق سے نوش فرماتا ہوں۔ ایسا لگتا ہے زویا اعجاز نے مسلسل پاکستانی ٹیم کی شکست کا صدمہ دل پر لے لیا ہے۔ ابھی تک آپ کا دل و دماغ اپنی جگہ نہیں آیا ورنہ جاسوسی میں ضرور شامل ہوتیں۔ اب کہانیوں کی بات کرتے ہیں۔ سب سے پہلے میں نے طاہر جاوید مغل کی انگارے پڑھی، بہت اچھی جارہی ہے۔ مغل صاحب اللہ آپ کو زندگی اور صحت دے اسی طرح آپ ہمیں اچھی اچھی کہانیاں پیش کریں۔ دوسری کہانی ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی آوارہ گرد پڑھی۔ یہ بھی اپنے نمبروں پر آگے ہی آگے بڑھتی جارہی ہے۔ شہزی اور اول خیر کی دوستی کی مثال بہت ہی خوب صورت ہے۔ مجھے تو اس کا اینڈ مسافر کہانی کی طرح دکھائی دیتا ہے، شہزی کو نہ تو عابدہ ملے اور نہ ہی بیگم زہرہ بانو شاید میری قیاس آرائی ہو، آخر میں میری دعا ہے کہ آپ کے ادارے کے ایک ایک شخص کو اللہ تعالیٰ اپنی پناہ میں رکھے اور آپ اس سے بھی بڑھ کے ترقی حاصل کرو۔ ویلڈن ویری نائس اور جس طرح کراچی میں عالمگیر خان بے لوث کام کر رہا ہے صفائی کا اسی طرح اگر ہر فرد صفائی کا ذمہ اپنے اوپر لے لے تو یقین جانیں گلی محلوں میں آپ کو کوئی کچرا نظر نہ آئے۔“

کراچی سے ایم عمران جونانی کی تعریف و توصیف ”جاسوسی کا دیدار جلد ہی ہو گیا تھا۔ سلیم فاروقی صاحب کی زہر آلود ستانا میں مزہ آ گیا۔ فاروق انجم کی اذیت بجا طور پر سرورق کا پہلا رنگ کہلانے کی مستحق ہے۔ اکثر کہانیاں قتل ہو جانے کے بعد شروع ہوتی ہیں لیکن یہاں تو واردات سے قبل ہی گرفت مضبوط تھی اور اس کے بعد تو گویا چار چاند ہی لگ گئے۔ علی اسد کی باغ تلے خوب صورت تحریر ثابت ہوئی۔ جیسمین کی ڈیڑھ ہوشیاری اسے لے ڈوبی لیکن یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ جب عرصہ قبل اس نے خود ہی نکی کو یہاں مار کر دفن کیا تھا تو معاملہ دبانے کے بجائے اپنے سیل فون سے پولیس کو کال کیوں کی۔ بیچ کا آدمی جیسے فراڈ مغرب میں عام ہیں، وہاں راہ چلتے لوگ لوٹ کر مار ڈالنے یا سیاست کے ذریعے قومی خزانے پر ڈاکا مارنے سے زیادہ اس قسم کی فنکاری رائج ہے۔ نکس فاطمہ کے قلم میں روانی ہے، ویلڈن۔ مرحوم و مغفور کاشف زبیر کی کہانی جواب دکھی دل کے ساتھ پڑھی۔ بار بار

یہ احساس ہو رہا تھا کہ یہ خوب صورت تحریر لکھنے والا فنکار اب اس دنیا میں نہیں، کیا کمال کی کہانی بُنتا تھا کہ قاری مبہوت ہو کر بس پڑھتا جائے۔ اسی تازہ تحریر کو لے لیں۔ آخری لفظ تک دلچسپی کا عنصر برقرار رہا۔ مختصر لیکن خوب صورت جرم نامہ دل کو چھو گیا بھائی۔ ارے بھئی خلا میں جاسوسی کی مٹھاس چینی نکتہ چینی سے ہے۔ بھرپور تبصرے کے ساتھ سید شکیل کاظمی جلوہ افروز تھے۔ ایم سرفراز کا انداز تحریر بڑا پسند آیا۔ منجھے ہوئے تبصرہ نگار ہیں۔ معراج عباسی اللہ آپ کی دادی ماں کی مغفرت فرمائے۔ مشال اینڈ نوال، اسد عباس، سیف الرؤف، کاشف عبید، کبیر عباسی، عذرا ہاشمی اور رومی انصاری کے تبصرے و تجاویز بھی بہت پسند آئیں، سیکھنے کو ملا۔‘‘

ہری پور ہزارہ سے معراج محبوب عباسی کی محبت بھری باتیں، ’’مارچ کا جاسوسی 5 تاریخ کو لیا۔ ایک ماہ میں اتنی تبدیلی حیران کن لگی، یعنی یکم سے ترقی پا کر 5 تاریخ تک۔ بہرحال ٹائٹل کسی طرح بھی جاسوسی کا ہم مزاج نہیں تھا۔ محفلِ یاراں نال بہاراں میں قدم رنجہ فرمایا۔ اداریے میں مدیر صاحب اپنے حصے کا چراغ جلا رہے تھے۔ اس میں تو کوئی شک نہیں کہ ہمارے ملک پاکستان میں بے شمار ہونہار سپوت ہیں مگر ’’افسوس اہی لوگ بے قدرے ہیں‘‘ ہمارا نظام اس قدر بگڑ چکا ہے کہ اگر کوئی خدا ترس انسان اسے بدلنے کے لیے آگے آتا ہے تو یہ نظام اس کو ہی اپنے رنگ میں رنگ دیتا ہے کیونکہ سارے رنگ ہمارے ہیں۔ وفاقی دارالحکومت سے ارسال شدہ شکیل کاظمی کی تبصرہ نگاری نمایاں تھی۔ جتوئی سے سرفراز صاحب! ور اسٹائل ماضی سے جو لپٹا ہے وہ سودائی ہے۔ اگر آپ کو دھیما انداز پسند ہے تو آئندہ...... میرے سابقہ تبصرے پڑھ پڑھ کر گزارہ کر لیں پلیز۔ قاسم رحمان، اس عمر کے خواب اور بال، خیال ہوئے۔ اب تو میں نے محمد عامر کا اسٹائل اپنا لیا ہے اور سانپ والی گیم سے مجھے چڑ ہے۔ مجھے تو کرکٹ پسند ہے بس۔ مرحا گل پلس رمنا گل، مجھ میں ابھی نوابی یا فولادی والی روح نہیں آئی اس لیے میں فرمانے سے گریز کرتا ہوں اور اگر آپ دو ہیں تو پھر مل کر سمجھنے کی کوشش کریں پھر بھی نہ سمجھ آئے تو ایک اور ایک گیارہ والا عمل دہرائیں۔ عبادت بھائی پڑوسن کو سمجھائیں، اس عمر میں اتنے چکر اچھے نہیں، چکرا کر گر گئیں تو ٹوٹی ہڈی جڑنے کا بھی امکان نہیں، ہاں خط پسند کیا تو شکریہ۔ اس کے علاوہ کاشف عبید، سیف الرؤف، ناصر علی، مشال اینڈ نوال، قاسم رحمان کا شکریہ کہ انہوں نے میرا لکھا پسند کیا، خوش رہو جناب، آپڑیں خرچے تے۔ فروری کا مہینا ادارے اور قارئین کے لیے بہت بھاری رہا۔ لفظوں کے کھلاڑی، دیوتا کے خالق جناب نواب صاحب کے بعد ہر دلعزیز قلم کار اور شاہی دتیمور اور جلیل جیسے کرداروں کے خالق جناب کاشف زبیر بھی اس جہان فانی سے کوچ کر گئے۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور پسماندگان کو صبر کی توفیق دے۔ سب سے پہلے انگارے پڑھی۔ آسمان سے گر کر کھجور میں اٹکا کے مصداق شاہ زیب بھی ایک مصیبت سے نکل کر دوسری میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ پردے والی سرکار سے جان چھوٹی تو سیالکوٹی کے ہتھے چڑھ گیا۔ سونے پہ سہاگا یہ کہ اس بار انیق کا ساتھ بھی حاصل نہیں۔ آوارہ گرد میں شہزاد ان ایکشن ہے اور بلیو تلسی جیسی کھاگ اور منظم شدت پسند تنظیم کو نہ صرف بہت کاری ضربیں لگا چکا ہے بلکہ ان کے منہ سے نوالہ چھین کر لے آیا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ عابدہ کے سلسلے میں کیا کر پاتا ہے اور اسے اغوا کرنے والے اس کے ساتھ کیا گل کھلاتے ہیں۔ ساتھ ہی کبیل اور بیگم صاحبہ کی بات بھی چل نکلی ہے اب جانے کہاں تک پہنچے۔ اذیت میں مہتاب احمد ہر خواص و عام کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکتا رہا اور قدم قدم پر ہر بندے کو اپنا بیری بناتا گیا بالآخر اپنے برے انجام سے دوچار ہو گیا۔ بہرحال اچھی اسٹوری تھی۔ بیچ کا آدمی میں مانگ نے مسز برائٹ کو خوب بے وقوف بنایا۔ سچ ہے کہ جب تک بے وقوف زندہ ہیں عقل مند کبھی بھوکے نہیں مریں گے۔ باغ تلے میں گھر کو گھر کے چراغ سے ہی آگ لگ گئی۔ جیسمین کی پالتو کتیا نے اپنی مالکن کی ہی لنکا ڈھا دی۔ بے داغ گواہی میں جیفری..... اپنی ذہانت کو بروئے کار لایا اور ایک نقطے پر توجہ مرکوز کرتے ہوئے مارگریٹ کو ہاورز کے قتل کے جرم میں گرفتار کر لیا۔ اگر وہ ذرا سا عقلمندی کا ثبوت دیتی اور کپ گرا دیتی تو بچ نکلتی پر بے چاری کی مت ماری گئی تھی شاید۔ زہر آلود سناٹا سلیم فاروقی کی ایکشن تحریر تھی مگر یہ سمجھ نہ آئی کہ شہزاد اور کمپنی اس میں کہاں فٹ بیٹھتی ہے۔ ہیرو یا ولن۔ لیکن ایک بات تو ہے۔ ہمارے ہاں خون اس قدر سفید ہو گیا ہے کہ رشتوں کو دولت کے سامنے درجہ بندی میں ثانوی حیثیت حاصل ہے اور اس طرح کے واقعات آئے دن اخبارات کی زینت بنتے رہتے ہیں۔ زیرِ دام میں الٹی ہو گئیں سب تدبیریں اور آپ اپنے دام میں صیاد آ گیا۔ مسٹر قاتل کو قتالی کا ورلڈ ریکارڈ مہنگا پڑ گیا۔ اگر ورجن پہ اکتفا کر لیتا تو کیا فرق پڑ جانا تھا مگر کیا کریں لالچ بری بلا جو ہے۔ چلو جی بیسٹ آف لک کلر جی۔ معاشرے پہ طنز کرنا تو کوئی جناب منظر امام سے سیکھے۔ رقابت کا گھاؤ میں دو عزیز از جاں دوستوں نے ایک مرد کے لیے دوستی بھی چھوڑی، دشمنی بھی مول لی قتل بھی کیا اور ہاتھ بھی کچھ نہ آیا۔ نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم، نہ ادھر کے رہے نہ ادھر کے۔ اسی لیے کہتے ہیں دو آدمیوں میں تیسرا جو بھی آئے، وہ شیطان ہوتا ہے اور بالآخر شیطان نے اپنا کام کر دکھایا۔ گزیدہ سیریز پیش کرتے ہیں، سگ گزیدہ، مردم گزیدہ، عشق گزیدہ، محبت گزیدہ مار گزیدہ کے بعد اب نئی اسٹوری گل گزیدہ...... جس میں قاتل پھولوں کی خاطر قتل جیسا جرم کر دیتا ہے مگر آفرین ہے ان سراغ رسانوں پر جو کبھی کیس کو غیر حل شدہ چھوڑیں۔ اس بار بھی قاتل کو سات پردوں سے نکال لایا۔ اس بار کے لیے اتنا ہی باقی باتیں آپے نال آپ کرو۔‘‘

فتح پور سے سید محی الدین اشفاق کے مزے ’’ٹائٹل گرل ہمایوں سعید کو یاد کر رہی تھی۔ مدیر اعلیٰ نے بالکل درست فرمایا کہ تنقید آسان ترین کام اور الزامات کی جو بوچھاڑ ہمارے نام نہاد عوامی لیڈر ایک دوسرے پر کر رہے ہیں مگر ان میں سے کوئی بھی دودھ کا دھلا ہوا نہیں ہے۔ سید شکیل پڑوسن تو اب آپ پر خصوصی نظر کرم کرے گی چھائے ہوئے تھے آپ محفل پر۔ انور یوسف صاحب جاسوسی تو شدت کی گرمی کو بہار میں بدل دیتا ہے۔ سرفراز صاحب جاسوسیت تو تھی مگر آپ شاید کچھ اور ڈھونڈ رہے تھے۔ ناصر علی خیر تو ہے آپ کو بڑا اپنا ہے کہ کس قسم کے انتظار میں آنکھ نہیں لگتی؟ مرحا گل اور رمنا گل بالکل درست کہا آپ نے۔ شکیل کاظمی کی مصروفیات تبدیل ہوتی جا رہی ہیں۔ سید عبادت کاظمی کے والد صاحب کے لیے دلی دعا ہے کہ خدا ان کو جلد از جلد صحت مند کر دے، آمین۔ عذرا ہاشمی آپ کی ذرہ نوازی ہے۔ بلقیس خان جب بھی تھک جانے کے بعد کوئی کام کیا جاتا ہے تو ہی وہ شاہکار بنتا ہے۔ ماریہ خوش آمدید۔ جزیرہ ظلمات کو دل کی آنکھ سے پڑھا۔ کاشف زبیر مرحوم کا جواب کیا زبردست تحریر تھی۔ عامر شاہ جیسے کردار معاشرے میں عام طور پر

نظر آتے ہیں۔ عنایت شاہ جیسا خال خال ہی نظر آتا ہے۔ کہانی میں بہت مزہ تھا۔ انگارے کی یہ قسط بہت زیادہ شاندار رہی۔ فیض محمد کا کردار اچھا لگا۔ سجاول سیالکوٹی کی ماں کا کردار اور مانی کا کردار بھی اچھا تھا۔ تاہم وہی ہوا جس کا ڈر تھا اس ہرکارے نے شاہ زیب کو پہچان لیا۔ طاہر جاوید مغل صاحب ایکشن کے تمام سین کمال تھے۔ آوارہ گرد، ڈاکٹر بھٹی نے بھی خوب ایکشن دکھایا۔ کبیل دادا نے اپنی جان پر کھیل کے ثابت کر دیا کہ وہ اصل بہادر ہے۔ مجھے پہلے ہی لگ رہا تھا کہ کبیل دادا کے ساتھ زہرہ بانو کو ملا دیا جائے گا۔ جاسوسی کی جان زہر آلود سناٹا تھی۔ سلیم فاروقی نے جمبو جیٹ جہاز کی طرح ایکشن کروایا اور ایک چھوٹی واردات سے بڑی واردات کا منظر کیا کمالِ خوبی سے دکھایا۔ شہزاد اور شائلہ کی شادی ہوئی اور ماریہ دکھی ہوئی۔ فاروق انجم کو پہلے بھی پڑھا اب بھی مزہ آیا۔ جاسوسی کمال کا تھا۔''

تحصیل علی پور سے ہارٹ کیچر کی ہارٹ تنقید ''سوچ نگر کا دیوتا، شہنشاہِ ذہانت، سرمحی الدین نواب کے زمین کی کوکھ میں اتر جانے کی دل شکن خبر سے نیناں تمکین جل سے... جل تھل ہوئے۔ نواب صاحب سے ہمیں محبت ہی نہیں بلکہ عقیدت بھی تھی۔ ہمارا خیال ہے کہ عقیدت، محبت سے افضل ہے۔ پابندِ شرع معصوم صورت و سیرت کے مالک کاشف زبیر کے ردائے تراب اوڑھ جانے کا دکھ قلب قارئین کے لیے حزنِ دل بن گیا۔ یہ دل بھی کیا چیز ہے۔ غم ہو یا خوشی بے اختیار ہو کر دھک دھک دھڑکنے لگتا ہے۔ بقول ہمارے انسان کے سینے میں اگر دل نہ ہوتا تو انسان مثل مشین ہوتا۔ ابتدائیہ سے خوشہ چینی کی۔ ارضِ پاک کے سیاست داں...... سیاست داں کم سیاست گرد زیادہ بن گئے جنہوں نے پورے ملک میں سیاست گردی کی گردی پھیلا رکھی ہے۔ چینی نکتہ چینی میں تانک جھانک کے دیکھا۔ شکیل صاحب ہماری گزشتہ سے پیوستہ تحریر میں آپ کے لیے آئینہ تاکید اور حقیقت تھی جسے آپ اور نا سمجھ داری کی نمائش کرتے ہوئے مشورہ سمجھ بیٹھے تھے اب بھی آپ کی کشادہ سمجھ دانی میں ہماری وضاحت نہ سما پائے تو جواباً میں خاموش رہنا پسند کروں گا۔ مشال کو شادی خانہ آبادی مبارک اور دعاؤں کے تحفے۔ دعائے دل ہے کہ اللہ پاک ان کی زندگی کو ازدواجی خوشیوں کے رنگوں سے رنگین فرمائے۔ عبادت کاظمی کے والد محترم کے لیے صحت یابی کی دعائیں۔ عذرا ہاشمی نے پیش گوئی کی اور چینی نکتہ چینی کی پیر پگاڑا قرار پائیں۔ سیفی صاحب طاہرہ گلزار کے ساتھ کھڑے ادھار کھاتا کھلوانے پر بضد نظر آئے مگر طاہرہ نے بھی صاف صاف کہہ دیا بھیا نقد بڑے شوق سے ادھار اگلے چوک سے۔ بلقیس خان جو بات دماغ پر لینے کی ہو، شکیل کاظمی اسے دل پر لے لیتے ہیں۔ اسکول گرل ماریہ جہانگیر کا چھوٹی سوئی کی طرح رضائی میں سمٹ کر لکھا ہوا محبت نامہ اور تحریم تکوکر کا مختصر نامہ قابلِ توجہ رہا۔ ڈائجسٹ بیٹی کا سہرا ذہین کرداروں کی طویل تر داستان دیوتا کے سر سجتا ہے۔ جب بھی سسپنس یا جاسوسی لیا تو شروعات دیوتا یعنی نواب کے دل و دماغ سے کشید شدہ کہانیوں سے ہی کی۔ اس روایت کو برقرار رکھتے ہوئے جادو، جاسوسی جان لیوا جرائم جبر و جدوجہد پر مبنی یک قسطی داستان جزیرۂ ظلمات پر آنکھوں کی روشنی بکھیرنے کا قصدِ مصمم کیا۔ ذہنی بھول بھلیوں سے .... لبریز کا انجام کاوش چونکنے پر منتج ہوا اسی خوبی کی بدولت ہی نواب صاحب سنگھاسن دل پر رونق افروز ہیں۔ کاشف زبیر کی جواب لاجواب رہی۔ دونوں رنگوں میں پولیس کا قابل قدر رنگ ڈھنگ پڑھ کر حیرت ہی حیرت ہوئی۔ اس کے برعکس عام طور پر یہی دیکھا ہے، سنا ہے، پڑھا ہے کہ پولیس کا فرض ہے چھترول عوام کی۔ انگارے میں شاہ زیب آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا۔ تمکین رضا کی بے داغ گواہی غلطی سے بے داغ نہ تھی ماگریٹ کو... ٹوٹی پیالی کی خاموش گواہی لے ڈوبی۔ مترجم علی اسد کی باغ تلے پر کچھ نکتہ چینی جیسا کہ کمی کو جیسمین نے کیونکر اور کس طرح مارا؟ پھر مار کر اس کے ہی گھر میں سب کی نظروں سے بچ بچا کر کس طرح دفن کیا؟ اس کے لیے اس کے گھر کے باغیچے میں ہی گڑھا کیوں کھودا جبکہ جیسمین کو معلوم تھا کہ باغبانی کے لیے کھدائی ہوتی رہتی ہے اور گڑھا کم گہرا کیوں کھودا کہ سگِ جیسمین کے چند بار پنجہ چلانے سے باقیات باہر آگئیں۔ جب پہلی ہڈی دریافت ہوئی تو ردعمل کے طور پر جیسمین پریشان کیوں نہ ہوئی۔ (کیوں نا ان تمام سوالوں کے جواب میں باقی ادھوری کہانی کو مکمل کر دیا جائے، باغ تلے پارٹ ٹو ہارٹ کیچر کے قلم سے......) کہانیوں اور تبصروں پر تعریف کی چینی بکھیرنا تو آسان مگر تنقید کی نکتہ چینی بہت مشکل ہے۔ (اور آپ کو یہ کمال حاصل ہے) باپ بیٹی کی محبتوں پر تحریر فصیل پڑھ کر معلوم ہوا کہ مادی ترقی کے باوجود اہلِ مغرب کے دل رشتوں کی محبت سے یکسر خالی نہیں۔ (شکر الحمدللہ۔ فصیل، دراڑ سے بچ گئی) بیچ کا آدمی دلچسپ اسٹوری تھی۔''

اسلام آباد سے انور یوسف زئی کی شکایت ''جاسوسی اس بار معمول کی تاریخوں یعنی 7 مارچ کو مل سکا۔ سرورق یونہی سا تھا۔ محی الدین نواب صاحب اور کاشف زبیر کی رحلت کا پڑھ کر افسوس ہوا۔ اللہ انہیں جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ ادارہ جاسوسی کو ان کی کمی ہمیشہ محسوس رہے گی۔ خطوط کی محفل کی بازی اس بار میرے ہم شہری وڈے شاہ جی جیت گئے، مبارک ہو۔ کہانیوں میں مغل صاحب کی انگارے کی قسط اچھی تھی۔ شاہ زیب آسمان سے گرا تو کھجور میں اٹک گیا۔ دیکھیں سجاول سے اس کو رہائی کیسے ملتی ہے۔ مغل صاحب کی خدمت میں مودبانہ گزارش ہے کہ اپنے قلم کی حرمت کا خیال رکھیں کہ یہ رسالہ خواتین اور نیم پختہ ذہن والے نوخیز بھی پڑھتے ہیں۔ سرورق کی دونوں کہانیاں بس بھرتی کی چیزیں تھیں اور ہرگز جاسوسی کے معیار کی نہیں تھیں۔ نواب صاحب کی غیر مطبوعہ کہانی جزیرۂ ظلمات ٹھیک تھی اور کسی مغربی کہانی کا ترجمہ یا اخذ کی ہوئی لگتی تھی۔ دوسری کہانی آوارہ گرد اب ایک نازک موڑ پر آگئی ہے۔ شہزاد کو اس کا باپ تو مل گیا ہے مگر عابدہ کا قضیہ ابھی باقی ہے اور وہ اب ٹائیگر گینگ کے کارندوں کے ہاتھوں یرغمال بھی بن چکا ہے۔ کاشف زبیر مرحوم کی کہانی جواب اس شمارے کی بہترین کہانی تھی جس میں کچے کے علاقے کے ڈاکوؤں کی صحیح عکاسی کی گئی ہے۔ مغربی کہانیوں میں علی اسد کا ترجمہ باغ تلے بہتر رہی۔ اس ماہ کترنیں زیادہ تھیں اور کارٹون بے حد کم۔''

لودھراں سے محمد انعام کی خود ساختہ ناراضی ''سب سے پہلے میں تعزیت کرنا چاہتا ہوں محی الدین نواب صاحب کی وفات پر اور ان کے لاتعداد چاہنے والوں سے۔ اللہ انہیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا کرے، آمین۔ اخبار میں کاشف زبیر کے انتقال کی خبر پڑھ کر دل دھک سے رہ گیا۔ میرے پسندیدہ مصنف اس جہاں سے کوچ کر گئے۔ اس دن افسردگی دل پر ایسی چھائی کہ کالج کا کوئی بھی پیریڈ نہیں پڑھا۔ کاشف صاحب خود تو چلے گئے لیکن

ان کا نام ہمیشہ کہانیوں میں زندہ رہے گا۔ بے شک انہوں نے اپنے قلم کے ذریعے مسلمانوں کو بیدار کرنے کی کوششیں کی تھیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں جنت میں اعلیٰ مقام عطا کرے، آمین۔ کہانیوں کا آغاز انگارے سے کیا۔ شاہ زیب ایک مصیبت سے نکل کر دوسری مصیبت میں پھنس گیا۔ آخری میں ان کا بھید کھل گیا کہ گونگا تاجور کو بھگا کرلے آیا ہے۔ دیکھتے ہیں اگلی قسط میں کیا ہوتا ہے۔ آوارہ گرد میں شہزی اپنے باپ کو دشمنوں سے چھڑوانے میں کامیاب ہو گیا ہے لیکن عابدہ کا کیس وہیں اٹکا ہوا ہے۔ ایسی کہانیاں محبِ وطن کے جذبے کو ابھارتی ہیں۔ زہر آلود سناٹا اس بات کا منہ بولتا ثبوت ہے کہ پاکستان میں جو آئے روز چوریاں، برائی کے اڈے اور جو قتل ہو رہے ہیں، ان کا اصل سبب بے روزگاری ہے۔ جب ایک نوجوان محنت کر کے تعلیم حاصل کرتا ہے، نوکری دھکے کھانے کے باوجود بھی نہیں ملتی، بھلا ذہنی محنت کرنے والا جسمانی محنت یعنی مزدوری کیسے کرے گا۔ ہمارے خود غرض حکمران اگر بے روزگاری پر قابو پالیں تو پاکستان میں جرائم کافی حد تک ختم ہو جائیں گے۔ پہلے رنگ میں جو دوسروں کو اذیت دے کر سکون حاصل کرتا ہے، وہ خود کبھی دلی سکون سے نہیں رہ سکتا۔ اس کا انجام مہتاب احمد کی طرح ہوتا ہے۔ جزیرۂ ظلمات میں محی الدین نواب نے کالے جادو کو متعارف کروایا۔ انسان دولت اور شہرت کی ہوس میں غلط راستے کا انتخاب کرنے سے نہیں چوکتا، وہ نہیں دیکھتا کہ وہ کس راستے پر جا رہا ہے۔ اس کا انجام کتنا برا ہوگا۔ ایک بار دیکھا ہے میں، انسان نیکی کسی کے ساتھ نہیں کر سکتا۔ زمانہ ہی ایسا آ گیا ہے۔ کسی کے ساتھ بھلائی کرنے سے انسان خود مصیبت میں پھنس جاتا ہے۔ دوستوں کی محفل میں پہنچے تو شکیل حسین سب پر بازی لے گئے۔ ان کو پرانے تبصرہ نگاروں کی یاد ستا رہی تھی اس لیے ہم نے شرکت کرلی۔ مشال اینڈ نوال دوستوں کا حال احوال پوچھتے ہوئے، ماریہ جہانگیر ہم بھی تمہارے بھائی ہیں۔ ہم ڈائجسٹ گھر والوں سے چھپ کر پڑھتے ہیں۔ باقی لوگوں کے بھی تبصرے اچھے تھے۔ کالج کے ٹیسٹ ہو رہے ہیں اس لیے میں پورا رسالہ نہیں پڑھ سکا۔ پلیز انکل میں نے ٹائم نکال کر لکھا ہے، خط نہ شائع کر کے مجھے ناراض مت کیجیے گا۔"

ناظم آباد کراچی سے ادریس احمد خان کی محبتیں "سب سے پہلے جناب کاشف زبیر صاحب کی رحلت کی روح فرسا خبر سنی تھی تو دل جیسے رک سا گیا مگر اس حقیقت سے بھی انکار کوئی بھی متنفس نہیں کر سکتا کہ جو دنیا میں آیا ہے اسے دنیا سے جانا بھی ہے۔ یہ ایک اٹل حقیقت ہے ہم تو ان کی صحت یابی کی نوید سننے کو بے چین تھے کہ ان کے دنیا سے اٹھ جانے کا شور و غوغا سنا اور دل مسوس کر رہ گئے۔ اللہ ان کو غریقِ رحمت کرے اور بلند درجہ عطا فرمائے، آمین۔ ادب کا ایک اور بہت بڑا نقصان ہے جس کی تلافی شاید بہت برسوں تک نہ ہو سکے گی۔ ہم ان کے اہلِ خانہ کے غم میں شریک ہیں اللہ تعالیٰ ان کے جتنے بھی لواحقین ہیں سب کو صبرِ ایوب عطا فرمائے۔ اداریہ بھی حالات کی ترجمانی کر رہا تھا۔ سرِ فہرست شکیل کاظمی تھے، مبارکباد۔ سب سے پہلے تحریروں میں جزیرۂ ظلمات پڑھی جو محی الدین نواب کی کاوش تھی، بہت خوب رہی۔ منظر امام کی ایک بار دیکھا ہے نے بھی اچھا تاثر دیا۔ گل گزیدہ بھی اچھی لگی۔ خون کا بدلہ اچھی تحریریں تھیں اور انگارے وہ تو تحریر ہے ہی تعریف کرنے لائق جس کی ہر ہر سطر میں روانی ہے، دلچسپی ہے۔ یہی تسلسل قاری کو تحریر سے نگاہیں ہٹانا مشکل کر دیتا ہے۔ فصیل بھی بہتر انداز لیے ہوئے تھی، گمشدہ لاش اور زیرِ دام لکھنے والوں کا الگ الگ انداز لیے کہانیاں تھیں۔ پھر ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی آوارہ گرد کی بھی کیا ہی بات ہے یہ بھی مقبول ترین کہانی ہے جو آہستہ آہستہ اپنے انجام کی طرف بڑھ رہی ہے۔ جواب، کاشف زبیر کی بہترین کہانی تھی جس کا اینڈ بھی بہت اچھا تھا۔ بیچ کا آدمی بھی دلچسپ کہانی تھی جس میں بیچ کا آدمی فائدے میں رہا۔ اس نے ہر طرف سے اپنا فائدہ حاصل کرلیا۔ باغ تلے جس میں جرم جو انتہائی مہارت سے کیا گیا تھا، اس کا پردہ فاش ہو گیا۔ جرم کتنا ہی منظم ہو مگر ہر چالاک سے چالاک جرم کے نقوش چھوڑ جاتا ہے جس کی بنا پر پابندِ سلاسل ہو جاتا ہے۔ یہ قدرت کا نظام ہے۔ بے داغ گواہی میں ہوشیار عقلمند سراغرساں جیفری نے ایک چھوٹے سے نکتے سے جرم کو آشکار کر دیا۔ بہت خوب آخری صفحات کی دونوں کہانیاں خوب صورت اور بہترین تھیں۔ محمد فاروق انجم اور سلیم فاروقی نے بلاشبہ اچھی تحریریں لکھیں۔ اچھی تحریر کے لیے کسی کی سفارش کی ضرورت نہیں ہوتی وہ خود اپنا آپ منوا لیتی ہے۔ بیچ بیچ میں کترنوں نے اپنی اہمیت کا احساس دلایا۔"

نور پور سے محمد یوسف کی دلی کیفیات "بہت ہی بوجھل دل ہے۔ مارچ کی 6 کو پرچا ملا اور ورق گردانی کرتے ہوئے جب کاشف زبیر صاحب کی رحلت کی خبر پر نظر پڑی تو یقین کریں ایک دفعہ آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ ابھی محی الدین نواب صاحب کی وفات کا صدمہ گہرا تھا کہ تقدیر نے کاشف صاحب کی جدائی بھی ہمارا مقدر کر دی۔ اگر لفظ خون روتے تو یقین کریں اس وقت خط کا صفحہ لال ہوتا۔ دو عظیم ہستیوں کا بچھڑ جانا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ قارئین کو جس شدت کا صدمہ پہنچا ہے، اس سے کہیں بڑھ کر ادارے کو بہت بڑا صدمہ اور نقصان ہوا مجھے ادارہ اور مرحومین کے لواحقین سے دلی ہمدردی ہے اور دعا کہ مالک و خالق صدقہ پنج تن پاک کا مرحومین کو جنت میں اعلیٰ مقام دے اور پسماندگان کو اس عظیم صدمے سے نبرد آزما ہونے کی طاقت دے، آمین۔ سرورق دل کو بھایا اور ذاکر انکل کے لیے لانگ لائف کی دعا کی۔ سب سے پہلے چینی نکتہ چینی میں اداریہ پڑھا اور اس سے اتفاق کرتے ہوئے ایک اور بات کا اضافہ کر کے آج کی تمام لیڈرشپ کو خلائی جہاز میں سوار کرایا جائے کیونکہ ہماری تمام تر ناکامیوں کا سبب آج کی یہ لیڈرشپ ہے۔ اسلام آباد سے سید شکیل حسین کاظمی کا تبصرہ پڑھا، اچھا لگا۔ محی الدین اشفاق، ابرار وارث، کبیر عباسی، عبدالجبار رومی، تحریم تکو کر کی شرکت شاندار رہی۔ معراج محبوب عباسی اللہ آپ کی دادی صاحبہ کو جنت میں اعلیٰ مقام دے۔ سیف الرؤف صاحب اگر میں اس وقت ان تک پہنچ پاتا تو لازمی بتاتا کیونکہ کسی انسان کی جان بچانا بہت بڑا ثواب ہے۔ مرحا گل اور رمنا گل صاحبہ انکل کی مغفرت کے لیے دعا کرنے کا شکریہ، پشاور سے ناصر علی آپ کا بھی بہت شکریہ آپ نے انکل کے لیے دعا کی۔ ہری پور سے محمد قاسم اور جتوئی سے محمد سرفراز اور اسلام آباد سے انور یوسف زئی تبصرہ کرنے کا شکریہ اور محمد سرفراز صاحب نصیحت کرنے کا شکریہ۔ کہانیوں میں سے سب پہلے سلیم فاروقی کا زہر آلود سناٹا پڑھی۔ جرم و سزا کے موضوع پر لکھی گئی تحریر بہت شاندار رہی اور اپنے ہی خون سفید ہو گئے ہیں، یہ بات سچ ہے کہ دولت کے لیے کوئی کسی کو نہیں چھوڑتا چاہے سگا بھائی کیوں نہ ہو۔ محمد فاروق انجم کی اذیت واقعی اذیت تھی۔ مہتاب احمد کے کردار سے نفرت ہوئی۔ جزیرۂ ظلمات، محی الدین صاحب کی انمٹ یادوں میں سے ایک اور یاد ہمارے لوحِ دل پر تحریر ہو گئی، عمدہ کہانی اچھی لگی۔ جاسوسیت اور تھرل سے بھرپور انگارے اور آوارہ گرد اس وقت اپنے دور کی بہترین قسط وار کہانیاں ہیں۔ باقی تمام مغربی کہانیاں

اچھی لکھیں اور مرحوم کاشف زبیر صاحب کی کہانی جواب تو لاجواب تھی۔‘‘

پشاور سے طاہرہ گلزار کی الفاظ گری ’’جاسوسی آج 6 مارچ شام 5 بجے ملا۔ سب سے بڑا دکھ تو پہلے نواب انکل یعنی مجی الدین نواب نے ہمیں دیا۔ ابھی ادب نے یہ داغ سینے پر نہیں لیا تھا کہ سینہ شاک کرنے والی خبر کہ کاشف زبیر ہمیں چھوڑ گئے۔ میری دعا ہے کہ کاشف زبیر اللہ تعالیٰ آپ کو جنت الفردوس میں بہت اعلیٰ مقام عطا کرے۔ سرورق کی حسینہ خواب میں اپنے محبوب کو دیکھ کے مسکرا رہی تھی اور صنفِ کرخت اس کی اس مسکراہٹ پر طنزاً مسکرا رہا تھا کیونکہ یہ صنفِ کرخت محبت کے سچے جذبے کو کیا جانے۔ اس بار تو انکل نے سیاست دانوں سے جان چھڑانے کا بہت آسان اور انوکھا طریقہ بتایا کاش کہ ایسا جہاز بھی میں بنا سکوں۔ وڈے شاہ جی نمایاں تھے، مبارکاں مبارکاں شاہ جی لگتا ہے پڑوسن سے صلح ہوگئی ہے۔ اچھی بات ہے، جھگڑا کرنے سے کیا فائدہ۔ خط تو آپ کا بہت شاندار تھا لیکن آپ کی اس بات سے میں بالکل متفق نہیں کہ آپ جھگڑوں سے دور رہتے ہیں۔ مجی الدین اشفاق میں تعریف ان کی کرتی ہوں جو اس کے لائق ہوتے ہیں اور جو مجھے اچھے بھی لگتے ہوں۔ آپ بھی ان میں سے ایک ہو۔ اشفاق صاحب، زہرہ بانو مجھے بالکل پسند نہیں بس شہزی اپنا ملکی مقصد پورا کرے اور عابدہ سے ہی شادی کرے۔ مشال اینڈ نوال ڈیئر یاد رکھنے کا شکریہ۔ آپ کا تبصرہ میں بہت پیار سے پڑھتی ہوں۔ واہ یہ تو میرے چھوٹے بھائی ابرار وارث بھی حاضر ہیں۔ حسینہ والی بات اگر بھابی کو پتا چلی تو تیری خیر نہیں ہاہاہا۔ تبصرہ اچھا رہا کہاں غائب ہو ضرور ملنا یوسف، کاشف زبیر نے تو ہمیں جدائی کا ایسا داغ دیا ہے جو کبھی مٹنے کا نہیں۔ اسد عباس صاحب میں بچوں کو تو صلح کرنے پر مجبور بھی کر سکتی ہوں لیکن شیطانوں اور کینہ پروروں کو نہیں سمجھا سکتی، ایسے لوگوں سے اللہ مجھے بچائے، آمین۔ واہ اس بار تو محمد سرفراز بہت اچھے اور تفصیلی تبصرہ لے کر حاضر تھے ویلکم اینڈ مبارک ہو۔ سرفراز جی آپ بلقیس خان کی انکساری کو کچھ اور نہ سمجھ لینا، اس نے ہو سکتا ہے تم مردوں پر طنز فرمایا ہو۔ ویسے تبصرہ بہت شاندار رہا۔ لیڈیز کلیئر ہاہاہا...... محمد قاسم الرحمان یاد کرنے کا شکریہ، ویسے پشاور آ کر بھی مجھ سے نہیں ملے، اچھی بات نہیں ہے۔ تبصرہ بہت دلچسپ رہا۔ چھوٹے بھائی میری دعا ہے کہ تم امتحان میں بہت اچھے نمبر لو، آمین۔ سویٹ بھائی ناصر علی آپ کا تبصرہ بہت اچھا لگا۔ اردو صحیح نہ بولتے ہوئے بھی آپ کا تبصرہ لاجواب ہوتا ہے لیکن زیادہ توجہ پڑھائی پر دو تا کہ معاشرے کے ایک اعلیٰ اور کامیاب انسان بن سکو۔ مرجا گل اینڈ رمنا گل یاد رکھنے کا شکریہ۔ آپ کا تبصرہ بہت ہی دلچسپ اور چٹکیاں بھرنے والا لگا۔ بہت اچھے...... آپ نے ٹھیک کہا کہ اپنے سرفراز صاحب کو بخارِ عشق ہو گیا ہے۔ ہر بات میں صنفِ نازک کو لاتے ہیں ہاہاہا۔ عبادت کاظمی ایک دن تم بھائی کے ہاتھوں شہید ضرور ہو گے۔ کاشف عبید یاد کرنے کا شکریہ۔ عذرا ہاشمی صاحبہ بہت ہی دلچسپ اور شاندار تبصرہ کے ساتھ حاضر تھیں۔ اس بار بھی مغل اعظم کی، ایکشن سے بھرپور قسط رہی۔ میرے دوسرے فیورٹ رائٹر عبدالرب بھٹی کی تحریر آوارہ گرد کیا بھرپور ایکشن، وہ کیا کہتے ہیں سونے پہ سہاگا۔ شہزی باپ کو بھی لایا اور خطرناک مجرم کو بھی۔ کبیل دادا، اول خیر اور شکیلہ زخمی ہوئے۔ شہزی نے آخر کبیل دادا کی دل کی بات چھیڑ ہی دی۔ اپنے فیورٹ رائٹر کاشف زبیر کی جاسوسی میں کہانی جواب جوڑا کو منگنی پر تھی، بہت زبردست تحریر تھی۔ علی اسد کی مختصر مغربی تحریر باغ تلے اچھی تھی لیکن پڑھی ہوئی محسوس ہوئی۔ تمکین رضا کی مختصر تحریر بے داغ گواہی لیفٹیننٹ جیفری نے حاضر دماغی سے مارگریٹ کو قاتل قرار دیا، ویری گڈ۔ ایک بار پھر عکس فاطمہ اپنی مغربی شاہکار لے کر حاضر تھیں۔ مغربی معاشرے میں جس طرح رشتوں کی بے حرمتی کی جاتی ہے، یہ کہانی مکمل اس کی عکاس تھی، ویلڈن۔ عکس فاطمہ، امجد رئیس کی مختصر تحریر زیرِ دام میں بالآخر قاتل دام میں آ گیا اور 13 کے نمبر کی حسرت لے کر بے چارہ پھنس گیا۔ منظر امام صاحب اس بار پھر ایک مختلف موضوع لے کر آئے۔ ایک بار دیکھا ہے، حاتم طائی اور منیر شامی کے یادگار کردار ایک بار پھر لے آئے، ویلڈن منظر امام صاحب۔ سلیم انور کی تحریر رقابت کا گھاؤ مغربی معاشرے کی گندگی دکھانے میں خوب کامیاب رہی۔ اچھی تحریر تھی، ویلڈن سلیم انور۔ واہ مجی الدین نواب کی زبردست تحریر جزیرۂ ظلمات جاسوسی کے پہلے صفحات پر شامل کر کے کچھ تو قاری کے دل کو تسکین دی ہے اور نواب انکل سے اپنی محبت کا ثبوت دیا ہے۔ سرورق کی دونوں کہانیاں ابھی نہیں پڑھیں۔ کیونکہ دل یہ تسلیم کرنے کو تیار نہیں کہ سرورق کے صفحات پر اب میرے فیورٹ رائٹر کاشف زبیر کا نام نہیں ہوگا یقیناً سلیم فاروقی اور محمد فاروق انجم بہت اچھے لکھنے والے ہیں۔‘‘

سعید عباسی بہاولپور کی مصروفیت ’’رسالہ 5 تاریخ کو دوپہر کو ملا۔ ٹائٹل سچ پوچھیں تو ایک آنکھ بھی نہیں بھایا، آج کل میں نے نوٹ کیا ہے کہ اندرونی صفحات والی کہانیوں کے تمام اوراق کو اکٹھا کرنے کے لیے جو 2 سوئیاں لگائی جاتی ہیں، وہ ٹائٹل میں نہیں چبھوتے آپ لوگ، ٹائٹل ایسے ہی کسی محلول سے چپکا دیتے ہیں جو وقتی طور پر تو چپک جاتے ہیں پر بعد میں کچھ عرصہ گزرنے کے بعد ٹائٹل خود بخود اندرونی صفات سے الگ ہو جاتا ہے۔ ماضی کے کچھ پرانے رسالے میرے پاس پڑے ہیں، ان کے ٹائٹل آج بھی محفوظ ہیں کیونکہ ان میں سوئیاں چبھی ہوئی ہوتی تھیں تو پلیز اس بارے میں کچھ غور کریں۔ چینی نکتہ چینی میں سید شکیل حسین کاظمی براجمان تھے۔ احسان سحر مصنف ہے ارے واہ بھائی ہمیں تو پتا نہیں تھا ویسے آج کل کون سے رسالے میں لکھ رہے ہیں جناب؟ ماریہ جہانگیر ہم تو سمجھتے تھے کہ ہم ہی ہیں جو راتوں کو اٹھ اٹھ کر رسالہ پڑھتے ہیں پر اب پتا چلا کہ کافی قاری رات کو پڑھتے ہیں رات کو پڑھنے کا اپنا ہی مزہ ہوتا ہے۔ ہر طرف خاموشی، سناٹا میں خود بھی رات کو پڑھتا ہوں، رات کے آخری پہر تک۔ بہاولپور سے نومی اے ہوا کرتا تھا، وہ کہاں غائب ہے؟ نواب صاحب اور کاشف زبیر کے بارے میں سن کر بہت افسوس ہوا۔ ادب سے شوق رکھنے والے قاری دو نامور شخصیات سے محروم۔ خدا پاک لواحقین کو صبر عطا فرمائے اور مرحومین کو جنت میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے، اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف۔ سب سے پہلے نواب صاحب

انتقال پُر ملال

ماہنامہ سرگزشت کے مدیر پرویز بلگرامی کی والدہ محترمہ کار ضائے الٰہی سے انتقال ہوگیا۔ ادارہ ان کے غم میں برابر کا شریک ہے۔ قارئین سے درخواست ہے کہ سورۂ فاتحہ ایک بار اور سورۂ اخلاص تین بار پڑھ کر ایصالِ ثواب کریں۔

کی جزیرۂ ظلمات پڑھی۔ لمحہ بہ لمحہ، سطر بہ سطر اپنے سحر میں جکڑ لینے والی داستان تھی۔ برے کام کا برا انجام ہوتا ہے اور سلمان کا کردار اچھا لگا۔ اس کے بعد کاشف زبیر کی جواب پڑھی۔ اشفاق خان نے اپنی بیوی کی موت کا بدلہ کیا خوب لیا۔ منگی گروپ کو بم سے اڑا دیا اور عامر کو اسی کی بیوی اور معصوم بیٹے کی وجہ سے اس کی جان بخشی کر دی۔ زہر آلود سنانا بھی اچھی تحریر تھی۔ موتی والا کا اپنا سگا بھائی اپنے بھائی کا دشمن بن گیا جائداد کی خاطر اس کو ختم کرنا چاہا مگر شہزاد اور علی نے اس کا سارا پلان خاک کر دیا اور ماریہ کو اس کے گھر پہنچا کر کامیاب ہوا۔ گمشدہ لاش بھی کافی پراسرار کہانی تھی۔ ایک بار دیکھا ہے منظر امام کی کہانی کافی پرمزاح تحریر تھی۔ حاتم طائی کے جملے پسند آئے۔ بے داغ گواہی مارگریٹ نے پلاننگ اچھی کی تھی۔ باقی رسالہ ابھی زیر مطالعہ ہے۔''

جتوئی سے چوہدری محمد سرفراز کا سرفراز نامہ ''مارچ کا جاسوسی کیا ملا سید ھا، چیمی نکتہ چینی کا رخ کیا۔ کچھ تبصرے مشورہ ساز فیکٹریوں کا منظر پیش کر رہے تھے تو کچھ افواہ ساز، کچھ گلے شکوے کر رہے تھے تو کچھ دل کے پھپھولے پھوڑ رہے تھے اور کچھ ہم جیسے معصوم بھی تھے جو میٹھی میٹھی باتوں میں معروف تھے۔ (یہ جگہ ہی ایسی ہے جہاں ہر شخص اپنی بات کر سکتا ہے) لو جی مرحا گل کے ساتھ رمنا گل کا بھی اضافہ ہو گیا۔ یعنی پہلے ایک دماغ سے کام نہیں چلا تو ایک اور دماغ کو ساتھ ملا کر وہ کمی پوری کرنے کی کوشش کی گئی... خیر جو بھی ہے حاضری لگاتی رہا کریں۔ آپ کے جاندار تبصرے محفل کو چار چاند لگا دیتے ہیں۔ اپنے عبادت کاظمی صاحب کسی مہ جبیں کو دیکھ کر دل زور سے دھک کرنے لگے تو سمجھ لینا دال میں کچھ کالا کالا ہے۔ بلقیس خان کے جوابی حملے بھی جاندار رہے۔ کافی عرصے بعد کسی خاتون کو یہاں متھا دیتے دیکھ کر خوشی ہوئی۔ طاہرہ گلزار صاحبہ محفل سے ندارد تھی۔ کبیر عباسی صاحب ہم اصلی نام سے تبصرہ لکھنے کے لیے اوکھے سے وقت نکال پاتے ہیں اور یہ فیک نام والے کچھ زیادہ ہی ویلے ہوں گے تبھی تو یہ نیک کام سرانجام دیتے ہیں۔ خیر جو بھی کر رہے ہیں، کمال کر رہے ہیں۔ کہانیوں میں اس مرتبہ ابتدا، ابتدائی صفحات سے کی۔ جزیرۂ ظلمات میں بلاشبہ اعلیٰ درجے کا فکشن پڑھنے کو ملا۔ ہر رائٹر کا اپنا اندازِ تحریر ہے مگر تخیل کی زرخیزی جو اُن کے ہاں تھی شاید ہی کسی اور رائٹر میں ہو۔ اللہ تعالیٰ انہیں جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ انگارے میں شاہ زیب آسمان سے گر کر کھجور میں اٹک گیا۔ نئے کرداروں کی آمد اور شاہ زیب کی اصلیت کا کھلنا بتا رہا ہے کہ معاملات ابھی اور بھی پیچیدہ ہوں گے۔ مغل صاحب کو یہی پیچ و خم بنانے اور سنوارنے میں ملکہ حاصل ہے۔ پہلا رنگ اذیت اتنا ہی متاثر کر سکا جتنا کہ ہم ہو سکے۔ تقریباً اوسط درجے کی تحریر تھی۔ عموماً اس ٹائپ کی تحریروں میں جہاں قتل کی چھان بین ہو، سسپنس ہی سب سے اہم چیز ہوتا ہے۔ یہ سسپنس تہ در تہ کھلنے پر ہی لطف آتا ہے مگر رائٹر نے سب کھول کر بیان کر دیا جس کے بعد پیچھے کچھ نہ بچا اور دو جمع دو چار کر کے قاتل پکڑا گیا۔ دوسرے رنگ پر سلیم فاروقی صاحب کا نام دیکھ کر ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ ایکشن سے بھرپور کہانی ہو گی۔ یہ رنگ پہلے رنگ کی نسبت زیادہ بہتر رہا۔ گل گزیدہ میں قتل کی گتھی سلجھائی گئی۔ ایک تو ہر دوسری تحریر میں سراغ رساں معاملہ سلجھاتے سلجھاتے کسی نہ کسی خاتون پر عاشق ضرور ہو جاتا ہے۔ یہاں بھی اختتام پر کچھ یہی ہوا۔ (آپ کو کیوں برا لگ رہا ہے۔ کیا آپ بھی لائن میں ہوتے ہیں؟) رقابت میں انسان کسی بھی حد تک جا سکتا ہے۔ سلیم انور نے رفاقت کا گھاؤ، میں یہی چیز نہایت دلچسپ انداز میں دکھائی۔ اندازِ تحریر نے ایک لمحے کے لیے بھی بور نہیں ہونے دیا۔ سیر بنا راض کی خون کا بدلہ بھی اچھی رہی۔ ترجمہ کہانیوں میں یہ کہانی سب پر بازی لے گئی۔ کاشف زبیر صاحب جیسا شاید ہی کوئی اور لکھ سکے۔ ان کی تحریر جواب ایک دم لاجواب تحریر تھی۔''

ڈیرا اسماعیل خان سے سید عبادت کاظمی کی ریاضت ''موسم بدل رہا ہے تو سرورق بھی بدلا بدلا سا لگا۔ قاسم رحمان سرورق کی حسینہ کو گرمیوں کا تحفہ یعنی مشروب پیش کر رہے تھے لیکن وہ 1960ء کی لڑکیوں کی طرح شرما رہی تھی، ان دونوں کو ان کے حال پر چھوڑ کر محفل میں داخل ہوئے۔ سید شکیل حسین کاظمی اپنے جلالی تبصرے کے ساتھ تشریف فرما تھے۔ پڑوسن کے ساتھ ان کی محفل خوب جمی رہی۔ شاہ جی تسی تے چھا گئے۔ کاشف زبیر میرے پسندیدہ لکھاری اس جہان فانی کو چھوڑ گئے اب ان کے بغیر شامی اور تیمور کہاں سے آئیں گے، یقین ہی نہیں آتا۔ جلیل اور شنو کاشف زبیر کے ساتھ مٹی تلے دفن ہو گئے۔ اللہ ان کی مغفرت فرمائے۔ سید محی الدین اشفاق بہت کم گو ہو گئے ہیں، وجہ کیا ہے؟ ابرار وارث کی آمد اچھی لگی۔ محمد سرفراز آپ نے ٹھیک کہا، کچھ لوگ بلا وجہ اور بنا مقصد کے روک ٹوک اور تنقید کرتے ہیں لیکن کیا کیا جائے ان کا، عادت سے مجبور ہوتے ہیں۔ قاسم رحمان اچھے تبصرے کے ساتھ براجمان تھے۔ جناب عورتوں اور لڑکیوں کے فلسفے سمجھاتے نظر آئے۔ ناصر علی سالگرہ وش کرنے کا شکریہ۔ مرحا گل سالگرہ وش کرنے کا شکریہ اور ٹائٹل کی تعریف تو کرنی چاہیے ابتدا اچھی تو انتہا بھی۔ سیف الرؤف کا تکی کا عنصر لیے تبصرہ عمدہ تھا۔ محمد کبیر عباسی کا اداسی میں ڈوبا تبصرہ پڑھ کر دل اداس ہو گیا مگر جناب یہ دنیا تو عارضی ہے۔ سب نے جانا ہے، کچھ لوگ بھلائے نہیں بھولتے۔ کچھ عرصے کے بعد عذرا ہاشمی کی آمد اچھی لگی۔ بلقیس خان ہمارا منہ میٹھا کروا رہی تھیں۔ مٹھاس سے بھرا تبصرہ اچھا لگا لیکن ساتھ میں شوگر کا خطرہ بھی تھا سو...... ماریہ جہانگیر دیر آید درست آید۔ عبدالجبار رومی تبصرہ پسند کرنے کے لیے بنڈل آف تھینکس۔ معراج محبوب عباسی ابھی میرے برے دن نہیں آئے۔ یار شادی ابھی خیالوں میں بھی نہیں۔ ویسے فکر ناٹ آپ کو ابھی سے کارڈ بھیج دیا وقت آنے پر مل جائے گا اور جاسوسی میں تو لازمی نام لکھواؤں گا مہمانوں کے نہیں ادارے والوں کے...... آخر اتنا حق تو بنتا ہے ناں۔ قاسم رحمان، سرفراز احمد، مرحا گل اور باقی دوستوں کے تجزیے بہترین رہے۔ انگارے زبردست ہو گئی۔ مغل صاحب کے قلم کا جادو سر چڑھ کر بولنے لگا ہے۔ آوارہ گرد میں شہزی کی ہمت کی تو داد دینی چاہیے۔ عابدہ کی جدائی کے بعد بھی حوصلہ رکھے ہوئے ہے، کمیل داوا اور زہرہ بانو کی جوڑی پرفیکٹ ہے، شہزی کا باپ مل گیا لیکن کرنالی کے مذموم ارادے خطرناک لگ رہے ہیں۔ پہلا رنگ اذیت اچھا تھا لیکن دوسرا رنگ زیادہ بہترین تھا۔''

ماتلی سے عابد حسین لغاری کی خواہش ''2 مارچ کو حیدرآباد جانے کا اتفاق ہوا۔ مارکیٹ جاتے ہوئے بک اسٹال پر جاسوسی نظر آ گیا، فوراً خرید لیا۔ مارچ کے جاسوسی میں 2 بری خبریں پڑھنے کو ملیں۔ محی الدین نواب اور کاشف زبیر بھائی کے انتقال کی جو میرے پسندیدہ رائٹر تھے، اللہ مرحومین کی مغفرت فرمائے، آمین۔ ٹائٹل گرل کی آنکھیں بند تھیں اس لیے بنا کسی خوف و خطر ان کے سامنے سے گزر کر خطوط میں جا پہنچے۔ سب سے پہلے سید شکیل

حسین کاظمی کا تبصرہ پڑھا۔ آگے چلے تو مرحا گل صاحبہ، عبدالجبار رومی انصاری، بلقیس خان اور محمد صفدر معاویہ ان کے تبصرے پڑھے بنا رہ ہی نہیں سکا۔ اس مرتبہ صفدر معاویہ گم ہیں، بھائی ایسا نہ کریں حاضری دیا کریں۔ آپ ہی تو ہماری جان ہیں۔ سب سے پہلے انگارے پڑھی، ویلڈن طاہر جاوید مغل۔ پھر آوارہ گرد پڑھی۔ محی الدین نواب کی جزیرۂ ظلمات، سرورق کی کہانیاں اذیت اور زہر آلود سناٹا پڑھیں، پڑھ کر مزہ آیا۔ باقی کہانیاں زیرِ مطالعہ ہیں۔ میرے ماموں بہادر خان لغاری، 10 سال سے جاسوسی کے پکے قاری ہیں ان کو دیکھ کر جاسوسی پڑھنے کا شوق ہوا، امید ہے اس مرتبہ بھی خط شامل کر کے حوصلہ افزائی کریں گے۔''

خانیوال سے محمد صفدر معاویہ کا صدمہ ''کیا لکھوں کیا نہ لکھوں، کچھ سمجھ نہیں آرہا۔ آج لفظ میرا ساتھ نہیں دے رہے، دل بہت رنجیدہ ہے آنکھیں پرنم۔ 24 فروری کو مجھے پتا چلا کہ محترم کاشف زبیر صاحب زندگی کی بازی ہار گئے۔ کاشف زبیر بھی تو ایک مہکتے پھول تھے۔ جن کی خوشبو سے ہم جیسے لوگ مستفید ہوتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو ذہانت کی جو صلاحیت دی تھی، اس نے کاشف زبیر کو لاکھوں دلوں کی دھڑکن بنا دیا کہ لوگ ہر ماہ کاشف زبیر کی کہانی.... یا ناول کے انتظار میں ہوتے۔ اللہ تعالیٰ محترم کاشف زبیر کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا کرے اور مرحوم کے لواحقین کو صبرِ جمیل اور اجرِ عظیم عطا کرے۔ باقی تمام دوستوں کے تبصرے اچھے رہے۔ شکیل حسین کاظمی اچھے تبصرے کے ساتھ نمایاں تھے۔ کہانیوں میں پہلے کاشف زبیر کی جواب پڑھی، بہت عمدہ تحریر تھی۔ نواب صاحب کی جزیرۂ ظلمات اچھی تحریر تھی۔ دونوں رنگ بھی اچھے رہے۔ دونوں قسط وار کہانی اچھی رہیں۔ تمام دوستوں سے التماس ہے کہ کاشف زبیر نواب صاحب اور باقی تمام لوگوں کی روحوں کو ایصالِ ثواب کے لیے اول آخر درود شریف تین مرتبہ قل شریف پڑھ کر ان کی روح کو بخش دیں۔'' (جی ضرور۔ فہرست والے صفحے پر جو ایڈریس چھپتا ہے وہی مستقل ایڈریس ہے)

عبدالجبار رومی انصاری کی قصیدہ نگاری لاہور سے ''صنفِ کرخت کے چہرے پہ چھائی ویرانی، اس کے اندر سے ٹوٹے ہوئے دل کی ترجمانی کر رہی تھی جبکہ ان سب سے بے نیاز حسین دوشیزہ بھرے ہوئے جام کی خوشبو سے ہی مدہوش ہو رہی تھی لیکن نہ جانے کب کوئی اس کی مدہوشی میں دخل اندازی کر دے اور پھر کراچی کی سیاست کی طرح اس کا نشہ بھی اُڑن چھو ہو جائے۔ سید شکیل حسین بھی نمبر لے گئے ہیں، لگتا ہے پڑوسنوں کے ساتھ کوئی مقابلہ ہوتا ہے۔ مبارک ہو، تبصرہ نگاری عمدہ رہی۔ ملک تو جانے کب تک دو نمبری کا شکار رہے پر محی الدین اشفاق کا تبصرہ ایک نمبر ہی لگا۔ سرِ شام سرورق کا دیکھنا بھی کمال ہے منتظر ہیں جاسوسی کے اور یہ حال ہے۔ کیا پوچھا یہ سب کس کا جمال ہے؟ ہاں جی جہلم سے قاری مشال اینڈ نوال ہیں۔ انور سیف کا شکوہ بجا ہے اور اسد عباس کی تعریف محمد سرفراز کی سرفرازی بھی خوب تھی جبکہ محمد قاسم رحمان کی دلی راحت بھی اچھی لگی۔ ناصر علی کی کوششیں بار آور ہو رہی ہیں۔ اندازِ تحریر دل کو چھو رہا ہے۔ گل کاری میں بھی کمال ہے مرحا گل، پھر کیوں پیچھے رہیں تبصرہ میں رمنا گل؟ سیف الرؤف نے تو لگتا ہے ٹائٹل گرل میں جو بیں دیکھ لی ہیں اور کاشف عبید مصروفیات کے باوجود ٹائٹل میں رنگ ڈھونڈ رہے ہیں۔ محمد کبیر عباسی پر بھی افسردگی چھائی ہے۔ اس کے برعکس عذرا ہاشمی دلچسپ پیش گوئیاں لائی ہیں۔ معراج محبوب عباسی آپ کو کیا ہوا؟ اوہ اللہ تعالیٰ آپ کی دادی محترمہ کو اپنی جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ واہ بلقیس خان کے جوابی حملے ایک دم سے اچھے لگے، نہلے پہ دہلے۔ ماریہ جہانگیر بھی عرصے بعد نظر آئیں۔ وہ بھی رضائی میں چھپی ہوئی۔ وادی سون سے مختصر مگر تحریر ہے خوب صورت، پھر بھی تحریم تلوکر کی اچھی رہی شمولیت۔ آسمان سے گرے کھجور میں اٹکے شاہ زیب اور تاجور اور سجاول ڈاکو کے چنگل میں پھنس گئے۔ سلگتی سسکتی ایک دم زبردست تحریر تھی۔ اس دفعہ تو اول خبر، شکیلہ، کبیل دادا اور شہزاد کی جان بھی خطرے میں پڑ گئی پھر بھی شہزی اپنے باپ کو بچا لائے۔ دوسری طرف کبیل دادا کی یک طرفہ محبت بھی رنگ پکڑنے لگی ہے۔ تبھی لگتا آوارہ گرد بھی سمٹنے لگی ہے۔ عجیب و غریب جزیرۂ ظلمات میں سلمان واحد کی ہمت قابلِ تحسین رہی۔ تنویمی عمل اور روحوں کے تبادلے کے واقعات پُراسرار تھے جس میں برائی کے مرتکب اسی پُراسراریت کی بھینٹ چڑھ گئے۔ نرسوں کا عظیم قاتل جو، زیرِ دام آیا تو قانون، وکیل اور حقوق کی بات کرنے لگا مگر ایسے قاتلوں کے لیے کیسا قانون؟ سو وہ بھی فلیک گیا۔ پھولوں کی دکان سے ہی قاتل مل گیا پنسل کے اشارے نے فلیمنگ کو چونکا دیا تھا۔ باقی فلیمنگ نے گل گزیدہ کو انجام دے کر پیٹریشیا کو پرپوزل دے دیا۔ خون کا بدلہ خون ہی ہوتا ہے۔ ڈیلن لاکروز نے مجرم سورسا کو بکاؤ عدالتوں میں گھسیٹنے کے بجائے خود ہی سزا دے دی۔ ایسے مجرم کے لیے یہی ہونا چاہیے۔ بے چاری غریب عوام آئے روز حاتم طائی کی طرح ناکردہ گناہوں کی سزا بھگتتی ہے اور بڑے بڑے مگرمچھوں پر کسی کو ہاتھ ڈالنے کی ہمت نہیں ہوتی۔ کہتے ہیں ایک بار دیکھا ہے یہ دیکھا جانے کیسا ہوگا پر ہم نے تو اس ملک کو لٹتے بار بار دیکھا ہے۔ شاید ایسی ہی اس ملک کی قسمت کی ریکھا ہے۔''

مانچسٹر آف پاکستان کے کھلاڑی سیف الرؤف کی بالنگ ''مارچ کا ڈائجسٹ دو تاریخ کو ملا۔ وڈے شاہ جی کو ڈرائیونگ سیٹ سنبھالنے پر مبارک باد اور اس سے بھی بڑھ کر زندگی کی نئی اننگز شروع کرنے کی بہت مبارک باد۔ عبادت کاظمی صاحب! آپ کے والد کے لیے ڈھیروں دعائیں۔ کاشف عبید کا چلتا پھرتا تبصرہ پڑھ کر پیارے یار شہزادہ کو ہسار کی رائے اور مشوروں سے سے بالکل متفق ہوں۔ عذرا ہاشمی صاحبہ! آپ کی رائے میرے لیے امتحان ہے انشاء اللہ پوری کرنے کی کوشش کروں گا۔ کہانیوں کا آغاز حسبِ معمول انگارے سے کیا۔ کافی رنگین و سنگین قسط تھی۔ آوارہ گرد میں پچھلی کچھ اقساط سے گجر مارکہ پنجابی فلموں کی جھلک نظر آنے لگی ہے۔ سرورق کا پہلا رنگ ایک نفسیاتی مریض کی ایذا رسانیوں کی عمدہ تحریر، پڑھ کر مزہ آیا۔ سلیم فاروقی کا دوسرا رنگ تو تیز رفتاری میں پاکستانی ٹیم کی بیٹنگ جیسا تھا۔ دھڑا دھڑ وکٹیں گر رہی تھیں اور ہم بے بسی سے محوِ حیرت تھے۔

ان قارئین کے اسمائے گرامی جن کے محبت نامے شاملِ اشاعت نہ ہو سکے۔

مرحا گل، دراب کلاں۔ شاکر لطیف، لاہور (آپ کی.... کہانیاں پاکباز اور عورت کا انتقام دونوں ناقابلِ اشاعت ہیں) بلقیس خان، واہ کینٹ۔ شفقت محمود، کھیوڑہ۔ ناصر علی، پشاور۔ سجاد علی شگری گلگت بلتستان۔ ایم اقبال، سینٹرل جیل میانوالی۔ احسان سحر، میانوالی۔ کاشف عبید کاوش، بنگرام۔

آپ کے پسندیدہ مصنف کے قلم کا یادگار شاہکار نامہ

محافظ

کاشف زبیر

مجاہدانہ زندگی جینے کا درانہ وار عزم رکھنے والے اپنے ارادے میں پختہ ہوں تو پھر کامیابیوں سے ضرور ہم کنار ہوتے ہیں۔ وہ ظلم و درندگی اور دہشت گردی کے پھیلائے جال کے خلاف مزاحمت کی مشعل کو ہمیشہ اپنے سینے میں روشن رکھتے ہیں ... دردمندی کے مقدس رشتے کے بغیر کوئی تخلیق کار... مزاحمت کار اور سرفروشانِ وطن انسانیت کے طوفان بدوش سمندر اور انسان کے مقدر سے رشتہ قائم نہیں کر سکتا... دردمندی کے جذبوں ... ضمیر کی پاسداری اور خودداری جیسے لوازمات کی بدولت اسے دشمنوں کے سامنے چٹان بنادیتی ہے ... جمالیاتی حسن و نظر رکھنے والی لڑکی کے نظریات اور ایک جاں باز مجاہد کے عملی کارنامے... یکجائی کے باوجود دونوں کے درمیان ہر طرح کے فاصلے حائل تھے۔

حق ناحق انصاف اور بے انصافی کے مابین جنگ اور کشمکش کے دلدوز مراحل سے گزرتی وطن کہانی

سعد نے رائفل سیدھی رکھی اور اپنے ساتھی باسط کی طرف دیکھا۔ پھر انگلیوں کے اشارے سے اسے آگے آنے کو کہا۔ باسط دبے قدموں آگے بڑھا۔ احاطہ بڑا تھا مگر اس کے درمیان میں کمرے چھوٹے چھوٹے اور الگ الگ بنے تھے یعنی ہر کمرا چاروں طرف سے دوسروں سے الگ تھا۔ مکان کی یہ ساخت عام طور سے دیکھنے میں نہیں آتی ہے۔ کمروں کے درمیان... چھوٹی گلیاں تھیں۔ سعد اور باسط کے ساتھ ان کے چار ساتھی اور تھے۔ اندر داخل ہونے والے اس اسپیشل یونٹ کا سربراہ وسیم تھا۔ ابھی تک کسی طرف سے مزاحمت نہیں ہوئی تھی مگر اندر کچھ افراد کی موجودگی یقینی تھی۔ سعد اور باسط ایک گلی میں تھے اور محتاط انداز میں آگے بڑھ رہے تھے۔ اچانک مکان کے کسی حصے سے تیز برسٹ مارا گیا اور پھر جوابی فائرنگ شروع ہوگئی۔ سعد اپنے ریڈیو پر پوچھ رہا تھا کہ کیا ہوا ہے مگر فائرنگ کے شور میں کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ سعد جس گلی میں تھا اس سے آگے والے کمرے کا دروازہ ایک دھماکے سے کھلا اور ایک آدمی ایک عورت کو اپنے آگے کیے ہوئے نمودار ہوا۔ اس کے ہاتھ میں دستی بم تھا اور اس نے پن دبا رکھی تھی۔ سعد اور باسط یہ دیکھتے ہی پیچھے ہونے لگے۔ سعد نے اسے حکم دیا۔

''عورت کو چھوڑ دو۔ ہتھیار پھینک دو۔''
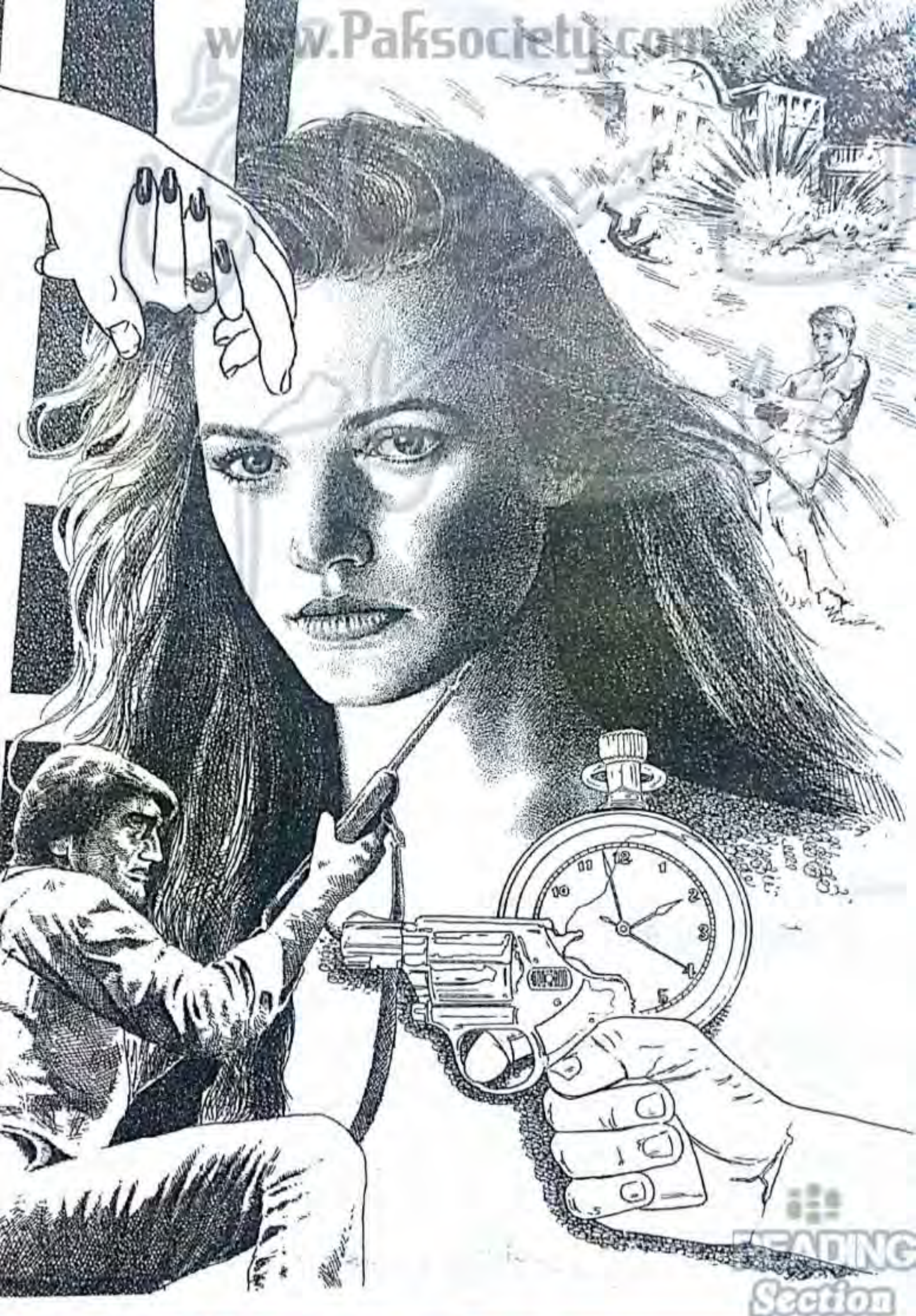
''کوئی میرے راستے میں نہ آئے۔'' آدمی نے چلّا کر کہا۔ ''ورنہ میں اس عورت کو ماردوں گا۔''

''خدا کے لیے مجھے اس سے بچاؤ۔'' عورت نے فریاد کی۔

سعد نے محسوس کیا کہ آدمی کے انداز میں دیوانگی تھی۔ وہ جو کہہ رہا تھا اس پر عمل بھی کر سکتا تھا۔ اس نے اپنی رائفل سنگل شاٹ پر کر لی تھی اور آدمی کے سر کا نشانہ لیا ہوا تھا مگر اس نے خود کو عورت کے پیچھے چھپایا ہوا تھا۔ سعد کے لیے صاف نشانہ لینا ممکن نہیں تھا۔ آس پاس سے ابھرنے والی فائرنگ کی تیز آوازیں اب مدھم پڑنے لگی تھیں۔ عورت کو پکڑے ہوئے آدمی نے یہ بات محسوس کر لی تھی اور شاید اسی وجہ سے اس نے یہ فیصلہ کیا۔ اچانک اس نے دستی بم والا ہاتھ اوپر کیا اور بم ان کی طرف اچھالنا چاہا مگر اس سے پہلے سعد کی رائفل سے شعلہ نکلا اور آدمی کے ہاتھ میں سوراخ ہو گیا۔ اسے جھٹکا لگا اور دستی بم اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر وہیں گر گیا۔ سعد اور باسط حرکت میں آئے اور پلٹ کر تیزی سے گلی کے سرے پر دائیں بائیں چلے گئے۔ اسی لمحے دھماکا ہوا اور بارودی و دھاتی ذرات کے ساتھ انسانی لوتھڑے گلی کے سرے پر آ کر گرے ...

چند منٹ بعد سعد، وسیم کے سامنے کھڑا ہوا تھا۔ وسیم سخت غصے میں تھا اور اس کا نشانہ سعد تھا۔ مکان میں چھ مسلح افراد تھے اور ایک یہ عورت تھی۔ سب ہی مارے گئے۔ وسیم کے خیال میں یہ سعد کی غفلت تھی جو عورت ماری گئی۔ دستی بم نے آدمی کے ساتھ اسے بھی موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ سعد نے صفائی پیش کی۔ ''سر میرا قصور نہیں ہے، اس نے دستی بم ہم پر پھینکنا چاہا تھا۔''

''شٹ اپ۔'' وسیم نے غرا کر کہا۔ ''میں تمہاری رپورٹ کروں گا بلکہ مجھے کرنا پڑے گی، اگر میں نہ چاہوں تب بھی۔''

کچھ دیر بعد وہ تمام معاملات پولیس کے حوالے کر کے اپنی گاڑی میں واپس جا رہے تھے۔ دفتر پہنچ کر لاکر روم میں اپنا اسلحہ، بلٹ پروف لباس اور جوتے رکھ کر اپنے عام کپڑوں میں آنے سے پہلے سعد نے شاور لیا۔ اسے معمولی سی خراشیں آئی تھیں۔ ان کی مرہم پٹی کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ اس کا سارا یونٹ اس آپریشن میں بہ خیریت واپس آیا تھا، مگر ایک ناکامی اس کے گلے پڑ گئی تھی۔ پولیس کو اطلاع ملی کہ دارالحکومت کے نزدیک ایک کچی بستی میں خطرناک مجرموں کا ایک گروہ موجود ہے جو اغوا برائے تاوان کی وارداتوں میں ملوث ہے۔ پولیس نے مکان کا محاصرہ کر لیا مگر خطرناک مجرموں کی موجودگی کی اطلاع پر اندر کارروائی کے لیے ایک اسپیشل یونٹ طلب کیا گیا۔ یونٹ اس لیے بھی طلب کیا گیا تھا کہ مکان میں کسی مغوی کی موجودگی کی اطلاع تھی۔ ان کا پہلا ٹاسک مغوی کو بہرصورت بچانا تھا اور وہ اسی میں ناکام رہے تھے۔

سعد شاور لے کر لاؤنج میں آیا تو وہاں سب موجود تھے اور ٹی وی دیکھ رہے تھے۔ ٹی وی رپورٹر اسی آپریشن کے بارے میں بتا رہا تھا اور خاص بات یہ تھی کہ اسے عورت کے مارے جانے کا علم بھی تھا۔ رپورٹر کے مطابق اسپیشل یونٹ کی غلطی سے مجرموں کو موقع ملا اور انہوں نے مکان میں موجود مغوی عورت کو مار دیا، کافی کا مگ تھامے وسیم نے طنزیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ ''ہمارے کارنامے کی جو اصل میں تمہارا کارنامہ ہے اس کی دھوم سارے ملک میں ہو چکی ہے۔ لگ رہا ہے اب سب کی شامت آئے گی۔''

سعد جانتا تھا کہ اس کے خلاف جو کارروائی ہونی ہے وہ ہو گی۔ لیکن ٹی وی رپورٹ کے بعد شاید پورے یونٹ کی شامت آئے گی۔ اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''میں اپنی رپورٹ بنا رہا ہوں اور اس کی مکمل ذمّے داری خود لے رہا ہوں۔ کسی کی شامت نہیں آئے گی۔''

وسیم کا موڈ خراب ہو گیا۔ ''رپورٹ بنانا تمہارا نہیں میرا کام ہے۔ اگر تمہیں ذمّے داری لینے کا شوق ہے تو غفور صاحب کے سامنے لینا۔''

سب ٹی وی دیکھ رہے تھے اور پھر وہ اچھل پڑے جب ٹی وی پر سعد کی تصویر نمودار ہوئی۔ آپریشن کی رپورٹ جاری تھی اور رپورٹر بتا رہا تھا کہ اسپیشل یونٹ کے اس رکن کی غلطی کی وجہ سے ایک بے گناہ عورت ماری گئی۔ باسط نے غصے سے کہا۔ ''یہ کیا بکواس ہے۔ ٹی وی پر اس طرح ہماری تشہیر ہوتی رہی تو ہم اپنا کام کر چکے۔''

''یہ پولیس والوں کی شرارت ہے۔'' متین نے کہا۔ ''وہاں کیمرے کہاں سے آ گئے؟''

وسیم کی پیشانی پر شکن آ گئی تھی۔ اس نے موبائل نکالا اور کسی کو کال کرنے لگا۔ کال کرتے ہوئے وہ اٹھ کر وہاں سے چلا گیا تھا۔ چند منٹ بعد آ کر اس نے حکم دیا۔ ''سب اپنے گھر جائیں اور تاحکمِ ثانی گھر پر رہیں۔''

''کیا ہمیں نظر بند کیا جا رہا ہے؟'' باسط نے پوچھا۔

''تقریباً۔'' وسیم نے سر ہلایا۔ ''تم لوگ صرف ہنگامی صورتِ حال میں باہر نکلو گے اور کوشش کرنا کہ خود کو

چھپا کر رکھو۔ ممکن ہے یونٹ کے باقی اراکین کی تصاویر بھی میڈیا تک پہنچ گئی ہوں۔ اس صورت میں ہمیں خود کو اسپیشل یونٹ سے فارغ سمجھنا چاہیے۔''

٭٭٭

فرحت ساکت بیٹھی تھی۔ وہ تقریباً چوبیس برس کی خوب صورت اور نازک اندام عورت تھی۔ وہ امید کے آخری دنوں سے تھی۔ ٹی وی کی وہ رپورٹ کب کی گزر چکی تھی اور اب دوسری خبریں پیش کی جارہی تھیں۔ مگر فرحت کی نظروں میں وہی رپورٹ اور سعد کی دکھائی جانے والی تصویر گھوم رہی تھی۔ سعد اسپیشل یونٹ کی یونیفارم میں تھا اور اس کا سر اور چہرہ ہیلمٹ اور شیشے کے کور سے ڈھکا ہوا تھا۔ اسے ہر کوئی شناخت نہیں کرسکتا تھا مگر فرحت اور اس کے قریبی جاننے والے اسے پہچان سکتے تھے۔ اگر اس کا نام بھی سامنے آجاتا تو اب تک پورے ملک کو علم ہو چکا ہوتا کہ سعد احمد اصل میں کیا کام کرتا ہے۔ سوائے چند قریبی عزیزوں اور دوستوں کے سب یہی جانتے تھے کہ سعد سرکاری محکمے میں کام کرتا ہے۔ ان میں محلے والے بھی شامل تھے جو سعد کی اصل حیثیت سے بے خبر تھے۔

سعد، فرحت کا شوہر تھا اور ایک سال پہلے ہی ان کی شادی ہوئی تھی۔ شادی کے ایک مہینے بعد بھی فرحت لاعلم تھی کہ اس کا شوہر سرکاری محکمے کے اسپیشل یونٹ کا ایک ممبر ہے اور اس کا کام خطرناک مجرموں اور دہشت گردوں سے دو بدو نمٹنا تھا۔ فرحت کے لیے یہ ایک شاک تھا۔ وہ تو سمجھتی تھی کہ اس کا شوہر دفتری نوعیت کی ڈیوٹی کرتا ہے۔ اگر اس کا مجرموں اور دہشت گردوں سے واسطہ پڑتا بھی ہوگا تو یہ صرف فائلوں کی حد تک ہوگا۔ اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ سعد خطرناک ہتھیاروں کا استعمال ایسے کرتا ہوگا جیسے وہ کچن میں اپنے برتن استعمال کرتی ہے۔ ان کی شادی ارینج میرج تھی۔ ہر اچھی مشرقی بیوی کی طرح شادی کے بعد فرحت، سعد سے محبت کرنے لگی تھی۔ مگر اس کے بارے میں جان کر اسے دھچکا لگا تھا اور وہ اب تک اس حقیقت کو ہضم نہیں کر پائی تھی۔ جب وہ سوچتی کہ سعد اصل میں کیا کرتا ہے تو اسے لگتا کہ وہ کسی ایسے شخص کے ساتھ رہ رہی ہے جسے وہ جانتی نہیں ہے۔

حقیقت سے واقف ہونے کے بعد کے چند مہینے بہت مشکل تھے اور شاید وہ سعد کو چھوڑ کر چلی جاتی مگر ان ہی دنوں وہ امید سے ہوگئی۔ یہ ساتواں مہینا تھا۔ سعد کا رویہ اس کے ساتھ بہت اچھا تھا۔ وہ اس کا مکمل خیال رکھتا تھا۔ اتفاق سے دونوں کا خاندان دوسرے شہر میں آباد تھا اور وہ ایک دوسرے کو جانتے تھے، اسی بنا پر سعد اور فرحت کا رشتہ ہوا تھا۔ رخصت ہونے کے بعد فرحت کچھ عرصے اپنے سسرال میں رہی تھی۔ اس وقت سعد ایک چھوٹے سے کمرے کے اپارٹمنٹ میں رہتا تھا۔ پھر اس نے یہ تین کمروں کا بڑا اپارٹمنٹ تلاش کیا۔ پوش ایریا میں ہونے کی وجہ سے اس کا کرایہ زیادہ تھا مگر سعد دے سکتا تھا اور وہ فرحت کو اچھی جگہ رکھنا چاہتا تھا اس لیے بھی اس نے یہ اپارٹمنٹ لے لیا۔

فرحت جہیز میں اچھا خاصا سامان لائی تھی اور اس سامان سے یہ اپارٹمنٹ سج گیا تھا۔ ڈرائنگ روم کے علاوہ دو بیڈ رومز تھے اور انہوں نے دوسرے بیڈ روم کو ٹی وی لاؤنج میں بدل دیا تھا۔ فرحت کو سارے کام خود کرنے کی عادت تھی اس لیے اس نے کوئی ملازمہ نہیں رکھی۔ دارالحکومت سرسبز علاقہ تھا اور یہاں دھول مٹی کم تھی۔ تیسرے فلور پر ویسے ہی گرد کم آتی ہے اس لیے ہفتے میں دو بار صفائی بھی کافی ہوتی تھی۔ دو ہی بار وہ واشنگ مشین لگا کر کپڑے دھو لیتی تھی۔ ویسے تو سعد کی ڈیوٹی کا کوئی وقت نہیں تھا، اسے آدھے گھنٹے کے نوٹس پر طلب کیا جاسکتا تھا مگر وہ معمول کے مطابق نائن ٹو فائیو جاب بھی کرتا تھا۔ فرحت صبح ناشتا بناتی اور ناشتے کے بعد سعد دفتر چلا جاتا۔

سعد نے محسوس کرلیا تھا کہ فرحت اس کی پیشہ ور حیثیت کو قبول نہیں کر پائی تھی۔ وہ بالکل مختلف حساس شخصیت کی مالک تھی۔ فرحت نے فائن آرٹس میں ماسٹر کیا تھا اور وہ بہت اچھی آرٹسٹ تھی۔ خاص طور سے پینٹنگ کرنے میں اسے کمال حاصل تھا۔ شاید اسی وجہ سے سعد کے پیشے کے خلاف تھی مگر دوسری طرف سعد کے لیے یہ پیشہ نہیں بلکہ مشن تھا۔ اسکول میں ہی اس نے فیصلہ کرلیا تھا کہ ملک و قوم کے دشمنوں سے لڑے گا۔ شعور میں آنے کے بعد اس نے اپنے اردگرد جاری دہشت گردی اور بدامنی کی لہر کو شدت سے محسوس کیا اور ساتھ ہی یہ بھی محسوس کیا کہ ملک کو اس سے بچانے کے لیے ہر فرد کو اپنا کردار ادا کرنا چاہیے۔ صرف چند افراد یا اداروں کی کوشش سے ملک سے یہ ناسور ختم نہیں ہوگا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے گریجویشن کے بعد پولیس میں شمولیت اختیار کی اور ٹریننگ کرکے ایس آئی بن گیا۔

مگر وہ اس ملازمت سے مطمئن نہیں تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ پولیس میں رہ کر وہ سب نہیں کر سکے گا جو وہ کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے جب سرکار نے اپنا اینٹی ٹیررسٹ اینڈ اسپیشل کرائم یونٹ بنانے کا فیصلہ کیا تو بہت سے دوسرے

حوصلہ مند افراد کی طرح سعد نے بھی اس میں شمولیت کی درخواست دے دی۔ تحریری ٹیسٹ میں وہ کامیاب رہا اور پھر انٹرویو میں بھی کامیابی حاصل کر کے اس اسپیشل یونٹ میں شمولیت کی راہ ہموار کر لی۔ ایک سال کی کڑی تربیت کے بعد اسے فیلڈ یونٹ میں تعینات کیا گیا۔ اس کا یونٹ دارالحکومت میں تھا۔ وسیم کی سربراہی میں اس یونٹ میں کل سولہ افراد تھے۔ مگر اراکین کی تعداد مشن کے لحاظ سے چنی جاتی تھی۔ اس لیے کچی آبادی آپریشن میں چھ افراد نے حصہ لیا تھا۔

ستائیس سال کا خوش شکل اور مضبوط جسامت کا سعد دو سال سے اسپیشل یونٹ کا حصہ تھا اور آج تک اس نے جتنے بھی آپریشنز میں حصہ لیا تھا، ان میں اس کی کارکردگی مثالی رہی تھی۔ ایک بار وہ زخمی بھی ہوا تھا جب اسے گولی لگی اور وہ ایک ہفتہ اسپتال میں داخل رہا تھا۔ اب یہ پہلا موقع تھا کہ اس پر حرف آیا تھا۔ سزا کے طور پر شاید اسے فیلڈ یونٹ سے ہٹا دیا جائے اور کوئی دفتری نوعیت کی ذمے داری دے دی جائے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ اسے واپس پولیس کے محکمے میں بھیج دیا جائے۔ مگر سعد اس پر استعفے کو ترجیح دیتا۔ ایک امکان یہ تھا کہ اسے ملازمت سے نکال دیا جائے۔ کچھ بھی ہوتا مگر اسے لگ رہا تھا کہ آنے والا وقت اس کے لیے مشکلات لے کر آنے والا ہے۔

سعد اور فرحت کے درمیان کشمکش سی جاری تھی۔ فرحت نے ایک دو بار اس سے بات کی اور اسے اندازہ ہو گیا کہ سعد کسی صورت اپنی جاب نہیں چھوڑے گا۔ دوسری طرف اس کے لیے ایسے آدمی کے ساتھ رہنا بہت مشکل تھا جو انسانوں پر گولیاں چلاتا تھا اور اس کے ہاتھوں یقیناً کئی افراد مارے جا چکے تھے۔ مگر اس موضوع پر ان دونوں کے درمیان کبھی بات نہیں ہوئی تھی۔ شادی کے ابتدائی دنوں میں جب ان کے درمیان دوری جنم لے رہی تھی تو سعد نے ماحول کو بدلنے کے لیے اسے جاب کی تجویز پیش کی۔ فرحت دن میں اکیلی اور بور ہوتی تھی اس لیے کسی قدر ہچکچاہٹ کے ساتھ وہ مان گئی۔ اس نے جاب کی تلاش شروع کی تو اسے اسکول میں آرٹ ٹیچر کی جاب کی پیشکش ہوئی۔ مگر اس نے انکار کر دیا۔ اسے معلوم تھا کہ اسکول میں ٹیچنگ بہت مشکل کام ہے۔

بالآخر اسے اس آئی ٹی انسٹی ٹیوٹ میں جاب مل گئی۔ جاب بھی آسان تھی۔ اسے گرافک آرٹس کے طالب علموں کو ہاتھ سے آرٹ کی تکنیک کے بارے میں پڑھانا اور عملی طور پر بتانا تھا۔ جاب یوں آسان تھی کہ اسے ہفتے میں صرف پانچ کلاسز لینا ہوتی تھیں اور ایک کلاس ایک سے ڈیڑھ گھنٹے کی ہوتی تھی۔ اس لیے اس نے توقع سے کم تنخواہ کے باوجود ہامی بھر لی۔ اسے بیس ہزار مل رہے تھے۔ بس اسٹاپ اپارٹمنٹ اور انسٹی ٹیوٹ دونوں سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ وہ آرام سے جاتی اور آتی تھی۔ اس کی توجہ بٹی تو سعد سے کشیدگی میں بھی کمی آئی تھی۔ اس کے باوجود وہ سمجھوتے کے لیے تیار نہیں تھی اور اس نے سوچنا شروع کر دیا تھا کہ مستقل بے چین رہنے سے بہتر ہے کہ اس مسئلے کا ایک ہی بار حل نکال لیا جائے۔ اس کے خیال میں ان دونوں کی جوڑی پھول اور آگ کا ملاپ تھا جس میں بالآخر پھول راکھ ہو جاتا ہے۔ وہ اس بارے میں سعد سے بات کرنا چاہتی تھی مگر ہمت نہیں کر پا رہی تھی اور جب اس نے ہمت کر لی تو اسے پتا چلا کہ وہ امید سے ہے۔

☆☆☆

کال بیل کے جواب میں فرحت نے دروازہ کھولا۔ اس کے تاثرات سے سعد نے بھانپ لیا کہ اس نے ٹی وی پر خبر دیکھ لی ہے۔ وہ اندر آیا اور فریج سے ٹھنڈے پانی کی بوتل نکالی۔ حالانکہ موسم خاصا سرد ہو چلا تھا مگر اس کی عادت تھی وہ پانی ٹھنڈا ہی پیتا تھا۔ فرحت کچن میں آ گئی۔ اس نے ڈنر تیار کر لیا تھا کچھ کام باقی تھا، وہ اسے نمٹانے لگی۔ چھ بجے باہر مکمل تاریکی چھا چکی تھی اور وہ سرما میں ڈنر جلدی کر لیتے تھے۔ کچھ دیر بعد وہ دونوں ڈنر ٹیبل پر تھے۔ سعد کا خیال تھا کہ فرحت خبر کے بارے میں بات کرے گی مگر اس کے بجائے اس نے کہا۔ ''میں امی ابو کے گھر جا رہی ہوں۔''

سعد چونکا۔ ''کب...... کیوں؟''

''پرسوں میری آخری کلاس ہے۔ میں نے چھٹی لے لی ہے۔ اس سے اگلے دن میں چلی جاؤں گی۔''

فرحت نے کیوں کا جواب نہیں دیا تھا۔ سعد نے پھر پوچھا۔ ''کیا امی نے بلایا ہے؟''

''نہیں، میں نے خود سوچا ہے۔''

''کیا یہ جلدی نہیں ہے؟''

''اس کے برعکس میں نے خاصی تاخیر سے فیصلہ کیا ہے۔'' فرحت کا لہجہ سرد ہو گیا تھا۔ ''شاید مجھے پہلے ہی یہ فیصلہ کر لینا چاہیے تھا۔''

''تم آج کے واقعے سے فرسٹریٹ ہو؟''

''ظاہر ہے۔'' فرحت کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ ''آج بھی سات افراد اپنی جان سے گئے۔''

''اس میں میرا یا کسی اور کا قصور نہیں ہے۔'' سعد نے ہاتھ روک لیا۔ ''یہ راستہ انہوں نے خود چُنا تھا۔''

''ایک انسان کسی صورت بھی اس قابل نہیں ہوتا ہے کہ اسے مار دیا جائے۔''

سعد نے اسے عجیب نظروں سے دیکھا۔ ''تم اپنی خیالی دنیا میں بہت آگے جا چکی ہو...... بہتر ہوگا......''

''بہتر ہوگا کہ اس موضوع کو یہیں ختم کر دیا جائے۔'' فرحت نے اس کی بات کاٹ کر کہا اور اس کے بعد باقی ڈنر خاموشی سے ہوا۔ سعد کچھ کہنا چاہتا تھا مگر کہہ نہیں پا رہا تھا۔ دوسری طرف فرحت کے تاثرات بتا رہے تھے کہ وہ اس موضوع پر مزید بات نہیں کرنا چاہتی۔ ڈنر کے بعد فرحت نے سعد کے لیے چائے بنائی۔ جب سے وہ امید سے ہوئی تھی اس نے چائے کافی کا استعمال ترک کر دیا تھا۔ وہ صرف دودھ اور جوسز وغیرہ لیتی تھی۔ اسے معلوم تھا وہ جتنی صحت بخش غذا استعمال کرے گی اس کے ہونے والے بے بی کے لیے یہ اتنا ہی اچھا ہوگا۔ سعد چائے لے کر ٹی وی لاؤنج میں آ گیا اور جب وہ بیڈ روم میں آیا تو فرحت سوٹ کیس کھولے اس میں کپڑے رکھ رہی تھی۔

☆☆☆

اس جنگ زدہ ملک کے حالات سدھرنے کے آثار دور دور تک نظر نہیں آ رہے تھے اور اس کی سب سے بڑی ذمّے داری اس ملک میں موجود متحارب گروپوں پر تھی جو آپس میں اپنے مفادات کی جنگ لڑ رہے تھے اور انہیں ملک اور اپنی قوم کا کوئی احساس نہیں تھا۔ یہاں کی افراتفری سے فائدہ اٹھا کر بین الاقوامی اور علاقائی طاقتیں بھی یہاں اپنا کھیل کھیل رہی تھیں اور ان میں ایک جنوبی ایشیا کی نام نہاد سیکولر ریاست بھی شامل تھی۔ اس جنگ زدہ ملک میں اس کے درجن سے بھی زیادہ قونصلیٹ تھے اور وہ مغربی طاقتوں کی چھتری تلے اپنے پڑوسی ملک کے خلاف پوری قوت سے تمام حربے استعمال کر رہی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ جب تک مغربی طاقتیں یہاں ہیں تب تک وہ یہاں کھل کر کام کر سکتا ہے، ان کے جاتے ہی اسے بھی اپنا بوریا بستر لپیٹنا ہوگا۔ اس لیے سرحد کے پاس قائم اس کے نام نہاد قونصل خانے پوری طرح سرگرم تھے۔

ایسے ہی ایک قونصل خانے میں کچھ دیر پہلے مغربی طاقتوں کا ایک سول نمائندہ ہو کر گیا تھا اور وہ یہاں کے انچارج ونود مکرجی سے ملنے اور اسے خبردار کرنے آیا تھا کہ اس کے ملک کی طرف سے ضرورت سے زیادہ ہاتھ پاؤں نکالے جا رہے ہیں۔ وہ انہیں سمیٹ لے ورنہ دوسری طرف سے بھی ایسا ہی کوئی جواب دیا جا سکتا ہے۔ مگر ونود بالکل بے فکر تھا۔ اسے اپنے بڑوں کی طرف سے فری ہینڈ ملا ہوا تھا اور انہوں نے مکرجی کو امورِ خارجہ کی فکر سے بالکل آزاد کر دیا تھا۔ مغربی نمائندے کے جانے کے بعد ونود اپنے دفتر میں موجود رہا اور کچھ دیر بعد ایک مقامی شخص اندر داخل ہوا۔ اس نے ہاتھ جوڑ کر مکرجی کو پرنام کیا۔ مکرجی نے جواب دیا اور آہستہ سے بولا۔

''شیرباز، بہتر ہے تم تنہائی میں بھی خیال رکھا کرو۔''

آنے والا مسکرایا۔ اس کا اصل نام گائیکر رشانی تھا وہ گزشتہ چھ سال سے یہاں تھا اور یہاں سب اسے شیرباز کے نام سے جانتے تھے۔ وہ تقریباً پینتیس برس کا سرد آنکھوں اور سخت چہرے والا آدمی تھا۔ جسامت عام سی تھی مگر اس کے ہاتھ مضبوط اور کلائیاں بھاری تھیں۔ شیرباز نے آہستہ سے کہا۔ ''میں جا رہا ہوں اور شاید واپسی نہ ہو سکے۔''

ونود کھڑا ہو گیا اور اس نے دونوں ہاتھ گائیکر کے شانوں پر رکھے۔ ''ہم سب دیش کے بھگت ہیں اور ہماری جانیں بھی دیش کے لیے ہیں۔''

''یہی سوچ کر میں یہاں آیا تھا۔'' گائیکر بالکل مقامی لہجے میں اردو بول رہا تھا۔ اس نے اتنی مشق کی تھی کہ اب وہ اسی کا عادی ہو گیا تھا۔ اس نے ونود سے اپنے مشن کے بارے میں کوئی بات نہیں کی کیونکہ اس لحاظ سے وہ غیر متعلق شخص تھا۔ وہ اس سے اس لیے ملنے آیا تھا کہ وہ اس کا استاد تھا۔ کچھ دیر بعد گائیکر باہر آیا اور ایک خستہ حال پرانے ماڈل کی کھلی جیپ میں بیٹھ کر وہاں سے روانہ ہو گیا۔ اس کے انداز سے یہ کہنا مشکل تھا کہ اس کی منزل کئی سو میل دور سرحد پار تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ نزدیک ہی کہیں جا رہا ہے مگر شام تک وہ سرحد بھی پار کر چکا تھا۔ اپنے جیسے چلنے والوں کے ایک ہجوم کے ساتھ وہ سرحد کے دوسری طرف آیا۔ اس نے چیک پوسٹ پر صرف اپنا نام اور قبیلے کا نام بتایا تھا۔ اس کا پاسپورٹ دیکھا گیا اور اسے جانے کی اجازت مل گئی۔ وہ سرحد سے ذرا فاصلے پر آیا۔ اسے معلوم تھا یہاں بہت سی آنکھیں آنے جانے والوں کو دیکھتی تھیں لیکن وہ آنکھیں ہزاروں افراد پر نظر نہیں رکھ سکتی تھیں۔

ایک بڑی کھلی پک اپ جو آدمیوں سے بھری ہوئی وہاں سے جا رہی تھی وہ لپک کر اس پر سوار ہو گیا۔ اس نے ایک راڈ تھام رکھی تھی اور اس کا ایک پاؤں ٹکا ہوا تھا۔ اسی

حالت میں اس نے مطالبہ کرنے والے کو شہر تک کا کرایہ ادا کیا مگر وہ شہر کے نواحی علاقے میں ہی چلتی پک اپ سے اتر گیا۔ اس نے ایک گندہ نالا کراس کیا اور غریب طبقے کی بستی میں داخل ہو گیا۔ وہ یوں اطمینان سے اور بنا کسی سے پوچھے جارہا تھا جیسے اسے اپنی منزل کا علم ہو اور وہ راستے بھی جانتا ہو۔ مختلف گلیوں سے گزرتا ہوا بالآخر وہ ایک چھوٹے سے احاطے کے سامنے پہنچا اور اس نے لکڑی کے دروازے سے لٹکتی زنجیر بجائی۔ ایک منٹ سے پہلے دروازہ کھل گیا۔ اندر ایک سفید داڑھی والا مقامی شخص کھڑا ہوا تھا، اس کی ایک آنکھ بالکل سفید ہو رہی تھی۔ اس کی بینائی جا چکی تھی۔ اپنی اکلوتی آنکھ سے گائیگر کو دیکھ کر اس نے راستہ چھوڑ دیا اور وہ اندر آتے ہوئے آہستہ سے بولا۔

''سورما آگیا؟''

بوڑھے نے پلٹ کر ایک کمرے کی طرف دیکھا۔ گائیگر اس کمرے میں داخل ہوا تو وہاں ایک تنومند اور باڈی بلڈر جیسے جسم والا شخص موجود تھا مگر اس کا رنگ اور نقوش اس علاقے کے لوگوں جیسے نہیں تھے۔ وہ سانولے رنگ اور بیٹھی ناک والا شخص تھا۔ موٹے ہونٹوں کے عقب میں سفید دانت بھیڑیے کا سا تاثر دے رہے تھے۔ گائیگر کو دیکھ کر اس نے صرف سر ہلایا اور کسی قسم کے خیر مقدمی جملے سے گریز کیا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ گائیگر کو پسند نہیں کرتا تھا اور یہ ناپسند دو طرفہ تھی کیونکہ گائیگر نے بھی اسے سرد نظروں سے دیکھا۔ ''تیاری مکمل ہے؟''

''ہاں۔'' سورما بولا۔ ''ہمیں ابھی یہاں سے جانا ہے۔''

گائیگر یہ بات جانتا تھا۔ وہ پلٹا اور کچھ دیر بعد وہ دونوں اس گھر سے نکل آئے تھے۔ ان کے عقب میں سفید آنکھ والا بوڑھا گھر کے صحن میں اس حال میں پڑا تھا کہ اس کی گردن ایک سو اسی ڈگری کے زاویے پر گھومی ہوئی تھی اور یہ سورما کی قوت کا کمال تھا۔ اس نے ایک جھٹکے میں بوڑھے کی گردن توڑ دی تھی۔ وہ لوگ اپنے پیچھے نشان اور گواہ چھوڑنے کے قائل نہیں تھے۔ بوڑھا عرصے سے اس جگہ ان کا ایجنٹ تھا مگر اب اس کی ضرورت نہیں رہی تھی اور وہ بیکار ہو جانے والی چیزوں اور انسانوں کو ضائع کر دیتے تھے۔ سورما کے ہاتھ میں ایک سوٹ کیس تھا۔ ایک سنسان جگہ دیکھ کر انہوں نے آگے روانہ ہونے سے پہلے لباس اور حلیہ بدلا۔ وہ اسی طرح پیدل چلتے ہوئے ایک سڑک تک آئے اور وہاں سے گزرنے والی اولین بس میں سوار ہو گئے مگر بس کا یہ سفر اگلے اسٹاپ تک تھا۔ وہ بس سے اتر کر ایک بڑی یلو کیب تک آئے اور اس میں بیٹھ گئے۔ ڈرائیور نے ان کے بیٹھتے ہی ٹیکسی آگے بڑھا دی تھی۔

☆☆☆

سعد کرسی پر بیٹھا ہوا ٹیبل ٹینس کی بال سامنے کارڈ بورڈ کی دیوار پر مار رہا تھا۔ بال میز پر ٹپا کھا کر واپس اس کے پاس آتی تھی۔ ہال میں مسلسل ٹک ٹک کی آواز ابھر رہی تھی۔ باسط ہینڈ فری لگا کر میوزک سن رہا تھا مگر باقی سب کے کان کھلے تھے۔ کچھ دیر بعد متین نے آ کر اس کے آگے ہاتھ جوڑے۔ ''خدا کے لیے اب یہ ٹک ٹک دماغ پر لگنے لگی ہے۔''

سعد نے افسوس سے اس کی طرف دیکھا۔ ''یہ حال ہے اسپیشل یونٹ کے ارکان کا، وہ ایک معمولی بال کی ٹک ٹک بھی برداشت نہیں کر سکتے تو عملی میدان میں گولیوں اور بموں کے دھماکے کیسے برداشت کریں گے۔''

''وہ کر سکتے ہیں۔'' اگلی میز پر بیٹھے یاسر نے کہا۔ ''لیکن یہ برداشت سے باہر ہے۔''

''اصل میں یہ شادی شدہ ہے اس لیے اس کی قوتِ برداشت بھی ہم سے زیادہ ہے۔''

سعد کا ہاتھ رک گیا تھا۔ وہ کچھ دیر ساکت بیٹھا رہا پھر جھٹکے سے اٹھ کر وہاں سے چلا گیا۔ متین نے حیرت سے کہا۔ ''اسے کیا ہوا؟''

''یار اس کے ساتھ مسئلہ چل رہا ہے۔'' باسط نے کہا۔ وہ سعد کے سب سے قریب تھا اس لیے جانتا تھا۔ ''بھابی اس کی جاب سے کمپرومائز نہیں کر پا رہی ہیں۔''

یاسر کو حیرت ہوئی تھی۔ اس نے کہا۔ ''بیویاں تو فخر کرتی ہیں۔''

''ہاں مگر کچھ الگ فطرت کی بھی ہوتی ہیں۔'' یاسر نے کہا۔ ''فرحت بھابی آرٹسٹ ہیں اور شاید اسی وجہ سے وہ سمجھوتا نہیں کر پا رہی ہیں۔''

سب باسط کے گرد جمع ہو گئے تھے مگر اس نے اس موضوع پر زیادہ بات کرنے سے انکار کر دیا۔ ''اتنا بھی میں نے اس لیے بتا دیا کہ ہم سب ایک فیملی کی طرح ہیں۔ مگر کسی کی ذاتیات میں ایک حد تک ہی دخل دیا جا سکتا ہے۔''

سعد لاکر روم میں تھا۔ اس نے اپنا لاکر کھول کر اندر سے اپنی رائفل اور دوسرے ہتھیار نکال لیے تھے اور میز پر سجا کر انہیں دیکھ رہا تھا۔ اسے انسانوں کو قتل کرنے کا شوق نہیں تھا اور نہ ہی وہ جنونی تھا۔ کئی مواقعوں پر اس نے صرف

مجرموں کو زندہ پکڑنے کے لیے اپنی جان تک خطرے میں ڈال دی تھی۔ وہ فرحت کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ وہ سمجھتی تھی کہ اس کا شوہر قتل کرنے کا شوقین تھا۔ تب ہی اس نے یہ جاب چنی تھی۔ وہ اسے چھوڑ کر جا رہی تھی۔ اگرچہ اس نے واضح نہیں کہا تھا مگر سعد سمجھ رہا تھا کہ اب وہ گئی تو شاید پھر کبھی واپس نہیں آئے گی۔ فرحت بہ ظاہر نازک اور حساس لڑکی تھی مگر سعد جانتا تھا وہ اتنی ہی مضبوط اور پختہ ارادے کی مالک بھی تھی۔ اگر وہ فیصلہ کر لیتی تو کوئی اس کا فیصلہ تبدیل نہیں کرا سکتا تھا۔ وہ بچہ بھی نہیں جو دو مہینے بعد اس دنیا میں آنے والا تھا۔ باسط لاکر روم میں آیا اور میز کے کنارے ٹک گیا۔

''کوئی نئی بات ہوئی ہے؟''

''بات پرانی ہے لیکن کل کے واقعے نے اسے ایک نیا رنگ دیا ہے۔'' سعد نے سرسری سے انداز میں کہا۔ ''پرسوں فرحت اپنے ماں باپ کے گھر جا رہی ہے۔''

باسط نے اسے تسلی دی۔ ''یار مشکل وقت آتے ہیں۔ لیکن گزر بھی جاتے ہیں۔''

''ہاں مگر بعض مشکلات ایسی ہوتی ہیں جو اتنی آسانی سے نہیں گزرتی ہیں۔ وہ اپنے اثرات چھوڑ جاتی ہیں۔''

باسط اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے سعد کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ ''میں سمجھ رہا ہوں۔ تمہارے لیے بہت مشکل ہے۔''

''مجھے افسوس اس بات کا نہیں ہے کہ فرحت مختلف فطرت کی عورت ہے۔ افسوس اس کا ہے کہ وہ مجھے غلط سمجھتی ہے جیسے میں کوئی قاتل ہوں اور قتل کر کے خوشی محسوس کرتا ہوں۔''

باسط کو بھی افسوس ہوا۔ ''اگر بھابی ایسا سمجھتی ہیں تو وہ تمہارے ساتھ زیادتی کر رہی ہیں۔ یہ ہماری جاب ہے اور ہم اسے پوری احتیاط سے نبھاتے ہیں۔ ہم میں سے کوئی بھی کسی کو مار کر خوشی محسوس نہیں کرتا ہے۔ ہم یہ مشکل کام اپنے ملک و قوم کی حفاظت کے لیے کرتے ہیں۔''

''فرحت یہ بات نہیں سمجھتی ہے۔'' سعد نے سرد آہ بھری۔

''آج شام کیا پروگرام ہے؟'' باسط نے موضوع بدل دیا۔

''کچھ نہیں۔'' سعد نے کہا۔ ''باس نے رپورٹ بنا دی ہے؟''

باسط مسکرایا۔ ''تم اسے جانتے ہو، وہ ذمے داری لینے والا شخص ہے اور وہ رپورٹ میں ذمے داری لے گا۔''

''مجھے یہ بات اچھی نہیں لگے گی۔'' سعد نے سنجیدگی سے کہا۔ ''دیکھا جائے تو میں نے غلط نہیں کیا مگر اس کا نتیجہ ایک غیر متعلق عورت کی موت کی صورت میں نکلا۔ کیا اس کے بارے میں پتا چلا ہے کہ وہ کون تھی؟''

''بدقسمتی سے دھماکے نے اس کا چہرہ متاثر کیا اور اب اس کی شناخت کے دوسرے طریقے اختیار کیے جا رہے ہیں۔''

سعد جانتا تھا کہ دوسرے طریقے سست تھے۔ شاید عورت کی شناخت سامنے آنے میں خاصا وقت لگ جائے۔ ٹی وی چینل کی لگام کھینچ دی گئی تھی اور یوں ایک اہم سرکاری اہلکار کا چہرہ دکھانے اور اس کے بارے میں بات کرنے پر اس کی نشریات پر ایک ہفتے کی پابندی لگائی گئی تھی۔ خوش قسمتی سے اس نے فرنٹ پر شیشے والا ہیلمٹ پہنا ہوا تھا اس لیے صرف قریبی لوگ ہی اسے شناخت کر سکتے تھے جو پہلے ہی اس کے بارے میں جانتے تھے۔ اب تک کسی غیر متعلق فرد نے اسے دیکھ کر شناخت کرنے کا دعویٰ نہیں کیا تھا۔ اسے امید تھی کہ اگر کسی نے دیکھا ہو تو چند دن بعد وہ بھی بھول جائے گا۔ باسط نے اسے شام باہر کھانے کے لیے کہا مگر اس نے معذرت کر لی۔

''پرسوں فرحت چلی جائے گی۔ میں یہ وقت زیادہ سے زیادہ اس کے ساتھ گزارنا چاہتا ہوں۔''

''چلو بھابی کے جانے کے بعد پروگرام رکھیں گے۔ بہت دن ہو گئے باہر ڈنر کیے ہوئے۔''

☆☆☆

فرحت لیڈی ڈاکٹر کے کلینک میں تھی۔ امید سے ہونے کے بعد وہ اسے ہی دکھا رہی تھی اور ہر دوسرے ہفتے اس کے پاس آتی تھی۔ لیڈی ڈاکٹر نے اس کا الٹرا ساؤنڈ کیا تھا اور وہ مطمئن تھی۔ اس نے فرحت سے کہا۔ ''بے بی بالکل ٹھیک ہے۔ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔''

''میں پرسوں جا رہی ہوں۔'' فرحت نے اسے بتایا۔ ''ڈلیوری امی کے ہاں ہی کراؤں گی۔''

''کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ تمہاری فائل مکمل ہے اور اس میں سب کچھ ہے۔ نہ بھی ہو تو کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ اچھا ہوا تم نے بتا دیا۔ بہتر ہوگا وہاں جاتے ہی کسی لیڈی ڈاکٹر سے رابطہ کرنا اور پھر اس کی ہدایت پر عمل کرنا۔ وش یو بیسٹ لک۔''

فرحت انسٹی ٹیوٹ سے کلینک آئی تھی۔ کلینک اس

کے اپارٹمنٹ سے ایک بلاک کے فاصلے پر بس اسٹاپ سے مخالف سمت میں تھا۔ وہ اپارٹمنٹ کی طرف روانہ ہوئی۔ راستے میں اسے ایک بے بی شاپ نظر آئی اور وہ غیر ارادی طور پر اندر داخل ہوگئی۔ وہاں چھوٹے بچوں کے لحاظ سے ہر چیز تھی۔ ان میں سے بیشتر چیزیں فرحت اور سعد لے چکے تھے۔ باقی ان کا ارادہ بچے کی پیدائش کے بعد لینے کا تھا۔ انہیں پہلے ہی معلوم ہوگیا تھا کہ آنے والا مہمان لڑکا ہے اس لیے اس کے لیے اسی لحاظ سے چیزیں لی گئی تھیں۔ فرحت کو اونی ٹوپیاں، سوٹ اور موزے نما جوتوں کا سیٹ پسند آیا۔ وہ شدید سرما میں دنیا میں آتا اور اسے اس کی ضرورت ہوتی اس لیے فرحت نے سیلز گرل سے یہ سیٹ نکالنے کو کہا۔ وہ مختلف ڈیزائن اور رنگوں میں سیٹ لے آئی اور فرحت اس میں سے پسند کرنے لگی۔ اسے نیلے رنگ کا سیٹ پسند آیا۔ مگر جب اس نے ادائیگی کے لیے پرس کھولا تو ایک ہاتھ آگے آیا جس میں قیمت کے لحاظ سے نوٹ تھے۔ اس نے چونک کر دیکھا تو سعد اس کے پاس کھڑا تھا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔

''میں ادائیگی کررہی ہوں۔''

''ایک ہی بات ہے۔'' سعد نے نوٹ کاؤنٹر پر رکھ کر شاپر اٹھالیا۔ وہ دونوں باہر آئے۔ دو رویہ سڑک کے وسط میں لگے درختوں کے پتے خزاں رسیدہ ہوکر جھڑ رہے تھے۔ درختوں نے اورنج رنگ اختیار کرلیا تھا۔ سعد نے بے ساختہ کہا۔

''خوب صورت موسم ہے۔''

''آپ کو خزاں خوب صورت لگتی ہے؟''

''ہاں کیونکہ اس کی اپنی الگ خوب صورتی ہوتی ہے۔'' سعد نے کہا۔

''خزاں زوال اور خاتمے کی نشانی ہے۔''

سعد نے اس کی طرف دیکھا۔ ''تم آرٹسٹ ہوکر یہ بات کررہی ہو۔ خزاں آنے والی بہار کا آغاز ہوتی ہے جب پرانے پتے جھڑ جاتے ہیں اور ان کی جگہ نئے پتے آتے ہیں۔ اگر خزاں نہ آئے تو بہار بھی نہیں آئے گی۔''

فرحت نے جواب نہیں دیا۔ شاید وہ اس سے متفق نہیں تھی۔ وہ اپارٹمنٹ تک آئے۔ یہاں لفٹ تھی اور اس وجہ سے فرحت سیڑھیوں کی زحمت سے بچ گئی تھی۔ اس حالت میں تیسری منزل پر چڑھنا اور اترنا آسان نہیں تھا جبکہ گراؤنڈ فلور پر پارکنگ تھی اور اپارٹمنٹ فرسٹ فلور سے شروع ہورہے تھے۔ دفتر سے آتے ہوئے سعد نے فرحت کو بے بی شاپ میں داخل ہوتے دیکھ لیا تھا۔ وہ گاڑی اپارٹمنٹ کی پارکنگ میں چھوڑ کر پیدل واپس آیا تھا۔ فرحت کو ان دنوں واک کی ضرورت تھی اور وہ اس طرح سے یونیورسٹی آتے جاتے واک کرلیتی تھی۔ لفٹ میں اور اوپر آتے ہوئے ان کا سامنا پڑوسیوں سے ہوا تو وہ ان کے سامنے اچھے میاں بیوی بن گئے۔ مگر گھر میں آتے ہی ان کے چہرے پھر سے سپاٹ ہوگئے تھے۔ فرحت نے کچن کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ ''میں اپنے لیے شیک بناتے جارہی ہوں آپ کے لیے چائے بناؤں؟''

''ہاں تم بنا دو جب تک میں شاور لے لوں۔'' سعد نے اندر جاتے ہوئے کہا۔ آج چھٹی سے پہلے وسیم نے سب کو طلب کرلیا تھا۔ اس نے محکمے کی طرف سے آنے والا ایک وارننگ لیٹر دکھایا اور اپنے یونٹ کو دوسرے درجے کا اسٹینڈ بائی رہنے کا حکم دیا۔ اس حکم کے بعد وہ شہر سے باہر نہیں جا سکتے تھے اور انہیں پندرہ منٹ کے نوٹس پر طلب کیا جاسکتا تھا۔ وارننگ لیٹر کے مطابق کچھ تخریب کار اور دہشت گردوں کے دارالحکومت میں داخل ہونے کی اطلاع تھی اور اسپیشل یونٹ کو کسی بھی ہنگامی موقع پر آدھے گھنٹے میں حرکت میں آجانا تھا۔ رات سونے سے پہلے جب اس نے موبائل اپنے پاس ہی رکھا تو فرحت سمجھ گئی۔ اس نے پوچھا۔

''کوئی ہنگامی صورتِ حال ہے؟''

''ہاں، مجھے طلب کرنے پر پندرہ منٹ میں دفتر پہنچ جانا ہوگا۔''

نصف رات کے قریب اچانک ہی موبائل نے بیل دی اور اس نے گہری نیند سے چونک کر کال ریسیو کی۔ دوسری طرف سے حکم ملتے ہی وہ حرکت میں آگیا تھا۔ وہ اٹھا تھا کہ فرحت کی آنکھ کھل گئی۔ وہ اسے دیکھتی رہی پھر آہستہ سے کہا۔ ''آپ جارہے ہیں؟''

''ہاں کال آئی ہے۔'' اس نے الماری سے جیکٹ نکالتے ہوئے کہا اور باہر آگیا۔ اس نے کی ہولڈر سے چابیوں کا گچھا اٹھایا اور اپارٹمنٹ سے نکل کر دروازہ لاک کردیا۔ پارکنگ سے گاڑی نکال کر وہ تیز رفتاری سے دفتر کی طرف روانہ ہوگیا۔ کال کرنے والا وسیم تھا اور اس نے اسے فوری دفتر پہنچنے کا حکم دیا تھا۔

☆☆☆

گائیگر اور سورما دارالحکومت میں داخل ہوئے تو رات کے بارہ بج چکے تھے۔ ٹیکسی ڈرائیور نے ٹیکسی کا رخ ایک متوسط طبقے کی آبادی کی طرف موڑ دیا۔ مگر ٹیکسی جس چھوٹی سی کوٹھی کے سامنے رکی وہ آبادی سے ذرا دور تھی۔ کوٹھی

نامکمل تھی اور اس کی بیرونی دیواروں کا پلاستر بھی نہیں ہوا تھا۔ البتہ اس کے گرد چار دیواری اور فرنٹ پر مضبوط فولادی گیٹ موجود تھا۔ ہارن پر گیٹ کھلا اور ٹیکسی اندر داخل ہو گئی۔ احاطے میں جابجا تعمیراتی ملبا بکھرا ہوا تھا اور یہاں بجلی بھی نہیں تھی کیونکہ اندر مٹی کے تیل کے لیمپ روشن تھے۔ گیٹ کھولنے والا ایک باریش نوجوان تھا۔ اندر اسی کی طرح باریش اور شلوار قمیص والے تین نوجوان اور تھے۔ وہ گرم جوشی سے گانگیر، سورما اور ٹیکسی ڈرائیور سے ملے جس کا نام بیدار شاہ لیا جا رہا تھا۔ مگر وہ سورما اور شیر باز کا ہم وطن تھا اور اس کا اصل نام بدری دیو وندر تھا۔ البتہ باقی چار نوجوان مقامی تھے اور وہ پہلی بار ان سے مل رہے تھے مگر ان کے انداز سے لگ رہا تھا کہ انہیں شیر باز اینڈ پارٹی سے متعارف کرا دیا گیا تھا۔ گیٹ کھولنے والے نوجوان اسلم حمید نے گرم جوشی سے کہا۔

''برادر ہم شکر گزار ہیں کہ تم لوگ اتنی دور سے ہماری مدد کو آئے ہو۔''

''کیونکہ ہمارا مقصد ایک ہے۔'' گانگیر نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''اپنے دشمنوں کو زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچانا۔''

وہ کوٹھی کے ایک کمرے میں آئے جسے کسی قدر صاف کر کے رہائش کے قابل بنا لیا گیا تھا۔ ایک لیمپ اس کمرے میں بھی روشن تھا۔ وہاں دیوار کے ساتھ اسلحہ یوں سجا ہوا تھا جیسے زیرِ تعمیر مکان میں اوزار رکھے گئے ہوں۔ ان کے پاس پستولوں سے لے کر خودکار رائفلیں اور مہلک شاٹ گنوں کے ساتھ ہینڈ گرینیڈ اور بارودی اسٹکس بھی تھیں۔ ان کو اڑانے کے لیے ڈیٹونیٹر اور بیٹریاں بھی تھیں۔ گانگیر نے دلچسپی سے ان سب چیزوں کو دیکھا اور معنی خیز انداز میں بولا۔ ''تیاری واقعی مکمل ہے۔''

''منصوبہ کیا ہے؟'' اسلم کے ساتھی نعیم نے پوچھا۔

گانگیر نے ایک بڑا نقشہ نکال کر فرش پر پھیلایا اور لیمپ اس کے نزدیک لے آیا۔ نقشہ ایک بڑے احاطے کا تھا۔ اس میں عمارتیں تھیں، میدان تھے اور باغ تھے۔ گانگیر نے ایک لکیر کی طرف اشارہ کیا۔ ''ہم یہاں سے اندر داخل ہوں گے۔''

اسلم اور اس کے ساتھی دلچسپی سے نقشہ دیکھ رہے تھے۔ ایک نے پوچھا۔ ''یہ کیا ہے؟''

''برساتی نالا ہے۔ اسے محفوظ بنانے کی کوشش کی گئی ہے مگر ہمارے لیے مسئلہ نہیں ہے۔'' گانگیر نے کہا۔ ''ہم یہاں سے اس کا دھاتی جال کاٹ کر اندر آئیں گے اور اس جگہ سے باہر نکلیں گے۔'' اس نے ایک باغ پر انگلی رکھی۔ اس کے سامنے وہ عمارت ہے جس میں ہمیں جانا ہے۔ یہی ہمارا اصل نشانہ ہے۔''

گانگیر نے احاطے کی مرکزی عمارت کی طرف اشارہ کیا۔ چاروں مقامی نوجوان نقشے کو غور سے دیکھ رہے تھے۔ ابھی وہ بتا رہا تھا کہ سورما اندر آیا اور اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''کچھ گاڑیاں ادھر آ رہی ہیں، سب تیار ہو جائیں۔''

سورما کے اعلان نے سنسنی پھیلا دی تھی۔ انہوں نے تیزی سے ہتھیار اٹھانے شروع کر دیے۔

☆☆☆

سعد اور اس کے ساتھی تیزی سے تیار ہو رہے تھے۔ مشکل سے پانچ منٹ میں وہ مکمل ڈریس آپ ہو چکے تھے اور اپنے ہتھیار سنبھال چکے تھے۔ تیار ہوتے ہی وہ تیزی سے باہر آئے جہاں ایک بڑے سائز کی بند وین ان کی منتظر تھی۔ ایک درجن افراد اس کے پچھلے حصے میں آ گئے۔ وین نکلی تو اس کے ساتھ دو گاڑیاں اور تھیں۔ وین میں وسیم بھی تھا۔ سعد نے اس سے پوچھا۔ ''مشن کیا ہے سر؟''

''دارالحکومت کی ایک عمارت میں دہشت گردوں کی موجودگی کی اطلاع ہے۔'' وسیم نے اپنا پستول چیک کرتے ہوئے کہا۔ ''پولیس علاقے کا محاصرہ کر رہی ہے اور ہمیں عمارت میں کارروائی کرنی ہے۔''

بیس منٹ بعد اسپیشل یونٹ کی گاڑیاں ایک زیرِ تعمیر مکان کے سامنے رکیں۔ کوٹھی کا احاطہ مکمل تھا اور اس پر گیٹ بھی لگا ہوا تھا۔ وین کا دروازہ کھلتے ہی اسپیشل یونٹ کے ارکان نکل کر کوٹھی کے احاطے کے ساتھ پھیلنے لگے۔ سعد اور باسط آگے تھے، انہوں نے فولادی گیٹ چیک کیا، وہ اندر سے بند تھا۔ یہ خاصا مضبوط فولادی دروازہ تھا۔ باسط نے سعد کو اشارہ کیا تو اس نے ہتھوڑی اور چھینی سنبھالی۔ باسط آگے آیا اور ایک درمیانے سائز کی باڈی اسپرے جیسی بوتل نکال کر خلا سے اندر موجود کنڈی کی سلاخ پر اسپرے کرنے لگا۔ یہ مائع نائیٹروجن تھی جو منفی ایک سو اسی ڈگری سینٹی گریڈ پر مائع ہو جاتی ہے۔ اس نے دس سیکنڈ اسپرے کیا اور پیچھے ہٹ گیا۔ سعد نے چھینی سلاخ پر رکھ کر ہتھوڑی ماری اور سلاخ ہلکی کی آواز سے ٹوٹ گئی۔ مائع نائیٹروجن نے دھات کی لچک ختم کر کے اسے سخت کر دیا اور وہ ایک ہی چوٹ میں ٹوٹ گئی۔ دروازہ کھلتے ہی وہ اندر گھسے تھے اور فوراً ہی عمارت کی طرف سے فائر آیا تھا۔

اسپیشل یونٹ کے ارکان تیزی سے پھیلنے لگے۔ وہ مختلف آڑ سے اندر کی سمت جوابی فائرنگ کر رہے تھے۔ پھر کوٹھی کی عقبی دیوار دھماکا خیز مواد سے گرا کر اسپیشل یونٹ کے دوسرے افراد اندر داخل ہوئے اور شدید مقابلے کے بعد بالآخر انہوں نے اندر موجود نصف درجن سے زیادہ افراد کو ہلاک اور شدید زخمی کر دیا۔ اسپیشل یونٹ کے ایک فرد ماجد کو گولی لگی تھی اور اسے ابتدائی طبّی امداد کے بعد اسپتال روانہ کر دیا گیا تھا۔ اندر موجود افراد میں سے چار مارے گئے تھے اور تین شدید زخمی تھے۔ بے شمار اسلحہ اور بارودی مواد برآمد ہوا تھا۔ وسیم اور اس کے ساتھی مارے جانے والے چار افراد کا معائنہ کر رہے تھے۔ ان کے پاس سے کسی قسم کی کوئی شناختی دستاویز برآمد نہیں ہوئی تھی۔ ان کے پاس موبائل تھے مگر انہوں نے سارے موبائل ایک دستی بم کے ساتھ رکھ کر تباہ کر دیے تھے۔ وسیم نے کہا۔

''یہ مقامی لگ رہے ہیں۔ ان کے فنگر پرنٹس اور تصاویر ریکارڈ چیک کرنے کے لیے بھیجنا ہوگا۔''

اب باقی کام پولیس کا تھا اور مشکل سے ڈیڑھ گھنٹے بعد وہ واپس جا رہے تھے۔ صبح کے چار بجے تک سعد واپس اپارٹمنٹ پہنچ گیا تھا اور جب وہ فرحت کے برابر میں لیٹا تو اس نے کروٹ لے کر اس سے رخ پھیر لیا تھا۔ سعد تھکا ہوا تھا مگر اسے خاصی دیر سے نیند آئی۔ صبح اس کی آنکھ کھلی تو فرحت بیڈ پر نہیں تھی۔ وہ واش روم میں تھی۔ اس نے گھڑی دیکھی دس بج چکے تھے۔ سعد نے کروٹ لے کر ریموٹ اٹھایا اور بیڈ روم میں موجود چھوٹا ایل ای ڈی ٹی وی آن کر دیا۔ اس کی توقع کے عین مطابق رات کے آپریشن کے بارے میں خبر مختلف چینلز سے آ رہی تھی۔ خبر مکمل طور پر پولیس اور وزارت داخلہ کی طرف سے جاری ہوئی تھی اور مارے جانے والے افراد کی فوٹیج بھی انہوں نے ہی جاری کی تھی۔ تصویروں کے ساتھ عوام سے اپیل بھی تھی کہ اگر وہ ان کے بارے میں کچھ جانتے ہیں تو حکومت کو اطلاع کریں۔

زخمیوں کو سخت پہرے میں اسپتال میں رکھا گیا تھا اور فی الحال ان کی حالت ایسی نہیں تھی کہ ان سے کسی قسم کی تفتیش کی جاتی ...... سرکار کے بیان کے مطابق اس آپریشن میں اس کے اسپیشل یونٹ نے حصہ لیا تھا اور اصل آپریشن اسی یونٹ نے کامیابی سے مکمل کیا۔ آپریشن کے دوران یونٹ کا ایک رکن زخمی ہوا تھا مگر اس کی حالت خطرے سے باہر تھی۔ ماجد کا نام یا تصویر نہیں آئی تھی۔ ایک چینل پر پابندی نے میڈیا کو محتاط کر دیا تھا اور اس لیے پھر کسی نے غیر ذمّے داری کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ سعد خبر دیکھ رہا تھا کہ وہ واش روم سے فرحت باہر آئی اور اس نے تھکی آواز میں کہا۔ ''پلیز اسے بند کر دیں، میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔''

سعد نے ٹی وی آف کر دیا اور فکر مندی سے بولا۔ ''کوئی مسئلہ ہے؟''

''نہیں میں سستی اور تھکن محسوس کر رہی ہوں۔''

''تم آرام کرو۔ میں ناشتا بناتا ہوں۔'' سعد نے اٹھ کر واش روم کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ بیس منٹ بعد وہ ٹرے میں ناشتا سجائے بیڈ روم میں آیا تو فرحت اپنی اسکیچ بک میں پنسل سے ایک بچے کا چہرہ بنا رہی تھی جو چہرے پر مسکراہٹ اور شوخی سجائے اسے دیکھ رہا تھا۔ سعد نے ٹرے رکھ کر اسکیچ بک دیکھی۔ ''ہمارا بیٹا ایسا ہی ہوگا انشاءاللہ۔''

''میں اسے آرٹسٹ بناؤں گی۔'' فرحت نے اسکیچ مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''وہ کیا بنے گا یہ تو اس پر منحصر ہوگا۔''

فرحت نے اسکیچ بک اور پنسل سائڈ دراز پر رکھ دی۔ ''بچہ وہ بنتا جس کا گھر میں اسے ماحول دیا جائے اور میں اسے ماحول دوں گی۔''

''آرٹسٹ ہونا بُری بات نہیں ہے مگر فی الحال اس ملک کو ایسے جوانوں کی ضرورت ہے جو اس کا مضبوط بازو بنیں اور اس کی طرف بڑھنے والے ہر دشمن ہاتھ کو توڑ دیں۔''

''ہمیں امن اور امن سے پیار کرنے والوں کی ضرورت ہے۔''

''ہم پُرامن اور امن سے پیار کرنے والے لوگ ہی ہیں۔'' سعد نے یقین سے کہا۔ ''مگر بدقسمتی سے ہم کچھ ایسی الجھنوں میں پڑ گئے ہیں جن سے نکلنا زیادہ مشکل نہیں ہے۔ اگر ہمارے حکمران یکسو ہو جائیں اور وہ بڑی حد تک ہو چکے ہیں تو ان سے نمٹنا زیادہ مشکل نہیں ہے۔ اصل مسئلہ ہمارے وہ ازلی دشمن اور حریف ہیں جو اس صورت حال کا فائدہ اٹھا رہے ہیں اور وہ مسلسل ہمارے داخلی معاملات میں مداخلت کر رہے ہیں۔''

فرحت اس سے متفق نہیں تھی۔ ''تشدد کو کبھی تشدد سے ختم نہیں کیا جا سکتا۔''

''تم ٹھیک کہہ رہی ہو مگر جوابی قوت کا استعمال ہی دشمن کو امن کی طرف لاتا ہے۔''

فرحت نے ناشتا مکمل کیا تو سعد اپنے لیے چائے بنانے چلا گیا۔ آج اس کی آف تھی۔ رات کے وقت کسی قسم کی ڈیوٹی کے بعد اگلا دن آف شمار ہوتا تھا بہ شرط کہ کوئی اور ایمرجنسی نہ پیش آئے۔ اس نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ سارا دن آرام کرے گا۔ چائے لے کر وہ ٹی وی لاؤنج میں آیا اور ایک طرف رکھا ہوا لیپ ٹاپ اٹھالیا۔ وہ سرچنگ اور براؤزنگ کر رہا تھا کہ باسط کی کال آئی۔ وہ دفتر میں تھا اور اس نے بتایا کہ مارے جانے اور گرفتار ہونے والے افراد خطرناک قسم کے دہشت گرد تھے اور وہ کسی بڑی کارروائی کا منصوبہ بنا کر اس ویران کوٹھی میں رہ رہے تھے۔ انہوں نے کوٹھی کے چوکیدار کو پہلے رقم کے عوض خریدا تھا اور جب اس پر ان کی اصلیت کھلی تو انہوں نے اسے مار کر وہیں کوٹھی میں دفن کر دیا تھا۔ وہاں سے کچھ نقشے اور ایسی چیزیں ملی تھیں جن سے حملے کے لیے چنے مقامات کی نشان دہی ہو رہی تھی اور ان میں کچھ تعلیمی ادارے بھی شامل تھے۔

سعد سوچ رہا تھا کہ وہ کیسے لوگ ہیں جو اپنی ہی نسل کو ختم کرنے پر تلے ہوئے تھے اور ان دشمنوں سے ہاتھ ملا رہے تھے جن کی دشمنی روزِ روشن کی طرح واضح تھی۔ جنہوں نے یہ کہہ کر ہتھیار اٹھائے تھے کہ حکمران دشمنوں سے مل گئے ہیں اور اب وہ ان ہی دشمنوں کی مدد سے اس ملک و قوم کی جڑیں کھوکھلی کر رہے تھے۔ ان کے پاس کیا جواز تھا سعد جیسا شخص بھی اس کا اندازہ نہیں کر سکتا تھا جس کا آئے دن ان لوگوں سے واسطہ پڑتا تھا۔ دوسری بار بیل بجی تو وہ چونکا اور اس نے موبائل دیکھا۔ وسیم کال کر رہا تھا۔ اس نے کال ریسیو کی تو وسیم نے کہا۔ ”ایک بجے غفور احمد صاحب نے تمہیں طلب کیا ہے۔“

”میں پہنچ جاؤں گا۔“ سعد نے کہا اور کال کاٹ دی۔ بارہ بجے اٹھ کر سعد نے تیاری شروع کی تو آرام کرتی فرحت نے پوچھا۔

”آج تو چھٹی ہونی چاہیے؟“

”ہاں چھٹی ہے لیکن غفور صاحب نے بلایا ہے۔“

فرحت نے اسے غور سے دیکھا۔ ”وہی ماری جانے والی عورت کا معاملہ ہے۔“

”شاید۔“ سعد نے سر ہلایا۔ ”امکان ہے کہ مجھ پر چارج لگے گا اور ہو سکتا ہے کہ تمہاری خواہش یوں پوری ہو جائے۔“

فرحت کچھ کہنا چاہتی تھی مگر سعد باہر نکل گیا تھا۔ وہ گہری سانس لے کر رہ گئی۔ اس کی کلاس تین سے چار بجے تک ہوتی تھی اور وہ ڈھائی بجے گھر سے نکل جاتی تھی۔ وہ اٹھ کر کچن میں آئی۔ اس نے اپنے لیے چند سینڈوچز تیار کیے۔ اسے بھوک نہیں تھی لیکن انسٹی ٹیوٹ میں اسے لازمی بھوک لگتی۔ اگرچہ وہاں کیفے ٹیریا تھا مگر فرحت اپنے ہاتھ کی بنی چیز کھانا پسند کرتی تھی۔ اس نے سینڈوچز ایک شاپر میں لپیٹ کر اپنے بڑے سائز کے ہینڈ بیگ میں رکھ لیے اور جانے کی تیاری کرنے لگی۔

☆☆☆

غفور احمد اسپیشل یونٹ کے انچارج تھے اور وہی اس یونٹ کے خالق بھی تھے۔ ان کا شمار بیوروکریسی کے محنتی اور قابل افسران میں ہوتا تھا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھے جو اچھی حکومتوں میں استعمال کیے جاتے تھے اور کرپٹ حکمران انہیں ایک طرف بٹھا دیتے تھے۔ صلہ انہیں کسی سے نہیں ملتا تھا اور وہ اپنی مدتِ ملازمت پوری کر کے رخصت ہو جاتے تھے۔ آج صبح تک انہیں ایک بڑے مسئلے کا سامنا تھا کہ اسپیشل یونٹ کے آپریشن میں ماری جانے والی عورت کے کیس پر کیا ایکشن لیں۔ جب انہوں نے یہ یونٹ تشکیل دیا تب ہی سے بہت سے محکمے اور ان کے ذاتی حریف ان کی ٹانگ کھینچنے میں مصروف تھے۔ اسپیشل یونٹ نے مختصر عرصے میں اپنی افادیت ثابت کر دی تھی اور ان کے حریف اب تک کوئی ایسا نقطہ تلاش نہیں کر سکے تھے جسے ان کے خلاف استعمال کر سکتے۔ مگر یہ نقطہ اب مل گیا تھا۔ وزیر صاحب جو اب تک غفور صاحب کے مداح رہے تھے کل کی میٹنگ میں ان کا لہجہ بدلا ہوا تھا اور انہوں پوچھا تھا کہ غفور صاحب نے اس غفلت کے ذمے دار اہلکار کے خلاف کیا کارروائی کی تھی۔

دوسرا مسئلہ صبح دفتر روانگی سے پہلے سامنے آیا۔ شامیرا عرف شمی ان کی اکلوتی بیٹی تھی اس کے علاوہ چھ بیٹے تھے۔ اس لیے شمی کی اہمیت واضح تھی۔ شمی گرافک اینڈ اینی میشن کے ڈگری پروگرام میں داخل تھی۔ مگر کچھ عرصے سے آرٹ کی اضافی کلاسز لے رہی تھی۔ اس کے خیال میں اس نے اتنا کچھ سیکھ لیا تھا کہ اب وہ خود پینٹنگ کر سکتی تھی اور اس کا مطالبہ تھا کہ اسے گھر میں اسٹوڈیو بنا کر دیا جائے۔ غفور صاحب کو کوئی اعتراض نہیں تھا مگر شمی کی ماں اور بھائیوں کو اعتراض تھا۔ ناشتے کی میز پر یہ مسئلہ وجۂ فساد بنا تھا اور انہیں لگ رہا تھا کہ رات کا ڈنر بھی اسی کی نذر ہو جائے گا۔ دفتر آنے کے بعد انہوں نے مسئلہ ذہن سے جھٹک دیا اور وسیم کی بھیجی رپورٹ کا معائنہ کیا۔ اگرچہ وسیم نے ذمے داری

قبول کی تھی مگر رپورٹ کے مطالعے سے انہیں اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ عملی غفلت کس کی تھی؟ انہوں نے وسیم سے کہا کہ وہ سعد کے ساتھ ایک بجے ان کے دفتر میں ان سے ملے۔ ایک بجے وہ دونوں غفور صاحب کے سامنے تھے۔

سعد نے ان کے تیکھے سوالوں کے جوابات سکون سے دیے۔ اس نے تسلیم کیا کہ ایک غیر متعلق عورت ماری گئی تھی مگر اس نے وہی کیا جو اس صورتِ حال میں اسے کرنا چاہیے تھا۔ اسپیشل یونٹ کے ارکان کی بنیادی تربیت میں شامل تھا کہ پہلے اپنی حفاظت یقینی بنائیں۔ اس نے اسی اصول پر عمل کیا تھا۔ اگر دستی بم ان پر پھینک دیا جاتا تو اس کے اور باسط کے بچنے کا امکان کم تھا۔ مگر غفور صاحب کے موڈ سے لگ رہا تھا کہ وہ اس کی وضاحت قبول نہیں کر رہے تھے۔ انہوں نے کہا۔ ''عورت کی شناخت سامنے آنے تک انکوائری جاری رہے گی مگر فی الحال تمہیں فیلڈ ڈیوٹی سے ہٹایا جا رہا ہے۔ تم دفتر تک محدود رہو گے۔''

''یس سر۔'' سعد نے کہا۔ کچھ دیر بعد وہ اور وسیم واپس جا رہے تھے۔ سعد جانتا تھا کہ وسیم نے ممکن حد تک اس کا ساتھ دیا ہوگا مگر غفور صاحب کے سامنے وہ بھی مجبور تھا۔ سعد کا موڈ خراب تھا اور وہ اس موڈ کے ساتھ گھر جانا نہیں چاہتا تھا اس لیے اس نے مناسب سمجھا کہ وسیم کے ساتھ دفتر چلا جائے اور کچھ وقت وہاں گزارے۔ جب وہ بہتر محسوس کرتا تو گھر جا سکتا تھا۔ دفتر پہنچ کر وسیم نے اسے باقاعدہ آرڈر دیا کہ وہ ایکٹو ڈیوٹی سے ہٹا دیا گیا ہے اور اس سے اسلحے اور یونیفارم کٹ والے لاکر کی چابی لے لی گئی تھی۔ اس کے ساتھی اس کے ساتھ تھے مگر کسی نے منہ سے کچھ نہیں کہا۔ انہوں نے صرف اس کا شانہ تھپکا اور ہاتھ ملایا تھا۔ کچھ دیر بعد سب لنچ کرنے لگے مگر اس نے منع کر دیا۔ ہال سے باہر آ کر اس نے فرحت کو کال کی اور اسے اطلاع دی۔ ''مبارک ہو، مجھے ایکٹو ڈیوٹی سے ہٹا دیا گیا ہے۔ فی الحال میں کلرک کی طرح میز پر ہوں۔''

فرحت کچھ دیر خاموش رہی پھر اس نے کہا۔ ''اس میں خوشی کی کوئی بات نہیں ہے۔ مجھے اصل خوشی اس وقت ہو گی جب آپ میری اور ہمارے ہونے والے بچے کی خاطر یہ جاب چھوڑ دیں گے۔''

''جہاں تک جاب کی بات ہے تو اسے تقریباً ختم سمجھو۔'' سعد نے کہا اور کال کاٹ دی۔

☆☆☆

فرحت تیار تھی جب سعد کی کال آئی اور اس سے بات کر کے وہ اپارٹمنٹ سے نکل آئی۔ دن میں اتنی سردی نہیں تھی مگر سورج ڈھلتے ہی درجۂ حرارت گر جاتا تھا اس لیے اس نے اس نے بیگ میں شال بھی رکھ لی تھی۔ ابھی اس نے سادہ چادر لی ہوئی تھی۔ باہر نکلتے ہوئے وہ خود کو اسی طرح ڈھک لیتی تھی۔ خوش قسمتی سے اسٹاپ پر آتے ہی بس آ گئی۔ اس کی مجبوری تھی یہاں رکشے نہیں چلتے تھے اور چلتے بھی تو اپنی حالت کے پیشِ نظر وہ ان میں نہیں بیٹھ سکتی تھی اور ٹیکسی میں وہ اکیلے نہیں بیٹھتی تھی۔ اس لیے بس سے آنا جانا پڑتا تھا مگر جب سے یہ جدید بسیں چلی تھیں سفر میں بہت آسانی ہو گئی تھی۔ اپارٹمنٹ سے نکل کر مشکل سے بیس گز کے فاصلے پر اسٹاپ تھا البتہ انسٹی ٹیوٹ میں اسے خاصا پیدل چلنا پڑتا تھا۔ چلنا اس کی اور ہونے والے بچے کی صحت کے لیے اچھا تھا اس لیے اسے محسوس نہیں ہوتا تھا۔

انسٹی ٹیوٹ عام طور سے ڈھائی بجے تک خالی ہو جاتا تھا اور وہاں صرف وہی طلبا اور اسٹاف رہ جاتا تھا جنہیں کوئی خاص کام ہوتا تھا۔ مگر عام طور سے صرف فرحت اور اس کے طلبا ہوتے تھے۔ انسٹی ٹیوٹ کا ایڈمنسٹریٹو اسٹاف بھی ساڑھے تین بجے تک چھٹی کر چکا ہوتا تھا اور اس کے بعد صرف گارڈز رہ جاتے تھے۔ فرحت مرکزی بلڈنگ کی دوسری منزل پر واقع ایک چھوٹے آڈیٹوریم میں کلاس لیتی تھی۔ کلاس کے لیے سیٹ لگانا اور اسے واپس رکھنا طلبا کی ذمے داری تھی۔ جب تک وہ کلاس میں پہنچتی سیٹ لگایا جا چکا ہوتا تھا۔ طلبا کی کل تعداد بارہ تھی، اس میں سات لڑکیاں اور پانچ لڑکے تھے۔ وہ سب اینی میشن اینڈ گرافک آرٹ کے پروگرام سے تھے۔ فرحت کی ان سے اچھی انڈر اسٹینڈنگ ہو گئی تھی، وہ سب اس سے بے تکلف بھی تھے اور اس کا احترام بھی کرتے تھے۔ جب اس نے بتایا کہ وہ چھٹیوں پر جا رہی ہے اور اب چار مہینے بعد آئے گی تو وہ افسردہ ہو گئے تھے۔ فرحت کی کلاس ان کی ڈگری کا حصہ نہیں تھی، یہ ان کی ذاتی صلاحیتوں کو نکھارنے اور پالش کرنے کے لیے تھی۔ اس لیے اس کے جانے سے انہیں ویسے نقصان نہیں ہوتا مگر وہ اسے اور اس کی کلاس کو مس کرتے۔

فرحت گیٹ سے اندر آئی تو اس نے دیکھا کہ پارکنگ کا بیشتر حصہ خالی ہو چکا تھا۔ کہیں کہیں کچھ طلبا اور اسٹاف کے ممبر نظر آ رہے تھے۔ کچھ دیر میں یہ بھی چلے جاتے۔ طویل روش پر چلتے ہوئے وہ مرکزی بلڈنگ تک

آئی۔ اس کے سامنے والے بڑے باغ میں درختوں اور پودوں پر خزاں چھا رہی تھی۔ اسے سعد کی بات یاد آئی کہ خزاں بہار کا آغاز ہوتی ہے۔ پھر اسے سعد کی کال یاد آئی اور اس نے اندر بوجھ سا محسوس کیا۔ اس نے کبھی نہیں چاہا کہ سعد کے ساتھ ایسا ہو۔ اسے ملنے والی سزا کا سن کر فرحت کو دکھ ہوا تھا۔ مگر سعد کا انداز ایسا تھا جیسے وہ اسے جتا رہا ہو کہ وہ اسے خوش ہی سمجھتا ہے۔ وہ سیڑھیاں چڑھ کر عمارت میں داخل ہوئی تو اسے ریسیپشن پر مسز صدیقی نظر آئیں، وہ چھٹی کی تیاری کر رہی تھیں۔ ان سے سلام دعا کر کے وہ آگے بڑھی۔ ایک طویل راہداری جس کے دونوں طرف کلاس رومز تھے عبور کر کے وہ بلڈنگ کے عقبی حصے میں آئی۔ آڈیٹوریم اسی حصے میں تھا۔ وہ سیڑھی سے اوپر آئی اور کلاس میں داخل ہوئی تو وہاں خلافِ توقع تاریکی تھی۔ وہ ٹھٹک گئی۔ تاریکی کے ساتھ وہاں سناٹا بھی تھا۔ فرحت سہم گئی پھر اس نے کہا۔

''ہیلو، کوئی یہاں ہے؟''

''ہاں ہے۔'' کسی نے زور سے کہا اور اچانک کلاس میں روشنی ہو گئی۔ تمام طلبا وہاں موجود تھے اور انہوں نے ایک میز سجا رکھی تھی۔ جس پر کیک اور ریفریشمنٹ کا سامان تھا۔ فرحت نے حیرت سے کہا۔ ''یہ کیا؟''

''یہی فیرویل پارٹی۔'' شمی نے شوخی سے کہا۔ ''اس امید کے ساتھ کہ آپ چار مہینے بعد واپس آجائیں گی۔''

''جی اور اپنے بے بی میں کھو کر ہمیں بھول نہیں گی نہیں۔'' فروزاں بولی تو وہ جھینپ گئی۔ پھر طلبا کے اصرار پر اس نے کیک کاٹا۔ کھانے پینے کا دور چلتا رہا۔ پھر شمی نے تجویز پیش کی کہ وہ سب باری باری بتائیں گے کہ انہوں نے اپنی ٹیچر سے کیا سیکھا تھا۔ ایک کرسی کو ڈائس تصور کر لیا گیا اور سب باری باری اس پر آ کر فرحت کے بارے میں اپنے تاثرات اور جذبات بیان کرنے لگے۔ اگرچہ فرحت ان سے بے تکلف تھی اور وہ روایتی ٹیچرز کی طرح طلبا سے فاصلے کی قائل نہیں تھی۔ مگر اسے یہ اندازہ نہیں تھا کہ وہ ان کے لیے اتنی اہمیت اختیار کر گئی تھی۔ وہ اس کے بارے میں اپنے دلی جذبات بیان کرتے ہوئے اسے خراجِ تحسین پیش کر رہے تھے۔ خاص طور سے شمی نے اسے بہت سراہا تھا۔

''جب میں نے اینی میشن اور گرافکس کا انتخاب کیا تھا تو دلچسپی کے باوجود یہ میرے لیے ایک بے جان ڈگری تھی۔ میں جو کمپیوٹر پر کرتی تھی وہ میرے اندر ذرا بھی ہلچل نہیں مچاتا تھا۔ مگر جب میں نے یہاں عملی آرٹ سیکھا اور جانا کہ انسان کس طرح اس سے منسلک ہو جاتا ہے۔ یہ کس طرح آپ کے زندہ وجود کا ایک حصہ بن جاتا ہے اور تب میں نے جانا کہ آرٹ ہوتا کیا ہے۔ یہ سب مجھے میڈم فرحت نے سکھایا۔''

جب فرحت کی باری آئی تو مارے جذبات کے چند لمحے کے لیے اس سے بولا نہیں گیا تھا۔ پھر اس نے اپنے آنسو صاف کیے اور کہنے لگی۔ ''جب میں نے وقت گزاری کے لیے یہاں ایک کلاس لینا شروع کی، تب میرے لیے بھی سب کچھ بے جان اور ڈل تھا۔ میں سمجھتی تھی کہ جس طرح میں نے آرٹ کو اس کی گہرائیوں کے ساتھ پڑھا اور سیکھا ہے شاید اسے میں آگے آپ لوگوں کو ایسے منتقل نہ کر سکوں۔ کمپیوٹر آرٹ میرے لیے روبوٹ ورک کی طرح ہے اس میں جذبات اور احساسات کا دخل نہیں ہوتا ہے اور میں اس سے منسلک طلبا کو بھی ایسا ہی سمجھتی تھی مگر جب میرا آپ سے تعلق بنا اور میں نے آپ کو سکھانا شروع کیا تو مجھے پتا چلا کہ بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو میں آپ سے سیکھ سکتی ہوں اور میں نے سیکھی بھی ہیں۔ آج آٹھ مہینے بعد جب میں یہاں سے کچھ عرصے کے لیے آپ سے دور جا رہی ہوں تو میں یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ میں پہلے سے زیادہ باصلاحیت اور باخبر آرٹ ٹیچر ہوں۔''

وہ واپس کرسی پر آئی تو سب تالیاں بجانے لگے۔ پھر لڑکیوں نے اسے گھیر لیا اور لڑکوں سے درخواست کی وہ کچھ دیر کے لیے کلاس سے باہر چلے جائیں کیونکہ وہ میڈم سے کچھ پرائیویٹ گفتگو کرنا چاہتی ہیں۔ اس نے منع کیا مگر لڑکیاں آج بہت شریر اور شوخ ہو رہی تھیں۔ انہوں نے لڑکوں کو کلاس سے نکال کر دم لیا اور پھر اس پر سوالوں کی بوچھاڑ کر دی۔ اکثر سوال ایسے تھے کہ وہ جواب دیتے ہوئے شرما رہی تھی۔ دس منٹ بعد اس نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ''اب بس، تم سب فری ہوتی جا رہی ہو۔ لڑکوں کو واپس بلا لو۔''

چار بجنے والے تھے۔ فرحت نے کہا کہ دروازہ کھول دیا جائے کیونکہ اب چھٹی کا وقت قریب آ گیا تھا۔

☆☆☆

غیاث اور مراد انسٹی ٹیوٹ کے سیکیورٹی گارڈز میں شامل تھے۔ دن کے وقت یہاں ایک درجن اور اس کے بعد چار چار سیکیورٹی گارڈز اگلی صبح تک دو شفٹوں میں ڈیوٹی دیتے تھے۔ ان میں سے ایک آمد و رفت کے گیٹ پر ہوتا تھا۔ دوسرا بڑا گیٹ چار بجے بند کر دیا جاتا تھا اور اس کے

بعد صرف ایک گیٹ بہ وقتِ ضرورت کھولا جاتا تھا۔ باقی تین گارڈز اندر احاطے میں گھومتے پھرتے اور عمارتوں کو چیک کرتے رہتے تھے۔ عمارتوں میں الارم تھے جو کسی بھی مداخلت کی صورت میں بج جاتے تھے۔ ان چاروں کا آپس میں واکی ٹاکی سے رابطہ ہوتا تھا۔ پہلی شفٹ رات بارہ بجے ختم ہوتی تھی اور دوسرے گارڈز آجاتے تھے۔ صبح آٹھ بجے دن کی شفٹ شروع ہوتی تھی اور اس میں ایک درجن گارڈز ہوتے تھے۔ غیاث اور مراد اس وقت انسٹی ٹیوٹ کے احاطے کا عقبی حصہ دیکھ رہے تھے۔

یہاں سے ایک برساتی نالا احاطے میں داخل ہوتا تھا اور ان کی ذمے داریوں میں اسے مسلسل چیک کرتے رہنا شامل تھا۔ نالا تقریباً پندرہ فٹ گہرا اور پچیس فٹ چوڑا تھا۔ انسٹی ٹیوٹ کی حد میں اس کے کنارے پتھر لگا کر پختہ کیے گئے تھے۔ کسی کو حادثاتی طور پر اس میں سے گرنے سے بچانے کے لیے چار فٹ اونچی ریلنگ لگائی گئی تھی۔ نالے کے ساتھ پاتھ وے بھی تھا۔ وہ اس پر چلتے ہوئے وقفے وقفے سے نالے میں جھانک رہے تھے۔ ایک بار مراد نے نالے میں جھانکا تو اسے جھٹکا لگا اور وہ اوندھے منہ ریلنگ پر گرا تھا۔ غیاث اس سے ذرا فاصلے پر تھا وہ اس کی طرف لپکا اور اسے سنبھالنے کی کوشش کی۔ مگر مراد گرتا جا رہا تھا۔ اسے سنبھالنے کی کوشش میں غیاث ریلنگ کے پاس گیا تھا کہ ٹھک کی آواز آئی اور کوئی چیز اس کے پہلو کو چیرتی ہوئی جسم میں اتر گئی تھی۔

وہ مراد کو چھوڑ کر نیچے گرا اور اذیت کو برداشت کر کے اس نے اپنا پہلو ٹٹولا۔ اس کا ہاتھ خون سے بھر گیا تھا۔ اس نے لرزتے ہاتھ سے اپنا واکی ٹاکی نکالنے کی کوشش کی مگر وہ بیلٹ پاؤچ میں بند تھا۔ وہ کوشش کے باوجود اس کا بٹن نہیں کھول پا رہا تھا۔ اچانک نالے کی طرف سے آہٹ ہوئی۔ ایسا لگا کہ کوئی اوپر آرہا تھا۔ غیاث نے واکی ٹاکی نکالنے کا ارادہ ترک کر کے اپنی شاٹ گن شانے سے اتارنے کی کوشش کی۔ مگر بدقسمتی سے وہ اس زاویے سے گرا تھا کہ شاٹ گن اس کے جسم تلے دب کر رہ گئی تھی اور وہ نکل نہیں پا رہی تھی۔ بہ مشکل اس نے شاٹ گن کا دستہ گرپ کیا اور اس کا ٹریگر ٹٹولنے لگا۔ اس نے محسوس کر لیا تھا کہ وہ شاٹ گن نہیں نکال سکے گا۔ اس کی توانائی تیزی سے کم ہو رہی تھی۔ وہ فائر کر کے دوسروں کو خبردار کرنا چاہتا تھا۔ لیکن اس سے پہلے وہ شاٹ گن کا ٹریگر دباتا نالے سے ایک ہاتھ نمودار ہوا جس میں لمبی نال والا پستول تھا۔ اس سے ایک فائر ہوا اور غیاث ٹریگر دبانے کی حسرت لیے دنیا سے رخصت ہو گیا۔

☆☆☆

پانچوں لڑکے باہر گیلری میں تھے اور آپس میں ہنسی مذاق کر رہے تھے۔ پانچوں کا تعلق پوش گھرانوں سے تھا اور وہ آپس میں دوست بھی تھے۔ گیلری مرکزی عمارت کے عقبی حصے میں تھی، یہاں سے سامنے جمنازیم اور اس کے دائیں طرف عقبی باغ دکھائی دے رہا تھا۔ باغ کے وسط سے برساتی نالا گزر رہا تھا۔ عام طور سے یہ خشک رہتا تھا اور صرف بارش کے دنوں میں اس میں پانی آتا تھا۔ ان میں سے شہریار نامی لڑکا غور سے نالے کی سمت دیکھ رہا تھا۔ آس پاس درخت تھے اور منظر اتنا واضح نہیں تھا۔ یہ نالا مرکزی عمارت کی دائیں طرف سے ہوتا ہوا سامنے والے باغ کے وسط سے گزرتا ہوا انسٹی ٹیوٹ کے احاطے سے باہر چلا جاتا تھا۔ اچانک شہریار نے کہا۔ ”وہ کیا ہے، نالے میں دیکھو۔“

”کوئی مگر مچھ نظر آگیا کیا؟“ اسد نامی لڑکا بولا۔ مگر جب انہوں نے غور سے دیکھا تو انہیں فوراً سنگینی کا احساس ہو گیا۔ نالے میں کم سے کم چار پانچ مسلح افراد تھے اور وہ آگے بڑھ رہے تھے۔ اس بلندی سے وہ صاف نظر نہیں آرہے تھے مگر جتنی بھی جھلکیاں تھیں ان میں ان کے ہتھیار صاف دکھائی دے رہے تھے۔ عمار نامی لڑکے نے کہا۔

”گڑبڑ ہے، ہمیں فوری یہاں سے نکلنا ہوگا۔“

ملک میں ایسے کئی واقعات ہو چکے تھے جب مجرموں اور دہشت گردوں نے مخصوص مقاصد کے تحت تعلیمی اداروں پر حملے کیے اور وہاں قتل عام کیا۔ اس لیے وہ فوری ہوشیار ہو گئے۔ شہریار نے کہا۔ ”ہمیں لڑکیوں کو لے کر فوری نکلنا ہوگا۔“

وہ کلاس کی طرف لپکے تھے۔ اسی وقت شمی نے دروازہ کھولا تھا اور وہ اندر گھسے تو ان کے انداز سے فرحت کو گڑبڑ کا اندازہ ہوا تھا۔ اس نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ”کیا ہوا؟“

”برساتی نالے سے کچھ مسلح لوگ اندر آئے ہیں اور وہ اسی طرف آرہے ہیں۔ اس سے پہلے کہ وہ اندر آئیں ہمیں یہاں سے نکل جانا ہوگا۔“ اسد نے تیزی سے کہا۔

”انداز سے وہ دہشت گرد لگ رہے ہیں۔“ شہریار بولا۔ یہ سنتے ہی وہاں دہشت پھیل گئی تھی خاص طور سے لڑکیاں خوفزدہ نظر آنے لگی تھیں۔

”جلدی نکلو یہاں سے۔“ فرحت نے کہا اور وہ سب نیچے کی طرف لپکے۔ لڑکیاں اور لڑکے بھاگ رہے تھے مگر

فرحت اپنی حالت کے پیشِ نظر ایک حد سے زیادہ تیز نہیں بھاگ سکتی تھی۔ جب وہ سیڑھیوں تک پہنچی تو لڑکے اور لڑکیاں راہداری میں آگے جا چکے تھے۔ پھر ثمی کو احساس ہوا اور وہ پلٹ کر آئی۔ اس نے فرحت کا ہاتھ تھام لیا۔ فرحت نے ہانپتے ہوئے کہا۔

''تم جاؤ، میں آ رہی ہوں۔''

''میں آپ کے بغیر نہیں جاؤں گی۔''

فرحت اور ثمی تیز قدموں سے ریسیپشن تک آئے تو لڑکے باہر جانے والا دروازہ کھول چکے تھے مگر فوراً ہی واپس آئے۔ ان کے چہرے سفید ہو رہے تھے۔ شہر یار نے کہا۔ ''وہ سامنے باغ میں آ گئے ہیں، ان کی نظروں میں آئے بغیر کوئی باہر نہیں جا سکتا ہے۔''

ریسیپشن لابی کا سامنے والا حصہ شیشوں پر مشتمل تھا اور یہاں آمد و رفت کے لیے شیشوں کے تین دروازے تھے۔ مسز صدیقی چھٹی کر کے جا چکی تھیں اور شاید اس وقت یہاں سوائے چند گارڈز کے اور کوئی نہیں تھا۔ فرحت نے لڑکوں سے کہا۔ ''تمام دروازے اندر سے لاک کر دو۔''

لڑکے بھاگے اور انہوں نے شیشے کے دروازے لاک کر دیے تھے۔ مگر یہ چیز مسلح افراد کو اندر آنے سے نہیں روک سکتی تھی۔ وہ ایک گولی مار کر شیشے توڑ سکتے تھے۔ فرحت نے سوچا اور ریسیپشن کی طرف آئی۔ اس نے فون اٹھا کر ایمرجنسی نمبر ملایا۔ دوسری طرف بیل جانے لگی مگر کوئی کال ریسیو نہیں کر رہا تھا۔ اس نے دل ہی دل میں پولیس کو سنائیں جو ایمرجنسی کال بھی ریسیو نہیں کرتی تھی۔ لڑکیاں اور لڑکے اس دوران میں دھندلے شیشوں سے باہر جھانک رہے تھے۔ اچانک لڑکیاں تیزی سے پیچھے آئیں۔

''وہ آ رہے ہیں۔'' ایک چھوٹے قد کی گول مٹول سی لڑکی ثوبیہ نے کہا۔ وہ بہت ڈری ہوئی تھی اور اس کی سسکیاں نکل رہی تھیں۔ فرحت نے سوچا اور فوری فیصلہ کیا۔ اس نے ریسیور واپس رکھا اور بولی۔

''اندر چلو۔'' وہ راہداری میں آئے۔ اس کا دو پٹ والا سوئنگ ڈور مضبوط دھات کا تھا مگر اسے لاک نہیں کیا جا سکتا تھا۔ فرحت نے لڑکوں سے کہا۔ ''کوئی چیز تلاش کرو تاکہ اس کے ہینڈلز میں پھنسا کر اسے بند کیا جا سکے۔ لڑکے اندر کی طرف بھاگے تھے۔ انہوں نے ایک کلاس روم میں رکھی دھاتی میز اٹھائی اور باہر لا کر اس کے دو پائے اس طرح سے دروازے کے ہینڈلز میں پھنسائے کہ اب اسے میز ہٹائے بغیر نہیں کھولا جا سکتا تھا۔ مگر وہ یہاں بھی محفوظ نہیں تھے۔ سوئنگ ڈور کے اوپر چھ انچ چوڑا اور دو فٹ اونچا ایک ٹکڑا صرف شیشے پر مشتمل تھا اور اسے بہ آسانی توڑ کر اندر فائرنگ کی جا سکتی تھی۔ اسی لمحے ریسیپشن لابی کی طرف سے شیشہ ٹوٹنے کی آواز آئی تو فرحت نے موبائل نکالتے ہوئے کہا۔ ''یہاں سے نکلو اور موبائل پر ایمرجنسی کال کرو۔''

موبائل سب کے پاس تھا اور راہداری کے دوسرے سرے کی طرف جاتے ہوئے انہوں نے موبائل نکال لیے تھے۔ ایمرجنسی کال کا فائدہ نہیں تھا اس لیے سب اپنوں کو کال کرنے لگے۔ فرحت نے بھی سعد کا نمبر ملایا تھا۔

☆☆☆

وہ بال بال بچے تھے۔ پولیس نے ان کی کوٹھی سے ذرا دور واقع ایک اور نامکمل کوٹھی کا محاصرہ کیا تھا اور پھر وہاں شدید تصادم ہوا تھا۔ فائرنگ کی آواز سے علاقہ دیر تک گونجتا رہا تھا اور بالآخر پولیس و اسپیشل یونٹ نے اندر موجود افراد کو ہلاک اور زخمی کر دیا۔ اس دوران میں گائیکر اور اس کے ساتھی دم سادھے کارروائی ہوتے دیکھتے رہے اور اس خدشے سے ہتھیار سنبھالے رہے کہ جلد پولیس وہاں بھی آئے گی۔ مگر پولیس نے صبح سے کچھ پہلے اپنا کام مکمل کر لیا اور چند ایک افراد کی نفری وہاں چھوڑ کر باقی ہلاک و زخمی ہونے والوں کو لے کر چلے گئے تھے۔ گائیکر ایک نائٹ ویژن سے اسپیشل یونٹ کی کارروائی دیکھ رہا تھا اور دل ہی دل میں ان لوگوں کو داد دے رہا تھا۔ وہ خود اسی میدان کا آدمی تھا اور جانتا تھا کہ اسپیشل یونٹ نے کتنی مہارت اور دلیری سے یہ آپریشن مکمل کیا تھا۔ انہوں نے بنا کسی نقصان کے اندر موجود مسلح اور مرنے مارنے پر آمادہ افراد کو قابو کر لیا تھا۔

اب وہ تشویش زدہ تھا۔ اسے اپنے مشن کی فکر لاحق ہوئی تھی۔ یہ لوگ اس کی توقع سے زیادہ تیز اور مستعد ثابت ہو رہے تھے اور ان کا واسطہ ان ہی لوگوں سے پڑ سکتا تھا۔ اس کے باوجود اسے یقین تھا کہ اس کا مشن کامیاب ہوگا۔ اس نے پورے چھ مہینے تک اس کی پلاننگ اور ریکی کی تھی۔ ایک ایک چیز کا اچھی طرح جائزہ لیا تھا اور چھ مہینے تک وہ اس کی نوک پلک سنوارتا رہا تب کہیں جا کر وہ اپنے پلان سے مطمئن ہوا تھا۔ تمام تیاریاں مکمل کر کے اور سرحد کے اس طرف موجود اپنے زرخرید ایجنٹوں سے اپنے مطلب کے آدمی حاصل کرنے کے بعد وہ یہاں آئے تھے۔ گائیکر کو خدشہ تھا کہ اس کے مشن کا بھانڈا قبل از وقت پھوٹ سکتا ہے اور اسے اس کے ساتھیوں سمیت گرفتار کیا جا سکتا ہے۔ جب

سورما نے قانون نافذ کرنے والوں کی آمد کی اطلاع دی تو وہ سمجھا تھا کہ وقت آگیا ہے۔ مشن میں طے تھا کہ انہیں زندہ گرفتار نہیں ہونا ہے اور وہ مرنے کے تیار ہو گئے تھے۔ مگر ان کا وقت نہیں آیا تھا۔

مشن کا آغاز ہی گڑبڑ سے ہوا تھا۔ نالے میں لگا دھاتی جال ان کی توقع سے زیادہ مضبوط ثابت ہوا تھا اور برقی آری سے اسے کاٹنے میں خاصا وقت لگ گیا تھا۔ وہ چار بجے اندر داخل ہوئے جبکہ انہیں پندرہ منٹ پہلے یہاں آجانا چاہیے تھا۔ گارڈز کی شفٹ تبدیل ہونے کی وجہ سے اس وقت عقبی حصے میں کوئی گارڈ نہیں ہوتا تھا مگر تاخیر سے معاملہ خراب ہوا اور گارڈز پیچھے پہنچ گئے تھے۔ انہیں دیکھتے ہی گائیکر نے حکمتِ عملی تبدیل کی اور سائلنسر لگا پستول نکال لیا۔ اس نے نالے کے اندر سے ایک گارڈ کو شوٹ کر دیا جو اندر جھانک رہا تھا اور پھر دوسرے کو بروقت شوٹ کیا جب وہ اپنی شاٹ گن کا ٹریگر دبانے والا تھا۔ اس کے بعد وہ تیزی سے حرکت میں آئے اور مرکزی عمارت کے سامنے والے باغ میں نالے سے باہر آئے۔ اسی لمحے عمارت کا گلاس ڈور کھلا اور چند لڑکے اور لڑکیاں باہر آئے مگر انہیں دیکھتے ہی واپس اندر چلے گئے۔ سورما نے کہا۔

''یہ اچھا نہیں ہوا، وہ جان گئے ہیں۔ اب سب کو بتائیں گے۔''

''نہیں، اچھا ہوا ہے۔'' گائیکر نے کہا اور اسلم کی طرف دیکھا۔ ''تم اور شبیر گیٹ کی طرف جاؤ اور وہاں موجود گارڈز کا صفایا کردو۔ شفیع اور سورما تم دونوں جاکر لیب اور لائبریری والی عمارت چیک کرو۔ کوئی بھی ہو اسے شوٹ کر دینا ہمیں صرف اس مین بلڈنگ میں لوگ زندہ چاہئیں۔''

وہ چاروں روانہ ہوئے تو گائیکر، بدری اور عباس کے ہمراہ مرکزی بلڈنگ کی طرف بڑھا۔ وہ ساتوں پوری طرح مسلح تھے اور ان کی پشت پر بڑے سائز کے بیگز بندھے ہوئے تھے۔ حسبِ توقع انہیں داخلی گلاس ڈور اندر سے لاک ملے تھے مگر یہ مسئلہ نہیں تھا۔ گائیکر نے سائلنسر ڈ پستول سے ایک فائر کیا اور ایک دروازے کا شیشہ بکھر گیا۔ وہ اندر آئے۔ لابی سے عمارت میں جانے کے دو دروازے تھے، ایک سوئنگ ڈور جو راہداری میں کھلتا تھا اور دوسرا سروس ڈور اسے صفائی کرنے والے ملازمین استعمال کرتے تھے۔ یہ لاک تھا اور اسے صرف چابی کی مدد سے کھولا جاسکتا تھا۔ مگر انہیں اس کی پروا نہیں تھی... بلکہ یہ اچھی بات تھی کہ عمارت کے اکثر دروازے لاک تھے۔ حد یہ کہ عقب میں موجود ہنگامی حالات میں استعمال ہونے والا دروازہ اور چھت کی طرف جانے والے دروازے لاک کر دیے جاتے تھے۔ اگرچہ یہ حفاظتی اصولوں کے خلاف تھا لیکن طلبا کو بعض دوسری سرگرمیوں سے روکنے کے لیے انسٹی ٹیوٹ کی انتظامیہ نے ایسا کیا تھا۔ گائیکر نے بدری سے کہا۔

''ٹریپ لگادو۔''

بدری نے اپنا بیگ پشت سے اتار کر اسے نیچے رکھا اور ایک بڑا سیاہ ڈبا اٹھا کر ریسپشن کے کاؤنٹر کے نیچے رکھ دیا۔ اس کے بعد اس نے دو چھوٹی ڈیوائسز نکالیں اور داخلی دروازوں کے دائیں بائیں موجود ستونوں پر نصب کیا اور ان کے بٹن دبائے۔ ڈیوائسز آن ہو گئیں اور ایک ڈیوائس سے لیزر لائٹ نکل کر دوسری ڈیوائس تک گئی۔ بیدار شاہ نے مخصوص عینک لگائی تو اسے لیزر بیم نظر آنے لگی تھی۔ وہ خود بہ خود دوسری ڈیوائس جو اصل میں اس کا ریسیور تھا سیٹ ہو رہی تھی۔ جیسے ہی سیٹنگ مکمل ہوئی۔ ایک آواز آئی اور لیزر بند ہو گئی۔ بدری نے ایک چھوٹا سا ریموٹ نما آلہ نکالا اور اس کا ایک بٹن دبایا تو لیزر دوبارہ جاری ہو گئی اور دوسرا بٹن دبانے پر اس کا رابطہ کاؤنٹر تلے رکھے سیاہ ڈبے سے ہو گیا۔ اس نے گائیکر کی طرف دیکھ کر او کے کا اشارہ کیا اور اسی لمحے سورما تیزی سے اندر آیا تھا۔ بدری نے بروقت ریموٹ کا بٹن دبایا ورنہ اگر وہ لیزر بیم کو منقطع کر دیتا تو سیاہ ڈبے میں موجود خوفناک دھماکا خیز مادہ پھٹ جاتا۔ یہ اتنا خطرناک تھا کہ اس عمارت کا اگلا حصہ مکمل تباہ کر دیتا اور ان میں سے کسی کے بچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ بدری نے غصے سے سورما کو دیکھا۔

''تم دیکھ کر نہیں آسکتے تھے، ابھی سب مارے جاتے۔''

سورما مسکرایا۔ ''یہ دیکھنا تمہارا کام ہے۔''

اسلم نے واکی ٹاکی پر گائیکر کو اطلاع دی۔ ''گیٹ کلیئر کر دیا ہے، دو آدمی تھے دونوں کو اڑا دیا۔''

''گڈ۔'' گائیکر نے کہا اور بدری کی طرف دیکھا۔ ''اب گیٹ کی باری ہے۔''

بدری نے سر ہلایا۔ اس نے ریموٹ گائیکر کے حوالے کیا اور اپنا بیگ اٹھا کر باہر کی طرف بڑھ گیا۔ اس کے جانے کے بعد گائیکر نے سورما کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا، اس نے کہا۔ ''کوئی نہیں ہے۔ عمارت لاک ہے۔''

''ضروری نہیں ہے کہ عمارت لاک ہو تو اندر کوئی نہ

ہو۔'' گائیکر نے سرد لہجے میں کہا۔ ''بیدار اپنا کام کر لے تو ایک بار اسے ضرور چیک کرنا۔''

سورما نے ہونٹوں پر زبان پھیری۔ ''ہمارے اصل شکار تو یہاں ہیں اور ان میں زیادہ لڑکیاں ہیں۔''

سورما کی بات پر عباس نے چونک کر اسے دیکھا مگر کچھ کہا نہیں۔ گائیکر دھاتی دروازے تک آیا اور اس نے شیشے سے اندر جھانکا تھا۔ دوسری طرف کوئی نظر نہیں آرہا تھا مگر اسے معلوم تھا کہ وہ لوگ اسی عمارت میں تھے یہاں سے باہر نہیں جاسکتے تھے۔ اسے ان تک جانے کی جلدی نہیں تھی۔ وہ پہلے اپنا کام مکمل کر لینا چاہتا تھا۔ اسے یہ پروا بھی نہیں تھی کہ عمارت میں قید ہونے کے باوجود وہ باہر رابطہ کرنے کے لیے آزاد تھے۔ بلکہ یہ اچھا ہوتا کہ وہ زیادہ سے زیادہ کال کر کے خوف و دہشت پھیلا سکتے تھے۔ اس کا بنیادی مقصد یہی تھا۔ گائیکر نے بہت سوچ سمجھ کر اس جگہ کا انتخاب کیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ تعلیمی ادارے کو نشانہ بنانے پر اسے فوری توجہ ملے گی اور اس کی گونج بین الاقوامی سطح تک جائے گی۔ مقامی حکومت اور ادارے ہل کر رہ جائیں گے۔ میڈیا والے پورے ملک کو ٹی وی کے آگے لے آئیں گے اور یہ ہیجان پورے ملک میں پھیل جائے گا۔ یہ ڈراما جتنا طویل ہوگا اتنا ہی مؤثر بھی ثابت ہوگا۔

☆☆☆

سعد کرسی پر نیم دراز تھا۔ اس وقت ہال میں صرف وہی تھا۔ باقی سب لاؤنج میں تھے اور ٹی وی دیکھ رہے تھے۔ موبائل نے بیل دی تو اس نے میز سے اٹھا کر دیکھا اور فرحت کی کال پا کر اس کے ماتھے پر شکن آگئی۔ ایسا بہت کم ہوتا تھا کہ فرحت اسے آفس ٹائم میں کال کرے۔ اس نے کال ریسیو کی۔ ''ہیلو، سب ٹھیک ہے؟''

''سعد، میں انسٹی ٹیوٹ میں ہوں۔'' فرحت کی سہمی آواز آئی۔ ''یہاں کچھ مسلح لوگ گھس آئے ہیں۔''

سعد کرسی پر سیدھا ہو گیا۔ ''کہاں؟...... تم کہاں ہو؟''

''جہاں میں کلاس لیتی ہوں۔'' فرحت نے کہا۔ ''اس وقت ہم مین بلڈنگ میں محصور ہیں۔ میرے ساتھ بارہ اسٹوڈنٹ بھی ہیں۔''

''مسلح افراد کتنے ہیں اور اس وقت کہاں ہیں؟''

''میں نے خود نہیں دیکھا مگر لڑکوں کا کہنا ہے کہ وہ پانچ چھ ہیں اور پوری طرح مسلح ہیں، ان کے پاس رائفلیں ہیں۔ وہ مین بلڈنگ کی انٹرنس لابی میں آچکے ہیں۔ ہم نے اندر آنے والا دروازہ کسی طرح بند کر دیا ہے لیکن یہ انہیں نہیں روک سکتا ہے۔ وہ اسے کھول سکتے ہیں۔''

سعد کا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ اس کا دل کہہ رہا تھا کہ فوری الارم بجا دے مگر عقل کہہ رہی تھی کہ وہ فرحت سے زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرے، ممکن ہے اسے پھر موقع نہ ملے۔ ''گارڈز کہاں ہیں، کیا فائرنگ کی آواز آئی تھی؟''

''نہیں۔'' فرحت نے انکار کیا۔ ''لڑکوں نے عقبی گیلری سے انہیں برساتی نالے سے آتے دیکھا۔ اب ہم کیا کریں؟''

سعد نے سوچا اور مشورہ دیا۔ ''تم لوگ چھپنے کی کوشش کرو۔ ایک جگہ نہ رہو، گروپس بنا کر الگ الگ جگہوں پر پھیل جاؤ۔ وہ یقیناً تم لوگوں کو قابو کرنا چاہیں گے اور اس کام میں جتنی مشکل ہوگی، تمہارے بچنے کا اتنا زیادہ امکان ہوگا۔''

''سعد مجھے ڈر لگ رہا ہے۔''

''حوصلہ رکھو، میں آرہا ہوں۔'' سعد کہتے ہوئے کھڑا ہو گیا۔

''مجھے اپنے بچے کا خوف ہے۔''

''فرحت میری بات سنو، تمہیں اور ہمارے بچے کو کچھ نہیں ہوگا۔'' سعد نے ہال سے باہر جاتے ہوئے کہا۔ ''جو میں نے کہا ہے وہ کرو۔ چھپ جاؤ اور سب اپنے موبائلوں کی بیل آف کر لیں۔ کوئی آہٹ یا شور نہ ہو جس سے آنے والے تم لوگوں کے بارے میں جان سکیں۔''

سعد نے بات کرنے کے دوران لاؤنج میں جھانکا اور اشارے سے باسط کو بلایا۔ وہ اٹھ کر آیا تو سعد لاکر روم کی طرف چل پڑا۔ ساتھ ہی وہ فرحت سے بات کر رہا تھا۔ ''تم لوگ لائٹس بند کر سکتے ہو؟''

فرحت اپنے طلبا سے معلوم کرنے لگی۔ باسط لاکر روم میں آیا اور اس نے سوالیہ نظروں سے سعد کی طرف دیکھا۔ سعد نے کال کاٹ کر اس سے کہا۔ ''آئی ٹی انسٹی ٹیوٹ میں کچھ مسلح لوگ گھس آئے ہیں۔ فرحت اور بارہ دوسرے افراد وہاں مین بلڈنگ میں محصور ہو گئے ہیں۔''

باسط اچھل پڑا۔ ''ہمیں فوراً اتھارٹیز کو اطلاع دینی ہے۔''

''یہ کام تم کرو گے۔ لیکن اس وقت مجھے تمہارا اسلحہ اور دوسری چیزیں چاہئیں۔ مجھ سے میرے لاکر کی چابی لے لی گئی ہے۔''

"تم کیا کرو گے۔" باسط نے نفی میں سر ہلایا۔ "تم معطل ہو۔"

"اسی لیے تو تم سے کہہ رہا ہوں، مجھے معلوم ہے اگر یہاں سے اسپیشل یونٹ گیا تو میں اس میں شامل نہیں ہوں گا۔ یار میری بیوی وہاں ہے اور وہ اکیلی نہیں ہے۔ اس کے وجود میں میرا بچہ بھی ہے۔"

باسط سوچ میں پڑ گیا تھا۔ یونٹ میں کسی دوسرے کو اپنا اسلحہ دینا قواعد کی سنگین خلاف ورزی تھی اور اسے بھی سزا ہو سکتی تھی۔ سعد ملتجی نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ "باسط پلیز۔"

باسط نے گہری سانس لی۔ "او کے، میں لاکر کھول دیتا ہوں اور یہاں سے جا رہا ہوں۔ جب تم یہاں سے نکلو تو مجھے کال کر کے بتاؤ گے۔ تب میں باس کو اطلاع دوں گا۔"

"ویسے اتھارٹیز تک اطلاع پہنچ رہی ہو گی کیونکہ وہاں کافی موبائل فونز ہیں اور وہ سب رابطے کر رہے ہوں گے۔" سعد نے سکون کا سانس لے کر کہا۔ "بہتر ہو گا کہ تم چابی مجھے دے دو، میں بعد میں کہہ دوں گا کہ میں نے چپکے سے تمہاری جیب سے نکال لی تھی۔"

باسط نے چابی اس کے حوالے کی اور وہاں سے چلا گیا۔ یونیفارم کی ضرورت نہیں تھی۔ سعد نے سب سے پہلے بلٹ پروف جیکٹ پہنی۔ پھر اس نے جیکٹ سے ریڈیو منسلک کر کے اس کا ہینڈ فری کان سے لگایا۔ فی الحال تو نہیں لیکن اسے بعد میں اس کی ضرورت پڑ سکتی تھی۔ اسلحے میں سے اس نے پستول اور رائفل منتخب کی۔ دونوں کے تین تین اضافی میگزین جیکٹ کے خانوں میں لگائے۔ چار عدد ہینڈ گرینیڈ اور اتنے ہی اسموک بم بھی اس نے جیکٹ سے منسلک کر لیے تھے۔ گیس ماسک اس نے گلے میں ڈال لیا تھا۔ لباس گھر والا تھا البتہ اس نے باسط کے جوتے پہن لیے یہ بھاگ دوڑ کے لیے بہترین تھے۔ وہ باہر آیا اور کار میں بیٹھ کر اسے پارکنگ سے نکالتے ہوئے اس نے باسط کو کال کی۔

"میں نکل گیا ہوں۔ تم بات آگے کر سکتے ہو۔"

اس نے کہتے ہی کال کاٹ کر فرحت کو کال کی۔ اس نے ریسیو کی۔ "تم ٹھیک ہو نا؟"

"ہاں ہم بلڈنگ کے پچھلے حصے میں ہیں۔ یہاں ایک ایمرجنسی ڈور ہے مگر وہ لاک ہے اور یہ اتنا مضبوط ہے کہ ہم اسے توڑ بھی نہیں سکتے۔"

"چھت پر جانے کا راستہ کھلا ہے؟"

"میں معلوم کرتی ہوں۔" فرحت نے کہا اور وہاں موجود طلبا سے چھت کی طرف کھلنے والے راستے کے بارے میں پوچھا اور پھر سعد کو بتایا۔ "وہ بھی بند ہے، انتظامیہ اسے مستقل بند رکھتی ہے۔"

"شِٹ......!" سعد نے کہا۔ "تم سب ایک جگہ ہو؟"

"ہاں کیونکہ یہ لوگ الگ ہونے کے لیے تیار نہیں ہیں۔"

"چھپنے کے لیے کوئی جگہ تلاش کرو۔" سعد نے کہا۔ اس کے نمبر پر دوسری کال آنے لگی تھی۔ "میرے نمبر پر کال آرہی ہے میں تمہیں پھر کال کرتا ہوں۔" اس نے کال کاٹ کر آنے والی کال ریسیو کی۔ دوسری طرف وسیم تھا۔ "باسط کہہ رہا ہے آئی ٹی انسٹی ٹیوٹ میں مسلح افراد گھس آئے ہیں؟"

"ہاں انسٹی ٹیوٹ کی مین بلڈنگ میں اس وقت تیرہ افراد پھنسے ہوئے ہیں، ان میں میری بیوی بھی شامل ہے۔"

وسیم چونکا۔ "تم کہاں ہو؟"

"میں اسی طرف جا رہا ہوں۔"

"سعد واپس آؤ، تم معطل ہو۔" وسیم نے تیز لہجے میں کہا۔ "اوپر سے آئے حکم کے بغیر ہم کوئی قدم نہیں اٹھا سکتے۔"

"سر آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں لیکن یہ معاملہ ہے میری بیوی اور ہونے والے بچے کا۔ میں انہیں دہشت گردوں کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑ سکتا۔ میں جو کر رہا ہوں مکمل طور پر اپنی ذمے داری پر کر رہا ہوں۔ میں نے چپکے سے باسط کی چابی نکال لی تھی اور میرے پاس اس کا اسلحہ و سامان ہے۔ کیا آپ نے اعلیٰ حکام تک یہ خبر پہنچا دی ہے؟"

"خبر پہنچ گئی ہے اور میرے یونٹ کو تیاری کا حکم مل گیا ہے۔"

"سر بہتر ہے میں جو کر رہا ہوں مجھے کرنے دیں۔ میں اپنی ذمے داری پر اندر جاؤں گا اور اگر باہر سے مجھے مدد ملتی رہے تو شاید میں اندر موجود افراد کو بچا سکوں۔"

وسیم بولا تو اس کا لہجہ نرم تھا۔ "میرا اب بھی یہی مشورہ ہے کہ تم واپس آجاؤ۔"

"سوری سر۔"

"او کے، اپنا خیال رکھنا۔" وسیم نے کال کاٹ دی۔ سعد بہت تیز ڈرائیو کر رہا تھا اور انسٹی ٹیوٹ زیادہ دور نہیں رہا تھا۔

☆☆☆

فرحت رفتہ رفتہ اپنے خوف پر قابو پا رہی تھی۔ لڑکیاں ہراساں تھیں مگر لڑکے اب پُرسکون تھے۔ فرحت نے ان سے کہا۔ ''باہر سے مدد آنے میں کچھ وقت لگے گا تب تک ہمیں چھپنے کے لیے کوئی جگہ تلاش کرنی ہوگی جہاں یہ آسانی سے ہمیں تلاش نہ کرسکیں۔''

شہریار نے مایوسی سے کہا۔ ''یہاں بیشتر کمرے لاک ہیں اور جو چند ایک کھلے ہیں ان میں چھپنے کی جگہ نہیں ہے۔''

''یہاں ایک تہ خانہ بھی ہے۔'' عمران نامی لڑکے نے کہا۔ ''مجھے پتا ہے اس کا راستہ کہاں ہے۔''

''میں اور عمران جاکر دیکھتے ہیں۔'' شہریار نے کہا اور وہ دونوں تہ خانے کی طرف روانہ ہوگئے۔ فرحت اور دوسری لڑکیاں اس طرف کے دروازے کھولنے کی کوشش کر رہی تھیں مگر ان میں سے بیشتر لاک تھے اور جو کھلے تھے وہ عام سے دفاتر یا کلاس رومز تھے جن میں چھپنے کی جگہ نہیں تھی۔ ثوبیہ، فرحت کے ساتھ تھی، اس نے دھیمی آواز میں کہا۔

''کیا یہ ہمیں مار دیں گے؟''

''ہمیں یہی سوچ کر بچنا چاہیے کہ وہ ہمیں مارنے آئے ہیں۔'' فرحت نے کہا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اگر یہاں اندھیرا ہوجائے تو آنے والے انہیں اتنی آسانی سے تلاش نہیں کرسکیں گے۔ مگر وہ مین سوئچ کے مقام سے بے خبر تھے۔ اس نے معلوم کیا تھا مگر کسی کو مین سوئچ کا پتا نہیں تھا۔ اسے خیال آیا اور اس نے سعد کو کال کی۔ ''سنیں کیا یہاں کی لائٹ بند نہیں کی جاسکتی ہے۔''

''تم لوگوں نے مین سوئچ تلاش کرنے کی کوشش کی؟'' سعد نے پوچھا۔

''کی لیکن کسی کو نہیں معلوم ہے۔'' فرحت نے کہا۔

''یہ مسئلے کا حل بھی نہیں ہے۔ مجھے یقین ہے آنے والے مین سوئچ کی جگہ سے واقف ہوں گے اور آسانی سے لائٹ بحال کرلیں گے۔''

سعد قائل ہوا۔ ''تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ یہ بتاؤ کہ تم لوگوں کے پاس سکے ہیں؟''

''یقیناً ہوں گے، میرے پاس کئی ہیں۔''

''لڑکوں سے کہو کہ وہ سکے پن والے انرجی سیور کے ہولڈر میں رکھ کر انرجی سیور واپس لگا کر سوئچ آن کریں تو اس جگہ کا فیوز اڑ جائے گا۔ اگر یہ نہیں کرسکیں تو کہیں سے تار لے کر اسے ساکٹ میں دونوں سوراخوں میں ڈال کر سوئچ آن کردیں تب بھی فیوز اڑ جائے گا۔''

''پوری بلڈنگ کا۔''

''نہیں صرف اسی علاقے کا جسے اس فیوز سے لائٹ دی جارہی ہوگی۔ یہ کام دوسری جگہوں پر بھی کرکے وہاں کی لائٹ اسی طرح اڑائی جاسکتی ہے۔''

''میں کہتی ہوں۔'' فرحت نے کہا۔ اس نے اسد، عمار اور منیر کو بلایا۔ انہیں سعد کی تجویز سے آگاہ کیا۔

''یہ کام ہوسکتا ہے۔'' اسد بولا۔ ''لیکن میں جانتا ہوں یہاں سارے ہولڈر چوڑی والے ہیں اور اس ترکیب سے فیوز نہیں اڑے گا۔ البتہ تار والی ترکیب سے کام چل جائے گا۔''

فرحت نے کہا۔ ''ہمیں تار تلاش کرنا ہوگا۔ ہم ساکٹ کی مدد سے فیوز اڑا سکتے ہیں۔''

انہوں نے تار کی تلاش شروع کی۔ ایک کمرے میں ایگزاسٹ فین کو اوپر سے وائر دی گئی تھی۔ وہ انہوں نے کھینچ کر توڑ دی اور پھر اسے پیپر نائف کی مدد سے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں کاٹ کر ان کے دونوں سرے ننگے کرنے لگے۔ ثمی اور اس کی ایک ساتھی لڑکی راہداری کے سرے سے جھانک رہی تھیں ثمی، غفور صاحب سے بات بھی کررہی تھی۔ وہ اسے تسلی دے رہے تھے کہ جلد پولیس اور دوسرے قانون نافذ کرنے والے اداروں کے افراد وہاں آجائیں گے اور وہ انہیں بچالیں گے۔ اسد تجربے کے لیے اولین تار انٹرنس لابی کی طرف سے آنے والی راہداری کے ایک سوئچ بورڈ تک لے کر آیا۔ اس نے ساکٹ کے دونوں سوراخوں میں تار کے ننگے سرے داخل کیے اور ذرا پیچھے ہو کر اس کا سوئچ آن کیا۔ ایک شعلہ لپکا اور دھماکا ہوا اس کے ساتھ ہی راہداری تاریکی میں ڈوب گئی۔ لڑکیوں نے ہلکی سی چیخ ماری تھی۔ اسد نے خوش ہوکر کہا۔

''تجربہ کامیاب رہا۔''

اسی لمحے دھاتی دروازے کا شیشہ ٹوٹنے کی آواز آئی اور وہ سب بے ساختہ وہاں سے پیچھے بھاگے تھے۔ مسلح افراد اندر آنے والے تھے اور بہ ظاہر ان سے بچنے کی کوئی صورت نظر نہیں آرہی تھی۔

☆☆☆

بدری اندر آیا تو اس کے ہونٹوں پر ایک سفاک سی مسکراہٹ تھی۔ ''شروع میں چار شکار کیے ہیں۔''

گائیگر نے جوابی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''یہ آغاز ہے، ابھی اور شکار ہوں گے۔''

''میں نے ٹریپ لگا دیا ہے، آنے والوں کو پہلا جھٹکا گیٹ پر ہی لگ جائے گا۔''

''انہیں بے وقوف مت سمجھو۔ اب یہ بڑے ہوشیار ہو گئے ہیں۔ امکان ہے کہ وہ اس ٹریپ سے بچ جائیں گے مگر اس سے انہیں معلوم ہو جائے گا کہ ہم آسانی سے قابو میں آنے والے نہیں ہیں۔''

اسلم، عباس، شبیر اور شفیع ایک جگہ موجود تھے۔ سورما، گائیکر کے حکم پر ایک بار پھر لیب اور لائبریری والی عمارت چیک کرنے چلا گیا۔ اگرچہ اس نے بہت برا سا منہ بنایا تھا مگر اسے حکم کی تعمیل کرنا ہی تھی۔ گائیکر نے راہداری میں کھلنے والے دھاتی دروازے کی طرف دیکھا اور بولا۔ ''وقت آ گیا ہے دوستو۔''

اسلم نے پوچھا۔ ''اندر موجود افراد کے ساتھ کیا کرنا ہے؟''

''ان کو پکڑنا ہے۔ کوشش کرو کہ کسی کو مارنا نہ پڑے۔ معمولی زخمی کرنے میں حرج نہیں ہے۔ اس وقت ہمیں یرغمالیوں کی ضرورت ہے۔'' گائیکر نے کہا اور دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ ''اسے کھولو۔''

اسلم اور اس کے ساتھی دروازے کی طرف بڑھے تھے کہ ریسپشن پر موجود فون کی گھنٹی بجی۔ گائیکر نے آگے بڑھ کر ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف سے کسی نے کھردری آواز میں کہا۔ ''کون بات کر رہا ہے؟''

''جسے تم نے کال کی ہے۔'' گائیکر نے استہزائیہ لہجے میں جواب دیا۔

کھردری آواز والے نے کسی قدر توقف کے بعد پوچھا۔ ''کیا چاہتے ہو تم؟''

''فی الحال صرف اتنا چاہتا ہوں کہ تمہاری طرف سے کوئی جذباتی قدم نہ اٹھایا جائے جس کا نتیجہ کم سے کم.... افراد کی ہلاکت کی صورت میں نکلے۔'' گائیکر کا لہجہ سرد ہو گیا۔ ''اتنا تو تم جانتے ہو گے کہ یہاں.... ٹیچر اور.... طلبہ موجود ہیں۔''

''ہماری طرف سے کوئی جذباتی قدم نہیں ہو گا مگر ہم یہ صورتِ حال زیادہ دیر برداشت بھی نہیں کر سکتے۔ اندر سے ایک بھی فائر کی صورت میں ہمارے لیے ایکشن روکنا مشکل ہو جائے گا۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟''

''کوئی فائر نہیں ہو گا۔ جب تک تمہاری طرف سے کوئی حرکت نہ ہو۔'' گائیکر نے جواب دیا۔ ''ہم ایک مقصد لے کر آئے ہیں، اگر وہ مقصد پورا ہو گیا تو ہم یرغمالیوں کو رہا کر دیں گے۔ مگر کوئی فرد انسٹی ٹیوٹ کے احاطے میں داخل ہونے کی کوشش نہ کرے ورنہ نتائج کی ذمے داری تم پر ہو گی اور یہاں کی لائٹ نہیں بند ہونی چاہیے، لائٹ بند ہونے کا مطلب ہو گا تمہاری طرف سے گڑبڑ اور اس کا نتیجہ یرغمالیوں کے لیے برا نکلے گا۔''

گائیکر نے کہتے ہوئے فون رکھ دیا اور اسلم کی طرف دیکھا جس نے رائفل کے بٹ سے دروازے پر لگے شیشے توڑ دیے تھے اور اب اندر ہینڈلز میں پھنسی میز کو نکالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ شفیع اس کی مدد کر رہا تھا۔ اسلم نے گائیکر کو مطلع کیا۔ ''ابھی اندر کی روشنی بند ہو گئی ہے۔ جھماکا ہوا ہے جیسے فیوز اڑا ہو۔''

''اس کی فکر مت کرو، اپنا کام کرو۔''

اتنے میں سورما اندر آیا اور اس نے بتایا۔ ''باہر پولیس آ گئی ہے مگر وہ گیٹ سے دور ہے۔''

''گارڈز کی لاشیں کیا کی ہیں؟'' شیر باز نے سورما سے پوچھا۔

''جو طے کیا تھا۔'' سورما نے جواب دیا۔ گارڈز کے بارے میں طے تھا کہ انہیں مار کر ان کی لاشیں نالے میں ڈال دی جائیں تا کہ وہ کسی کی نظر میں نہ آئیں۔ ایسا لگ رہا تھا کہ گائیکر فی الحال گارڈز کی موت چھپانا چاہتا تھا۔ اسلم اور شبیر نے مل کر کسی طرح میز نکال دی اور دروازہ کھل گیا تھا۔ گائیکر نے حکم دیا۔

''تم سب دو دو کی ٹیم بنا کر اندر جاؤ اور مختلف جگہوں پر دیکھو۔ یہاں چھپنے کی خاصی جگہیں ہیں۔ ممکن ہے وہ لوگ پھیل کر چھپ گئے ہوں۔ جو ملیں انہیں یہاں لے آنا اور فی الحال کسی کے ساتھ کسی قسم کی کوئی زیادتی نہیں ہونی چاہیے۔'' گائیکر نے کہتے ہوئے خاص طور سے سورما کی طرف دیکھا تھا اور اس نے برا سا منہ بنایا۔ اسلم کے ساتھ سورما تھا۔ شفیع اور شبیر تھے جبکہ بیدار کے ساتھ عباس ہوتا۔ وہ کھلے ہوئے دروازے سے اندر داخل ہو گئے۔ انہوں نے رائفلز تان رکھی تھیں۔

☆☆☆

میٹنگ روم میں غفور صاحب کے ساتھ دارالحکومت کا پولیس چیف اور آئی بی چیف بھی موجود تھا اس نے کہا۔ ''ہم نے اس حملے کی خبر پہلے دے دی تھی مگر پولیس نے کوئی حفاظتی انتظامات نہیں کیے۔''

''ہمارے پاس نفری کم ہے اور بیشتر وی آئی پیز کی حفاظت پر مامور ہے۔'' پولیس چیف نے کسی قدر تلخ لہجے

میں کہا۔ ''وارننگ جاری کرنا آسان ہے اس پر ایکشن لینا آسان نہیں ہے۔''
''میرا خیال ہے ماضی کو پیٹنے کے بجائے حال پر توجہ دی جائے۔'' غفور صاحب نے کہا اور کال کے بارے میں بتایا جو انہوں نے کی تھی اور انہیں یقین تھا کہ دوسری طرف بات کرنے والا دہشت گردوں کا سرغنہ تھا۔
پولیس چیف نے کہا۔ ''کیا اس نے تسلیم کیا کہ وہی ان دہشت گردوں کا سرغنہ ہے؟''
''نہیں مگر اس کا انداز ایسا ہی تھا۔ کال کوئی مجاز فرد ہی ریسیو کر سکتا ہے۔''
''آپ کا کیا خیال ہے، یہ لوگ کیا چاہتے ہیں؟'' آئی بی چیف نے پوچھا۔
''اگر ان کا مقصد قتل و غارت گری ہوتا تو وہ اب تک یہ کام کر چکے ہوتے۔ اس وقت یرغمالیوں میں سے کوئی زندہ نہیں ہوتا۔'' غفور صاحب نے یقین سے کہا۔ ''سربراہ کا کہنا ہے کہ ان کے کچھ مطالبات ہیں، وہ تسلیم کر لیے جائیں تو یرغمالیوں کو چھوڑا جا سکتا ہے۔''
''ممکن ہے وہ یہ کام کر چکے ہوں۔'' پولیس چیف نے نفی میں سر ہلایا۔ ''میں اس کی بات پر یقین نہیں کر سکتا۔''
''اندر موجود افراد ابھی تک ان کے ہاتھ نہیں آئے ہیں۔ ان میں میری بیٹی بھی ہے۔'' غفور صاحب نے کہا۔ ''لیکن وہ عمارت کے اندر محصور ہو گئے ہیں۔''
آئی بی اور پولیس چیف چونک گئے۔ پولیس چیف نے کہا۔ ''آپ نے پہلے نہیں بتایا؟''
''یہ ایک ضمنی بات ہے، اس کا مجموعی صورتِ حال پر کوئی فرق نہیں پڑے گا۔'' غفور صاحب نے سگریٹ سلگایا۔ وہ عادی اسموکر نہیں تھے مگر کشیدہ اعصاب ہونے کی صورت میں سگریٹ استعمال کرتے تھے۔
''اس صورت میں اسپیشل یونٹ اور پولیس کمانڈوز تیز ایکشن کر کے انہیں یرغمالیوں پر قابو پانے سے پہلے ہلاک کر سکتے ہیں۔'' پولیس چیف نے کہا۔
''میں اس کا مشورہ نہیں دوں گا۔'' غفور صاحب نے نفی میں سر ہلایا۔ ''واضح رہے کہ وہ بھی مین بلڈنگ میں ہیں اور انہیں یرغمالیوں تک پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔''
''سوال یہ ہے کہ وہ دیر کیوں کر رہے ہیں؟'' آئی بی چیف نے کہا۔
''یہ اہم سوال ہے اور اس کا ممکنہ جواب ہے کہ وہ اپنی پوزیشن مضبوط کر رہے ہیں۔ ہماری طرف سے تمام ممکنہ کارروائیوں کا پہلے سے اندازہ کر کے۔''
''اور ہم کیا کر رہے ہیں؟'' آئی بی چیف نے پوچھا۔
پولیس چیف نے میز پر پھیلے آئی ٹی انسٹی ٹیوٹ اور اس کے آس پاس کے نقشے کی طرف اشارہ کیا۔ ''پولیس سامنے اور عقبی حصے میں پہنچ رہی ہے۔ سامنے سے مکمل کور کر لیا ہے مگر وہ گیٹ سے دور ہے اور عقب میں ابھی پولیس کے دستے پہنچ رہے ہیں۔''
''اسپیشل یونٹ کا دستہ یہاں پہنچ گیا ہے۔'' غفور صاحب نے گیٹ سے ذرا فاصلے پر انسٹی ٹیوٹ کے احاطے کی دیوار کی طرف اشارہ کیا۔ ''یہاں گھنے درخت ہیں اور یہیں سے ایک برساتی نالا احاطے سے باہر آتا ہے۔ وہ اس کی مدد سے اندر داخل ہو سکتے ہیں۔''
''اس جگہ سے مرکزی بلڈنگ سو میٹرز کے فاصلے پر ہے اور کوئی بھی فرد اندر موجود دہشت گردوں کی نظروں سے بچ کر وہاں تک نہیں جا سکتا ہے خاص طور سے جب انہوں نے لائٹ بند نہ کرنے کی وارننگ دے دی ہے۔'' آئی بی چیف نے کہا۔
''اسی وجہ سے اسپیشل یونٹ اسٹینڈ بائی پر ہے۔''
''ہمارے آپریشن انچارج یقیناً کوئی اسٹریٹجی تیار کر رہے ہوں گے۔'' پولیس چیف نے تجویز پیش کی۔ ''بہتر ہو گا کہ ہم بھی وہاں موجود ہوں۔''

☆☆☆

سعد اس علاقے سے اچھی طرح واقف تھا اس لیے اس نے گاڑی نالے سے کچھ دور روکی تھی۔ گاڑی سے اترتے ہوئے اس نے رائفل شانے سے ٹانگ لی اور جھاڑیوں کی آڑ لیتے ہوئے نالے تک آیا۔ شام کا جھٹپٹا تیزی سے چھا رہا تھا اور کچھ دیر میں تاریکی چھا جاتی۔ اس طرف آنے سے پہلے اس نے پولیس کی گاڑیوں کو انسٹی ٹیوٹ کے سامنے والے حصے کی طرف جاتے دیکھ لیا تھا اور اس سے پہلے پولیس پیچھے بھی آتی وہ نالے سے اندر پہنچ جانا چاہتا تھا۔ یہاں نالا کچا تھا اور اس کے کنارے بہت گھنی جھاڑیاں اور اونچی گھاس تھی۔ اس میں سیکڑوں افراد چھپ سکتے تھے اور ان کا پتا چلانا آسان نہ ہوتا۔ اب سعد جان گیا کہ حملہ آوروں نے اندر داخل ہونے کے لیے نالا کیوں استعمال کیا تھا۔ بارش نہ ہونے کی وجہ سے نالے میں پانی بھی نہیں تھا اور بس کہیں کہیں کیچڑ یا نمی تھی۔ سعد آرام سے نالے میں اتر گیا اور تیزی سے آگے بڑھنے لگا۔
اس نے پستول ہاتھ میں رکھا تھا۔ فی الحال اسے

رائفل کی ضرورت محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ انسٹی ٹیوٹ کی عمارت نظر آتے ہی اس نے رفتار سست کر لی اور محتاط قدموں سے آگے بڑھا۔ یہاں نیم تاریکی تھی اور کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ سعد نے لمبی گھاس کی ڈنڈی توڑی اور اسے آگے کر کے چلنے لگا۔ انسٹی ٹیوٹ کی چار دیواری اور فولادی جال سے ذرا پہلے گھاس کی ڈنڈی کسی چیز سے ٹکرائی اور مڑنے لگی۔ سعد فوراً رک گیا تھا پھر اس نے چھوٹی ٹارچ جلا کر اس کی روشنی ڈالی تو ایک سرمئی دھاتی تار نظر آیا جو دائیں سے بائیں طرف تنا ہوا تھا۔ وہ تار کے ساتھ اس کے مخرج تک گیا جو ایک پن گرینیڈ ثابت ہوا۔ ایسا ہی گرینیڈ دوسری طرف بھی تھا۔ یہ ٹریپ تھا اور اگر وہ بغیر دیکھے تار سے ٹکراتا تو کم سے کم ایک گرینیڈ پھٹ جاتا اور اس کے چیتھڑے اڑ جاتے۔ گرینیڈز پائپ کی شکل کے تھے اور یہ گیلی زمین میں آسانی سے نصب کیے جا سکتے تھے۔

سعد نے احتیاط سے ایک گرینیڈ زمین سے نکالا اور خیال رکھا کہ تار کھنچنے نہ پائے۔ پھر دوسرا گرینیڈ نکالا اور ان کی پنیں واپس اندر کر کے انہیں اپنے بیگ میں رکھ لیا۔ وہ آگے آیا اور یہاں بھی اس نے احتیاط سے کام لیا تھا۔ مگر آگے کوئی ٹریپ نہیں تھا۔ فولادی جال کٹا ہوا تھا اور اس میں ایک آدمی آسانی سے اندر داخل ہو سکتا تھا۔ انسٹی ٹیوٹ کے اندر کنارے کو زیادہ ترچھا کر کے اس پر پھسلواں پتھر لگا دیے تھے تاکہ کوئی آسانی سے اوپر نہ چڑھ سکے۔ مگر سعد کے لیے مسئلہ نہیں تھا۔ اس کے پاس ڈوری اور سوالیہ نشان جیسا ہک تھا۔ اس نے ہک رسی سے باندھا اور اسے اوپر اچھالا۔ تیسری کوشش میں وہ ریلنگ میں پھنس گیا۔ وہ آرام سے چڑھ کر اوپر آ گیا۔ وہ عقبی باغ میں ہی نکل آیا تھا کیونکہ سامنے وہ لوگ تھے اور انہوں نے وہاں کوئی نہ کوئی ٹریپ لگایا ہوگا۔ سعد عقب سے ہی مرکزی عمارت کی طرف بڑھا تھا۔ سورج ڈوب چکا تھا اور تاریکی تیزی سے پھیل رہی تھی وہ اسی کا فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ کیونکہ کچھ دیر میں روشنیاں آن ہو جاتیں اور پھر نظر میں آنے کا امکان زیادہ ہو جاتا۔ وہ فرحت کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ وہ اس وقت کہاں ہوگی؟

☆☆☆

شیشہ ٹوٹنے کی آواز پر سب تیزی سے پیچھے آئے تھے اور فرحت لڑکیوں سے کہہ رہی تھی کہ وہ الگ الگ جگہوں پر چھپ جائیں۔ لڑکیاں بدحواس ہو کر مختلف کھلے کمروں میں جا رہی تھیں۔ فرحت نے محسوس کیا کہ وہ نچلی منزل پر محفوظ نہیں تھے اس نے سیڑھیوں سے اوپر کا رخ کیا۔ اسد اور دوسرے لڑکے اب باقی جگہوں کے فیوز اسی طرح اڑا رہے تھے۔ فرحت کے ساتھ ثمی اور ثوبیہ تھیں۔ باقی لڑکیاں نچلی منزل پر چھپنے کی جگہ تلاش کر رہی تھیں۔ ثمی نے اسے بتایا۔ ''میں نے اپنے پاپا سے بات کی ہے۔ وہ انٹیریئر منسٹری میں افسر ہیں اور انہوں نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ جلد ہمیں یہاں سے نکال لیا جائے گا۔''

فرحت نے نفی میں سر ہلایا۔ ''یہ اتنا آسان نہیں ہے، آنے والے بہت تربیت یافتہ اور چالاک ہیں۔ ان کے پاس مکمل پلان ہے اور وہ اس کے مطابق عمل کر رہے ہیں۔''

''ہمیں آڈیٹوریم میں جانا چاہیے۔'' ثوبیہ نے کہا۔

''نہیں وہاں ہم آسانی سے محصور ہو جائیں گے۔'' فرحت نے کہا۔ ''ہمیں یہاں بھی لائٹس اڑانا ہوں گی۔''

''مجھے بجلی سے ڈر لگتا ہے۔'' ثوبیہ بولی۔

''میں کروں گی۔'' ثمی نے ہمت سے کہا۔ ''ہمیں تار تلاش کرنا ہوگا۔''

فرحت کی کلاس میں پینٹنگ کا رنگ جلد خشک کرنے کے لیے پیڈسٹل فین تھا۔ ثمی گئی اور اس کا تار توڑ کر لے آئی۔ اسی دوران میں نیچے سے لڑکیوں کے چلانے کی... آواز آئی۔ ان لوگوں کے چہرے سفید پڑ گئے تھے۔ شاید نیچے رہ جانے والی لڑکیاں پکڑی گئی تھیں۔ ان کی چیخوں کے ساتھ اجنبی مردانہ آوازیں بھی آ رہی تھیں جو انہیں ڈرا دھمکا رہے تھے اور خاموش ہونے کا کہہ رہے تھے۔ لڑکے نہ جانے کہاں تھے۔ اچانک اس جگہ کی لائٹ چلی گئی جہاں فرحت اور دوسری لڑکیاں تھیں۔ یہ یقیناً اسد اور اس کے ساتھیوں کی کارروائی تھی۔ شہریار اور عمران جوتہ خانے کی طرف گئے تھے ان کا کچھ پتا نہیں تھا۔ فرحت نے آہستہ سے کہا۔ ''آواز مت نکالنا اور خاموش رہو۔''

''مجھے ڈر لگ رہا ہے۔'' ثوبیہ نے کہا۔ ''اندھیرے میں میرا دم گھٹنے لگتا ہے۔''

ثمی نے اپنا موبائل نکال کر اس کی اسکرین آن کی۔ تب اسے پتا چلا کہ اس کے موبائل پر اس کے پاپا کی کالز آ رہی تھیں۔ اس نے غفور صاحب کو کال کی۔ انہوں نے ریسیو کی اور بے تابی سے بولے۔ ''ثمی تم کہاں ہو؟''

ثمی نے باپ کو بتایا۔ ''پاپا ہم آڈیٹوریم کے پاس ہیں۔ وہ اندر آ گئے ہیں اور انہوں نے کچھ لڑکیوں کو پکڑ لیا ہے۔ ہم یہاں کے فیوز اڑ رہے ہیں۔''

''یہ تم لوگ اچھا کر رہے ہو۔'' غفور صاحب بولے۔

''ہم باہر آ گئے ہیں اور ان لوگوں سے بات کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔''

''پاپا پلیز کچھ کریں۔'' شمی بھی روہانسی ہونے لگی۔ اگرچہ وہ بہادری کا مظاہرہ کر رہی تھی مگر باپ کی آواز سن کر کمزور پڑ گئی تھی۔ ''مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔''

''تم فکر مت کرو بیٹا، ہم پوری کوشش کر رہے ہیں۔''

فرحت کا موبائل اس کے ہاتھ میں تھا، اس کی اسکرین روشن ہوئی تو اس نے دیکھا۔ سعد کال کر رہا تھا۔ فرحت نے کال ریسیو کی۔ ''آپ کہاں ہیں؟''

''کسی کے سامنے ذکر مت کرنا اور نہ تاثر دینا، میں اندر آ گیا ہوں۔'' سعد نے جواب دیا۔ ''میں مین بلڈنگ کے عقبی حصے میں ہوں۔''

فرحت خوش ہوئی تھی مگر اس نے ظاہر نہیں کیا۔ ''وہ اندر گھس آئے ہیں اور کچھ لڑکیوں کو پکڑ لیا ہے۔ میں اور دو لڑکیاں اوپر آڈیٹوریم کے پاس ہیں۔ لڑکوں نے کچھ جگہوں کی لائٹ اڑا دی ہے مگر وہ سب جگہوں کی نہیں اڑا سکے ہیں۔''

''یہ عمارت بہت بڑی ہے اور اگر تم سب الگ الگ ہو کر پھیل جاؤ تو وہ آسانی سے تمہیں تلاش نہیں کر سکیں گے۔''

''میں لڑکیوں کو سمجھا رہی ہوں مگر وہ ڈر کر الگ ہونے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ پھر یہ عام لڑکیاں ہیں، جو ہم سے الگ ہوئی تھیں وہ آسانی سے ان کے ہاتھ آ گئیں۔'' فرحت نے کہا۔ سعد کو یہ سن کر مایوسی ہوئی تھی کہ حملہ آوروں کے ہاتھ کچھ لڑکیاں آ گئی ہیں اور اب وہ پہلے سے زیادہ بہتر پوزیشن میں تھے۔ اس نے کہا۔

''کسی کلاس روم میں چلے جاؤ اور دروازہ اندر سے بند کر کے فرنیچر اس کے سامنے لگا دو۔''

فرحت آڈیٹوریم کے ساتھ واقع کلاس رومز تک آئی۔ ایک کلاس روم کا دروازہ کھلا تھا۔ اس نے لڑکیوں کو اندر بلا لیا۔ یہاں روشنی تھی۔ انہوں نے پہلے دروازہ اندر سے بند کر کے اس کی کنڈی لگائی اور پھر اس کے آگے میزیں جمع کرنے لگیں۔ میزیں لکڑی کی اور بھاری نہیں تھیں مگر ایک کے اوپر ایک رکھنے سے خاصا وزن آ گیا تھا۔ فرحت اپنی حالت سے قطع نظر ان کا پورا ساتھ دے رہی تھی۔ ذرا سی دیر میں انہوں نے کلاس کا سارا فرنیچر دروازے کے آگے لگا دیا تھا۔ اس کے بعد فرحت نے اندر کی لائٹ بند کر دی۔ کلاس روم کی صرف ایک کھڑکی تھی جو عمارت کے دائیں پہلو میں تھی۔ فرحت نے اس کے شیشے سے باہر جھانکا تو اسے باغ میں ایک سایہ حرکت کرتا دکھائی دیا مگر وہ یقین سے نہیں کہہ سکتی تھی کہ وہ سعد تھا۔

☆☆☆

گائیکر بے چینی سے ٹہل رہا تھا اور وہ بار بار راہداری کے دروازے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ بالآخر سورما اور اسلم پانچ لڑکیوں کے ساتھ وہاں سے برآمد ہوئے اور وہ خوش ہو گیا۔ لڑکیاں سہمی ہوئی اور رو رہی تھیں۔ گائیکر نے درشت لہجے میں کہا۔ ''چپ رہو، تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔''

''ہمیں جانے دو۔'' ایک لڑکی نے گڑگڑا کر کہا۔

''جلد تمہیں جانے دیں گے۔'' اس بار گائیکر نرمی سے بولا۔ ''لیکن پہلے سب اپنا نام بتائیں۔''

لڑکیاں اپنا نام بتانے لگیں۔ گائیکر کاؤنٹر پر رکھے نوٹ پیڈ پر نام نوٹ کر رہا تھا۔ یہ کام کر کے اس نے لڑکیوں کو دیوار کے ساتھ بیٹھنے کا حکم دیا اور سورما کی طرف دیکھا۔ ''تم یہاں کیا کر رہے ہو، باقیوں کو کون لائے گا؟''

''دوسرے بھی ہیں۔'' سورما لڑکیوں کو گھورتے ہوئے بولا۔ ''وہ لے آئیں گے۔''

''مجھے یہاں پورے مطلوبہ افراد چاہئیں۔'' گائیکر نے سرد لہجے میں بولا۔ ''جاؤ اور تلاش کرو۔''

سورما بادل ناخواستہ اسلم کے ساتھ اندر گیا تھا۔ اس کے جاتے ہی گائیکر نے گھڑی دیکھی اور فون اٹھایا۔ اس نے وہی نمبر ڈائل کر دیا جس سے کال آئی تھی۔ یہ غفور صاحب کا سرکاری موبائل نمبر تھا۔ انہوں نے کال ریسیو کی۔ گائیکر نے کہا۔ ''تم نے مجھ سے پوچھا تھا کہ میں کیا چاہتا ہوں۔ چھ بجے والا ایکشن صرف دو منٹ کے فاصلے پر ہے۔ ٹاپ کے نیوز چینلز میں سے کوئی بھی چینل لگاؤ، تمہیں میرا مطالبہ پتا چل جائے گا۔'' اس نے کہتے ہی ریسیور رکھ دیا اور ریڈیو پر کہا۔ ''تم لوگ اب تک کیا کر رہے ہو صرف پانچ لڑکیاں ملی ہیں باقی.... افراد کہاں ہیں؟''

''ہم تلاش کر رہے ہیں۔'' بدری نے جواب دیا۔ ''انہوں نے یہاں کچھ جگہوں کی لائٹ اڑا دی ہے۔''

''اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔'' گائیکر غرایا۔ ''تمہارے پاس سب کچھ ہے۔''

''جگہ بہت بڑی ہے۔'' اس بار سورما بولا۔ ''ہمیں سارے بند دروازے توڑنے پڑ رہے ہیں۔''

گائیکر ان کی مجبوری سمجھ رہا تھا کہ وہ کوئی دروازہ یہ سوچ کر نظرانداز نہیں کر سکتے تھے کہ وہ لاک ہوگا۔ ممکن ہے

کچھ افراد نے اندر گھس کر اسے بند کر لیا ہو۔ مگر اس نے لہجہ نرم نہیں کیا۔ ”تلاش تیز کرو، اگر یرغمالی کم ہوئے تو ہم پورا دباؤ نہیں ڈال سکیں گے۔“

☆☆☆

غفور صاحب اور پولیس چیف کمیونیکیشن ٹرک میں موجود تھے اور یہاں اسکرین پر ایک معروف نیوز چینل لائیو آرہا تھا۔ نیوز کاسٹر نے ہیڈ لائن میں ہی ذکر کر دیا تھا کہ دہشت گردوں نے آئی ٹی انسٹی ٹیوٹ پر قبضہ کر لیا ہے اور انہیں ان دہشت گردوں کا مطالبہ موصول ہوا ہے۔ تفصیلی خبروں میں واقعے کا ذکر کرتے ہوئے دہشت گردوں کا مطالبہ پیش کیا جو ایک آڈیو پیغام کی صورت میں تھا۔ ایک کرخت آواز والا شخص کہہ رہا تھا۔ ”ہمارے پاس تقریباً تیرہ یرغمالی ہیں اور ہمارا مطالبہ ہے کہ ملک کی مختلف جیلوں میں قید ستر افراد کو رہا کیا جائے۔ مطالبہ نہ ماننے کی صورت میں رات آٹھ بجے سے ہر آدھے گھنٹے بعد ایک یرغمالی کو قتل کر دیا جائے گا۔“

اس کے بعد وہ آدمی نام لے کر قید افراد کے بارے میں بتانے لگا جنہیں چھڑانا مقصود تھا۔ یہ سارے نامی گرامی دہشت گرد اور ملک کے خلاف کام کرنے والے مجرم تھے۔ جن میں سے ہر فرد پر نہایت سنگین الزامات تھے اور ان میں سے ہر ایک کو کم سے کم بھی سزائے موت ہوتی۔ وہ ملک کی مختلف جیلوں میں قید اپنے مقدمات کے فیصلوں کا انتظار کر رہے تھے۔ غفور صاحب نام نوٹ کر رہے تھے اور وہ ان سب کو اچھی طرح جانتے تھے۔ کم سے کم ایک درجن افراد کو ان کے اسپیشل یونٹ نے ہی گرفتار کیا تھا۔ ان سب کا تعلق نصف درجن مختلف دہشت گرد تنظیموں سے تھا اور انہیں کسی صورت رہا نہیں کیا جا سکتا تھا۔ خبر ختم ہونے کے بعد غفور صاحب نے ہتھیلی پر مکا مارا۔ ”ان کا مطالبہ دھوکا ہے، یہ دہشت گرد ہیں اور قتل کرنے کے ارادے سے آئے ہیں۔“

پولیس چیف نے تائید کی۔ ”اس طرح سرعام مطالبہ پیش کرنے کا مطلب صرف دہشت گردی ہے۔ یہ پینک پھیلانا چاہتے ہیں۔“

غفور صاحب نے پولیس چیف کی طرف دیکھا۔ ”اب ہمارے پاس سوائے ایکشن کے اور کوئی راستہ نہیں ہے۔“

”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ پولیس کمانڈو ایکشن کے لیے تیار ہے۔“ پولیس چیف نے کہا مگر غفور صاحب نے نفی میں سر ہلایا۔

”اس کے لیے میرا اسپیشل یونٹ زیادہ موزوں ہے۔“

یہ سن کر پولیس چیف کا چہرہ تن گیا۔ اس نے کہا۔ ”یہاں کا انچارج میں ہوں۔“

”واقعی؟“ غفور صاحب نے طنزیہ لہجے میں کہا اور کمیونیکیشن ٹرک سے اتر گئے۔ پولیس کا محکمہ ان کے اسپیشل یونٹ کا سب سے بڑا مخالف تھا اور اس کے افسران کی پوری کوشش تھی کہ کسی طرح اسے اینٹی ٹیررسٹ مقاصد سے ہٹا کر یہ کام پولیس کمانڈوز کے حوالے کر دیا جائے۔ لیکن اسپیشل یونٹ کی کارکردگی اس کے مخالفوں کی ناکامی کی بنیادی وجہ تھی۔ اس دوران میں کچھ وزراء اور اعلیٰ حکومتی ارکان کی وہاں آمد شروع ہو گئی تھی جن کی وہاں قطعی ضرورت نہیں تھی مگر وہ میڈیا میں آنے کے شوق میں یہاں چلے آئے تھے۔ غفور صاحب اس طرف بڑھ گئے جہاں ان کے یونٹ کی گاڑیاں موجود تھیں اور ایک چھوٹی وین میں وسیم اور اس کے ساتھ آپریٹر ماتحت موجود تھے۔ غفور صاحب اندر آئے اور سلائڈنگ ڈور بند کر لیا۔ ”کیا رپورٹ ہے؟“

وسیم نے رپورٹ پیش کی۔ ”سر میرے آٹھ آدمی اندر جانے کے لیے تیار ہیں۔ ہمارے پاس انسٹی ٹیوٹ کا مکمل نقشہ ہے اور مرکزی عمارت کا تھری ڈی نقشہ بھی حاصل کر لیا ہے۔“

”گڈ، مجھے دکھاؤ۔“

وین جدید ترین کمپیوٹرز اور دوسرے آلات سے لیس تھی جس میں بڑے سائز کی ایل ای ڈی اسکرینیں بھی تھیں۔ وسیم نے آپریٹر کو اشارہ کیا۔ اس نے اپنے سامنے رکھے کی بورڈ کے چند بٹن دبائے اور اسکرین پر مرکزی عمارت کا تھری ڈی نقشہ آگیا۔ آپریٹر نے انٹرنس لابی سے شروع کیا اور عمارت کا اندرونی حصہ دکھانے لگا۔ غفور صاحب نے کہا۔ ”یہاں چھپنے کی خاصی جگہیں ہیں۔“

”ہاں مگر لڑکیاں اور لڑکے ناتجربے کار ہیں۔ اب تک کی اطلاعات کے مطابق کچھ لڑکیاں ان کے قبضے میں آگئی ہیں۔ مگر سعد کی بیوی اور چند دوسرے طلبا ابھی آزاد ہیں۔“

غفور صاحب نے سر ہلایا۔ ”تبھی وہ اعتماد سے بات کر رہا تھا۔ سعد کہاں ہے؟“

وسیم جھجکا پھر اس نے بتایا۔ ”وہ انسٹی ٹیوٹ کے احاطے میں مرکزی عمارت کے پاس ہے۔“

”نہتا؟“

”نو سر، اس کے پاس مکمل کٹ اور اسلحہ ہے۔“ وسیم نے ایک بار پھر مشکل سے کہا۔ لیکن غفور صاحب نے پوچھا

نہیں کہ جب وہ معطل ہے تو اس کے پاس اسلحہ اور کٹ کہاں سے آئی۔ ان کی توجہ فی الحال اس مسئلے پر تھی جس میں ان کی بیٹی بھی شامل تھی مگر انہوں نے ایک بار بھی اس کے بارے میں بات نہیں کی تھی۔ وہ جانتے تھے کہ جو سب کے ساتھ ہو گا وہی ان کی بیٹی کے ساتھ بھی ہوگا۔

''اب کیا حکم ہے سر؟'' وسیم نے پوچھا۔

''فی الحال اسٹینڈ بائی رہو اور سعد سے مستقل رابطے میں رہو۔ وہ اندر موجود ہے اور اس کی بیوی عمارت میں ہے، وہ زیادہ بہتر معلومات فراہم کرسکتا ہے۔''

غفور صاحب کہہ کر نیچے اتر آئے۔ انہوں نے موبائل نکالا اور وزیر داخلہ کو کال کرنے لگے۔ اس وقت انہوں نے دیکھا کہ پولیس کمانڈوز اندر گھسنے کی تیاری کر رہے تھے۔

☆☆☆

سعد اس وقت مرکزی عمارت کے دائیں پہلو میں تھا۔ یہاں نچلی منزل اور اوپری منزل کی کچھ کھڑکیاں کھل رہی تھیں مگر یہ مکمل طور پر گرلڈ تھیں۔ وہ عقبی حصے کا پہلے ہی جائزہ لے چکا تھا۔ پیچھے کی طرف جو گیلری کھلتی تھی اس پر گرل لگی ہوئی تھی اور اگر وہ کسی طرح اس دومنزلہ عمارت کی چھت پر پہنچ جاتا تب بھی نیچے نہیں اتر سکتا تھا کیونکہ چھت پر کھلنے والا مضبوط دھاتی دروازہ لاک تھا۔ سوائے انٹرنس لابی کو چھوڑ کر عمارت کے تمام ہی اہم دروازے دھات کے اور بہت مضبوط بنے تھے۔ سعد کو یقین تھا کہ انٹرنس لابی میں بھی کوئی ٹریپ ہوگا۔ جیسا کہ اسے نالے سے ملا تھا۔ پھر اسے انسٹی ٹیوٹ کے گیٹ کا خیال آیا اور اس نے وسیم کو کال کی۔ ''کوئی گیٹ کے پاس تو نہیں ہے؟''

''نہیں لیکن پولیس کمانڈوز اندر گھسنے کی تیاری کر رہے ہیں۔''

''انہیں روکو۔'' سعد نے تشویش سے کہا۔ ''انہوں نے وہاں کوئی ٹریپ لگایا ہوگا۔''

''پولیس چیف یہاں کے انچارج بنے ہوئے ہیں۔'' وسیم نے کسی قدر طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''وہ باس کی کوئی بات سننے اور ماننے کو تیار نہیں ہیں۔''

''ہمارے آدمی کہاں ہیں؟''

''فرنٹ والے لان کے بالکل ساتھ والی دیوار کے پیچھے جہاں چند گھنے درخت آس پاس ہیں۔''

''مناسب جگہ ہے۔'' سعد نے کہا۔ ''مگر یہاں عمارت میں گھسنے کی کوئی جگہ نظر نہیں آرہی ہے۔''

''ہمارے پاس بلڈنگ کا تھری ڈی نقشہ ہے۔'' وسیم نے کہا۔ ''میں دیکھتا ہوں کہ اس میں داخلے کے اور کون سے راستے ہوسکتے ہیں۔''

سعد پُرامید ہوگیا۔ ''شاید اس سے کام بن جائے۔''

☆☆☆

شہریار اور عمران تہ خانے تک آئے تھے مگر یہ جگہ اصل میں کباڑ رکھنے کے لیے استعمال ہوتی تھی اور یہاں زیادہ جگہ بھی نہیں تھی۔ وہ واپس آرہے تھے کہ اس جگہ تاریکی چھا گئی۔ یہ چھوٹی سی راہداری تھی جو انٹرنس لابی میں بھی کھلتی تھی اور سروس والے اسے استعمال کرتے تھے۔ وہ اندھیرے میں آگے بڑھ رہے تھے اور انہوں نے ڈر کر اپنے موبائل کی روشنی نہیں کی تھی اس لیے وہ بے خیالی میں بڑی راہداری میں نکلے۔ وہاں بھی تاریکی تھی اور اس تاریکی میں بدری، عباس کے ساتھ موجود تھا۔ آہٹ محسوس کر کے انہوں نے اچانک اپنی ٹارچیں روشن کیں اور ان دونوں کو ہینڈز اپ کرلیا۔ بدری نے ریڈیو پر گائیکر کو اطلاع دی۔ ''دو اور ہاتھ آئے ہیں۔''

''لڑکیاں ہیں؟''

''نہیں لڑکے ہیں۔'' بدری نے جواب دیا۔

''لے آؤ۔''

اسد، عمار اور منیر عمارت کے مختلف حصوں کے فیوز اڑاتے پھر رہے تھے، ساتھ ہی وہ خود کو بچا بھی رہے تھے۔ پانچ لڑکیاں ان کے سامنے پکڑی گئی تھیں اور وہ انہیں بچانے کے لیے کچھ نہیں کرسکے تھے۔ انہیں پکڑنے والے پوری طرح مسلح اور صورت سے خطرناک لگ رہے تھے۔ وہ تینوں اس وقت ایک کلاس روم میں تھے جب لڑکیاں پکڑی گئی تھیں۔ جیسے ہی وہ لوگ لڑکیوں کو لے کر نکلے یہ تینوں وہاں سے نکل آئے تھے۔ نیچے کے بیشتر فیوز اڑا کر اب وہ اوپری منزل پر آئے تھے۔ انہوں نے سیڑھیوں کی لائٹ کا فیوز بھی اڑا دیا تھا اور اس کے ساتھ ہی اوپری منزل کا کچھ حصہ تاریک ہوگیا تھا۔ وہ اوپر آئے تو انہیں فرحت اور باقی دو لڑکیاں نظر نہیں آئی تھیں۔ اسد نے اوپر آنے کے بعد کہا۔ ''اس طرح بچنا مشکل ہے، ہمیں یہاں سے نکلنے کی کوشش کرنی چاہیے۔''

''نکلنے کا صرف ایک راستہ ہے اور اس پر وہ لوگ بیٹھے ہیں۔'' عمار نے نفی میں سر ہلایا۔ ''تم جانتے ہو یہاں صرف دو دروازے ہیں اور پیچھے کا دروازہ لاک ہے۔ ہر کھڑکی اور عقبی بالکونی گرل والی ہیں۔ ہم چھت پر بھی نہیں

جاسکتے۔''
''میڈم اور لڑکیاں کہاں ہیں؟'' منیر نے پوچھا۔
''وہ اس طرف آئی تھیں۔''
''وہ کہیں چھپ گئی ہیں۔'' اسد نے کہا۔
''ہمیں بھی چھپ جانا چاہیے۔'' منیر بولا۔
''ہاں لیکن پہلے یہاں کے فیوز بھی اڑانے ہیں۔'' اسد نے کہا۔
''تار کم رہ گیا ہے۔'' عمار نے تار دیکھا۔
''اب ایک تار کو کئی بار استعمال کریں گے۔ اتنے فیوز لگانا ان لوگوں کے لیے بھی ممکن نہیں ہوگا۔''
وہ ایک سوئچ بورڈ تک آئے اور اس کے ساکٹ میں تار داخل کر کے اس کا سوئچ آن کیا تو دھماکے اور شعلے کے ساتھ وہاں تاریکی چھا گئی۔ مگر اسی لمحے عقب سے ان پر تیز روشنی آئی اور کسی نے غرا کر کہا۔ ''خبردار! ہاتھ اوپر کرلو۔''
منیر نے حماقت کی اور بے ساختہ بھاگا تھا مگر فوراً ہی ایک بے آواز فائر ہوا اور وہ پاؤں پکڑ کر ڈھیر ہو گیا۔ اس کے منہ سے چیخیں نکل رہی تھیں۔ فائر سورما نے کیا تھا۔ وہ آگے آیا اور پھاڑ کھانے والے لہجے میں بولا۔ ''اب کسی نے ایسی حرکت کی تو اس کے سر میں سوراخ کردوں گا، مردوں پر مجھے بالکل رحم نہیں آتا ہے۔''
گولی نے منیر کی پنڈلی میں سوراخ کر دیا تھا اور خون نکل کر فرش پر بہہ رہا تھا۔ سورما نے اسد اور عمار سے کہا۔ ''اسے اٹھاؤ اور نیچے چلو۔''
اسد نے منیر کا زخم دیکھا اور بولا۔ ''اس کا خون بہہ رہا ہے۔ اسے میڈیکل ایڈ کی ضرورت ہے۔''
سورما نے جواب میں اسد کے چہرے پر رائفل کی نال ماری اور اس کا رخسار پھٹ گیا، اسد نے کراہ کر چہرے پر ہاتھ رکھا تھا۔ سورما سفاک لہجے میں بولا۔ ''یہ میڈیکل ایڈ مل سکتی ہے۔ اب اٹھاؤ اسے۔''
مجبوراً اسد اور عمار نے منیر کو اٹھایا تو زخم پر زور آتے ہی اس کی چیخیں بلند ہو گئی تھیں۔ وہ اسے سہارا دے کر نیچے لے جانے لگے۔ چند منٹ بعد وہ گاٹیکر کے سامنے تھے۔ باہر تاریکی چھانے کے بعد باہر کی روشنیاں آٹو میٹک سسٹم کے تحت آن ہو گئی تھیں۔ لیکن انٹرنس لابی کی روشنیاں ان لوگوں نے خود بند کر دی تھیں۔ گاٹیکر نے نئے پکڑے جانے والوں کو دیکھا اور مطمئن انداز میں بولا۔ ''گڈ اب صرف کچھ افراد کم ہیں۔''
سورما اس کے نزدیک آیا۔ ''یہ بھی کافی ہیں۔ دس افراد کم نہیں ہوتے ہیں۔''
''لیکن مجھے اور افراد درکار ہیں۔۔۔'' گاٹیکر نے اسے گھورا۔ ''جاؤ جا کر تلاش کرو۔''
سورما دانت پیس کر رہ گیا۔ وہ کسی اور چکر میں تھا۔ وہ عورتوں کا شوقین تھا مگر گاٹیکر اور خاص طور سے مقامی افراد کے سامنے اپنے شوق کا اظہار نہیں کر سکتا تھا۔ پھر اسے کوئی خیال آیا اور اس نے پکڑے جانے والے لڑکوں سے پوچھا۔ ''اب کون کون باقی رہ گیا ہے؟''
''ہماری ٹیچر اور دو لڑکیاں۔'' اسد نے جواب دیا۔ اسے معلوم تھا کہ اگر اس نے نہ بھی بتایا تو وہ کچھ دیر میں ان تک بھی پہنچ جائیں گے اور جواب نہ دینے کی صورت میں انہیں تشدد سہنا پڑتا۔ ان لوگوں کی سفاکی وہ دیکھ اور بھگت چکے تھے۔ غلط جواب دینے کی ہمت بھی نہیں تھی۔ پکڑے جانے پر انہیں پھر سزا کا سامنا کرنا پڑتا۔ اسد کا جواب سن کر سورما کی باچھیں کھل گئیں اور اس نے گاٹیکر سے کہا۔
''میں اور بیدار جاتے ہیں۔''
''نہیں اسلم اور اس کے آدمی بھی تلاش کریں گے۔ میں جلد از جلد یہاں موجود تمام افراد کو اپنے قبضے میں دیکھنا چاہتا ہوں۔'' گاٹیکر نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ وہ سب دوبارہ راہداری سے عمارت کے اندرونی حصے کی طرف چلے گئے۔ گاٹیکر یہاں اکیلا تھا مگر اسے خود پر اعتماد تھا کہ وہ دس افراد کی اکیلے نگرانی کر سکتا تھا۔ وہ سب عام سے لوگ تھے اور وہ مسلح تھا۔ اس نے زخمی منیر کو دیکھا اور ان سب کے نام پوچھ کر نوٹ پیڈ پر لکھنے لگا۔ اس کام سے فارغ ہو کر اس نے منیر کے زخم پر کوئی کپڑا باندھنے کو کہا۔ اسد نے اپنا رومال لیا اور اسے کس کر منیر کی پنڈلی پر باندھ دیا۔ وہ درد سے چلا اٹھا مگر خون روکنے کے لیے یہ ضروری تھا۔ ساڑھے چھ بج گئے تھے اور ابھی ڈیڑھ گھنٹا باقی تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اس نے میڈیا کی مدد سے پورے ملک میں کھلبلی مچا دی تھی اور حکومت بوکھلاہٹ کا شکار ہو سکتی تھی۔
اس کا نتیجہ لازمی آپریشن کی صورت میں نکلتا۔ بہ ظاہر ان کا بچنا مشکل تھا، وہ زیادہ سے زیادہ یرغمالیوں کو ہلاک کر سکتے تھے۔ مگر گاٹیکر مطمئن نظر آ رہا تھا۔ وہ جان دینے کا فیصلہ کر کے آیا تھا یا اس کے پاس جان بچانے کا کوئی راستہ تھا۔ اچانک انسٹی ٹیوٹ کے گیٹ کی طرف سے زوردار دھماکوں کی آوازیں آئیں۔ دھماکے اتنے شدید تھے کہ یہاں بھی زمین ہل کر رہ گئی تھی۔ انٹرنس لابی کے شیشے مضبوط تھے اس لیے وہ شاک برداشت کر گئے لیکن عمارت کی باقی

کھڑکیوں کے شیشے اتنے مضبوط نہیں تھے۔ ان کے ٹوٹنے اور بکھرنے کی آوازیں بعد میں آئی تھیں۔ گائیکر ان شدید دھماکوں پر ذرا بھی پریشان نہیں ہوا تھا بلکہ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی تھی۔ بدری نے انسٹی ٹیوٹ کے گیٹ پر گارڈز کی چوکیوں میں ٹریپ لگایا تھا جیسے ہی کوئی اندر آنے کی کوشش کرتا وہاں موجود بم خوفناک دھماکوں سے پھٹ جاتے اور ایسا ہی ہوا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ کسی نے اندر آنے کی کوشش کی تھی اور وہ ٹریپ کا شکار ہوگیا تھا۔ دھماکے نے لڑکے اور لڑکیوں کو بھی ہلا دیا تھا۔ انہیں لانے والوں نے ان کی تلاشی لے کر ان کے پاس سے سب نکال لیا تھا اور ان کا سامان کاؤنٹر پر اسٹیشنری کی ٹوکری میں رکھا ہوا تھا، اس میں موبائل اور پرس وغیرہ تھے۔ گائیکر نے ایک موبائل اٹھایا اور ایک لڑکی کو آگے بلایا۔ وہ لرزتے قدموں سے آگے آئی۔ گائیکر نے اس سے کہا۔

''ٹیچر اور باقی... لڑکیوں کو کال کرو۔''

☆☆☆

غفور صاحب وزیر داخلہ سے بات کر رہے تھے کہ انسٹی ٹیوٹ کے گیٹ کی طرف سے خوفناک دھماکے سنائی دیے۔ دھماکے اتنے شدید تھے کہ تقریباً سو گز کے فاصلے پر غفور صاحب بھی نیچے گر گئے۔ ایک لمحے کو انہیں لگا کہ وہ بھی دھماکوں کا شکار ہوئے ہیں مگر چند لمحے گزرنے کے بعد انہوں نے محسوس کیا کہ وہ ٹھیک ہیں۔ وہ دھماکوں کی شاک ویوز کا نشانہ بنے تھے۔ انہوں نے بہ مشکل اپنا گر جانے والا فون اٹھایا، دوسری طرف وزیر داخلہ بار بار ان کی خیریت پوچھ رہے تھے۔ وہاں کیا ہوا یہ پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ دو درجن سے زیادہ چینل یہاں کی لائیو کوریج کر رہے تھے اور بہت بڑے شعلے ٹی وی اسکرین پر صاف نظر آئے تھے۔ غفور صاحب نے کہا۔

''میں ٹھیک ہوں لیکن یہاں سب ٹھیک نہیں ہے۔ میں اسی بارے میں بات کر رہا تھا۔ پولیس چیف نے میری مخالفت کے باوجود پولیس کمانڈوز کو اندر بھیج دیا اور وہ کسی ٹریپ کا شکار ہوئے ہیں۔ میرے خدا یہاں بہت بڑی تباہی ہوئی ہے۔''

انسٹی ٹیوٹ اور اس کے آس پاس کا علاقہ جیسے صاف ہوگیا تھا۔ پولیس کمانڈوز کے ساتھ اندر جانے کے لیے دو بکتر بند گاڑیاں بھی آگے آئی تھیں اور دھماکوں نے انہیں بھی ادھیڑ کر رکھ دیا تھا۔ کنکریٹ کی بنی ہوئی پختہ چوکیاں غائب تھیں اور ملبا دور دور تک گرا تھا۔ کئی جگہوں پر آگ لگی ہوئی تھی۔ مارے جانے اور زخمی ہونے والوں کے مجروح جسم بکھرے ہوئے تھے۔ دھواں دھار ماحول کے باوجود غفور صاحب نے وہاں کم سے کم تین لاشیں دیکھی تھیں۔ ان کا وزیر داخلہ سے رابطہ تھا کہ موبائل پر انسٹی ٹیوٹ کے نمبر سے کال آنے لگی۔ انہوں نے وزیر..... کو مطلع کیا تو انہوں نے کہا۔ ''اب یہاں کے انچارج آپ ہیں، میں بھی جائے وقوع پر پہنچ رہا ہوں۔ آپ پوری اتھارٹی کے ساتھ اس سے بات کریں اور کوشش کریں کہ اس سے مہلت حاصل ہو۔''

غفور صاحب نے کال ریسیو کی تو دوسری طرف موجود اکھڑ لہجے والے شخص نے سرد انداز میں کہا۔ ''میں نے خبردار کیا تھا کہ کوئی انسٹی ٹیوٹ میں داخل ہونے کی کوشش نہ کرے۔ مگر تم شاید مذاق سمجھ رہے ہو۔ دیکھ لو یہ مذاق تمہیں کتنی جانوں کی صورت میں پڑا ہے۔ میری آخری وارننگ ہے کوئی انسٹی ٹیوٹ میں داخل ہونے کی کوشش نہ کرے ورنہ اب ہونے والی تباہی اس سے بھی بڑی ہوگی۔''

''میری بات سنو۔'' غفور صاحب نے کہا۔ ''اس کے ذمے دار تم بھی ہو۔ تم نے اپنے مطالبات اور اسے نہ ماننے کی صورت میں دھمکی میڈیا پر دی، اس سے یہ تاثر پیدا ہوا کہ تم مرنے مارنے آئے ہو۔ اس صورت میں یہ کارروائی فطری تھی۔''

''میڈیا پر اسی لیے دیا کہ اندرون خانہ تم لوگ سب کھا پی جاؤ گے اور ان مطلوبہ افراد کی پروا بھی نہیں کرو گے لیکن اب تمہیں بہت سے لوگوں کے بہت سے سوالوں کا جواب دینا ہوگا اس لیے جو کرنا ہو سوچ سمجھ کر کرنا۔ یہ تم نے ٹھیک کہا کہ ہم مرنے اور مارنے آئے ہیں مگر اس کا انحصار تمہارے رویے پر ہے۔ جو کچھ ہوا ہے اس سے آٹھ بجے والے پروگرام پر کوئی فرق نہیں پڑے گا۔''

''لیکن ......'' غفور صاحب نے کہنا چاہا مگر رابطہ منقطع ہوگیا تھا۔ انہوں نے نمبر ملایا مگر دوسری طرف سے انگیج ٹون آ رہی تھی۔ انہیں لگا کہ ان کا بلڈ پریشر ہائی ہو رہا ہے۔ ان کے پاس دوا تھی، انہوں نے ایک گولی نکال کر منہ میں رکھی اور اسے چبا کر نگل لیا۔ چند گہرے سانس لے کر وہ خود کو بہتر محسوس کرنے لگے تو وہ پولیس کمیونیکیشن ٹرک کی طرف آئے۔ پولیس چیف وہاں چلا چلا کر کسی سے بات کر رہا تھا۔ غفور صاحب اندر آئے اور پولیس چیف کو وزیر داخلہ کے حکم سے آگاہ کیا تو اس کا چہرہ بگڑ گیا۔ مگر وزیر داخلہ کے حکم کے آگے وہ مجبور ہوگیا۔ غفور صاحب نے اسے خبردار کیا۔

"اب یہاں کوئی قدم میری مرضی کے خلاف نہیں اٹھایا جائے گا۔ سب سے پہلے ریسکیو آپریشن کیا جائے اور ایمبولینسوں کے لیے راستہ صاف کیا جائے۔"

☆☆☆

سعد صدمے کی کیفیت میں تھا۔ دھماکا اس کے سامنے ہوا تھا اور کم سے کم نصف درجن افراد براہِ راست اس کی زد میں آئے تھے۔ یہ بکتر بند گاڑیوں کے آگے آنے والے پولیس کمانڈوز تھے۔ وہ دھماکے کا براہِ راست نشانہ بنے تھے اور امکان تھا کہ ان کے جسم ٹکڑوں میں بٹ گئے تھے۔ دھماکے کی بازگشت ختم ہوئی تو اسے احساس ہوا کہ وسیم موبائل پر اسے پکار رہا ہے۔ "سعد تم ٹھیک ہو؟"

اس نے چونک کر کہا۔ "ہاں میں ٹھیک ہوں لیکن یہاں بہت بُرا ہوا ہے۔"

وسیم نے پولیس چیف کو گالی دی۔ "یہ سب اس کمینے کا کیا دھرا ہے، باس اسے منع کر کے آئے تھے مگر اس نے ہٹ دھرمی دکھائی۔ میرے خدا یہاں ہونے والا نقصان بہت بڑا ہے۔"

سعد سامنے والے باغ میں مین گیٹ سے تقریباً ڈیڑھ سو گز کے فاصلے پر تھا۔ دھماکے نے عمارتوں کے شیشے بھی توڑ دیے تھے۔ "اس سے ثابت ہو گیا ہے کہ یہاں آنے والے بہت خطرناک اور مہلک اسلحے سے لیس ہیں اس لیے اب کوئی اندر نہ آئے۔"

وسیم نے گہرا سانس لے کر کہا۔ "لیکن یرغمالیوں کو ان کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑا جا سکتا ہے۔"

"میں کوشش کر رہا ہوں۔" سعد نے کہا۔ "مین بلڈنگ کے اندر جانے کا کوئی اور راستہ ملا؟"

"دھماکے سے سسٹم متاثر ہوا ہے اسے ری اسٹارٹ کر رہے ہیں، جلد میں تمہیں بتاتا ہوں لیکن میرے آپریٹر کا کہنا ہے کہ اس قسم کی بڑے رقبے پر پھیلی ہوئی عمارت میں لازمی وینٹی لیشن سسٹم ہوتا ہے۔ اس کے ڈکٹ عام طور سے چھت پر نکلتے ہیں۔"

"اس سے کہیں جلد از جلد تلاش کرے، میں کچھ دیر میں رابطہ کرتا ہوں۔" سعد نے کہا اور کال کاٹ کر دوبارہ عمارت کے دائیں پہلو کی طرف جانے لگا۔ وہ روشنی سے بچ کر اور درختوں اور پودوں کی آڑ میں آگے بڑھ رہا تھا۔ اس نے یہاں کا جائزہ لیا مگر اسے چھت تک جانے کا کوئی ذریعہ نظر نہیں آیا تھا، کھڑکیاں چھوٹی اور دور دور تھیں ان کی گرل بھی دیوار میں فکس تھی۔ وہ گھومتا ہوا عقبی حصے میں آیا اور یہاں اسے گیلری کی گرل کی صورت میں ایک امید نظر آئی تھی۔ اگر وہ پہلے اس تک رسائی حاصل کر لیتا تو اس کے بعد وہ چھت کے اتنے نزدیک پہنچ جاتا کہ اس کی ریلنگ پر ہک پھنسا کر اوپر جا سکے۔ مگر ایسا وہ صرف اس صورت میں کر سکتا تھا کہ جب آپریٹر عمارت میں وینٹی لیشن کا ڈکٹ تلاش کر لیتا۔ ورنہ اس کا اوپر جانا بیکار تھا۔ اس نے فرحت کو کال کی۔

"تم کہاں ہو؟"

"میں دو لڑکیوں کے ساتھ ایک کلاس روم میں ہوں یہاں ہم نے دروازے کے آگے فرنیچر لگا دیا ہے۔" فرحت نے جواب دیا۔ اس کا لہجہ اب پُرسکون تھا۔ "باقیوں کے بارے میں کہہ نہیں سکتی۔"

سعد کو اس کے لہجے سے خوشی ہوئی تھی۔ وہ حوصلے اور بہادری سے صورتِ حال کا مقابلہ کر رہی تھی۔ "گڈ! اگر انہوں نے تم لوگوں کو تلاش بھی کر لیا تو وہ آسانی سے اندر نہیں آ سکیں گے۔"

"یہ دھماکا کیسا تھا۔ یہاں سب ہل کر رہ گیا؟"

"پولیس نے اندر داخل ہونے کی کوشش کی تھی۔ انہوں نے ٹریپ لگایا تھا۔ دھماکا اسی کا تھا۔"

"پلیز سعد کچھ کریں۔ یہاں بارہ معصوم لڑکے اور لڑکیاں ہیں۔"

"مجھے معلوم ہے اور میں کوشش کر رہا ہوں۔" سعد نے کہا۔ "تم حوصلہ رکھو۔ باقیوں کا کچھ پتا ہے؟"

"میرا خیال ہے وہ پکڑے گئے ہیں۔" فرحت نے کہا۔ "ہم نے طے کیا تھا کہ موبائل پر نہ تو ایک دوسرے کو کال کریں گے اور نہ ایس ایم ایس لیکن اب ان کی طرف سے کال اور ایس ایم ایس آ رہے ہیں وہ پوچھ رہے ہیں کہ ہم کہاں ہیں۔"

"تم میں سے کسی نے جواب تو نہیں دیا؟" سعد نے فکر مند ہو کر کہا۔ "یہ کام یقیناً وہی لوگ کر رہے ہیں۔"

"نہیں ہم نے جواب نہیں دیا اور نہ ہی کال ریسیو کی ہے بلکہ سوائے میرے باقی سب کے موبائل آف کر دیے ہیں۔"

"تمہارے ساتھ شامیرا نامی لڑکی ہے۔"

"آپ شمی کی بات کر رہے ہیں۔ ہاں وہ میرے ساتھ ہے۔"

"وہ میرے شعبے کے باس غفور صاحب کی بیٹی ہے۔" سعد نے انکشاف کیا۔ "وہ بھی باہر موجود ہیں۔"

فرحت حیران ہوئی تھی۔ "شمی نے مجھ سے کبھی ذکر نہیں کیا۔"

"وہ غفور صاحب کی بیٹی ہے، وہ اپنے عہدے اور مقام کی تشہیر پسند نہیں کرتے ہیں۔ امکان ہے کہ یہ بات شمی نے اپنی ساتھی لڑکیوں کو بھی نہیں بتائی ہوگی اس لیے تم بھی اسے خود تک محدود رکھوگی۔ اگر یہ بات دہشت گردوں کے علم میں آگئی تو وہ اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں گے۔"

سعد نے فرحت کو دہشت گردوں کے مطالبے اور دھمکی سے آگاہ نہیں کیا تھا۔ وسیم کی کال آنے لگی تو اس نے کال کاٹ دی اور وسیم کی کال ریسیو کی۔ وسیم نے جوش سے کہا۔ "چھت پر وینٹی لیشن کے ڈکٹ موجود ہیں۔"

سعد نے گھڑی دیکھی۔ چھ بج کر چالیس منٹ ہو رہے تھے۔ اس نے کہا۔ "میں اوپر جا رہا ہوں۔"

"میں دیوار کے ساتھ موجود ایک درخت پر اسنائپر بھیج رہا ہوں۔ وہاں سے انٹرنس لابی کا منظر صاف دکھائی دیتا ہے۔ اگر تمہیں ضرورت پڑی تو وہ وہاں موجود ہوں گے۔ تمہیں کسی چیز کی ضرورت ہے؟"

"مجھے ایک ریڈیو ہیڈ سیٹ چاہیے۔" سعد نے اپنے موبائل کا چارج تیزی سے کم ہوتے دیکھ کر کہا۔ "کیا ڈرون موجود ہے؟"

"بالکل ہے۔ تم چھت تک جاؤ میں اس سے بھیجتا ہوں۔" وسیم نے کہا۔ ان کے پاس نگرانی اور دوسرے کاموں کے چھوٹے ڈرون بھی تھے جو محدود فاصلے پر کام کرتے تھے۔ غفور صاحب نے جب اسپیشل یونٹ کی منصوبہ بندی کی تھی تو انہوں نے دور جدید کی تمام ٹیکنالوجیز کو مدِنظر رکھا تھا اور اسی حساب سے یونٹ کے لیے افرادی قوت لی تھی۔ سعد نے موبائل اندر کی جیب میں رکھا کہ اوپر چڑھنے کے دوران وہ گرے نہیں۔ باقی تمام چیزیں بالکل فکس تھیں اور غلطی سے بھی نہیں گر سکتی تھیں۔ سعد بلڈنگ کے پاس آیا اور اس نے رسی سے بندھا ہک گیلری کی طرف اچھالا۔ اس کی گرل ڈیزائن والی تھی، ہک دوسری کوشش میں ہی اس میں پھنس گیا۔ سعد رسی کے سہارے گیلری تک پہنچا اور اس نے اندر جھانکا۔ وہاں اندھیرا تھا۔ مگر اچانک ہی اندر سے تیز روشنی اس پر پڑی تھی۔

☆☆☆

سورما اور بدری اوپر والی منزل پر آئے تھے۔ انہوں نے اسلم اور اس کے ساتھیوں کو نچلی منزل پر لگا دیا تھا۔ سورما کو یقین تھا کہ ٹیچر اور... لڑکیاں اسی فلور پر تھیں۔ وہ بدری سے گائیگر کے بارے میں کہہ رہا تھا۔ "یہ ہمیں اس مشن پر لایا ہے جہاں سے واپسی نہیں ہوگی اور یہ اب بھی ہمیں مزے کرنے سے روک رہا ہے۔"

"وہ باس ہے۔" بدری نے آہستہ سے کہا۔ "اگر واپسی نہ ہوئی تو اس کی بھی نہیں ہوگی۔ ہمارا جینا مرنا ساتھ ہے۔"

"میں نے کب انکار کیا ہے۔ مگر یہاں اتنی لڑکیاں ملی ہیں اور وہ مزید کے چکر میں ہے۔ کیا ہے جو ایک دو ہمارے حوالے کر دے۔"

"تم اسلم اور اس کے ساتھیوں کو بھول رہے ہو۔" بدری نے معنی خیز انداز میں کہا۔ "وہ ہماری اصلیت سے ناواقف ہیں اور آخر میں قربانی کا بکرا بھی انہوں نے بننا ہے۔ اگر ہم نے لڑکیوں کو چھیڑا تو وہ کھٹک جائیں گے۔"

"کھٹک جائیں۔" سورما نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ "تمہیں میرا ساتھ دینا ہوگا۔ ایک ٹیچر اور... لڑکیاں یہیں ہیں۔ تم نے دوسری لڑکیاں دیکھی ہیں، کیا سندرتا ہے۔ باقی بھی ایسی ہی ہوں گی۔"

بدری بھی للچا گیا۔ اس نے سوچا اور سر ہلا دیا۔ "ٹھیک ہے لیکن پہلا مرحلہ ان کو تلاش کرنے کا ہے۔"

"وہ اسی فلور پر ہیں۔" سورما نے کہا۔ وہ گیلری کے پاس آئے تو یہاں تاریکی تھی۔ سورما نے ٹارچ آن کی تو اس کا رخ گیلری کی گرل کی طرف تھا۔ بدری ایک دم چونکا۔ اس نے کہا۔

"اس طرف کوئی ہے؟"

سورما نے روشنی گھمائی۔ "کہاں، کس طرف؟"

"مجھے لگا کہ گیلری کے باہر کسی آدمی کا سر ہے۔"

سورما نزدیک آیا اور اس نے باہر ٹارچ کی روشنی ڈالی مگر وہاں کوئی نہیں تھا۔ اصل میں اسے لڑکیوں کی بے تابی تھی اس لیے اس نے ٹھیک سے دیکھا نہیں ورنہ اسے ہک ضرور نظر آ جاتا۔ وہ واپس آیا اور بدری کے ساتھ مل کر دروازے چیک کرنے لگا۔ وہ پہلے آڈیٹوریم میں آئے جہاں فرحت کی کلاس ہوتی تھی مگر وہ خالی تھا۔ پھر وہ گھوم کر برابر والی راہداری میں آئے جہاں کلاس رومز اور دفتری نوعیت کے کمرے تھے۔ اکثر بند تھے اور جو بند تھے ان کا لاک وہ سائلنسر لگے پستول سے فائر کر کے توڑ رہے تھے۔ ایک دروازے کا لاک فائر کر کے توڑا اور اسے کھولنا چاہا تو وہ نہیں کھلا۔ سورما نے دوبارہ فائر کیا مگر اس بار بھی لٹو گھمانے سے دروازہ نہیں کھلا تھا۔ ان دونوں نے معنی خیز انداز میں ایک دوسرے کو دیکھا۔

"وہ یہیں ہیں۔" بدری آہستہ سے بولا۔

سورما کی باچھیں کھل گئیں۔ اس نے اپنے مضبوط

شانے سے دروازے پر ٹکر ماری تو وہ لرز گیا اور پاس سے کسی کی ہلکی سی آواز بھی آئی تھی۔ سورما نے سر ہلایا اور مسرور لہجے میں بولا۔ ''یہیں ہیں۔''

☆☆☆

روشنی پڑتے ہی سعد نے رسی پر گرفت ڈھیلی کی اور وہ تیزی سے نیچے گیا تھا۔ زمین کے نزدیک آکر اس نے رفتار کم کی اور پاؤں ٹکتے ہی وہ دیوار سے چپک کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے رسی کھینچی رکھی کہ گرل میں پھنسا ہک نہ ہلے۔ اوپر سے دو افراد کے بولنے کی آواز آرہی تھی اور سعد ان کی گفتگو سن رہا تھا۔ وہ گیلری تک آئے اور باہر بھی روشنی ڈالی۔ پھر واپس چلے گئے۔ سعد کو ان کا لہجہ الگ سے لگا تھا۔ لہجوں میں کوئی خاص بات تھی مگر اس وقت وہ خاص بات اس کے ذہن میں نہیں آرہی تھی۔ جیسے ہی اوپر سے آواز اور آہٹیں ختم ہوئیں اس نے نائٹ ویژن آنکھوں پر لگائی پھر اوپر چڑھنا شروع کیا۔ گیلری تک آکر اس نے اندر جھانکا مگر نائٹ ویژن میں کوئی نظر نہیں آرہا تھا۔ اب اسے اوپر جانا تھا۔ اس فلور پر ان دو افراد کی موجودگی اس کے لیے تشویشناک تھی اسے یقین تھا کہ وہ فرحت اور دوسروں کی تلاش میں وہاں آئے تھے۔

اندر کی طرف سے مطمئن ہو کر وہ اب گرل کے سہارے اوپر چڑھا اور ممکن حد تک اوپر آیا۔ یہاں سے چھت کی گرل کوئی سات فٹ اوپر تھی، اس نے ہک اوپر پھینکا مگر اوپر والی ریلنگ کا پائپ زیادہ موٹا تھا اور ہک اس میں پھنس نہیں رہا تھا۔ کئی بار کی کوشش کے بعد اس نے یہ آپشن ترک کر دیا۔ اوپر تین فٹ کی دیوار کے بعد اس پر ایک فٹ کی دھاتی ریلنگ بھی تھی۔ ہک دونوں میں سے کسی جگہ نہیں پھنس سکتا تھا۔ اس لیے اب وہ کوئی اور طریقہ دیکھ رہا تھا کہ اس کی نظر بارش کے پانی کی نکاسی کے لیے نکلے پائپ پر گئی۔ یہ گرل سے ایک فٹ بائیں طرف تھا۔ اگرچہ اس کی مدد سے چڑھنا بھی ممکن نہیں تھا مگر سعد کے ذہن میں ایک ترکیب آگئی تھی۔ اس نے کوشش کر کے پائپ پر اپنا پاؤں ٹکایا اور کسی قدر بلند ہو کر ہک کو گھما کر ریلنگ کی طرف پھینکا۔ ہک گیا اور ریلنگ کے اوپر نکلا تھا کہ سعد نے رسی روکی، نتیجے میں وزنی ہک ریلنگ کے نیچے سے گھوم کر باہر آیا اور سعد نے رسی ڈھیلی کی تو وہ واپس اندر نہیں جا سکا تھا۔ دیوار سے ٹکرا کر وہیں لٹکنے لگا۔ سعد نے رسی کو مزید ڈھیلا کیا تو ہک وزن کی وجہ سے نیچے آنے لگا اور جب وہ سعد تک آیا تو اس نے اسے پکڑ کر گرل میں پھنسا دیا اور ایک منٹ بعد وہ چھت پر تھا۔ رسی ڈھیلی کر کے اس نے پھنسا ہک نکالا اور اسے اوپر کھینچ لیا تھا۔ اوپر آتے ہی اس نے وسیم کو کال کی۔

''میں اوپر آگیا ہوں۔''

''ڈرون تیار ہے، میں روانہ کر رہا ہوں۔'' وسیم نے کہا۔ دو منٹ بعد سعد نے اپنے سر پر سیاہ رنگ کے ڈرون کی فلیش کرنے والی لائٹوں کی وجہ سے اسے دیکھا۔ یہ لائٹیں بھی اسے ہوشیار کرنے کے لیے جلائی گئی تھیں۔ چار پنکھڑیوں سے اڑنے والا ڈرون بہ آسانی چھت پر اتر گیا اور سعد نے اس کے نچلے حصے میں ٹیپ سے چپکا ہوا ریڈیو اور ہیڈ سیٹ نکال لیا۔ کام کر کے اس نے اشارہ کیا تو ڈرون دوبارہ اڑ گیا۔ اس نے ریڈیو عقب میں جیکٹ سے لگایا اور اس کا ہیڈ سیٹ کان پر فکس کر لیا۔ اب اسے وسیم سے رابطے کے لیے موبائل استعمال کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ سعد نے کہا۔

''ڈکٹ کہاں ہیں؟''

''عمارت کے وسطی حصے میں جہاں سیڑھیوں کا دروازہ نکل رہا تھا۔'' وسیم نے بتایا تو وہ دروازے تک آیا۔ یہ چھوٹا سا کمرا تھا اور دروازہ اندر سے لاک تھا۔ دروازہ اسٹیل کی مضبوط پلیٹ سے بنا ہوا تھا اور اسے گولی کی مدد سے بھی نہیں کھولا جا سکتا تھا۔ ڈکٹ اس کے عقب میں تھا۔ ڈھائی فٹ قطر کے گول دھاتی ڈکٹ چھت پر نکل کر گھوم رہے تھے۔ ان کے سوراخ چھت کے متوازی تھے تاکہ بارش کا پانی اندر نہ جا سکے۔ پرندوں اور کیڑے مکوڑوں سے بچانے کے لیے سامنے جالی لگی تھی اور یہ فکس تھی۔ سعد نے خنجر نکالا اور بہ آسانی جالی کاٹ دی۔ اس نے چھوٹی ٹارچ آن کر کے سامنے جیکٹ میں لگائی۔ وسیم نے بتایا۔ ''تمہیں دس فٹ نیچے جانا ہوگا اس کے بعد ڈکٹ سیدھا ہو جائے گا۔''

دس فٹ زیادہ اونچائی نہیں تھی، وہ رسی کے بغیر بھی کود سکتا تھا مگر اس سے شور ہوتا اور ان کانوں تک چلا جاتا جنہیں سعد اپنی آمد سے بے خبر رکھنا چاہتا تھا اس لیے اس نے رسی کا استعمال کیا۔ ہک ڈکٹ کے کنارے سے پھنسا کر وہ اندر گیا۔ پہلے پاؤں اندر کیے اور پھر باقی دھڑ اندر لے گیا۔ ذرا نیچے جاتے ہی وہ پھسلا اور رسی پر گرفت مضبوط کی ورنہ وہ نیچے گرتا۔ اس کے پاؤں نیچے ٹکے۔ یہاں ڈکٹ دائیں بائیں جا رہا تھا۔ اس نے ایک طرف پاؤں کیے اور لیٹتا چلا گیا۔ یہاں ڈکٹ مشکل سے دو فٹ چوڑا اور اتنا ہی اونچا تھا۔ وہ یہاں چاروں ہاتھوں پاؤں کے بل ہی چل سکتا

تھا۔ اس نے وسیم سے کہا۔ ''میں اندر اتر گیا ہوں، اب مجھے کس طرف جانا ہے؟''

''اگر تم آڈیٹوریم میں اترنا چاہتے ہو تو شمال کی سمت جاؤ۔''

سعد نے گھڑی میں لگے قطب پیما میں سمت دیکھی اور جس طرف اترا تھا اسی سمت آگے بڑھا۔ یہاں ڈکٹ کنکریٹ کا بنا ہوا تھا اور اس کا پلاسٹر بھی ٹھیک سے نہیں ہوا تھا پھر صفائی وغیرہ بھی نہیں تھی اس لیے فرش پر مٹی کی تہ تھی اور یہاں بے شمار کیڑے مکوڑوں کی لاشیں اور چوہوں کی مینگنیاں پڑی تھیں۔ مگر اسے ان چیزوں کی پروا نہیں تھی۔ ذرا آگے جانے کے بعد اسے پہلی جالی ملی۔ اس کے دوسری طرف ایگزاسسٹ فین تھا۔ فین جالی پر نصب تھا اور جالی ایک ہک کی مدد سے بند تھی اور اسے اندر سے ہی کھولا جاسکتا تھا۔ یہاں سعد نے ٹھیکیدار کا شکریہ ادا کیا جس نے بچت کی خاطر دھات کے بجائے پلاسٹک کی جالی لگائی تھی۔ اس نے خنجر استعمال کیا اور جالی کو کاٹ دیا۔ جالی کھلتے ہی اس نے ٹارچ بند کر کے نائٹ ویژن آنکھوں پر کرلی۔ یہ سوئمر گاگلز کی طرح تھی جو سر پر بینڈ سے فٹ ہوجاتی تھی اور کسی بھی حرکت کی صورت میں ان کے گرنے کا امکان نہیں رہتا تھا۔ جالی فرش سے کوئی دس فٹ کی اونچائی پر تھی۔

وہ سوچ رہا تھا کہ نیچے کودنے کی صورت میں آواز پیدا ہوگی۔ اس لیے وہ کسی قدر دقت سے گھوما اور پہلے دونوں ہاتھوں کے بل لٹکا اور پھر ہاتھ چھوڑ دیے۔ پنجوں کے بل گرتے ہوئے وہ زمین پر یوں اترا کہ آواز بہت معمولی سی آئی تھی۔ اس نے گھوم کر ہال کا جائزہ لیا۔ ایک طرف نیم دائرے میں حاضرین کے لیے کرسیاں اور لمبی سی میز تھی لیکن فرحت اسٹیج والے حصے میں کلاس لیتی تھی۔ اس کا سامان اور کرسیاں اب تک وہیں پڑی تھیں۔ اچانک اسے لگا کہ کہیں دور ہلکے دھماکے ہو رہے ہیں۔ ایسا لگ رہا تھا کوئی لکڑی پر چوٹ مار رہا ہو۔ وہ دروازے کی طرف بڑھا اور آہستہ سے اسے کھولا۔ یہ دروازہ گیلری والے حصے میں کھل رہا تھا۔ یہاں کوئی نہیں تھا مگر آواز نزدیک ہی سے آرہی تھی۔ سعد باہر آیا اور گیلری کے مخالف سمت بڑھا۔ یہاں راستہ دو حصوں میں تقسیم ہو رہا تھا۔ دائیں طرف سیڑھیاں تھیں اور بائیں طرف ایک طویل راہداری تھی اور شور کی آواز یہیں سے آرہی تھی۔

راہداری میں ٹارچ کی روشنی تھی اور سعد نے دیکھا کہ ایک تنومند شخص لکڑی کے ایک دروازے پر ٹکریں مار رہا ہے۔۔۔ سعد نے رائفل شانے سے اتار کر ہاتھ میں لے لی

اور ریڈیو میں آہستہ سے بولا۔ ''یہاں اوپری منزل پر دو افراد میرے سامنے ہیں، دونوں مسلح ہیں اور ایک کمرے کا دروازہ توڑنے کی کوشش کر رہے ہیں۔''

''یقیناً اس کمرے میں کچھ افراد چھپے ہوں گے۔'' وسیم نے کہا۔ ''کیا تم انہیں عمارت سے باہر نکال سکتے ہو؟''

''یہاں سے باہر جانے کا اور کوئی راستہ ہے۔'' سعد نے پوچھا تو وسیم کے آپریٹر نے تھری ڈی نقشے میں چیک کر کے بتایا۔

''ہاں نچلی منزل پر ایک ایمرجنسی ڈور ہے جو سیڑھیوں سے ذرا دور ہے۔ لیکن ڈور لاک ہے۔''

''میرے پاس گرینیڈ ہے، میں اسے اڑا سکتا ہوں۔'' سعد نے کہا۔ ''لیکن میں نچلے فلور کی صورت حال سے بے خبر ہوں اور اتنے افراد کے ساتھ نیچے جانا مشکل ہوگا۔''

''او کے سب سے پہلے تم مزید افراد کو ان کے قبضے میں جانے سے بچاؤ گے۔'' وسیم نے کہا۔ ''میں کوشش کرتا ہوں کہ ہمیں اندر آنے کی اجازت مل جائے۔''

''یس سر۔'' سعد نے کہا اور ایک بار پھر راہداری میں جھانکا جہاں دروازہ توڑنے کی کوشش کرنے والے کا جوش و خروش بتا رہا تھا کہ وہ کامیابی کے قریب ہے۔ سعد نے رائفل سیدھی کی اور ہلکا برسٹ مارا۔ اس نے کوشش کی کہ دونوں نشانہ بنیں۔ ٹکریں مارنے والے کے ساتھ موجود آدمی فوراً نشانہ بن گیا۔ گرتے ہوئے اس کی ٹارچ کا رخ اس کے چہرے کی طرف ہوا تو اس کی نصف اڑ جانے والی کھوپڑی صاف دکھائی دی تھی۔ ٹکریں مارنے والا ابھی نشانہ بنا تھا کیونکہ وہ لڑکھڑایا تھا مگر فوراً ہی سنبھل کر اس نے دروازے پر بھرپور ٹکر ماری اور اندر گھستا چلا گیا۔ سعد کا دل ایک لمحے کو رکا اور وہ اس طرف لپکا۔ مگر اس کے نزدیک جانے سے پہلے ہی دروازہ اندر سے بند ہوگیا تھا۔ اس سے پہلے سعد کچھ کرتا عقب سے اس پر فائرنگ ہوئی۔ گولیاں اس کی پشت سے ٹکرائی تھیں۔ وہ زمین پر گرا اور اسی طرح رینگتا ہوا آگے جانے لگا۔

☆☆☆

فائرنگ کی آواز نے گائیگر کو چونکا دیا تھا۔ اس نے فوری ریڈیو پر پوچھا۔ ''کیا ہوا، فائر کس نے کیا ہے؟''

چند لمحے بعد سورما کی تکلیف دہ آواز آئی۔ ''کوئی اندر آیا ہے۔ بدری مارا گیا ہے، میں زخمی ہوں شانے پر گولی لگی ہے۔''

''بیدار شاہ مارا گیا ہے۔'' گائیگر کو صدمہ ہوا تھا مگر

اس حالت میں بھی اس نے اپنے حواس بحال رکھے اور جلدی سے کہا۔

''اسلم، تم اپنے ساتھی کے ساتھ اوپر جاؤ اور اس شخص کو تلاش کر کے کتے کی موت مار دو۔''

''میں جا رہا ہوں۔'' اسلم کی آواز آئی۔ گا نگر کے لیے یہ حیرت ناک بات تھی کہ عمارت میں کوئی مسلح آدمی موجود تھا۔ جبکہ باہر سے کوئی اندر نہیں آ سکتا تھا۔ اس نے سوچا اور فون اٹھا کر سرکاری نمائندے کو کال کی۔ رابطہ ہوتے ہی اس نے سرد لہجے میں کہا۔

''کوئی اندر آیا ہے۔''

''ہماری طرف سے؟'' غفور صاحب نے سوال کیا۔

''یہ بکواس ہے، ہماری طرف سے کوئی اندر نہیں آیا ہے۔''

''اس نے میرے ایک آدمی کو مار دیا ہے۔ جلد میرے آدمی اسے تلاش کر کے مار دیں گے اور یاد رکھنا اگر وہ سرکاری آدمی نکلا تو اس کے بدلے میں دو یرغمالیوں کو یوں ہلاک کروں گا کہ ساری دنیا انہیں مرتے دیکھے گی۔''

غفور صاحب نے یقین سے کہا۔ ''ہمارا کوئی آدمی احاطے میں نہیں آیا ہے۔ ممکن ہے وہ کوئی انسٹی ٹیوٹ کا گارڈ ہو اور تمہارے آدمیوں سے سامنا ہوتے پر اس نے فائر کر دیا ہو۔''

''دیکھتے ہیں۔'' گا نگر نے فون رکھ دیا۔ اسی لمحے اوپر سے پھر فائرنگ کی آواز آئی۔ وہ مسکرانے لگا۔ اس بار ان کے ہتھیار چلے تھے وہ ان کی آواز پہچانتا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ اس کے آدمیوں نے حملہ آور کو تلاش کر لیا تھا اور جلد وہ اسے ختم کر دیتے۔ بدری کی موت کا صدمہ اس کے قاتل کی موت کی صورت میں ہی ختم ہوتا۔ دیوار کے ساتھ بیٹھے لڑکے اور لڑکیاں اس کی بات سن رہے تھے اور ان کا خوف سے برا حال تھا۔ منیر کی حالت اب بہتر تھی۔ مگر اس کا خون خاصا بہہ گیا تھا۔ گا نگر نے ریڈیو پر سورما سے پوچھا۔ ''باقی لڑکیاں ملیں؟''

☆☆☆

سعد پیچھے سرک رہا تھا۔ گولیاں اس کے اوپر سے گزر رہی تھیں۔ راہداری میں کم سے کم دو افراد تھے جو ٹارچ کی روشنی اس پر ڈالنے کی کوشش کر رہے تھے۔ سعد کو موقع ملا تو اس نے رائفل سیدھی کر کے اس کا پورا میگزین ان دونوں پر خالی کر دیا۔ ان میں سے ایک گرا اور دوسرا بھاگا مگر کچھ دور جا کر وہ بھی گر گیا۔ سیڑھیوں کی طرف سے پھر تیز فائرنگ کی آواز آنے لگی تھی۔ مگر اس بار وہ نشانہ نہیں تھا۔ گولیاں چلانے والے اندھا دھند برسٹ مار رہے تھے۔ سعد اٹھا تو اس کے دائیں پاؤں میں ٹیس اٹھی تھی۔ اس نے چھو کر دیکھا ران میں زخم تھا اور اس سے خون بہہ رہا تھا۔ اس نے تکلیف برداشت کرتے ہوئے پاؤں ٹٹولا اور یہ دیکھ کر اسے اطمینان ہوا کہ گولی چھوتی گزر گئی تھی، اس کے جسم میں نہیں تھی۔ وہ پیچھے ہٹا اور دروازے دیکھتا ہوا ایک کھلے کمرے میں داخل ہوا۔ یہ کلاس روم تھا۔ دروازہ اندر سے بند کر کے اس نے ٹارچ روشن کر کے میز پر رکھی اور اپنے زخم کی مرہم پٹی کرنے لگا۔ اس کے پاس تیار پٹی تھی، وہ اس نے زخم پر رکھ کر اوپر سے مضبوط ٹیپ کس کر باندھ دیا۔ پھر اس نے موبائل نکالا اور دھڑکتے دل کے ساتھ فرحت کو کال کی۔ چند بیل جانے کے بعد اس نے کال ریسیو کی تو سعد نے اطمینان کا سانس لیا۔

''تم ٹھیک ہو نا؟''

''ہاں۔'' وہ سہمے لہجے میں بولی۔ ''ہمارے برابر والے کمرے کا دروازہ توڑا جا رہا تھا۔''

''میں نے اسے زخمی کر دیا ہے۔'' سعد نے باقی تین مارے جانے والوں کا ذکر کرنے سے گریز کیا۔ ''فی الحال تم لوگوں کو خطرہ نہیں ہے۔ اس لیے میں نیچے جا رہا ہوں۔''

''نہیں یہ لوگ بہت خطرناک ہیں۔'' فرحت روہانسی ہو گئی۔ ''پلیز سعد آپ واپس چلے جائیں۔''

''میں تمہیں لیے بغیر واپس نہیں جا سکتا اور اتنے افراد کو ان کے رحم و کرم پر کیسے چھوڑ دوں جبکہ یہ رحم کے نام سے بھی نا آشنا ہیں۔''

''آپ ٹھیک ہیں نا؟'' فرحت کو اس کے لہجے سے شک ہو گیا۔

''معمولی زخم ہے۔'' سعد نے اسے تسلی دی۔ ''میں نے بینڈیج بھی کر لی ہے۔ تم لوگ خاموشی سے اسی جگہ رہو، میں آتا ہوں۔''

سعد نے موبائل رکھا اور ریڈیو پر وسیم کو رپورٹ دی، وہ خوش ہو گیا۔ ''تم نے کمال کر دیا ہے ذرا سی دیر میں ان کے چار آدمی بیکار کر دیے۔ میرا خیال ہے ان کی کل تعداد سات آٹھ سے زیادہ نہیں ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو ان کی نصف نفری ختم ہو گئی ہے۔''

''لیکن یہ لوگ دھماکا خیز ٹریپ کے ماہر لگ رہے ہیں۔ مجھے یقین ہے انہوں نے اور جگہوں پر بھی ٹریپ لگائے ہوں گے اس لیے اگر کوئی اندر آئے تو بہت خیال سے آئے۔''

''میری باس سے بات ہوئی ہے اور وہ ابھی اجازت نہیں دے رہے ہیں لیکن مجھے امید ہے جب میں تمہاری کارگزاری کے بارے میں بتاؤں گا تو وہ اجازت دے دیں گے۔''

وہ لوگ سیڑھیوں کے نیچے موجود تھے۔ اس راہداری میں سیدھے اس طرف جانا تو خودکشی کے مترادف ہوتا، وہاں کوئی آڑ نہیں تھی جو اسے گولیوں سے بچا سکتی۔ یہاں سے سیڑھیاں اتنی دور تھیں کہ وہ گرینیڈ یا گیس کا بم بھی نہیں پھینک سکتا تھا۔ اس کا نشانہ خطا جاتا اور بم اسی فلور پر پھٹ جاتا تو اسے مسئلہ ہوتا۔ اس لیے وہ کسی ایسے راستے کی تلاش میں تھا جہاں سے سیڑھیوں کے پاس نکل سکے۔ وہ راہداری میں نکلا اور مخالف سمت میں گیا۔ یہ آگے جا کر دائیں بائیں گھوم رہی تھی اور عمارت کے سامنے والے حصے میں طویل گیلری تھی۔ وہ بائیں طرف مڑا۔ اس کے ذہن میں تھا کہ آڈیٹوریم کا ایک دروازہ یہاں بھی کھلنا چاہیے تھا۔ اسے دروازہ ملا بھی مگر وہ اندر سے بند تھا۔ اس نے پیچھے ہٹ کر رائفل سے سنگل فائر کیا اور لاک توڑ دیا۔ وہ اندر آیا تو یہ آڈیٹوریم کا عقبی کمرا ثابت ہوا۔ مگر یہاں سے آڈیٹوریم تک رسائی تھی۔

وہ آڈیٹوریم میں داخل ہوا اور اس کے گیلری کی طرف کھلنے والے دروازے تک آیا۔ اس نے باہر جھانکا تو اسے نیچے جانے والی سیڑھیاں بالکل سامنے نظر آئیں۔ اس نے ایک گیس بم نکالا اور اس کی پن گھما کر اسے سیڑھیوں سے نیچے پھینک دیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے چھوٹا سا گیس ماسک منہ پر چڑھا لیا۔ وہ دبے قدموں سیڑھیوں تک آیا لیکن نیچے جانے والی سیڑھیوں پر نہیں آیا تھا کیونکہ جو لوگ اتنی تیاری سے آئے تھے ان کے پاس گیس ماسک کی موجودگی عین ممکن تھی۔ سعد نے کسی کو دبی زبان میں کہتے سنا۔ ''پیچھے ہٹو گیس اثر کر رہی ہے۔''

اسپیشل یونٹ کے پاس جدید ترین گیس بم تھے جن کا توڑ مخصوص قسم کے ماسک ہی کر سکتے تھے اور ہر گیس ماسک اسے ناکارہ نہیں کر سکتا تھا۔ شاید اسی وجہ سے نیچے موجود افراد پیچھے ہٹنے پر مجبور ہوئے تھے۔ وہ دبے قدموں سیڑھیاں اترنے لگا اور اس نے نائٹ وژن آنکھوں پر کر لیا تھا۔ اس سے دھوئیں کے پار بھی دکھائی دے رہا تھا اور وہ نیچے آیا تو اسے انٹرنس لابی کی طرف جانے والی راہداری میں دو افراد دکھائی دیے تھے۔ وہ پیچھے ہٹ رہے تھے اور آڑ میں رہنے کی کوشش کر رہے تھے۔ دونوں الگ الگ تھے۔ سعد نے سوچا اور ایک کی طرف رائفل کر کے ٹریگر دبا دیا۔

☆☆☆

سورما اپنا زخم دیکھ رہا تھا۔ گولی اس کا شانہ ادھیڑتی چلی گئی تھی۔ اس نے اپنی جیکٹ میں موجود تیار پٹی نکال کر زخم پر لگائی اور اس پر ٹیپ کر لیا۔ پھر اس نے ایک چھوٹی سی سرنج نکالی جس میں دوا پہلے سے موجود تھی۔ اس نے سرنج بازو میں گھونپ کر خالی کر دی۔ یہ خون روکنے والا انجکشن تھا۔ یہ کام کر کے وہ گہرے سانس لے رہا تھا معاً اسے لگا جیسے کوئی پاس ہی بول رہا ہے۔ وہ کمرے میں اکیلا تھا۔ پہلے اس نے ایک طرف کی دیوار سے کان لگائے جب یہاں سے کچھ سنائی نہیں دیا تو اس نے دوسری طرف کی دیوار سے کان لگائے اور اس بار اسے واضح نسوانی آواز سنائی دی۔ اگرچہ وہ جو بات کر رہی تھی وہ سمجھ میں نہیں آرہی تھی مگر آواز نسوانی ہی تھی۔ سورما خوش ہو گیا۔ بدقسمتی سے اس نے اس کمرے کا دروازہ توڑا تھا۔ اصل میں فائر سے لاک ٹوٹ گیا تھا مگر دروازے کو کھولنے والا حصہ پھنس رہ گیا اور اسی وجہ سے دروازہ نہیں کھل رہا تھا۔ وہ سمجھا کہ اندر سے بند ہے اور اس نے ساری جان لگا کر دروازہ توڑ دیا تھا مگر اس کی قیمت بدری کی جان اور اپنے شانے کے زخم کی صورت میں ادا کی تھی۔ اس نے دانت پیسے اور زیر لب کہا۔

''یہ قیمت میں تم لوگوں سے وصول کروں گا۔''

مگر وہ دروازے سے باہر نہیں جا سکتا تھا۔ جب وہ کمرے میں گھسا اور اس نے دروازہ بند کیا تب بھی باہر فائرنگ جاری رہی تھی۔ اسلم اور اس کے ساتھی آگئے تھے اور پھر فائرنگ تھم گئی مگر کوئی آواز نہیں آئی۔ سورما سمجھ گیا کہ اسلم اور اس کا ساتھی مارے گئے تھے یا پسپا ہو گئے تھے۔ وہ حیران تھا کہ یہ کون ہے جس نے چند منٹ میں ان میں سے کئی کو ناکارہ کر دیا تھا۔ اس نے ریڈیو پر پوچھا۔ ''باہر کس نے حملہ کیا ہے؟''

''شبیر اور شفیع ہیں۔'' اسلم نے جواب دیا۔ ''مگر ان کی طرف سے کوئی جواب نہیں آرہا ہے۔''

''وہ مارے جا چکے ہیں۔'' سورما نے زہریلے لہجے میں کہا۔ ''کس نے کہا تھا کہ احمقوں کی طرح اس کے سامنے چلے جائیں۔''

''انہوں نے بہادروں کی طرح جان دی ہے۔'' اسلم کا لہجہ بھی تلخ ہو گیا۔ ''بزدلوں کی طرح کہیں چھپ کر نہیں بیٹھے۔''

''آپس میں لڑنے کے بجائے اسے تلاش کرو۔''

گائیکر کی آواز آئی۔ ''ہمارے پاس وقت کم رہ گیا ہے۔''

''میں اور عباس نیچے راہداری میں ہیں۔ سورما سے کہو وہ بھی باہر نکلے اور اسے دو طرف سے گھیرے۔''

''میں زخمی ہوں۔'' سورما نے عذر پیش کیا۔

''وہ ایک ہے اور تم چھ تھے۔'' گائیکر نے غصے سے کہا۔ ''وہ تم میں سے آدھے ختم کر چکا ہے۔''

''اس نے اچانک حملہ کیا۔'' سورما نے صفائی پیش کی۔ ''ہم نے سوچا بھی نہیں تھا کہ یہاں کوئی مسلح آدمی ہوسکتا ہے۔''

''تم ایک خونی مہم پر آئے ہو اور تم نے کیسے سوچ لیا کہ یہاں تمہیں آسانیاں ملیں گی۔'' گائیکر نے زہریلے لہجے میں طنز کیا۔

''میرے برابر والے کمرے میں باقی... لڑکیاں ہیں۔'' سورما نے کہا۔ ''میں انہیں قابو کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔''

''تم دونوں اسے نیچے آنے سے روکو۔'' گائیکر نے اسلم کو حکم دیا۔

''کیوں نہ ٹریپ لگا دیا جائے۔'' سورما نے تجویز پیش کی۔

''یہ ٹھیک رہے گا۔'' گائیکر مان گیا۔ ''اسلم تم ٹریپ لگاؤ اور جب وہ نیچے آئے تو پیچھے ہٹ جانا۔''

''میں لگاتا ہوں۔'' اسلم نے کہا۔ اس دوران میں سورما نے ایک جگہ دیکھ لی تھی جہاں سے وہ برابر والے کمرے تک رسائی حاصل کرسکتا تھا۔ اس نے میز گھسیٹ کر دیوار کے ساتھ کی اور اوپر چڑھ کر ایگزاسٹ فین کی جالی ہٹائی۔ اس کے پیچھے ڈکٹ تھا۔ اس نے ٹارچ کی روشنی میں چیک کیا یہ اتنا بڑا تھا کہ وہ کسی قدر دقت سے اس میں آسکتا تھا۔ اس نے پہلے اپنی رائفل اندر ڈالی۔ انجکشن کے اثر سے خون رک گیا تھا اور زخم بھی سن ہو گیا تھا۔ اس لیے جب وہ اچک کر ہاتھوں کے بل چڑھا تو اسے ہلکی سی تکلیف ہوئی تھی۔ اصل مشکل اسے اندر گھسنے میں پیش آئی۔ یہاں اس کے چوڑے شانے رکاوٹ بن گئے تھے اور وہ خاصی مشکل سے چھیل چھلا کر اندر داخل ہوا تھا۔ تکلیف سے اس کی کراہیں اور زبان سے گالیاں نکل رہی تھیں۔ مگر کسی نہ کسی طرح وہ اندر داخل ہو گیا اور ڈکٹ میں برابر والے کمرے کی طرف بڑھا تھا۔ اس جیسے جثے کے آدمی کے لیے محدود جگہ حرکت کرنا آسان نہیں تھا۔ مگر اس کے سر پر لڑکیوں کا جنون اس طرح سوار تھا کہ وہ کسی بھی طرح ان تک پہنچ جانا چاہتا تھا۔

☆☆☆

فرحت اور لڑکیاں خاموش بیٹھی تھیں۔ فرحت سعد کے لیے فکر مند تھی اور لڑکیاں اپنے لیے فکرمند تھیں۔ اچانک شمی نے کہا۔ ''یہ آوازیں کہاں سے آرہی ہیں۔''

فرحت چونکی۔ ''کیسی آوازیں؟''

''شش۔'' شمی نے کہا اور وہ سب کان لگا کر سننے لگیں پھر شمی آوازوں کے مخرج کی طرف گئی۔ اس نے موبائل کی روشنی کرلی تھی اور جلد اسے معلوم ہو گیا کہ آوازیں ایگزاسٹ فین کے عقب میں واقع ڈکٹ سے آرہی تھیں۔ آوازیں انسانی اور مردانہ تھیں۔ اس نے فرحت سے کہا۔ ''یہاں کوئی آدمی ہے۔''

فرحت ڈکٹ کے نزدیک آئی اور پھر اس نے جو سنا اس نے گھبرا کر کہا۔ ''ہمیں یہاں سے نکلنا ہوگا۔''

''کیسے؟'' شمی نے دروازے کی طرف دیکھا جس پر انہوں نے اتنا سارا فرنیچر ڈال دیا تھا۔

''جلدی سے ہٹاؤ۔'' فرحت نے کہا۔

وہ خود بھی فرنیچر ہٹانے میں لگ گئی۔ اس کی کیفیت دیکھ کر لڑکیاں اور ڈر گئی تھیں اور انہوں نے تیزی سے فرنیچر ہٹانا شروع کر دیا تھا۔ ڈکٹ سے وہ آوازیں آرہی تھیں جو ناقابلِ بیان گالیوں اور لڑکیوں کے حوالے سے بدترین عزائم پر مشتمل تھیں۔ اس لیے فرحت نے فوری فیصلہ کیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ یہ وہی فرد تھا جس نے برابر والے کمرے کا دروازہ توڑا تھا اور اب ڈکٹ کے راستے یہاں آرہا تھا۔ ابھی انہوں نے نصف فرنیچر ہٹایا تھا کہ ایگزاسٹ کی جالی کے دوسری طرف سے اسے کھولنے کی کوشش شروع ہو گئی۔ فرحت نے چلا کر کہا۔ ''جلدی کرو۔''

وہ اپنی حالت کی پروا کیے بغیر بھاری چیزیں اٹھا کر پھینک رہی تھی۔ لڑکیاں اس کا پورا ساتھ دے رہی تھیں۔ لیکن ابھی کچھ فرنیچر باقی تھا کہ ایگزاسٹ فین کی جالی ٹوٹ گئی۔ شمی نے عقل مندی سے کام لیتے ہوئے موبائل کی روشنی بند کر دی۔ اب وہ اندھیرے میں کام کر رہی تھیں۔ کچھ روشنی ڈکٹ کی طرف سے آرہی تھی۔ ان کا پھینکا فرنیچر پورے کمرے میں بکھر گیا تھا۔ اب آخری میز رہ گئی تھی۔ انہوں نے اسے بھی سرکا کر راستہ بنایا اور دروازہ کھول لیا مگر وہ اتنا ہی کھلا تھا کہ اس سے پھنس کر نکلا جاسکے۔ اسی لمحے ڈکٹ سے سورما نیچے کودا اور اس نے دہاڑ مار کر گالی دی تھی۔ نیچے کودتے ہوئے سورما کی پنڈلی ایک الٹی پڑی کرسی کے دھاتی پائے نے چیر دی تھی۔ مگر فرحت اور لڑکیاں اس سے

واقف نہیں تھیں۔ سوسلا کی دہاڑ نے انہیں دہشت زدہ کر دیا۔ فرحت چلائی۔ ”بھاگو۔“

لڑکیاں دروازے سے نکلنے لگیں۔ سامان کی وجہ سے دروازہ پورا نہیں کھلا تھا۔ اس لیے لڑکیاں ایک ایک کر کے نکل رہی تھیں۔ پہلے ثوبیہ گئی، پھر شمی نکل رہی تھی کہ سورما فرش سے اٹھا۔ اس نے اپنی جیکٹ پر لگی ٹارچ روشن کر لی۔ اس کے ہاتھ میں پستول تھا رائفل اس کی ابھی ڈکٹ میں تھی۔ وہ پستول ان کی طرف سیدھی کر رہا تھا کہ فرحت کی نظر بروقت اس پر گئی اور اس میں نہ جانے کہاں سے اتنی جرأت آئی کہ اس نے ایک کرسی اٹھا کر اس پر دے ماری۔ کرسی اس کے زخمی شانے پر لگی اور مارے تکلیف کے پستول اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔ وہ گالی دے کر فرحت کی طرف جھپٹا تھا کہ کسی چیز سے الجھ کر گرا۔ شمی باہر نکل گئی تھی اس نے چلا کر کہا۔ ”جلدی آئیں۔“

فرحت کو باہر نکلنے میں دشواری ہوئی مگر وہ کسی طرح نکل گئی اور اس کے ساتھ ہی اس کے پیٹ میں ٹیس سی اٹھی تھی۔ لڑکیوں نے اپنے موبائل فونز کی اسکرین آن کر لی تھی کیونکہ وہاں مکمل تاریکی تھی۔ فرحت پیٹ تھام کر جھک کر آگے بڑھی تھی۔ شمی نے پلٹ کر دیکھا تو اس کی کیفیت بھانپ لی اور واپس آ کر اسے سہارا دیا۔ راہداری میں ایک لاش پڑی تھی اور اس کا نصف سر اڑا ہوا تھا۔ آگے مزید دو لاشیں پڑی تھیں۔ ان کے پاس ان کا اسلحہ بھی تھا۔ شمی اور وہ ان کے پاس سے گزرنے لگیں تو فرحت نے شمی کو روکا اور ایک لاش کی طرف اشارہ کر کے بولی۔ ”اس کی کمر سے پستول لگا ہے، اسے نکال لو۔“

شمی کو ڈر لگ رہا تھا مگر اس نے ہمت کر کے پستول نکال لیا۔ فرحت نے اس سے پستول لیا اور چیک کیا وہ پوری طرح لوڈ تھا۔ شمی نے حیرت سے کہا۔ ”آپ کو اس کے فنکشن آتے ہیں؟“

”ہاں میرے شوہر اسے استعمال کرتے ہیں اور کتنی بار وہ میرے سامنے بھی لے کر آئے۔ میں نے پہلی بار ہاتھ میں لیا ہے مگر مجھے اس کے فنکشن سمجھ میں آتے ہیں۔“ فرحت نے کہا۔ اس نے پستول اپنے بیگ میں رکھ لیا اور آگے بڑھی۔ اب تکلیف کم ہو گئی تھی۔ دروازے سے نکلتے ہوئے اسے رگڑ لگی تھی۔ وہ سیڑھیوں تک آئیں تو ثوبیہ وہیں تھی۔ ثوبیہ نے کہا۔ ”نیچے دھواں ہے۔“

”کلاس روم میں چلو۔“ فرحت نے فوری فیصلہ کیا کیونکہ یہاں کی باقی جگہیں لاک تھیں۔ وہ تیزی سے آڈیٹوریم میں آئیں اور اس کا دروازہ اندر سے بند کر دیا۔ یہاں بھی لائٹ بند تھی۔ ثوبیہ نے اپنے موبائل کی فلیش لائٹ آن کر لی تھی۔ وہ روشنی گھما کر دیکھ رہی تھی تب اس کی توجہ کھلے ڈکٹ پر گئی اور اس نے فرحت کو دکھایا۔

”یہ کھلا ہے یہاں سے کوئی آیا ہے۔“

کیونکہ فرحت نے ان دونوں کو سعد کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔ اس لیے اس نے مبہم انداز میں تسلی دی۔ ”فکر مت کرو یہاں سے کوئی نہیں آیا ہے۔“

لڑکیاں دوسرا دروازہ دیکھ رہی تھیں اور اسے کھلا پا کر انہوں نے اندر سے بند کر دیا۔ اگرچہ بند دروازے ان لوگوں کو نہیں روک سکتے تھے مگر ان کے بس میں جو تھا وہ کر رہی تھیں۔ فرحت ایک بینچ پر آ گئی۔ اس کی تکلیف کبھی بڑھتی تھی اور کبھی کم ہو جاتی تھی۔ وہ گہرے سانس لے رہی تھی اور فکر مند تھی کہ اس کے بچے کو کوئی نقصان نہ ہوا ہو۔ پھر اسے سعد کا خیال آیا کہ اس وقت وہ کہاں ہوگا؟ اچانک آڈیٹوریم کے چھوٹے کمرے میں کھلنے والے دروازے پر دھمک ہوئی تو وہ دہل گئی تھی۔ اس کے دل نے کہا کہ ان کے پیچھے آنے والا وحشی یہاں بھی آ گیا ہے۔ اس کے خوفناک عزائم وہ اپنے کانوں سے سن چکی تھی اور وہ یہاں آ جاتا تو وہ تینوں مل کر بھی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی تھیں۔ فرحت نے لڑکیوں کو دیکھا۔ وہ ان کی ٹیچر تھی اور انہیں بچانا اس کی ذمے داری۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنی ذمے داری ممکن حد تک پوری کرے گی۔

☆☆☆

سعد دیکھ رہا تھا کہ دونوں افراد پیچھے ہٹ رہے تھے۔ اس نے جو برسٹ مارا تھا وہ رائگاں گیا تھا۔ وہ لوگ خود کو محفوظ رکھے ہوئے تھے۔ شاید انہوں نے کوئی آڑ لے لی تھی۔ نائٹ وژن میں یہ مسئلہ ہوتا ہے کہ یہ صرف گرم جسم واضح کرتی ہے اور ٹھنڈی چیز واضح نہیں ہوتی ہے۔ سعد آگے بڑھنا چاہتا تھا کہ اس کی چھٹی حس نے خبردار کیا اور وہ رک گیا۔ ان لوگوں کا پیچھے ہٹنا خالی از علت نہیں تھا۔ پھر وہ انٹرنس لابی کی طرف جانے کے بجائے مخالف سمت بڑھا۔ یہاں تاریکی اور خاموشی تھی۔ محفوظ حد تک دور آنے کے بعد اس نے ریڈیو پر وسیم کو صورتِ حال سے آگاہ کیا اور شبہ ظاہر کیا۔ ”انہوں نے ہال وے میں کوئی ٹریپ لگایا ہے۔“

”اس کا امکان ہے بھی یہ یوں پیچھے ہٹ رہے ہیں۔“ وسیم نے تائید کی۔

”مجھے حملہ آور بہت منظم اور تربیت یافتہ لگتے ہیں۔

ایسے لوگ جان دینے کے لیے نہیں آتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ انہوں نے اپنے فرار کا راستہ رکھا ہوگا۔ مجھے چیک کر کے بتائیں کہ عمارت میں سیوریج کے پوائنٹ کہاں ہیں اور یہ کہاں نکلتے ہیں۔''

وسیم چونکا اور پُرجوش انداز میں کہا۔ ''یہ تم نے اچھا نقطہ اٹھایا ہے۔ میرا خیال ہے یہاں سیوریج کے بڑے پوائنٹ ہوں گے۔''

وسیم اپنے آپریٹر کی مدد سے مرکزی عمارت میں سیوریج کے پوائنٹ تلاش کرنے لگا اور اس نے دو منٹ بعد ہی تصدیق کر دی۔ ''یہاں چار مین پوائنٹ ہیں اور عمارت کے نیچے دو فٹ قطر کی بڑی سیوریج لائنیں موجود ہیں۔''

سعد حیران ہوا۔ ''اتنی بڑی سیوریج لائنیں؟''

''شاید مستقبل کو مدنظر رکھ کر انہیں ڈالا گیا ہے۔ اس عمارت کی اوپری سات منزلیں ابھی تعمیر ہونا باقی ہیں۔ اس لحاظ سے دو فٹ قطر کی لائن مناسب ہے۔''

سعد نے اپنی لوکیشن بتائی۔ ''اس جگہ سے قریب ترین پوائنٹ کہاں ہے؟''

آپریٹر نے چیک کیا اور بتایا۔ ''سیڑھیوں کے عقب میں واش رومز کے قریب۔''

سعد کو ایک خیال اور آیا۔ اس نے پوچھا ''انٹرنس لابی کے نزدیک ترین پوائنٹ کہاں ہے؟''

''وہ بھی یہی ہے باقی چار پوائنٹ اس جگہ سے زیادہ فاصلے پر ہیں۔''

سعد پیچھے آیا۔ آپریٹر اس کی رہنمائی کر رہا تھا۔ پوائنٹ واش رومز کے ساتھ ایک چھوٹی سی جگہ تھا اور اس پر اسٹیل کا تقریباً ڈیڑھ فٹ قطر کا ڈھکن فٹ تھا۔ سعد نے اس کا لاک کھول کر ڈھکن اٹھایا تو اندر سے بدبو کا بھپکا آیا تھا۔ سعد نے اس کی پروا کیے بغیر ٹارچ روشن کر کے اندر دیکھا۔ اس نے نائٹ وژن ہٹائی تھی۔ نیچے سیوریج کا بڑا پائپ تھا اور اس میں فی الحال پانی نہ ہونے کے برابر تھا۔ سعد نے سوچا اور پھر نیچے اتر گیا۔ اس کے گھستے ہی گٹروں میں پائے جانے والے کیڑے مکوڑوں اور دوسرے حشرات الارض میں کھلبلی مچ گئی تھی اور وہ ادھر ادھر بھاگنے لگے تھے۔ پائپ کا فرش کوئی پانچ فٹ نیچے تھا۔ کسی قدر دقت کے ساتھ اس نے لائن میں جھانکا تو اسے کچھ آگے چھت کے ساتھ ایک بیگ سا دکھائی دیا۔ وہ آگے آیا اور ٹارچ کی روشنی میں بیگ کا جائزہ لیا پھر اسے احتیاط سے دبا کر دیکھا۔ اسے اندازہ ہو گیا کہ بیگ میں کپڑے جیسی کوئی چیز تھی۔

سعد نے معنی خیز انداز میں سر ہلایا تھا۔ وہ کچھ دیر بعد سیوریج ہول سے باہر نکل آیا اور اس نے ڈھکن واپس لگا دیا۔ اس کے جوتے گندے ہوئے تھے مگر فی الحال اسے ان کی پروا نہیں تھی۔ وہ دبے قدموں راہداری کی طرف بڑھا جہاں اب اسے دو افراد نظر نہیں آ رہے تھے۔ وہ انٹرنس لابی کی طرف چلے گئے تھے۔ سعد سوچ رہا تھا کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ اسے فرحت اور اس کے ساتھ کی لڑکیوں کا خیال آ رہا تھا، ان میں غفور صاحب کی بیٹی بھی تھی۔ لیکن پہلے اس نے وسیم کو صورتِ حال سے آگاہ کیا تو اس نے کہا۔ ''اسنائپر نے اندر تقریباً ایک درجن افراد کو انفراریڈ ویژن سے دیکھا ہے۔ ان میں بڑی تعداد یرغمالیوں کی ہے۔''

''مجھے یہی خدشہ تھا کہ وہ یرغمالیوں کو اپنے پاس جمع کر لیں گے۔ انٹرنس لابی غیر محفوظ جگہ ہے اور وہاں آپریشن آسانی سے کیا جا سکتا ہے مگر یرغمالیوں کی موجودگی میں اب یہ کام آسان نہیں رہے گا۔''

وسیم نے کہا۔ ''تم نیچے تک رسائی حاصل کر چکے ہو۔ کوشش کرو کہ ایمرجنسی دروازے سے باقی محفوظ یرغمالیوں کو باہر نکال سکو۔''

''میں یہی کرنے جا رہا ہوں۔'' سعد نے کہا اور سیڑھیوں کا رخ کیا۔

☆☆☆

اسلم نے راہداری میں ایک ٹریپ بم لگا دیا تھا اور وہ عباس کے ساتھ انٹرنس لابی میں آ گیا تھا۔ یہاں گائیکر نائٹ ویژن کی مدد سے راہداری میں دیکھ رہا تھا۔ وہ منتظر تھا کہ کب دشمن ٹریپ کی زد میں آتا ہے اور اس کا جسم ٹکڑوں میں بٹ جائے۔ مگر اسے اسلم اور عباس کے آنے کے بعد مزید کوئی حرارت دیتا ہوا جسم نظر نہیں آیا تھا۔ وہ فکرمند ہو گیا تھا۔ اس دوران میں اسلم اور عباس آپس میں بات کر رہے تھے پھر اسلم گائیکر کی طرف آیا۔ اس نے کہا۔ ''ان لوگوں کو اڑاؤ اور باہر نکل کر مقابلہ کرو۔''

اسلم کا اشارہ یرغمالیوں کی طرف تھا۔ گائیکر نے اس کی طرف دیکھا۔ ''ابھی نہیں، پہلے ہمیں اپنے مطالبے کو پورا کرانا ہے۔''

''کیسے؟ اب ہم چار رہ گئے ہیں۔'' اسلم بولا۔ ''باہر سے ایکشن ہوا تو ہم اسے نہیں روک سکیں گے۔''

''گیٹ پر ہونے والے دھماکے کے بعد وہ کسی ایکشن کا سوچیں گے بھی نہیں۔''

''تب اندر آنے والا کون ہے؟''

''میرا خیال ہے وہ بچ جانے والا کوئی گارڈ ہے۔''

اسلم نے نفی میں سر ہلایا۔ ''ادھر گارڈز کے پاس شاٹ گنیں ہیں، اس کے پاس آٹومیٹک رائفل ہے۔''

یہ بات گائیکر بھی جانتا تھا مگر وہ فی الحال اس بات پر باہر موجود صورت حال کے نگران سے الجھ نہیں سکتا تھا۔ اس کی کوشش اور خواہش تھی کہ کسی آپریشن کی نوبت نہ آئے اور اسے اپنا آٹھ بجے والا ڈراما مکمل کرنے کا موقع مل جائے۔ اس میں اب زیادہ دیر نہیں رہی تھی۔ سات بج کر پچیس منٹ ہونے والے تھے۔ گائیکر نے کہا۔ ''فکر مت کرو ٹریپ کے ہوتے ہوئے وہ یہاں نہیں آسکے گا۔''

اسلم اور عباس مرنے مارنے کے لیے بیتاب تھے۔ اپنے دو ساتھیوں کے مرنے کا ان پر گہرا اثر ہوا تھا اور وہ یہاں مرنے کے لیے ہی آئے تھے۔ گائیکر شیشے کے دروازے تک آیا اور اس نے سورما سے پوچھا۔ ''تم کہاں ہو؟''

''میں ان ۔۔۔۔ کے پیچھے ہوں۔''

''تم ابھی تک ان پر قابو نہیں پا سکے ہو؟''

''یہ بہت چالاک ہیں۔'' سورما نے مرتعش لہجے میں کہا۔ ''ابھی تک بچی ہوئی ہیں لیکن میں نے انہیں تلاش کر لیا ہے۔''

''انہیں قابو کر کے نیچے لاؤ اور خیال رکھنا راہداری میں ٹریپ لگا ہوا ہے۔''

گائیکر، سورما سے بات کر کے واپس کاؤنٹر کی طرف آیا اور اس نے اپنے بیگ سے ایک چھوٹا لیپ ٹاپ نکالا اور اس سے یو ایس بی انٹرنیٹ اسٹک لگائی۔ پھر اس نے ایک ویڈیو سروس آن کی اور لیپ ٹاپ کے ویب کیم کو سیٹ کرنے لگا۔ اس نے دیوار کا ایک حصہ منتخب کیا تھا۔ ویب کیم کا رخ اس کی طرف کر کے اس نے لڑکے اور لڑکیوں کی طرف دیکھا اور سفاک انداز میں مسکرایا۔ ''اِٹ از شو ٹائم۔''

☆☆☆

دھماکے کی آواز نے ان تینوں کو دہلا دیا تھا۔ یہ آواز چھوٹے کمرے کے دروازے کی طرف سے آئی تھی۔ لڑکیوں نے اسے اندر سے بند کر دیا تھا مگر فرحت جانتی تھی کہ معمولی سی کنڈی آنے والے کو نہیں روک سکے گی۔ اس وقت اس کا ذہن تیزی سے سوچ رہا تھا۔ اس نے ثمی اور ثوبیہ سے کہا۔ ''سنو ہمیں کوئی تدبیر کرنا ہوگی۔ تم دونوں یہاں بینچ کے آگے والی میزوں کے نیچے الگ الگ جگہ چھپ جاؤ گی اور میں اسے اپنے پیچھے لگاؤں گی۔''

''اپنے پیچھے کیسے؟'' ثمی نے پوچھا۔

فرحت ایک ہلکی میز گھسیٹ کر ایگزاسٹ فین کے کھلے ڈکٹ تک لائی۔ اس پر چڑھ کر اس نے اپنا بیگ ڈکٹ کے اندر پھینک دیا اور ثمی اور ثوبیہ سے کہا۔ ''مجھے سہارا دے کر اوپر چڑھاؤ۔''

وہ ہچکچائیں۔ ثمی نے کہا۔ ''یہ آپ کیا کر رہی ہیں؟''

''میں جو کہہ رہی ہوں وہ کرو۔'' فرحت نے سخت لہجے میں کہا۔ ''وقت کم ہے۔''

مجبوراً لڑکیوں نے اسے سہارا دے کر ڈکٹ پر چڑھایا اور وہ بہت مشکل سے چڑھی تھی۔ کسی نہ کسی طرح وہ ہانپتے ہوئے اندر داخل ہونے میں کامیاب ہوئی اور اس نے ان دونوں سے کہا۔ ''اب تم دونوں جا کر میزوں کے نیچے چھپ جاؤ، آواز مت نکالنا اور جب وہ یہاں آئے تو سانس بھی روک لینا۔ جب وہ میرے پیچھے آئے تو تم دونوں اپنی جان بچانے کی تدبیر کرنا۔''

ثمی اور ثوبیہ سمجھ گئی تھیں کہ ان کی ٹیچر انہیں بچانے کے لیے آنے والے آدمی کو اپنے پیچھے لگا رہی تھی۔ وہ اشکبار آنکھوں سے آڈیٹوریم کی نیم دائرے میں بنی نشستوں کے آگے موجود میزوں کے نیچے چھپ گئیں۔ اس دوران میں دروازے پر لگاتار دھمک ہو رہی تھی اور ابھی لڑکیاں چھپی تھیں کہ دروازہ ٹوٹ گیا۔ فرحت نے اپنا رخ ڈکٹ میں سامنے کی طرف کر لیا۔ وہ یہاں چاروں ہاتھوں پاؤں سے چل سکتی تھی اور اپنی حالت کی وجہ سے اس کے لیے یہ پوز آسان نہیں تھا۔ ابھی سے اس کی کمر درد کرنے لگی تھی اور وہ سوچ رہی تھی کہ وہ کتنی دیر اس پچویشن میں رہ سکے گی۔ ڈکٹ کھلا ہوا تھا مگر آنے والے کو متوجہ رکھنے کے لیے وہ اس کے کھلے حصے میں تھی۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ جیسے ہی وہ آڈیٹوریم میں نمودار ہوا فرحت نے چلا کر کہا۔

''جلدی آگے بڑھو، وہ آگیا ہے۔''

☆☆☆

سورما زخموں سے چور ہونے کے باوجود ان کا پیچھا چھوڑنے کو تیار نہیں تھا۔ دوسری بار گرنے پر کوئی چیز اس کے ماتھے سے لگی تھی اور کھال پھٹ جانے کے بعد وہاں سے خون بہہ رہا تھا۔ لیکن ان زخموں نے اس کی دیوانگی کو مزید بڑھا دیا۔ اس بار اس نے مرہم پٹی کرنے کی زحمت بھی نہیں کی تھی۔ اس کی رائفل ڈکٹ میں رہ گئی تھی۔ سورما نے وہ بھی نہیں اٹھائی اور صرف پستول بدست ان کے پیچھے باہر آیا۔ تب تک وہ آڈیٹوریم میں جا چکی تھیں۔ سورما نے سوچا اور سامنے کے بجائے وہ عقبی حصے کی طرف بڑھا۔ بالکونی والی

طرف سے وہ آڈیٹوریم کے ساتھ والے کمرے میں آیا مگر اس کا آڈیٹوریم کی طرف کھلنے والا دروازہ اندر سے بند تھا۔ اس نے پیچھے ہٹ کر اپنے صحیح شانے سے اس پر ٹکر ماری۔ دروازہ ہلا مگر کھلا نہیں تھا۔ وہ لگاتار ٹکریں مارنے لگا۔ اگرچہ اسے بھی تکلیف ہو رہی تھی مگر وہ رکا نہیں۔ بالآخر کچھ ٹکریں کھا کر اندر سے کنڈی جواب دے گئی اور دروازہ کھل گیا۔ وہ اندر آیا تو ٹارچ کی روشنی میں اسے آڈیٹوریم خالی نظر آیا اور اسی لمحے اسے ڈکٹ کی طرف سے ایک نسوانی آواز آئی۔

''جلدی آگے بڑھو، وہ آگیا ہے۔''

سورما اس طرف لپکا تھا۔ اسے ٹارچ کی روشنی میں دو خوب صورت نسوانی پاؤں ڈکٹ میں غائب ہوتے دکھائی دیے تھے۔

☆☆☆

غفور صاحب اور وسیم اندر کے آپریشن کو حتمی صورت دے رہے تھے۔ وسیم کو یقین تھا کہ انٹرنس لابی میں کوئی بڑا ٹریپ ہوگا جیسا کہ انسٹی ٹیوٹ کے مین گیٹ پر تھا۔ اب تک سات افراد کی ہلاکت اور ایک درجن شدید زخمیوں کی تصدیق کی جاچکی تھی، ان سب کا تعلق پولیس ایلیٹ فورس سے تھا۔ وسیم نے غفور صاحب سے کہا۔ ''ہمارا پلان آسان ہے۔ میں اور میرے ساتھی نالے کے راستے اندر داخل ہوں گے۔ جال ہم پہلے ہی کاٹ چکے ہیں اور نالے سے ہوتے ہوئے ہم مین بلڈنگ کے عقب میں نکلیں گے۔ وہاں سعد ایمرجنسی ڈور کھولے گا اور ہم اس کے راستے اندر داخل ہوں گے۔''

''اگر ایمرجنسی ڈور کھلنے میں شور ہوا تو وہ یرغمالیوں کو قتل کرنا شروع کر دیں گے۔''

''نہیں، وہ اسے سعد کی کارروائی سمجھیں گے۔'' وسیم نے کہا۔ ''وہ سعد کی اندر موجودگی سے واقف ہیں۔''

غفور صاحب سوچ رہے تھے کہ صورتِ حال بہت ہی مشکل ہے اور خاص طور سے ان کے لیے کہ وہ اب یہاں کے باس تھے۔ انہوں نے سر ہلایا۔ ''ٹھیک ہے جب میں کہوں تب ہی تم لوگ حرکت میں آؤ گے۔''

''یس باس۔''

غفور صاحب نے موبائل پر انٹرنس لابی کے فون پر کال کی، اس بار بیل جا رہی تھی۔ گانیکر نے کال ریسیو کی اور بولا۔ ''صرف بیس منٹ رہ گئے ہیں۔ لگتا ہے چند ایک یرغمالیوں کی قیمت ادا کر کے تمہیں ہوش آئے گا۔''

''یہ آسان معاملہ نہیں ہے ہمیں مہلت چاہیے۔ تم نے جن ناموں کی فہرست دی ہے انہیں چیک کیا جا رہا ہے۔ یہ سب مختلف جیلوں میں ہیں۔''

''ٹھیک آٹھ بجے میں معاملے کو آسان بنا دوں گا۔'' گانیکر ہنسا۔ ''مجھے معلوم ہے سرکاری مشینری کس طرح کام کرتی ہے اور اس کی رفتار میں کیسے تیزی لائی جا سکتی ہے۔''

''سنو قتل و غارت گری کسی قسم کا حل نہیں ہے۔ اگر تم نے ایسی غلطی کی تو پھر ہمیں حرکت میں آنا پڑے گا۔ ممکن ہے ہم یرغمالی نہ بچا سکیں لیکن ایک بات یقینی ہے کہ تم میں سے بھی کوئی بچ نہیں سکے گا۔''

''ہم مرنے کے لیے آئے ہیں۔'' گانیکر نے بے پروائی سے جواب دیا۔ ''کامیابی یا موت، تیسرا کوئی راستہ نہیں ہے۔''

''ہمیں مہلت چاہیے۔'' غفور صاحب نے اصرار کیا۔

''کوئی مہلت نہیں ہے۔'' گانیکر نے کہا اور کال کاٹ دی۔ غفور صاحب نے پھر کال ملائی مگر انگیج ٹون آرہی تھی۔ انہوں نے وسیم کی طرف دیکھا اور سر ہلایا تو وہ وین سے اتر گیا تھا۔ اس کے چار ساتھی نالے کے پاس اس کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ ان کے ساتھ نالے میں اتر گیا۔ اس نے سعد سے ریڈیو پر کہا۔

''ہم آرہے ہیں، تم کہاں ہو؟''

☆☆☆

سعد اوپری فلور پر تھا اور وہ احتیاط سے ان کمروں کی طرف جا رہا تھا جہاں زخمی حملہ آور اور فرحت لڑکیوں کے ساتھ موجود تھی۔ اس نے فرحت کو کال کی مگر وہ ریسیو نہیں کر رہی تھی۔ سعد فکرمند ہو گیا۔ وہ اس کمرے کے سامنے پہنچا جس میں فرحت اور لڑکیاں تھیں تو اس کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور اندر وہ فرنیچر بکھرا ہوا تھا جو پہلے دروازے کے سامنے روک کے طور پر لگایا تھا۔ سعد کا دل ایک لمحے کو رکا مگر فوراً ہی اس کی عقل نے سمجھایا کہ یہ کام فرحت اور لڑکیوں نے خود کیا تھا، کوئی باہر سے اس طرح زبردستی اندر نہیں جا سکتا تھا۔ البتہ وہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ وہ اس محفوظ جگہ سے باہر کیوں نکلیں؟ اس نے اندر جھانک کر دیکھا تو اسے کمرے کا ایگزاسٹ ڈکٹ کھلا دکھائی دیا۔ وہ تیزی سے اندر آیا۔ اس نے نائٹ ویژن ہٹا کر ٹارچ روشن کر لی تھی اور جلد اس کی روشنی میں اسے زمین پر پڑا خون اور ڈکٹ میں رکھی رائفل دکھائی دی۔ اس نے زیرِ لب کہا۔ ''شٹ!''

وہ تیزی سے باہر آیا تھا کہ وسیم نے اسے ریڈیو پر اطلاع دی۔ ''ہم آرہے ہیں، تم کہاں ہو؟''

''میں اوپری فلور پر ہوں یہاں فرحت اور دونوں لڑکیاں غائب ہیں۔''
''کیا وہ ان کے ہاتھ آ گئی ہیں؟'' وسیم نے پوچھا۔
''میں امید کر سکتا ہوں کہ ایسا نہیں ہوا ہے۔'' سعد نے کہتے ہوئے دوسرے کمرے میں جھانکا اور اس کا کھلا ڈکٹ دیکھ کر اس کے اندازے کی تصدیق ہو گئی۔ اس کا نشانہ بننے والا ڈکٹ سے ہوتا ہوا دوسرے کمرے میں پہنچ گیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ اتنا زخمی نہیں ہوا تھا کہ حرکت سے معذور ہو جاتا۔ سعد تیزی سے سوچ رہا تھا اگر اس نے فرحت اور دو لڑکیوں کو اپنے قبضے میں کر لیا تھا تو وہ اس وقت ہی انہیں نیچے لے جا سکتا تھا جب سعد عقب میں سیوریج لائن کا معائنہ کر رہا تھا۔ ورنہ وہ اس کی نظروں سے بچ نہیں سکتے تھے۔ اگر ایسا ہو گیا تھا تو جلد ہی یہ لوگ اپنا اصل کھیل شروع کر سکتے تھے۔ سعد نے گیلری میں بالکونی کی طرف جاتے ہوئے وسیم سے کہا۔
''اسنائپر بتا سکتا ہے کہ انٹرنس لابی میں کل کتنے افراد ہیں؟''
اسنائپر نے براہِ راست جواب دیا۔ ''ایک درجن سے اوپر ہیں۔ ایک دیوار کے ساتھ کئی افراد اس طرح بیٹھے ہیں کہ انفراریڈ ان کی الگ الگ تفصیل نہیں دکھا پا رہی ہے۔''
''ان میں کوئی اضافہ ہوا ہے پچھلے دس منٹ میں؟''
''نہیں، ان میں کوئی اضافہ نہیں ہوا ہے۔ پچھلے دس منٹ میں صرف دو افراد یہاں آئے ہیں اور وہ الگ کھڑے ہیں، ان کے پاس اسلحہ ہے۔''
سعد نے اطمینان کا سانس لیا۔ ''اس کا مطلب ہے کہ وہ آزاد ہیں۔''
''اگر وہ آزاد ہیں تو اسی فلور پر ہوں گے۔'' وسیم نے کہا۔ ''انہیں تلاش کر کے نیچے ایمرجنسی ڈور تک لاؤ اور اسے کھولو۔''
سعد بالکونی میں آ گیا تھا۔ اس نے دیکھ لیا کہ آڈیٹوریم سے منسلک کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ وہ محتاط انداز میں اس تک آیا۔ اس نے ٹارچ بند کر دی اور نائٹ ویژن آنکھوں پر کر لی۔ وہ کمرے سے ہوتا ہوا آڈیٹوریم تک آیا اور وہاں کا دروازہ ٹوٹا پا کر سعد چونک گیا۔ اس نے اندر جھانکا۔ وہاں خاموشی تھی مگر فوراً ہی اسے آڈیٹوریم کی گول نشستوں کے درمیان حرارت کا منبع محسوس ہوا۔ اس نے پستول اس طرف کیا اور آگے بڑھا۔ اس کی کوشش تھی کہ وہ آواز نہ نکالے اور خاموشی سے اس کے سر پر پہنچ جائے جو وہاں چھپا ہوا تھا۔ اس کی چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ وہ حملہ آوروں میں سے نہیں تھا اس کے باوجود وہ پوری طرح محتاط تھا۔ وہ نیم دائرے میں گھومتی نشستوں کے ساتھ اس جگہ پہنچا تو اسے ایک نسوانی وجود میز تلے دبکا نظر آیا۔ وہ شمی تھی اور وہ سعد کو نہیں دیکھ سکی مگر اس نے اس کی موجودگی محسوس کر لی تھی۔ سعد نے آہستہ سے کہا۔
''فرحت، یہ تم ہو؟''
شمی اچھل پڑی تھی اور اس نے جلدی سے کہا۔
''آپ کون ہیں؟''
''میں سعد ہوں۔ فرحت میری بیوی ہے۔''
''وہ ڈکٹ میں ہیں۔'' شمی باہر نکل آئی۔ ''انہوں نے پیچھا کرنے والے کو ڈکٹ میں بلا لیا تاکہ ہم محفوظ رہیں۔''
سعد پریشان ہو گیا۔ ''فرحت نے یہ کیا کیا؟''
''میں نے بھی منع کیا تھا مگر وہ نہیں مانیں۔'' شمی بولی اور اس نے ثوبیہ کو آواز دی۔ ''باہر آ جاؤ۔''
سعد نے ٹارچ روشن کر کے ڈکٹ کا معائنہ کیا اور اسے وہاں کوئی سرگرمی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ ثوبیہ میز تلے سے نکل آئی تھی اور وہ خوفزدہ تھی۔ شمی نے اسے تسلی دی۔ ''یہ ٹیچر فرحت کے شوہر ہیں اور میرے پاپا کے ساتھ کام کرتے ہیں۔''
سعد چونکا۔ ''تم شامیرا ہو، غفور صاحب کی بیٹی؟''
''ہاں۔'' شمی نے سر ہلایا۔
سعد نے ریڈیو پر اطلاع دی کہ دو لڑکیاں اسے ملی ہیں۔ وسیم نے کہا۔ ''ہم عقب میں نکل آئے ہیں اور عمارت کے پاس موجود ہیں۔ لڑکیوں کو باہر نکالو۔''
سعد تذبذب میں پڑ گیا تھا۔ وہ فرحت کے لیے ڈکٹ میں جانا چاہتا تھا۔ بے شک اس کے پیچھے جانے والا زخمی تھا مگر خود فرحت کی حالت ایسی نہیں تھی کہ وہ مزاحمت کر سکتی۔ لڑنے کی اس کی فطرت ہی نہیں تھی۔ دوسری طرف یہ لڑکیاں بھی اس کی ذمے داری تھیں اور انہیں یہاں سے باحفاظت نکالنا اس کی ترجیح ہونی چاہیے تھی۔ اس نے سوچا اور لڑکیوں سے کہا۔ ''میرے ساتھ آؤ۔''
وہ انہیں لے کر گیلری والے حصے میں باہر آیا، اس نے ٹارچ بند کر کے نائٹ ویژن چڑھا لیا تھا۔ اس نے لڑکیوں سے کہا کہ وہ اس کی پشت کے پاس رہ کر بے آواز چلیں۔ شمی نے اس کی جیکٹ کا سرا پکڑا ہوا تھا اور ثوبیہ اس کے پیچھے تھی۔ وہ دونوں بالکل تاریکی میں تھیں۔ سعد چلنے کے ساتھ انہیں گائیڈ بھی کر رہا تھا کہ آگے کیا ہے اور وہ اسی مناسبت سے قدم آگے بڑھائیں۔ وہ سیڑھیوں تک آئے اور نیچے اترنے لگے تھے۔ نیچے پھینکے گیس بم کا اثر معمولی سا رہ گیا تھا۔ مگر اس نے لڑکیوں سے کہا کہ وہ کچھ دیر کے لیے

سانس روک لیں اور انہیں اسی حالت میں عمارت کے عقب میں واقع ایمرجنسی ڈور تک لایا۔ یہاں سیڑھیاں تھیں جو اوپر تک جا رہی تھیں مگر یہ آگے سے بند تھیں۔ اس نے لڑکیوں کو سیڑھیوں تلے محفوظ کیا اور ایمرجنسی ڈور کے لاک سے ایک ہینڈ گرینیڈ لگا کر اس کی پن رسی سے باندھی اور خود بھی سیڑھیوں تک آ کر اس نے گرینیڈ کی پن کھینچ لی تھی۔

☆☆☆

فرحت ڈکٹ میں تیزی سے آگے گئی تھی۔ اس کے شانے پر موجود بیگ آگے لٹک رہا تھا اور رکاوٹ بن رہا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ بلاوجہ اسے اٹھائے گھوم رہی ہے۔ مگر اس میں موبائل تھا اور وہ موبائل ہاتھ میں لے کر نہیں چل سکتی تھی۔ کم سے کم یہاں تو ممکن نہیں تھا۔ وہ دس بارہ گز آگے گئی ہوگی کہ عقب سے پیچھا کرنے والا اندر گھس آیا۔ فرحت کو اس کی زبان اور عزائم یاد آئے تو وہ کانپ اٹھی تھی۔ ان چند الفاظ سے اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ شخص عورتوں کے معاملے میں جنسی جنونی تھا اور اسی وجہ سے خود زخمی ہونے کے باوجود ان کے پیچھے آ رہا تھا۔ اس نے ڈکٹ میں آتے ہی وحشیانہ انداز میں ہنس کر کہا۔ ”بھاگو، دیکھتا ہوں کہاں تک بھاگ سکتی ہو تم تینوں......“

اس کے لہجے میں درندگی محسوس کر کے فرحت خوفزدہ ہوئی تھی مگر ساتھ ہی اسے اطمینان ہوا کہ اس کی حکمتِ عملی کامیاب رہی تھی اور وہ ان تینوں کو ڈکٹ میں موجود سمجھ رہا تھا۔ ایک جگہ ڈکٹ دو حصوں میں بٹا تو اس نے دائیں طرف کا راستہ اختیار کیا۔ وہ جانتی تھی کہ جتنی سستی دکھائے گی یا وقت ضائع کرے گی اس کا فائدہ پیچھے آنے والے کو ہوگا۔ پیچھے آنے والا اب مسلسل بول رہا تھا اور اس کی باتوں میں ہذیان کے ساتھ ساتھ فحش گوئی بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ لفظوں میں اپنے غلیظ عزائم کا اظہار کر رہا تھا۔ فرحت کو لگ رہا تھا کہ تھکن سے زیادہ اس شخص کی بکواس اس کا حوصلہ توڑ دے گی اور وہ گر جائے گی۔ اس کے بازو شل تھے اور گھٹنے مسلسل رگڑ سے چھل گئے تھے۔ پیٹ میں رہ رہ کر ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ یہاں گرد مٹی اور مکڑی کے جالے تھے۔ مگر اسے کسی چیز کا احساس نہیں تھا، اس کے ہاتھ پاؤں مشینی انداز میں چل رہے تھے۔

فرش پر کیڑے مکوڑے اور گندگی تھی۔ مگر اس وقت اسے کسی چیز کا احساس نہیں تھا۔ وہ بہرصورت اس شخص سے دور رہنا چاہتی تھی جس کی بکواس سن کر اسے لگ رہا تھا کہ کان کے راستے گند اس کے دماغ میں اتر رہا ہے۔ پیچھے آنے والے نے کئی بار اسے گولی مارنے کی دھمکی دے کر رکنے کو کہا تھا مگر فرحت نے اس پر قطعی توجہ نہیں دی تھی۔ وہ اس پر موت کو ترجیح دینے کو تیار تھی کہ اس شخص کے ہاتھ اسے چھوئیں۔ اسے پتا نہیں چلا کہ وہ کب اس کے نزدیک آ گیا۔ اچانک اس کا ایک پاؤں جیسے شکنجے میں آ گیا اور وہ آگے جانے کے بجائے جھٹکے سے پیٹ کے بل گری تھی۔ اس کے منہ سے چیخ نکلی اور اس نے بے ساختہ دوسرا پاؤں چلایا۔ سینڈل کی ایڑی سورما کے منہ پر لگی اور اس نے غرا کر گالی دی۔ تکلیف کی وجہ سے اس کے ہاتھ سے فرحت کا پاؤں نکل گیا تھا۔ فرحت نے پاؤں گھسیٹا اور دوبارہ آگے جانے کی کوشش کی مگر سورما نے ہاتھ بڑھا کر پھر اس کا پاؤں پکڑ لیا۔ وہ خود کو کھینچ کر اس تک آنے کی کوشش کر رہا تھا۔

جلد فرحت نے محسوس کیا کہ وہ خود کو اس سے نہیں چھڑا سکے گی۔ مگر اس نے اسے روکنے کی جدوجہد جاری رکھی ساتھ ہی اس کے ہاتھ اپنا بیگ کھولنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس دوہری کوشش میں اس کی توجہ ہٹی اور سورما نے اچانک زور لگایا اور اس کے اوپری جسم تک آ گیا۔

”چھوڑ دو مجھے ورنہ......“ فرحت نے پہلی بار کہا۔ اس کے لہجے میں ہسٹر یا تھا۔

”ورنہ کیا کرلے گی۔“ سورما بولا۔ ”اب تو نہیں بچ سکتی۔“

سورما نے مزید اوپر آنے کی کوشش کی تھی اور فرحت کو لگا کہ اس کا جسم پس جائے گا۔ اس نے ہاتھ آگے کیا اور اس میں دبے پستول کا دستہ اس کے سر پر مارا۔ سورما دہاڑا کیونکہ ضرب شدید تھی۔ وہ ساکت ہو گیا۔ فرحت نے محسوس کیا کہ وہ بے ہوش ہو گیا ہے۔ اس نے پیچھے ہونے کی کوشش کی تھی کہ اچانک سورما نے ہاتھ چلایا۔ وہ مکاری سے بے ہوش ہونے کا تاثر دے رہا تھا اور اس سے پستول چھیننا چاہتا تھا، مگر وہ صحیح سے ہاتھ نہیں ڈال سکا اور فرحت نے گولی چلا دی۔ فائر کے ساتھ ہی سورما ڈھیر ہو گیا تھا۔ گولی اس کے غلاظت سے بھرے دماغ میں گھسی تھی اور اس کا مغز باہر آ گیا تھا۔ فرحت ہانپ رہی تھی اور شاید رو بھی رہی تھی۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ اس کے ہاتھ سے کبھی کوئی انسان مارا جائے گا۔ اس معاملے میں وہ اتنی حساس تھی کہ کسی کا خون بہتے نہیں دیکھ سکتی تھی۔ وہ چیونٹی بھی نہیں مار سکتی تھی۔

لیکن آج اس نے ایک انسان کو مار دیا تھا اور حیرت کی بات تھی اسے ذرا بھی افسوس نہیں تھا۔ بلکہ وہ خوش تھی کہ اس نے دنیا سے ایک گندے وجود کو کم کر دیا تھا۔ مگر جلد تکلیف نے اسے یاد دلایا کہ اسے خود کو لاش کی قید سے آزاد

کرانا ہے۔ اس نے پستول پیچھے پھینکا اور خود بھی پیچھے ہونے کی کوشش کرنے لگی۔ مرنے والا اتنا وزنی تھا کہ وہ اس کے بوجھ تلے سے نکل نہیں پا رہی تھی۔ اس نے چند گہرے سانس لیے اور زور لگا کر خود کو سورما کی لاش تلے سے نکالا تھا۔ فوراً ہی اسے بے پناہ سکون محسوس ہوا تھا۔ اس نے ٹٹول کر پستول تلاش کیا اور اسے بیگ میں رکھ کر اسے شانے پر ٹانگا۔ وہ ذرا پیچھے ہوئی تھی کہ اچانک دور کہیں دھماکا ہوا اور اس کا توازن بگڑا۔ اسے لگا کہ وہ کسی ڈھلان پر پھسلتی ہوئی جارہی ہے۔

☆☆☆

آٹھ بجنے میں دس منٹ تھے۔ گائیکر نے لیپ ٹاپ سیٹ کر لیا تھا اور وہ جو وڈیو میسنجر استعمال کر رہا تھا اس کا رابطہ جلد ملک کے بڑے ٹی وی چینل سے ہونے والا تھا اور وہ یہاں سے لائیو شو دکھا سکتا تھا۔ اس نے آگے آکر طلبہ کا جائزہ لیا اور فوراً ہی اپنا پہلا شکار چن لیا۔ یہ منیر تھا جو پہلے ہی شدید زخمی تھا۔ گائیکر نے اسلم کو اشارہ کیا تو وہ آگے آیا، اس نے منیر کو سر کے بالوں سے پکڑ کر اٹھایا اور اس کی کراہوں کی پروا کیے بغیر اسے کھینچتا ہوا اس جگہ لے آیا جس طرف گائیکر نے لیپ ٹاپ کا ویب کیم سیٹ کیا تھا۔ اس نے دھکا دے کر اسے دیوار کے ساتھ لگایا۔ منیر کے ساتھی چلا رہے تھے اور اسے چھوڑنے کو کہہ رہے تھے۔ لڑکیاں رو رہی تھیں۔ مگر ان کے شور کی پروا کیے بغیر منیر کو دھکا دے کر اسلم نے ذرا پیچھے ہو کر پوزیشن سنبھال لی اور اپنی رائفل کا رخ اس کی طرف کر دیا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ اسے شوٹ کر دے گا۔ گائیکر بولا۔

''آخری وقت آگیا ہے، اپنے اللہ کو یاد کر لو۔''

لڑکیوں کے رونے دھونے کی آوازوں میں شدت آگئی تھی۔ گائیکر کی نظر گھڑی پر مرکوز تھی۔ آٹھ بجنے میں پانچ منٹ پر اس نے میسنجر کا ایک بٹن دبایا اور اب لائیو وڈیو ٹی وی چینلز کے پاس جا رہی تھی۔ گائیکر نے سامنے آئے بغیر کہا۔ ''ہمارے مطالبے کے جواب میں ابھی تک حکومت نے کچھ نہیں کیا ہے، اس لیے میں اپنے وعدے کا پاس کرتے ہوئے پہلے یرغمالی کو ٹھیک آٹھ بجے شوٹ کر دوں گا۔ اس کے ہر آدھے گھنٹے بعد ایک یرغمالی اسی طرح مارا جائے گا جب تک ہمارا مطالبہ تسلیم نہیں کر لیا جاتا۔''

آٹھ بجنے میں دو منٹ تھے۔ منیر دیوار کے ساتھ لگا بیٹھا تھا اور اس کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا۔ جیسے ہی آٹھ بجے اور گائیکر نے اسلم کو اشارہ کرنا چاہا اچانک ان کے ریڈیو سے سورما کی آوازیں آنے لگیں۔ وہ دہاڑ رہا تھا جیسے کسی تکلیف میں ہو۔ پھر چند لمحے کے لیے خاموشی چھائی اور اچانک ہی دوبارہ انسانی آوازوں کے ساتھ ایک فائر ہوا۔ ایک بار پھر خاموشی چھا گئی تھی۔ گائیکر ریڈیو پر سورما کو پکارنے لگا مگر اس کی طرف سے کوئی جواب نہیں آرہا تھا۔ اسی لمحے ایک دھماکا ہوا۔ زمین لرزی تھی مگر دھماکا عمارت کے عقبی حصے میں ہوا تھا۔ گائیکر کا چہرہ بگڑ گیا۔ اس نے اسلم اور عباس کو حکم دیا۔

''پیچھے جاؤ اور وہاں جو نظر آئے اسے اڑا دو۔''

وہ دونوں دوڑتے ہوئے راہداری کی طرف چلے گئے۔ گائیکر کے چہرے پر شدید طیش نظر آرہا تھا اور اس نے لیپ ٹاپ بند کر دیا تھا۔ اس نے سفاک نظروں سے طلبہ کی طرف دیکھا اور بولا۔ ''شاید تم سب کا ایک ساتھ صفایا کرنا پڑے۔''

☆☆☆

دھماکے نے دروازے کو ہی اڑا دیا تھا اور جیسے ہی ذرات کی بارش تھمی سعد نے دونوں لڑکیوں کو سیڑھیوں کے نیچے سے نکالا اور دروازے کی طرف آیا۔ وسیم اور اس کے ساتھی پہلے ہی وہاں پہنچ گئے تھے۔ وسیم نے لڑکیوں کو اپنے دو آدمیوں کے حوالے کیا اور خود باقی دو کے ساتھ اندر آیا۔ اس کے آدمی لڑکیوں کو محفوظ مقام کی طرف لے گئے تھے۔ سعد نے اشارہ کیا۔ ''اس طرف...... میرے ساتھ آئیں۔''

وسیم نے گھڑی دیکھی۔ ''آٹھ بج گئے ہیں، وہ اپنی دھمکی پر عمل شروع کر دے گا۔''

''اب وہ سب کو ماریں گے۔'' سعد نے کہا۔ ''یرغمالیوں کو بچانے کے لیے ہمیں تیز ایکشن کرنا ہوگا۔''

وسیم رکا۔ ''تمہاری بیوی......''

''وہ ڈکٹ میں کہیں ہے اور ایک حملہ آور اس کے پیچھے ہے۔ اس نے لڑکیوں کو بچانے کے لیے اسے اپنے پیچھے لگایا تھا۔'' سعد سپاٹ انداز میں بتا رہا تھا مگر اس کے اندر کی کیفیت اس سے بالکل جدا تھی۔ وسیم کے دو آدمی آگے تھے۔ پہلے ان کی طرف فائر آیا۔ وہ تیزی سے پیچھے آئے تھے۔ وسیم نے وین میں موجود آپریٹر سے پوچھا۔ ''کوئی دوسرا راستہ ہے؟''

''دوسرا راستہ سروس ایریا سے نکلتا ہے۔'' آپریٹر نے بتایا۔ ''اس کے لیے سیڑھیوں کے نیچے سے جانا ہوگا۔ تہ خانے سے پہلے ایک راہداری سروس ایریا کی طرف جاتی ہے۔ اسٹور روم کا دروازہ انٹرنس لابی میں کھل رہا ہے۔''

سعد نے وسیم سے کہا۔ ''مجھے اجازت دی جائے کہ میں ڈکٹ میں جاؤں، مجھے اپنی بیوی کی فکر ہے۔''

وسیم نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ ''ہمیں بھی اس

کی فکر ہے مگر یہاں دس افراد اور ہیں اور وہ سب شدید خطرے میں ہیں۔"

"میں اس ٹیم کا قانونی حصہ نہیں ہوں۔" سعد نے اسے یاددلایا۔

"لیکن تم اس کا ایک اخلاقی حصہ ہو۔ میری طرف سے تم آزاد ہو مگر میری درخواست ہے ہمارا ساتھ دو۔"

سعد نے چند لمحے سوچا اور بے بسی سے بولا۔ "ٹھیک ہے۔"

وسیم نے دو ساتھیوں کو وہیں رکنے اور حملہ کرنے والوں کو روکنے کو کہا اور خود سعد کے ہمراہ سروس ایریا کی طرف بڑھا۔ یہاں لائٹ نہیں تھی اور انہیں ٹارچیں روشن کرنا پڑی تھیں۔ آپریٹر کی رہنمائی میں وہ اسٹور تک پہنچے۔ اس کا یہ دروازہ بھی لاک تھا سائلنسر لگے پستول سے فائر کر کے وسیم نے لاک توڑ دیا۔ وہ اندر داخل ہوئے تو وہاں بے شمار ریکس رکھے تھے اور ان پر سامان تھا۔ وہ ان کے درمیان سے گزرتے ہوئے اس دھاتی دروازے تک آئے جو انٹرنس لابی میں کھلتا اور وہاں نہ صرف یرغمالی اور دہشت گرد تھے بلکہ وہاں ٹریپ بھی موجود تھے اور انہیں جو کرنا تھا ان سب کو مدِنظر رکھتے ہوئے کرنا تھا۔

☆☆☆

گانٹیکر مضطرب تھا۔ اس کا پلان اگرچہ ابھی ناکام نہیں ہوا تھا مگر یہاں بہت کچھ اس کی توقع کے خلاف ہو چکا تھا اور اس کے چار ساتھی جس میں اس کے دو اصل ساتھی بھی تھے مارے جا چکے تھے۔ اگرچہ اسے ان کی بھی خاص پروا نہیں تھی لیکن اب اگر وہ زندہ بچ کر واپس جاتا تو اسے بہت سے سوالوں کے جواب دینا پڑتے اور ممکنہ طور پر اسے ہیرو کے بجائے مجرم قرار دیا جاتا۔ بہرحال اس وقت اس کی ترجیح جان بچانا تھی۔ راہداری کی طرف سے فائرنگ کی آواز آرہی تھی۔ فائرنگ دونوں طرف سے رہ رہ کر جاری تھی۔ اچانک ہی راہداری کی طرف سے شدید ترین فائرنگ کے ساتھ اسلم اور عباس کی آوازیں بھی آئی تھیں۔ وہ نعرے لگا رہے تھے اور پھر فائرنگ تھم گئی۔ گانٹیکر نے ریڈیو پر اسلم کو پکارا۔ اسے جواب نہیں ملا۔ عباس کی طرف سے بھی جواب نہیں آیا تھا۔ فائرنگ تھم گئی تھی اور اس کا ایک ہی مطلب تھا کہ وہ دونوں بھی زندہ نہیں رہے تھے۔ اس نے گہری سانس لی اور رائفل ہاتھوں میں لے لی۔ اب اسے یرغمالیوں کو ختم کرنا تھا۔ اس کے بعد وہ یہاں سے نکلنے کی کوشش کرتا۔ لیکن اس سے پہلے اسے ایک کام اور کرنا تھا۔ اس نے کاؤنٹر کے نیچے موجود بم کا ریموٹ نکالا اور اس کے چند بٹن دبائے۔ اب یہ ٹائم بم بن گیا تھا جو دس منٹ بعد پھٹ جاتا۔

☆☆☆

فرحت کو لگا جیسے دنیا گھوم رہی ہو۔ اس کا سر چکرا رہا تھا اور وہ یوں ہاتھ پاؤں مار رہی تھی جیسے ڈوبتا انسان ہاتھ پاؤں مارتا ہے۔ وہ پشت کے بل پھسلتی ہوئی ایک ہموار جگہ آگری تھی۔ اسے چوٹ نہیں آئی تھی مگر سر ضرور گھوم گیا تھا۔ چند لمحے بعد وہ سنبھل کر اٹھی اور اس کا سر ڈکٹ کی چھت سے ٹکرایا تو اس کے حواس اس تکلیف سے مکمل بحال ہو گئے۔ اس نے سب سے پہلے خود کو ٹٹول کر دیکھا اور اسے محسوس ہوا کہ اس کا بچہ ٹھیک تھا۔ پھر اس نے اپنا پرس دیکھا جو اس کی کمر تلے دبا ہوا تھا۔ اس نے دوبارہ اسے شانے سے لٹکایا اور آگے بڑھنے لگی۔ وہ ڈکٹ کے سلوپ سے گزر کر نچلی منزل تک آگئی تھی۔ یہاں تاریکی تھی اور اسے ٹٹول کر آگے بڑھنا پڑ رہا تھا۔ مگر کچھ آگے آتے ہی اسے ہلکی سی روشنی محسوس ہوئی جو کسی قدر فاصلے پر تھی۔ یہ شاید کوئی ایگزٹ تھا۔ وہ چلتی ہوئی اس تک آئی۔

یہاں ایگزاسٹ فین نہیں تھا بلکہ جالی کے پیچھے اسے انٹرنس لابی دکھائی دی۔ وہاں کی بیشتر روشنیاں بند تھیں۔ مگر اتنی روشنی ضرور تھی کہ اسے وہاں کا منظر صاف دکھائی دے رہا تھا۔ اسے ایک سخت نقوش والا شخص دکھائی دیا جس کے ہاتھ میں کوئی ریموٹ نما چیز تھی۔ اس نے اس کے چند بٹن دبائے اور پھر جھک کر ریسپشن کاؤنٹر کے نیچے دیکھا اور مطمئن ہو کر اس نے ریموٹ نیچے پھینکا اور جوتے سے کچل کر اسے توڑ دیا۔ جیسے وہ چاہتا ہو کہ اب یہ کسی کام کا نہ رہے۔ پھر اس نے اپنے دوسرے ہاتھ میں موجود رائفل کو دونوں ہاتھوں سے تھاما اور بولا۔ "مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔"

فرحت کو اپنے طلبہ کی چیخیں اور التجائیں سنائی دیں۔ وہ انہیں مارنے جا رہا تھا۔ فرحت نہیں جان سکی کہ وہ اتنی تیزی سے کیسے حرکت میں آئی۔ اس نے بیگ سے پستول نکالا اور جالی کے پیچھے سے اس کا رخ اس شخص کی طرف کر کے مسلسل فائر کرنے لگی۔ وہ اس وقت تک ٹریگر دباتی رہی جب تک پستول خالی نہیں ہو گیا۔ پہلے فائر کے بعد اس نے آنکھیں بھی بند کر لی تھیں اور محدود جگہ گونجنے والے دھماکے اس کے اعصاب پر اثر کر رہے تھے۔ وہ بس مشینی انداز میں ٹریگر دبا رہی تھی۔ کچھ دیر بعد اسے احساس ہوا کہ وہ خالی ٹریگر دبا رہی ہے۔ اسی لمحے نیچے سے برسٹ آیا اور جالی چھلنی ہو کر رہ گئی تھی۔ فرحت کے منہ سے چیخ نکلی تھی۔

☆☆☆

گائیکر نے سوچا بھی نہیں تھا کہ اس طرف سے اس پر گولیاں چلیں گی۔ دو گولیاں اس کے سینے پر لگیں اور وہ بلٹ پروف کی وجہ سے بچ گیا مگر ایک گولی شانے پر لگی اور اس نے ہڈی توڑ دی۔ وہ نیچے گرا اور اس نے تکلیف برداشت کرتے ہوئے الٹے ہاتھ سے رائفل کا رخ ڈکٹ کی طرف کر کے پورا برسٹ چلا دیا۔ پھر اس نے خالی ہو جانے والی رائفل پھینکی اور لڑکھڑاتے قدموں سے سروس ڈور تک آیا۔ اس نے جیکٹ سے ایک چھوٹا سا بم نکال کر اس کے لاک پر فٹ کیا اور ایک ستون کی آڑ میں ہو گیا۔ دس سیکنڈ بعد دھما کا ہوا اور سروس ڈور کا بڑا حصہ اڑ گیا۔ گائیکر پستول نکالتے ہوئے اندر گھسا تھا اور فوراً ہی اسے وہاں کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ گائیکر ایک ریک کی آڑ میں ہو گیا۔ وہاں کم سے کم دو افراد موجود تھے اور وہ ایک دوسرے سے ٹھیک ہونے کے بارے میں پوچھ رہے تھے شاید وہ دروازے کے پاس تھے جب وہ دھماکے سے تباہ ہوا۔ گائیکر کی خوش قسمتی کہ انہوں نے اسے اندر آتے نہیں دیکھا تھا ورنہ ان کے پاس خودکار ہتھیار تھے۔ وہ سروس ڈور کی طرف بڑھے اور جیسے ہی وہ باہر نکلے گائیکر حرکت میں آ گیا۔ وہ تیزی سے عمارت کے عقبی حصے کی طرف جا رہا تھا۔

☆☆☆

وسیم دروازے کے نزدیک تھا۔ وہ باہر سے فائرنگ کی آواز سن کر دروازے کے پاس آیا تھا جب اچانک دھماکے سے دروازہ تباہ ہوا اور وہ اڑ کر پیچھے گرا تھا۔ سعد اس سے ذرا پیچھے تھا۔ وہ دونوں ہی گرے اور پھر سنبھل کر اٹھے تھے۔ وسیم معمولی زخمی تھا۔ اسے شاک ویوز نے اچھال دیا تھا۔ ایک دوسرے کی خیریت دریافت کرنے کے بعد وہ دونوں اپنے ہتھیار سامنے کرتے انٹرنس لابی میں نکلے۔ مگر خلافِ توقع وہاں کوئی نہیں تھا۔ اگر وہاں کوئی نہیں تھا تو دھما کا کس نے کیا تھا۔ اچانک وسیم چونکا۔ اس نے چلا کر کہا۔ ”وہ نکل گیا۔“

”کہاں سے؟“ سعد نے پوچھا۔

”اسی راستے سے۔“ وسیم نے کہا اور سعد کو انٹرنس لابی میں رکنے کا کہہ کر تیزی سے واپس گیا تھا۔ وہ ریڈیو پر اپنے آدمیوں کو خبردار کر رہا تھا کہ کم سے کم ایک دہشت گرد بچ کر عمارت کے عقبی حصے کی طرف آیا ہے۔ سعد انٹرنس لابی کے کاؤنٹر والے حصے کی طرف آیا تو اسے فرحت کی ہلکی سی آواز آئی۔ وہ بے تاب ہو گیا۔ اس نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”فرحت تم کہاں ہو؟“

”میں یہاں ہوں۔“ فرحت نے کہا تو اس بار سعد نے اندازہ کر لیا۔ پھر گولیوں سے چھلنی جالی دیکھ کر ایک لمحے کو اس کا دل رکا تھا۔ جالی فرش سے دس فٹ اونچی تھی۔ وہ اس تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ وہ تیزی سے کاؤنٹر والے حصے میں آیا جہاں طلبہ ابھی تک دہشت اور خوف کے عالم میں بیٹھے ہوئے تھے۔ فائرنگ اور پھر دھماکے نے انہیں دنگ کر دیا تھا۔ سعد نے انہیں دیکھا اور کہا۔ ”کوئی اپنی جگہ سے حرکت نہ کرے۔“

اس دوران میں اس کے جو دو ساتھی راہداری میں اسلم اور عباس کا مقابلہ کر رہے تھے انہوں نے اطلاع دی کہ وہاں موجود دونوں افراد کو مار دیا ہے۔ سعد نے ٹریپ سے خبردار کیا جو راہداری میں کہیں ہو سکتا تھا۔ وہ کرسی لے کر ڈکٹ کے نیچے آیا اور اوپر چڑھ کر جالی کھینچ لی۔ فرحت اس کے عقب میں موجود تھی۔ وہ گول مول سی ہو کر لیٹی ہوئی تھی۔ سعد نے نرمی سے اسے بازوؤں میں لیا اور نیچے اتار لیا۔ وہ اندازہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اسے کہیں گولی تو نہیں لگی ہے۔ مگر اسے کہیں خون نظر نہیں آیا۔ ”تم ٹھیک ہو نا؟“

”ہاں، پتا نہیں کیسے بچ گئی۔“ فرحت نے کہا۔ ”میں نے اس پر فائرنگ کی تو اس نے پورا برسٹ چلا یا تھا۔“

سعد دنگ رہ گیا۔ ”تم نے فائرنگ کی؟“

”ہاں، وہ طلبہ کو مارنے جا رہا تھا۔“ فرحت نے کہا اور پھر بے تابی سے بولی۔ ”وہ ٹھیک ہیں نا؟“

”ہاں، سب ٹھیک ہیں۔“ سعد نے اسے تسلی دی۔ ”شمی اور دوسری لڑکی کو میں نے خود باہر نکالا تھا۔“

فرحت نے سکون کا سانس لیا اور پھر چونکی۔ ”سعد اس نے بچوں کو مارنے سے پہلے ایک ریموٹ سے یہاں کچھ کیا تھا۔ پھر اس نے ریموٹ توڑ دیا تھا۔“

سعد کو بم، ریموٹ کے ٹکڑے اور دروازے کے قریب لگا ہوا لیزر ٹریپ تلاش کرنے میں صرف ایک منٹ لگا تھا مگر ریموٹ والی بات نے اسے زیادہ چونکایا تھا۔ اس نے اضطرابی انداز میں وسیم کو اطلاع دی تو اس نے فوری طور پر وہاں سے سب کو نکلنے کو کہا۔ اس کے ذہن میں وہی خیال آیا تھا جو سعد کے ذہن میں آیا تھا کہ یہاں لگایا جانے والا بم مختلف طریقوں سے بلاسٹ کیا جا سکتا تھا اور ممکن ہے اسے ٹائم سیٹ کر دیا گیا ہو۔ سعد نے طلبہ اور فرحت کو ساتھ لیا۔ احتیاطاً اس نے اسٹور والے حصے سے نکلنا مناسب سمجھا تھا۔ وسیم نے اسے بتایا کہ فرار ہونے والا ہاتھ نہیں آیا تھا۔ سعد

نے اس سے کہا۔ ''آپ فکر نہ کریں، وہ بھاگ نہیں سکے گا۔''

☆☆☆

گانگیر اسٹور سے نکلا اور راہداری میں آیا۔ یہاں مکمل تاریکی تھی مگر اس کے پاس نائٹ ویژن تھی اور وہ آرام سے دیکھ سکتا تھا۔ وہ سیڑھیوں والے حصے تک پہنچا اور کچھ دیر سن گن لینے کے بعد عقب میں واقع واش رومز تک آیا۔ اس نے سیوریج ہول کا ڈھکن اٹھایا اور اندر اتر گیا۔ اندر اترتے ہی اس نے ڈھکن واپس لگا دیا۔ اس نے نائٹ ویژن اتار کر پھیلتی روشنی والی ٹارچ آن کر لی اور بھاگتے دوڑتے کیڑے مکوڑوں اور چھوٹے جانوروں کی پروا کیے بغیر وہ آگے آیا جہاں اس نے لباس والا بیگ چھپایا ہوا تھا، اس میں دارالحکومت کے میونسپلٹی کے عملے کی مخصوص تین وردیاں تھیں۔ گانگیر کو سورما اور بدری کے ساتھ نکلنا تھا۔ اسلم اور اس کے ساتھی اگر نہ مارے جاتے تب بھی وہ انہیں ختم کر کے یہاں سے جاتے۔ یرغمالیوں کو لازمی ختم کرنا تھا۔

وہ خود یہ کام نہیں کر سکا تھا مگر اسے امید تھی کہ یہ کام ہو جائے گا۔ کاؤنٹر تلے رکھے بم کے پھٹنے میں پانچ منٹ باقی رہ گئے تھے۔ وہ چاہتا تھا کہ جب یہ بم بلاسٹ ہو تو سب کی توجہ اس طرف رہے اور اسے سیوریج سے نکلنے کا موقع مل جائے۔ اسی وجہ سے اس نے عجلت میں بیگ پکڑ کر کھینچا اور وہ اپنی جگہ سے نکلا تو اس کے ساتھ ہی کلک کی ایک آواز آئی۔ گانگیر کا سانس رک گیا تھا کیونکہ بیگ کے پیچھے ٹریپ گرینیڈ صاف نظر آرہا تھا اور اس کی پن بیگ کھینچتے ہی نکل گئی تھی۔ یہ ان ہی کا ٹریپ تھا مگر یہاں کیسے آیا وہ نہیں جان سکتا تھا۔ بم دیکھتے ہی گانگیر عجلت میں پلٹا۔ وہ واپس سیوریج ہول کی طرف آنا چاہتا تھا مگر اسے مہلت نہیں ملی۔ دھماکا ہوتے ہی اس کے جسم کے ٹکڑے اڑ گئے تھے۔

☆☆☆

وہ سب مین بلڈنگ کے عقبی حصے میں پہنچے تھے کہ واش روم والے حصے سے ایک دبا ہوا دھماکا سنائی دیا۔ سعد، وسیم کے ساتھ اس طرف آیا تو دھماکے نے سیوریج ہول کا ڈھکن اڑا دیا تھا اور جب انہوں نے اندر جھانکا تو انہیں ایک نصف دھڑ یوں پڑا دکھائی دیا کہ اس کے چہرے کا رخ اوپر کی طرف تھا۔ سعد نے کہا۔ ''شاید یہی ان لوگوں کا سربراہ ہے۔''

''یہ اپنے ہی بم کا شکار ہوا ہے۔'' وسیم نے کہا۔

''ہاں لیکن وہ بم میں نے اس کے لیے یہاں لگایا تھا۔''

وسیم چونکا مگر اسے دوسروں کو یہاں سے نکالنے کی عجلت تھی۔ سعد کا کہنا تھا کہ بم کو ممکنہ طور پر ٹائم سیٹ کر دیا گیا ہے اور وہ کسی لمحے بھی پھٹ سکتا ہے۔ وہ سب باہر عقبی باغ میں نکل آئے تھے اور اب اسپیشل یونٹ کے لوگ راستہ چیک کرتے ان کی طرف آرہے تھے۔ انہیں باہر نکلے تین منٹ بھی نہیں ہوئے تھے کہ بلڈنگ کے اگلے حصے میں بہت بڑا دھماکا ہوا۔ آگ کی ایک گیند ہوا میں بلند ہوئی تھی۔ شاک ویو ایسا تھا کہ اس نے رہے سہے شیشے بھی توڑ دیے تھے۔ وہاں سے نکل کر آنے والوں نے جب یہ حال دیکھا تو خدا کا شکر ادا کیا کہ وہ وہاں نہیں تھے اور ان لوگوں کے شکرگزار تھے جو انہیں بروقت وہاں سے نکال لائے تھے۔ فرحت کی حالت ٹھیک نہیں تھی اس لیے سعد اسے لے کر باہر کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس سے پہلے اس نے اپنا اسلحہ اور تمام چیزیں وسیم کے حوالے کر دی تھیں۔

☆☆☆

فرحت کی آنکھ کھلی تو سعد اس کے بستر کے پاس ہی کرسی پر بیٹھا سو رہا تھا۔ فرحت کا جسم پرسکون تھا۔ ڈاکٹرز نے اسے ٹھیک قرار دیا تھا مگر احتیاطاً اسے بارہ گھنٹے کے لیے اسپتال میں داخل کر لیا تھا۔ فرحت نے سعد کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا تو اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے انگڑائی لی اور آگے جھک کر بولا۔ ''اب کیسا محسوس کر رہی ہو؟''

''بہترین۔'' وہ مسکرائی۔ ''میں نے کبھی خود کو اتنا اچھا محسوس نہیں کیا۔''

''حالانکہ کل تم نے بہت مشکل وقت گزارا۔''

''اللہ کا شکر ہے کہ مجھے اور میرے بچے کو نقصان نہیں ہوا۔ دوسرے لحاظ سے بھی یہ اچھا ہی ہوا۔''

''کس لحاظ سے؟''

فرحت نے آنکھیں جھکا لیں۔ ''سعد آئی ایم سوری، میں نے آپ کو بہت تنگ کیا۔ میں ناسمجھ تھی۔ مگر کل کے واقعے نے میری آنکھیں کھول دی ہیں۔ اب مجھے آپ پر فخر ہے کہ آپ ملک کو ایسے لوگوں سے پاک کر رہے ہیں۔''

سعد بستر پر اس کے سرہانے کے ساتھ بیٹھ گیا۔ ''اور مجھے تم پر فخر ہے تم نے جو کیا وہ ہر عورت نہیں کر سکتی بلکہ بہت سے مرد بھی نہیں کر سکتے۔''

فرحت نے اس کے بازو سے سر ٹکا لیا۔ ''ہمارا بیٹا خیر خیریت سے دنیا میں آئے اور بڑا ہو کر اگر اس کا رجحان ہوا تو میں بھی اسے ملک کا محافظ بنانا پسند کروں گی۔''

سعد کھل اٹھا تھا۔ ''انشاء اللہ!''

موت کی گواہی

تنویر ریاض

کسی بھی کیس سے جان چھڑانی ہو تو اسے خودکشی کا رنگ دے کر بند کر دیا جاتا ہے... ایک حسینۂ عالم کی تشویش ناک موت کا معما... پولیس اسے خودکشی قرار دے رہی تھی جبکہ سراغ رساں کا فیصلہ تھا کہ یہ قتل کی واردات ہے...

سنہرے بالوں والی ماہ جبین کی موت سے شروع ہونے والی واردات کی سنسنی خیز روداد

کوکی کیبن اپنی سیاہ بنٹلے کار میں مردہ پائی گئی۔ اس خوب صورت لڑکی کو اس حال میں دیکھ کر مجھے جھرجھری آ گئی۔ اس نے انتہائی قیمتی کشمیری سویٹر پہن رکھا تھا اور اس کے پیروں کے پاس گرے گوز کی خالی بوتل پڑی ہوئی تھی۔

میں نے زندگی میں اتنی خوب صورت عورت کی لاش نہیں دیکھی۔ میرا نام انجیلا رچ مین ہے اور میں مسوری کی چاؤ ٹیو کاؤنٹی میں ڈیتھ انویسٹی گیٹر ہوں۔ میرا اپنا کوئی گھر نہیں ہے اور میں ڈوپریس اسٹیٹ میں رہتی ہوں۔ میرے ماں

باپ اپنی روزمرہ ضروریات پوری کرنے کے لیے ڈوپریس خاندان کی ملازمت کرتے تھے لیکن وہ دونوں کینسر میں مبتلا ہوکر اس دنیا سے رخصت ہو گئے اور اب میں اس کاؤنٹی کے لیے خدمات انجام دے رہی ہوں۔ میرا کام ایسی تمام غیر متوقع اور غیر واضح اموات کی تحقیقات کرنا ہے جو کسی بیماری کے نتیجے میں یا طبعی طور پر واقع نہیں ہوتیں۔ مثلاً حادثات، قتل اور خودکشی وغیرہ۔ میں چاؤٹیو کاؤنٹی میڈیکل ایگزامنر کے لیے کام کرتی ہوں اور ایسی تمام اموات کی چھان بین کرنا میری ذمے داری ہے۔ پولیس جائے وقوعہ کا معائنہ کرتی اور تمام شواہد جمع کرتی ہے لیکن لاش کو ہاتھ نہیں لگاتی۔ یہ لاشیں خاموش نہیں ہوتیں بلکہ ہماری توجہ حاصل کرنے کے لیے چلّا رہی ہوتی ہیں لیکن انہیں سننا بہت مشکل ہوتا ہے جب آپ کا ردِعمل 'اوہ، میرے خدا' تک محدود ہو۔ جو کچھ آپ ٹی وی پر دیکھتے ہیں۔ اس پر یقین نہ کریں۔ موت خوب صورت نہیں ہوتی بلکہ گندی، بدبودار اور بدصورت ہوتی ہے۔ بعض لاشیں اتنی خراب حالت میں ہوتی ہیں کہ ان کی طرف دیکھنا مشکل ہوجاتا ہے۔ لیکن کوکی ان میں سے نہیں تھی۔ گو کہ وہ مرچکی تھی لیکن اس کے سنہرے بال اور گلابی جلد اپنی جانب متوجہ کرنے کے لیے کافی تھی لیکن میں بالکل بھی نہیں سن سکی کہ وہ کیا کہنا چاہ رہی تھی کیونکہ سراغ رساں رے گریمن خاموش ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا۔

ڈیتھ انویسٹی گیٹر اور ہومی سائڈ سراغ رساں رفیق کار ہوتے اور اکٹھے مل کر کام کرتے ہیں۔ لیکن رے گریمن اس کاؤنٹی میں سب سے زیادہ بے پروا سراغ رساں تھا اور چیزوں کو بہت سرسری انداز میں لیتا تھا۔ خدا جانے یہ اس کی حد سے زیادہ بڑھی ہوئی خوداعتمادی تھی یا نااہلی کہ وہ کبھی گہرائی میں نہیں جاتا اور نہ ہی جزئیات پر غور کرتا تھا۔ کوکی کیبن اور اس کا شوہر بارہ ہزار مربع فٹ پر تعمیر شدہ فرانسیسی طرز کی قلعہ نما حویلی میں رہتے تھے جو کوکی کے آباؤاجداد نے اس صدی کے آغاز پر بنوائی تھی۔ چاؤٹیو کاؤنٹی، سینٹ لوئیس کے مغرب میں تیس میل کے فاصلے پر واقع ہے اور کوکی کا شمار یہاں کی معزز خواتین میں ہوتا تھا۔ میں نے اس کی تصاویر دیکھی تھی جن میں وہ سیاہ ویلوٹ کا گاؤن پہنے ہوئے اپنی حویلی میں ماربل کی سیڑھیوں پر بیٹھی ہوئی ہے۔ کوکی کے شوہر رینڈولف ڈی کیبن کی تصویر بلیئرڈ روم میں کھینچی گئی تھی اور لوگوں کا کہنا ہے کہ یہی وہ کمرا ہے جہاں کوکی نے رینڈولف کو نوجوان خادمہ کے ساتھ رنگ رلیاں مناتے ہوئے پکڑا تھا۔

جب میں جنوری کی اس سرد سہ پہر میں کوکی کی حویلی پہنچی تو مجھے وہاں روایتی شان وشوکت کے بجائے سناٹے کا احساس ہوا۔ کوکی کی موت گیرج میں ہوئی تھی چنانچہ میں اپنی گاڑی وہیں لے گئی اور جائے وقوعہ کے قریب کھڑی کر دی جس کے گرد زرد فیتہ باندھ دیا گیا تھا۔ کیبن ہاؤس سے گیرج زیادہ فاصلے پر نہیں تھا اور وہاں جانے کے لیے پتھروں سے بنے ہوئے احاطے سے گزرنا پڑتا تھا جس میں ایک چھوٹا سا جانور خانہ بنا ہوا تھا، نہ جانے امیروں کو کتے، بلیاں پالنے کا شوق کیوں ہوتا ہے۔ میں نے کار کی ڈکی کھول کر اپنی کٹ نکالی۔ اس میں ہر وہ چیز موجود تھی جس کی تحقیقات کے دوران ضرورت پڑسکتی تھی۔

اس سامان میں آئی پیڈ، ڈیجیٹل ریکارڈر، کیمرا، لاش کا درجۂ حرارت ناپنے کے لیے تھرمامیٹر، ٹارچ، دھلی ہوئی سفید چادریں اور دستانے وغیرہ شامل تھے۔ کیونکہ لاش زیادہ پرانی نہیں تھی اس لیے مجھے حفاظتی ماسک، چشمے یا جمپ سوٹ کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔

میں نے ڈیوٹی پر موجود پولیس آفیسر وارن کو ہیلو کیا۔ سراغ رساں رے گریمن سے میری ملاقات جائے وقوعہ پر ہوئی۔ اس نے کشمیری کوٹ پہن رکھا تھا اور لگتا تھا کہ وہ کسی فیشن شوٹ کے لیے آیا ہے۔ مجھے لگا کہ وہ قیمتی کپڑے پہن کر اپنے آپ کو ماہر سراغ رساں ثابت کرنا چاہتا ہے۔

''کس نے لاش سب سے پہلے دیکھی؟'' میں نے پوچھا۔ ان لوگوں سے ہمیشہ قیمتی معلومات مل سکتی تھیں جنہوں نے آخری بار مرنے والے کو زندہ دیکھا اور جس نے سب سے پہلے لاش دریافت کی۔

''اس لڑکی نے جو ایمبولینس میں بیٹھی ہے۔'' گریمن نے کہا۔ ''وہ مرنے والی کی چھوٹی بہن ہے۔ اس کا نام ارابیلا ڈوول ہے اور عمر بیس سال ہے۔ ابھی اس کی شادی نہیں ہوئی اور وہ اپنے والدین کے ساتھ رہتی ہے۔ اس نے گیرج کا دروازہ کھولا تو بہن پر نظر گئی۔ وہ کار کی طرف دوڑی اور اپنی بہن کو باہر نکالنے کی کوشش کرنے لگی لیکن کار سے نکلنے والے دھوئیں کی وجہ سے کامیاب نہ ہوسکی۔ اس نے نو گیارہ کو فون کیا اور لڑکھڑاتی ہوئی گیرج سے باہر آ گئی۔ ایمبولینس کے عملے نے اسے ابتدائی طبی امداد دی لیکن اس نے اسپتال جانے سے انکار کر دیا۔ یہ خودکشی ہے۔ کیونکہ جب اس کی بہن گیرج میں آئی تو کار سے دھواں نکل رہا تھا۔ کوکی نے شراب پی۔ گیرج کا دروازہ بند کیا اور کار اسٹارٹ

کر دی۔ اس کی موت دم گھٹنے سے واقع ہوئی۔‘‘
’’کوکی خودکشی کیوں کرے گی؟‘‘ میں نے پوچھا۔
’’وہ خوب صورت سنہرے بالوں والی لڑکی تھی اور اس کی دولت کا اندازہ ایک کروڑ ڈالر لگایا جاتا ہے۔ جس کے پاس دنیا بھر کی آسائشیں اور نعمتیں ہوں، وہ اپنی جان کیوں دے گی۔‘‘
’’اس کی شوہر سے علیحدگی ہو گئی تھی۔‘‘ گریمن نے کہا۔
’’سنا ہے کہ کوکی نے اسے گھر سے نکال دیا تھا۔‘‘ میں نے کہا۔
اس کے شوہر کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ عورتوں کا رسیا ہے اور اس معاملے میں بالکل احتیاط سے کام نہیں لیتا۔ ایک روز کوکی کسی کام سے بلیئرڈ روم گئی تو اس نے رینڈولف کو بیس سالہ خادمہ کے ساتھ قابلِ اعتراض حالت میں دیکھا۔ اس نے ایک لمحے کی تاخیر کیے بغیر ملازمہ کو برطرف کر دیا اور وکیل کو بلا کر علیحدگی کے کاغذات تیار کرے، وہ اپنے شوہر کی حرکتوں سے تنگ آ چکی تھی۔
’’اب تم اس کی بہن سے بات کر سکتی ہو۔‘‘ گریمن نے اپنی گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے کہا اور وہ سوچنے لگی کہ ایک سراغ رساں کے پاس پینتیس ہزار ڈالر مالیت کی گھڑی کہاں سے آ گئی۔
’’اس کے بعد تم لاش کا معائنہ کر کے اس معاملے کو لپیٹنا۔‘‘ گریمن نے کہا۔ ’’تمہیں تیزی دکھانے کی ضرورت ہے کیونکہ میں ایک گھنٹے بعد چلا جاؤں گا۔ میری ڈیوٹی چار بجے تک ہے۔‘‘
’’اوہ نو۔‘‘ میں نے سوچا۔ میں پولیس والوں سے احکامات نہیں لیتی۔ خصوصاً ایسے شخص سے جو بہت زیادہ غلطیاں کرتا ہو۔
’’پہلے میں طبی عملے سے مل لوں پھر اس کی بہن سے گھر میں بات کروں گی۔‘‘
’’ٹھیک ہے لیکن جلدی کرو۔ ہمیں شام سے پہلے اپنا کام ختم کرنا ہے۔‘‘
میں نے اس کی بات کا جواب دینے کی زحمت گوارا نہیں کی اور آئی پیڈ نکال کر وہ فارم کھولا جس پر جائے وقوعہ سے تحقیقات کے دوران حاصل ہونے والی معلومات درج کی جاتی ہیں۔ میں نے دیکھا کہ طبی عملے کا ایک رکن مائیک اس لڑکی بیلا ڈوول کو ایمبولینس سے باہر نکالنے کی کوشش کر رہا ہے جو ابھی تک بُری طرح کپکپا رہی تھی۔ اس نے سرخ فر کا کوٹ اور اس سے ہم رنگ مخملیں ٹوپی پہن رکھی تھی۔ اس کے باوجود سردی سے اس کے ہونٹ نیلے ہو رہے تھے۔
’’میں اب بھی تمہیں یہی مشورہ دوں گا مس ڈوول کہ کسی ڈاکٹر کو دکھا دو۔‘‘ مائیک نے کوکی کی بہن سے کہا۔ ’’لیکن اگر تم اسپتال نہیں جانا چاہتیں تو براہِ کرم اس کاغذ پر دستخط کر دو۔‘‘
گھنگریالے بالوں والا مائیک ایک جاذبِ نظر شخص تھا۔ اس نے دل موہ لینے والی مسکراہٹ کے ساتھ بیلا کو دیکھا۔ اس نے نفی میں سر ہلایا۔ یہ گویا اس بات کی جانب اشارہ تھا کہ وہ اسپتال نہیں جانا چاہتی۔
’’مس ڈوول۔‘‘ میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ’’میرا نام انجیلا رچ مین ہے۔ مجھے تمہاری بہن کی موت کا بے حد افسوس ہے۔ اس کی موت کی تحقیقات کے لیے یہاں آئی ہوں اور مجھے یہ معلوم کرنا ہے کہ اس کی موت کس طرح واقع ہوئی۔ میں طبی عملے سے ملنے کے بعد تم سے کچھ باتیں کرنا چاہوں گی۔ بہتر ہوگا کہ ہماری ملاقات گھر کے اندر ہو تاکہ تم سردی سے محفوظ رہ سکو۔‘‘
’’میں یہیں تمہارا انتظار کروں گی۔‘‘ بیلا نے کہا لیکن اس کے بعد وہ وہاں سے ہٹ گئی تاکہ اس تک ہماری آواز نہ پہنچ سکے۔
’’ہائے پیاری لڑکی، تمہیں یہاں دیکھ کر خوشی ہوئی۔‘‘ مائیک نے شوخ لہجے میں مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ ’’کیا تم میرے ساتھ کہیں باہر جانا پسند کرو گی؟‘‘
’’تم ایک شادی شدہ عورت کے ساتھ فلرٹ کر کے اپنا وقت ضائع کر رہے ہو۔‘‘ میں نے نرمی سے کہا۔
’’خواب دیکھنے پر تو کوئی پابندی نہیں۔‘‘ اس نے کہا۔ ’’مجھے لمبے بھورے بالوں والی لڑکیاں بہت پسند ہیں۔‘‘
’’میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے مائیک۔ بہتر ہے کہ پہلے کام کی بات کر لی جائے۔‘‘
’’ٹھیک ہے۔ میں تیار ہوں۔‘‘ اس نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔
میں نے آئی پیڈ کھولا اور اس میں تفصیلات درج کرنے لگی۔ جب میں نے اس کا پورا نام، عہدہ، تاریخ اور وقت لکھ لیا تو اس نے بولنا شروع کیا۔ ’’میں اپنے ایک ساتھی ڈین وانس کے ساتھ دو بجے گیرج میں داخل ہوا۔ ہم دونوں نے منہ پر سانس لینے والا آلہ لگایا ہوا تھا۔ ہم نے مقتولہ کی

لاش کو اکڑی ہوئی حالت میں دیکھا۔ میرا اندازہ ہے کہ اس کی موت کو بارہ سے پندرہ گھنٹے گزر چکے تھے۔ اس کا انحصار اس بات پر ہے کہ کار کے اندر درجۂ حرارت کیا تھا۔ اس کی لاش اتنی سخت ہو گئی تھی کہ اسے ہلانا ممکن نہیں تھا چنانچہ ہم نے اسے ڈرائیونگ سیٹ پر ہی چھوڑ دیا۔

''کیا کار کا انجن چل رہا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں، لگتا تھا اس میں گیس ختم ہو گئی ہے لیکن میں نے اگنیشن کو غور سے نہیں دیکھا۔''

''میڈیکل ایگزامنر نے مجھے بتایا ہے کہ کاربن ڈائی آکسائڈ کے خارج ہونے سے کار گیس پر نہیں چلتی۔'' میں نے کہا۔ ''کیونکہ گیرج میں آکسیجن کی کمی ہو گئی تھی۔ اس لیے گیس ختم ہونے سے پہلے ہی کار کا انجن بند ہو گیا تھا۔''

''تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔'' مائیک کندھے اچکاتے ہوئے بولا۔ ''میں نے گیس پیڈل کے قریب ایک ووڈکا کی بوتل دیکھی تھی لیکن مجھے نہیں معلوم کہ اس میں شراب کی کتنی مقدار بچی تھی۔ مجھے وہاں کوئی خط، پرس یا کوئی اور چیز نظر نہیں آئی البتہ میں نے کار کا تفصیلی معائنہ نہیں کیا۔''

''کیا گیراج کی روشنیاں جل رہی تھیں؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں، جب گیراج کا دروازہ کھولا جائے تو وہ خود بخود روشن ہو جاتی ہیں۔''

''کیا تم نے کار کے ہینڈل کو ہاتھ لگایا تھا؟''

''ہاں لیکن میں نے دستانے پہن رکھے تھے۔''

''کیا عقبی پائپ سے کوئی ربڑ کا پائپ منسلک تھا؟''

''میں نے وہاں ایسی کوئی چیز نہیں دیکھی۔'' مائیک نے جواب دیا۔ ''میں تمہیں یہی کچھ بتا سکتا ہوں۔ اس کے علاوہ میرے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں ہے۔''

اس کے ساتھی ڈین نے بھی مائیک کی کہی ہوئی باتیں دہرائیں۔ جیسے ہی اس کا بیان ختم ہوا انہیں کہیں اور سے بلاوا آ گیا اور وہ وہاں سے چلے گئے۔

آگ بجھانے والے عملے نے ابھی تک گیراج کو کلیئر نہیں کیا تھا۔ سراغ رساں گریمن نے ایک بار پھر اضطراب کے عالم میں گھڑی پر نظر ڈالی۔ وہ اپنے طور پر پہلے ہی طے کر چکا تھا کہ یہ خودکشی کا کیس ہے اور اب وہ چاہ رہا تھا کہ جلد از جلد ضابطے کی کارروائی مکمل ہو جائے تاکہ وہ اپنی شفٹ کا وقت ختم ہونے سے پہلے گھر جا سکے۔ میں بیلا کے ساتھ گھر کی جانب روانہ ہو گئی۔ سردی سے میری انگلیاں سن ہو گئی تھیں حالانکہ میں نے گرم اونی دستانے پہن رکھے تھے۔

''کوکی کے گھر میں دو کچن ہیں۔'' بیلا نے سنگِ مرمر کے فرش سے مزین صحن میں قدم رکھتے ہوئے کہا۔ میں اس کے ہمراہ اپنا سوٹ کیس گھسیٹتی ہوئی چل رہی تھی۔ ''بات کرنے کے لیے یہ مناسب جگہ ہے۔''

''کیا تم جانتی ہو کہ تمہاری بہن سے ملنے والا آخری فرد کون تھا؟''

''غالباً فرین۔'' بیلا نے کہا۔ ''مجھے معلوم ہے کہ گزشتہ شب اس نے مہمانوں کے لیے کھانا تیار کیا اور سرو کرنے کے بعد گھر چلی گئی۔''

کوکی کے چہرے پر زردی چھائی ہوئی تھی یہاں تک کہ اس کے سنہری بالوں کا رنگ بھی ماند پڑ گیا تھا۔ جونہی فرین عقبی دروازے سے داخل ہوئی تو وہ اسے دیکھ کر اپنے آنسو نہ روک سکی۔

''او، مس بیلا۔'' پستہ قد باورچن نے کہا۔ ''مجھے یقین نہیں آ رہا کہ ہماری کوکی اس دنیا سے چلی گئی۔'' بیلا اس کے گلے لگ گئی اور دونوں رونے لگیں۔

فرین گول مٹول عورت تھی اور اس نے کام کے کپڑے پہن رکھے تھے۔ اس کے بال گھنگریالے اور آنکھیں نیلی تھیں جن میں اداسی تیر رہی تھی۔ اس کے صاف ستھرے کچن میں کافی اور دار چینی کی مہک پھیلی ہوئی تھی۔ بیلا نے فرین کو اپنے سے الگ کرتے ہوئے کہا۔ ''میں نے سن لیا ہے جو وہ سراغ رساں کہہ رہا تھا۔ میری بہن خودکشی نہیں کر سکتی۔''

''وہ اس ناکارہ شخص کے لیے اپنی جان نہیں دے سکتی۔'' فرین نے کہا۔

''کیا تمہاری بہن اس وجہ سے پریشان تھی کہ وہ اور مسٹر کیبن علیحدہ ہو گئے؟'' میں نے پوچھا۔

''بالکل نہیں۔'' بیلا نے کہا۔ ''اس نے تو اس شخص کو گھر سے نکال دیا تھا اور وہ گزشتہ شب اسے ڈنر پر بلانے کے لیے صرف اس لیے رضامند ہو گئی کہ ماں ان دونوں کا دوبارہ ملاپ چاہتی تھی۔ وہ ایک راسخ العقیدہ کیتھولک ہے اور طلاق کو پسند نہیں کرتی۔''

میں اور بیلا کچن ٹیبل پر بیٹھے ہوئے تھے۔ فرین ہمارے لیے پھول دار چائنا کپ میں کافی لے کر آئی۔ ہم نے اس کا شکریہ ادا کیا لیکن وہ وہیں پر کھڑی اپنے ہاتھوں کو مسلتی رہی۔ مجھے لگا جیسے وہ کچھ کہنا چاہ رہی ہے۔

''کیا تم ہی وہ آخری فرد تھیں جس نے مسز کیبن کو زندہ

دیکھا؟''

''مجھے یقین ہے۔'' فرین نے کہا۔ ''اس کے بعد آنے والا شخص اس کا قاتل ہی ہو سکتا ہے۔ وہ کوئی اور نہیں بلکہ اس کا شوہر ہے۔''

''کیا تم میرے پاس بیٹھ کر بات کر سکتی ہو تاکہ مجھے اپنی رپورٹ کی تیاری کے لیے مواد مل سکے۔''

وہ بیٹھ تو گئی لیکن کچھ مضطرب لگ رہی تھی۔ میں نے اس کے بارے میں بنیادی معلومات لیں پھر اس سے ممکنہ خودکشی کے بارے میں سوالات کیے۔

''کیا مسز کیبن افسردہ دکھائی دیتی تھی؟''

''بالکل نہیں فرین نے کہا۔ ''مس کوکی کبھی اپنا دکھ لوگوں سے بیان نہیں کرتی تھی۔ اس نے اپنے خاندان کے لوگوں کو بھی اس بارے میں کچھ نہیں بتایا کیونکہ وہ اپنی ذات کو تماشا نہیں بنانا چاہتی تھی۔ شوہر سے علیحدگی ہو جانے کے بعد وہ مستقبل کے بارے میں منصوبہ بندی کر رہی تھی۔ اس کی ہمیشہ سے خواہش تھی کہ وہ انٹیریئر ڈیزائنر بنے لیکن شادی کی وجہ سے وہ گریجویشن مکمل نہ کر سکی۔ اس کے جانے کے بعد مس کوکی نے ڈگری حاصل کرنے کے لیے سینٹ لوئیس کے میری ول کالج میں داخلہ لے لیا اور ایک ہفتہ پہلے ہی اس کا نیا سیمسٹر شروع ہوا تھا۔ وہ یہ کورس کرنے کے لیے بہت پُرجوش تھی۔ اس کا ارادہ تھا کہ گریجویشن کرنے کے بعد اپنا کاروبار شروع کرے اور وہ ایسا کیوں نہ کرتی۔ اس کے پاس صلاحیت اور پیسا دونوں چیزیں تھیں جن سے وہ اپنی مرضی کے مطابق کام کر سکتی تھی۔ اسے شوہر کے جانے کا غم نہیں تھا بلکہ اپنی خواہشات عزیز تھیں۔''

فرین نے دورانِ گفتگو ایک مرتبہ بھی مسٹر کیبن کا نام نہیں لیا۔ اسی طرح کوکی کے بارے میں بھی وہ حال کا صیغہ استعمال کر رہی تھی۔ لگتا تھا اس نے ابھی تک اس کی موت کو ذہنی طور پر قبول نہیں کیا تھا۔

''اسے مسٹر کیبن سے علیحدہ ہوئے کتنا عرصہ ہوا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''تقریباً دو ماہ۔'' فرین نے کہا۔ ''جب وہ شخص چلا گیا تو مس کوکی نے کہا، ایسا لگتا ہے کہ اس کے کندھوں سے کوئی بوجھ ہٹ گیا۔ وہ کبھی اس سے دوبارہ نہیں ملنا چاہتی تھی لیکن وہ ایک اچھی بیٹی بھی تھی اور اپنی ماں کو خوش رکھنا چاہتی تھی۔ اسی لیے ماں کے کہنے پر اس نے گزشتہ شب کیبن کو ڈنر پر بلا لیا۔''

یہ کہتے ہوئے فرین کی آواز بھرا گئی اور اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ بیلا نے اس کا ہاتھ تھپتھپایا تو وہ بمشکل اپنا بیان جاری رکھنے کے قابل ہو سکی۔ ''مس کوکی نے مجھ سے دو آدمیوں کے لیے اچھا سا کھانا بنانے کی فرمائش کی اور ہر وہ چیز بنوائی جو اسے پسند تھی۔ وہ سات بجے کے قریب آیا۔ اس کے ہاتھ میں سرخ گلابوں کا بڑا سا گلدستہ تھا۔ وہ اب بھی کچن کاؤنٹر پر پڑا ہوا ہے۔''

اس نے پھولوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''ان کی شادی کو دس سال ہو گئے اور وہ ابھی تک نہیں جان سکا کہ اسے شاخ سے ٹوٹے ہوئے پھول اچھے نہیں لگتے۔ وہ انہیں مرجھاتا ہوا نہیں دیکھ سکتی۔ میں نے آٹھ بجے میز پر کھانا لگا دیا تھا۔''

وہ لمحہ بھر کے لیے خاموش ہوئی پھر کہنے لگی۔ ''میں بتا سکتی ہوں کہ مصالحت کی یہ کوشش کامیاب نہیں ہوئی۔ مس کوکی بہت زیادہ پی رہی تھی۔ اس نے آدھی سے زیادہ بوتل خالی کر دی اور برائے نام کھانا کھایا۔ میں اس کی پلیٹ اٹھا کر لے گئی۔ اس نے شاید بھنے ہوئے گوشت کے ایک دو ٹکڑے ہی لیے ہوں گے۔ باقی کسی چیز کو ہاتھ بھی نہیں لگایا۔''

''کیا مسٹر کیبن ووڈکا پیتے تھے؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ اسکاچ کا شوق رکھتا تھا۔'' فرین نے کہا۔ ''اس نے صرف ایک گلاس لیا اور وہ بھی ختم نہیں کیا پھر اس نے مجھ سے کہا کہ میں وہ گلاس اس کے سامنے سے ہٹا دوں البتہ اس نے خوب ڈٹ کر کھانا کھایا جبکہ مس کوکی نے کھانے کے بعد میٹھے کو بھی ہاتھ نہیں لگایا حالانکہ میں نے اس کی پسندیدہ ڈش بنائی تھی۔ میں ان کے لیے کافی لے کر آ رہی تھی جب میں نے مس کوکی کو یہ کہتے ہوئے سنا۔ ''سب کچھ ختم ہو چکا ہے۔ میں تمہارے ساتھ نہیں رہنا چاہتی اور نہ ہی تمہیں مزید کوئی پیسا ملے گا۔ پچھلی مرتبہ تم نے وعدہ کیا تھا کہ مجھ سے دوبارہ بے وفائی نہیں کرو گے لیکن ......''

مجھے دیکھ کر مس کوکی خاموش ہو گئی۔ اس نے مجھ سے کہا کہ میں گھر جا سکتی ہوں۔ اس وقت ساڑھے آٹھ بج رہے تھے اور میں نے اسے آخری مرتبہ زندہ حالت میں دیکھا۔ مجھے اسے مسٹر کیبن کے ساتھ اکیلا نہیں چھوڑنا چاہیے تھا۔ مجھ سے بہت بڑی غلطی ہوئی کہ اس کی بات مان لی۔ مجھے کیبن ... کے جانے تک اس کے پاس رہنا چاہیے تھا۔''

''کیا تمہارے علاوہ بھی یہاں کوئی اور تھا؟''

''صرف یہاں رہنے والی ہاؤس کیپر مسز ایون، لیکن

اس کا کمرا دوسری طرف ہے۔ وہ رات میں ٹی وی شوز دیکھتی ہے۔ مجھے شبہ ہے کہ اس نے کچھ دیکھا یا محسوس کیا ہوگا۔ محافظ عمارت کے مرکزی گیٹ پر ڈیوٹی دے رہے تھے۔ وہ بتا سکتے ہیں کہ کون آیا اور کس وقت گیا لیکن جہاں تک میرے علم میں ہے، میں ہی مس کوکی کو دیکھنے والی آخری فرد تھی۔''

''کیا اس نے گزشتہ روز اپنے معمولات میں کوئی تبدیلی کی تھی؟''

''نہیں۔ وہ صبح اپنی مارننگ کلاس اٹینڈ کر کے میری ول چلی گئی تھی اور معمول کے مطابق دو بجے واپس آئی پھر وہ اپنے بال بنوانے ہیئر ڈریسنگ سیلون چلی گئی۔''

''کیا تم اس جگہ کا نام بتا سکتی ہو؟''

''ہاں، وہ یہاں کا مشہور فیشن ایبل سیلون کلر کٹس ہے۔ وہ چار بجے گھر واپس آئی۔ اسے اپنی کلاس کے لیے ایک پروجیکٹ تیار کرنا تھا لہٰذا اس نے بقیہ سہ پہر تیسری منزل پر واقع اپنے اسٹوڈیو میں گزاری۔ پانچ بجے میں نے اسے چائے دی۔ سات بجے وہ نہانے چلی گئی پھر اس نے لباس تبدیل کیا اور اس کے ساتھ ڈنر کرنے کی تیاری کرنے لگی۔ اس نے بھیڑ کی اون کا بنا ہوا کشمیری سویٹر پہنا۔ میرا خیال ہے کہ اس میں وہ اپنے آپ کو آرام دہ محسوس کرتی ہو گی۔ میں جانتی ہوں کہ اس سے اسے کوئی آرام نہیں ملا۔'' وہ غصے سے ناک سکیڑتے ہوئے بولی۔

''آج مسٹر کیبن کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ نیویارک میں ہے۔'' فرین نے ایپرن سے اپنی آنکھیں پونچھتے ہوئے کہا۔ ''وہ صبح سویرے ہی چلا گیا تھا۔ تمہیں اور کافی چاہیے۔ اس کے ساتھ دار چینی کے رول کیسے رہیں گے؟''

''ہاں ضرور۔'' بیلا نے کہا۔ ''ہم دونوں کے لیے لے آؤ۔''

''آگ بجھانے والے عملے اور پولیس والوں کو بھی کافی دے دوں؟'' فرین نے پوچھا۔

''صرف کافی ہی نہیں۔ اس کے ساتھ رول بھی دینا۔ وہ تمہارے بہت شکر گزار ہوں گے۔''

فرین کے جانے کے بعد میں ایک بار پھر بیلا سے مخاطب ہوگیا۔ ''تمہارا کہنا ہے کہ کوکی نے خودکشی نہیں کی۔ کیا تمہیں اس کا یقین ہے؟''

''ہاں، میں اچھی طرح جانتی ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''میں اور ڈیڈی نہیں چاہتے تھے کہ وہ کیبن سے شادی کرے اور ہم نے اسے سمجھانے کی بہت کوشش کی لیکن وہ اس کی محبت میں پاگل ہو چکی تھی۔ کیبن نے میری ماں کو شیشے میں اتار لیا لیکن میں اور ڈیڈی اس کی حرکتوں سے واقف تھے۔ ڈیڈی نے اس سے ایک تحریری اقرار نامے پر دستخط کروائے اور اس میں شرط رکھی کہ بے وفائی کی صورت میں اسے بھاری جرمانہ ادا کرنا ہوگا اور اگر کوکی......''

یہ کہتے ہوئے بیلا کی آواز بھرا گئی۔ چند سیکنڈ خاموش رہنے کے بعد اس نے اپنے حواس مجتمع کیے اور بولی۔ ''اگر کوکی مر گئی تو وہ اس کے تمام اثاثوں کا مالک ہوگا جو ایک کروڑ ڈالر اور اس مکان پر مشتمل ہیں۔''

وہ ایک بار پھر خاموش ہوگئی پھر اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے بولی۔ ''ڈیڈی کا خیال تھا کہ وہ اس اقرار نامے کے ذریعے میری بہن کا تحفظ کر رہے ہیں لیکن اب ایسا لگتا ہے کہ انہوں نے اس کا ڈیتھ وارنٹ لکھا تھا۔ کیبن کے پاس کچھ بھی نہیں تھا حالانکہ اس کا خاندان کافی دولت مند ہے۔''

بیلا بہت زیادہ جذباتی ہوگئی تھی۔ میں نے اسے بولنے دیا۔ اس سے انٹرویو کرنے کا وہی بہترین وقت تھا۔ خودکشی کرنے والے کے قریبی عزیزوں کو اگر سوچنے کا وقت مل جائے تو وہ اپنی کہانی تبدیل کرتے ہیں اور ان کی خواہش ہوتی ہے کہ ان کے بیان کردہ حقائق ہی سچ ہوں۔

''ہم سب جانتے تھے کہ وہ دوسری عورتوں سے ملتا رہتا ہے۔'' بیلا نے کہا۔ ''اس نے ہنی مون ختم ہوتے ہی یہ حرکتیں شروع کر دی تھیں اور اس علاقے میں سب لوگ اسی بارے میں باتیں کیا کرتے تھے۔ کوکی بھی اپنی آنکھیں بند نہیں کر سکتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اس کے کم از کم تین عورتوں کے ساتھ تعلقات ہیں جبکہ مجھے معلوم تھا کہ یہ تعداد اس سے بھی زیادہ ہے۔ ہر بار وہ وعدہ کر لیتا کہ آئندہ ایسا نہیں ہوگا اور وہ اس کے کہنے پر یقین کر لیتی تھی، پھر ایک دن اس نے اسے خادمہ کے ساتھ رنگ رلیاں مناتے ہوئے پکڑ لیا۔ تم نے بھی یہ کہانی سنی ہوگی۔''

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''یہ منظر اس کے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔ شوہر کے بارے میں دوسرے لوگوں سے سننا ایک الگ بات ہے لیکن اسے کسی دوسری عورت کے ساتھ قابلِ اعتراض حالت میں دیکھنا بالکل مختلف تجربہ ہے۔ وہ سیدھی اپنے وکیل کے پاس گئی۔ اس نے سہ پہر میں اس کا سامان پیک کیا اور اس

کے وکیل کو بھیج دیا۔ کیسین بھی ڈنر سے پہلے گھر چھوڑ کر چلا گیا۔''

فرین گرم گرم رول اور کافی لے کر آگئی۔ میں نے ایک ٹکڑا منہ میں رکھا۔ بیلا نے بھی میری تقلید کی اور اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ''کیسین نے واپس آنے کی بہت کوشش کی لیکن وہ اس کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی تھی۔ وہ اس کی ٹیلی فون کالز بھی نہیں سن رہی تھی اور اس کے بھیجے ہوئے پھول بھی واپس کر دیے پھر وہ آنسو بہاتا ہوا اماں کے پاس پہنچ گیا اور اس سے کہا کہ وہ کوکی سے مصالحت چاہتا ہے۔ ماں نے بیٹی پر زور دیا کہ وہ اپنے شوہر کو ایک موقع اور دے، کوکی نے ماں کے کہنے پر اسے کھانے پر بلا لیا اور اس کے بعد یہ واقعہ پیش آگیا۔''

اتنا کہہ کر بیلا زاروقطار رونے لگی۔ اس کی ہچکیاں رکنے کا نام نہیں لے رہی تھیں۔ فرین نے جلدی سے اس کی جانب ٹشو پیپر کا ڈبا بڑھایا اور اس کی پیٹھ تھپتھپانے لگی۔ میں نے اس کے آنسو تھمنے کا انتظار کیا پھر پوچھا۔

''تم آج کس سلسلے میں یہاں آئی تھیں؟''

بیلا نے اپنی آنکھیں صاف کرتے ہوئے کہا۔ ''ہمارا ایک بجے سونج ز۔ میں لنچ کرنے کا پروگرام تھا۔ یہ اس علاقے میں ایک نیا فرانسیسی ریستوران ہے۔ کوکی وقت کی بہت پابند تھی۔ جب وہ ایک بج کر پندرہ منٹ تک نہیں آئی تو میں نے اسے فون کیا لیکن کوئی جواب نہیں ملا۔ پھر میں نے فرین کو فون کیا تو اس نے بتایا کہ اس نے ابھی تک کوکی کو نہیں دیکھا لیکن میری بہن نے ہدایت کی تھی کہ وہ دیر تک سونا چاہتی ہے۔ فرین نے بتایا کہ اس کے کمرے کا دروازہ بند تھا لیکن جب اس نے کوکی کا بستر دیکھا تو وہ وہاں موجود نہیں تھی۔ یہ سن کر میں سیدھی یہاں چلی آئی۔ اس کی کار پورچ میں نہیں تھی۔ اس کی عادت تھی کہ جب وہ پریشان ہوتی تو کار لے کر بے مقصد گھومنے نکل جاتی۔ اس وقت بھی میں یہی سمجھی کہ وہ لمبی ڈرائیو پر چلی گئی ہے اور ممکن ہے کہ وہ سینٹ لوئیس چلی گئی ہو۔ میں اپنا اطمینان کرنے کے لیے گیراج کی طرف گئی لیکن جونہی دروازہ کھولا تو میں نے کار کے دھوئیں کی بو محسوس کی اور کوکی کو ڈرائیونگ سیٹ پر دیکھا۔ گاڑی کا انجن بند ہو چکا تھا اور دھوئیں کی وجہ سے مجھے سانس لینے میں دشواری ہو رہی تھی۔ میں بڑی مشکل سے کار تک پہنچی لیکن میرا سر بری طرح چکرا رہا تھا۔

جیسے ہی میں نے کار کا دروازہ کھولا تو سمجھ گئی کہ وہ مر چکی ہے حالانکہ دیکھنے میں لگ رہا تھا جیسے وہ گہری نیند سو رہی ہے۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑا تو وہ اکڑا ہوا تھا۔ یہ بہت دہشت ناک منظر تھا۔ میں اسے باہر نکالنا چاہ رہی تھی لیکن اس وقت مجھ میں اتنی طاقت نہیں تھی اور میں اپنے آپ کو بہت کمزور محسوس کر رہی تھی۔ میں نے نو گیارہ کو فون کیا اور اس کے بعد بے ہوش ہو گئی۔ جب ہوش آیا تو اپنے آپ کو ایمبولینس میں پایا۔''

''اب تم کیسا محسوس کر رہی ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''میری بہن مر گئی ہے۔'' بیلا نے کہا۔ ''تم کیا سمجھتی ہو کہ میں کیسا محسوس کر رہی ہوں گی۔'' اس نے کندھے

اچکائے اور اپنا بھاری کوٹ اتار کر کرسی کی پشت پر ڈال دیا۔

میں نے اپنی آواز نرم رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''جانتی ہوں کہ تمہاری بہن کی موت واقع ہو چکی ہے......''

''اسے قتل کیا گیا ہے۔'' بیلا نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''یہ تمہارے لیے بہت مشکل وقت ہے لیکن تم کاربن مونو آکسائیڈ سے بے ہوش ہو گئی تھیں۔''

''اس بات کو دہرانے کی ضرورت نہیں۔'' بیلا نے کہا۔ ''میں اسپتال نہیں جا رہی۔ تم میری بہن کے بارے میں کچھ اور پوچھنا چاہ رہی ہو؟''

''میں نے کاربن مونو آکسائیڈ کے حوالے سے ہی سوال کیا۔'' تمہاری بہن کے گیراج کا دروازہ ہاتھ سے کھلتا ہے یا اس میں بجلی کا نظام موجود ہے؟''

''بجلی سے۔'' بیلا نے کہا۔ ''کوکی کے یہاں چوبیس گھنٹے سیکیورٹی سسٹم کام کرتا ہے، گیراج کے دروازے کے ساتھ ایک بٹن لگا ہوا ہے جسے دبانے سے وہ کھل جاتا ہے۔ اسی طرح اس کی کار میں بھی ایسا ہی ایک بٹن موجود ہے۔''

''کیا کار کا ریڈیو یا سی ڈی پلیئر چل رہا تھا۔''

''نہیں۔''

''کیا گاڑی کی کھڑکیاں بند تھیں؟''

''ہاں، سردی کی وجہ سے کھڑکیوں کے شیشے اوپر چڑھے ہوئے ہوتے ہیں۔''

''کار کا ہیٹر چل رہا تھا؟''

''مجھے نہیں معلوم۔ البتہ اس کے پیروں کے پاس میں نے ووڈکا کی بوتل دیکھی تھی۔ اس کے علاوہ میں نے کسی اور چیز پر غور نہیں کیا۔''

''کیا تمہاری بہن سگریٹ پیتی تھی؟''

''نہیں۔''

اب ایک مشکل سوال کی باری تھی لہٰذا میں نے ہوشیاری سے کام لیتے ہوئے کہا۔ ''کیا اسے نشہ کرنے کے بعد کوئی مشکل ہوتی تھی؟''

''تم یہ کہنا چاہ رہی ہو کہ وہ شراب پیتی تھی۔ ایسا نہیں ہے۔ فرین کا کہنا ہے کہ گزشتہ شب اس نے پی رکھی تھی۔ لیکن ایسا بہت کم ہوتا تھا۔ کوکی نے کیپٹن۔ کو باہر نکالنے کے بعد شیمپین کی بوتل ضرور کھولی تھی لیکن یہ ایک طرح سے اظہارِ مسرت تھا۔ اس نے بہت زیادہ نہیں پی۔''

''وہ کوئی دوا استعمال کرتی تھی؟''

''ہم اس کا بیڈ روم دیکھ سکتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ صرف مانع حمل گولیاں اور نیند کی دوا لیتی ہو گی۔ ویسے وہ مکمل طور پر صحت مند تھی۔''

''دوسری دواؤں کے بارے میں کچھ بتا سکتی ہو، مثلاً منشیات وغیرہ۔''

بیلا ہچکچائی تو مجھے اپنے سوال کا جواب مل گیا۔ میں نے کہا۔ ''میرا تعلق پولیس سے نہیں ہے اور میں کسی کے لیے مشکل پیدا کرنا نہیں چاہتی البتہ اپنی تحقیقات کے لیے یہ جاننا ضروری ہے۔''

''وہ کبھی کبھی چرس پیتی تھی۔'' بیلا نے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ یہ عادت اسے اسکول سے پڑی تھی۔''

''کیا اس نے خودکشی کے بارے میں کبھی کوئی بات کی تھی؟''

''نہیں۔ میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ میری بہن نے خودکشی نہیں کی۔ وہ افسردہ نہیں تھی اور نہ ہی کسی ماہرِ نفسیات کے زیرِ علاج رہی۔ وہ منشیات اور شراب کی بھی عادی نہیں تھی۔'' بیلا نے سینے پر ہاتھ باندھتے ہوئے کہا۔ ''فرین کی طرح کوئی بھی اس کی موت کا یقین کرنے کو تیار نہیں۔''

''کیا تم مجھے اس کا کمرا دکھا سکتی ہو؟'' میں نے کہا۔

''آؤ میرے ساتھ۔'' اس نے کہا اور میں اس کے پیچھے چل دی۔ کوکی کا کمرا دوسری منزل پر سامنے کے رخ پر تھا اور اس کی فرانسیسی کھڑکیوں سے باغ کا منظر صاف طور پر دکھائی دے رہا تھا۔ اس کمرے کی شان و شوکت دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ اس سے پہلے میں نے اتنا زیادہ سونا اور شیشے صرف ایک مرتبہ دیکھے تھے جب میں ایک امیر عورت کی موت کی تحقیقات کرنے گئی تھی۔ اس عورت کا انتقال دل کا دورہ پڑنے سے ہوا تھا۔ وہ سونے کے کام والا فرنیچر پسند کرتی تھی۔ مجھے یہ جان کر بڑی حیرت ہوتی تھی کہ اس معاملے میں امیر ترین اور انتہائی غریب لوگوں کا ذوق ایک جیسا ہے اور سب ہی سونے یا اس سے بنی ہوئی چیزوں پر جان دیتے ہیں۔ مجھے یقین تھا کہ کوکی کے کمرے میں رکھی ہوئی سونے اور کرسٹل کی چیزیں اصلی ہیں۔ اس کے آراستہ و پیراستہ بستر کے سرہانے کوئی نائٹ اسٹینڈ نہیں تھا۔ ابھی میں کمرے کا جائزہ لے ہی رہی تھی کہ بیلا نے سائڈ بورڈ پر رکھے ہوئے ایک سنہری باکس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''یہ میری بہن کے زیورات کا باکس ہے۔''

میں نے باکس کھولنے کے لیے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ وہ بولی۔ ''اسے مت کھولو۔''

لیکن اس وقت تک میں باکس کھول چکی تھی۔ میری نظر ایک قدیم ہیروں کی ڈبیا پر گئی جو چرس سے بھری ہوئی تھی۔ میں نے کچرے کی باسکٹ دیکھی لیکن اس میں کوئی گولی، کوک کاٹن یا کوئی اور دوا نظر نہیں آئی اور نہ ہی بستر پر یا تکیوں کے نیچے کوئی خط ملا جو عام طور پر خودکشی کرنے سے پہلے لکھا جاتا ہے۔

''کوکی اپنی دوائیں باتھ روم میں رکھتی تھی۔'' بیلا نے سونے کے کام سے مزین دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

دواؤں کا کیبنٹ ایک آئینے کے پیچھے تھا اور اس کا فریم بھی سونے سے بنا ہوا تھا۔

بیلا اپنی بہن کو اچھی طرح جانتی تھی۔ اس نے جن دواؤں کا ذکر کیا تھا' کیبنٹ میں وہی موجود تھیں۔ یعنی مانع حمل گولیاں اور خواب آور دوائیں جو مقامی ڈاکٹر نے تجویز کی تھیں۔ میں نے نسخے پر درج تاریخ دیکھی پھر گولیوں کی تعداد گنی۔ اس نے گزشتہ تین ہفتوں میں صرف دو گولیاں لی تھیں۔ گویا وہ ان دواؤں کی عادی نہیں تھی، اس کے علاوہ عام استعمال کی دوائیں مثلاً اسپرین وغیرہ بھی تھیں۔ میں نے وہ تمام دوائیں اپنے قبضے میں کرلیں۔ یہ لاش کے ساتھ میڈیکل ایگزامنر کو بھیجی جاتیں۔ میں نے باتھ روم میں رکھی ٹوکری دیکھی۔ اس میں موزوں کا ایک خالی ڈبا تھا جس پر قیمت بھی درج تھی۔ کوکی نے آف وائٹ سلک کے موزے ساٹھ ڈالر میں خریدے تھے۔

اس کا اسٹوڈیو اوپری منزل پر ایک بڑے کمرے میں تھا جس کے فرش پر پڑے ہوئے ایرانی قالین کی قیمت غالباً میری ایک سال کی تنخواہ سے بھی زیادہ تھی۔ اسے پیشہ ورانہ انداز میں ترتیب دیا گیا تھا۔ وہاں ایک لکھنے کی میز اور ڈرائنگ ٹیبل رکھی ہوئی تھی۔ میں نے ایک لیونگ روم اور بیڈروم کے نامکمل خاکے دیکھے جنہیں ڈرائنگ بورڈ پر پنوں کے ذریعے چسپاں کیا گیا تھا۔ ایک کونے میں آرام دہ کاؤچ دو کرسیاں اور ایک میز رکھی ہوئی تھی جس پر انٹیریئر ڈیزائن سے متعلق کتابیں رکھی ہوئی تھیں اور ان میں جگہ جگہ نشانیاں لگا دی گئی تھیں جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس نے اپنے لیے جس پیشے کا انتخاب کیا اس میں کتنی سنجیدہ تھی۔

میں نے اس کا کمپیوٹر کھولا لیکن مجھے وہاں بھی خودکشی کے حوالے سے کوئی خط نظر نہیں آیا کیونکہ وہ کاغذات جمع نہیں کرتی تھی اس لیے مجھے کمرے کی تلاشی لینے میں آسانی رہی۔ بیلا خودکشی کا خط نہ ملنے پر کافی پُرسکون نظر آرہی تھی۔

''کوئی خط نہیں ملا۔'' اس نے کہا۔ ''اس سے ثابت ہوجاتا ہے کہ میری بہن نے خودکشی نہیں کی۔''

''ضروری نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔ ''عام طور پر صرف ایک تہائی خودکشی کرنے والے کوئی خط چھوڑتے ہیں۔'' ''لیکن کوئی نہ کوئی ایسا اشارہ ضرور مل جاتا ہے جس سے پتا چلے کہ انہوں نے خودکشی کی ہے۔ میں نے سوچا۔ پھر مجھے اس اعلیٰ افسر کی موت یاد آگئی جسے ملازمت سے برطرف کر دیا گیا تھا۔ پچیس سال تک کام کرنے کے بعد اسے ملازمت اور عہدے سے اچانک محروم کر دیا گیا۔ جب وہ ایک صبح اپنی ڈیوٹی پر آیا تو دو محافظوں نے اسے عمارت سے باہر دھکیل دیا۔ اس کا دفتر مقفل کر دیا گیا اور اسے بتایا گیا کہ اس کی ذاتی اشیا گھر بھیج دی جائیں گی۔

وہ افسر گھر گیا اور بیوی سے کہا کہ وہ ایک لمبے سفر پر جارہا ہے۔ لہٰذا مجھے آخری بار بوسہ دے دو۔ اس کی بیوی کو ایک میٹنگ میں جانے کی جلدی تھی۔ اس لیے اس نے اپنے شوہر کے الفاظ پر غور نہیں کیا۔ اس افسر نے اپنے بستر پر ایک خط چھوڑا جس میں لکھا تھا۔ ''باسٹھ سال کی عمر میں مجھے کوئی دوسری نوکری نہیں مل سکتی ویسے بھی میں شوگر کا مریض ہوں۔ تم میرے بغیر بہتر زندگی گزار سکو گی۔''

پھر اس نے بیڈروم سے اپنی گن اٹھائی اور گاڑی میں جاکر بیٹھ گیا۔ اس نے اپنی کار گھر کے باہر کھڑی کی اور ریوالور سے سر کو نشانہ بنالیا۔ اس کی بیٹی جب اسکول سے واپس آئی تو اس نے باپ کی لاش دیکھی لیکن کوکی نے اپنی بہن اور کک کے کہنے کے مطابق ایسا کوئی نشان نہیں چھوڑا جس سے ظاہر ہوتا ہو کہ اس نے خودکشی کی ہے۔

اب وقت آگیا تھا کہ میں گیراج میں جاکر لاش کا معائنہ کروں۔ بیلا نے اپنا کوٹ اٹھایا اور میرے ساتھ جانا چاہا لیکن میں نے اسے منع کر دیا۔ ''تم وہاں نہیں جاسکتیں۔

رات کے دو بجے ایک شیدائی جب اپنی محبوبہ کو رخصت کرنے لگا تو اس نے کہا: ''کیا تم اپنی ممی کو ہماری محبت کی باتیں بتا دیتی ہو؟''

محبوبہ بولی۔ ''وہ تو کچھ نہیں کہتیں، کرید کی عادت تو میرے شوہر میں ہے۔''

مرسلہ: فدا محمد آصف، مردان

میں چاہتی ہوں کہ تم گھر کے اندر ہی رہو۔"

اس کا زرد چہرہ غصے کے مارے سرخ ہو گیا اور اس نے منہ بسور لیا۔

"اپنی بہن کی خاطر میری بات مان لو۔" میں نے اس کی ناراضی کا احساس کرتے ہوئے کہا اور تیزی سے صحن کی جانب چل دی جہاں تیز ہوا چل رہی تھی اور درجۂ حرارت نیچے آرہا تھا۔ سراغ رساں مجھے خوب صورتی سے تراشیدہ جھاڑیوں کے قریب ملا۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی اس کی زبان پھسل گئی اور وہ بولا۔ "تم عورتوں کو تو باتیں کرنے کا موقع ملنا چاہیے۔ میں اتنی دیر سے تمہارا انتظار کررہا ہوں۔"

"میں نے اپنے انٹرویوز ختم کر لیے ہیں۔" میں نے اس کے طنز کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔

"جائے وقوعہ کی تصویریں لی جا چکی ہیں۔" اس نے کہا۔ "تین بج کر دس منٹ ہوئے ہیں اگر تم جلدی کرو تو ہم چار بجے تک فارغ ہو سکتے ہیں۔"

مجھے کوئی جلدی نہیں تھی کیونکہ یہ مرحلہ بہت اہم تھا۔ میں نے آئی پیڈ آن کر کے ڈیتھ سین انویسٹی گیشن فارم کھولا۔ بیلا پہلے ہی مجھے ابتدائی معلومات فراہم کر چکی تھی جس میں کوکی، کی تاریخ پیدائش اور سوشل سیکیورٹی نمبر بھی شامل تھا۔ میں نے موسم کے حوالے سے معلومات درج کیں۔ اس وقت باہر کا درجۂ حرارت تیس اور گیراج کے اندر بتیس ڈگری تھا۔ میں نے لمبے زاویے سے گیراج اور کار کی تصویر لی پھر قریب جا کر کار کی تصویر اور لاش کا کلوز اپ لیا۔ ڈرائیور کی طرف کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور اس پر سرمئی رنگ کا فنگر پرنٹ پاؤڈر چھڑک دیا گیا تھا۔ ڈیش بورڈ اور دوسری جگہوں پر بھی یہ پاؤڈر نظر آرہا تھا۔ اگنیشن کی آن تھی اور گیس کی ٹنکی خالی ہو چکی تھی۔ میں نے ان سب کی تصاویر لے لیں۔

میں نے نوٹ کیا کہ کوکی، کی کار گیراج کے پہلے حصے میں کھڑی ہوئی تھی اور اس کا رخ مشرق کی جانب تھا جبکہ وہ خود ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے پاؤں فرش پر اور ہاتھ برابر میں تھے۔ اس کی لاش ابھی تک کمان کی طرح اکڑی ہوئی تھی اور کمر سیٹ کی پشت سے لگی ہوئی تھی۔ اس کی بہن کے کہنے کے مطابق کوکی بتیس سال کی تھی۔ اس کے ہونٹ تھوڑے سے کھلے ہوئے اور آنکھیں بند تھیں۔ میں نے اس کی لاش کی کئی تصویریں بنائیں اور سر سے لے کر پاؤں تک اس کے جسم کے ہر حصے کو کیمرے میں محفوظ کر لیا۔ اس کے بال بہت خوب صورت تھے۔ اس نے گلابی رنگ کا کشمیری سویٹر، گرم سفید پتلون اور سفید سلک کے موزے پہن رکھے تھے جبکہ اس کے پیروں میں جوتے نہیں تھے۔

"ہمیں دیر ہو رہی ہے۔" گریمن نے مجھے یاد دلایا۔ "تم دیکھ سکتی ہو کہ اس نے خودکشی کی ہے۔ اب ہمیں چلنا چاہیے۔ تمہارا کام ختم ہو گیا۔"

"ابھی نہیں۔" میں نے کہا۔ "اگر تمہیں جلدی ہے تو اس لاش کو ہلانے میں میری مدد کرو۔"

وہ گیراج اتنا بڑا تھا کہ میں لاش کے تفصیلی معائنے کے لیے زمین پر ایک صاف سفید چادر بہ آسانی بچھا سکتی تھی۔ میں اپنے سامان میں ہمیشہ ایسی چادریں رکھا کرتی تھی۔ میں نے فرش پر چادر بچھانے کے بعد اس پر چار جوڑی دستانے رکھ دیے۔ میں ہمیشہ لاش کا معائنہ کرتے وقت انہیں استعمال کرتی تھی۔ گریمن نے لاش کو کار سے باہر نکالنے میں میری مدد کی گو کہ کوکی کا وزن صرف سو پونڈ تھا لیکن ہمیں کافی جدوجہد کرنا پڑی کیونکہ لاش ابھی تک سخت تھی۔ میں نے ڈرائیونگ سیٹ کی بھی تصویریں لیں پھر میں نے آئی پیڈ پر لاش کے معائنے کا فارم کھولا۔ جبکہ گریمن بے صبری سے ٹہل رہا تھا اور ساتھ ساتھ بڑبڑاتا جا رہا تھا۔ "اب آ بھی جاؤ۔"

میں نے اس کا سویٹر اوپر کر کے پسلیوں کے قریب کھال میں ایک چھوٹا سا شگاف کیا اور ڈیجیٹل تھرمامیٹر سے اس کا ٹمپریچر لیا۔ پھر میں نے اس شگاف کے گرد سیاہ مارکر سے ایک دائرہ بنا دیا تاکہ میڈیکل ایگزامنر سمجھ جائے کہ اس کی کھال میں یہ شگاف میں نے کیا تھا۔ اس کے سویٹر کے بٹن اور پتلون کی زپ پوری طرح بند تھی جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس نے لباس خود تبدیل کیا تھا۔ مجھے اس کے جسم پر کوئی ٹیٹو نظر نہیں آیا۔

یہ تفصیل بتانا اس لیے ضروری ہے کہ ایک دفعہ میں نے قتل کی واردات کا معائنہ کیا تھا جس میں شوہر نے بتایا کہ اس کی بیوی کام سے واپس آئی اور کپڑے تبدیل کر رہی تھی کہ اس کا سر بیرونی دروازے کے ساتھ رکھی ہوئی میز سے ٹکرا گیا۔ اس نے اسے ہال کے فرش پر پڑا ہوا پایا۔ اگر ایسا تھا تو وہ عریاں حالت میں بیرونی دروازے سے گزری ہو گی لیکن اس نے اسکرٹ پہن رکھا تھا جس کی پیچھے کی جانب زپ کھلی ہوئی تھی۔ پولیس کے سراغ رساں نے معلوم کر لیا کہ کسی نے بلیچ کے ذریعے بیڈروم کے قالین پر سے خون صاف کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس کے شوہر نے اعتراف کر لیا کہ ان دونوں میں اس وقت جھگڑا ہو گیا تھا جب وہ کام

سے واپس آنے کے بعد بیڈروم میں لباس تبدیل کررہی تھی اور اس نے بیڈ کے سرہانے رکھے ہوئے لیمپ سے اس کے سر پر کاری ضرب لگائی پھر اس نے اس کی موت کو حادثاتی رنگ دینے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔

اب گریمن کے چہرے پر غصے کے آثار نظر آرہے تھے لیکن میں اسے نظرانداز کر کے اپنے کام میں لگی رہی۔ کوکی، کی لاش کا ٹمپریچر نوے ڈگری فارن ہائٹ تھا۔ سرد موسم کی بدولت گیراج اور کار کے اندر کا درجہ حرارت بہت کم تھا اور اس وجہ سے میڈیکل آفیسر کو موت کے وقت کا تعین کرنے میں مشکل پیش آسکتی تھی۔ میں نے لاش کا جائزہ لینا شروع کیا۔ اس کے جسم پر کوئی کپڑا نظر نہیں آیا۔ نہ ہی میں نے کوئی اندرونی چوٹ، زخم، انگلیوں کے ٹوٹے ہوئے ناخن یا خون دیکھا۔ اس کے ہاتھوں پر بھی کوئی نشان نہیں تھا اور وہ بالکل صاف تھے۔ ایسا کوئی زخم یا چوٹ نظر نہیں آئی جس سے ظاہر ہوتا ہو کہ کوکی نے اپنی مدافعت میں کوئی جدوجہد کی ہو۔ میں نے اس کے کانوں میں سونے کے بندے دیکھے لیکن میں اس کا ذکر نہیں کرسکتی تھی کیونکہ موت کی تحقیقات کرنے والے جیولری کا تخمینہ نہیں لگاتے۔ اس کے بجائے میں نے لکھ دیا کہ اس نے پیلے رنگ کے بندے پہن رکھے تھے۔ اس کے علاوہ اس کے جسم پر انگوٹھیوں سمیت کوئی زیور نہیں تھا۔

اسی معائنے کے دوران مجھے کوکی، کی داہنی آستین پر ایک ڈارک براؤن بال نظر آیا۔ میں نے اسے گریمن کو دکھایا۔ اس کی تصویر بنائی اور چمٹی سے پکڑ کر اٹھالیا۔

''ہاں ہاں۔'' وہ بولا۔ ''میں نے دیکھ لیا ہے۔ ایک بال ہی تو ہے۔ تمہارے لیے یہ ایک بڑی بات ہوسکتی ہے لیکن میں یہی کہوں گا کہ اس نے خود ہی اپنی زندگی کا خاتمہ کیا ہے۔ کیا تم جلدی نہیں کرسکتیں۔ مجھے جانا ہے۔''

لیکن میں نے اپنا کام جاری رکھا اور گھوم کر لاش کے سامنے اس کے پیروں کے پاس کھڑی ہوگئی۔ تبھی میری نظر اس کی پتلون پر گئی۔ وہاں دائیں گھٹنے پر ایک سیاہ دھبا نظر آیا۔

''یہ دیکھو۔'' میں نے کہا اور اس کی تصویر اتار لی پھر اسے ناپا، اس کی لمبائی دو انچ تھی۔ ''لگتا ہے کہ اس کی پتلون پر تیل یا اس سے ملتی جلتی چیز کا دھبا لگا ہے۔''

''ممکن ہے کہ کار میں داخل ہوتے وقت دروازے سے لگ گیا ہو۔'' اس نے کہا۔

''ایک عورت جس نے سفید پتلون پہن رکھی ہو، اسے زیادہ محتاط ہونا چاہیے۔'' میں نے اس دھبے کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''وہ خودکشی کے ارادے سے کار میں گئی تھی۔ اسے اس دھبے کی کیا پروا ہوسکتی ہے۔'' گریمن نے مضطرب انداز میں کہا۔ لگ رہا تھا کہ میں نے فوری طور پر کام ختم نہیں کیا تو وہ مجھے چھوڑ کر چلا جائے گا۔

اس جملے نے مجھے چونکنے پر مجبور کردیا۔ گریمن کا کہنا تھا کہ وہ کار میں گئی تھی۔ میں نے کوکی کے پیروں کو دیکھا۔ اس کے سفید سلک کے موزے بالکل صاف تھے اور اس کے تلووں پر کوئی دھبا نہیں تھا۔ پھر کوکی کار میں کیسے آئی، اسے تو یہاں تک آنے کے لیے پتھروں کے فرش والے صحن کو عبور کرنا پڑا ہوگا تاوقتیکہ......''

گریمن نے ایک بار پھر اپنی گھڑی دیکھی اور بولا۔ ''اب چلنے کی تیاری کرو۔ کوئی احمق بھی دیکھ کر کہہ سکتا ہے کہ اس نے خودکشی کی ہے۔''

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو رے۔'' میں نے کہا۔ ''واقعی کوئی بے وقوف ہی ایسی بات کہے گا کیونکہ اس نے اس کے موزوں پر غور نہیں کیا ہوگا۔''

''یہ سفید رنگ کے موزے ہیں۔'' اس نے کہا۔ ''ان میں ایسی کیا خاص بات ہے؟''

''یہ بالکل صاف ہیں اور ان پر مٹی کا ایک دھبا بھی نظر نہیں آرہا۔ وہ گھر سے گیراج تک پتھر کے فرش والا صحن عبور کر کے کیسے آئی ہوگی؟ کیا وہ اڑ کر یہاں تک پہنچی تھی؟''

گریمن نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کا منہ ہونقوں کی طرح کھلا ہوا تھا۔

''قاتل اسے یہاں تک لے کر آیا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اس نے سارا ڈراما اس طرح اسٹیج کیا کہ یہ خودکشی معلوم ہو۔''

''اور میں شرطیہ کہہ سکتا ہوں کہ یہ قتل اس کے شوہر نے کیا ہے جسے کوکی کے مرنے پر ایک کروڑ ڈالر ورثے میں ملتے۔''

''لیکن قتل کی تحقیقات کرنا تمہارا کام ہے رے۔'' میں نے اسے چھیڑنے کے لیے کہا۔ ''معلوم ہوتا ہے کہ اب تمہیں یہاں دیر تک رکنا پڑے گا۔ میرا کام ختم ہوگیا ہے، اب چلتی ہوں۔''

گریمن اپنی جگہ پر تلملا کر رہ گیا اور میں اس کی بے چینی سے لطف اندوز ہوتی ہوئی وہاں سے چلی آئی۔

شاطر

سلیم انور

کھیل کا آغاز کتنا ہی سست انداز میں ہو... اختتام سنسنی خیز ہی ہوتا ہے... اس نے بھی نہایت ہوشیاری و چالاکی سے اپنے کھیل کا پہلا داؤ کھیلا تھا... اس کے بعد تمام داؤ اس کی منصوبہ بندی کے تحت صحیح پڑتے رہے... مگر انجام تک پہنچتے پہنچتے اچانک ہی دوسرے شاطر نے اپنا آخری اور فیصلہ کن باؤنسر پھینکا... اور شکست و فتح کا توازن بگڑ گیا...

ایک کہنہ مشق مجرم کی سرگرمیاں جو ہمیشہ شکست سے دور رہتا تھا...

وہ شخص چلتے چلتے اچانک رک گیا۔ اس کے اوورکوٹ کو جھٹکا سا لگا تھا۔ جیسے کسی نے اسے کھینچا ہو۔ اس نے رک کے اپنے قدموں کی طرف دیکھا کہ وہ کیا شے ہے۔

وہ ایک چھوٹی سی لڑکی تھی۔

چھوٹی لڑکی!

اوورکوٹ میں ملبوس اس شخص کے دل کی دھڑکن ایک ساعت کے لیے جیسے رک گئی۔ وہ اطراف کا جائزہ لیتے ہوئے ان چیزوں کو ذہن نشین کرنے لگا۔ موسیقی، خریدار،

ایک جوڑا جن کے ساتھ ایک بے بی تھی، گھریلو لباس پہنے ہوئے ایک عورت جو درمیانی راستوں کا جائزہ لیتے ہوئے آگے بڑھ رہی تھی۔ ایک بوڑھی عورت جو اپنے دہرے لینس کی عینک کی اوٹ سے کسی لیبل کو غور سے پڑھ رہی تھی۔ نیلی جینز میں ملبوس ایک ٹین ایجر جو کھلونا پستول کو چلاتے ہوئے ٹک ٹک کی آوازیں پیدا کر رہا تھا۔

لیکن اس چھوٹی لڑکی کی ماں کہیں نظر نہیں آرہی تھی۔ اوورکوٹ میں ملبوس شخص حیران ہو رہا تھا کہ اس بچی کی ماں کہاں چلی گئی ہے۔ ابھی چند لمحوں قبل تو وہ اس بچی کے ساتھ یہاں موجود تھی۔

''ہیلو ینگ لیڈی!'' اوورکوٹ میں ملبوس شخص نے اپنی عینک کو انگلیوں میں گھماتے ہوئے بچی کو مخاطب کیا۔ ''کیا تم اپنی ماں سے بچھڑ گئی ہو؟''

بچی نے نظریں اٹھا کر اوپر کی طرف دیکھا۔ اس کے پرپل کلر کے لباس کی چمک دمک اور اکڑاہٹ اس کے نئے پن کی غمازی کر رہی تھی۔ اس نے جواب میں اثبات میں سر ہلا دیا۔

اوورکوٹ میں ملبوس شخص نے پوشیدہ نظروں سے اطراف کا جائزہ لیا، پھر جھک کر بچی سے بولا۔ ''تمہارا لباس بے حد خوب صورت ہے۔''

بچی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ابھر آئی۔ ''یہ میری سالگرہ کا لباس ہے۔ پارٹی کے لیے۔''

''اوہ...... پارٹی کے لیے۔'' اوورکوٹ والا شخص بھی جواباً مسکرا دیا۔ ''تب تو تمہیں بہت مزہ آئے گا۔''

اتنے میں گھریلو لباس والی خریدار عورت ان کے نزدیک سے گزرنے لگی۔ وہ اپنے آپ میں مگن تھی اور ان دونوں پر ایک اچٹتی نگاہ تک نہیں ڈالی۔ شاپنگ کرنے والوں میں سے کوئی بھی ان کی طرف دھیان نہیں دے رہا تھا۔ سب یہی سمجھ رہے تھے جیسے کوئی باپ بیٹی آپس میں محو گفتگو ہیں۔

''میرا ہاتھ تھام لو۔'' اوورکوٹ میں ملبوس شخص نے اچانک کہا۔ ''آؤ، تمہاری ممی کو تلاش کرتے ہیں۔''

اس شخص کے ہاتھ میں بچی کا ہاتھ بے حد نازک اندام لگ رہا تھا۔ وہ بچی کو کھینچتے ہوئے راہداری کے آخری حصے کی جانب بڑھنے لگا۔

راہداری کے اختتام پر اس نے ایک اچٹتی نگاہ چھت پر لگے ہوئے سنہری گنبد نما سیکیورٹی کیمرے پر ڈالی اور بچی سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''ہم ممی کو آس پاس بھی دیکھیں گے، ٹھیک ہے نا؟''

اسٹور کا منیجر داخلی دروازے کے نزدیک ہی موجود تھا۔ اوورکوٹ میں ملبوس شخص نے ایک نظر اسٹور منیجر کی جانب دیکھا اور یوں لگا جیسے وہ ذہن میں کوئی فیصلہ کرنا چاہ رہا ہے۔

پھر وہ تیز تیز چلنے لگا۔ اس کا اوورکوٹ تیز رفتاری کی وجہ سے لہرا رہا تھا۔ بچی اس کا ساتھ دینے کے لیے تقریباً دوڑ رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی باپ بیٹی عجلت میں ہوں۔

وہ اب تقریباً کاؤنٹر کے نزدیک پہنچ گئے تھے۔ اب وہ دروازے سے کچھ فاصلے پر تھے کہ منیجر نے اچانک اپنے کلپ بورڈ پر سے نظریں اٹھاتے ہوئے ان کی طرف دیکھا اور مسکراتے ہوئے بولا۔ ''ہیو اے نائس ڈے!''

اوورکوٹ والے شخص کے قدم ڈگمگائے۔ ''ہاں...... اچھا...... سیم ٹو یو!'' اس نے زبردستی مسکراتے ہوئے جواب دیا اور بدستور چلتا رہا۔ ابھی وہ دروازے تک ہی پہنچے تھے کہ ایک عورت نے بے دھیانی میں اپنی سامان سے بھری ٹرالی ان کی راہ میں حائل کر دی۔ وہ عورت کیشیئر سے باتیں کرنے میں مگن تھی اور اس نے اوورکوٹ والے اور اس کے ساتھ بچی کو دروازے کی جانب بڑھتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔

اوورکوٹ والے کو اپنا راستہ بلاک ہونے پر اچانک رکنا پڑ گیا اور بچی اس کی ٹانگوں سے ٹکرا گئی۔ وہ آنکھیں جھپکاتے ہوئے چاروں طرف دیکھنے لگی۔

''تم اپنے اس دلکش لباس میں بے حد پیاری لگ رہی ہو۔'' اسٹور منیجر نے پیچھے سے آکر بچی سے کہا۔

''آج میری سالگرہ ہے۔'' بچی نے خوشی سے کہا۔

''اوہ، بہت خوب!''

''میری ممی......'' بچی نے ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ اوورکوٹ والے نے بچی کے بازو کو ایک جھٹکا دیا اور راہ میں حائل شاپنگ ٹرالی کو ایک جانب دھکیل دیا۔ کیشیئر اور اس سے گفتگو میں مصروف ٹرالی والی عورت نے حیرانی سے اوورکوٹ والے کو دیکھا۔

''ہمیں دیر نہیں کرنی چاہیے۔'' اوورکوٹ والے نے بچی سے مخاطب ہو کر کہا اور اسے تقریباً گھسیٹتا ہوا دروازے سے باہر نکل گیا۔

اسٹور منیجر، خریدار عورت اور کیشیئر اوورکوٹ والے شخص کی اس حرکت پر استفہامیہ نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

باہر فٹ پاتھ پر جگہ جگہ چیونگم کے دھبے نمایاں دکھائی دے رہے تھے۔ اسٹور کا ایک ملازم خالی شاپنگ ٹرالیوں کی

ایک قطار کو دھکیل کر واپس اسٹور میں لے جارہا تھا۔

''میرے ڈیڈی نے ہمیں یہیں چھوڑا تھا۔'' بچی نے اوورکوٹ والے سے کہا۔ ''ٹھیک اسی جگہ۔''

''اوہ!''

''وہ جلد ہی ہمیں لینے کے لیے آجائیں گے۔''

تب وہ اوورکوٹ والا شخص اچانک رک گیا۔ باہر کی ٹھنڈی ہوا کے باوجود اس شخص کے اوپری ہونٹ پر پسینے کی بوندیں نمودار ہونے لگیں۔ ''جانتی ہو، یہ ایک خیال ہے۔ شاید وہ جلدی آجائیں گے۔ اس لیے مجھے معلوم ہے کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے۔'' اس شخص نے کہا۔ ''ہم تمہارے ڈیڈی پر نگاہ رکھیں گے...... اور تمہاری ممی پر بھی۔ لیکن یہاں پر رک کر نہیں۔ یہاں ایک ایسی جگہ ہے جہاں سے نہ صرف ہم ان کی آمد پر نظر رکھ سکتے ہیں بلکہ ساتھ ساتھ اس ٹھنڈ میں خود کو گرم بھی رکھ سکتے ہیں۔ آؤ، چلیں۔'' یہ کہتے ہوئے اوورکوٹ والا بچی کو تیزی سے گھسیٹتے ہوئے پارکنگ لاٹ کی جانب بڑھنے لگا۔

بچی نے گھسیٹے جانے سے بچنے کے لیے اپنی رفتار تیز کر دی لیکن احتجاج اس کے لہجے سے عیاں ہو گیا۔

''میرے ڈیڈی......'' اس نے بولنا شروع کیا۔

''اوہ، نو۔ اِٹ از پرفیکٹ! تمہارے والدین کے آتے ہی ہم انہیں دیکھ لیں گے اور ہم اپنی گاڑی کا ہارن بجا دیں گے۔ اس انتظار کے دوران ہم گرم اور باآرام رہیں گے۔ یہ پرفیکٹ رہے گا۔''

اس وقت تک وہ اوورکوٹ والے کی پارکنگ لاٹ میں موجود کار تک پہنچ چکے تھے۔ اس شخص نے اپنی کار کی پسنجر سائڈ کے دروازے کا تالا کھولا اور بچی کو گود میں اٹھا کر اسے تقریباً سیٹ پر اچھال دیا۔ ''تم یہاں بیٹھ جاؤ۔''

اس بچی کے چہرے پر شبہات کے تاثرات امڈ آئے لیکن اس سے قبل کہ وہ کوئی صدائے احتجاج بلند کرتی، اس شخص نے ایک جھٹکے سے کار کا دروازہ بند کر دیا۔ پھر اس نے پہلے دائیں اور پھر بائیں جانب محتاط نگاہوں سے دیکھا۔ پھر تیزی سے گھوم کر ڈرائیور سائڈ پر چلا گیا اور کار میں سوار ہو گیا۔

بچی کے چہرے کی رنگت پھیکی پڑ چکی تھی۔ ''مجھے میرے ڈیڈی چاہئیں۔'' اس نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔

''بس اطمینان سے خاموش بیٹھی رہو، ہنی!'' اوورکوٹ والے نے کار اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔

ابھی اس نے اپنی کار ریورس کرنا شروع کی تھی کہ کسی نے اچانک اپنی کار جان بوجھ کر اس کے پیچھے لا کر روک دی۔ اس نے اپنی کار کے عقبی منظر والے آئینے میں دیکھا۔ وہ ایک کیڈی لیک کار تھی۔

کیڈی لیک کار کے دروازے ایک ساتھ کھلے اور اس میں سے چار آدمی نیچے اتر آئے۔ وہ چاروں سوٹ میں ملبوس تھے۔

اوورکوٹ والا منہ ہی منہ میں غصے سے مغلظات بکنے لگا۔ اس دوران کیڈی لیک سے اترنے والے چار افراد میں سے ایک اس کی کار کے ڈرائیور سائڈ کی جانب آیا اور کھڑکی کا شیشہ بجانے لگا۔ وہ ایک لحیم شحیم شخص تھا جس کا قد چھ فٹ سے بھی اونچا تھا۔ وہ کھڑکی پر جھک کر کار کے اندر جھانکنے لگا۔

اوورکوٹ والے نے اپنی کھڑکی کا شیشہ چند انچ نیچے کھسکا دیا۔

''کیا مجھے یہ بتانا چاہو گے کہ تم کہاں جارہے ہو؟'' اس دراز قامت نے پوچھا۔

دراز قامت کے چہرے پر نگاہ پڑتے ہی بچی چیخ پڑی۔ ''ڈیڈی!''

دراز قامت نے بچی کو دیکھنے کے لیے اپنا سر کھڑکی میں ڈال دیا۔ ''اوہ! تم کیسی ہو، پرنسس؟''

اس دراز قامت کے ساتھیوں میں سے ایک پسنجر سائڈ کے دروازے کو کھولنا چاہ رہا تھا لیکن دروازہ لاک تھا۔

''کیا تم دروازوں کے لاک کھولنے کی زحمت گوارا کرو گے، پلیز؟'' دراز قامت نے کہا۔ ''میں اپنی بیٹی کو واپس لینا چاہتا ہوں۔''

''ہاں، ہاں، کیوں نہیں، یقیناً۔'' اوورکوٹ والے نے اپنا سر زور زور سے ہلاتے ہوئے کہا اور مسکراتے ہوئے الیکٹرک لاک کا بٹن دبا دیا۔ پسنجر سائڈ کے دروازے کا تالا کھل گیا۔ ''تم اس کے باپ ہو، ہم تو بس پارکنگ لاٹ میں راؤنڈ لگانے جارہے تھے تاکہ تمہیں اور اس کی ماں کو تلاش کر سکیں۔'' یہ کہہ کر وہ ہنس دیا۔ ''تم نے ہمارا وقت بچا دیا۔''

''میں تمہارا شکرگزار ہوں۔'' دراز قامت نے کہا۔

بچی راکٹ کی سی رفتار سے کار سے اتر کر دوڑتی ہوئی اس دراز قامت کی ٹانگوں سے جا لپٹی۔

''ڈیڈی!''

''سوئٹ ہارٹ!'' دراز قامت نے اسے لپک کر گود میں اٹھا لیا۔ ''تمہیں دیکھ کر خوشی ہو رہی ہے۔ کیا تم نے اپنا تحفہ لے لیا؟''

''نہیں، ڈیڈی۔ مجھے تحفہ نہیں ملا۔ ہم للّی باربی ڈول کی تلاش میں تھے کہ... ممی پتا نہیں کہاں چلی گئیں اور اس

آدمی نے کہا کہ وہ ممی کو تلاش کرنے میں میری مدد کرے گا اور پھر اس نے تمہیں تلاش کرلیا۔ کیا اب مجھے میری باربی ڈول مل جائے گی، ڈیڈی؟ کیا ہم ممی اور باربی کو تلاش کرلیں گے؟ میں پارٹی میں جانا چاہتی ہوں۔"

"ہاں، پرنسس، کیوں نہیں۔ ہم سب کچھ کریں گے لیکن پہلے میں اس آدمی سے کچھ بات کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔" دراز قامت نے بچی کو گود سے نیچے اتارتے ہوئے کہا۔ "تم انکل ولیم کے ساتھ جاؤ اور ممی کو تلاش کرو۔ میں بھی ایک منٹ میں وہاں پہنچتا ہوں۔"

بچی نے ولیم کا ہاتھ پکڑلیا اور وہ واپس اسٹور کی جانب چل پڑے۔ بچی باتیں کیے جارہی تھی اور ولیم خاموشی سے سنے جارہا تھا۔

دراز قامت اپنے دوسرے ساتھی کی جانب پلٹ گیا جو سوٹ میں ملبوس تھا۔ "تم بھی اندر جاکر میری بیوی کو تلاش کرو۔ بیماری اور صحت مندی کے بعد تین ماہ ری ہیبی ٹیشن کے باوجود وہ ابھی تک خود کو ہم آہنگ نہیں کرسکی۔ وہ جب تمہیں مل جائے تو مجھے فون کرلینا۔"

اس کے ساتھی نے اثبات میں سر ہلادیا اور وہ بھی چلا گیا۔

"اب..." دراز قامت نے دوبارہ کار کی کھڑکی پر جھکتے ہوئے کہا۔ "تم کار سے نیچے کیوں نہیں اتر آتے تاکہ ہم کچھ بات چیت کرسکیں۔"

"اوہ......" اوورکوٹ والے نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ "میں بہ خوشی نیچے اتر آتا لیکن میں ذرا جلدی میں ہوں، کچھ ضروری کام نمٹانے ہیں۔ مصروفیت ہی مصروفیت۔ لہٰذا...... اب اگر تم اپنی کار راستے سے ہٹادو تو یہ تمہاری حقیقی مدد ہوگی۔ کیا تم اپنی کار آگے بڑھا سکتے ہو، پلیز؟"

"ہاں......لیکن میں نہیں سمجھتا کہ فی الوقت یہ ممکن ہوسکتا ہے۔ مجھے اور تمہیں بات کرنے کی ضرورت ہے۔ ہمارے لیے یہ سمجھنا ضروری ہے کہ یہاں کیا ہورہا ہے۔ سمجھو، میں نے اپنی بیوی اور بیٹی کو یہاں ڈراپ کیا تھا تاکہ وہ ایک کھلونا خرید سکیں اور پھر اگلی چیز میں نے یہ دیکھی کہ تم میری بیٹی کو گھسیٹتے ہوئے اسٹور سے نکل کر پارکنگ لاٹ میں آرہے ہو۔ میری بیوی آس پاس کہیں بھی موجود نہیں اور تم اس تیزی کے ساتھ حرکت کررہے ہو جیسے تم عجلت میں کہیں جانا چاہتے ہو...... یا جیسے تم میری بیٹی کو کہیں دور لے جانا چاہتے ہو۔ میں وہاں سامنے بیٹھا ان کی واپسی کا انتظار کررہا تھا اور میں نے یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور اگلی بات میں نے یہ دیکھی کہ تم اپنی کار میں میری بیٹی کو لے کر نکل جانے کی کوشش کررہے ہو۔ اب تم ہی بتاؤ کہ مجھے کیا سمجھنا چاہیے؟"

"ایسی کوئی بھی بات نہیں ہے جیسی تم سمجھ رہے ہو۔" اوورکوٹ والے شخص کے اوپری ہونٹوں پر ایک بار پھر پسینے کی بوندیں نمودار ہونے لگیں۔ "میں تو بس ایک ہمدرد تھا جو تمہاری بیٹی کی مدد کرنا چاہ رہا تھا۔" یہ کہہ کر وہ مسکرادیا۔ "میں بھی یہاں اپنی بھانجی کے لیے ایک تحفہ خریدنے کے لیے آیا تھا...... دوسرے کے بچے بھی سالگرہ مناتے ہیں، تم تو جانتے ہی ہو۔ تمہاری بیٹی نے مجھ سے مدد طلب کی تھی۔ میں اس کے نزدیک نہیں گیا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ اس نے میرا انتخاب ہی کیوں کیا تھا۔ اب تو میں یہ سوچ رہا ہوں کہ کاش اس نے مجھے نہ چنا ہوتا۔ لوگ کہتے ہیں کہ میرا چہرہ دوستانہ ہے۔ شاید اسی وجہ سے اس نے ایسا کیا ہو۔" اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

"ہاں، بے شک تمہارا چہرہ دوستانہ ہے۔ اور یہی بات مجھے خوف زدہ کررہی ہے۔ دوستانہ چہرے والے لوگ بہ آسانی چیزوں کو چھپاسکتے ہیں۔ تم یہ بات جانتے ہو کہ بیشتر سیریل کلرز کے چہرے دوستانہ ہوتے ہیں؟ ان مسلسل قتل کرنے والوں کے دوستانہ چہرے ہی دھوکا دے جاتے ہیں۔"

"یہ تو اچھی بات نہیں ہے۔"

دراز قامت ایک لمحے تک اوورکوٹ والے کا جائزہ لیتا رہا۔ "مجھے ایک بات تو بتاؤ۔" اس نے بالآخر کہا۔ "کیا تمہارے خیال میں میرا چہرہ بھی دوستانہ ہے؟"

"ویل......" اوورکوٹ والا اپنی نشست پر بے چینی سے پہلو بدلنے لگا۔

"میں اس معاملے میں تمہاری مدد کرتا ہوں۔ یہ میرا دوستانہ چہرہ ہے۔" دراز قامت نے اپنے چہرے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "تم میرا غیر دوستانہ چہرہ نہیں دیکھنا چاہو گے۔ ہے نا؟ اس لیے کہ جب لوگ میرا غیر دوستانہ چہرہ دیکھتے ہیں تو ان کا وہ دن حقیقت میں بہت برا ہوتا ہے۔"

اتنے میں ایک کار کے انجن کے اسٹارٹ ہونے کی آواز نے ان کے درمیان ہونے والی گفتگو میں خلل ڈال دیا۔ اوورکوٹ والے کی کار کے سامنے پارک کی ہوئی کار کا مالک اسی دوران اپنی کار میں آبیٹھا تھا جب وہ دونوں محوِ گفتگو تھے۔ اس شخص نے اپنی کار آگے بڑھادی۔

اوورکوٹ والے کے لیے اب سامنے سے نکلنے کا راستہ صاف تھا۔ اس نے یہ موقع غنیمت جانا اور اپنی کار کے

اگنیشن کی جانب ہاتھ بڑھا دیا۔

''لگتا ہے کہ اب مجھے اپنی راہ لے لینی چاہیے۔'' اوورکوٹ والے نے اگنیشن میں چابی گھماتے ہوئے کہا۔ اس کی کار کا انجن بیدار ہو گیا۔ ''مجھے خوشی ہے کہ تمہارا اور تمہاری بیٹی کا ہر کام سیدھا ہو گیا۔''

اتنے میں اسے اپنی کھڑکی کے شیشے پر دستک سنائی دی جیسے شیشے پر کوئی دھات ٹکرا رہی ہو۔ اس نے نظریں گھما کر کھڑکی کی جانب دیکھا۔

دراز قامت کے ہاتھ میں ایک ریوالور تھا۔ اس نے کھڑکی میں ہاتھ ڈالتے ہوئے ریوالور کی نال اوورکوٹ والے کی کھوپڑی سے لگا دی اور یوں جھک گیا جیسے وہ کار والے کا کوئی شناسا ہو اور وہ آپس میں دوستانہ گپ شپ کر رہے ہوں۔

''اگر تم نے گیئر کے لیور کو چھوا تو میں تمہاری کھوپڑی میں ایک سوراخ کر دوں گا اور دنیا میں بچوں سے دست درازی کرنے والا ایک غلیظ آدمی کم ہو جائے گا۔'' دراز قامت نے درشت لہجے میں کہا۔ ''یہ مت سمجھنا کہ میں ایسا نہیں کر سکتا۔''

''میں نے...... میں نے تمہاری بیٹی کو بالکل بھی نہیں چھوا۔'' اوورکوٹ والے نے ہکلاتے ہوئے کہا۔ ''تم خود اپنی بیٹی سے پوچھ لو۔''

''ہاں۔ اور میرا خیال ہے کہ اگر میں نے ابھی تمہیں روکا نہ ہوتا تو میری بیٹی ہمیشہ کے لیے مجھ سے بچھڑ جاتی۔ یقیناً میں غلط بھی ہو سکتا ہوں۔ تم اگر اپنی صفائی پیش کرنا چاہتے ہو تو میں تمہیں موقع دے رہا ہوں۔ کار سے نیچے اتر آؤ تاکہ ہم بات کر سکیں۔ لیکن تم یوں بچ کر نکل نہیں سکتے۔''

اوورکوٹ والے کا چہرہ پھیکا پڑ گیا۔ ''او کے...... بس مجھے شوٹ مت کرنا...... پلیز مجھے شوٹ مت کرنا۔''

''اور تم اپنا ہاتھ اپنی جیب سے دور رکھو۔'' دراز قامت نے اپنا نشانہ لیتے ہوئے کہا۔ ''تم جیب میں کیا ٹٹول رہے ہو؟''

''میں اپنی چابیاں رکھ رہا ہوں......''

''اپنا ہاتھ ابھی باہر نکال لو۔ لیکن دھیرے دھیرے...... اسی طرح...... گھونگھے کی سی رفتار سے...... تاکہ میں دیکھ سکوں کہ تمہارے ہاتھ میں کچھ بھی نہیں ہے...... گڈ، واقعی گڈ!'' دراز قامت کی نگاہیں اوورکوٹ والے کے ہاتھ پر مرکوز تھیں اور انگلیاں ریوالور کے ٹریگر پر جمی ہوئی تھیں۔ اب کار سے باہر آجاؤ!''

اوورکوٹ والا کار سے نیچے اتر آیا۔ اس کی پریشان نظریں دراز قامت کے ہاتھ میں دبے ہوئے ریوالور پر مرکوز تھیں۔ اس نے اپنے ہاتھ اپنے شانوں تک اٹھا لیے۔ اس کی نگاہیں دونوں افراد کا جائزہ لے رہی تھیں۔

''اپنے ہاتھ نیچے گرا دو، کم بخت۔'' دراز قامت نے سخت لہجے میں کہا۔ ''تم لوگوں کی توجہ ہماری جانب مبذول کرا دو گے۔''

اوورکوٹ والے نے محتاط انداز میں اپنے ہاتھ نیچے کر لیے۔

''اس کی شناخت کے لیے تلاشی لو۔'' دراز قامت نے اپنے ساتھی سے کہا۔ ''دیکھو اس کی اس جیب میں کیا ہے جسے یہ ٹٹول رہا تھا۔''

دراز قامت کے سوٹ میں ملبوس ساتھی نے اپنا ہاتھ اوورکوٹ والے کے کوٹ کی جیب میں گھسیڑ دیا۔ اس نے جیب میں سے ایک سیل فون اور ایک کاغذ کا ٹکڑا باہر نکال لیا۔

جب دراز قامت کے ساتھی نے کاغذ کے ٹکڑے کی تہ کھولی تو اس پر نگاہ ڈالتے ہوئے بے ساختہ بولا۔ ''ہولی شٹ، باس۔ یہ تو دیکھو۔''

دراز قامت نے وہ کاغذ اپنے ساتھی کے ہاتھ سے لے لیا۔ کاغذ پر نگاہ پڑتے ہی اس کے چہرے کا رنگ سرخ ہونے لگا۔

''تمہیں یہ کہاں سے ملی ہے؟'' دراز قامت نے منہ سے تھوک اُڑاتے ہوئے پوچھا۔ ''تمہیں یہ کہاں سے ملی ہے؟ کیا یہ تم نے خود بنائی ہے؟'' اس کی آنکھوں سے وحشت ٹپک رہی تھی۔

''یہ...... یہ تو...... یہ تو صرف ایک تصویر ہے۔'' اوورکوٹ والے نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

''یہ...... یہ میری بیٹی اور...... میری بیوی کی تصویر ہے۔ اور یہ تمہاری جیب میں تھی۔'' دراز قامت نے دوبارہ تصویر پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔ اس کے ہاتھ کپکپانا شروع ہو گئے تھے۔

تصویر میں بچی کسی پارک میں جھولے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی اور اس کی ماں اس کے پیچھے کھڑی تھی۔

''تم کب سے......؟'' غصے کی شدت سے اس نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ ''کار میں بیٹھ جاؤ۔'' وہ تھوک اُڑاتے ہوئے بولا۔

اوورکوٹ والا اپنی کار کی جانب بڑھنے لگا۔

''اپنی کار میں نہیں۔'' دراز قامت نے ایک موٹی سی گالی دیتے ہوئے کہا۔ ''کیڈی لیک میں۔''

اوورکوٹ والے نے کیڈی لیک کے کھلے ہوئے دروازوں پر ایک نگاہ ڈالی اور ہچکچاتے ہوئے نفی میں سر ہلانے لگا۔ ''میں...... نہیں......'' ساتھ ہی وہ پیچھے ہٹ گیا۔

''اسے کار میں ڈال دو۔'' دراز قامت نے اپنے ساتھی سے درشت لہجے میں کہا۔ ''اور یہ مجھے دے دو۔'' اس نے اوورکوٹ والے کے سیل فون کی جانب اشارہ کیا۔

اس کے ساتھی نے سیل فون دراز قامت کی جانب بڑھا دیا۔ اس نے سیل فون اپنی جیب میں ڈال لیا۔

پھر دراز قامت کے سوٹ والے ساتھی نے ایک زوردار گھونسا اوورکوٹ والے کے پیٹ میں جڑ دیا۔ اوورکوٹ والا درد کی شدت سے دہرا ہو گیا۔ پھر سوٹ والے نے ایک کھڑا ہاتھ اوورکوٹ والے کی کنپٹی پر دے مارا۔ اوورکوٹ والا لڑکھڑانے لگا۔ اس کا سر بری طرح چکرا رہا تھا۔

''سیدھے کھڑے رہو۔'' سوٹ والے نے اوورکوٹ والے کا کالر کھینچتے ہوئے کہا۔

وہ مزید ڈگمگانے لگا۔ دراز قامت نے اپنا ریوالور اس کے چہرے کے سامنے کر دیا۔ ''تم سیدھے کھڑے ہوتے ہو یا یہیں پارکنگ لاٹ میں گولی اپنی کھوپڑی میں اتروانا چاہتے ہو؟'' اس نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ ''کیا تم اسی طرح مرنا چاہتے ہو؟''

اوورکوٹ والا حیرت انگیز طور پر اپنے قدموں پر کھڑا ہو گیا۔ سوٹ والا اسے کیڈی لیک کی جانب دھکیلتے ہوئے لے گیا اور کھلے دروازے سے اندر کار میں پھینک دیا۔ دراز قامت اس کے برابر میں عقبی نشست پر بیٹھ گیا۔

''گاڑی چلاؤ اور یہاں سے نکل چلو۔'' اس نے دروازہ ایک جھٹکے سے بند کرتے ہوئے کہا۔ ''ایٹ ویسٹ کا راستہ پکڑو۔''

پھر دراز قامت نے اپنے ریوالور کا دستہ اوورکوٹ والے کے شانے پر مارا اور بولا۔ ''کیا تمہیں پتا ہے کہ میں کون ہوں؟'' وہ چیخ پڑا۔ ''کیا تم جانتے ہو تم نے کس کی بیٹی کو اپنے مذموم ارادے کی خاطر لے جانے کی کوشش کی ہے؟'' اس نے اوورکوٹ والے کو کالر سے پکڑ کر سیدھا بٹھا دیا۔

اوورکوٹ والا درد سے کراہنے لگا۔

''غور سے دیکھو۔'' دراز قامت نے اس کے چہرے کا رخ اپنے چہرے کی طرف کرتے ہوئے چیخ کر کہا۔ ''غور سے دیکھو، حرام زادے۔''

''تت...... تم......'' اوورکوٹ والا ہانپنے لگا۔ اس کے چہرے پر پسینے کی بوندیں ابھر آئی تھیں۔ چہرے پر پڑی خراش سے خون بہنے لگا۔ ''تم وہی ہو، وہی نامور منشیات فروش!''

''تم نے ٹھیک کہا...... میں وہی ہوں۔ نامور منشیات فروش...... رکی گیلارڈی، نامور منشیات فروش!'' دراز قامت نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

اوورکوٹ والے کی آنکھیں خوف سے پھٹ پڑیں۔

''ایسٹ کوسٹ میں کوئی بھی میری اجازت کے بغیر نہ ہیروئن خرید سکتا ہے نہ بیچ سکتا ہے۔'' رکی گیلارڈی نے کہا۔ ''کیا تم نے میری داستانیں نہیں سنی ہیں؟ یہ کہ میں لوگوں کے ساتھ کیا، کیا کرتا ہوں؟ کیا تم نے سنا ہے کہ میں نے ٹونی ٹولیڈو کے ساتھ کیا، کیا تھا؟ وہ کس حالت میں پایا گیا تھا؟ کیا تم ٹی وی پر خبریں دیکھتے ہو؟ وہ بہت چیختا چلاتا تھا اور طرح طرح کی آوازیں نکالتا تھا۔ میرے لڑکوں نے اسے نیچے گرا دیا تھا اور میں نے پلاس کی مدد سے اس کی زبان کھینچ لی تھی۔ وہ شخص قانون نافذ کرنے والے وفاقی اداروں سے خوب باتیں کرتا تھا، خوب زبان چلاتا تھا لیکن جب میں نے اس کی زبان کھینچ لی تو وہ بس یہی کہہ سکتا تھا۔ آ آ آ آہ......''

''اور پھر تم جانتے ہو کہ کیا ہوا؟ پھر میں نے اس کی آنکھوں کے سامنے اس کی زبان کو ہتھوڑے کی مدد سے کچل کر اس کا قیمہ بنا دیا۔ اسے یہ بہت اچھا لگا۔ اسے یہ اتنا اچھا لگا کہ میں نے اس کے ہاتھوں اور پیروں کو بھی اسی طرح کچل دیا جبکہ وہ اس کے بدن سے جڑے ہوئے تھے۔ میں نے ان کا بھی کچل کر قیمہ بنا دیا اور اسے بیس بال کے بلّے کی مدد سے اس کے حلق میں ٹھونس دیا تھا۔ دستے کی جانب سے۔ اس کے منہ میں بلّے کا دستہ گھسیڑنے کی کوشش میں اس کے چند دانت ضرور ٹوٹ گئے تھے لیکن کیا کیا جا سکتا تھا؟ آملیٹ بنانے کے لیے انڈوں کو توڑنا پڑتا ہے نا؟ وہ اس حالت میں پولیس کو ملا تھا کہ نہ تو اپنے قدموں پر کھڑا رہ سکتا تھا اور نہ ہی کچھ بولنے کے قابل رہا تھا۔ فرفر زبان چلانے کی پاداش میں وہ سانس لینے کے لائق بھی نہیں رہا تھا۔ اب تمہارے خیال میں میری بیٹی کے ساتھ زیادتی کی کوشش کے جواب میں، میں تمہارے ساتھ کیا کرنے جا رہا ہوں؟ میری اولاد کے ساتھ...... میرے خون کے ساتھ زیادتی؟ تمہارے بدن کا کون سا حصہ......''

اتنے میں رکی گیلارڈی کے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔
''لعنت ہو......!'' وہ بڑبڑایا۔ اس نے جیب میں سے اپنا سیل فون نکالا اور اسکرین پر نگاہ ڈالتے ہوئے خودکلامی کے انداز میں بولا۔ ''یہ فرینکی ہے۔'' اس نے اسکرین کو چھوتے ہوئے کہا۔ ''ہاں، کیا بات ہے؟ ہم قدرے مصروف ہیں۔ وہ اب کہاں ہے؟ اور بچی؟'' اس نے قدرے توقف کیا۔ ''تم پوری یقین دہانی کرلو، سمجھ گئے؟ اور فرینکی؟ بہت عمدہ کام کیا ہے تم نے۔ تم بہترین آدمی ہو۔ میں دل سے کہہ رہا ہوں۔'' فون پر بات مکمل کرنے کے بعد رکی گیلارڈی نے سیل فون واپس اپنی جیب میں رکھ لیا۔
''انہوں نے ماریٹا کو تلاش کرلیا ہے۔'' اس نے ڈرائیور سے مخاطب ہوکر کہا۔ ''وہ باتھ روم میں بے ہوش ہو گئی تھی۔ آج بچی کی سالگرہ ہے اور ہم سمجھ رہے تھے کہ وہ اس دن کی مناسبت سے خود کو ہم آہنگ رکھے گی۔ لیکن نہیں...... وہ خود کو ایک دن کے لیے بھی صاف ستھرا نہیں رکھ سکتی۔ اس نے یقیناً شاپنگ اسٹور میں خوراک لے لی ہوگی اور جبھی تو اسے ٹائلٹ میں جانے کی ضرورت پیش آئی ہوگی۔ بیماری کے بعد معمول پر لانے کا دعویٰ کرنے والے یہ ادارے پیسے تو خوب اینٹھتے ہیں لیکن علاج دھیلے کا بھی نہیں کرتے۔ یہ واویلا مچانے اور پیسے بٹورنے والوں کے گروہ ہیں جو محض بے وقوف بناتے ہیں۔'' رکی گیلارڈی نے شکوے کے انداز میں کہا اور پھر کار کی کھڑکی سے باہر نگاہ ڈالتے ہوئے بولا۔ ''ایگزٹ فور سے باہر نکل جاؤ اور سینڈ پٹ کی جانب چلو۔''
پھر اس نے اوورکوٹ والے کی جانب گردن گھماتے ہوئے اپنے ریوالور کی نال اس کے پہلو میں چبھوئی اور بولا۔ ''تم کس سوچ میں غرق ہو؟''
''میں نے تمہاری بیٹی کو کوئی گزند نہیں پہنچائی ہے۔'' اوورکوٹ والے نے کہا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ اپنے سر پر باندھے ہوئے تھے جس سے اس کی آواز دب سی رہی تھی۔ ''پلیز، مجھے جان سے مت مارنا۔''
''آہ، اس بارے میں فکرمند مت ہو۔ سب کچھ ٹھیک ہوجائے گا۔ تم بالکل ٹھیک ٹھاک رہو گے۔''
چند لمحے خاموشی سے گزر گئے پھر دراز قامت یکا یک بول پڑا۔ ''ارے، ہمیں ابھی تک پتا نہیں چلا کہ تم کون ہو؟''
اس نے اوورکوٹ والے کی جیبیں تھپتھپائیں۔
''تمہارے پاس بٹوا ہے؟''
اوورکوٹ والا مبہم لہجے میں کچھ بڑبڑایا۔ دراز قامت کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔
''یہ کم بخت کیا شے ہے؟'' رکی گیلارڈی نے اوورکوٹ والے کی جیب سے ہاتھ نکالتے ہوئے کہا۔ وہ ایک پستول تھا۔
دراز قامت کے ہونٹوں سے سیٹی کی آواز نکل گئی۔
''پیاری شے ہے۔'' اس نے کہا۔ ''خوش قسمتی ہے کہ تمہیں اسے نکالنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ یہ کیا ہے...... سلینچر نائن؟''
اوورکوٹ والے نے کوئی جواب نہیں دیا۔
''جانتے ہو اچھی بات کیا ہوئی؟ یہ کہ میں نے یہ تلاش کرلیا۔'' رکی گیلارڈی نے کہا۔ ''اگر اسلحہ کسی ایک کے ہاتھ میں ہو تو وہ تمام بات چیت غارت کرسکتا ہے۔ اب ہم ایک عمدہ بات چیت کرسکتے ہیں۔ ہم تمہاری شناخت اس وقت کریں گے جب ہم رک جائیں گے۔ ابھی بہت وقت باقی ہے۔''
کیڈی لیک چلتی رہی۔ وہ پہلے مین روڈ سے ایک بغلی سڑک پر اتر آئی۔ پھر کئی موڑ گھومتی ہوئی آگے چلتی رہی۔ بالآخر جب اس کے ٹائر پختہ سڑک پر سے پتھریلے راستے پر اور پھر ایک ناہموار راستے پر اچھلنے لگے تو ڈرائیور نے کار کی رفتار سست کردی۔
بالآخر کار رک گئی۔
''اوکے۔'' رکی گیلارڈی نے کہا۔ ''سڑک ختم ہو گئی۔'' پھر وہ کار سے نیچے اتر آیا۔
دراز قامت کے سوٹ والے ساتھی نے کار کا دروازہ کھولا اور اپنے اوورکوٹ والے قیدی کو کار سے نیچے گھسیٹ لیا۔ اوورکوٹ والا اب خود ہی اپنے قدموں پر کھڑا ہو گیا اور چاروں طرف دیکھنے لگا۔
وہ ایک عمارت میں تھے...... ایک بہت بڑے شیڈ کے نیچے جس میں مٹی اٹھانے والی مشینیں ریپیئر کی مختلف حالتوں میں بھری ہوئی تھیں۔ وہاں ہاتھ سے استعمال ہونے والے اوزار بھی تھے۔ دستی اوزار جیسے بیلچے، بھاری رولرز، آرے اور برمے وغیرہ۔
''اوکے۔'' رکی گیلارڈی نے اپنے ساتھی سے کہا۔ ''اسے سست رو کردو۔''
اس کے سوٹ والے ساتھی نے جیسے اپنے باس کے حکم کا پہلے سے اندازہ لگا لیا تھا۔ وہ نہ جانے کہاں سے اچانک نمودار ہوا اور لوہے کے ایک پائپ سے اوورکوٹ والے کی پنڈلی پر ایک زوردار ضرب لگائی۔ اوورکوٹ والے کی پنڈلی کی ہڈی چٹخنے کی آواز صاف سنائی دی۔ ساتھ ہی اس کے حلق

سے ایک زوردار چیخ بلند ہوئی اور وہ فرش پر ڈھیر ہو گیا۔
''ارے، ارے۔'' رکی گیلارڈی نے اوورکوٹ والے کے سر کے بالوں کو اپنی انگلیوں میں بل دیتے ہوئے اس کا سر اوپر اٹھایا اور اس کے چہرے پر ہلکا سا طمانچہ مارتے ہوئے بولا۔ ''تم بالکل بھی فکر مت کرو۔ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ ہم تمہارا خیال رکھنے جارہے ہیں۔ ہمیں صرف یہ دھیان دینا ہے کہ جب ہم باتیں کر رہے ہوں تو تم کسی قسم کے پاگل پن کی حرکت سے باز رہو۔ تم سمجھ گئے، ٹھیک؟''

اوورکوٹ والا درد کی شدت سے کراہ رہا تھا لیکن وہ کسی نہ کسی طرح منہ سے الفاظ ادا کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ ''میں نے تمہاری بیٹی کو ہاتھ تک نہیں لگایا۔''
''مجھے معلوم ہے، مجھے معلوم ہے۔ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔'' دراز قامت نے تسلی دیتے ہوئے کہا پھر اپنے سوٹ والے ساتھی سے مخاطب ہوا۔ ''اِسے باندھ دو۔''
سوٹ والے نے اوورکوٹ والے کے دونوں ہاتھ آپس میں باندھ دیے اور ایک آہنی زنجیر سے اسے یوں اونچا لٹکا دیا کہ اس کے پیر زمین پر ٹکے رہیں۔
''بالآخر ہم یہاں تک آگئے ہیں۔'' رکی گیلارڈی نے اپنے ہاتھ اپنے کولہوں پر ٹکاتے ہوئے کہا پھر اس نے صورتِ حال کا جائزہ لیتے ہوئے اطمینان کا ایک گہرا سانس لیا۔
''اب ہمیں سنجیدہ گفتگو کرنی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ہم کسی اچھے نتیجے پر پہنچ جائیں۔'' یہ کہہ کر اس نے ٹہلنا شروع کر دیا۔ ''میں تم سے سوالات کرنے جارہا ہوں اور تم نے مجھے ان سوالات کے جوابات دینے ہیں اوکے؟''
اوورکوٹ والا خالی نگاہوں سے اس کی صورت تکتا رہا۔
''اب تم مجھے یہ بتاؤ کہ تم میری بیٹی کے ساتھ کیا کر رہے تھے؟ تمہیں یہ بھی بتانا ہوگا کہ تم نے میری بیٹی کی وہ تصویریں کہاں سے اتاری ہیں؟ تمہیں یہ بھی اُگلنا ہوگا کہ تم کب سے چوری چھپے اس کا پیچھا کر رہے تھے اور یہ بھی جواب دینا ہوگا کہ کرسمس پر تمہاری آنٹی تمہارا کون سا پسندیدہ قیمہ تیار کرتی ہے۔ تمہیں سب کچھ بتانا ہوگا۔ تم میری بات سمجھ گئے؟ اور تمہارے جوابات پر اس بات کا انحصار ہوگا کہ تم کس طرح موت سے ہمکنار ہو گے۔ یہ آسان موت بھی ہوسکتی ہے اور ٹونی ٹولیڈو کے انداز کی بھی۔ یہ سب کچھ تم پر منحصر ہے۔'' یہ کہہ کر رکی گیلارڈی مسکرانے لگا۔ ''صورتِ حال اپنے کنٹرول میں ہونا کتنا اچھا ہوتا ہے، ہے نا؟''

اوورکوٹ والا درد کی شدت سے کراہ رہا تھا لیکن پھر اس کی یہ کراہٹ ہلکے سے قہقہے میں بدل گئی۔
''ہاں، مضحکہ خیز صورتِ حال ہے نا؟'' رکی گیلارڈی نے کہا۔ ''عین اس وقت میں یہ سوچ رہا ہوں کہ ہم تمہارے کان شکنجے میں جکڑ کر اکھاڑ دیں۔ اور اگر اس سے بھی کام نہ بنا تو ہم تمہاری آنکھیں نکال دیں گے۔ تم اس بارے میں کیا کہتے ہو؟ یہ مضحکہ خیز رہے گا نا؟''
اوورکوٹ والے نے دوبارہ قہقہہ لگایا تو رکی گیلارڈی بھی مسکرانے لگا۔
''اس قسم کی صورتِ حال میں، میں نے بہت سارے ردِعمل دیکھے ہیں لیکن یہ ردِعمل میرے لیے بالکل نیا ہے۔ تم اس کی وضاحت کر سکتے ہو؟ کیا تم پاگل ہو؟ کیا یہاں کی کوئی کل تڑخ گئی ہے؟'' اس نے اوورکوٹ والے کی کھوپڑی بجاتے ہوئے کہا۔
''تم......'' اوورکوٹ والے نے ایک بار پھر قہقہہ بلند کیا۔ ''میرا سیل فون تمہاری جیب میں ہے......''
رکی گیلارڈی اس بات پر مسکرا دیا۔ ''ہاں، وہ سیل فون ہے کوئی سائرن نہیں۔''
''جب وہ میری جیب میں تھا تو میں نے اس کا سائیلنٹ مائک آن کر دیا تھا۔ تم خود ہی ہر چیز کو نشر کر رہے ہو، منشیات کا کاروبار، ٹونی ٹولیڈو کا قتل، اغوا......''
رکی گیلارڈی نے اپنی جیب میں سے فون یوں نکال کر ایک جھٹکے سے زمین پر پھینک دیا جیسے وہ کوئی سانپ ہو۔
''......تشدد پر مبنی سنگین جرائم......''
رکی گیلارڈی نے اپنے جوتے سے سیل فون کو روندتے ہوئے اس کا اسکرین توڑ دیا۔
''......یہ تمام کے تمام وفاقی جرائم شمار ہوتے ہیں اور ایک وفاقی ایجنٹ کو جان سے مارنے کی دھمکی بھی ایک سنگین جرم ہے۔'' اوورکوٹ والے نے کہا۔
آخری جملے پر رکی گیلارڈی چونک پڑا۔
''تمہیں پہلے میرا شناختی کارڈ چیک کرنا چاہیے تھا۔'' اوورکوٹ والے نے کہا۔ ''تمہاری قسمت خراب ہے۔ وہ میری دوسری جیب میں رکھا ہوا ہے۔''
''تم......تم کون ہو؟'' رکی گیلارڈی نے سرگوشی کے سے لہجے میں پوچھا۔
''ایف بی آئی ایجنٹ تھیوڈور ریز!''
رکی گیلارڈی پر جیسے سکتہ سا طاری ہو گیا۔
''ایف بی آئی نے مجھے تمہاری نشہ باز بیوی سے

معلومات اگلوانے کے لیے بھیجا تھا۔ وہ تصویر تمہاری بیوی کی شناخت کے لیے تھی جو تمہیں میری جیب سے ملی ہے۔''

''ایک ایف بی آئی ایجنٹ ایک چھوٹی بچی کو اغوا کر رہا تھا؟'' رکی گیلارڈی نے طنزیہ کہا۔

''ایف بی آئی ایجنٹ ایک لاوارث بچی کو حفاظتی تحویل میں لے رہا تھا۔ اس کا یہ قدم قانون کے مطابق تھا۔ جب تم عدالت میں لے جائے جاؤ گے تو جج سے پوچھ لینا۔'' اوورکوٹ والے نے کہا۔

''کورٹ...... تم کتیا کے بچے! تم نے ابھی ابھی خود کو اپنی کھوپڑی میں ایک گولی کا حق دار بنا دیا ہے۔'' رکی گیلارڈی نے اپنا پستول ایف بی آئی کے ایجنٹ پر تانتے ہوئے کہا۔

اتنے میں دور سے پولیس سائرن کی آواز آنے لگی۔

رکی گیلارڈی ہچکچانے لگا۔

''تم نے اپنی لوکیشن بھی نشر کر دی ہے۔'' ایجنٹ تھیوڈور نے کہا۔ ''مجھے شوٹ کرو گے تو وہ تمہیں رنگے ہاتھوں دھر لیں گے۔ میں عدالت میں فون پر اپنے اعترافی بیان کی صفائی پیش کرنے کا چانس ضرور لوں گا۔ یہی چانس کم از کم تمہارے پاس بھی ہے۔''

تب دراز قامت کا سوٹ والا ساتھی فوراً بول پڑا۔

''اب ہم کیا کریں، باس؟''

رکی گیلارڈی نے اپنے پستول کے دستے پر اپنی گرفت مضبوط کر لی اور ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگا۔ اس نے اپنی نظریں اس جانب پھیریں جہاں سے سائرن کی آواز آرہی تھی۔ پہلے کیڈی لیک کار اور پھر ایجنٹ تھیوڈور کی جانب دیکھا۔ اس کے ماتھے پر پسینے کے قطرے ابھر آئے تھے۔

''ہمیں فوری طور پر کچھ کرنا ہوگا، باس۔'' سوٹ والے نے تیزی سے کہا۔ ''میں اب مزید جیل نہیں جاسکتا۔ میری ایک بیوی اور بچے بھی ہیں۔''

''اس کی بندشیں کھول دو۔'' رکی گیلارڈی نے کوئی فیصلہ کرتے ہوئے کہا۔ ''مجھے ایک آئیڈیا سوجھ گیا ہے۔''

''اسی وجہ سے میں تمہارے لیے کام کر رہا ہوں، باس۔'' سوٹ والے نے ایجنٹ تھیوڈور کو زنجیر سے آزاد کرتے ہوئے کہا۔

پھر جب اس نے پلٹ کر اپنے باس کی طرف دیکھا تو اس کے ہاتھ میں دبے ہوئے پستول کا رخ اپنی جانب پایا۔ یہ وہی پستول تھا جو رکی گیلارڈی نے تلاشی لینے کے

مصیبت

صحرائے نویڈا میں امریکی ایٹمی تنصیبات پر پرواز کی سخت ممانعت تھی۔ ایک شام ایک چھوٹا امریکی ہوائی جہاز ان حدود میں داخل ہوا تو لڑاکا طیاروں نے اسے گھیر کر فوجی اڈے پر اتار لیا۔

اگلوتے ہوا باز سے رات بھر کڑی باز پرس ہوتی رہی۔ جب محافظوں کو یقین ہوگیا کہ وہ غلطی سے ادھر آنکلا تھا تو صبح اسے اس وارننگ کے ساتھ جانے کی اجازت دے دی گئی کہ وہ دوبارہ ادھر نظر نہ آئے ورنہ مارا جائے گا۔

اسی شام اسی جہاز کو دوبارہ ان اطراف میں دیکھ کر پورا عملہ الرٹ ہوگیا۔ اس بار کسی کو اسے گھیرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ ہوا باز نے طیارہ اڈے پر اتار لیا۔ وہ کاک پٹ سے باہر کودا تو مسلح محافظوں نے اسے اپنے نشانے پر لے لیا ''تم کو وارننگ دی گئی تھی اور تم پھر یہاں آگئے......!''

''وارننگ پر لعنت بھیجو!'' ہوا باز، محافظ کی بات کاٹ کر جھلائے ہوئے لہجے میں بولا ''جہاز میں میرے ساتھ مصیبت سوار ہے۔ میں دن بھر اسے سمجھا کر عاجز آگیا کہ مجھے تم لوگوں نے رات بھر روکا ہوا تھا مگر میری بیوی سمجھ رہی ہے کہ میں نے پچھلی رات کسی گرل فرینڈ کے ساتھ گزاری ہے......اب تم ہی اسے سمجھاؤ کہ میں کہاں تھا۔''

امریکا سے جاوید کاظمی کی سوغات

غالب

ہائی اسکول کے طالب علموں سے ٹیچر نے دریافت کیا۔ ''کیا تم میں سے کوئی لڑکا بتا سکتا ہے کہ مرزا اسداللہ خاں غالب کی غزلیات کا کن کن غیر ملکی زبانوں میں ترجمہ ہوا ہے؟''

ایک طالب علم نے اٹھ کر کہا۔ ''جہاں تک میری معلومات اور مطالعے کا تعلق ہے، میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ غالب کی غزلیات کا ابھی تک اردو میں بھی ترجمہ نہیں کیا گیا۔''

کراچی سے امتیاز احمد کی حسِ مزاح

دوران ایجنٹ تھیوڈور کی جیب سے برآمد کیا تھا۔
''د نہیں...... ''سوٹ والا کانپنے لگا۔
''تمہیں اب جیل جانے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔'' رکی گیلارڈی نے کہا۔ ''اور میں یہ یقین دہانی کرانا چاہتا ہوں کہ تمہاری بیوی جینا اور بچوں کا۔۔۔ پوری طرح خیال رکھا جائے گا۔''
''باس، نہیں......''
لیکن رکی گیلارڈی ٹریگر دبا چکا تھا۔
''یہ تم کیا کر رہے ہو؟'' ایجنٹ تھیوڈور نے چیختے ہوئے کہا۔ ساتھ ہی وہ لڑکھڑاتے قدموں سے پیچھے ہٹ گیا۔
گولی لگتے ہی رکی گیلارڈی کے سوٹ والے ساتھی کی پیشانی پر ایک سوراخ نمودار ہو گیا۔ اس کی آنکھیں اوپر کو چڑھ گئیں جیسے وہ ایک نگاہ اپنی پیشانی کے زخم کو دیکھنا چاہ رہا ہو۔ وہ نصف لمحے تک اسی کیفیت میں کھڑا رہا، پھر آگے کی جانب منہ کے بل گر پڑا۔
''...... ارے، یہ کیا......'' ایجنٹ تھیوڈور کی زبان اس وقت لڑکھڑانے لگی جب اس نے پستول کی نال کا رخ اپنی جانب پایا۔ ''تم...... تم پاگل ہو گئے ہو۔ تم اس طرح سب کو مارنے کے بعد بچ کر نہیں جا سکتے ہو...... تم مقدمے کا سامنا کرو...... تمہارے پاس بچ نکلنے کی یہی ایک صورت ہے۔ ہم گنجائش نکال لیں گے۔ ہم کوئی بھی کہانی گھڑ لیں گے۔''
''واقعی؟ اور تم اس کہانی پر قائم رہو گے' مجھے بچانے کے لیے؟'' رکی گیلارڈی نے کہا۔
''میں واقعی ایسا کروں گا۔'' ایجنٹ تھیوڈور نے اسے یقین دلاتے ہوئے کہا۔ ''میں قسم کھا رہا ہوں کہ میں واقعی ایسا کروں گا۔''
''ایسا ممکن نظر نہیں آ رہا۔ اس کے علاوہ میرے پاس پہلے سے ایک کہانی موجود ہے۔''
ایجنٹ تھیوڈور نے اپنے طور پر اپنی سی بہترین کوشش کرتے ہوئے ٹوٹی ہوئی ٹانگ پر اچھل کر دراز قامت پر چھلانگ لگا دی۔ لیکن یہ اس کی بے سود کوشش تھی۔ اس کے باوجود وہ ان دونوں کے درمیان کا نصف فاصلہ عبور کر چکا تھا۔
اس سے قبل کہ وہ رکی گیلارڈی پر جھپٹتا، دراز قامت نے اس پر فائر کر دیا۔
گولی تھیوڈور کے سینے میں لگی۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا زمین پر گر پڑا اور سانس لینے کی کوشش میں ہانپنے لگا۔
رکی گیلارڈی نے حقارت بھری نظروں سے ایجنٹ تھیوڈور کی طرف دیکھا جو زمین پر پڑا سسک رہا تھا۔
''تمہاری کوشش رائگاں رہی۔'' رکی گیلارڈی نے کہا۔ ''تم ایک انتہائی ڈھیٹ کمینے ہو۔''
یہ کہہ کر اس نے ایجنٹ تھیوڈور کے سر میں ایک اور گولی مار دی۔ ایجنٹ کا جسم بے جان ہو گیا۔
پھر رکی گیلارڈی دوزانو بیٹھ گیا۔ اس نے نائن ملی میٹر کا پستول ایجنٹ کے مردہ ہاتھ میں دبا دیا اور نال کا رخ کھلے ہوئے دروازے سے باہر کی جانب کرتے ہوئے ہوا میں ایک گولی چلا دی۔
اب وہ دونوں لاشوں کو اپنے آئیڈیے کے مطابق ترتیب دینے لگا۔ جیسے کہ وہ دونوں آپس میں بھڑ گئے تھے۔ جس پائپ سے اس کے ساتھی نے ایجنٹ تھیوڈور کی ٹانگ توڑی تھی اسے بھی اس نے اپنے سوٹ والے ساتھی کے بے جان ہاتھ میں تھما دیا۔
''اب بات بن جائے گی۔'' اس نے ایجنٹ تھیوڈور کے چہرے پر پڑی خراشوں کا جائزہ لیتے ہوئے خود کلامی کے انداز میں کہا۔
پولیس سائرن کی آوازیں اب کافی نزدیک آ گئی تھیں۔

☆☆☆

چھ بجے کے خبرنامے میں نیوز کاسٹر خبریں پڑھتے ہوئے بتا رہا تھا:
''آج عدالت نے رچرڈ گیلارڈی عرف رکی گیلارڈی کو تمام الزامات بشمول منشیات کی لین دین، اغوا اور قتل سے باعزت بری کر دیا۔ اس کے پیروکار وکیل نے بحث کے دوران میں یہ دلیل دی کہ بدمعاش فیڈرل ایجنٹ تھیوڈور ریز نے پستول کی زد پر اس کے موکل سے زبردستی اعترافی بیان لیا تھا اور نیوجرسی کے اس بزنس مین کو دھمکیاں دی تھیں اور اس کے ساتھی کو ایک مقامی سینڈ پٹ پر قتل کر دیا تھا۔ اس کے موکل نے کسی طرح اس بدمعاش فیڈرل ایجنٹ پر قابو پاتے ہوئے اس کا پستول چھین لیا تھا اور اسی پستول سے اسے شوٹ کر کے اپنی جان بچائی تھی۔ رچرڈ گیلارڈی نے کہا ہے کہ وہ اپنے ساتھی کی المناک موت پر غم زدہ ہے اور اب زیادہ سے زیادہ وقت اپنی بیوی اور بیٹی کے ساتھ گزارنے کا منتظر ہے۔''
اس کے بعد نیوز کاسٹر موسم کے تغیرات کے بارے میں بتانے لگا۔

بُرا وقت

مریم کے خان

کامیابی اور فتوحات کا نشہ ہر شخص کو مسرور بنا دیتا ہے... جدوجہد اور سخت ترین لمحات گزارنے کے بعد اسے زندگی کا عیش و آرام میسر آچکا تھا... مگر اس کے کام کی نوعیت ایسی تھی کہ اسے ہر لمحہ چونکنا... درندے کی طرح سفاک اور مستعد رہنا پڑتا تھا...

مافیا کے سربراہوں اور کرداروں کے گرد گھومتی فیصلہ کن انجام سے بھرپور کہانی

جونی براڈ نے کئی بُرے وقت دیکھے تھے۔ ایک وقت وہ بھی تھا جب وہ نیویارک کے کچرے دانوں میں کھانے کی چیزیں تلاش کرکے اپنا پیٹ بھرتا تھا۔ دس سال کی عمر تک وہ ایک یتیم خانے میں رہا اور وہاں اس نے جو وقت گزارا، وہ اس کے لیے ڈراؤنے خواب سے کم نہیں۔ وہاں وہ، دوسرے بچے اور بچیاں منتظمین اور باہر سے آنے والوں کی زیادتیوں کا نشانہ بنتے تھے۔ وہ کئی سال تک برداشت کرتا رہا جب اس کی برداشت جواب دے گئی تو

وہاں سے بھاگ نکلا۔ اسے معلوم تھا کہ پولیس کے پاس جانا بیکار ہے۔ اس سے پہلے کئی بچوں نے ایسی ہی کوششیں کی تھیں اور پولیس نے انہیں واپس یتیم خانے پہنچا دیا تھا جہاں ان کے ساتھ پہلے سے بھی بُرا سلوک ہوا اور انہیں بہ طور سزا جسمانی اذیتوں سے گزرنا پڑا۔ اس لیے اس نے پولیس کے پاس جانے کی کوشش نہیں کی اور بے گھر لوگوں کی ایک ٹولی کے ساتھ رہنے لگا۔

مگر یہ نام کی حد تک ٹولی تھی۔ درحقیقت یہاں ہر فرد چاہے وہ سات سال کا ہو یا ستر سال کا، اپنی زندگی کے لیے خود جدوجہد کرتا تھا۔ کوئی کسی کو ڈبل روٹی کا ایک ٹکڑا بھی نہیں دیتا تھا۔ جونی نے جلد یہ بات سیکھ لی۔ بارہ سال کا ہوا تو وہ پینے کا عادی ہو گیا تھا مگر اس کی خوش قسمتی کہ اسے ملتی اتنی کم تھی کہ وہ بس گلا ہی تر کر پاتا تھا ورنہ اس کے کئی ساتھی جو شراب کے معاملے خوش قسمت تھے. زندگی کے معاملے میں بدقسمت ثابت ہوئے اور بہت جلد دنیا سے گزر گئے۔ ہاں کھانے کے معاملے میں وہ خوش قسمت تھا جہاں ہاتھ ڈالتا، اسے کھانے کو بہت کچھ مل جاتا اور یہی وجہ تھی کہ اس نے بہت تیزی سے قد کاٹھ نکالا تھا۔ شروع میں وہ دُبلا اور کمزور تھا اور دوسرے اسے دباتے تھے مگر جب اس نے قد کاٹھ نکالا تو وہ دوسروں کو دبانے لگا۔

دو سال میں اس کا قد چھ فٹ ہو گیا اور جسامت کسی باکسر جیسی ہو گئی۔ درحقیقت وہ بہت اچھا باکسر تھا مگر اس کی ساری باکسنگ اسٹریٹ فائٹس تک محدود رہی تھیں۔ جہاں اس نے لاتعداد جبڑے اور ناکیں توڑی تھیں۔ اس کی یہی خوبی مارگن کی نظر میں آگئی۔ مارگن لائنر نیویارک میں سرگرم جرمن مافیا کا ایک بااثر آدمی تھا۔ اگرچہ اس کا عہدہ کسی کے علم میں نہیں تھا مگر اکثر لوگوں کو شبہ تھا کہ وہی جرمن مافیا کا سربراہ ہے۔ جرمن یہاں سیاہ فاموں اور اطالین لوگوں کے مقابلے میں کمزور تھے اس لیے مارگن ہاتھ پاؤں بچا کر کام کرنے کا قائل تھا۔ اگرچہ قوت میں وہ کسی سے کم نہیں تھا مگر اسے شہدوں والے انداز میں نمائشی کام پسند نہیں تھے۔ یہی تربیت اس نے اپنے آدمیوں کو دی تھی۔ جب جونی اس کے ساتھ شامل ہوا تو اس کا درجہ بہت نچلا تھا مگر مارگن نے خود اس سے ملاقات کی اور اسے کچھ اصول و قواعد سمجھا دیے جن کی پابندی اسے جان کی حفاظت سے زیادہ کرنی تھی۔ ان میں سب سے اہم اصول خاموشی اور رازداری تھا۔ مارگن نے کہا۔ ''جس دن تمہاری وجہ سے یہ اصول پامال ہوا، وہ دن گینگ میں نہیں، اس دنیا میں تمہارا آخری دن ہوگا۔''

جونی نے دیکھا، مارگن کا یہ اُصول صرف اصول نہیں تھا بلکہ اس نے سچ مچ اس پر عمل کیا۔ جب نیویارک پولیس نے منی لانڈرنگ کا ایک کیس پکڑا اور اس میں مارگن کا نام آیا اور اس کی گرفتاری کا خطرہ پیدا ہوا تو مارگن نے ایک رات اپنے عالی شان گھر میں سر میں گولی مار کر خودکشی کر لی۔ پولیس اسے گرفتار نہ کر سکی اور جرمن مافیا چیف تک پہنچنے کا اس کا خواب ادھورا رہ گیا۔ دراصل منی لانڈرنگ کا چکر ہی اس تک پہنچنے کے لیے چلایا گیا تھا اور بدقسمتی سے مارگن کے خلاف کافی سے زیادہ ثبوت .... مل چکے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ ایک بار وہ پولیس کے ہاتھ آگیا تو زبان بند نہیں رکھ سکے گا۔ مارگن کے بعد جو سربراہ بنا وہ اس سے بھی زیادہ پُراسرار شخص تھا کہ سوائے چند افراد کے اس کے بارے میں کوئی نہیں جانتا تھا۔ بہرحال مارگن کے مرنے سے کوئی فرق نہیں پڑا اور تمام کام اسی طرح چلتے رہے۔ اس وقت تک جونی درمیانے درجے کے کارندوں میں شامل ہو گیا تھا۔

اس کی غربت تو اسی دن ختم ہو گئی تھی جس دن وہ مارگن کا آدمی بنا تھا۔ مافیا میں ہر فرد کو باقاعدہ تنخواہ ملتی تھی۔ ہر فرد کے لیے حکم تھا کہ وہ اچھے علاقے میں گھر لے کر رہے اور آس پاس کے لوگوں سے اچھے تعلقات رکھے۔ وہ اپنی اصل زندگی کو اس طرح سے چھپائے کہ کسی کو اس کی اصلیت کے بارے میں علم نہ ہو۔ جونی نے بھی ایک اچھے علاقے میں اپارٹمنٹ لے لیا اور وہاں رہنے لگا مگر اسے لوگوں سے گھلنے ملنے میں بہت دشواری پیش آرہی تھی، اس نے اب تک بہت نچلے درجے کے لوگوں کے ساتھ زندگی گزاری تھی۔ اس کی زبان اور عادتیں خراب تھیں۔ اس کی یہ مشکل آسان کرنے کے لیے مارگن نے اس کے لیے ٹیوٹر کا بندوبست کیا جس نے اسے نہ صرف پڑھایا لکھایا بلکہ مہذب انداز میں زندگی گزارنے کے طور طریقے بھی سکھائے۔ اس نے جونی کے لیے باقاعدہ ایک ٹائم ٹیبل بنا کر اس پر عمل کرنے کا حکم دیا۔ کیونکہ ٹیوٹر مارگن کی طرف سے تھا اس لیے اس نے بلا چون چرا اس کے کہنے پر عمل کیا۔

پھر اسے خود بھی اس زندگی میں مزہ آنے لگا۔ اپنی زبان مزید بہتر بنانے کے لیے وہ کتابیں پڑھنے لگا۔ ٹی وی دیکھتا اور باقاعدگی سے اخبار لیتا تھا۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس نے عیاشیوں سے منہ موڑ لیا تھا۔ پینے پلانے اور لڑکیوں کے لیے مارگن کا اپنا ایک نائٹ کلب تھا جہاں اس کے آدمی جاتے اور تفریح کرتے تھے۔ یہ کلب اس نے

اس لیے قائم کیا تھا کہ عام طور سے شراب اور عورت کے سامنے آدمی کی زبان بند نہیں رہتی ہے۔ جرائم کی دنیا میں رہنے والے اکثر افراد اسی وجہ سے مارے جاتے ہیں یا ہمیشہ کے لیے جیل جاتے ہیں۔ اپنے کلب میں اس کے آدمیوں کو خطرہ نہیں تھا۔ وہاں انہیں لوٹا بھی نہیں جاتا تھا۔ شراب، شباب اور کباب کے ساتھ ساتھ انواع و اقسام کی تفریحات میسر تھیں اور خاصی سستی تھیں۔ مارگن کے بعد بھی یہ سب چلتا رہا۔

ترقی کے ساتھ ساتھ جونی کا معیارِ زندگی بلند ہوتا رہا۔ پہلے وہ ایک چھوٹے فلیٹ میں رہتا تھا پھر اس نے ایک اچھے علاقے کی عمارت میں پورشن حاصل کرلیا اور آخر میں وہ ایک پینٹ ہاؤس میں اٹھ آیا۔ مگر اس نے کبھی کوئی جگہ خریدی نہیں تھی۔ مافیا کے آدمی بہترین علاقوں میں رہتے تھے مگر مافیا کے اصول کے تحت وہ کبھی کوئی جائداد یا مکان نہیں خریدتے تھے تاکہ کسی وقت اگر انہیں اچانک بھاگنا پڑے تو کوئی مسئلہ نہ ہو۔ وہ اپنے اثاثے ہمیشہ نقد کی صورت میں رکھتے تھے۔ کسی کو بینک اکاؤنٹ کھولنے کی اجازت نہیں تھی۔ کسی کا سوشل سیکیورٹی کارڈ نہیں تھا۔ البتہ ڈرائیونگ لائسنس لازمی تھے۔ مافیا کے کاموں سے ہٹ کر انہیں عام طور سے قانون کی پابندی کا کہا جاتا تھا۔ تاکہ وہ بلا وجہ پولیس کی نظروں میں نہ آئیں۔

دس سال بعد جونی ریجنل چیف بن گیا۔ ریجنل چیف کسی ریاست میں مافیا کے تمام امور کا ذمّے دار ہوتا ہے۔ اسے نیوجرسی بھیج دیا گیا۔ جرمن مافیا ایشیا یورپ روٹ سے کینیڈا کے راستے امریکا ہیروئن اور چرس اسمگل کرتی تھی۔ یہ منشیات نیویارک سے تقسیم کی جاتی تھی۔ مختلف ریاستوں میں مختلف چیف اس منشیات کی ترسیل کے ذمّے دار تھے۔ نیوجرسی کے لیے جونی کو چیف بنایا گیا تھا اور یہ اس کے لیے بہت بڑا اعزاز تھا کیونکہ بہت تجربے کار اور بااعتماد کارکن کو ہی چیف بنایا جاتا تھا۔ اس کے مالی فوائد بھی بے اندازہ تھے۔ جونی کو رہائش کے لیے ایک عالی شان فارم ہاؤس مہیا کیا گیا۔ یہ مافیا کی ملکیت تھی۔ اسے نصف درجن اعلیٰ درجے کے لڑاکے دیے گئے تھے۔ جونی کا کام نیویارک سے بھیجی جانے والی منشیات کو نیوجرسی میں پھیلانے کے ساتھ اگلی دو ریاستوں یعنی ڈلاور اور میری لینڈ تک پہنچانا تھا۔ پنسلوانیا کی ریاست بھی نیوجرسی سے لگتی تھی مگر اس کے لیے سپلائی روٹ اور ریجنل چیف دوسرا تھا۔ جونی کی ذمّے داری صرف ان دو ریاستوں تک محدود تھی۔ ایک بار اس کی تحویل میں آنے کے بعد منشیات مکمل طور پر اس کی ذمّے داری بن جاتی تھی اور یہ اصول بھی واضح تھا کہ نقصان مال یا جان کی مدد سے پورا کیا جائے گا۔

جونی کے سامنے اس اُصول پر کئی بار عمل ہوا تھا اس لیے وہ اس معاملے میں پوری طرح محتاط تھا۔ ریجنل چیف بننے سے پہلے جونی محدود زندگی گزار رہا تھا مگر جب وہ نیوجرسی آیا اور یہاں ایک عالی شان فارم ہاؤس میں رہنے لگا تو اسے اسی کے مطابق طرزِ زندگی گزارنا پڑی۔ اس نے آس پاس رہنے والوں سے روابط بڑھائے اور فارم ہاؤس میں پارٹیاں دینے لگا۔ یہ ضروری تھا کیونکہ الگ تھلگ رہنے کی صورت میں لوگ بلاوجہ تجسس کرتے۔ ایک سوشل لائف یوں بھی ضروری تھی کہ اس کا ایک مرتبہ بن جائے اور کسی کو اس کے اصل کاروبار کا خیال نہ آئے۔ چند سالوں میں جونی نہ صرف یہاں کی اعلیٰ سوسائٹی میں رچ بس گیا بلکہ اس کا ایک جاندار حصہ بن گیا۔ اس کے فارم ہاؤس پر دی جانے والی پارٹیاں اپنے اعلیٰ ترین معیار کی وجہ سے مثال بن گئی تھیں۔ اگرچہ اس کی آمدنی بہت زیادہ نہیں تھی مگر وہ کھل کر خرچ کرتا تھا۔ اکثر اس کی ساری آمدنی ان کاموں پر لگ جاتی تھی اور بعض اوقات تو اسے ادائیگیاں کرنے میں بھی مشکل پیش آتی تھی۔ پھر بھی اس نے کبھی ہاتھ نہیں روکا۔

دولت کے بارے میں اس نے شروع سے فیصلہ کرلیا تھا کہ اسے جمع نہیں کرنا ہے۔ دولت خرچ کرنے اور زندگی کو پُرلطف بنانے کے لیے ہوتی ہے۔ اس لیے اسے بے دریغ خرچ کرنا چاہیے۔ وہ اس خیال پر قائم تھا اور ریجنل چیف بننے کے بعد بھی اس کی جمع پونجی خاص نہیں تھی۔ مگر اسے کوئی پچھتاوا بھی نہیں تھا جبکہ وہ دیکھ چکا تھا کہ کئی ریجنل چیف جنہوں نے خاصی دولت جمع کی تھی یا تو اچانک دنیا سے رخصت ہوگئے یا پھر پکڑے گئے اور تقریباً ساری عمر کے لیے جیل چلے گئے۔ ان کی دولت دنیا میں یا جیل سے باہر ہی رہ گئی تھی۔ یہ اس کی زندگی کا سب سے اچھا دور تھا۔ اس دور میں وہ کھل کر اپنی مرضی سے جیا۔ اس نے شادی بھی کی۔ کلارا اس کی بیوی ایک بینکر کی بیٹی تھی اور شادی کے چند دن بعد ہی وہ جونی کی اصل زندگی سے واقف ہوچکی تھی مگر اس نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ بلکہ کلارا خوش تھی کیونکہ جونی دولت مند تھا اور اسے وہ سب دے سکتا تھا جس کی وہ خواہش رکھتی تھی۔ البتہ جونی نے اس پر واضح کردیا تھا کہ جس دن اس نے کسی کو بھی اس کے بارے میں ایک لفظ بتایا وہ اس کی اور شاید جونی کی زندگی کا بھی آخری دن ہوگا۔ اس

پر کلارا نے اسے تسلی دی تھی۔

''تم فکر مت کرو، میں ایک بینکر کی بیٹی ہوں اور رازداری کی قدر جانتی ہوں۔''

کلارا کا باپ جوزف زیادہ نیک نام نہیں تھا، اس کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ ناجائز دولت کو بینک کی مدد سے جائز کرتا ہے اور کالی کمائی کو اسٹاک مارکیٹ میں پھیلا کر اسے سفید کرتا ہے۔ مگر یہ کام وہ اتنی ہوشیاری سے کرتا تھا کہ آج تک اس پر ہاتھ نہیں ڈالا جا سکا تھا۔ منی لانڈرنگ کے الزامات کے بارے میں جوزف کا کہنا تھا کہ یہ سب اس کے دشمنوں کا پروپیگنڈا ہے جو اس کی ترقی اور بینک میں اس کی افادیت سے جیلس ہوتے ہیں۔ جوزف اور دوسرے سمجھتے تھے کہ جونی ایک دولت مند فارمر ہے۔ یہ تاثر برقرار رکھنے کے لیے جونی اپنے فارم پر کچھ نہ کچھ کاشت کرتا رہتا تھا۔ فصل کا وقت آنے پر وہ مارکیٹ سے ہی اجناس خرید کر دوسری جگہ سپلائی کرتا تھا تا کہ اس کے زمیندار ہونے کا تاثر برقرار رہے۔ اس نے اصطبل بھی بنایا ہوا تھا جس میں اعلیٰ نسل کے گھوڑے تھے۔ مگر اس کے فارم پر ایک بھی غیر متعلقہ فرد نہیں تھا۔ اس کے خاص آدمی ہی نوکروں کے روپ میں رہتے تھے اور زمین پر بھی وہی کام کرتے تھے۔

وہ فارم پر کسی غیر متعلقہ فرد کے ہونے کا متحمل ہو ہی نہیں سکتا تھا کیونکہ اس کا فارم ہاؤس ہی اس کا ویئر ہاؤس بھی تھا۔ نیویارک سے آنے والی منشیات یہیں رکھی جاتی اور پھر آگے روانہ کی جاتی تھی۔ کیونکہ یہ کلی طور پر جونی کی ذمے داری تھی اس لیے وہ کھیپ کو ایک لمحے کے لیے بھی اپنی نظروں سے دور نہیں کرتا تھا۔ مطلب یہ کہ کھیپ وہ خود وصول کر کے لاتا اور خود حوالے کرنے جاتا تھا اور جب تک یہ اس کے فارم ہاؤس میں رہتی، وہ ایک لمحے کے لیے بھی کہیں نہیں جاتا تھا۔ اس کھیپ کے ساتھ بھی اس نے ایسا ہی کیا تھا۔ یہ کوئی بیس کلوگرام خالص ہیروئن اور پچاس کلوگرام چرس تھی۔ ہول سیل میں اس کی قیمت تقریباً ایک کروڑ ڈالرز تھی اور نچلی سطح پر اس کی قیمت دُگنی ہو کر دو کروڑ ڈالرز تک چلی جاتی۔ جہاں ایک گرام ہیروئن کی قیمت پانچ سو ڈالرز بنتی تھی۔ جبکہ چرس پانچ سو ڈالرز میں دس گرام ملتی تھی۔ مگر دونوں میں ملاوٹ کر کے ریٹیلر اپنا نفع کئی گنا بڑھا لیتے تھے۔

جونی تین آدمیوں کے ہمراہ نیوجرسی کی سرحد تک گیا تھا اور وہاں مافیا کے ریجنل چیف نے کھیپ اس کے حوالے کی تھی۔ کھیپ ایک درجن تہ والی سیلوفین میں لپٹی تھی اور اس پر مخصوص سیل لگی تھی۔ اس سیل کا مطلب تھا کہ اندر مال اصل ہے۔ جونی کو اسے تین دن بعد میری لینڈ کے ریجنل چیف کے سپرد کرنا تھا۔ کھیپ لے کر وہ چند گھنٹوں میں فارم ہاؤس پہنچ گیا اور اسے مخصوص سیف میں رکھ دیا۔ اس سیف کو سوائے اس کے اور کوئی نہیں کھول سکتا تھا۔ دو دن بعد وہ کھیپ لے کر نکلا۔ اس شام اس کے فارم ہاؤس پر پارٹی تھی۔ لیکن اسے پروا نہیں تھی، وہ کام نمٹا کر شام تک واپس آجاتا۔ اس نے تین آدمیوں کو ساتھ رکھا اور اپنی شاندار مرسیڈیز کار میں روانہ ہوا۔ منشیات کی کھیپ ڈکی کے اندر ایک خفیہ خانے میں تھی۔ اس ائر لاک خانے کو منشیات سونگھنے والے کتے بھی تلاش نہیں کر سکتے تھے۔

میری لینڈ جانے والے تمام راستے بہت پُرہجوم ہائی ویز سے گزرتے تھے اور راستے میں کئی پُل آتے تھے جہاں چیکنگ سخت ہوتی تھی اس لیے جونی نے ایک اور راستہ نکالا ہوا تھا جو پنسلوانیا کی ریاست سے گزرتا تھا اور وہ آرام سے نرم چیکنگ والی جگہوں سے گزر کر میری لینڈ پہنچ جاتا تھا۔ یہ راستے نسبتاً ویران تھے۔ مگر جونی کو خطرہ نہیں تھا اس کے آدمی پوری طرح مسلح ہوتے تھے اور وہ ہر طرح کی صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے تیار رہتے تھے۔ لیکن اس سفر میں ان کے ساتھ جو ہوا وہ یقیناً غیر متوقع تھا۔ مرسیڈیز تقریباً سو کلومیٹرز فی گھنٹے کی رفتار سے جارہی تھی کہ اچانک اس کا عقبی ٹائر برسٹ ہو گیا۔ کار لہرائی مگر ڈرائیور نے مہارت سے کام لے کر اسے قابو کر لیا اور الٹنے سے محفوظ رکھا۔ کار نے کئی چکر کاٹے۔ اس کے ٹائر سڑک پر رگڑتے ہوئے بُری طرح چلا رہے تھے اور وہ سب بھی چلّا رہے تھے۔ جب کار بہ حفاظت رکی تو ان سب کی جان میں جان آئی۔ جونی نے گرج کر کہا۔

''یہ کیا ہوا ہے؟''

''سر ٹائر برسٹ ہو گیا ہے۔'' ڈرائیور نے جواب دیا اور نیچے اتر گیا۔ اس کے ساتھ ہی جونی اور باقی افراد بھی کار سے باہر آگئے۔ وہ اس وقت ایک جنگل کے پاس سے گزر رہے تھے اور وہاں سڑک پر دور تک کوئی گاڑی نہیں تھی۔ اچانک جنگل سے کئی بے آواز فائر ہوئے اور دس سیکنڈ کے اندر جونی کے تینوں آدمی موت کے گھاٹ اُتر گئے۔ خود جونی کی گردن میں تکلیف ہوئی تو اسے بھی وہ گولی کا زخم سمجھا مگر جب اس نے ہاتھ مارا تو اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا تیر آیا۔ جس کا اگلا حصہ سرنج کی سوئی کی طرح تھا اور یقیناً یہ سرنج تھی جس کی دوا جونی کے جسم میں اُتر چکی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کا سر چکرایا اور وہ بے ہوش ہو کر نیچے گر گیا۔ وہ قطعی نہیں

دیکھ سکا کہ ان پر حملہ کرنے والے کون تھے۔ البتہ جب اسے ہوش آیا اور اس نے ڈکی کھلی دیکھی تو وہ حملہ آوروں کا مقصد جان گیا۔ اس کے تینوں آدمی مارے جا چکے تھے اور ابھی تک وہاں پولیس یا کسی کی آمد نہیں ہوئی تھی۔

وہ حیران تھا کہ حملہ آوروں نے اسے قتل کیوں نہیں کیا اور صرف بے ہوش کر کے چھوڑ گئے۔ جونی نے سوچنے میں زیادہ دیر نہیں لگائی، اس نے خالی خفیہ خانہ بند کیا اور اپنے آدمیوں کی لاشیں کھینچ کر جنگل میں لے گیا۔ اس نے ان کے کپڑے اتارے اور بالکل برہنہ کر کے ڈکی میں رکھا ہوا پیٹرول کا ڈبا ان کی لاشوں پر خالی کر دیا۔ اس سے پہلے وہ ان پر خاصی خشک لکڑی اور سوکھے پتے ڈال چکا تھا۔ اس نے چتا کو آگ دکھائی اور جب اس نے اچھی طرح آگ پکڑ لی تو ان کے لباس بھی اس پر ڈال دیے البتہ ایسی تمام چیزیں اتار لی تھیں جو مشکل سے جلتی ہیں۔ یہ سب چیزیں مع ان کے جوتوں اور اسلحے کے ایک بڑے شاپر میں ڈال کر کار کی ڈکی میں رکھ دیا۔ ٹائر بدلنے سے پہلے اس نے وہاں پھیلا ہوا خون صاف کیا تاکہ کوئی اچانک آجائے تو اسے شک نہ ہو۔ البتہ جنگل کی طرف سے اٹھتا دھواں کسی کو مشکوک کر سکتا تھا۔

اس نے عجلت میں ٹائر بدلا۔ برسٹ ہونے والا ٹائر اصل میں گولی کا نشانہ بنا تھا۔ جونی نے وہ حصہ چاقو سے خراب کر دیا جہاں گولی لگی تھی اب یہ کہنا مشکل تھا کہ اسے گولی نے برسٹ کیا تھا۔ یہ ساری احتیاطی تدابیر اس نے راستے کے لیے کی تھیں۔ واپسی کے سفر میں اس نے ایک پل سے گزرتے ہوئے شاپر اور برسٹ ہونے والا ٹائر ندی میں پھینک دیا جہاں سے اس کے ملنے کا امکان بہت کم تھا۔ مگر وہ جانتا تھا یہ سب تدبیریں اسے مافیا سے نہیں بچا سکیں گی، یہ سب تو وہ پولیس سے بچنے کے لیے کر رہا تھا۔ جب اس کا دماغ کسی قدر ٹھکانے آیا تو اسے سمجھنے میں زیادہ دیر نہیں لگی کہ مخبری اس کے اپنے کسی آدمی نے کی تھی جو اس کے روٹ سے واقف تھا۔ امکان یہی تھا کہ مارے جانے والوں میں مخبر بھی شامل تھا جسے اس کی خدمت کا یہ صلہ ملا تھا۔ اسے زندہ چھوڑنے میں بھی یہ رمز تھا کہ مافیا کا شک اس پر جائے اور اصل ذمے داروں کا کسی کو خیال نہ آئے۔

اس سے قطع نظر کہ یہ کس کا کام تھا۔ تقریباً ایک کروڑ ڈالرز مالیت کی منشیات اس کے ہاتھ سے نکل کر جا چکی تھی اور اب اسے حساب دینا تھا۔ مصیبت یہ تھی کہ وہ حساب دینے کی پوزیشن میں بالکل بھی نہیں تھا۔ وہ تو اس کا دسواں حصہ بھی ادا نہیں کر سکتا تھا اور نقدی کی صورت میں اس کے پاس دو ڈھائی لاکھ ڈالرز سے زیادہ رقم نہیں تھی۔ اگر وہ اپنی ملکیت میں ہر قابلِ فروخت چیز فروخت کر بھی دیتا تب بھی مشکل سے دس لاکھ ڈالرز کر سکتا تھا۔ بلکہ وہ یہ بھی نہیں کر سکتا تھا کیونکہ اسے مہلت ہی نہیں ملتی۔ جیسے ہی اوپر والوں کو علم ہوتا کہ منشیات کی کھیپ اپنی منزل پر نہیں پہنچی ہے۔ وہ اس سے رابطہ کرتے اور جب وہ نہیں ملتا تو اس کی تلاش شروع ہو جاتی بلکہ شروع ہو گئی تھی۔ ابھی وہ فارم ہاؤس کے نزدیک پہنچا تھا کہ اسے میری لینڈ کے ریجنل چیف کی کال آ گئی۔ اس نے برہمی سے کہا۔ ''کہاں ہو تم، مقررہ وقت سے دو گھنٹے اوپر ہو گئے ہیں۔''

''مسئلہ ہو گیا تھا۔'' اس نے خود کو پُرسکون رکھتے ہوئے کہا۔ ''گاڑی خراب ہو گئی تھی، اب ٹھیک ہوئی ہے، ہم

آرہے ہیں بس ایک گھنٹا اور۔''

''او کے ایک گھنٹا۔'' ریجنل چیف نے دھمکی آمیز انداز میں کہا۔ ''اس کے بعد میں نیویارک کال کروں گا۔''

جونی کو پسینا آ گیا تھا۔ اس نے یقین دلانے کے انداز میں کہا۔ ''اس سے زیادہ دیر نہیں لگے گی۔''

اس نے طوفانی انداز میں مرسیڈیز فارم ہاؤس کے پورچ میں روکی اور سامنے کے بجائے پیچھے سے اندر داخل ہوا۔ اس کا خیال تھا کہ کلارا آگے مہمانوں میں مصروف ہو گی۔ اندر اور باہر خاصی گاڑیاں بتارہی تھیں کہ مہمانوں کی بڑی تعداد آ چکی تھی۔ مگر جیسے ہی وہ عقبی لاؤنج کا سلائڈنگ ڈور کھول کر اندر آیا کلارا اسے سامنے ہی موجود نظر آئی۔ اس نے آج سرخ رنگ کا لباس پہنا ہوا تھا اور خاصی حسین لگ رہی تھی۔ بہرحال یہ موقع ایسا نہیں تھا کہ وہ اس کے حسن سے لطف اندوز ہوتا۔ جونی اسے نظرانداز کر کے بیڈروم کی طرف بڑھا تو وہ اس کے سامنے آ گئی۔ ''جونی یہ کیا ہے، تم نے اتنی دیر کہاں لگا دی اور وہ تینوں کہاں ہیں؟''

مگر جونی اس کا سوال اَن سنی کر کے بیڈروم میں آیا۔ اس نے سیف کھولا اور اندر موجود نقد رقم نکال کر ایک بیگ میں رکھنے لگا۔ کلارا اس کے پیچھے آئی تھی اور اسے رقم نکالتے دیکھ کر مزید پریشان ہو گئی۔ ''خدا کے لیے جونی یہ سب کیا ہے۔ یہاں مہمان آئے ہوئے ہیں۔''

''جہنم میں جائیں مہمان۔'' اس نے بیگ کی زپ بند کی اور پھر اپنی ضروری دستاویزات اور چیزیں نکال کر بیگ کی پاکٹ میں رکھنے لگا۔ کلارا کو اس جواب کی توقع نہیں تھی، اس نے چند لمحے بعد کہا۔

''او کے مہمان جائیں جہنم میں لیکن میں ....''

''تم بھی جہنم میں جاؤ۔'' جونی نے اس کے لیے بھی یہی مشورہ دیا۔

کلارا دنگ رہ گئی۔ ''تمہارا دماغ درست ہے۔''

''بالکل درست ہے۔'' جونی نے کہا۔ ''اگر تم کل صبح تک یہیں رہیں تو سچ مچ جہنم رسید ہو جاؤ گی۔ میرا مشورہ ہے کسی ایسی جگہ چلی جاؤ جس سے میں بھی ناواقف ہوں۔''

''میرے خدا آخر ہوا کیا ہے؟'' کلارا چلائی۔ ''کیا تم سے کوئی جرم ہو گیا ہے۔''

''ہاں لیکن جرم قانون کی نظر میں نہیں ہے، میں کھیپ گنوا بیٹھا ہوں۔''

کلارا نے منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔ وہ اس جملے کا مفہوم سمجھتی تھی۔ جونی اسے حیران پریشان چھوڑ کر پیچھے سے باہر آیا۔ کلارا اس کے پیچھے دوڑتی ہوئی آئی مگر تب تک وہ کار میں بیٹھ کر انجن اسٹارٹ کر چکا تھا۔ کلارا چلائی۔ ''مجھے بھی ساتھ لے چلو۔''

''ضرور۔'' جونی نے دوسرا دروازہ کھول دیا۔ ''مگر اس بات کی کوئی ضمانت نہیں ہے کہ باہر قاتل منتظر نہ ہوں۔ مگر یہ بات یقینی ہے کہ وہ اس کار میں موجود کسی فرد کو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔''

یہ سنتے ہی کلارا کا ہاتھ جو ہینڈل تک پہنچ گیا تھا رک گیا اور پھر اس نے جھٹکے سے دروازہ بند کر دیا۔ وہ تیزی سے اندر کی طرف لپکی تھی۔ جونی نے حسرت سے عالی شان فارم ہاؤس کو دیکھا اور گاڑی آگے بڑھا دی۔ ہائی وے پر آتے ہی اس نے اس کا رخ نیویارک کی طرف کر دیا۔ مرسیڈیز کے طاقتور انجن نے اس کا بھرپور ساتھ دیا اور رات نو بجے نیویارک کے نزدیک پہنچ گیا تھا۔ اس نے ایک بڑی ہائی وے اسٹور سے ذرا آگے ویران جگہ مرسیڈیز روکی جہاں اس کے دریافت ہونے کا فوری امکان نہیں تھا۔ اس کے باوجود اس نے گاڑی کی نمبر پلیٹس اتار لیں اور انہیں ایک نزدیکی گڑھے میں پھینک کر اوپر سے مٹی ڈال دی۔ اس نے اپنا کوٹ اتار دیا تھا اور سر کے سلیقے سے جمے بال بکھیر لیے۔ جوتوں اور پتلون پر کسی قدر گرد ڈال کر اس نے ایسا تاثر دیا جیسے وہ پیدل ہو اور عام سا آدمی ہو۔

وہ ہائی وے کے اسٹور تک پہنچا، وہاں اس نے ٹراؤزر، عام سے جوگرز، اور ہائی نیک ٹی شرٹ کے ساتھ ایک گرم اپر لیا۔ یہ اسے سردی سے بھی بچاتا اور اس کا چہرہ بھی نظروں میں آنے سے محفوظ رہتا۔ وہیں اس نے سادہ سا ڈنر کیا اور آنے والی پہلی بس سے نیویارک روانہ ہو گیا۔ اسے یقین تھا کہ مافیا کے لوگ اس وقت نیوجرسی میں اس کے گھر کی طرف روانہ ہوں گے۔ اگر کلارا ان کے ہاتھ آ گئی تو اس کی خیر نہیں ہو گی۔ کیونکہ مافیا کا اصول تھا کہ متعلقہ فرد کے ساتھ اس کے اہلِ خانہ کو بھی نہ چھوڑتا تاکہ دوسروں کو زیادہ سے زیادہ عبرت ہو۔ بہرحال اسے کلارا کی خاص فکر نہیں تھی۔ اس کی بلا سے وہ مافیا کے ہاتھ آتی ہے یا نہیں۔ کلارا اس کی محبت نہیں بلکہ صرف ضرورت تھی۔ اگر وہ زندہ رہتا تو اپنی ضرورت کسی اور سے پوری کر لیتا۔ اگر وہ کلارا سے محبت کرتا اور اسے ساتھ لانا چاہتا تو یہ بھی ممکن نہیں تھا۔ وہ خود شدید خطرے میں تھا اور کلارا اس کے ساتھ زیادہ خطرے میں پڑ جاتی۔ جونی کو امید تھی کہ وہ اپنی ذہانت سے کام لے گی اور مافیا کے آدمیوں کے آنے سے پہلے نکل

خواہش

ایک نوجوان اپنی منگیتر کو اس کی بیسویں سالگرہ پر کوئی تحفہ دینا چاہتا تھا لیکن اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا دے۔ آخر ماں کے پاس گیا اور کہا۔

''امی جان، اگر آپ بیس سال کی ہو جائیں تو آپ کی کیا خواہش ہو گی؟''

ماں نے حسرت سے جواب دیا۔ ''بیٹے اگر ایسا ہو جائے تو میری کوئی خواہش باقی نہ رہے گی۔''

شہلا رضا کی کراچی سے خوش گمانی

کر کسی محفوظ مقام پر چلی جائے گی۔

نیو یارک کے مرکزی بس ٹرمنل آنے سے پہلے وہ ایک جگہ اتر گیا تھا۔ بس ٹرمنل، ریلوے اسٹیشن اور ائرپورٹس ایسی جگہیں تھیں جہاں مافیا کے تنخواہ دار پہلے سے موجود ہوتے تھے اور حکم ملنے پر وہ آنے جانے والوں پر نظر رکھتے تھے۔ اس لیے جونی ایسی جگہوں سے دور رہنا چاہتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ نیو یارک میں کون سے علاقے مافیا کے زیر اثر تھے، وہ ایسے تمام علاقوں سے دور رہنا چاہتا تھا۔ اپنے تو اس کے دشمن بن چکے تھے اور جو دوسری مافیا والے تھے وہ اس کے ویسے ہی دشمن ہوتے اس لیے کسی بھی ایسی جگہ جانا رسکی تھا۔ چند سال پہلے جونی نے ایک کام کیا تھا، اس نے چھپ کر سینٹرل پارک کے نزدیک ایک متوسط علاقے میں چھوٹا سا فلیٹ خرید لیا تھا۔ آج تک اسے استعمال کرنے کی نوبت نہیں آئی تھی۔ مگر جونی کے ذہن میں تھا کہ شاید کبھی اسے جان بچانے کے لیے کسی ایسے ٹھکانے کی ضرورت ہو جس سے کوئی واقف نہ ہو تو یہ جگہ اس کے کام آئے۔

اگرچہ اسے توقع نہیں تھی کہ کبھی بُرا وقت آیا تو اسے یہاں تک آنے کی مہلت مل سکے گی۔ مگر آج وہ اس پناہ گاہ تک آن پہنچا تھا۔ اس نے جام ہو جانے والا تالا کسی قدر دقت سے کھولا۔ ایک بیڈ اور لاؤنج پر مشتمل یہ اپارٹمنٹ گرد مٹی سے اٹا ہوا تھا۔ لیکن یہ مکمل طور پر فرنش تھا۔ وہ آتے ہوئے ایک چھوٹے سے گروسری اسٹور سے کھانے پینے کا سامان اور کچھ چیزیں لے آیا تھا جن کی فوری ضرورت پڑ سکتی تھی۔ وہ چند دن تک بالکل باہر نہیں جانا چاہتا تھا۔ ایک زمانے میں اس نے بڑی گندی زندگی بھی گزاری تھی جب وہ بلا جھجک بدبودار کچرے دانوں میں گھس جاتا اور مٹی پر سو جاتا تھا۔ مگر اب وہ یہاں کا گرد آلود سامان اسے بُرا لگ رہا تھا۔ اس نے جھاڑن لی اور پہلے ڈسٹنگ کی اس کے بعد پورا فلیٹ اچھی طرح صاف کیا۔

واش روم کا حال سب سے بُرا تھا اور اسے صاف کرنے کے لیے کلینرز کی ضرورت تھی جو فی الحال نہیں تھے اس لیے اس نے پانی کی مدد سے جہاں تک ممکن ہوا اسے صاف کر لیا۔ اس دوران میں وہ خود گرد مٹی سے اَٹ گیا تھا مگر اس نے عقل مندی کی تھی کہ اپنا صاف ستھرا لباس اتار کر یہ سارے کام کیے تھے۔ نہا دھو کر اس نے ایک بڑا مائیکرو ویو میں گرم کر کے کھایا۔ یہاں تمام الیکٹرانکس کی چیزیں ٹھیک کام کر رہی تھیں۔ اس نے باقی ماندہ کھانے کی چیزیں فریج میں رکھیں اور لمبی تان کر سو گیا۔ نیو یارک کی طرف روانہ ہونے سے پہلے اس نے اپنا موبائل فون بھی راستے میں آنے والی ایک ندی میں پھینک دیا تھا۔ اس نے کوئی ایسی چیز نہیں رکھی تھی جو اس کی نشان دہی کر سکتی۔ اسے امید تھی کہ وہ یہاں محفوظ رہے گا۔ اس کی آنکھ کھلی تو دن نکل آیا تھا بلکہ دوپہر بھی ہو چکی تھی۔

اس نے فریج سے بیئر کی ایک بوتل نکالی اور ٹی وی آن کیا۔ اس نے آواز اتنی رکھی تھی کہ باہر تک نہ جا سکے اور کسی کو احساس ہو کہ کوئی اس فلیٹ میں آ گیا ہے۔ وہ چینل بدلتا رہا اور ایک چینل سے اسے نیو جرسی کے جنگل سے ملنے والی تین ناقابلِ شناخت سوختہ لاشوں کی خبر مل گئی۔ پولیس کے مطابق پہلے انہیں گولی مار کر ہلاک کیا گیا اور پھر ان کی لاشوں کو آگ لگا دی گئی۔ وہ قطعی ناقابلِ شناخت تھیں اور انگلیوں کے نشانات بھی جل گئے تھے اب پولیس ڈینٹل اسٹرکچر کی مدد سے ان کی شناخت کی کوشش کر رہی تھی۔ جونی جانتا تھا کہ ان کا سرے سے کوئی ڈینٹل ریکارڈ ہی نہیں تھا۔ پولیس انہیں شناخت نہیں کر سکتی تھی مگر مافیا جان گئی ہو گی کہ اس کے گم ہونے والے تین آدمی اب کہاں تھے؟ اسے چوتھے آدمی کی تلاش ہو گی اور وہ اس کے لیے کوئی کسر نہیں چھوڑے گی۔

یہ سوچ کر جونی کے جسم میں سرد لہری دوڑ گئی تھی کہ وہ کب تک اس طرح چھپے گا۔ مافیا بھی اس کا پیچھا نہیں چھوڑے گی۔ وہ بغیر پاسپورٹ کے کینیڈا یا میکسیکو کی سرحد عبور کر سکتا تھا مگر اس میں دو خطرے تھے ایک تو ہر پوائنٹ پر مافیا کا آدمی موجود ہو گا اور اگر وہ کسی طرح بچ کر نکل بھی گیا تب بھی ان دونوں ملکوں میں مافیا کے لوگ تھے اور وہ اسے تلاش کرتے رہتے۔ ان سے بچنے کا ایک طریقہ تھا کہ

وہ آبادیوں سے دور نکل جاتا تھا۔ مگر وہ انسانوں میں رہنے والا شخص تھا۔ کسی ویرانے میں جا کر زندگی بسر کرنا اس کے لیے ممکن نہیں تھا اور پھر اس کے لیے بہت سی دولت درکار تھی جو اس کے پاس نہیں تھی۔ ڈھائی لاکھ ڈالرز امریکا جیسے مہنگے ملک میں خاص حیثیت نہیں رکھتے تھے۔ پھر جو علاقے شہر سے دور ہوتے تھے وہ زیادہ مہنگے ہوتے تھے، وہاں رہنا آسان نہیں تھا۔ اس نے سوچا اور کسی ویرانے میں رہنے کا ارادہ منسوخ کر دیا۔

وہ اچانک ہی سب سے دور ہو گیا تھا کہ اسی میں اس کی خیریت تھی۔ اسے مافیا کی پروا نہیں تھی مگر اسے خیال آیا تھا کہ کلارا کے بارے میں معلوم کرے۔ اس کے لیے اسے کلارا کو کال کرنی پڑتی اور کلارا کو معلوم ہو جاتا کہ وہ نیویارک میں ہے۔ اگر مافیا والے کلارا تک پہنچ گئے تھے اور وہ ان کے قبضے میں تھی تو ان کو بھی پتا چل جاتا۔ ان کی تلاش کا دائرہ سکڑ کر نیویارک تک محدود ہو جاتا اور وہ زیادہ دن ان سے چھپ نہیں سکتا تھا۔ یہ سوچتے ہوئے اس نے کلارا سے رابطے کا ارادہ بھی ملتوی کر دیا۔ اس کی عافیت اسی میں تھی کہ جب تک اسے اس مشکل سے نکلنے کا کوئی راستہ نہ مل جائے تب تک وہ سکون اور خاموشی سے اس جگہ چھپا رہے اور بہت ضرورت کے وقت ہی یہاں سے باہر نکلے۔ اگر یہ جگہ مافیا کے علم میں ہوتی تو اب تک اس کے کارندے یہاں آ چکے ہوتے۔ اسے اشیائے ضرورت لینے کے لیے باہر جانا ہوتا اور وہ ہفتے میں ایک بار جا کر بھی لا سکتا تھا۔ یہاں تفریح کے لیے ٹی وی تھا۔ وہ موویز دیکھ سکتا تھا۔ ایم پی تھری پلیئر سے میوزک سن سکتا تھا۔

آنے والے دو ہفتوں تک اس نے یہی کیا۔ اس دوران میں وہ صرف دو بار باہر گیا اور وہ بھی اپر میں چھپ کر۔ اپنا قد کم ظاہر کرنے کے لیے وہ گھٹنے ذرا جھکا کر چلتا تھا اور سر بھی جھکائے رکھتا تھا۔ اگرچہ اس طرح چلنا خاصا مشکل تھا مگر وہ اپنی شناخت چھپانے کے لیے یہ سب کر رہا تھا۔ دو بار میں وہ ضرورت کا سارا سامان لے آیا۔ اس نے ایک الیکٹرانکس کی دکان سے لیپ ٹاپ بھی لے لیا تھا۔ اس کے اپارٹمنٹ میں انٹرنیٹ کنکشن بھی تھا جو اس نے ایکٹو کروا لیا۔ مگر اس نے غلطی سے بھی اپنا ای میل اکاؤنٹ، یا کوئی میسنجر نہیں کھولا تھا۔ اس صورت میں مافیا کے ہیکرز چند منٹ میں اس کا سراغ لگا لیتے اور حفاظت کرنے والے سوفٹ ویئر بھی ان کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتے تھے۔ کمپیوٹر اور انٹرنیٹ اس نے وقت گزاری کے لیے لیا تھا۔

مگر ان چیزوں سے وہ کب تک دل بہلاتا۔ اسے تو جاندار انسانوں کی عادت ہو گئی تھی، بے جان مشینیں اس کی تسکین نہیں کر پا رہی تھیں۔ تیسرے ہفتے تک وہ اتنا بور ہو گیا کہ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ اپنے فلیٹ سے باہر نکل جائے۔ بے شک اسے مافیا والے لے جائیں مگر اس نے اپنی خواہش پر کسی نہ کسی طرح قابو پا لیا۔ اگر مافیا اسے صرف سزائے موت دیتی تب بھی شاید وہ باہر نکل جاتا مگر وہ جانتا تھا کہ مافیا کے معتوب آسانی سے جان نہیں دیتے ہیں۔ اس نے صرف سنا نہیں تھا بلکہ چشم دید گواہ تھا۔ وہ اپنے معتوب کو ایسی ایسی اذیتوں سے گزارتے تھے کہ وہ مرنے کی آرزو کرتا مگر وہ اسے مرنے بھی نہیں دیتے تھے۔ جب جونی نیا نیا آیا تھا تب اس نے ایک شخص کو اذیتوں کے ساتھ مرتے دیکھا تھا۔ اس نے اتنا سسک سسک کر جان دی تھی کہ جونی کے رونگٹے اس منظر کو یاد کر کے ہی کھڑے ہو جاتے تھے۔

اس کے بعد اس کے حکم پر بھی معتوبین کو ایسی ہی اذیت ناک موت دی گئی تھی۔ آج وہ خود مافیا کا معتوب تھا۔ وہ جانتا تھا کہ نچلے درجے کے اہلکاروں پر تو رحم کیا جاتا تھا مگر جو اوپر ہوتے تھے ان کے ساتھ زیادہ ہی سختی کی جاتی تھی۔ بات وہی تھی کہ دوسروں کو زیادہ سے زیادہ عبرت ہو اور وہ غداری یا کوئی غلطی کرنے سے گریز کریں۔ دیکھا جائے تو جونی نے نہ تو غداری کی تھی اور نہ اس سے غلطی ہوئی تھی۔ مگر وہ ایک کروڑ ڈالرز مالیت کی منشیات گنوا بیٹھا تھا۔ اگر اس کے پاس اتنی رقم ہوتی تو وہ پھر بھی بڑوں کے سامنے تلافی کے ساتھ معافی کا خواستگار ہو سکتا تھا۔ مگر اس کے پاس تو کچھ تھا ہی نہیں۔ زندگی میں پہلی بار وہ اس پر پچھتایا تھا کہ اس نے مافیا سے ملنے والی بے بہا دولت پانی کی طرح بہا دی تھی اگر وہ اسے سلیقے سے خرچ کرتا تو اس کے پاس ایک کروڑ ڈالرز کے آس پاس رقم جمع ہو جاتی اور اسے یوں چوہوں کی طرح نہ چھپنا پڑ رہا ہوتا۔

چوتھے ہفتے تک اس کا دماغ اس حد تک خراب ہوا تھا اس نے ٹی وی اور لیپ ٹاپ توڑ دیا تھا۔ اس کے بعد اس نے ڈرائی جن کی بوتل چند گھنٹوں میں خالی کر دی اور نشے میں دھت ہو کر پڑا رہا.... خوش قسمتی سے پاس پڑوس میں کسی نے اس کے شور شرابے کا نوٹس نہیں لیا تھا ورنہ بلڈنگ منیجر کی طرف سے اسے نوٹس آ جاتا۔ جب اسے ہوش آیا تو اس کے منہ کا ذائقہ بے حد خراب ہو رہا تھا اور سر چکرا رہا تھا۔ اس نے واش روم میں آ کر منہ پر پانی کے چھینٹے مارے اور پھر آئینے میں دیکھا تو بڑھی ہوئی شیو، مُتے ہوئے چہرے اور

ورم آلود آنکھوں کے ساتھ اسے ایک وحشی شخص دکھائی دیا تھا۔ بائیس دن پہلے وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ کبھی اس کا یہ حلیہ بھی ہوگا۔ اس نے منہ پر ہاتھ پھیرا۔ وہ کیا تھا اور کیا ہو گیا تھا۔ اس کا دل یہ سوچ کر بیٹھنے لگا کہ آنے والا وقت اس سے بھی بُرا ہوسکتا تھا۔ وہ واپس کچرے دان والے دور میں جارہا تھا۔

اگر بات پرانے دور تک جانے کی ہوتی تو وہ اب اس کے لیے بھی تیار تھا۔ مگر باہر جانا موت کو دعوت دینے کے برابر تھا۔ وہ چند دن بھی نہیں چھپ سکتا تھا۔ نیویارک چھوڑ کر وہ جہاں جاتا مافیا والے اور ان سے زیادہ دوسری مافیائیں ایک کروڑ ڈالرز کی منشیات کے چکر میں اسے تلاش کرتیں کیونکہ سب کو یقین ہوتا کہ یہ کام اسی کا ہے اور منشیات اس کے پاس ہے۔ اتنے سارے تلاش کرنے والوں سے وہ کہیں نہیں چھپ سکتا تھا۔ جیسے جیسے وہ سوچ رہا تھا اور امکانات پر غور کررہا تھا مایوسی ہی سامنے آرہی تھی۔ تمام راستے بند نظر آرہے تھے۔ وہ کئی دن سے باہر نہیں نکلا تھا اور گھر میں کھانے پینے کا سامان ختم ہورہا تھا۔ اسے کھانے کی اتنی پروا نہیں تھی مگر شراب ختم ہوچکی تھی اور اس وقت اس کا واحد سہارا شراب تھی۔ شام کے وقت وہ باہر نکلا اور نزدیکی گروسری اسٹور کی طرف روانہ ہوگیا۔ اس نے خریداری کی اور واپس آرہا تھا کہ بلڈنگ منیجر نے دفتر سے جھانک کر اسے پکارا۔

''مسٹر اسٹیورٹ۔''

یہاں اس نے اپنا نام سام اسٹیورٹ بتایا تھا۔ پہلے وہ چلتا رہا پھر چونکا اور پلٹ کر منیجر کے پاس آیا۔ ''تم نے مجھے پکارا مسٹر منیجر؟''

''یس مسٹر اسٹیورٹ۔'' اس نے کہا۔ ''ابھی کچھ دیر پہلے دو بدمعاش قسم کے لوگ آئے تھے اور وہ تصویر دکھا کر کسی جونی براڈ کا پوچھ رہے تھے۔ تصویر خاصی حد تک تم سے مشابہ تھی لیکن میں نے انکار کردیا۔ اب میں تم سے پوچھ رہا ہوں کیا تم ہی جونی براڈ ہو؟''

''میں سام اسٹیورٹ ہوں۔'' اس نے ہراساں ہوکر کہا۔

منیجر کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر اس نے کہا۔ ''تم جو کوئی بھی ہو بہتر ہوگا جلد از جلد یہاں سے چلے جاؤ، میں اپنی بلڈنگ میں کوئی ہنگامہ ہوتے دیکھنا نہیں چاہتا۔''

جونی نے تردید کرنا چاہی مگر منیجر نے اپنے دفتر کا دروازہ بند کرلیا۔ جونی تیز قدموں سے فلیٹ تک آیا اور اس نے عجلت میں اپنا مختصر سامان سمیٹا۔ وہاں سے نکلتے ہوئے اس نے احتیاطاً ہنگامی حالات میں استعمال ہونے والی سیڑھیوں کا سہارا لیا تھا۔ سڑک پر آکر اس نے ٹیکسی روکی اور اسے ایک جگہ کا پتا بتایا۔ نیویارک کے اس نواحی علاقے میں استعمال شدہ گاڑیوں کے بے شمار شوروم تھے۔ وہاں سے اس نے کئی سال پرانی لیکن چلنے میں بہترین جیگوار کار لی۔ اس کے بعد وہ ایک صنعتی علاقے میں آیا جہاں دن میں بھی ویرانی ہوتی تھی اور وہاں صرف وہی لوگ آتے تھے جو وہاں کام کرتے تھے۔ اسے امید تھی یہاں اسے کسی مافیا مین سے سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ اب وہ بے گھر تھا۔ وہ کسی ہوٹل نہیں جاسکتا تھا۔ کسی موٹیل میں نہیں ٹھہر سکتا تھا۔ امکان یہی تھا کہ اس کا نام اور تصویر ہر جگہ پہنچ چکی ہوگی اور جہاں وہ جائے گا وہاں مافیا والوں کو آنے میں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔ وہ خود کو لاچار اور بے بس محسوس کررہا تھا۔ اس کے ذہن میں خیال آیا کہ اب اس کے پاس سوائے خودکشی کے اور کوئی راستہ نہیں ہے۔ جیسے جیسے وہ سوچتا گیا اسے یہی واحد راستہ ٹھیک لگا تھا۔

☆☆☆

جونی ٹرین کی پٹری کے ساتھ بیٹھا تھا اور اس کے عقب سے ٹرین گزرتی جارہی تھی۔ وہ چلا چلا کر گالیاں دے رہا تھا اور بہ ظاہر اس کا ہدف کوئی نہیں تھا۔ یہ خودکشی کی چوتھی کوشش تھی جو ناکام رہی۔ سب سے پہلے اس نے زہر پی کر خودکشی کرنے کا فیصلہ کیا۔ خواب آور گولیوں کا استعمال پہلے ہی مسترد کردیا تھا کیونکہ اس نے کچھ عرصے پہلے ٹی وی پر ایک رپورٹ دیکھی تھی جس میں خواب آور گولیاں کھا کر خودکشی کی کوشش کرنے والے شخص کا احوال بیان کیا تھا۔ ڈاکٹروں نے اس کی جان بچالی تھی مگر اس کا جسم ان گولیوں کے اثر سے ہمیشہ کے لیے مفلوج ہوگیا تھا اور ڈاکٹروں کے مطابق اب اسے اپنی زندگی گوشت کے ایک لوتھڑے کی طرح گزارنی تھی۔ جونی اس طرح زندہ رہنا نہیں چاہتا تھا اس لیے اس نے یقینی موت کے لیے ایک مہلک زہر کا انتخاب کیا جو اسے ایک کیمسٹ سے خاصے بھاری داموں ملا تھا۔

کیمسٹ نے اسے یقین دلایا تھا کہ یہ زہر زیادہ سے زیادہ ایک منٹ میں انسان کی جان لے لیتا ہے۔ مگر جب اس نے پارک کی بینچ پر بیٹھ کر زہر کی شیشی منہ سے لگانی چاہی تو اس کے ہاتھوں نے جنبش سے انکار کردیا۔ اس خیال سے اس کا دل بیٹھنے لگا کہ کہیں کیمسٹ کی بات غلط ہو اور اسے مرنے میں بہت دیر لگے اور اس دوران میں اسے نہ جانے

کتنی اذیت برداشت کرنی پڑے۔ چند ناکام کوششوں کے بعد اس نے زہر پینے کا ارادہ ترک کر دیا اور جیب سے پستول نکال کر سر سے لگایا۔ گولی سر پر لگے تو موت فوری اور یقینی ہوتی ہے۔ یہ طریقہ زہر کے مقابلے میں زیادہ کارآمد تھا۔ مگر جب اس نے ٹریگر دبانا چاہا تو اس کے ہاتھ نے پھر کام کرنے سے انکار کر دیا اور اس کے ذہن نے وہ منظر دیکھا کہ اس کا بھیجا سر سے نکل کر باہر بکھرا ہوا ہے۔ اس خیال نے اسے لرزہ دیا اور اس نے پستول جلدی سے سر سے ہٹالیا۔ پاس موجود ایک بڑی بی نے پستول دیکھ کر چیخ ماری اور پولیس کو پکارنے لگیں۔

جونی نے وہاں سے نکل جانے میں عافیت سمجھی تھی۔ اگلا طریقہ بلندی سے کود کر جان دینے کا تھا۔ اس نے ایک بلند عمارت کی چھت تک رسائی حاصل کی۔ یہ کوئی بیس منزلہ عمارت تھی اور دو سو فٹ سے زیادہ بلندی سے گرنے کی صورت میں موت یقینی تھی۔ اگرچہ اس میں اس کا زیادہ حشر نشر ہو جاتا۔ مگر مرنے کے بعد اس کے جسم کا کیا ہوتا ہے اس کی اسے فکر نہیں تھی۔ البتہ جب اس نے کنارے سے نیچے جھانکا تو اس کا دل ایسا گھبرایا اور اسے چکر آیا تو وہ نیچے گرتے گرتے بچا۔ اس نے منڈیر کو مضبوطی سے نہ پکڑا ہوتا تو وہ نیچے گر چکا ہوتا۔ اس نے یہ طریقہ بھی مسترد کر دیا۔ اسے زمین تک پہنچنے میں جتنی دیر لگتی اتنی دیر تک وہ یہ عذاب برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ ذرا غور و فکر کے بعد اس نے سوچا کہ وہ کسی بھی ایسے طریقے سے خودکشی نہیں کر سکتا۔ جس میں آخری قدم اسے خود اٹھانا ہو۔ لہٰذا اسے کوئی ایسا طریقہ سوچنا چاہیے جس میں وہ بس پہلا قدم اٹھالے اور باقی کام کوئی دوسرا کر دے یوں خودکشی مکمل ہو جائے۔

تب اسے ریلوے لائن کا خیال آیا۔ صنعتی علاقے میں ریلوے لائن کئی جگہ سے گزر رہی تھی مگر اس نے مین لائن کا انتخاب کیا جہاں وقفے وقفے سے گاڑیاں گزر رہی تھیں۔ ایک ٹرین دور سے نمودار ہوئی تو جونی لائن پر سر رکھ کر لیٹ گیا اور ٹرین کے نزدیک آنے کا انتظار کرنے لگا۔ مگر عین اس وقت جب ٹرین کا انجن پاس آگیا تھا تو وہ از خود ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھا اور ٹرین اس کے عقب میں گزرتی چلی گئی۔ جونی گالیاں دے رہا تھا۔ اب وہ جان گیا تھا کہ وہ از خود اپنی جان لے نہیں سکتا ہے۔ اس میں اتنا حوصلہ ہی نہیں ہے۔ جب ٹرین گزر گئی تو وہ اٹھ کر گاڑی تک آیا جس کی ڈکی میں ابھی بھی دو لاکھ ڈالرز سے زیادہ رقم موجود تھی۔ اس ایک مہینے میں اس نے بہت کم خرچ کیا تھا بلکہ صرف ضرورت پر خرچ کیا تھا۔ عیاشی پینے کی تھی اور وہ کتنا پی سکتا تھا۔ ایک مہینے میں وہ کسی عورت کے پاس بھی نہیں پھٹکا تھا۔ وہ جانتا تھا ہر کال گرل اس کی صورت آشنا ہوگی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کیا اس کے مقدر میں مافیا کی دی ہوئی موت تھی۔ اس خیال نے اسے لرزا دیا۔ اگر اسے مرنا ہی تھا تو وہ کسی دوسرے فرد کے ہاتھوں مرنے کو ترجیح دیتا۔

اس سوچ سے ایک نیا خیال آیا، وہ اپنے لیے قاتل ہائر کر سکتا تھا۔ وہ جس دنیا کا باسی تھا اسے معلوم تھا کہ قاتل کیسے ہائر کرتے ہیں؟ وہ غور کرتا گیا اور اسے سب سے مناسب طریقہ یہی لگا۔ ایک بار وہ قاتل سے بات کر لیتا تو معاملہ اس کے ہاتھ سے نکل جاتا اور کرائے کا قاتل اپنا کام بہرصورت کرتا۔ کچھ دیر میں اس نے فیصلہ کر لیا۔ شام کے وقت وہ ایک نیٹ کیفے آیا اور اس نے ایک سائٹ کھولی۔ اس سائٹ کا ہر ایک کو علم نہیں تھا۔ یہاں کال گرل اور منشیات سے لے کر کرائے کے قاتل تک سب دستیاب تھے۔ کرائے کے قاتلوں کی ایک لمبی فہرست تھی۔ مگر ان کے نام فرضی تھے۔ اس نے ڈونی دی ڈوگ نامی قاتل کا انتخاب کیا۔ وہ نام سے ہی خطرناک لگ رہا تھا۔ اس نے اس پر کلک کیا تو ایک چھوٹا سا چیٹ پیج کھل گیا۔ ڈونی نے پوچھا۔ ”تم کون ہو؟“

”یہ میں نہیں بتا سکتا۔“

”اوکے... ملک کے اندر میرا معاوضہ ساٹھ ہزار ڈالرز ہوتا ہے اور میں پورا معاوضہ پیشگی لیتا ہوں۔“

”مجھے منظور ہے۔“

”تصویر اور دوسری تفصیلات رقم کے ساتھ پہنچادو۔“

”کہاں؟“

”یہ میں تمہیں ایک دوسرے چیٹ میسنجر پر بتاؤں گا۔ میری آئی ڈی نوٹ کرلو۔“

جونی نے اس کی آئی ڈی نوٹ کی۔ اس نے وہ میسنجر کھولا اور اس میں گیسٹ کی حیثیت سے لاگ ان ہو کر ڈونی دی ڈوگ کی بتائی آئی ڈی ڈالی۔ وہ چیٹ پر آگیا۔ ”تم کل صبح یہ رقم، تصویر اور دوسری تفصیلات سترھویں اسٹریٹ کے فون بوتھ نمبر بارہ میں ڈائریکٹری کے پیچھے والے خانے میں رکھ دو گے۔ اس پر آؤٹ آف آرڈر کی تختی لگی ہے۔ یہ کام کر کے تم فوراً وہاں سے روانہ ہو جاؤ گے۔“

”اوکے۔“ جونی نے جواب دیا۔ ”لیکن اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ تم رقم لے کر کام کر دو گے؟“

”ضمانتی اس سائٹ کا مالک ہے جہاں تم نے مجھ سے

رابطہ کیا تھا۔'' ڈونی نے کہا اور آف لائن ہوگیا۔ جونی نے آج تک کرائے کا قاتل ہائر نہیں کیا تھا۔ اس کام کے لیے مافیا میں بندے کم نہیں تھے۔ یہاں ہر دوسرا فرد قاتل ہی تھا۔ آج پہلی بار اس نے یہ کام کیا تھا اور حیران تھا کہ یہ کام کتنی آسانی سے ہوگیا۔ اس نے رات سے پہلے ہی سارے کام نمٹا لیے، اپنی بڑے سائز کی تصویر بنوائی اور ایک کاغذ پر تفصیلات لکھیں کہ وہ کون ہے اور قاتل اسے کہاں تلاش کرسکتا ہے؟ اگلی صبح اس نے اپنا پیسا اور رقم و تصویر والا لفافہ لے کر روانہ ہوا۔ اس نے ٹیکسی کی تھی۔ سترھویں اسٹریٹ پر فون بوتھ نمبر بارہ تلاش کرنے میں اسے زیادہ دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ اس نے ٹیکسی اس کے سامنے رکوائی اور سر جھکائے نیچے اترا کہ اگر کوئی نگرانی کر رہا ہو تو اس کا چہرہ نہ دیکھ سکے۔ لفافہ اس نے یوں ڈائریکٹری کے پیچھے ڈالا کہ ٹیکسی والا بھی نہیں دیکھ سکا البتہ وہ حیران ضرور تھا کہ وہ اس خراب فون بوتھ میں کیا کرنے گیا تھا۔ واپس آکر جونی ٹیکسی میں بیٹھا اور بولا۔

''چلو جہاں سے لائے تھے، مجھے وہیں واپس چھوڑ دو۔''

راستے میں ٹیکسی والے کو ٹیکسی مختلف سڑکوں پر موڑنے کا کہتا رہا۔ وہ یقینی بنا رہا تھا کہ اس کا پیچھا نہیں کیا جا رہا تھا اسی لیے واپسی میں اسے ایک گھنٹا لگا تھا اور اسے امید تھی کہ اتنی دیر میں قاتل نے لفافہ نکال لیا ہوگا۔ اگر ٹیکسی والا تجسس میں واپس جا کر دیکھے بھی تو اسے وہاں کچھ نہیں ملے گا۔ ٹیکسی اسے چھوڑ کر گئی تو وہ اپنی کار میں ایک ریستوران کی طرف روانہ ہوا۔ یہ اس کا پسندیدہ ریستوران تھا اور وہ نیویارک میں رہنے کے دوران اکثر کھانا کھانے یہاں آتا تھا۔ آج اس کی زندگی کا آخری دن تھا اور اسے اگلی صبح کا سورج دیکھنا نصیب نہیں ہوتا اس لیے اس نے سوچا کہ کچھ وقت اچھا گزار لیا جائے۔ اس نے ڈٹ کر لنچ کیا اور پھر ایک بار میں شام تک کا وقت گزارا۔ اتفاق سے وہاں بہت کم لوگ تھے اور جونی نے اپنے پسندیدہ ماحول کو پوری طرح انجوائے کیا تھا۔ سورج ڈوبنے کے بعد جب وہاں رش ہونے لگی تو وہ وہاں سے اٹھ گیا۔ اب امکان تھا کہ کوئی اس کی جان پہچان کا نکل آئے اور وہ مشکل میں پڑ جائے۔

بار سے نکل کر اس نے ایک بزنس ایریا کا رخ کیا۔ یہاں وہ ایک عمارت میں آیا۔ یہ چھ منزلہ عمارت پارکنگ کے لیے مخصوص تھی اور کیونکہ اوپن پارکنگ تھی اس لیے کوئی بھی یہاں اپنی گاڑی کھڑی کرسکتا تھا۔ کوئی نگران یا گارڈ نہیں تھا۔ ائرپورٹ نزدیک ہونے کی وجہ سے زیادہ تر وہ لوگ یہاں گاڑیاں چھوڑ کر جاتے تھے جو طویل دورے پر بیرون ملک جا رہے ہوں۔ کچھ گاڑیاں بزنس مین کھڑی کرتے تھے۔ جونی نے دوسرے فلور کا رخ کیا اور اس کے آخر میں ایک تاریک گوشے میں اپنی گاڑی روک دی۔ اب اسے قاتل کا انتظار تھا۔ اس نے قاتل کو بتایا تھا کہ اس کا شکار اسے یہاں رات دس بجے ملے گا۔ اس نے اپنی کار کی تفصیلات بھی بتائی تھیں۔ اسے امید تھی کہ قاتل کو کار تلاش کرنے میں زیادہ دشواری پیش نہیں آئے گی اور وہ تاریکی کا فائدہ اٹھا کر اسے چپکے سے ٹھکانے لگا دے گا اور وہ بھی چاہتا تھا کہ اسے پتا بھی نہ چلے کہ موت نے کب اسے دبوچ لیا۔

وقت بہت سست روی سے گزر رہا تھا۔ ساڑھے نو بجے تھے کہ ایک بڑی سیاہ وین بہت تیزی سے پارکنگ میں داخل ہوئی اور دوسرے فلور پر آتے ہوئے وہ ایک گاڑی سے ٹکرائی اور رک گئی۔ اس کا انجن بند ہوگیا تھا مگر کوئی اس سے اترا نہیں تھا۔ جونی کا دل دھڑک اٹھا۔ یہ قاتل کے آنے کا انداز نہیں تھا۔ معاملہ کچھ اور ہی لگ رہا تھا۔ وہ کچھ دیر انتظار کرتا پھر وہ اپنا پستول نکال کر نیچے اترا اور وین کی طرف بڑھا۔ آس پاس مکمل خاموشی تھی۔ اس نے پہلے ڈرائیونگ سیٹ پر دیکھا وہاں دو افراد تھے۔ ڈرائیور اوندھے منہ اسٹیرنگ پر پڑا تھا۔ دوسرا سیٹ سے ٹیک لگائے ڈھیر تھا۔ اگر سیٹ بیلٹ نہ بندھی ہوتی تو وہ آگے گر چکا ہوتا کیونکہ وہ مر چکا تھا اس کے سر میں سوراخ تھا جس سے اب تک خون ٹپک رہا تھا۔ جونی نے ڈرائیور کو چیک کیا وہ بھی مر گیا تھا۔ وہ شدید زخمی حالت میں وین کسی نہ کسی طرح یہاں لانے میں کامیاب رہا تھا۔ جونی نے عقبی ڈبل ڈور کھولنا چاہا مگر وہ لاک تھا۔

جونی نے ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھولا اور جھک کر اگنیشن سے چابی نکالی۔ اس میں عقبی دروازے کی چابی بھی تھی۔ اس نے پستول سامنے کرتے ہوئے لاک کھولا مگر اندر کوئی نہیں تھا اور صرف دو عدد کینوس بیگ پڑے تھے۔ جونی نے ایک بیگ اپنی طرف کھینچا اور اس کی زپ کھولی تو چونک گیا یہ اوپر تک سو ڈالرز والی گڈیوں سے بھرا ہوا تھا۔ جونی نے بیتابی سے بیگ ٹٹولا اس میں صرف گڈیاں تھیں۔ اس نے دوسرا بیگ بھی دیکھا اور یہ بھی گڈیوں سے بھرا ہوا تھا۔ تمام گڈیاں بینک کی مہر والی پٹی کے ساتھ تھیں اور ان میں نئے پرانے ہر طرح کے نوٹوں کی گڈیاں تھیں۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ کہیں سے گن پوائنٹ پر یہ رقم حاصل کرکے آ رہے تھے اور دوسری پارٹی بھی مسلح تھی۔ وہ نشانہ بنے لیکن وہاں

سے نکلنے میں کامیاب رہے اور یہاں تک آن پہنچے۔
جونی نے ایک بیگ اٹھانے کی کوشش کی تو یہ بہت مشکل سے اٹھایا گیا اس کا وزن کم سے کم بھی ساٹھ کلوگرام تھا۔ رقم دیکھتے ہی اس نے فوری فیصلہ کیا، اس نے اپنی گاڑی نزدیک لا کر دونوں بیگ اس کی ڈکی میں منتقل کیے اور وہاں سے روانہ ہو گیا۔ پونے دس بجنے والے تھے اور ڈونی کسی لمحے بھی وہاں آسکتا تھا۔ بلکہ جونی کو دھڑکا لگا ہوا تھا کہ ڈونی وہاں آنہ جائے۔ رقم دیکھتے ہی اس نے مرنے کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔ مگر یہ بات ڈونی نہیں جانتا تھا وہ اسے قتل کرنے آرہا تھا اور اب اسے ڈونی کو روکنا تھا۔ یہ زیادہ مشکل نہیں تھا۔ وہ اس سائٹ پر رابطہ کرتا اور اسے کام نہ کرنے کو کہتا۔ اگر وہ زیادہ چیخ پکار کرتا تو جونی اس سے رقم بھی نہ لیتا۔ اسے ساٹھ ہزار ڈالرز کی کیا پروا ہو سکتی تھی جبکہ اس کے خیال میں اسے ایک کروڑ ڈالرز سے زیادہ کی رقم مل گئی تھی۔ سب سے پہلے اسے رقم محفوظ کرنا تھی۔ اس نے ایک لاکر سروس کا رخ کیا جہاں مناسب کرائے پر مختلف سائز کے لاکر مل جاتے تھے جن میں لوگ اپنا سامان رکھ سکتے تھے۔ اس نے ایک لاکر لیا اور دونوں بیگ اس میں رکھ دیے۔ یہ بیک وقت الیکٹرانک کارڈ اور لگائے گئے پن کوڈ سے کھلنے والا لاکر تھا۔ پن کوڈ گاہک لگاتا تھا اور اسے یاد رکھنے کی ذمے داری بھی اسی کی تھی۔
رقم محفوظ کر کے جونی نے اطمینان کا سانس لیا اور اب دوسرا کام ڈونی کو روکنا تھا۔ وہ یقیناً پارکنگ میں اسے تلاش کر رہا ہوگا۔ جونی نے ایک نیٹ کیفے کا رخ کیا اور وہاں سائٹ پر جا کر ڈونی سے رابطے کی کوشش کی مگر وہ آف لائن تھا اس لیے چیٹ پر نہیں آیا۔ جونی بیٹھا رہا اور وقفے وقفے سے کوشش کرتا۔ بارہ بجے کے قریب ڈونی چیٹ پر آیا اور اس کا موڈ سخت خراب تھا اس نے آتے ہی کہا۔ ''وہ وہاں نہیں آیا۔ اب مجھے اس کا مستقل پتا بتاؤ۔''
''میں نے ارادہ ملتوی کر دیا ہے۔'' جونی نے کہا۔
''کیا مطلب؟''
''مطلب واضح ہے، اب میں کام نہیں کرانا چاہتا۔''
''ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟'' ڈونی نے کہا۔ ''ڈیل ڈیل ہوتی ہے۔''
''میری طرف سے ڈیل ختم سمجھو اور اگر تمہیں رقم واپس کرنے میں اعتراض ہے تو اسے بھی اپنے پاس رکھو۔''
''ایسا نہیں ہو سکتا۔ میں مفت کا معاوضہ نہیں لیتا اور نہ ہی ڈیل ختم ہوگی۔ ڈیل تمہاری طرف سے ضرور ختم ہوئی ہے لیکن میں اپنا کام کروں گا۔ تم پتا مت بتاؤ، اسے میں خود تلاش کر لوں گا۔''
''میری بات سنو۔'' جونی نے لکھا لیکن ڈونی آف لائن ہو چکا تھا۔ جونی پریشان ہو گیا۔ اس نے سائٹ کے مالک سے رابطہ کیا مگر اس نے اس کے اور ڈونی کے معاہدے میں دخل اندازی سے انکار کر دیا۔ اس نے کہا۔
''اگر اس نے معاہدے کی خلاف ورزی کی ہوتی تو تم مجھ سے کہتے مگر میں اسے معاہدے سے ہٹ کر مجبور نہیں کر سکتا۔''
''کیسی خلاف ورزی، میں نے اسے ڈیل دی اور میں اب واپس لے رہا ہوں۔''
''ڈیل یک طرفہ ختم نہیں ہوتی ہے۔''
''اس سے کہو مجھ سے بات کرے، وہ آف لائن ہو گیا ہے۔''
''میں اسے مجبور نہیں کر سکتا، یہ میرے دائرۂ اختیار میں نہیں ہے۔''
جونی کو پسینے آنے لگے، یہ سوچ کر کہ قاتل بدستور اس کے پیچھے ہے، وہ اس کی تصویر دیکھ چکا ہے اور لازمی بات ہے جلد وہ اس کے بارے میں سب جان جائے گا۔ اگر وہ مافیا سے ڈیل کر کے اپنی جان بچا لیتا ہے تب بھی اس قاتل سے کیسے بچے گا جس کے بارے میں وہ کچھ نہیں جانتا ہے۔
وہ نیٹ کیفے سے نکلا اور اب اسے اس کار سے چھٹکارا حاصل کرنا تھا۔ اس نے نیویارک سے باہر ایک ہائی وے شو روم کا رخ کیا جو اصل میں سروس اسٹیشن بھی تھا اور چوبیس گھنٹے کھلا رہتا تھا۔ یہ ہائی وے پر سفر کرنے والوں کی سہولت کے لیے تھا اور یہاں کاروں کی خرید و فروخت بھی کی جاتی تھی۔ جونی نے یہاں اپنی کار دے کر ایک دوسری کار لی اور واپس آکر ایک اور ہائی وے پر موجود موٹیل میں کمرا لیا۔ اس نے خطرہ مول لیا تھا کیونکہ اسے موٹیل میں بھی تلاش کیا جا رہا ہوگا۔
مگر دو دن کی بے آرامی نے اسے مجبور کر دیا تھا۔ وہ موٹیل میں کمرا لے کر اس وقت تک سوتا رہا جب تک بھوک نے اسے بیدار نہیں کر دیا۔ کسی ہوٹل کے بجائے اس نے ایک ہائی وے اسٹور کا رخ کیا جہاں کھانے کو بھی ملتا تھا۔ وہاں اس نے برگر اور ملک شیک سے اپنی بھوک مٹائی۔ دوسرے کپڑے لیے کیونکہ جو اس نے پہن رکھے تھے وہ خراب ہو چکے تھے۔ وہ موٹیل میں نہا لیا تھا۔ گاڑی میں بیٹھ کر اس نے اپنے کپڑے بدلے اور خراب کپڑے ڈسٹ

بن میں ڈال کر روانہ ہوگیا۔ کل تک وہ مایوس اور مرنے کے لیے تیار تھا۔ مگر اچانک ملنے والی دولت نے اسے پُرامید اور پھر سے زندہ کردیا تھا۔ اب مسئلہ ایک ہی تھا یعنی قاتل۔ جب رقم ملی تو اس نے سوچا تھا کہ مافیا کا نقصان پورا کر کے معافی حاصل کرلے گا۔ مگر اسے مرنے والے تین آدمیوں کا حساب بھی دینا تھا۔ اگر اوپر والوں کا شک برقرار رہتا کہ منشیات اصل میں اس نے غائب کی ہے تو رقم دینے کے باوجود اسے معاف نہیں کیا جاتا۔ بالفرض محال اسے معاف بھی کردیا جاتا تب بھی قاتل اس کے پیچھے رہتا اور وہ اس کا آسان ہدف بن جاتا۔

اس لیے اس نے فرار کا فیصلہ کیا۔ دنیا کی کسی محفوظ جگہ جا کر چھپنے، نام اور حلیہ بدلنے کے لیے بہت بڑی دولت درکار تھی جو اب اس کے پاس تھی۔ سب سے پہلے اسے پاسپورٹ کی ضرورت تھی اور یہ کام سب سے زیادہ آسانی سے جنوب کی ریاستوں میں ہوتا تھا۔ ایک دن غور وخوض کے بعد جونی نے اپنا پلان مکمل کرلیا۔ اس نے آسٹریلیا جا کر رہنے کا فیصلہ کیا۔ وہاں وہ آسانی سے غائب ہو جاتا۔ بحر الکاہل یا کسی ایسی جگہ جہاں سفید فام کم ہوتے ہیں وہ بلاوجہ نمایاں ہوتا اور نظروں میں آسکتا تھا۔ آسٹریلیا وسیع رقبے پر پھیلا ہوا ملک ہے جہاں چھپ کر رہنا آسان ہے۔ وہ زمین خرید سکتا تھا اور اپنا بزنس شروع کرسکتا تھا۔ مگر پہلے اسے ایک عدد پاسپورٹ کی ضرورت تھی۔ اسے حلیے میں تبدیلی کی ضرورت بھی تھی جو پلاسٹک سرجری سے ممکن تھی۔

اگلے دن وہ نیویارک پہنچا۔ اس نے لاکر سے رقم نکال کر اسے لکڑی کی ایک مضبوط پیٹی میں بند کیا اور اسے اپنے ہی نام سے میامی بھیج دیا۔ اس نے جس کوریئر کمپنی سے بھیجا تھا اس کے سینٹر سے وہ خود جا کر پیٹی وصول کرسکتا تھا۔ یہ کام کر کے وہ نیویارک سے نکلا اور سڑک کے راستے فلوریڈا روانہ ہوگیا۔ حفاظت کے خیال سے اس نے غیر معروف ہائی ویز کا انتخاب کیا اور اس وجہ سے اس کا سفر بھی بہت طویل ہوا۔ تین دن بعد وہ میامی میں داخل ہوا تو اس کی اور کار کی دونوں کی حالت خستہ ہو رہی تھی۔ ایک دن اس نے ایک شاندار ہوٹل میں بھرپور آرام کیا۔ اس کے بعد کوریئر سینٹر جا کر پیٹی وصول کی اور رقم اس سے نکال کر دوبارہ بیگز میں بھر کر ایک لاکر میں رکھوائی۔ وہ اتنی بڑی رقم ساتھ رکھنے کا خطرہ مول لے ہی نہیں سکتا تھا۔

مافیا کے ساتھ کام کر کے اس نے بہت سے روابط بنائے تھے۔ اسے معلوم تھا کہ پاسپورٹ کیسے مل سکتا ہے اور

بڑے لوگوں کی بڑی باتیں

کسی بزرگ سے سوال کیا گیا کہ کیا وجہ ہے کہ ہم علم کی باتیں سنتے ہیں لیکن فائدہ نہیں ہوتا۔

انہوں نے فرمایا۔ تمہارے اندر پانچ باتیں ہیں جن کی وجہ سے تم اس نعمت سے محروم ہو۔

1- اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا نہیں کرتے۔
2- گناہ کے بعد استغفار نہیں کرتے۔
3- جتنا جانتے ہو اس پر عمل نہیں کرتے۔
4- نیک لوگوں کی محفل میں بیٹھتے تو ہو لیکن ان کا اتباع نہیں کرتے۔
5- مردوں کو دفن کرتے وقت عبرت حاصل نہیں کرتے۔

حاصل مطالعہ، جاوید اختر رانا، حالی روڈ حیدر آباد

وہ کہاں سے اپنا چہرہ بدلوا سکتا ہے۔ مگر وہ ان کے پاس جا نہیں سکتا تھا کیونکہ وہ مخبری کرسکتے تھے۔ خاصے غور وخوض کے بعد اس نے کیلیفورنیا جانے کا فیصلہ کیا۔ وہاں جرمن مافیا کا اثر نہ ہونے کے برابر تھا اور اسے امید تھی کہ وہاں یہ دونوں کام وہ آسانی سے کروالے گا۔ مزید دو دن کے سفر کے بعد وہ کیلیفورنیا پہنچا۔ وہاں بچ بچ اسے آسانی ہوئی۔ اتفاق سے اس نے جس شخص سے رابطہ کیا وہ دونوں کاموں کے لیے بہترین روابط رکھتا تھا۔ اس نے پہلے جونی کے لیے ایک پاسپورٹ کا بندوبست کیا۔ یہ مارک اسپورگ نامی شخص کا اصلی پاسپورٹ تھا اور یہ اب زندہ نہیں تھا۔ اس کی لاش خلیج میکسیکو میں شارک مچھلیوں کی خوراک بن چکی تھی۔ ایجنٹ نے جونی کو مردہ مارک کی تصاویر دکھائیں جب وہ منشیات کے اسمگلروں کا نشانہ بنا اور انہوں نے اسے مار کر اس کی کشتی کی مدد سے منشیات امریکا اسمگل کی اور پھر اس کی کشتی کو بھی ڈبو دیا۔ اس لیے مارک اب گمشدہ تھا۔ ایجنٹ نے یہ نہیں بتایا کہ مارک کا پاسپورٹ اور تصویریں اس کے پاس کیسے آئیں اور نہ ہی جونی نے اس سے پوچھا۔

مزید اتفاق کہ مارک کی عمر اور چہرہ بھی جونی سے ملتا جلتا تھا۔ معمولی پلاسٹک سرجری اسے مارک کا روپ دے سکتی تھی۔ ایک چھوٹے سے ہٹ میں سرجن نے اس کی پلاسٹک

سرجری کی۔ یہ اتنی معمولی سی تھی کہ دو دن میں وہ بالکل ٹھیک ہو گیا اور اس کا چہرہ مارک سے سو فیصد نہیں مگر ننانوے فیصد ملنے لگا۔ یہ کام کرا کے جونی واپس فلوریڈا آیا۔ اب اسے شناخت کا خطرہ نہیں تھا۔ اس کے اور مارک کے بالوں میں ذرا سا فرق تھا۔ مارک کے بال سرخی مائل بھورے تھے اور جونی کے صرف بھورے تھے مگر تصویر میں یہ فرق واضح نہیں تھا۔ اب اگلا مرحلہ رقم کو آسٹریلیا لے جانا تھا اور یہ بھی آسان نہیں تھا۔ پہلے اسے امریکا میں یہ رقم ظاہر کرنی تھی۔ پھر ثابت کرنا تھا کہ اس نے یہ رقم کمائی ہے اور اس پر تمام ٹیکسز ادا کیے ہیں۔ آسٹریلیا پہنچنے کے بعد اسے وہاں بھی رقم کے حوالے سے بہت سے قوانین پر عمل کرنا پڑتا۔

مسئلہ قوانین کا نہیں بلکہ اس کی شناخت کھل جانے کا تھا۔ وہ بہرحال ایک مردہ شخص کی شخصیت اپنائے ہوئے تھا۔ پاسپورٹ پر اس کی انگلیوں کے نشانات نہیں تھے اگر مسئلہ ہوتا تو یہ نشانات چیک کیے جا سکتے تھے۔ جب تک اسے آسٹریلین پاسپورٹ نہیں مل جاتا راز افشا ہونے کا خطرہ برقرار رہتا۔ اس لیے جونی نے ایک آسان کام کیا۔ اس نے ہیروں کی خریداری شروع کر دی۔ مگر وہ جان بوجھ کر درمیانے درجے کے ہیرے لے رہا تھا جو قیمتی تھے مگر اتنے بھی نہیں کہ بین الاقوامی سطح پر ان کا شہرہ ہو۔ وہ سیٹ لینے کو ترجیح دے رہا تھا۔ ایک جیسے ہیرے زیادہ تعداد میں ہوں تو ان کی اچھی قیمت مل جاتی ہے۔ جوہری اپنے گاہکوں کی حفاظت کے لیے راز داری پر عمل کرتے ہیں اس لیے اس کا راز افشا ہونے کا خطرہ بھی نہیں تھا۔ چند دن میں اس نے تقریباً ایک کروڑ دس لاکھ ڈالرز مالیت کے ہیرے خرید لیے اور یہ اتنے تھوڑے تھے کہ وٹامن کی گولیوں کی شیشی میں آگئے۔

ہیرے لے کر وہ امریکا سے بہ آسانی نکل گیا اور سڈنی میں ائرپورٹ پر اس نے ہیرے ظاہر کر دیے۔ وہاں ان پر آسٹریلیا کی حکومت سے لگائی ہوئی ڈیوٹی ادا کی اور اب یہ ہیرے قطعی قانونی حیثیت رکھتے تھے۔ اس پر کسی قسم کا شک نہیں کیا گیا۔ اس نے ائرپورٹ پر بتا دیا تھا کہ وہ آسٹریلیا کی شہریت اختیار کرنے کا خواہش مند ہے اور ایک امریکی اور دولت مند کی حیثیت سے اسے وہیں فوری قانونی مشاورت فراہم کی گئی تھی۔ سڈنی میں اس نے ہیرے ایک بینک لاکر میں رکھوائے۔ چند دن اس نے دل کھول کر ان تفریحات میں گزارے جن سے وہ ایک مہینے سے زیادہ عرصے دور رہا تھا۔ یہاں اسے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ چند دن بعد اس نے آسٹریلیا کی شہریت کے لیے باقاعدہ درخواست دے دی۔ اسے امید تھی کہ آسٹریلین امیگریشن زیادہ انکوائری نہیں کرے گی اور اسے کم سے کم فوری رہائش اور بزنس کی اجازت تو مل جائے گی۔

ایسا ہی ہوا۔ اسے رہائش اور کام کی اجازت دو ہفتے بعد مل گئی تھی۔ البتہ مستقل شہریت کا پروسیس ذرا طویل تھا۔ اس نے ہیرے فروخت کیے اور کوئنز لینڈ کی ریاست میں ایک وسیع فارم خرید لیا۔ ساحل سے نزدیک یہ جگہ بہت خوب صورت، پُرسکون اور پُرامن تھی۔ یہاں زیادہ تر فارمرز رہتے تھے اور گھر فاصلے پر بنے ہوئے تھے۔ نزدیکی شہر روک ہمپٹن تھا جہاں وہ سب دستیاب تھا جس کی جونی کو خواہش تھی۔ دولت کی اس کے پاس کمی نہیں تھی اس لیے اس نے فارم پر کاشت کاری کی کوشش نہیں کی اور اسے یونہی چھوڑ دیا۔ اس کا رہائشی ولا ساحل سے ذرا فاصلے پر کسی قدر بلندی پر تھا اس کے نیچے دائرے میں کٹا ساحل خود بہ خود اس کی ملکیت بن گیا تھا۔ چٹانوں کے درمیان اس کا سفید ریت والا ساحل بہت خوب صورت اور سب سے الگ لگتا تھا۔ نیچے جانے کے لیے لکڑی کی ریلنگ والی سیڑھی تھی۔ جونی اکثر یہاں دھوپ، ہوا اور لہروں سے لطف اندوز ہونے آتا تھا۔ اس کے پاس دو انڈونیشین ملازمائیں تھیں جو اس کی اور گھر کی دیکھ بھال کرتی تھیں۔

موسم خوشگوار رہتا تھا۔ سال کے کم حصے ایسے آتے تھے جب بہت سردی یا بہت گرمی پڑتی تھی۔ ورنہ سال کے باقی حصے میں موسم ایک جیسا رہتا تھا۔ جونی کو یہاں منتقل ہوئے چھ مہینے ہونے کو آئے تھے۔ اس نے آس پاس لوگوں سے اچھے تعلقات قائم کر لیے تھے اور وہ دوبارہ سوشل لائف کا آغاز کرنے کی سوچ رہا تھا مگر اس کے لیے ضروری تھا کہ ایک عورت اس کی زندگی میں ہو، چاہے وہ بیوی کی حیثیت سے ہو یا محبوبہ کی حیثیت سے۔ فی الحال اس کا شادی کا موڈ نہیں تھا اور کوئی ایسی لڑکی یا عورت بھی نہیں ملی تھی جو اسے دل سے پسند آتی۔ اس کے بیڈروم تک تو کئی آئی تھیں مگر وہ اسے بس بیڈروم کی حد تک ہی اچھی لگی تھیں۔

اس دن موسم کسی قدر خنک ہوا تھا اور وہ لنچ کے بعد ساحل پر نکل آیا تھا۔ دھوپ کسی قدر سرد ہوا کے ساتھ مل کر اچھی لگ رہی تھی۔ وہ آرام کرسی پر نیم دراز تھا۔ برابر میں تپائی پر وہسکی اور برف کی باسکٹ رکھی تھی۔ اس کی انڈونیشین ملازمہ میری اس کے ساتھ تھی اور عقب میں کھڑی اس کے شانے سہلا رہی تھی۔ اس کے نرم ہاتھوں کے لمس سے جونی لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اچانک میری نے کہا۔ ''یہ کون ہے؟''

جونی نے آنکھیں کھولیں اور اسے سامنے شفاف پانی سے ایک جل پری جیسا وجود نکلتا نظر آیا۔ فرق صرف یہ تھا کہ جل پری کا نچلا دھڑ مچھلی جیسا ہوتا ہے مگر یہ ایک مکمل عورت تھی۔ چاندنی جیسا دمکتا وجود جو نہ ہونے کے برابر لباس میں چاند کی طرح نمایاں تھا۔ دمکتی رنگت، اساطیری نقوش اور سنہری بال جو جوڑے کی صورت میں بندھے ہوئے تھے۔ وہ عمر کے اس حصے میں تھی جب عورت اپنے حسن کے عروج پر ہوتی ہے۔ پانی سے نکل کر وہ سحر زدہ کر دینے والی چال کے ساتھ اس کی طرف آئی۔ جونی بے ساختہ کھڑا ہو گیا۔ وہ اس کے قریب آئی اور دلکش انداز میں مسکرائی۔ ”ہائے.... میں نے تمہیں ڈسٹرب تو نہیں کیا۔“

”نہیں.... نہیں۔“ جونی نے بے ساختہ کہا۔ نسوانی حسن اس کے لیے کوئی اجنبی چیز نہیں تھی مگر آج تک کسی عورت نے اسے اس طرح متاثر نہیں کیا تھا۔

اس نے اپنا مرمریں ہاتھ دراز کیا۔ ”میں شیلا ہوں۔“

”جو....“ وہ اپنا اصل نام لینے جا رہا تھا کہ بروقت سنبھل گیا۔ ”مجھے مارک کہتے ہیں۔“

وہ پھر مسکرائی۔ ”کیا تم مجھے بیٹھنے کو نہیں کہو گے؟“

”کیوں نہیں۔“ جونی نے دوسری کرسی کی طرف اشارہ کیا تو وہ نزاکت سے اس پر ٹک گئی۔ اتنے قریب سے اس کے جسمانی حسن و تناسب نے جونی کے ہوش اڑا دیے تھے۔ ”ڈرنک پلیز؟“

وہ ہنسی۔ ”میں براہِ راست بوتل سے نہیں پیتی۔“

جونی کو اپنی حماقت کا احساس ہوا۔ اس نے میری سے کہا۔ ”دوسرا گلاس لے کر آؤ۔“

میری نے برا سا منہ بنایا اور اوپر کی طرف روانہ ہو گئی۔ تقریباً پچاس فٹ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر جانا اور آنا تھا اسے کچھ دیر لگتی۔ اس کے باوجود وہ بڑی پھرتی سے گلاس لے کر چند منٹ میں نمودار ہوئی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ انہیں زیادہ دیر اکیلے چھوڑنا نہیں چاہتی تھی۔ شیلا نے اسے آتے دیکھا اور بولی۔ ”بڑی جلدی آ گئی، کیا یہ کچھ دیر کے لیے یہاں سے جا نہیں سکتی ہے۔“

شیلا نے جونی کے دل کی بات کہہ دی تھی، وہ خود اس کے ساتھ شدت سے تنہائی کا تمنائی تھا۔ اس نے میری کے آتے ہی اس سے گلاس لیا اور اسے حکم دیا۔ ”میرا کمرا بالکل صاف کر دو۔ اس کے بعد میرا کوئی سوٹ استری کر دینا۔“

میری نے گھور کر شیلا کو دیکھا۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ جونی اسے ٹال رہا ہے۔ وہ بھی اس کی تنہائیوں کی ساتھی تھی مگر ساتھ ہی ملازمہ بھی تھی۔ اس کے حکم سے انکار نہیں کر سکتی تھی اس لیے برہمی کے ساتھ اوپر کی طرف بڑھ گئی۔ اسے جاتے دیکھ کر شیلا نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ”لگتا ہے یہ ملازمہ سے بڑھ کر کچھ ہے؟“

”نہیں۔“ جونی نے اس کے اور اپنے لیے شراب گلاسوں میں انڈیلی اور گلاس اس کی طرف بڑھا دیا۔ ”بس ذرا نک چڑھی ہے۔“

شیلا نے گلاس تھام لیا۔ ”میں سمجھی کہ شاید کچھ اور بھی ہے۔“

”میں نے تمہیں پہلی بار دیکھا ہے۔“ جونی نے تجسس سے پوچھا۔

”میں برسبن سے آئی ہوں۔ کچھ فاصلے پر ہماری کشتی کھڑی ہے۔ میں سوئمنگ کرتی اس طرف آنکلی۔ مجھے یہ ساحل اچھا لگا۔“

”صرف ساحل؟“ جونی نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔

شیلا نے اس کی آنکھوں میں دیکھا اور گلاس خالی کر کے ریت پر اچھال دیا۔ وہ خود اٹھ کر اس کی طرف آئی۔ جونی نے اٹھنے کی کوشش کی مگر شیلا نے اسے واپس دھکیل دیا اور اس پر چھا گئی۔ جونی نے اسے من مانی کرنے دی۔ وہ خود یہی چاہتا تھا۔ شیلا کا قرب سحر انگیز تھا۔ اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں اور اسے پتا نہیں چلا کہ کب شیلا نے اپنے بالوں سے جوڑا باندھنے والی سلاخ نکالی جس کے ایک طرف چھوٹا سا گولا بنا ہوا تھا اور دوسری طرف تیز نوک تھی۔ شیلا نے نوک والا حصہ جونی کے بائیں کان میں داخل کیا اور اس سے پہلے وہ چونکتا اس نے پوری قوت سے دائیں ہاتھ کی ہتھیلی گولے پر ماری اور سلاخ پوری جونی کے سر میں گھس گئی۔ اس کی آنکھیں کھلیں اور پھر کھلی رہ گئیں۔ اسے مرنے میں شاید ایک لمحہ لگا تھا کیونکہ سلاخ دماغ کی گہرائیوں میں اتر گئی تھی۔ شیلا نے آرام سے گولا پکڑ کر سلاخ واپس کھینچ لی اور جونی کی لاش پر سے اٹھتے ہوئے وہ پانی کی طرف بڑھی۔ اس نے سلاخ پر لگا ہوا خون اور مغز صاف کیا اور اسے دوبارہ اپنے بالوں میں لگا لیا۔ پانی میں اترنے سے پہلے اس نے مڑ کر جونی کو دیکھا اور بولی۔

”ڈونی دی ڈوگ نے اپنی ڈیل مکمل کر دی مسٹر جونی۔ اگرچہ مجھے ساٹھ ہزار ڈالرز سے کہیں زیادہ رقم خرچ کرنا پڑی لیکن ڈیل ڈیل ہوتی ہے۔“

اس نے پانی میں چھلانگ لگائی اور چند منٹ بعد سمندر میں اس کا نام و نشان نہیں تھا۔

طاہر جاوید مغل

انگارے

دسویں قسط

نیکی کر دریا میں ڈال... بات محاورے کی حد تک ٹھیک ہو سکتی ہے لیکن خود غرضی اور سفاکی کے اس دور میں نیکی کرنے والے کو ہی کمر میں پتھر باندھ کر دریا میں ڈال دیا جاتا ہے۔ انسان بے لوث ہو اور سینے میں دردمند دل رکھتا ہو تو اس کے لیے قدم قدم پر ہولناک آسیب منہ پھاڑے انتظار کر رہے ہوتے ہیں۔ بستیوں کے سرخیل اور جاگیرداری کے بے رحم سرغنہ لہو کے پیاسے ہو جاتے ہیں... اپنوں کی نگاہوں سے نفرت کے انگارے برسنے لگتے ہیں... امتحان در امتحان کے ایسے کڑے مراحل پیش آتے ہیں کہ عزم کمزور ہو تو مقابلہ کرنے والا خود ہی اندر سے ریزہ ریزہ ہو کر بکھرتا چلا جاتا ہے لیکن حوصلہ جوان ہو تو پھر ہر سازش کی کوکھ سے دلیری اور ذہانت کی نئی کہانی ابھرتی ہے۔ وطن کی مٹی سے پیار کرنے والے ایک بے خوف نوجوان کی داستان جسے ہر طرف سے وحشت و بربریت کے خون آشام سایوں نے گھیر لیا تھا مگر وہ ان پیاسی دلدلوں میں رکے بغیر دوڑتا ہی چلا گیا... اثر و رسوخ اور درندگی کی زنجیریں بھی اس کے بڑھتے ہوئے قدم نہیں روک سکیں۔ وقت کی میزان کو اس کے خونخوار حریفوں نے اپنے قدموں میں جھکا لیا تھا مگر وہ ہار مان کر پسپا ہونے والوں میں سے نہیں تھا...

سطر سطر رنگ بدلتی ہوئی ایک لہو رنگ اور دل گداز داستان...

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

میں ڈنمارک سے اپنے پیارے وطن پاکستان لوٹا تھا۔ مجھے کسی کی تلاش تھی۔ یہ تلاش شروع ہونے سے پہلے ہی میرے ساتھ ایک ایسا واقعہ ہوگیا جس نے میری زندگی کو تہ و بالا کر دیا۔ میں نے سرِراہ ایک زخمی کو اٹھا کر اسپتال پہنچایا جسے کوئی گاڑی ٹکر مار کر گزر گئی تھی۔ مقامی پولیس نے مجھے مددگار کے بجائے مجرم ٹھہرایا اور یہیں سے جبر و ناانصافی کا ایسا سلسلہ شروع ہوا جس نے مجھے شکیل داراب اور لالہ نظام جیسے خطرناک لوگوں کے سامنے کھڑا کر دیا۔ یہ لوگ ایک قبضہ گروپ کے سرخیل تھے جو رہائشی کالونیاں بنانے کے لیے چھوٹے زمینداروں اور کاشت کاروں کو ان کی زمینوں سے محروم کر رہا تھا۔ میرے چچا حفیظ سے بھی زبردستی ان کی آبائی زمین ہتھیانے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ چچا کا بیٹا ولید اس جبر کو برداشت نہ کر سکا اور شکیل داراب کے دستِ راست انسپکٹر قیصر چودھری کے سامنے سینہ تان کر کھڑا ہوگیا۔ اس جرأت کی سزا اسے یہ ملی کہ ان کی حویلی کو اس کی ماں اور بہن فائزہ سمیت جلا کر راکھ کر دیا گیا اور وہ خود دہشت گرد قرار پا کر جیل پہنچ گیا۔ انسپکٹر قیصر اور لالہ نظام جیسے سفاک لوگ میرے تعاقب میں تھے، وہ میرے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے۔ میں WWF کا یورپی چیمپئن تھا، وسطی یورپ کے کئی بڑے بڑے گینگسٹر میرے ہاتھوں ذلت اٹھا چکے تھے۔ میں اپنی پچھلی زندگی سے بھاگ آیا تھا لیکن وطن پہنچتے ہی یہ زندگی پھر مجھے آواز دینے لگی تھی۔ میں نے اپنی چچی اور چچا زاد بہن فائزہ کے قاتل لالہ نظام کو بیدردی سے قتل کر دیا۔ انسپکٹر قیصر شدید زخمی ہو کر اسپتال نشیں ہوا۔ شکیل داراب ایک شریف النفس زمیندار کی بیٹی عاشرہ کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑا ہوا تھا۔ وہ اسی عارف نامی نوجوان سے محبت کرتی تھی جسے میں نے زخمی حالت میں اسپتال پہنچانے کی "غلطی" کی تھی۔ میں نے شکیل داراب کی ایک نہایت اہم کمزوری کا سراغ لگایا اور یوں اس پر دباؤ ڈال کر عاشرہ کی جان اس سے چھڑا دی۔ میں یہاں بیزار ہو چکا تھا اور واپس ڈنمارک لوٹ جانے کا تہیہ کر چکا تھا مگر پھر ایک انہونی ہوئی۔ وہ جادوئی حسن رکھنے والی لڑکی مجھے نظر آ گئی جس کی تلاش میں، میں یہاں پہنچا تھا۔ اس کا نام تاجور تھا اور وہ اپنے گاؤں چاند گڑھی میں نہایت پریشان کن حالات کا شکار تھی۔ میں تاجور کے ساتھ گاؤں پہنچا اور ایک ٹریکٹر ڈرائیور کی حیثیت سے اس کے والد کے پاس ملازم ہوگیا۔ انیق بطور مددگار میرے ساتھ تھا۔ مجھے پتا چلا کہ تاجور کا فتنہ صفت منگیتر اسحاق اپنے ہمنواؤں زمیندار عالمگیر اور پیر ولایت کے ساتھ مل کر تاجور اور اس کے والد دین محمد کے گرد گھیرا تنگ کر رہا تھا۔ پیر ولایت نے گاؤں والوں کو باور کرا رکھا تھا کہ اگر تاجور کی شادی اسحاق سے نہ ہوئی تو چاند گڑھی پر آفت آ جائے گی۔ ان لوگوں نے چاند گڑھی کے راست گو امامِ مسجد مولوی فدا کو بھی اپنے ساتھ ملا رکھا تھا۔ تاجور کے گھر میں آئی مہمان نمبردارنی کو کسی نے زخمی کر دیا تھا۔ اس کا الزام بھی تاجور کو دیا جا رہا تھا۔ ایک رات میں نے چہرے پر ڈھاٹا باندھ کر مولوی فدا کا تعاقب کیا۔ وہ ایک ہندو میاں بیوی رام پیاری اور وکرم کے گھر میں داخل ہوئے۔ پہلے تو مجھے یہی غلط فہمی ہوئی کہ شاید مولوی فدا یہاں کسی غلط نیت سے آئے ہیں لیکن پھر حقیقت سامنے آ گئی۔ مولوی فدا ایک خدا ترس بندے کی حیثیت سے یہاں وکرم اور رام پیاری کی مدد کے لیے آئے تھے۔ تاہم اسی دوران میں وکرم اور رام پیاری کے کچھ مخالفین نے ان کے گھر پر ہلا بول دیا۔ ان کا خیال تھا کہ ٹی بی کا شکار وکرم ان کے بچے کی موت کا باعث بنا ہے۔ اس موقع پر مولوی فدا نے دلیری سے وکرم اور رام پیاری کا دفاع کیا، لیکن جب حالات زیادہ بگڑے تو میں نے ہڈیوں کے ڈھانچے وکرم کو کندھے پر لادا اور رام پیاری کو لے کر وہاں سے بھاگ نکلا۔ میں نمبردارنی کو زخمی کرنے والے کا کھوج لگانا چاہتا تھا۔ یہ کام مولوی صاحب کے شاگرد طارق نے کیا تھا۔ وہ تاجور کی جان لینا چاہتا تھا کیونکہ اس کی وجہ سے مولوی صاحب کسی بلیک میلنگ کا شکار ہو رہے تھے۔ طارق سے معلوم ہوا کہ مولوی جی کی بچی زینب ایک عجیب بیماری کا شکار ہے۔ وہ زمیندار عالمگیر کے گھر میں ٹھیک رہتی ہے لیکن جب اسے وہاں سے لایا جائے تو اس کی حالت غیر ہونے لگتی ہے۔ اسی دوران میں ایک خطرناک ڈاکو سجاول نے گاؤں پر حملہ کیا۔ حملے میں عالمگیر کا چھوٹا بھائی مارا گیا۔ میں تاجور کو حملہ آوروں سے بچا کر ایک محفوظ جگہ لے گیا۔ ہم دونوں نے کچھ اچھا وقت گزارا۔ واپس آنے کے بعد میں نے بھیس بدل کر مولوی فدا سے ملاقات کی اور اس نتیجے پر پہنچا کہ عالمگیر وغیرہ نے زینب کو جان بوجھ کر بیمار کر رکھا ہے اور یوں مولوی صاحب کو مجبور کیا جا رہا ہے کہ وہ اپنی بچی کی جان بچانے کے لیے اسحاق کی حمایت کریں۔ میں نے مولوی صاحب کو اس "بلیک میلنگ" سے نکالنے کا عہد کیا مگر اگلی رات مولوی صاحب کو قتل کر دیا گیا۔ میرا شک عالمگیر اور اسحاق وغیرہ پر تھا۔ رات کی تاریکی میں، میں نے عالمگیر اور اسحاق کو کسی خاص مشن پر جاتے دیکھا۔ وہ ایک ویرانے میں پہنچے۔ میں نے ان کا تعاقب کیا اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ عالمگیر، سجاول کے کندھے سے کندھا ملائے بیٹھا تھا۔ میں نے چھپ کر ان کی تصاویر کھینچ لیں۔ پھر میں اقبال کا تعاقب کرتا ہوا یاسر تک جا پہنچا اور چھپ کر ان کی باتیں سنیں۔ وہ بے بس و مظلوم شخص تھا اور چھپ کر ایک قبرستان میں اپنے دن گزار رہا تھا۔ ایک دن میں اور انیق پیر ولایت کے والد پیر سائیں تاجی کے اس ڈیرے پر جا پہنچے جو کسی زمانے میں جل کر خاکستر ہو چکا تھا اور اس سے متعلق متعدد کہانیاں منسوب تھیں۔ اس ڈیرے پر لوگ دم درود وغیرہ کرانے آتے تھے۔ تاجور کی قریبی دوست ریشمی شادی کے بعد دوسرے گاؤں چلی گئی تھی۔ اس کا شوہر شکی مزاج اور تشدد پسند شخص تھا۔ اس نے ریشمی کی زندگی عذاب بنا رکھی تھی۔ ایک دن وہ ایسی غائب ہوئی کہ اس کا شوہر ڈھونڈتا رہ گیا۔ میں تاجور کی خاطر ریشمی کا کھوج لگانے کا بیڑا اٹھا بیٹھا اور ایک الگ ہی دنیا میں جا پہنچا۔ ریشمی ایک ملنگ کا روپ دھار چکی تھی اور آستانے پر اپنی دلکش و سریلی آواز کے باعث پاک بی بی کا درجہ حاصل کر چکی تھی۔ درگاہ پر ہم سب قید تھے لیکن قسمت نے ساتھ دیا اور حالات نے اس تیزی سے کروٹ لی کہ درگاہ کا سب نظام درہم برہم ہوگیا۔ میرے ہاتھوں پردے والی سرکار کا خون ہوگیا۔ آگ و خون کا دریا عبور کر کے ہم بالآخر پہاڑوں کے درمیان تک جا پہنچے مگر یہاں بھی درگاہ کے کارندے ہمارے منتظر تھے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

ماؤ جی کے بے ہوش ہونے سے افراتفری سی مچ گئی تھی۔ سب بھاگ دوڑ کر رہے تھے۔ ایک شخص تو ند منکاتا ہوا آیا۔ اس کے ہاتھ میں پانی کا گلاس تھا۔ پانی پینے سے پہلے ہی ماؤ جی نے کسمسانا شروع کر دیا۔ سجاول سیالکوٹی نے اس کی ہتھیلیوں کی مالش کی۔ ماؤ نے آنکھیں کھول دیں اور بڑبڑانے لگی۔ ''شاہ زیب کو کیا ہوا؟ میرے پُتر کو کیا ہوا؟''

''کچھ نہیں ہوا ماں جی۔ سیڑھیوں سے گر گیا ہے۔'' سجاول نے بہانہ بنایا۔

''ہائے اللہ، اس کا دھیان کیوں نہیں رکھا تم نے؟ کتنی چوٹیں آئی ہیں اسے۔ وہ دینو کہاں مر گیا تھا۔ میں نے اس سے کہا بھی تھا کہ ہر وقت ساتھ رہے میرے پتر کے..... کہاں ہے وہ ڈنگر۔ کہاں ہے؟''

ایک طرف سے دینو آگے بڑھا اور ماؤ سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''ماؤ جی، مم..... میں ذرا گھوڑوں کو پٹھے ڈالنے چلا گیا تھا۔''

ماؤ بھڑک کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''پٹھے ڈالنے چلا گیا تھا، اُلّو کے پٹھے، اگر میرے پتر کو کچھ ہو جاتا تو پھر؟'' ماؤ نے دینو کا گریبان پکڑا اور اس کے سر پر جھانپڑ رسید کرنے لگی۔

سجاول نے بمشکل دینو کی جان چھڑائی۔ ماؤ جی اب میری طرف بڑھی۔ میرے ہونٹوں سے خون رِس رہا تھا اور گریبان بھی پھٹ گیا تھا۔ پیشانی کی چوٹ علیحدہ تھی۔ ماؤ نے کہا۔ ''ہائے میرا پتر کتنی بری طرح گرا ہے..... پر..... سیڑھیوں سے گرنے سے یہ قمیص کیسے پھٹ گئی؟''

''یہ..... یہ اس کو اٹھاتے ہوئے پھٹی ہے۔'' چپٹی ناک والے فخرو نے فوراً بات بنائی۔

''کیسے گر گیا تھا، میرے بچڑے؟'' ماؤ نے اپنی قیمتی شال سے میرا خون پونچھا اور میرا سر چوما۔ وہ بے حد تاسف کا اظہار کر رہی تھی مگر اس کے تاسف میں حقیقت کم اور بناوٹ زیادہ تھی۔

''کچھ نہیں ماؤ جی، میں بس تہ خانے کے اسٹور کی طرف گیا تھا، پاؤں پھسل گیا۔'' میں نے سجاول وغیرہ کی تائید کرتے ہوئے کہا۔

''وہ مرن جوگی سیڑھیاں بہت بھیڑی ہیں۔ ایک واری میں بھی گرتے گرتے بچی تھی۔ پر تم تہ خانے کی طرف کرنے کیا جا رہے تھے؟ تمہیں پتا نہیں وہاں وہ منحوس منڈا ہے۔ ہر وقت بددعائیں دیتا رہتا ہے کالی زبان والا۔ اس خبیث کی تو آواز ہی نہیں سننی چاہیے۔ کیا پتا کب کوئی بددعا اثر کر جائے۔''

پتا نہیں، یہ منحوس منڈا کون تھا۔ اس کو یاد کر کے ماؤ کو ایک بار پھر غصہ آگیا۔ وہ دوبارہ دینو کی طرف بڑھی اور اڑنگا لگا کر اسے زمین پر گرا دیا۔ پھر اس کے سینے پر چڑھ بیٹھی اور ہاتھوں کی مضبوط گرفت سے اس کی سانس روکنے کی کوشش کرنے لگی۔ لیکن یہ کوشش کوئی اتنی ضروری بھی نہیں تھی۔ ماؤ کے وزن سے ہی دینو کی سانس بند ہو سکتی تھی۔ سجاول نے ایک بار پھر سمجھا بجھا کر ماؤ کو دینو کے سینے سے اتارا۔ وہ اس کی پسلیوں پر ایک زوردار ٹھوکر مار کر اور اس کی ماں بہن کو کوستی ہوئی میری طرف آگئی۔

مجھے اپنے بازو کے کلاوے میں لے کر وہ برآمدے میں پہنچی اور پھر اپنے کمرے میں لے آئی اور رونی صورت بنا کر بولی۔ ''اگر تجھے کچھ ہو جاتا تو میں نے کوٹھے سے چھال مار کر جان دے دینی تھی اپنی۔''

اتنی دیر میں وہ آفت کی پرکالہ، مہناز عرف مانی بھی پہنچ گئی۔ اس کے اندر پتا نہیں کیا بھڑکا رہتا تھا کہ سخت سردی میں بھی وہ عام سے کپڑوں میں نظر آتی تھی، اس وقت بھی اس کے بازو کندھوں تک عریاں تھے۔ خرانٹ دادی نے چالاک پوتی کو میرے زخمی ہونے کی روداد سنائی۔ خرانٹ اور چالاک ہونے کے باوجود وہ دونوں اس بات پر یقین کر رہی تھیں کہ میں اس تہ خانے میں جانے کی کوشش میں گرا ہوں جہاں کوئی منحوس منڈا بند ہے، ایسا منڈا جو ہر آنے جانے والے پر چلاتا ہے اور بددعائیں دیتا ہے۔ دادی پوتی نے مل کر میری چوٹوں پر مرہم لگایا۔ پوتی نے نظر بچا کر میرے سینے اور پیٹ کو ٹٹولا اور بولی۔ ''کہیں اور تو چوٹ نہیں آئی جانو؟''

میں نے مزید تشخیص سے بچنے کے لیے فوراً نفی میں سر ہلایا۔

وہ زیرِلب مسکرانے لگی۔ بہرحال مجھے اس کی آنکھوں میں شک کی ہلکی سی جھلک نظر آرہی تھی۔ اس کی وجہ شاید میرا پھٹا ہوا گریبان تھا۔ تاہم اس شک نے کسی طرح کے سوال و جواب کی شکل اختیار نہیں کی۔

کوئی دو گھنٹے بعد میں ایک بار پھر سجاول کے حضور پیش تھا۔ ہم کمرے کے اندر تھے اور دروازہ بند تھا۔ سجاول کی آنکھوں میں پھر خون اترا ہوا تھا۔ اس نے میری آنکھوں میں جھانکا اور خوفناک لہجے میں بولا۔ ''تم نے کیا سمجھا ہوا تھا

ہمیں۔ نرے گدھے اور اُلو کے پٹھے ہیں ہم؟ کچھ پتا نہیں چلے گا کہ تم کس باغ کی مولی ہو؟''

''میں معافی چاہتا ہوں۔ مجھے اپنے اور تاجور کے بچاؤ کے لیے یہ جھوٹ بولنے پڑے۔ میری نیت بری نہیں تھی۔''

''ہاں، تمہاری نیت تو بری ہو ہی نہیں سکتی۔ اچھی نیت کے ساتھ ہی تم چاند گڑھی میں بہروپیے بن کر آئے۔ اچھی نیت سے ہی اس کڑی سے عشق پیچا لڑایا۔ اچھی نیت سے ہی اس کو بھگا کر اس سے شادی کھڑکائی؟ اور آٹھ دس دن پہلے اچھی نیت سے ہی میرے بندوں کو کلاشنکوف کے برسٹ مار کر ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔''

''اپنی اس آخری غلطی پر تو میں آپ سے پہلے بھی معافی مانگ چکا ہوں، سجاول صاحب۔ باقی غلطیاں آپ کے سامنے ہیں۔ اگر آپ معاف کر سکتے ہیں تو کر دیں۔ آپ کا مجھ پر بڑا احسان ہوگا۔''

وہ قہرناک نظروں سے مجھے دیکھتا رہا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں بلا کی تپش تھی۔ وہ واقعی ایک قاتل، ڈکیت کی آنکھیں تھیں۔ اس کی نگاہیں کسی بھی شخص پر مرکوز ہو کر اس کا پتا پانی کر سکتی تھیں۔ وہ جیسے تصور ہی تصور میں مجھے کچا چبا رہا تھا۔ آخر ایک گہری سانس لے کر اس نے اپنے صندوق جیسے سینے کو کچھ اور چوڑا کیا پھر اپنی تیکھی مونچھوں کو انگلی سے سہلا کر بولا۔ ''اس فساد کی جڑ سے کہاں اور کب نکاح کیا تم نے؟''

فساد کی جڑ سے اس کی مراد یقیناً تاجور ہی تھی۔ لازماً سجاول سیالکوٹی جانتا تھا یا اسے بتا دیا گیا تھا کہ چاند گڑھی میں تاجور کی وجہ سے کیا ٹین شین پھیلی رہی ہے...... اور عالمگیر اپنے یار اسحاق کی اس منگ کو اسحاق کی گود میں ڈالنے کے لیے کیا کیا جتن کرتا رہا ہے۔

میں سجاول کے اس سوال کا جواب پہلے ہی سوچ چکا تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ ملنگی ڈیرے میں پہنچنے سے پہلے چاچے عبدالرزاق نے خود اپنی موجودگی میں ہمارا نکاح کروایا تھا۔ وہ ہمیں ایک گاؤں کے امام صاحب کے پاس لے کر گئے تھے اور وہاں ساری کارروائی ہوئی تھی۔ چاچا رزاق چونکہ اب اس دنیا میں نہیں تھے لہٰذا اس بات کی تصدیق نہیں ہو سکتی تھی)

سجاول کی باتوں سے میں نے اندازہ لگایا کہ اسے اس بات سے کچھ زیادہ دلچسپی نہیں کہ میں نے تاجور سے کب اور کیسے نکاح کیا ہے اور کیا بھی ہے یا نہیں؟ ہاں وہ اس بات پر ضرور یقین کیے ہوئے تھا کہ میں تاجور سے جسمانی تعلقات رکھتا ہوں۔ شاید اس کی سمجھ میں یہ بات آ ہی نہیں سکتی تھی کہ تاجور جیسی لڑکی کے ساتھ ایک ہی کمرے میں راتیں گزارنے کے باوجود اس سے دور رہا جا سکتا ہے۔ بہرحال وہ اس سارے معاملے کو نظرانداز کر رہا تھا۔ اس کی ساری توجہ اس بات پر تھی کہ اس کی بیمار ماں کو کسی طرح کا کوئی ذہنی صدمہ نہ پہنچے۔ وہ اس سلسلے میں میری چھوٹی سے چھوٹی غلطی معاف کرنے کو تیار نہیں تھا۔ اسے زیادہ طیش بھی اسی بات پر تھا کہ میرا جھوٹ سامنے آنے پر وہ اپنے غصے کو سنبھال نہ سکا اور مجھے پٹوانا شروع کر دیا۔ میری اس پٹائی کی وجہ سے اس کی ماں کو شدید دھچکا لگا اور وہ بے ہوش ہو گئی۔

ایک طویل مکالمے کے بعد وہ دوٹوک انداز میں بولا۔ ''ہمیں اندھا مت سمجھو۔ سب کچھ سمجھ لیا ہے ہم نے اور جان بھی لیا ہے۔ تم دین محمد کی اس کڑی کے ساتھ ملنگی ڈیرے گئے تھے، بڈھے رزاق کی کڑی ریشمی کو وہاں سے نکالنے کے لیے۔ رزاق بھی تمہارے ساتھ ہی تھا۔ یہ بات ماننا پڑتی ہے کہ تم نے ڈیرے پر دلیری دکھائی۔ تم نے ڈیرے کے کرتا دھرتا پردے والی سرکار کو مارا اور ملنگوں کا گھیرا توڑ کر وہاں سے بھاگ نکلے۔ لگتا ہے کہ مار دھاڑ کا کافی تجربہ ہے تمہیں۔ اور شاید تم وہ بھی نہیں ہو جو نظر آتے ہو......'' سجاول کی مردم شناس نگاہیں جیسے میرے اندر بہت دور تک دیکھ رہی تھیں۔

وہ پہلو بدل کر کہنے لگا۔ ''دیکھو، مجھے سچ سچ بتاؤ، تم کون ہو؟ کہاں سے آئے ہو، اور اس کڑی تاجور کے پیچھے کیسے پڑے تم۔ اور دیکھو، مجھ سے جھوٹ مت بولنا۔ میں پہلے ہی بہت تپا ہوا ہوں۔ یہاں کوئی پنگا شنگا نہ ہو جائے۔''

میں اب تک اچھی طرح جان گیا تھا کہ سجاول سیالکوٹی کوئی معمولی بدمعاش نہیں ہے۔ ایک جہاندیدہ اور نہایت خطرناک ڈکیت ہے اگر میں نہ بتاؤں گا تو وہ خود بہت کچھ معلوم کر لے گا۔ اس لیے بہتر تھا کہ اسے کچھ نہ کچھ بتا دیا جائے۔ میں نے کچھ باتوں کو صیغۂ راز میں رکھا اور کچھ باتیں اسے بتا دیں۔ جو باتیں میں نے اسے بتائیں ان میں سے کچھ تو وہ یقیناً اپنے اس بندے کی زبانی جان چکا تھا جس نے مجھے یہاں گونگے ڈرائیور کی حیثیت سے پہچانا تھا۔ وہ میرے لب و لہجے سے تو بہت پہلے ہی چونک چکا تھا، اب میں نے اسے واضح بتا دیا کہ میں ڈنمارک کا رہنے والا ہوں۔ کوئی ساڑھے تین چار سال پہلے اتفاقاً میرا پاکستان

آتا ہوا۔ یہاں لاہور کے شاہی قلعے میں میری ملاقات تاجور سے ہوئی۔ کچھ اوباش لڑکے اس کے پیچھے تھے۔ میں نے اس کی مدد کی اور اس کے بعد ہم دونوں نے لاہور کی مختلف جگہوں پر دو ملاقاتیں کیں۔ یہ ملاقاتیں مجھے واپس ڈنمارک جا کر بھی بھول نہ پائیں۔ پھر ڈنمارک میں حالات کچھ ایسے ہوئے کہ مجھے وہاں سے شفٹ ہونا پڑا۔ میں نے سوچا کہ جب مجھے شفٹ ہی ہونا ہے تو پھر کیوں نہ پاکستان جاؤں جو میری جنم بھومی ہے اور جہاں تاجور سے میری ملاقات ہو سکتی ہے۔''

سجاول بولا۔ ''یعنی تمہاری یہ بات بھی جھوٹ تھی کہ تم ولایت پلٹ جٹ پتر ہو، اپنی بے آباد زمین آباد کرنے کے لیے پاکستان آئے ہو۔''

''میں مانتا ہوں، یہ بے آباد زمین آباد کرنے والی بات تو واقعی غلط تھی۔'' میں نے اعتراف کیا۔ ''لیکن اب میں آپ کو جو کچھ بتا رہا ہوں، وہ حلفاً سچ ہے اور اگر یہ غلط ثابت ہوا تو میں سزا کا حق دار ہوں گا۔''

میں واقعی اسے سچ بتا رہا تھا، ہاں یہ بات ضرور تھی کہ میں کچھ باتیں حذف کر رہا تھا۔ مثلاً یہ کہ میں نے اپنے سگے چچا حفیظ اور ان کے گھر پر گزرنے والی قیامت کا ذکر نہیں کیا۔ نہ ہی اس قیامت کے ذمے داروں یعنی انسپکٹر قیصر چودھری، لالہ نظام اور شکیل داراب وغیرہ کے بارے میں کچھ بتایا۔ اگر میں ان لوگوں کے بارے میں بتاتا تو پھر میرا شمار سجاول سیالکوٹی کے دشمنوں میں ہونے لگتا (سجاول سیالکوٹی اور لالہ وریام وغیرہ کا باہمی تعلق ثابت ہو چکا تھا۔ میں نے ان لوگوں کو راگ رنگ کی محفل میں اکٹھے، جام لنڈھاتے دیکھا تھا) میں نے سجاول کو صاف بتا دیا کہ یہ تاجور کی محبت ہی تھی جس کی وجہ سے میں زمیندار دین محمد کا گونگا کاماں بنا اور اس کے بعد بھی میں نے جو جو کچھ کیا ہے، وہ اسی عشق محبت کی وجہ سے ہی تھا۔

سجاول نے جلتی نظروں سے مجھے دیکھا اور مونچھوں کو سہلا کر بولا۔ ''لگتا ہے تمہارا شجرہ پیچھے جا کر، مرزے یا رانجھے شانجھے سے ملتا ہے۔ مجھے یہ سب کچھ سن کر تم پر تاؤ چڑھ رہا ہے۔ زنانیوں کے لیے ترسنا اور ان کے پیچھے پھرنا، جی دار مردوں کا کام نہیں ہوتا۔ جو ہاتھ آنے والی نہ ہو، اس پر سو بار لعنت۔ اور جو ہاتھ آ جائے اس کو رکھا اپنے پاس ہفتہ دس دن اور پھر فارغ کر دیا۔''

وہ ایک ڈاکو تھا۔ اس کی اپنی سوچ تھی۔ میں اس کی سوچ پہ ''سو بار'' نفرین بھیجنے کے سوا اور کیا کر سکتا تھا۔ اسے کیا پتا تھا کہ وہ جس لڑکی کا ذکر کر رہا ہے، وہ میرے لیے کیا حیثیت رکھتی ہے۔ کس طرح میری رگِ جاں میں بس چکی ہے۔ لیکن اس موقع پر میں نے اسے جواب دینا مناسب نہیں سمجھا۔ میں اس کے ساتھ تعلقات زیادہ خراب کرنے کا متحمل نہیں تھا اور شکر کا مقام تھا کہ چاند گڑھی میں میری باقی کارروائیاں ''یاسر بھائی'' کے نام سے ہی جانی گئی تھیں۔ ان کارروائیوں کا سارا کریڈٹ اور اس کا سارا وبال بھی ''یاسر بھائی'' ہی کی طرف جاتا تھا۔ سجاول کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں تھی کہ چند ہفتے پہلے اس کی سجائی ہوئی محفلِ رقص میں اس کی اور عالمگیر کی تصویریں اتار کر عالمگیر کو اپنے رشتے دار ٹوانہ سے لڑانے والا میں ہوں۔ اسی طرح میری دیگر کارروائیاں بھی ہرگز اس کے علم میں نہیں تھیں۔ رقاصہ جاناں میری ہی وجہ سے سجاول کے ڈشکروں کی دسترس سے نکلی تھی۔ میری ہی وجہ سے بچی زینب کی پُراسرار بیماری کا راز کھلا تھا اور چاند گڑھی کے لوگوں نے پیر ولایت اور عالمگیر پر لعنت کے ڈونگرے برسائے تھے۔ یاسر کی بہن کے لیے سجاول کے مسلح ساتھیوں سے لڑنے والا بھی میں ہی تھا۔ اس طرح کے اور بھی واقعات تھے جن پر ''یاسر بھائی'' کی چھاپ لگ چکی تھی۔

سجاول نے سگریٹ کو مٹھی میں دبا کر ایک طویل کش لیا اور میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔ ''چلو ٹھیک ہے۔ اس کڑی کے ساتھ موج میلہ کرو...... لیکن یاد رکھو کہ یہ عالمگیر کے یار کی بھی منگ اور معشوق ہے۔ اگر عالمگیر نے اسے مانگا تو تمہیں اس کو واپس دینا پڑے گا، کیا سمجھے؟''

سجاول کی سوچ اس معاملے میں بہت گھٹیا تھی۔ وہ تاجور کا ذکر ایسے کر رہا تھا جیسے وہ کوئی زندہ انسان نہیں، موٹر سائیکل، ٹیلی ویژن یا موبائل قسم کی شے ہے، جسے استعمال کرنے کے بعد کسی دوسرے خواہش مند کے حوالے کیا جا سکتا ہے۔ بہرطور میں اس موقع پر بحث مباحثہ کرتا تو یہ میرے بے وقوفی ہوتی۔

''میں جو کہہ رہا ہوں، تم سن رہے ہو ناں؟'' اس نے ذرا بلند آواز میں پوچھا۔

''جی سن رہا ہوں۔'' میں نے کہا۔

اس نے میری خاموشی کو میری نیم رضامندی سمجھا اور موضوع بدلتے ہوئے بولا۔ ''وہاں ڈنمارک سے کیوں بھاگے ہو تم؟ کیا کوئی پھڈا اشڈا اٹھا وہاں؟''

سجاول کے سوال نے مجھے جھنجوڑ سا دیا لیکن میں نے اپنے جذبات کو تاثرات کی صورت میں اپنے چہرے تک

نہیں آنے دیا۔ خود کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ ''جی ہاں، ایک پاکستانی کی خاطر مجھے وہاں چند لوگوں سے لڑنا پڑا، جس کی وجہ سے دشمنی بڑھ گئی۔ بات بہت آگے تک چلی گئی۔ میرے ماں باپ کو خطرہ تھا کہ میں قتل ہو جاؤں گا یا کسی کو قتل کر کے بجلی والی کرسی پر بیٹھ جاؤں گا۔ انہوں نے ہاتھ پاؤں جوڑ کر مجھے پاکستان بھیج دیا۔''

وہ بولا۔ ''مجھے لگتا ہے کہ تم بات کو بہت گھٹا کر بتا رہے ہو۔ تم نے وہاں باہر کے ملک میں، شاید بہت مارا ماری کی زندگی گزاری ہے۔''

وہ کہہ تو ٹھیک رہا تھا۔ میں نے جس واقعے کا ذکر کیا تھا، وہ کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا۔ اس نے نہ صرف میری بلکہ بہت سے لوگوں کی زندگیاں بدل ڈالی تھیں۔

وہ مجھے سوچ میں دیکھ کر بولا۔ ''چلو، خیر چھوڑو...... یہ بتاؤ وہ پاکستانی کون تھا جس کے لیے تم نے دشمنی مول لی؟''

''میں اسے نہیں جانتا تھا۔ بس میں نے بازار سے گزرتے ہوئے، اسے کچھ انڈین غنڈوں کے ہاتھوں مار کھاتے دیکھا، ان میں دو گورے بھی شامل تھے۔ میں نے اس پاکستانی لڑکے کو چھڑانے کی بڑی کوشش کی مگر جب ان لوگوں نے حد کر دی تو میں ان سے لڑ پڑا۔ بعد میں پتا چلا کہ وہ تو ایک بڑے گینگ کے لوگ ہیں۔ ٹیکساس کا ایک خطرناک گورا اس گینگ کا کرتا دھرتا تھا۔ بس پھر بات چل نکلی......''

شاید سجاول اس سلسلے میں مجھ سے مزید باز پرس کرتا اور مجھے کچھ نہ کچھ تفصیل اسے بتانا پڑتی کہ ماؤ کی شکل نظر آ گئی۔ وہ جھومتی ہوئی میری طرف آ رہی تھی۔ سجاول نے دبی آواز میں کہا۔ ''میں ایک بار پھر تمہیں بتا رہا ہوں، اچھی طرح کان کھول کر سن لو...... ماں جی جیسا کہیں، تمہیں ویسا ہی کرنا ہوگا۔ نہیں تو تمہارے ساتھ یہاں وہ کچھ ہو جائے گا جو تمہارے خیال میں بھی نہ ہو۔''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ماؤ نے آتے ساتھ ہی حسبِ معمول میری بلائیں لیں۔ ایک امام ضامن نما چیز اس نے چند دن پہلے میری کلائی پر باندھی تھی، آج وہ اس نے اتار لی اور اس کی جگہ ایک اور بندھن مجھے باندھ دیا۔ یہ بھی بظاہر امام ضامن ہی دکھائی دیتا تھا۔ وہ بولی۔ ''شاہ زیب! تم کمزور ہوتے جا رہے ہو۔ کھاؤ پیو اور جان بناؤ۔ مرد کو ہٹا کٹا ہونا چاہیے بلکہ میں آج ہی تمہارے لیے بھانڈا بنواتی ہوں۔ مونگی اور چنے کی پسی ہوئی دال، گھی میں بھون کر اور مٹھا ڈال کر اس میں بادام پستہ اور کھوپرا ڈالا جائے تو بڑا شاندار بھانڈا بنتا ہے۔ تم نے زیادہ وقت ولایت میں گزارا ہے، تمہیں ان دیسی چیزوں کا زیادہ پتا نہیں ہوگا۔''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ مجھے لے کر اپنے کمرے میں آ گئی اور دیر تک باتیں کرتی رہی۔ یہ مختلف خوراکوں اور کھابوں کی باتیں ہی تھیں۔ اس کی باتوں سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ تاجور کی موجودہ حالت کے بارے میں جان چکی ہے۔ دایہ اختری کے ذریعے اسے پتا چل گیا ہے کہ تاجور ابھی نارمل ہے (یعنی وہ امید سے نہیں) مجھے یہ بھی پتا چلا کہ ماؤ کو موجودہ صورتِ حال پسند نہیں۔ وہ چاہتی ہے کہ تاجور جلد سے جلد امید سے ہو جائے۔ وہ میرے لیے جو ''اچھی خوراک وغیرہ'' کا ذکر کر رہی تھی، وہ بھی غالباً اسی پس منظر میں تھا۔ وہ عجیب خبطی عورت تھی۔ گاہے بگاہے منہ میں کچھ بڑبڑاتی بھی تھی، شاید کچھ پڑھتی تھی۔ جھاڑ پھونک پر اس کا اعتقاد بہت زیادہ تھا۔ میرے کانوں میں اس کی وہ گفتگو گونجنے لگی جو میں نے تین چار دن پہلے دروازے کی اوٹ سے سنی تھی۔ اس نے کسی پیر وسائیں کا ذکر کیا تھا اور اختری سے کہا تھا کہ شاہ زیب کی یہ بیوی حمل کے دوران میں بیمار ہو کر مرے گی اور اس کے بعد اس کی شادی ہماری مانی سے ہوگی۔

ایسے لوگوں کا ذہن جس طرف چل نکلتا ہے...... بس چل نکلتا ہے۔ اب شاید وہ یہ سوچ رہی تھی کہ تاجور جلد از جلد امید سے ہو۔ اس کے بعد (ماؤ کے منہ میں خاک) وہ مرے اور پھر اس کی پوتی کی شادی مجھ سے ہو۔ وہ پوتی جو کسی بازاری عورت کی بیٹی تھی اور ماؤ کے شرابی بیٹے اعظم کی حماقت سے اس ڈکیت خاندان کی رکن بن گئی تھی۔

☆☆☆

اگلے چار دن میں پہلوان حشمت راہی سے میری دو ملاقاتیں مزید ہوئیں۔ یہ ملاقاتیں میں نے اپنے کندھے کی چوٹ کے بہانے سے کیں۔ پہلوان یہاں آرام سے تھا۔ اسے ضروری سہولتیں حاصل تھیں لیکن ظاہر ہے کہ میری اور تاجور کی طرح اس کی حیثیت بھی یہاں قیدی ہی کی تھی۔ پہلوان سے مجھے چاند گڑھی کے حالات کے بارے میں مزید آگہی حاصل ہوئی۔ اس نے بتایا کہ سجاول کے بندے اب بھی علاقے میں یاسر کو ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔ انہیں اس بات پر بہت طیش ہے کہ یاسر نے خفیہ طور پر سجاول اور عالمگیر کی تصویریں اتاریں اور ان کے ذریعے عالمگیر کو اس کے رشتے داروں سے لڑا کر جیل پہنچایا۔

حشمت نے کہا۔ ''اللہ بخشے مولوی فدا کے قتل والا

معاملہ بھی ابھی تک لوگوں کو بہت زیادہ پریشان کرت ہے۔ یہ بات تو اب کھل ہی گئی ہے کہ مولوی جی کی بچی زینب کو عالمگیر نے ہی کوئی خطرناک کشتا کھلا کھلا کر بیمار کر رکھا تھا اس لیے سب کو اس بات کا شک ہے کہ مولوی جی کو مارنے میں بھی عالمگیر اور اسحاق وغیرہ کا ہاتھ ہے، مگر ثبوت کوئی نہیں۔ وہ مؤذن جس نے مولوی جی کو مسجد کی سیڑھیوں سے دھکا دیا تھا، وہ بھی اب تک لاپتا ہے۔ کئی لوگ تو یہ بھی کہوت ہیں کہ لڑائی جھگڑے والے معاملے میں عالمگیر کی ضمانت جلد ہو جاوے گی اور وہ واپس چاند گڑھی آ کر اپنے مخالفوں کا شکنجہ کسنا شروع کر دیوے گا۔ مجھے لگت ہے کہ ان حالات میں اگر کوئی چاند گڑھی والوں کی مدد کر سکت ہے تو وہ یاسر ہی ہے۔ لیکن وہ ابھی کھل کر سامنے ہی نہیں آ رہا۔''

میں نے سوچا، وہ کھل کر سامنے کیا آئے گا، وہ تو نشے میں ڈوب کر زندہ لاش کی طرح ایک تہ خانے میں پڑا ہے۔ جاناں کی اطلاع پر پیپل والی گاؤں میں پہنچ کر اس کی بہن کو میں نے ہی اغوا ہونے سے بچایا تھا۔ بہرحال اس کا کریڈٹ بھی یاسر کو ہی ملا تھا۔ پرسوں، پہلوان حشمت نے مجھے بتایا تھا کہ یاسر کے گھر والے اپنے گاؤں سے راتوں رات کہیں چلے گئے ہیں۔ ان کے گھر اور ڈیرے پر تالے پڑے ہیں۔

یاسر کی بہن کے اغوا کے موقع پر میرے اور سجاول کے بندوں میں جو خونی لڑائی ہوئی تھی، وہ ایک بار پھر میرے ذہن میں تازہ ہو گئی۔ سارے مناظر نگاہوں میں گھوم گئے۔ ایک حملہ آور کی کٹی ہوئی کلائی، ایک شخص کے سر میں دھنسی ہوئی کلہاڑی...... اس لڑائی میں سجاول کے کم و بیش پانچ ساتھی جان سے گئے تھے اگر کہیں پاس والے کمرے میں موجود سجاول سیالکوٹی کو علم ہو جاتا کہ لڑکی کے اغوا کی کوشش کو ناکام بنانے والا اور اس کے بندوں کو موت کے گھاٹ اتارنے والا میں ہی تھا تو شاید وہ اپنی ماں کے مفادات کو بھی نظرانداز کر دیتا اور مجھے سفاکی سے قتل کر ڈالتا۔ اس وقت ان لوگوں کی بے خبری میری اور تاجور کی زندگی کی ضمانت بنی ہوئی تھی۔

پہلوان حشمت پہلے چند روز تو کافی غمزدہ و گم صم رہا مگر اب کچھ بحال نظر آ رہا تھا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ وہ جان گیا تھا...... وہ یہاں اکیلا ہی پھنسا ہوا نہیں ہے، میں اور تاجور بھی موجود ہیں۔ دوسرے اسے یہاں ہڈی جوڑنے کا ایک کیس بھی مل گیا تھا اور وڈے سردار اعظم نے کہا تھا کہ اگر اس نے اس کے خاص مریض کا صحیح علاج کر دیا تو وہ اس کو انعام دے گا اور ہو سکتا ہے کہ اسے کچھ عرصے بعد چھوڑ بھی دیا جائے۔ (میں شاید بتانا بھول گیا کہ جب چند روز پہلے پہلوان حشمت اور جاناں کو یہاں لایا گیا تھا تو دونوں کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی تھی)

پہلوان حشمت نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔ ''ہم نے سنا تھا کہ قید کے دنوں میں لوگوں نے بڑی بڑی کتابیں لکھی ہیں اور شاعری کی ہے۔ اب یہاں پھنسا ہوں تو یہ بات درست لگت ہے۔ یہ دیکھو کیسے زبردست شعر جوڑے ہیں ہم نے۔''

اس نے ایک کاغذ پر لکھے ہوئے شعر مجھے دکھائے۔ وزن تو پتا نہیں کہ تھا یا نہیں لیکن املے کی غلطیاں شاندار تھیں۔

ہم لوگوں کے کام آتے ہیں اور پھنستے ہیں
اس دردناک صورتِ حال پر لوگ ہنستے ہیں
گاؤں اور گاؤں والے بہت دور رہ گئے

پھر یادوں کے ناغ کیوں ہم کو ڈستے ہیں
عشق آسان نہیں تم باض آ جاؤ اے راہی
سیانے لوگ اکسر ہم کو یہ بات دستے ہیں

پہلوان کی شاعری پر اعتراض تو اور بھی دکھائی دے رہے تھے، میں نے بس اتنا کہا۔ ''پہلوان جی یہ جو آخر میں آپ نے ''دستے ہیں'' لکھا ہے، یہ کیا ہے؟''

پہلوان نے ترنخ سے کہا۔ ''دستے ہیں...... کا مطلب ہووت ہے...... بتاتے ہیں۔''

''لیکن یہ تو پنجابی کا لفظ ہے؟''

''پنجاب کون سا غیر ہے۔ یہ تو ہمارے سارے صوبوں کا بھائی ہے اور مشکل کے وقت بڑے بھائی سے ایک آدھ لفظ تو لیا ہی جا سکت ہے۔''

''یہ تو بڑے پتے کی بات کہی ہے آپ نے۔'' میں نے عقیدت سے کہا۔

''باتیں تو میں ہمیشہ ہی پتے کی کرت ہوں لیکن اس سے پہلے تم سنتے ہی نہیں تھے۔ گونگے بہرے تھے نا تم۔'' پہلوان نے طنزیہ انداز میں کہا۔

''بات صرف اتنی تھی پہلوان جی کہ میری اردو ٹھیک نہیں ہے۔ اب آپ سن ہی رہے ہیں میں کس طرح بولتا ہوں۔ زبان کی ٹانگ توڑتے ہوئے مجھے بڑی تکلیف ہوتی ہے اس لیے میں نے گونگا بننا مناسب سمجھا تھا۔''

''صرف یہی معاملہ ہوتا تو کوئی بات نا ہیں تھی لیکن

معاملہ اس سے بہت آگے کا ہے۔ تم نے دین محمد اور ان کے گھر والوں کو دھوکا دیا۔ ہمارے گاؤں کی سیدھی سادی لڑکی پر ڈورے ڈالنے کی کوشش کی۔ یہ تو وہی بات ہوئی نا کہ جس تھالی میں کھاؤ اسی میں بینگن رکھو۔''

''پہلوان جی، خاموش محبت کرنا گناہ تو نہیں۔ میں نے بھی خاموش بلکہ گونگی محبت کی تھی لیکن حالات نے اس محبت کو زبان دے دی۔ اب اس میں میرا کیا قصور ہے؟''

''تمہاری اس خاموش محبت کا جو خمیازہ دین محمد وغیرہ کو بھگتنا پڑے گا، یہ کچھ ہم ہی جانتے ہیں۔ بہت بڑی مصیبت کھڑی کر دی ہے تم نے ان لوگوں کے لیے۔''

پہلوان نے اپنا مٹکا سا سر اختلافی انداز میں ہلایا۔

میں نے کہا۔''پہلوان جی، آپ کو پتا ہی ہے، میری اردو کس طرح کی ہے۔ یہ خمیازہ کیا ہوتا ہے؟''

''یہ جنازے کا چھوٹا بھائی ہے۔'' پہلوان نے برا سا منہ بنا کر کہا۔

پہلوان کی باتیں دلچسپ ہوتی تھیں۔ اس کے پاس مزید بیٹھنے...... اور حالات جاننے کو دل چاہ رہا تھا مگر تاجور کی بھی فکر تھی۔ میری غیر موجودگی میں وہ بے چین ہونے لگتی تھی۔ حالانکہ یہاں موجود عورتوں میں سے کوئی نہ کوئی اس کے پاس موجود رہتی تھی۔ میں پہلوان سے رخصت ہو کر اپنے کمرے کی طرف روانہ ہوا۔ اب اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ سرد کہرا گرد و پیش کو ڈھانپ رہا تھا۔ اس کہرے میں لالٹینوں اور گیس لیمپس کی روشنی دھندلائی ہوئی تھی۔ احاطے کے اردگرد درختوں کی بلندی پر چوکس نشانہ باز اپنی چھوٹی چھوٹی مچانوں پر موجود تھے۔ یہ مچانیں کسی وقت بھی خالی نہیں ہوتی تھیں۔

میں ایک کمرے کے سامنے سے گزر رہا تھا جب اچانک کمرے کا دروازہ کھلا اور ماؤ کی شعلہ صفت پوتی مانی مجھے بازو سے پکڑ کر کمرے کی طرف کھینچنے لگی۔ ''یا اللہ خیر'' میں نے دل ہی دل میں کہا۔

مجھے کمرے میں لا کر اس نے دروازہ بھیڑ دیا۔ یہاں وہ اکیلی نہیں تھی۔ جاناں بھی موجود تھی۔ کمرے میں کوئلے دہک رہے تھے اور فضا گرم تھی۔ مانی نے حسبِ معمول بڑا ہلکا لباس پہن رکھا تھا۔ دوپٹے کو کس کر کمرے سے باندھا ہوا تھا۔ اس کے ڈیانا کٹ بالوں کے نیچے اس کے دہکتے عارضوں پر نقرئی جھمکے جھول رہے تھے۔ مجھے اس کے پاؤں میں گھنگرو نظر آئے۔ جاناں کے پاؤں میں بھی گھنگرو تھے۔ جاناں سویٹر اور شلوار قمیص میں تھی۔ شال اس نے بھی اتار کر ایک طرف رکھی ہوئی تھی۔ پتا چلا کہ مانی یہاں کمرے میں جاناں سے رقص کے کچھ آؤ بھاؤ سیکھ رہی ہے (حالانکہ جاناں خود بھی کوئی ایسی ماہر رقاصہ نہیں تھی)

مانی نے مجھ سے کہا۔''یہ مجھے اچھی سہیلی دی ہے تم نے ڈیئر۔ سہیلی بھی اور ڈانس کی پارٹنر بھی۔ میں نے اس سے کافی کچھ سیکھ لیا ہے...... یہ دیکھو۔''

اس کے ساتھ ہی اس نے اپنے تلوے زور زور سے فرش پر مار کر ''تھا تھیا تھا'' وغیرہ شروع کر دیا۔ گاہے بگاہے وہ گول گول گھومنے بھی لگی۔ اس کے بوائے کٹ بال اس کی پیشانی پر بکھر گئے۔

کچھ دیر بعد وہ رک گئی اور سوالیہ نظروں سے جاناں کی طرف دیکھا۔

جاناں بالکل گم صم تھی۔ اس نے بس اثبات میں سر ہلایا۔ مطلب یہ تھا کہ مانی نے درست اسٹیپ لیے ہیں۔

''چلو، اب آگے بتاؤ۔'' مانی نے اٹھلا کر کہا۔

جاناں جھجک رہی تھی۔ ہولے سے بولی۔''نہیں۔ باقی کل......''

''نہیں، سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وقت کم ہے اور مقابلہ سخت۔ کسی کو کچھ کر کے دکھانا ہے۔'' اس نے میری طرف دیکھ کر معنی خیز لہجے میں کہا۔

اس کے مجبور کرنے پر جاناں بادلِ ناخواستہ ہولے ہولے پاؤں کو حرکت دینے لگی۔ جاناں قدرے دراز قد اور دبلے پتلے جسم کی تھی۔ بہرحال نسوانی کشش اس میں واضح طور پر موجود تھی۔ اس کے خوب صورت بال رقص کے زاویوں کے ساتھ لہرا رہے تھے۔ وہ بے چاری پولیس کے ہتھے چڑھ کر پاشا جیسے عیاش تک پہنچی تھی اور پھر وہاں سے آگے سجاول جیسے خطرناک ڈکیت کی محفل میں پہنچا دی گئی تھی۔ اب وہ نہ ٹی وی آرٹسٹ رہی تھی، نہ ماڈل گرل بلکہ پیشہ ور لڑکیوں والی حیثیت اختیار کر گئی تھی۔

اچانک دروازہ زور سے کھلا۔ جاناں سہم کر دیوار سے لگ گئی۔ میں اور مانی بھی ٹھٹک کر دروازے کی طرف دیکھنے لگے۔ وہاں شرابی اعظم کھڑا نظر آیا۔ کہنے کو تو وہ یہاں کا وڈا سردار تھا لیکن اس کے وڈے پن کو دل سے کوئی نہیں مانتا تھا۔ اس کی نگاہ سیدھی جاناں پر ہی پڑی۔ اس نگاہ میں حرص و ہوس کے سوا اور کچھ بھی نہیں تھا۔ ایک لمحے کے لیے یوں لگا جیسے یہ عورت باز شخص ہمیں نظرانداز کر کے سیدھا جاناں پر جا پڑے گا مگر پھر اس نے کمرے میں میری اور مانی کی موجودگی کو محسوس کیا۔

''تم یہاں؟'' مانی نے باپ کو بے رخی سے مخاطب کر کے پوچھا۔

''اور یہی بات میں تم سے پوچھ رہا ہوں۔ تم یہاں اس کمینی کے ساتھ کیا کر رہی ہو؟'' اعظم نے لڑکھڑاتے لہجے میں دریافت کیا۔

''یہ کمینی ہے، ناچی ہے یا نیک پروین۔ جو بھی ہے، میری سہیلی ہے اور یہ بات میں تم کو پہلے بھی بتا چکی ہوں۔ اب جاؤ یہاں سے۔''

باپ کے ساتھ مانی کا یہ طرزِ تخاطب چونکا دینے والا تھا مگر باپ جس قماش کا تھا شاید یہ انداز ٹھیک ہی تھا۔

اعظم نے ذرا ڈھیلا پڑتے ہوئے کہا۔ ''دیکھو، یہ سجن نہیں دشمن ہے۔ ہمارا ایک بندہ پھٹل کر کے بھاگی ہوئی ہے۔ بڑی مشکل سے ہاتھ آئی ہے۔''

''دشمن ہے تو پھر اس کو گولی مار دو نا...... میرے سامنے گولی مارو۔ یہ لو پستول۔''

وہ جلدی سے ایک طرف گئی اور ایک دراز میں سے کولٹ پسٹل نکال کر اعظم کی طرف بڑھایا۔ اعظم کا نشہ ہرن ہونا شروع ہو گیا تھا۔ اس نے پستول نہیں پکڑا۔ مانی کو سمجھانے والے انداز میں بولا۔ ''دیکھو، اس نے نقصان کیا ہے ہمارا۔ بے عزتی کی ہے۔ اگر ہم اس کو عزت دیں گے تو دوجے لوگوں پر کیا اثر پڑے گا۔ اس کمینی کو تو یہاں ذلیل و خوار ہونا چاہیے......''

''ٹھیک ہے، تو کرو ذلیل و خوار۔ اسے یہاں جھاڑو دینے پر لگا دو۔ گوبر اٹھانے پر لگا دو۔ سب کے سامنے مار کوٹ لو اسے...... کیا ذلیل و خوار کرنے کا بس ایک ہی طریقہ تمہاری سمجھ میں آتا ہے؟''

اعظم کے سامنے مانی کی بے باکی دیدنی تھی۔ کچھ بھی تھا وہ اس کی بیٹی تھی بلکہ اس سے دو ہاتھ آگے تھی۔

اعظم نے وہاں سے دم دبا کر نکلنے میں ہی عافیت سمجھی۔ طیش سے مانی کے عارض سرخ تھے اور سینہ پھول پچک رہا تھا۔ جاناں کو اعظم اور فخرو وغیرہ سے بچانے کے سلسلے میں میری چال کامیاب جا رہی تھی۔

مانی ابھی مجھے مزید اپنے پاس روکنا چاہتی تھی مگر مجھے تاجور کے پاس جانے کی جلدی تھی۔ میں ان دونوں سے روانہ ہو کر تاجور کے پاس کمرے میں پہنچا تو وہ حسبِ توقع گم صم نظر آئی مگر آج چہرے پر پریشانی کے بجائے غصہ دکھائی دیتا تھا۔ اس کا نہایت شفاف، شیشے جیسا چہرہ غصے یا شرم کے وقت سرخ گلابی ہو جاتا تھا۔ میں نے اس سے اس کیفیت کی وجہ جاننا چاہی۔ وہ تڑخ کر بولی۔ ''یہ ماؤ جی کیا عورت ہے۔ مجھے اس کی کچھ سمجھ نہیں آتی۔ ایسی بے ہودہ باتیں کرتی ہے کہ دل چاہتا ہے، اپنا سر پھوڑ لوں یا اُس کا۔''

''کیا کہہ رہی تھی؟'' میں نے پوچھا۔

تاجور پہلے تو ہچکچاتی رہی پھر بولی۔ ''وہ مجھے اور آپ کو شادی شدہ سمجھ رہی ہے۔ چلو یہاں تک تو برداشت کیا جا سکتا ہے، لیکن اب وہ پوری پوری آپ کی ماں بنی ہوئی ہے اور کہتی ہے کہ...... اسے جلد سے جلد پوتا پوتی چاہیے۔''

تاجور روہانسی آواز میں کہہ گزری۔

میں نے ٹھنڈی سانس لی۔ تاجور غصے سے بولی۔ ''مجھے نصیحتیں کر رہی تھی کہ میں آپ کو زیادہ سے زیادہ خوش رکھوں۔ آپ کو اچھا کھلاؤں پلاؤں۔ آپ کی صحت بناؤں۔ بالکل...... فضول...... بے ہودہ باتیں کر رہی تھی۔ پوری پوری کھوجی بنی ہوئی تھی۔ کہہ رہی تھی......''

تاجور بات مکمل نہ کر سکی اور گڑبڑا کر چپ ہو گئی۔ میرے اصرار کرنے پر وہ بولی۔ ''وہ بے شرم ہمارے بستر کی سلوٹیں تک گننے لگی ہے۔ کہہ رہی تھی، میں نے دو تین بار صبح کے وقت تمہارا بستر دیکھا ہے۔ دیکھ کر ہی پتا چل جاتا ہے کہ تم دونوں رات کو اپنے اپنے کنارے پر پڑے رہتے ہو۔ ایسے رہو گے تو زندگی کی گڈی آگے کیسے چلے گی۔ آپ بتائیں یہ کوئی کرنے والی باتیں ہیں۔ ابھی کہہ کر گئی ہے کہ اس تمہارے والے بڑے بیڈ کی ضرورت مجھے دوسرے کمرے میں ہے۔ میں تمہارے لیے ایک چھوٹا بیڈ بھجواؤں گی۔'' تاجور کا چہرہ غصے سے لال بھبو کا ہو رہا تھا۔

تاجور کا دھیان بٹانے کے لیے میں نے اس سے پہلوان حشمت کا ذکر کیا اور اسے بتایا کہ وہ یہاں آیا ہے اور میں نے اس سے ملاقات کی ہے۔ تاجور کے چہرے پر کئی رنگ آ کر گزر گئے۔ ''وہ کیسے آ گیا ہے یہاں...... کیا...... اسے بھی پکڑ کر لائے ہیں؟'' وہ حیرت زدہ ہو کر بولی۔

''سمجھو، پکڑ کر ہی لائے ہیں۔ دراصل ان لوگوں کو یہاں اپنے زخمیوں کے لیے کسی مرہم پٹی کرنے والے کی ضرورت تھی۔ ہو سکتا ہے کہ کچھ دنوں کے بعد اسے چھوڑ دیں۔''

تاجور نے بے تابی سے پوچھا۔ ''وہ گاؤں کے بارے میں کیا بتاتا ہے؟ امی اور ابا جی کیسے ہیں؟ اور راحیل اور اسفند۔ سب ٹھیک تو ہیں نا؟''

''سب خیریت سے ہیں۔ وہ تمہارے بارے میں پریشان تھے مگر ریشمی اور انیق وغیرہ کے گاؤں واپس پہنچنے

کے بعد انہیں تسلی ہوگئی ہے۔ ریشمی اور انیق نے انہیں بتادیا ہے کہ تم اور میں ملنگوں سے بچ نکلنے میں کامیاب ہوگئے ہیں اور کسی محفوظ ٹھکانے پر پہنچ گئے ہیں۔ انہیں امید ہے کہ ہم جلد ہی واپس آجائیں گے۔''

''ہائے ربا۔ ان کے دل پر کیا بیت رہی ہوگی۔ پتا نہیں کہاں کہاں ڈھونڈتے پھر رہے ہوں گے ہمیں۔ پپ...... پتا نہیں، گاؤں میں کیا کیا باتیں بن رہی ہوں گی؟''

''کوئی باتیں نہیں بن رہی ہیں۔'' میں نے اسے تسلی دی۔ ''سب کو پتا ہے کہ تم اور چاچا رزاق، دونوں نوری کو ساتھ لے کر ریشمی کو ملنگی ڈیرے سے نکالنے کے لیے گئے تھے۔ وہاں اتفاق سے میں اور انیق بھی پہنچ گئے۔''

''مجھے پتا ہے آپ میری تسلی کے لیے یہ سب کچھ کہہ رہے ہیں۔''

''وہم کا کوئی علاج نہیں، اگر موقع ملا تو میں پہلوان سے بھی تمہاری ملاقات کرادوں گا۔''

''میرے بھائی کیسے ہیں؟ اسفند تو ابھی پوری طرح ٹھیک بھی نہیں ہوا تھا۔'' تاجور نے روہانسی آواز میں کہا۔

میں نے اس حوالے سے بھی اسے تسلی دی۔ اسی دوران میں کھٹ پٹ کی آوازیں سنائی دیں۔ یہ ماؤ کے ہی دو تین خدمت گار کارندے تھے۔ وہ ماؤ کی ہدایت کے مطابق ایک چھوٹا بیڈ لے کر آئے تھے۔ انہوں نے ڈبل بیڈ کمرے سے نکال کر اس کی جگہ چھوٹا بیڈ وہاں رکھ دیا۔ انہوں نے بتایا کہ کچھ مہمان آئے ہیں، ان کے لیے بڑے بیڈ کی ضرورت ہے۔

رات کو میں نے وہی کیا جو اکثر پاکستانی اور ہندوستانی فلموں میں ہیرو لوگ کیا کرتے ہیں اور واقعی اس عمل کی بہت ضرورت تھی۔ میں نے بیڈ پر تاجور کو سونے دیا اور خود فرش پر بچھونا بچھا کر لیٹ گیا۔

اگلے روز صبح سویرے دروازے پر زوردار دستک ہوئی، پھر ماؤ کی بھاری آواز آئی۔ ''منڈیا جی، دروازہ کھولو۔''

میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ فرش پر بچھا ہوا بچھونا اٹھایا اور لپیٹ کر بیڈ کے نیچے گھسا دیا۔ تاجور بھی اٹھی بیٹھی تھی اور سر پر دوپٹا درست کر رہی تھی۔ میں نے دروازہ کھولا۔ ماؤ اپنے چوڑے چکلے جسم کے ساتھ جھومتی ہوئی اندر آگئی...... ''ہاؤ ہائے اتنا دن چڑھ آیا ہے کھل کھلا کے۔ اٹھ جاؤ میرے بچڑے، کوئی ناشتا توشتا کرلو۔''

بات کرنے کے ساتھ ساتھ وہ گہری نظروں سے کمرے کا جائزہ بھی لے رہی تھی۔ ''تیرا کیا حال ہے کڑیئے؟'' اس نے گہری نظروں سے تاجور کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''میں ٹھیک ہوں۔'' تاجور نے بال جُوڑے کی صورت میں باندھتے ہوئے مختصر جواب دیا۔

''آج کل کی کڑیاں نہ کھاتی کھل کھلا کے ہیں، نہ بات کھل کھلاں کے کرتی ہیں۔'' وہ اس کے پاس ہی بیڈ پر بیٹھ گئی۔ بے تکلفی سے اس کا منہ ہاتھ میں لے کر بولی۔ ''دیکھ کس طرح چونچ نکلی ہوئی ہے، کوئی رونق شونق نہیں۔ خشکی چڑھی ہوئی ہے ماس پر۔ ٹھنڈے پانی سے منہ ہتھ نہ دھویا کرو اور کوئی کریم شریم بھی لگایا کر۔''

پھر اس نے دروازے کی طرف منہ کر کے ایک ملازمہ ماکھی کو آواز دی۔ ''نی ماکھی، کہاں مرگئی ہے۔ اِدھر آ۔''

فربہ جسم والی ماکھی بھاگی ہوئی اندر آئی۔ ماؤ نے گرج کر کہا۔ ''کل سے ان دونوں کے غسل خانے میں گرم پانی رکھا ہونا چاہیے روزانہ۔ نہیں تو میں نے ٹنگ توڑ دینی ہے تیری۔''

ماکھی نے جلدی سے اثبات میں سر ہلایا اور باہر جانے لگی۔ اسی دوران میں اس کی نگاہ بیڈ کے نیچے چھپائے گئے بچھونے اور تکیے پر پڑ گئی۔ اس نے نیچے اشارہ کرتے ہوئے ماؤ سے پوچھا۔ ''ماؤ جی، کپڑے دھو رہی ہوں۔ یہ نیچے والی چادریں بھی دھونے والی ہیں؟''

ماؤ نے جھک کر دیکھا اور اسے وہ ''فرشی بستر'' نظر آ گیا جو میں نے بیڈ کے نیچے چھپایا تھا۔ اس نے بستر باہر کھینچ لیا۔ ''یہ یہاں کیوں ہے؟'' اس نے الجھے ہوئے سے انداز میں کہا۔

''یہ...... ذرا میں نے مالش کرائی تھی پنڈے کی...... تاجور سے۔'' میں نے وضاحت کی۔

معلوم نہیں کہ اسے میری وضاحت پر یقین آیا یا نہیں۔ بہرحال اس نے کوئی اور سوال نہیں کیا۔

ملازمہ ماکھی بچھونا اور کمبل وغیرہ لے کر باہر چلی گئی۔ ماؤ کے انداز میں شک تھا۔ اس نے غصیلی نظروں سے تاجور کی طرف دیکھا۔ یوں لگا کہ وہ تاجور سے کچھ کہے گی مگر اس نے خود پر ضبط کیا اور مجھے اشارہ کرتی ہوئی باہر چلی گئی۔

میں اس کے پیچھے باہر آیا۔ وہ مجھے اپنے کمرے میں لے آئی اور دیر تک سمجھاتی رہی۔ اس ساری نصیحتوں کا لب

لباب یہی تھا کہ ہم میاں بیوی آپس کے تعلقات ٹھیک کریں۔

وہ اپنے مخصوص انداز میں بولی۔ ''میں ذرا کھل کھلا کر بات کرتی ہوں۔ یہ تمہاری زنانی ذرا ٹھنڈے مزاج کی ہے۔ نئی نئی دوہٹیوں والی تیزی طراری نہیں ہے اس میں۔ اور میری ایک بات اپنے پلے سے باندھ لو۔ لاکھوں روپے کی بات بتارہی ہوں تمہیں۔ میاں بیوی کا رشتہ تب ہی پکا ہوتا ہے جب ان کی جھولی میں کوئی بچہ ہوتا ہے کھل کھلا کے۔ جتنی چھیتی بچہ ہو جائے گا اتنی ہی چھیتی اس کے منہ میں لگا میں پڑ جائیں گی۔ (کھل کھلا کے ماؤ کا تکیۂ کلام تھا)

میں اثبات میں سر ہلاتا رہا۔ فی الحال یہی مناسب تھا۔ میں اچھی طرح سمجھ رہا تھا کہ یہ خبطی عورت میرے ''بچے'' کے لیے کیوں تڑپ رہی ہے۔ اسے یقین تھا کہ تاجور سے میرا پیچھا تب ہی چھوٹے گا جب وہ امید سے ہو گی۔ میں یہ دیکھ دیکھ کر حیران ہو رہا تھا کہ میرے اس وطنِ عزیز میں توہمات کی کیا کیا شکلیں ہیں اور فرسودہ عقیدوں کی جڑیں کس طرح دھرتی کی گہرائی میں اتری ہوئی ہیں۔

رات کو پھر میں فرش پر ہی چادر بچھا کر سویا۔ تاجور تو کچھ دیر کروٹیں بدلنے کے بعد سو گئی لیکن مجھے دیر تک نیند نہیں آئی۔ ماؤ بھوت بن کر ذہن سے چمٹی ہوئی تھی۔ خطرہ محسوس ہو رہا تھا کہ ابھی کمرے کا دروازہ دھڑ دھڑ بجنے لگے گا اور وہ یہ دیکھنے کے لیے اندر آجائے گی کہ میں آج پھر کہیں فرش پر تو نہیں سو رہا۔

بہرحال ایسی کوئی بات نہیں ہوئی، لیکن ایک اور بات ضرور ہو گئی۔ ''دھپ دھپ'' کی کچھ نامانوس سی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ یوں محسوس ہوا جیسے کوئی دیواروں پر دوہتڑ مار رہا ہو۔ یہ آوازیں کسی نیچے والے حصے سے آرہی تھیں اور رات کے سناٹے کی وجہ سے واضح سنائی دے رہی تھیں۔ وفعتاً میرا ذہن ماؤ کی کہی ہوئی بات کی طرف گیا۔ اس نے...... کہا تھا کہ فخرو وغیرہ نے مجھے تہ خانے کی سیڑھیوں کی طرف کیوں جانے دیا، اس کا کہنا تھا کہ تہ خانے میں وہ منحوس بند ہے جو ہر ایک کو بددعائیں دیتا ہے۔ معلوم نہیں کہ یہ بات اس نے کس کے لیے کہی تھی؟ وہ کون تھا اور یہاں کیوں بند تھا؟

تاجور بھی کسمسا کر جاگ گئی اور یہ گونجتی ہوئی آوازیں سننے لگی۔ ہمیں یاد آیا کہ پرسوں رات بھی آخری پہر ایسی ہی دھپ دھپ سنائی دی تھی۔

میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''تاجور! دیکھنا چاہیے کہ یہ کیا ہے؟''

''نہیں، کوئی ضرورت نہیں۔'' وہ دوٹوک لہجے میں بولی۔

''اچھا چلو، برآمدے تک تو جانے دو۔'' میں نے ٹارچ اٹھاتے ہوئے کہا۔

وہ جلدی سے بستر سے نکل آئی، میرے ہاتھ سے ٹارچ واپس لیتے ہوئے بولی۔ ''میں نے کہا ہے نا، آپ کہیں نہیں جائیں گے۔''

اس کے تاثرات دیکھتے ہوئے میں نے ٹارچ واپس رکھ دی اور لالٹین کی لو پھر نیچی کر دی۔ آوازیں تھم گئی تھیں مگر اب وہ دوبارہ بستر پر جانے اور سونے کے لیے تیار نہیں تھی۔ اس کے ذہن میں انجانے اندیشے اودھم مچا رہے تھے۔ وہ کہہ نہیں رہی تھی مگر میرا قوی خیال تھا کہ اس کا ذہن ملنگی ڈیرے کے خطرناک اور خونی روز و شب کی طرف چلا گیا ہے۔ ایسی ہی ایک تاریک و خاموش شب میں تاجور نے پُراسرار آوازیں سنی تھیں۔ یہ آوازیں بعد میں خون آشام چیتوں کی ثابت ہوئی تھیں۔

کچھ دیر بعد میں نے اصرار کر کے اسے بستر پر لٹایا اور خود اس کے پاس بیٹھ کر اس سے تسلی تشفی کی باتیں کرنے لگا۔ وہ کراہ کر بولی۔ ''ہمارا کیا ہو گا شاہ زیب! جب ان لوگوں کو پتا چلے گا کہ میں شمسہ نہیں تاجور ہوں اور ہم دونوں ہری پورہ سے نہیں چاند گڑھی سے یہاں آئے ہیں تو یہ ہمیں کبھی معاف نہیں کریں گے۔''

''تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ سردار سجاول کو سب کچھ معلوم ہو چکا ہے اور اس نے یہ سب کچھ برداشت بھی کر لیا ہے۔''

''یہ سب کچھ کیسے ہوا؟''

''بس ہو گیا ہے نا۔ سجاول کی ماں کی ذہنی حالت کا تمہیں پتا ہی ہے۔ وہ مجھے بہت زیادہ اہمیت دے رہی ہے۔ شاید اپنے سگے بیٹوں سے بھی زیادہ...... سجاول مجبور ہے کہ میرا اور تمہارا بہت خیال رکھے، وہ اپنی ماں کو کسی طرح کا ذہنی صدمہ پہنچانے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔'' میں نے تاجور کو گول مول بات بتائی۔

''مجھے اس گورکھ دھندے کی کچھ سمجھ نہیں آرہی...... میں تو بس یہ جاننا چاہتی ہوں کہ ہم کب تک یہاں سے نکل سکیں گے؟'' وہ الجھی آواز میں بولی۔

میں نے اس کے نرم ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''مجھے یقین ہے کہ بہت جلد کوئی نہ کوئی راستہ نکل آئے

گا۔ بس تم کو حوصلہ نہیں چھوڑنا ہے...... اور ہاں...... سجاول کی ماں کے سامنے خود کو شمسہ ہی ظاہر کرنا ہے، اور باقی بھی جو کچھ اسے بتا رکھا ہے، اسی طرح رکھنا ہے۔''

وہ ڈری ہوئی تھی۔ اس نے میرا بازو کہنی کے اوپر سے تھامے رکھا اور لیٹی رہی۔ میں اس سے باتیں کرتا رہا۔ دھیرے دھیرے وہ غنودگی میں چلی گئی اور پھر سو گئی۔ بہرحال میرے بازو پر اس کی گرفت اسی طرح برقرار رہی۔ بڑی معصومیت اور اپنائیت تھی اس گرفت میں...... یہ اجنبی لوگوں کے درمیان، مشکل حالات میں گھری ہوئی ایک ایسی لڑکی کی گرفت تھی جو اَب تک بس اپنی چار دیواری میں ہی رہی تھی، اسے معلوم ہی نہیں تھا کہ اس کے بابل کے آنگن سے باہر اور اس کے چاند گڑھی سے آگے زندگی کتنی کٹھن اور سفاک ہو سکتی ہے۔

اچانک ایک بار پھر دھپ دھپ کی مدھم آوازیں آنے لگیں۔ ایک دو منٹ بعد یہ آوازیں معدوم ہو گئیں...... مگر پھر...... ایک اور طرح کی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ مجھے ہرگز توقع نہیں تھی کہ میں ڈکیتوں کے اس ڈیرے پر اس طرح کی آواز سنوں گا۔ یہ آواز بند دروازوں کے پیچھے سے ابھر رہی تھی اور میرے کانوں تک پہنچتے پہنچتے کافی مدھم ہو گئی تھی۔ یہ اذان کی آواز تھی۔ بہت دھیان دینے پر ہی الفاظ کو سمجھا جا سکتا تھا۔ میرا تجسس بڑھ گیا۔ میں نے بہ آہستگی اپنا بازو تاجور کی گرفت سے چھڑایا۔ اپنے فرشی بچھونے پر لحاف کو اس طرح رکھا کہ وہ خالی دکھائی نہ دے۔ پھر چپل پہنتا ہوا کمرے سے باہر نکل آیا۔

برآمدے سے گزر کر میں نیچے جاتی ہوئی تاریک سیڑھیوں پر پہنچا۔ میں جانتا تھا کہ یہ کافی شکستہ سیڑھیاں ہیں، بہرحال میں نے ٹارچ جلانے کی کوشش نہیں کی۔ سنبھل سنبھل کر پاؤں رکھتا میں قریباً پندرہ فٹ نیچے ایک مقفل دروازے کے سامنے پہنچا۔ میری جیب میں تاجور کی دو ہیئر پنیں موجود تھیں۔ میں نے انہیں ڈبل کر کے اور بل دے کر ایک مڑا تڑا تار تیار کر لیا۔ ایک دو منٹ کی کوشش سے میں دروازے کا آہنی قفل کھولنے میں کامیاب ہو گیا۔ ایک ہال نما جگہ پر پہنچا تو اذان کی آواز مزید بلند اور واضح ہو گئی۔ یہ آواز ایک اور بند دروازے کے عقب سے آ رہی تھی۔ دروازے کو باہر سے کنڈی لگی ہوئی تھی۔

غالباً میرے قدموں کی چاپ سننے کے بعد اذان دینے والے نے اذان روک دی۔ اندر لالٹین کی مدھم روشنی تھی، وہ ادھ کھلی کھڑکی کی طرف آیا۔ وہ ایک نوجوان لڑکا تھا۔ عمر اٹھارہ سال کے لگ بھگ ہو گی۔ چھوٹی چھوٹی داڑھی، شلوار قمیص اور ایک میلی سی جیکٹ پہنے ہوئے تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر پھنکارا۔ ''تم سب جہنمی ہو...... دوزخی ہو۔ تم سب ذلت کی موت مرو گے۔ تمہاری لاشیں کتے اور گدھ کھائیں گے۔ تمہاری آنے والی نسل بھی تم پر لعنت بھیجتی رہے گی۔ تم نے ایک نیک انسان کو قتل کیا۔ اس کا خون ضرور رنگ لائے گا۔ ضرور لائے گا۔''

اس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ میں نے کہا۔ ''دیکھو میں دشمن نہیں دوست ہوں۔ ان لوگوں سے میرا کوئی تعلق نہیں، میں تو......''

''بکواس بند کرو۔'' وہ دانت پیس کر بولا۔ ''میں تم سب کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ تم سب اسی عالمگیر حرامی کے پالتو سؤر ہو۔ تمہاری باتوں میں آ کر میری زندگی برباد ہو گئی۔ میں کہیں کا نہیں رہا۔ میری دنیا بھی گئی اور آخرت بھی۔ مولوی جی کی روح مجھے کبھی معاف نہیں کرے گی...... کبھی نہیں۔''

اس نے جیسے دیوانگی کے عالم میں دیوار پر دوہتڑ رسید کرنے شروع کر دیے۔ ''دھپ...... دھپ......'' کی آواز پھر بلند ہونے لگی۔

میں نے دیکھا نوجوان کی انگلیوں سے خون رس رہا تھا۔ میرے ذہن میں جیسے روشنی سی بکھر گئی۔ ابھی اس لڑکے نے مولوی جی کا لفظ استعمال کیا تھا۔ چاند گڑھی کی مسجد میں مولوی فدا صاحب کو سیڑھیوں سے دھکا دے کر قتل کرنے والا بھی ایک مؤذن لڑکا تھا اور وہ غالباً ابھی تک لاپتا تھا...... کہیں، یہی تو وہ لڑکا نہیں تھا؟ یہ بات ذہن میں آتے ہی میرے خون کی گردش بڑھ گئی۔

میں نے دھیان سے اسے دیکھا۔ وہ قبول صورت رہا ہو گا۔ مگر یہاں قید و بند کی صعوبتیں جھیل کر اس کی ہڈیاں نکل آئی تھیں اور حلیہ بگڑا ہوا تھا۔ میں نے دھیمے لفظوں میں اسے سمجھایا کہ وہ شور شرابا نہ کرے۔ ایسا نہ ہو کہ اوپر سے کوئی یہاں آ جائے اور میں اس سے بات نہ کر سکوں۔ میں نے اسے ایک بار پھر یہ یقین دلانے کی بھرپور کوشش کی کہ میرا ان لوگوں سے کوئی تعلق نہیں بلکہ یہاں میری حیثیت بھی وہی ہے جو اس کی ہے۔

میری ان باتوں نے اس پر کچھ اثر کیا اور اس کا ہیجان کچھ کم ہو گیا۔ میں نے ہمت کر کے دروازہ کھولا اور اس کے پاس اندر کمرے میں چلا گیا۔ یہاں ایک چٹائی اور رضائی فرش پر ہی پڑی تھی جیسے میں لالٹین سمجھ رہا تھا وہ ایک

بڑے سائز کا ''جستی دیا'' تھا۔ شاید لالٹین اس لیے یہاں نہیں رکھی گئی تھی کہ اس کی چمنی کے شیشے سے یہ لڑکا خود کو یا کسی دوسرے کو نقصان نہ پہنچا دے۔ مجھے اس سے زیادہ سے زیادہ خطرہ یہی ہوسکتا تھا کہ وہ مجھ پر حملہ کر دے گا لیکن اگر وہ ایسا کرتا تو میں اسے بہ آسانی سنبھال سکتا تھا۔

میرے اعتماد نے اس کا اعتماد بحال کیا اور وہ آہستہ آہستہ مجھ سے باتیں کرنا شروع ہوگیا۔ میں نے اسے اپنے بارے میں اتنا بتایا کہ ایک چکر میں پھنس کر میں ان ڈکیتوں کے ہتھے چڑھ گیا ہوں اور اب یہاں سے نکلنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا ہوں۔ جواب میں اس عبدالرحیم نامی لڑکے نے جو باتیں کیں، ان سے مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ یہی وہ لڑکا ہے جس کے ذریعے قریباً ڈیڑھ مہینا پہلے مولوی صاحب کو سیڑھیوں سے گرا کر قتل کیا گیا تھا۔ عبدالرحیم کھلے الفاظ میں اس قتل کا اعتراف کر رہا تھا اور ان لوگوں کو بددعائیں دے رہا تھا جن کی وجہ سے اس سے یہ گھناؤنا جرم سرزد ہوا۔

وہ ہیجان زدہ تھا۔ عجیب لہجے میں بولا۔ ''میں جب آنکھیں بند کرتا ہوں میرے سامنے مولوی جی کی شکل آجاتی ہے۔ میرا کلیجا پھٹنے لگتا ہے۔ وہ اذان دے کر دعا مانگتے ہوئے نیچے آنے لگے تھے جب میں نے ان کو دھکا دیا، اس سے دو سیکنڈ پہلے انہوں نے مڑ کر میری طرف دیکھا، ان کی وہ صورت میری آنکھوں میں اور میرے دماغ میں جم کر رہ گئی ہے۔ میں اس کو نہیں بھول سکتا۔ کسی صورت نہیں بھول سکتا۔ پتا نہیں اس وقت کیا ہوگیا تھا مجھے؟ کیوں میں نے اتنا بڑا جرم کیا۔ کس طرح کر دیا۔'' ایک بار پھر بے حد تاسف کے عالم میں اس نے پتھریلی دیوار پر دوہتڑ رسید کیا اور اس کی دو انگلیوں سے ٹپ ٹپ خون کے قطرے گرنے لگے۔

وہ دردناک انداز میں بولا۔ ''میں ان بدبختوں کے چنگل سے نکلنا چاہتا ہوں۔ میں چاند گڑھی کے چوک میں کھڑے ہوکر اپنے گناہ کا اعتراف کرنا چاہتا ہوں اور ان دوزخیوں کے نام بھی بتانا چاہتا ہوں، جنہوں نے مجھ سے یہ ظلم کرایا۔''

''یہ عالمگیر کون ہے؟'' میں نے انجان بنتے ہوئے پوچھا۔

''ہے ایک خنزیر چاند گڑھی گاؤں کا۔ اسی کی وجہ سے میری عقل پر پتھر پڑے۔ وہ بہت بڑا چالباز ہے۔ اگر تھانے کچہری والوں نے اس کے ساتھ کچھ نہ کیا تو میں اپنے ہاتھ سے اسے گولی ماروں گا اور پیش ہو جاؤں گا۔ ڈبل پھانسی تو نہیں ہوگی نا مجھے، ایک ہی دفعہ ہوگی۔''

میں نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اپنی باتوں سے تم سمجھدار اور سیانے لگتے ہو۔ پھر تم ایک نیک شخص کی جان لینے پر رضامند کیسے ہوگئے؟''

وہ بولا۔ ''کہا ہے، عقل پر پتھر پڑ گئے تھے۔ یہ لوگ بڑی چالاکی سے ہم جیسوں کی مت مار دیتے ہیں۔ فرقے، عقیدے، مسلک کو درمیان میں لاکر آگ بھر دیتے ہیں ہمارے اندر۔ مجھے بھی مولوی جی کے خلاف بھڑکایا گیا۔ ان کے مسلک کو غلط بتا کر ان کو کافر کہا گیا۔ ان کی گردن مارنے کو بہت بڑا ثواب بتایا گیا...... اور میں چل پڑا انہیں مارنے کے لیے مگر انہیں مارنے کے بعد...... میری زندگی حرام ہوگئی۔ میرا سکون چین برباد ہوگیا۔ میں ایک ایسے شکنجے میں جکڑ گیا ہوں کہ جی سکتا ہوں نہ مر سکتا ہوں۔'' آخری الفاظ کہتے کہتے اس کی آواز بھرا گئی۔

اس نے انتہائی جذباتی لہجے میں جو کچھ بتایا، اس سے پتا چلا کہ مولوی جی کے قتل کے بعد وہ شدید ذہنی خلفشار اور بے سکونی کا شکار ہو چکا ہے۔ اس نے مولوی صاحب کو نہ صرف سیڑھیوں سے دھکا دیا تھا بلکہ بعد میں انہیں مکمل طور پر ختم کرنے کے لیے، پکی اینٹ سے ان کے سر پر وار بھی کیے تھے۔ اس نے کہا کہ اب مولوی جی کی صورت ہر وقت اس کی نگاہوں کے سامنے گھومتی رہتی ہے۔ بیٹھے بیٹھے ایک دم اسے لگتا ہے کہ لہو میں ڈوبے ہوئے مولوی صاحب دیواروں کا سہارا لیتے اس کے سامنے آن کھڑے ہوئے ہیں۔ وہ جب بولتے ہیں تو وہ ان کی آواز بالکل صاف سنتا ہے۔ وہ کہتے ہیں...... مجھے کیوں مارا؟ میں تو اذان دینے کے لیے اور نماز پڑھانے کے لیے گھر سے نکلا تھا۔ میرا کیا قصور تھا؟ ایسے وقت میں وہ اٹھ کر بھاگ جانا چاہتا ہے مگر اٹھ نہیں سکتا۔ سکتہ زدہ ہو جاتا ہے۔ اس کا سارا جسم پسینے میں نہا جاتا ہے اور غشی طاری ہونے لگتی ہے۔ اس نے بتایا کہ دن اور رات میں کم از کم ایک بار ایسا ضرور ہوتا ہے۔ ابھی کوئی ایک گھنٹا پہلے بھی یہی سب کچھ ہوا ہے اور وہ دیوانوں کی طرح دیواروں پر دوہتڑ مارنے پر مجبور ہوگیا ہے۔

اس کی پوری بات سننے کے بعد میں نے کہا۔ ''تمہاری باتیں سمجھ میں آرہی ہیں مگر تم نے ابھی تک یہ نہیں بتایا کہ تم ان ڈکیتوں کے ہتھے کیسے چڑھے؟'' وہ گہری سانس لے کر بولا۔

''کوئی دو ہفتے پہلے کی بات ہے جب میں نے پکا فیصلہ کرلیا تھا کہ میں تھانے میں جا کر سب کچھ صاف صاف بتا دوں گا۔ میں نے اپنے ایک استاد قاری حبیب سے مشورہ

کیا اور اس نے بھی کہا کہ یہ مناسب ہے لیکن اس نے یہ بھی کہا کہ مجھے اکیلے ہی تھانے نہیں جانا چاہیے۔ اس کا کہنا تھا کہ مقامی ایم پی اے کا ایک بھائی اس کا جاننے والا ہے۔ میں اسے لے کر تھانے میں پیش ہوں تو اچھا ہے، اس روز ہم ایم پی اے کے اس بھائی کی طرف ہی جا رہے تھے۔ ایک بیٹھک میں پہنچے تو کچھ لوگ ایک دم اندر گھس آئے۔ انہوں نے دروازہ بند کر دیا اور مجھے بے تحاشا مارنا شروع کر دیا۔ قاری حبیب سکون سے ایک طرف کھڑا رہا۔ مجھے پتا چلا کہ قاری حبیب نے میرے ساتھ دھوکا کیا ہے، وہ اندر خانے عالمگیر اور اسحاق وغیرہ سے ملا ہوا ہے۔ عالمگیر بڑا بے رحم شخص ہے۔ اس نے مجھے اپنے ڈیرے پر ایک کوٹھری میں بند کروا دیا۔ میری جیب سے وہ دس ہزار روپیا بھی نکال لیا گیا جو مجھے مولوی جی کے قتل سے پہلے خرچے کے لیے دیے گئے تھے اور جو میں تھانے میں جمع کرانا چاہتا تھا۔ سخت سردی میں میرے پنڈے پر بس ایک شلوار اور بنیان رہنے دی گئی۔ رات کو میں نے وہاں سے بھاگنے کی کوشش کی۔ انہوں نے مجھے پکڑ لیا اور پھر بے دردی سے مارا۔ میں بے ہوش ہو کر گر گیا۔ کوئی چار پہر بے ہوش رہا۔ پھر ہوش آ گیا لیکن بے ہوش بن کر ہی پڑا رہا۔ مجھے ڈر تھا کہ وہ مجھے دوبارہ مارنا شروع کر دیں گے۔ ساتھ والے کمرے میں عالمگیر اپنے کچھ ساتھیوں سے باتیں کر رہا تھا۔ ان باتوں میں اللہ بخشے مولوی جی کی بیٹی زینب کا نام بھی آ رہا تھا۔ مجھے ایک عجیب بات کا پتا چلا۔ عالمگیر وغیرہ کے لیے زینب ایک بڑی قیمتی چیز تھی۔ وہ اسے کسی بہت امیر بندے کے ہاتھ بیچنا چاہتے تھے۔ پتا ہے کتنی قیمت پر؟''

''کتنی قیمت پر؟'' میں نے پوچھا۔

''تقریباً ایک کروڑ بیس لاکھ میں۔ انہیں یقین تھا کہ پانچ دس لاکھ کی کمی بیشی سے یہ سودا ہو جائے گا۔ مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا اور اب تک نہیں آ رہا۔ مولوی صاحب کی بچی عام سی ہے پھر پتا نہیں کیوں اس کے لیے اتنے زیادہ روپے کی بات ہو رہی تھی۔ اس رات مجھ پر ایک اور راز بھی کھلا۔ اور یہ زینب والے راز سے بھی زیادہ عجیب ہے۔ عالمگیر وغیرہ کی باتوں سے مجھے اشارہ ملا کہ زینب کوئی اکیلی لڑکی نہیں ہے۔ کچھ اور لوگ بھی ہیں جنہیں اس امیر کبیر بندے کے ہاتھ بیچا جانا ہے۔ یہ کوئی لمبا چکر ہے اور اس میں بہت سا روپیا بھی ہے۔ عالمگیر جیسے کچھ اور لوگ بھی اس چکر کا حصہ ہیں۔ شروع میں تو یہی لگ رہا تھا کہ میں چاند گڑھی سے زندہ بچ کر نہیں نکلوں گا اور شاید یہ ساری باتیں میرے ساتھ ہی عالمگیر کے ڈیرے میں کہیں دفن ہو جائیں گی۔ مگر پھر ایک رات ایک کرشمہ ہوا۔ مجھے لگتا ہے کہ وہ رات میرے لیے بہت بری ثابت ہونے والی تھی۔ اس رات عالمگیر کے بندے مجھے کاٹ کر ڈیرے کے پچھواڑے کہیں دفنانے والے تھے مگر رات کو ایک موٹا تازہ موچھیل بندہ آیا۔ اس نے مجھے یوں تاڑا جیسے لوگ قربانی کے جانور کو تاڑتے ہیں۔ اس نے عالمگیر کے کانوں میں کچھ کھسر پھسر کی۔ پھر میری بنیان اتروائی۔ میرے پنڈے کو بڑے دھیان سے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے ایک ایسا کام کیا جس کی مجھے بالکل امید نہیں تھی۔ اس نے اپنے لمبے چھرے سے اچانک ہی مجھ پر وار کیا اور میری کمر پر سے گوشت ادھیڑ کر رکھ دیا...... یہ دیکھو......''

لڑکے عبدالرحیم نے اپنی گہرے رنگ کی میلی جیکٹ اور قمیص اوپر اٹھا کر مجھے اپنی پشت دکھائی۔ میں چونک گیا۔ یہ قریباً ڈیڑھ فٹ لمبا گہرا کٹ تھا جو رحیم کے دائیں کندھے سے شروع ہو کر اس کی ریڑھ کے ساتھ ساتھ چلتا نیچے تک آ گیا تھا۔ اس میں کم و بیش بیس ٹانکے لگے ہوئے تھے۔ زخم اب مندمل ہونا شروع ہو گیا تھا۔

''یہ ٹانکے بھی انہوں نے خود ہی لگائے؟'' میں نے رحیم سے پوچھا۔

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''میری اچھی طرح مرہم پٹی کی گئی۔ دوائی بھی کھلائی گئی۔ اس دوائی میں کوئی نشہ آور گولی بھی تھی یا شاید ایک سے زیادہ گولیاں تھیں۔ میں بے ہوش ہو گیا۔ بے ہوشی کے دوران میں مجھے اندازہ ہوا کہ میں کسی جیپ یا ڈیزل کار میں لمبا سفر کر رہا ہوں۔ پھر میری آنکھوں پر پٹی باندھ کر گھوڑے پر سفر کرایا گیا۔ پوری طرح ہوش میں آیا تو خود کو یہاں ان ڈکیتوں کے درمیان پایا۔ سجاول ڈکیت کا نام میں نے پہلے بھی سنا ہوا تھا لیکن یہ کبھی نہیں سوچا تھا کہ ایک دن میں خود اس بدنام گروہ کے چنگل میں پھنس جاؤں گا۔ مجھے نہیں لگتا کہ یہ لوگ مجھے زیادہ دیر زندہ رہنے دیں گے۔ ابھی تک مارا کیوں نہیں، یہ بات میری سمجھ سے باہر ہے۔ اسی طرح یہ کمر والا زخم بھی سمجھ سے باہر ہے۔ پتا نہیں، یہ لوگ کیا چاہتے ہیں مجھ سے۔''

میں نے رحیم سے پوچھا۔ ''یہ جو تم لڑکی کی قیمت والی بات بتا رہے ہو، بہت حیران کرنے والی ہے۔ اس بات کا ذکر تم نے ان ڈکیتوں سے بھی کیا ہے؟''

''نہیں، ابھی تک تو نہیں کیا لیکن ہو سکتا ہے کہ یہ خود ہی جانتے ہوں۔ ظاہر ہے کہ یہ عالمگیر کے دوستوں میں سے

موسم بہار کے سنگ پاکیزہ کے رنگ

بہار کے دل فریب و خوشنما رنگوں سے سجا اپریل 2016ء کا سالگرہ نمبر

ماہنامہ

پاکیزہ

کراچی

نگہت سیما کا خوب صورت ناول اختتامی پڑاؤ کے ساتھ

انجم انصار، درثمن بلال و نایاب جیلانی کے قسط وار مسحور کن سلسلے

کھوئے کھوئے لمحے ...... **تابندہ نعیم** کی بھرپور کاوش کا خوب صورت اختتام

رضوانہ پرنس، ثمینہ عظمت علی کی خوب صورت کہانیاں خاص آپ کی نذر

ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی اور **محترمہ اختر شجاعت** کی ایمان افروز حکایتیں

وہ آئے بزم میں

شیریں حیدر کی شیریں بیانیاں

عظمیٰ آفاق سعید کی کتاب کی رونمائی کی پرلطف تقریب کا احوال

نگہت اعظمی، شیریں حیدر، میمونہ صدف، ہاجرہ ریحان،
عقیلہ حق، ریحانہ زیدی و دیگر مایہ ناز لکھاریوں کی حسین تحریریں......

اس کے ہمراہ جدید تفریحی معلومات و دیگر خوش بیانیاں لیے مستقل سلسلے آپ کی خوش ذوقی کی نذر

ہیں۔“
”اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ نہ جانتے ہوں۔ ابھی تم اس سلسلے میں چپ ہی رہو۔“
رحیم اب مجھ پر اعتماد کرنے لگا تھا۔ اسے اندازہ ہوا تھا کہ میں چاند گڑھی کے آس پاس ہی کہیں رہتا ہوں۔ غالباً میری گفتگو سے اسے یقین آنا شروع ہو گیا تھا کہ میں بھی اس کی طرح یہاں زبردستی رکھا گیا ہوں اور اسی کی طرح یہاں سے نکلنا بھی چاہتا ہوں۔ میں نے اسے سمجھایا کہ اس طرح دیواروں پر مکے چلانے اور واویلا کرنے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ وہ ذرا صبر تحمل سے کام لے۔ ہو سکتا ہے کہ دو چار دن میں یہاں سے نکلنے کی کوئی سبیل بن جائے۔ میں نے اسے یہ بتا کر حیران کیا کہ میرا تعلق بھی چاند گڑھی سے ہے اور مولوی فدا اور اس کی بیمار بچی کے بارے میں، میں بھی کافی کچھ جانتا ہوں۔ میں نے اسے اپنا نام بتایا اور یہ بھی بتایا کہ چاند گڑھی کے زمیندار دین محمد کی بیٹی تاجور بھی میرے ساتھ ہے۔ میں نے اس پر انکشاف کیا کہ میں اس سے نکاح کر چکا ہوں۔
دین محمد اور تاجور کا نام سن کر رحیم کچھ چونک سا گیا بولا۔ ”جس رات میں نے عالمگیر اور اس کے ساتھیوں کی باتیں سنی تھیں، اس رات میں نے تاجور کا نام بھی سنا تھا۔ مجھے اندازہ ہوا تھا کہ شاید یہ تاجور نام کی لڑکی بھی ان لوگوں میں شامل ہے، جن کو کسی امیر کبیر بندے کے ہاتھ مہنگی قیمت پر بیچا جانا ہے...... مگر یہ تاجور والا کام جلدی ہونے والا نہیں تھا، اس میں کچھ دیر لگنی تھی۔“
تاجور کے ذکر نے مجھے بھی بری طرح چونکا دیا۔ بہر حال میں نے اپنے تاثرات کو نمایاں نہیں ہونے دیا۔ رحیم نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”وہ تاجور کو ”تیار کرنے“ کی کوئی بات کر رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ اس میں کم از کم دو سال تو لگ جائیں گے......“
”دو سال لگ جائیں گے؟ تمہاری بات کچھ سمجھ میں نہیں آرہی؟“ میں نے کہا۔
”سمجھ میں تو میری بھی نہیں آئی تھی۔“
”اور کیا کہا انہوں نے؟“
”بس اسی طرح کی باتیں ہو رہی تھیں۔ وہاں کوئی اسحاق نام کا بندہ بھی تھا۔ عالمگیر غصے میں آکر اسے بزدل، ہیجڑا اور پتا نہیں کیا کیا کہنے لگا۔ اس کا کہنا تھا کہ تاجور کا منگیتر ہونے کے باوجود بھی وہ اسے اپنے گھر میں نہیں ڈال سکا۔ جب وہ گھر میں ہی نہیں ہے تو پھر اس کی ”تیاری“ کہاں ہونی ہے۔“
یہ ساری باتیں ایک معمے جیسی تھیں اور یہ معما بتدریج پیچیدہ ہو رہا تھا۔ رحیم نے پہلے زینب کے حوالے سے ایک حیران کن انکشاف کیا تھا اور اب وہ اس سے ملتی جلتی بات تاجور کے بارے میں بھی بتا رہا تھا۔ زینب عام شکل و صورت کی معمولی لڑکی تھی...... پھر اس کے حوالے سے کروڑ سوا کروڑ کی بات کیوں کی جا رہی تھی؟ کیا اس سے کوئی خاص مقصد حاصل کیا جانا تھا؟ اور کیا تاجور کے حوالے سے بھی کوئی اسی قسم کا معاملہ تھا؟ چند ہفتے پہلے زینب کی بیماری والا معاملہ عالمگیر اور پیر ولایت وغیرہ کی بدنیتی تک محدود نظر آتا تھا مگر اب اس کی سنگینی اور وسعت کافی بڑھی ہوئی دکھائی دینے لگی تھی۔ اس سے تاجور کا نام بھی نتھی ہو رہا تھا۔ میرے بدن میں بے چینی کی ایک تیز لہر سی دوڑ گئی۔
شاید میری اور رحیم کی گفتگو مزید کچھ دیر جاری رہتی مگر اوپر سے کھٹ پٹ کی آوازیں آنے لگیں۔ مجھے شک ہوا کہ تاجور بیدار ہو گئی ہے اور گھبراہٹ میں دروازہ... کھنکھنا رہی ہے۔ یہ نازک صورتِ حال تھی۔ میں نے رحیم سے کل رات پھر ملاقات کرنے کا کہا اور تسلی آمیز انداز میں اس کا شانہ تھپک کر وہاں سے نکل آیا۔
دروازے کو مڑے ہوئے تار سے تیزی سے مقفل کرنے کے بعد میں سیڑھیاں پھلانگتا ہوا واپس اپنے کمرے میں پہنچ گیا۔ تاجور مجھ سے چمٹ گئی اور ہچکیوں سے رونے لگی۔ اسے شدید گلہ تھا کہ میں اسے بتائے بغیر کمرے سے نکل کر کہیں چلا گیا۔ اس کے آنسو تھمنے میں نہیں آرہے تھے۔ میں اسے چپ کرانے کی کوشش کرتا تو وہ زور سے دھکا دیتی اور مزید شدت سے آنسو بہانے لگتی۔ میں نے کہا۔ ”پچھلے چار پانچ دن میں تم نے جتنا پانی بہایا ہے تمہیں ضرور ”ڈی ہائیڈریشن“ ہو جائے گا۔ جسم سے پانی ختم ہو جائے تو اندر کی نسیں جڑنا شروع ہو جاتی ہیں۔“
”تو ٹھیک ہے، مر جاؤں گی نا۔ اس سے اچھا اور کیا ہوگا میرے لیے۔ پتا نہیں وہ کون سی گھڑی تھی جب مجھ سے اتنی بڑی غلطی ہوئی۔ میں نے آپ کو اپنا مددگار سمجھا اور لاہور سے آپ کو اپنے پیچھے لگا کر گاؤں لے آئی۔ کاش یہ نہ ہوا ہوتا۔ یہ نہ ہوتا تو شاید گاؤں میں میری بدنامی کے جھنڈے نہ گڑے ہوتے۔ شاید نوری بھی اب تک زندہ ہوتی۔“
میں نے کہا۔ ”وہ تو شاید زندہ ہوتی لیکن سوچو، تم خود کہاں ہوتیں اور تمہارے گھر والے کہاں ہوتے اور ریشمی

کے ساتھ کیا کچھ ہو گیا ہوتا۔ اگر کچھ برا ہوا ہے تو بہت کچھ اچھا بھی ہوا ہے تاجور...... اور میں تمہیں یقین دلاتا ہوں ہم نوری اور چاچا رزاق کی قربانیاں رائگاں نہیں جانے دیں گے۔''

''میں بس واپس جانا چاہتی ہوں۔ اپنے گھر والوں کے پاس، اپنے بھائیوں کے پاس۔ ابھی اسی وقت۔'' وہ بچوں کی طرح ضدی لہجے میں بول رہی تھی۔

میں نے بڑی مشکلوں سے اسے سنبھالا۔ وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔ ''آپ اتنی رات کو مجھے سوتا چھوڑ کر کہاں گئے تھے، مجھے بالکل سچ سچ بتائیں۔''

میں نے زیرِلب مسکرا کر کہا۔ ''دیکھو نا اب لگی ہو اپنی اپنی سی۔ کتنی محبت چھپی ہے اس سوال میں...... بہرحال...... اس سوال کا جواب تمہارے لیے اتنا اچھا نہیں ہے۔ میں تم سے جھوٹ بولوں گا تو مجھے ٹھیک نہیں لگے گا اور سچ بتاؤں گا تو تم ناراض ہو جاؤ گی۔''

''نہیں، مجھ میں حوصلہ ہے سچ سننے کا، آپ بتائیں۔''

''میں ماؤ کی پوتی مانی سے ملنے گیا تھا۔ اس سے آج ''ڈیٹ'' تھی میری...... ڈیٹ سمجھتی ہو نا؟ میٹھی میٹھی سی ملاقات۔ ہم دونوں نے بھینسوں والے کمرے میں گھس کر آلو والا نان کھایا۔ دودھ پتی پی کر تھوڑی سی گپ شپ کی...... اور بس۔ ویسے ہے بڑی کڑک لڑکی۔ ایک دم گرم اور ہائی اسپیڈ۔''

تاجور اپنی جگہ سے اٹھی اور پاؤں پٹختی ہوئی بیڈ پر جا کر... لحاف اوڑھ کر لیٹ گئی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ میں مذاق کر رہا ہوں۔ اتنی ''خطرناک'' بات میں نے ہلکے پھلکے انداز میں کہہ دی تھی اور میرے اس انداز کی وجہ سے اس کے اندر کا شک ایک دم دھند بن کر اڑ گیا تھا۔ یقیناً اس کے دل نے گواہی دے دی تھی کہ اگر مانی کے بارے میں اس کا شک درست ہوتا تو یہ بات ایسے ''ایزی'' انداز میں نہ کرتا۔ اب وہ یونہی روٹھ کر دکھا رہی تھی۔ اس کے بارے میں مؤذن عبدالرحیم کی بات سن کر میں بہت فکرمند ہو گیا تھا، مگر یہ فکرمندی میں ابھی تاجور پر ہرگز ظاہر کرنا نہیں چاہتا تھا۔

تاجور کو منانے میں مجھے یقیناً کچھ وقت لگتا لیکن پھر برآمدے کی طرف سے کچھ ایسی آوازیں بلند ہوئیں جنہوں نے میرا کام آسان کر دیا۔ یہاں کا وڈا سردار اعظم، غل غپاڑا کر رہا تھا۔ اس کے دماغ کو چڑھی ہوئی تھی اور وہ بلند آواز میں اول فول بک رہا تھا۔ ڈنمارک میں، میں نے سنا تھا کہ پاکستان اور ہندوستان کے دیہی علاقوں میں لوگ گڑ کی دیسی شراب پیتے ہیں اور پھر ہر آنے جانے والے پر اینٹیں برساتے ہیں۔ اس وقت تو یقین نہیں آیا تھا مگر یہاں سجاول کے اس شرابی بھائی کو دیکھ کر لگ رہا تھا کہ کچھ لوگوں کی حد تک یہ بات ٹھیک ہی ہے۔

اعظم کا للکارا سنائی دیا۔ ''میں اندھا بہرا نہیں ہوں۔ سب پتا چلتا ہے مجھے۔ مجھ سے فراڈ ہو رہے ہیں یہاں۔ وہ حرام زادی جھوٹ بول رہی ہے کہ اسے بچہ ہونے والا ہے۔ خود کو بچانے کے لیے ڈھونگ رچایا ہے اُس نے۔ میں اس کو نہیں چھوڑوں گا۔ ابھی لے کر جاؤں گا اُسے......''

یہ ذکرِ خیر یقیناً تاجور کا ہی ہو رہا تھا۔ شاید دایہ اختری ہی کی زبانی اسے سچ کا علم ہو گیا تھا۔ میں نے دیکھا لالٹین کی زرد روشنی میں تاجور کا چہرہ زرد تر دکھائی دینے لگا۔ اس نے اپنی ناراضگی بھول کر میرا بازو اپنے ہاتھوں میں تھام لیا۔ اعظم کی مدہوش للکار کے جواب میں ادھیڑ عمر فیض کی سنجیدہ آواز ابھری۔ ''وڈے سردار! وہ امید سے نہیں، پر شادی شدہ تو ہے نا...... اور بیمار بھی ہے...... وہ آپ کے لائق نہیں ہے۔''

''ہاں، وہ میرے لائق نہیں ہے۔ فلانی بھی میرے لائق نہیں ہے، ڈھمکائی بھی میرے لائق نہیں ہے۔ تم لوگوں نے مجھے جھلّا سمجھ رکھا ہے؟ الو کا پٹھا ہوں میں؟ یہ شادی شدہ ہے اس لیے میں اسے ہاتھ نہیں لگا سکتا۔ وہ ڈانسر جس کو بدھ کے روز پکڑ کر لائے ہو، وہ خیر سے سہیلی بن گئی ہے مانی کی۔ کل کوئی اور آئے گی تو تم اسے اپنی ماں بنا لینا۔ میں سب سمجھتا ہوں تم لوگوں کی چکر بازیاں۔ پیچھے ہٹ جاؤ۔ میں ابھی لے کر جاؤں گا اُسے۔''

اتنے میں کہیں دور سے سجاول کی گرج دار آواز سنائی دی اور رات کا سناٹا چیرتی ہوئی دور تک پھیل گئی۔ ''اوئے چاچا فیض یہ کیسا شور ہے؟''

چھوٹے سردار سجاول سیالکوٹی کی گرج نے کام دکھایا اور وڈے سردار کی آواز کا دم خم ایک دم ماند پڑ گیا۔ وہ بڑبڑانے والے انداز میں بولا۔ ''لو، اب یہ بھی بول پڑا۔ ابھی یہاں آ کر مولوی ثنااللہ بن جائے گا اور تقریر جھاڑنے لگے گا۔ ذات کا ڈکیت اور باتیں سنو اس کی حاجیوں والی۔''

سجاول سیالکوٹی کی گرج پھر اُبھری۔ ''یہ کیا ہو رہا ہے وہاں؟''

چھوٹے سردار سجاول کے انداز سے عیاں تھا کہ وہ سب کچھ جانتا ہے، اور قصداً پاس نہیں آرہا تا کہ بڑے بھائی سے منہ ماری نہ کرنا پڑے۔ اس کی یہ تدبیر کارگر رہی۔ بڑے بھائی اعظم کی بولتی بند ہونے لگی۔ وہ شٹپٹائے ہوئے انداز میں فیض محمد سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''میری زندگی حرام کررہے ہو تم لوگ۔ کسی دن پھٹ پڑوں گا، بہت کچھ برباد کردوں گا یہاں کا۔ بہت کچھ ختم کردوں گا......'' وہ شاید ڈگمگاتا ہوا واپس جارہا تھا۔

اس چار دیواری میں اس کی حیثیت ایک عورت خور درندے کی سی تھی۔ وہ جیسے ہر جگہ صنفِ نازک کی ٹوہ لیتا پھرتا تھا۔ سجاول سیالکوٹی نے اسے بڑے حساب سے لگام ڈال رکھی تھی ورنہ وہ یہاں تہلکہ مچا دیتا۔ کل مجھے فیض محمد نے اس مریض کے بارے میں بتایا تھا جس کا علاج پہلوان حشمت نے کرنا تھا۔ وہ نگینہ نام کی ایک نوجوان مریضہ تھی۔ کسی بات پر مشتعل ہو کر سردار اعظم نے اس کا ہاتھ توڑ ڈالا تھا۔ وہ عجیب قماش کا بندہ تھا۔ لگتا تھا کہ اس کی زندگی والا سگریٹ دو طرف سے جل رہا ہے۔ ایک طرف سے شراب اور دوسری طرف سے عورت اسے ختم کررہی ہے۔ اس کے چہرے سے ایسی نحوست برستی تھی کہ خواہ مخواہ اس پر تھوکنے کو دل چاہتا تھا۔ اسے جو لوگ وڈا سردار کہتے تھے وہ یقیناً اسے اندر سے وڈا کمینہ ہی کہہ رہے ہوتے تھے۔

سارا دن مجھے یہی دھڑکا لگا رہا کہ ابھی ماؤ کی پوتی کی طرف سے نادر شاہی بلاوا آجائے گا اور مجھے اس کے دل بہلاوے کے لیے اس کی خلوت گاہ میں جانا پڑے گا مگر اس روز خیریت ہی گزری۔ شاید وہ آفت کی پرکالہ کسی اور مہم میں مصروف تھی۔ آج کل جاناں ہر وقت اس کے ساتھ نظر آرہی تھی۔ مانی اس سے رقص کے داؤ پیچ سیکھ کر غالباً خود کو مزید مسلح اور تباہ کن بنانے کی کوشش کررہی تھی۔

میں نے تاجور کو ساری بات سمجھا دی تھی، لہٰذا اگلی رات جب میں پھر موذن عبدالرحیم سے ملنے کے لیے کمرے سے نکلا تو بیدار ہونے کے باوجود تاجور نے کوئی رکاوٹ نہیں ڈالی۔ اس کی ''ہیئر پنیں'' میرے پاس تھیں لہٰذا اس کے سر کے بال کھلے ہوئے تھے۔ ان سیاہ بالوں کے گھیرے میں وہ بڑی دلکش لگ رہی تھی۔ بے اختیار اسے پیار کرنے کو دل چاہا لیکن ابھی اس کے اندر کا موسم پوری طرح بحال نہیں ہوا تھا۔ ابھی مجھے انتظار کرنا تھا اور...... میں اس کے لیے زندگی کی آخری سانس تک انتظار کرسکتا تھا۔

اس نے لحاف میں منہ سر لپیٹ کر کبوتر کی طرح آنکھیں بند کرلیں اور مجھے یقین دلایا کہ میری آواز پہچانے بغیر وہ ہرگز دروازہ نہیں کھولے گی۔ میں کل کی طرح خاموشی سے شکستہ سیڑھیاں اترا اور دروازے کا قفل کھول کر اندر چلا گیا۔ حسبِ توقع رحیم جاگ رہا تھا اور میرا انتظار کررہا تھا۔ آج وہ قدرے پُرسکون نظر آتا تھا۔ وہ ایک کونے میں ٹیک لگائے بیٹھا تھا اور لحاف گھٹنوں تک اوڑھا ہوا تھا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی داڑھی نے ابھی پوری طرح اس کی ٹھوڑی کو ڈھانپا نہیں تھا، تاہم اپنی بول چال اور طور اطوار سے وہ کافی سنجیدہ اور سمجھ دار دکھائی دیتا تھا۔ شاید زیادہ سنجیدہ اور سمجھ دار لوگ ہی مذہبی ٹھیکیداروں کے غلط خیالات اور خام عقیدوں کے چکر میں پھنستے ہیں۔ وہ اس بات پر حیران نظر آتا تھا کہ میں کتنی بے خوفی اور آسانی سے دروازے کا تالا کھول کر یہاں اس کے پاس پہنچ جاتا ہوں۔

آج اس نے گفتگو کا آغاز عجیب انداز سے کیا۔

''مجھے لگتا ہے کہ مجھے تو یہ لوگ زندہ نہیں چھوڑیں گے لیکن اگر تم یہاں سے باہر نکلنے میں کامیاب ہو گئے تو خدا کے لیے قانون کے محافظوں تک میری آواز ضرور پہنچا دینا۔ اگر سامنے نہ آنا چاہو تو نہ آؤ، کسی خط کے ذریعے یا ٹیلی فون کے ذریعے یا کسی بھی طریقے سے چاند گڑھی کے کسی معتبر تک یہ بات ضرور پہنچاؤ کہ مولوی جی کے ساتھ حادثہ نہیں ہوا تھا، انہیں قتل کیا گیا تھا اور قتل کرنے والوں میں سب سے پہلے عالمگیر اور اسحاق کا نام آتا ہے؟''

میں نے کہا۔ ''رحیم! تم فکر نہ کرو، وہی ہوگا جو تم کہہ رہے ہو لیکن یہ تم خود کرو گے۔ اللہ نے چاہا تو یہاں سے بحفاظت نکلیں گے اور ذمے داروں کو کیفرِ کردار تک پہنچائیں گے۔''

''مگر غیب کا علم تو خدا کو ہی ہے نا۔ اگر کوئی ایسی ویسی بات ہو گئی تو پھر یہ کام تمہیں کرنا ہے بلکہ اگر چاہو تو تاجور کو بھی یہ بات بتا دو اور وہ جو تمہارا ساتھی پہلوان یہاں ہے، اس کو بھی باخبر کردو۔''

''میں تمہیں یقین دلاتا ہوں، اگر ہمارا حوصلہ بلند رہے گا تو یہ لوگ ہمارا کچھ بگاڑ نہیں سکیں گے اور مجھے یہ بھی بھروسا ہے کہ قدرت ہماری مدد کرے گی۔''

اس نے محتاط نظروں سے بیرونی دروازے کی طرف دیکھا، پھر اپنی قمیص کے نیچے ہاتھ ڈال کر بولا۔ ''ٹھہرو، میں تمہیں ایک چیز دکھاتا ہوں۔''

اس نے اپنا ازار بند کھولا اور شلوار کے نیفے میں انگلی

گھسا کر کچھ ٹٹولنا شروع کر دیا۔ اب تک اس نے جو کچھ بتایا تھا، وہ حیران کن تھا۔ اب معلوم نہیں وہ کیا افشا کرنا چاہ رہا تھا۔ چند سیکنڈ بعد اس نے قمیص کے نیچے سے ہاتھ نکالا تو اس میں کاغذ کی ایک بتی سی نظر آئی۔ اس نے بتی کو احتیاط سے کھولا۔ یہ کاپی سائز کا ایک صفحہ تھا۔

''یہ کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ مجھے اسی کوٹھری سے ملا تھا جہاں عالمگیر نے مجھے سخت سردی میں تین چار دن بھوکا پیاسا بند رکھا تھا۔ دراصل جب میں نے وہاں سے بھاگنے کی کوشش کی تھی، ان لوگوں نے مجھے بری طرح مارا تھا۔ مارنے والوں میں عالمگیر کا منشی محمد افضل بھی شامل تھا۔ یہ کاغذ دو تین کرنسی نوٹوں کے ساتھ اس کی قمیص کی جیب سے گرا تھا۔ میں نے بعد میں اٹھا لیا۔''

میں نے صفحے کو لالٹین کی طرف کر کے غور سے دیکھا اور تعجب ہوا۔ میری اردو بہت اچھی تو نہیں تھی لیکن میں اردو تحریر آسانی سے پڑھ لکھ سکتا تھا جو کاغذ میرے سامنے تھا اس پر نیلی سیاہی سے جو کچھ لکھا ہوا تھا وہ اردو میں ہی نظر آتا تھا مگر اس کا ایک لفظ بھی میرے پلے نہیں پڑ رہا تھا۔ مجھے لگا کہ رسم الخط اردو ہے لیکن زبان شاید کوئی اور ہے۔

''کیا ہے یہ؟'' میں نے رحیم سے پوچھا۔

''تم بتاؤ کیا ہے۔ مجھے تو اب تک سمجھ نہیں آئی لیکن یہ میں تمہیں بتا دوں کہ یہ کوئی مذاق نہیں ہے، کوئی بہت اہم بات لکھی ہوئی ہے اس میں۔''

میں نے دھیان سے پڑھا۔ اس تحریر یا خط کا پہلا فقرہ القاب کی طرح لکھا ہوا تھا اور کافی نمایاں تھا۔ یہ فقرہ حرف بہ حرف اس طرح تھا۔

''رستام بحاص پاتھب ٹیل وہ۔ روب جم وہ رک طخ انکھل اڑپ''

یہ کیا الفاظ تھے۔ میں نے تین چار بار دہرایا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ باقی کا خط بھی اسی طرح تھا۔ کہیں کوئی ایک لفظ بھی پلے نہیں پڑ رہا تھا، پتا نہیں کون سی جناتی زبان تھی، یا پھر کسی نے مذاق میں ایسا کر دیا تھا۔

میں نے رحیم سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''تم کہہ رہے ہو کہ یہ مذاق نہیں ہے، کوئی بہت اہم بات لکھی ہوئی ہے اس میں، یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟''

رحیم نے گہری سانس لے کر کہا۔ ''جب یہ کاغذ مجھے کوٹھری کے فرش پر پڑا ہوا ملا تو اس کے ساتھ دس دس روپے والے تین نوٹ بھی تھے۔ میں نے کاغذ اور نوٹ بے پروائی سے اپنے بچھونے کے نیچے رکھ دیے مگر اگلے روز کوٹھری کے اردگرد سے جو آوازیں سنائی دیں، ان سے مجھے پتا چلا کہ منشی افضل اور دیگر لوگ بڑی پریشانی کے عالم میں اس لکھے ہوئے کاغذ کو ڈھونڈ رہے ہیں۔ منشی افضل نے ایک صفائی کرنے والی عورت کو باقاعدہ تھپڑ بھی مارا کہ اگر اسے کوئی کاغذ دکھائی دیا تھا تو اس نے اٹھایا کیوں نہیں۔ عمر رسیدہ عورت دہائی دے رہی تھی کہ اس نے ایسا کوئی کاغذ نہیں دیکھا۔ میں سمجھ گیا کہ یہ اسی کاغذ کا ذکر ہو رہا ہے جس پر عجیب و غریب الفاظ لکھے ہوئے ہیں۔ تلاش کرنے والے میری کوٹھری میں بھی آئے۔ مجھ سے لکھے ہوئے کاغذ کے بارے میں پوچھا۔ میں نے لاعلمی ظاہر کی۔ انہوں نے کوٹھری میں موجود سب چیزوں کو الٹ پلٹ کر رکھ دیا لیکن اس وقت تک میں یہ کاغذ نوٹوں سمیت اپنے نیفے میں چھپا چکا تھا۔''

میں نے ایک بار پھر تحریر کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''تمہارا کیا خیال ہے، اس کاغذ پر یہ کیا لکھا ہے؟''

''میرا دل یہ گواہی دیتا ہے کہ یہ جو کچھ بھی ہے بہت خاص ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس کا تعلق ان باتوں سے ہو جو میں نے مولوی جی کی بیٹی کے بارے میں سنی تھیں۔ یہ لوگ کسی لمبے چکر میں لگتے ہیں۔ یوں تو آج کل ٹیلی فون کا دور ہے لیکن دور دراز علاقے جہاں سگنل نہیں پہنچتے وہاں اب بھی خط و کتابت سے کام چلایا جاتا ہے۔ کچھ پرانے لوگ اب بھی خط کو ہی پیغام رسانی کا بہتر ذریعہ سمجھتے ہیں۔ لیکن سمجھنے والی بات یہ ہے کہ اگر یہ واقعی خط ہی ہے تو پھر کس زبان میں لکھا گیا ہے۔ عربی، فارسی وغیرہ کو تو ہم سب اچھی طرح جانتے ہیں۔ یہ ہندی شندی بھی نہیں ہے۔''

میں نے ایک بار پھر دھیان سے پہلے چند الفاظ پڑھے۔ ''رتسام بحاص، پاتھب ٹیل وہ۔''

یہ کیا تھا...... رتسام بحاص...... شاید کسی کا نام تھا اور اس سے کہا گیا تھا کہ پاتھب ٹیل وہ۔ ٹیل انگریزی کا لفظ لگتا تھا ''وہ'' اردو کا لفظ تھا لیکن باقی الفاظ کا کوئی سر پیر نہیں تھا۔

والد صاحب نے مجھے بتایا تھا کہ انگریزوں کے دورِ حکومت میں برصغیر کے مقامی لوگ خط و کتابت کے لیے خفیہ زبانیں بھی استعمال کیا کرتے تھے۔ کیا یہ بھی کوئی ایسی ہی خفیہ یا اشاراتی زبان تھی۔ شاید یہ خط عالمگیر کے منشی افضل نے ہی اپنے جاننے والے کسی دیہاتی یار دوست یا بھائی بند کو لکھا ہو یا پھر یہ خط اسے کہیں سے آیا ہو اور اس نے جیب میں رکھ لیا ہو، جہاں سے رحیم کی مار کٹائی کے دوران میں یہ گر گیا ہو۔

رحیم نے کہا۔ ”یہ کاغذ تم اپنے پاس سنبھال لو۔ ہوسکتا ہے کہ اس سے ہمیں کوئی بہت کام کی بات معلوم ہوجائے۔“

میں نے کاغذ اپنی اندرونی جیب میں رکھ لیا، یہ سب کچھ بڑا عجیب لگ رہا تھا، جیسے کسی تفتیشی کہانی کا حصہ ہو، اس معاملے میں سب سے اہم بات وہی تھی جس کا ذکر میں پہلے بھی کرچکا ہوں، زینب میں آخر ایسی کیا بات تھی جس کی وجہ سے کوئی طلب گار اسے ایک کروڑ سے زائد رقم دے کر خرید رہا تھا۔ وہ ایک عام سی لڑکی تھی اور بیمار بھی تھی۔ کہیں اس کی بیماری ہی تو اس کے خاص ہونے کی وجہ نہیں تھی؟ یہ بات اب تقریباً ثابت ہوچکی تھی کہ زینب کے جسم میں ایک ایسا زہر موجود ہے جو سانپوں سے حاصل کیا گیا ہے۔ یہ زہر بڑے طریقے سے اسے دیا گیا ہے۔ پہلے بے حد معمولی مقدار میں اس کے خون میں شامل کیا گیا پھر بتدریج اس کی مقدار بڑھائی گئی ہے، یہاں تک کہ وہ پوری طرح اس زہر خورانی کی عادی ہوگئی ہے۔ اب اس کا علاج کرنے کی کوششیں ہورہی تھیں، زہر اس کے جسم کی ضرورت بن چکا تھا۔ وہ اس سے محروم ہوکر تڑپتی تھی اور اس کا دم جیسے آنکھوں میں آجاتا تھا۔ کیا زینب کو کسی خاص مقصد کے لیے زہر کا عادی بنایا گیا تھا۔ اب چونکہ وہ عادی ہوگئی تھی اور اس کے جسم میں زہر موجود تھا اس لیے اس کی ایک خاص قدر و قیمت ہوگئی تھی، میرے لیے سنگین بات یہ بھی تھی کہ تاجور کے نام کو بھی زینب کے ساتھ نتھی کیا جارہا تھا۔ تاجور کو دو سال میں ”تیار کرنے والی بات“ بھی ایک معما تھی۔

کہیں تاجور بھی تو اسی ”زہریلے چکر“ میں پھنسنے والی نہیں تھی؟ اس صورتِ حال کو اس ناقابلِ فہم تحریر نے کچھ اور پیچیدہ بنادیا تھا۔ شاید رحیم کی یہ بات درست ہی تھی کہ اس تحریر کا تعلق زینب والے معاملے سے ہے۔

☆☆☆

اگلے روز میں نے اپنے کندھے کی چوٹ کے بہانے پھر پہلوان حشمت سے ملاقات کی۔ پہلوان حشمت بہت اردو داں بنتا تھا۔ شاعری تو فنِ حرب کی طرح اس کے ”گھر کی لونڈی“ تھی۔ پہلوان حشمت سے ملاقات ہمیشہ دلچسپ ہی ثابت ہوتی تھی۔ اس دفعہ بھی یہ دلچسپی برقرار رہی۔ میں پہلوان کی کوٹھری میں پہنچا تو وہاں اس کی مریضہ نگینہ پہلے سے موجود تھی۔ میرے اندازے کے عین مطابق نگینہ ایک طوائف تھی۔ دراصل سجاول نے اپنے بڑے بھائی کی عیاشی کے لیے کچھ اصول ضابطے بن رکھے تھے۔ ان میں سب سے اہم اصول یہ تھا کہ وہ حتی الامکان کسی شریف زادی کو خراب کرنے سے باز رہے گا، خاص طور سے اگر وہ شریف زادی بیاہتا بھی ہو۔ اپنے بھائی کی بھوک کو پورا کرنے کے لیے سجاول پیشہ ور عورتوں کا انتظام کرتا رہتا تھا۔ یہ نگینہ بھی ایک ایسی ہی جواں سال عورت تھی۔ شرابی ”اعظم“ نے مشتعل ہوکر اس سے مار پیٹ کی تھی اور اس کا بازو کہنی کے قریب سے ٹوٹ گیا تھا۔ اب وہ پہلوان حشمت کے پاس بیٹھی ہائے ہائے کررہی تھی اور پٹی بندھوا رہی تھی۔ اس کے جانے کے بعد حشمت نے مجھے بتایا۔ ”اس کی ہڈی غلط جڑ گئی ہے، اس لیے بازو ٹھیک سے ہلتا ناہیں۔ اب میں نے ہڈی کچی کرنے کے لیے اس پر چھان بورے اور گڑ کا لیپ کردیا ہے۔ دو تین دن تک ہڈی کچی ہوجاوے گی اور میں اس کو ٹھیک جگہ پر بٹھادوں گا۔“

میں نے کہا۔ ”پہلوان جی! آپ کے ہاتھ میں اللہ نے شفا دی ہے۔ ایک دنیا آپ کو مانتی ہے۔ آپ ماشاءاللہ پہلوان بھی ہیں یعنی ہڈی جوڑنے کے ساتھ ساتھ توڑنے کا کام بھی کرسکتے ہیں۔ پھر آپ شاعری بھی کرتے ہیں۔ یہ اتنے سارے کام آپ ایک ساتھ کیسے کرلیتے ہیں؟ جبکہ یہ کام ایک دوسرے سے کافی مختلف بھی ہیں۔“

شعر جوڑنا بھی ہڈی جوڑنے جیسا کام ہی ہووت ہے بھیا۔ ہڈی جوڑنے میں بھی ردیف قافیے کا دھیان رکھنا پڑت ہے۔ جس طرح مصرعے میں بحر کو ٹھیک بٹھانا ہووت ہے، اسی طرح ہڈی کے ٹکڑوں کو بھی ہڈی کے مطابق ٹھیک ٹھیک بٹھانا ہووت ہے۔“

”زبردست۔“ میں نے کہا۔

”شاید تم میری تعریف کرنا چاہ رہے ہو لیکن میں سچی سچی کہوں تو مجھے تمہاری کوئی بات اچھی ناہیں لگ رہی۔ تم نے جس طرح گونگا بن کر چاند گڑھی میں ہم سب کو اُلو بنایا ہے، وہ مجھ کو کسی طرح ہضم ناہی ہووت ہے۔“

”میں اس کی وجہ آپ کو بتا چکا ہوں اور اس کے لیے آپ سے معافی بھی مانگ چکا ہوں۔ یہاں سے بچ بچا کر نکل گیا تو میں پورے چاند گڑھی سے بھی معافی مانگ لوں گا۔“

لیکن تاجور اور اس کے گھر والوں کے لیے تو اب چاند گڑھی میں رہنا ناممکن ہوجاوے گا۔ میں دین محمد صاحب کو اچھی طرح جانت ہوں، وہ یہ سب کچھ برداشت ناہیں کرپائیں گے۔ اب یہاں بھی لوگ کئی طرح کی باتیں بنارہے ہیں، کچھ کہہ رہے ہیں کہ تم تاجور سے نکاح کرچکے ہو، اور کچھ کو اس میں شک ہے......“

میں نے پہلوان کو بڑی عرق ریزی سے سمجھایا کہ کچھ باتیں ایسی ہیں جن کے بارے میں، میں فی الحال اسے کچھ نہیں بتا سکتا لیکن وقت آنے پر کچھ بھی چھپاؤں گا نہیں۔ میں نے اس کے سر کی قسم کھائی جو اسے اچھی لگی۔

پہلوان ذرا نارمل ہوا تو میں نے ایک بار پھر اس کے سر کی تعریف کی اور اسے یقین دلایا کہ وہ اپنی مثال آپ ہے، میں نے کہا۔ ''پہلوان جی! یقین کریں میں اکثر سوچتا رہتا ہوں کہ آپ جیسا ہمہ صفت شخص چاند گڑھی جیسے دور دراز گاؤں کے بجائے لاہور یا کراچی جیسے شہر میں ہوتا تو دن رات روپیا کماتا۔ دن کو ہڈیاں جوڑ کر اور رات کو شعرو شاعری کر کے۔ آپ کی شاعری میں اتنی گہرائی ہے کہ...... کہ...... اگر تھوڑی سی گہرائی اور ہوتی تو آپ نے قدرتی گیس نکال لینی تھی۔''

''کیا مطلب؟'' پہلوان نے ذرا چونک کر کہا۔

''میں مثال دے رہا ہوں، شاید میں مناسب الفاظ استعمال نہیں کر سکا...... قدرتی گیس بھی تو ایک نہایت قیمتی اور انمول چیز ہے۔ یقین کریں، میں تہِ دل سے کہہ رہا ہوں، آپ لاہور میں ہوتے نا تو آپ پر شہرت اور روپے کی بارش ہو جاتی۔''

پہلوان قدرے مطمئن ہوا، ورنہ وہ قدرتی گیس والی بات کو لے کر بیٹھ جاتا تو گھنٹوں بحث چل سکتی تھی۔ اس نے گہری سانس لے کر کہا۔ ''بھیا! کوئی فن بھی محنت اور ریاضت کے بغیر حاصل نا ہیں ہوت۔ وہ محاورہ تو تم نے سنا ہی ہووے گا جتنا گڑ ڈالو گے اتنا ہی رادھا ناچے گی۔''

''بالکل...... بالکل۔'' میں نے اثبات میں سر ہلایا اور محاورے کی ''آبروریزی'' کو بمشکل برداشت کیا۔ پہلوان نے فلسفیانہ انداز جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''فن کے اندر اترنا پڑت ہے، غور کرنا پڑت ہے۔ تب کہیں جا کر اونچ نیچ کا پتا چلت ہے۔ اب دیکھو یہی شعر دیکھو، میں نے کل سے اسے کوئی چالیس مرتبہ پڑھا ہے، تب اس کا اصل مفہوم واضح ہوا ہے۔''

پہلوان نے چٹائی کے نیچے سے ایک اخباری کاغذ نکالا۔ اس کاغذ پر غالباً روٹی وغیرہ رکھ کر یہاں لائی گئی تھی۔ کسی اخبار کا سنڈے ایڈیشن تھا۔ تھوڑی سی شاعری بھی اس پر موجود تھی۔ پہلوان نے ایک شعر پر انگلی رکھی۔ ''پڑھو اسے'' مجھے حکم ملا۔

میں نے پڑھا۔

''ایک زمانہ گزرا ہے دید کی چاہت میں
جانم تم کو دیکھا تو دم میں دم آیا۔''

پہلوان نے فوراً غلطی نکالی۔ فرمایا۔ ''تم نے وہی غلطی کی جس کی مجھے امید تھی۔ یہ دم میں دم آیا نہیں۔ یہ ہے دم میں ڈم آیا۔ یعنی شاعر کہوت ہے کہ اپنے محبوب کو دیکھ کر میں مرنے والا ہو گیا۔ میرا دم بالکل ڈم میں آ گیا۔ یہ حسن کی بے پناہ تجلی اور عاشق نگاہوں کی بے بسی کا ماجرا بیان کیا گیا ہے اور کتنی خوب صورتی سے کیا گیا ہے۔''

میں نے ہنسی کو بمشکل ضبط کرتے ہوئے کہا۔ ''مگر پہلوان جی، یہ دم میں ڈم آنے والی بات کچھ سمجھ میں نہیں آتی۔ انسان کی تو ڈم نہیں ہوتی اور شاعر بھی غالباً انسان ہی ہے۔''

''بھیا! تم ان باتوں کو نا ہیں سمجھو گے۔ اس کو ''شعری رعایت'' کہوت ہیں۔ بڑے بڑے شاعروں نے اس طرح کے شعر کہے ہیں۔ اپنے مرزا غالب کا شعر تو تم نے سنا ہی ہووے گا۔ ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پر ڈم نکلے...... بہت نکلے میرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے۔ اب سوچو اگر غالب جیسے عظیم اور بے مثال شاعر کی ڈم نکل سکتی ہے تو ایک عام شاعر کا دم اس کی ڈم میں کیوں نا ہیں آ سکتا؟''

میں ماضی قریب میں انیق کے ساتھ پہلوان حشمت کی لمبی لمبی بحثیں سن چکا تھا اس لیے تکرار فضول تھی۔ میں نے تجربے کے لیے، اپنی اندرونی جیب میں سے وہ تحریر نکالی جو کل رات عبدالرحیم کے ذریعے مجھ تک پہنچی تھی۔ مسلح پہریدار کافی دوری پر تھا۔ وہ دیکھ نہیں سکتا تھا کہ ہماری سرگرمی کیا ہے۔ میں نے کاغذ پہلوان حشمت راہی کے سامنے کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ علم و فضل کے اعلیٰ درجے پر ہیں، مجھ ناچیز کی سمجھ میں تو کچھ نہیں آیا، کچھ آپ ہی بتائیں، یہ کیا تحریر ہے اور کس زبان میں ہے؟''

پہلوان نے کاغذ کو غور سے دیکھا۔ اپنا کدو جیسا سر تعجب میں ہلایا اور اٹک اٹک کر پہلا فقرہ پڑھا۔ ''رتسام بحاص۔ یاحبب ٹیل وہ...... اس کا کیا مطلب ہے؟'' انہوں نے سر کھجا کر مجھ سے ہی دریافت کیا۔

''اگر مجھے پتا ہوتا تو آپ سے کیوں پوچھتا؟ اس پوری تحریر میں سے ایک لفظ بھی ٹھیک طرح میرے پلے نہیں پڑ سکا۔''

''یہ کہاں سے ملا ہے تمہیں؟''

''بس سمجھیں کہ عالمگیر کے ایک خاص بندے کی جیب سے گرا تھا اور ایک بندے کے ہاتھ لگ گیا تھا۔ اس

نے مجھ تک پہنچا دیا ہے۔"
"مجھے تو یہ مذاق لگتا ہے۔"
"لیکن یہ مذاق ہے نہیں۔ عالمگیر اور اس کے چمچے اس کاغذ کی تلاش میں کافی پریشان رہے ہیں۔ چلیں میں آپ کو ساری بات بتا ہی دیتا ہوں لیکن اسے آپ نے اپنے تک ہی رکھنا ہے..... آپ کو وہ مؤذن یاد ہے نا جس پر مولوی فدا صاحب کو دھکا دے کر مارنے کا الزام تھا؟"
"ہاں، ہاں۔ اسے ہم لوگ کیسے بھول سکتے ہیں۔"
پہلوان بری طرح چونک گیا۔ میں نے مختصر الفاظ میں اسے بتا دیا کہ وہ مؤذن لڑکا یہاں سجاول سیالکوٹی کے ٹھکانے پر موجود ہے اور بری حالت میں ہے۔ وہ اپنے کیے پر ازحد پریشان ہے اور اپنے کیے کا کفارہ ادا کرنا چاہتا ہے۔ مؤذن عبدالرحیم کی پوری رُوداد سننے کے بعد پہلوان بھی ششدر رہ گیا۔ اس تحریر میں اس کی دلچسپی مزید بڑھ گئی۔ وہ بڑے دھیان سے لفظوں کے جوڑ توڑ پر غور کرنے لگا۔ پہلے اس نے اس زبان کو سنسکرت قرار دیا، پھر سندھی کی کوئی بگڑی ہوئی شکل بتایا۔ آخر میں خود ہی اپنی ان دونوں آرا کو رد کر دیا اور اس تحریر کے ڈانڈے تامل ناڈو سے ملانے شروع کر دیے۔ پہلوان کا یہ خیال بھی تھا کہ رتسام دراصل بہار کے ایک راجا کا نام تھا اور پہلوان کی طرح وہ بھی نہ صرف میواتی تھا، بلکہ گتکے یعنی لٹھ بازی اور کشتی میں بھی زبردست مہارت رکھتا تھا۔ اس کے بعد پہلوان نے اپنی گفتگو کا رخ اپنے فنِ حرب کی طرف موڑ دیا اور بتایا کہ ہڈیاں جوڑنے کے فن سے پہلے اس نے کس طرح ہڈیاں توڑنے کا فن سیکھا اور اس کے اس فن سے کون کون سے لوگ کس کس طرح متاثر ہوئے۔

پہلوان سے بمشکل اپنا پلا چھڑا کر میں واپس تاجور کے پاس پہنچا۔ تاجور نے بتایا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے مائی کی پوتی مانی مجھے ڈھونڈتے ہوئے یہاں آئی تھی، خوب بنی ٹھنی ہوئی تھی، جیسے کسی شادی پر جانے کے لیے تیار ہو۔ تاجور کے لہجے میں جو کاٹ سی تھی، اس نے مجھے مزہ دیا۔ مانی کے ذکر پر وہ جزبز ہو جاتی تھی۔ اس کی یہ کیفیت بتاتی تھی کہ میں اس کے لیے اہمیت رکھتا ہوں اور وہ میرے بارے میں سوچتی ہے۔ خاص طور سے مانی جیسی لڑکی کا میرے اردگرد رہنا اسے پسند نہیں۔
"وہ کیا کرنے آئی تھی؟" تاجور نے خفگی لہجے میں پوچھا۔
"وہ کوئی خاص نہیں بھئی، دراصل اسے میرے کندھے کی چوٹ کی بڑی فکر ہے۔ کہہ رہی تھی کہ اس کی دادی نے کشمیری جڑی بوٹیوں سے ایک بڑا خاص تیل بنوایا ہوا ہے۔ وہ مجھے اس تیل کی مالش کرنا چاہتی ہے دھوپ میں بٹھا کر..... لیکن اس کا یہ آئیڈیا مجھے کچھ زیادہ پسند نہیں آیا۔"
"کیوں؟"
"بھئی، ایسی زبردست لڑکی سے مالش ہی کروانی ہے تو پھر دھوپ میں بیٹھ کر کیوں کروائی جائے۔ بند کمرے میں ہونی چاہیے ایسی مالش تو۔" میں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔
"تو کروالیں نا بند کمرے میں، رکاوٹ کیا ہے؟"
"کتنی عجیب بات ہے۔ "رکاوٹ" خود ہی پوچھ رہی ہو کہ رکاوٹ کیا ہے۔ میں یہ کیسے برداشت کر سکتا ہوں کہ تمہارے ہوتے ہوئے کوئی اور لڑکی میرے جسم کو چھوئے؟"
"کبھی کبھی مجھے لگتا ہے کہ ایسی بات آپ پہلے بھی بہت سی لڑکیوں سے کہہ چکے ہوں گے۔" اس نے میری آنکھوں میں دیکھ کر عجیب سے لہجے میں کہا اور اپنا سر دوپٹے سے ڈھانپ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ کچھ ہی دیر بعد وہ مصلے پر کھڑی مغرب کی نماز پڑھ رہی تھی۔
پتا نہیں کیوں، اس کے آخری جملے نے دل پر عجیب سی چوٹ لگائی تھی، یوں تو اس نے یہ جملہ بہت سنجیدگی سے نہیں کہا تھا بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ ہلکے پھلکے انداز میں کہا تھا لیکن میرے دل و دماغ نے اسے ہلکے پھلکے انداز میں نہیں لیا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس کی وجہ تھی۔ مجھے اپنے ماضی کا پورا علم تھا۔ مجھ سے بڑھ کر اور کون جان سکتا تھا کہ میں نے اپنے پچھلے چھ سات سال کس طرح گزارے ہیں۔ بے شمار لڑکیاں میری گناہ گار زندگی میں آئی تھیں اور ان میں سے بہت سی ایسی بھی تھیں جن سے میرا جسمانی تعلق رہا تھا۔ میں نے دنیا کے خطرناک ترین جوا خانوں میں جوا کھیلا تھا، شراب پی تھی، بے دردی سے قتل کیے تھے، لوگوں کے ہاتھ پاؤں توڑے تھے، انہیں اغوا کیا تھا اور ان کے بدلے اپنے جرائم پیشہ دوست چھڑائے تھے۔ جرائم کی کتاب سے ایسا کون سا ورق تھا جو میری زندگی کی کتاب کا ورق نہیں تھا..... اور میرے سامنے دوپٹے کے ہالے میں اپنا چہرہ لپیٹے نماز پڑھتی ہوئی یہ سیدھی سادی دیہاتی دوشیزہ مذاق مذاق میں یہ کہہ رہی تھی کہ شاید کچھ دوسری لڑکیوں سے بھی میرا ایسا ہی مذاق رہا ہے۔
میں نے التحیات میں بیٹھی ہوئی دلکش تاجور کا معصوم

چہرہ بڑے دھیان سے دیکھا اور میرے اندر سے آواز آئی...... شاہ زیب، یہ فرشتہ سیرت لڑکی کسی اور دنیا کی باسی ہے، تم کسی اور دنیا کے رہنے والے ہو۔ بہت سی قاتل نگاہیں تمہارا پیچھا کررہی ہیں، ڈنمارک کی پولیس ہتھکڑیاں لیے تمہیں ڈھونڈ رہی ہے۔ تمہارا مقدر بجلی والی کرسی ہے، زہر کا انجکشن ہے یا پھر کسی اندھیری رات میں کسی سنسان گلی میں پگھلا ہوا سیسہ تمہارا نصیب بنے گا۔ تم کیوں اس معصوم لڑکی کی پاک صاف زندگی میں گھس کر اسے زہرناک بنا دینا چاہتے ہو، ٹھیک ہے تم نے ساڑھے تین برس تک اسے ڈھونڈا...... تمہارے دل میں اسے دیکھنے کی تڑپ تھی، تم نے اسے دیکھ لیا...... اس سے مل لیا۔ اس کے ساتھ کچھ وقت گزار لیا۔ اب اسے اس کے حال پر چھوڑ کر اس سے کہیں دور چلے جاؤ۔

فوراً ہی دل کے اندر سے ہی جواب آیا...... اب دور جانا اتنا آسان نہیں۔ کم از کم ابھی تو اتنا آسان نہیں ہے۔ وہ جن حالات میں پھنسی ہوئی ہے اور جن نئے حالات میں تم نے اسے خود پھنسایا ہے، ان میں سے نکالے بغیر تم اسے کیسے چھوڑ سکتے ہو؟

تاجور نے سلام پھیر کر میری طرف دیکھا، مجھے گم صم پا کر بولی۔ ''کیا ہوا؟''

''کچھ نہیں۔''

وہ بولی۔ ''سوری، جس طرح آپ مذاق میں بات کرتے ہیں، میں نے بھی مذاق میں کہہ دی۔''

میں اپنے تاثرات چھپانے کے لیے اٹھ کر باہر آ گیا۔

رات کو میں نے ایک بار پھر رحیم سے ملاقات کی۔ میں اسی تحریر کے بارے میں اس سے بات کرنا چاہ رہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ جس طرح پچھلے 24 گھنٹے میں اس کاغذ پر لکھے ہوئے بے معنی الفاظ میرے دل و دماغ میں ہلچل مچاتے رہے ہیں یقیناً رحیم کے دماغ میں بھی پیوست ہو گئے ہوں گے بلکہ وہ تو پچھلے کئی دن سے اس پر مغز ماری کر رہا تھا۔

میں نے حسب سابق احتیاط سے تہ خانے کی شکستہ سیڑھیاں طے کیں اور تاجور کی مڑی تڑی ہیئر پنوں سے اندرونی دروازے کا لاک کھول کر رحیم والے کمرے کے سامنے چلا گیا۔ یہاں لوہے کے بولٹ نے دروازہ باہر سے بند کر رکھا تھا۔ میں نے بہ آسانی بولٹ ہٹایا اور اندر چلا گیا۔ آج رحیم نے نئے کپڑے پہن رکھے تھے یہ جین کی پتلون اور ہاتھ کی بُنی ہوئی موٹی جرسی تھی۔

وہ پتلون میں بیزار نظر آ رہا تھا۔ کہنے لگا۔ ''میں نے کبھی پتلون نہیں پہنی مگر شلوار قمیص بھی بہت گندی ہو چکی تھی اس لیے انہوں نے جو دیا پہن لیا۔''

''ان کپڑوں میں بھی ٹھیک لگ رہے ہو۔'' میں نے کہا۔

وہ واقعی بہتر لگ رہا تھا۔ اس کا جسم بھی کسرتی تھا۔ سینہ کشادہ اور بازو مضبوط تھے۔ اس کی عمر اٹھارہ بیس سال کے اندر تھی مگر اپنے قدم کاٹھ کی وجہ سے بڑا دکھائی دیتا تھا۔ ہم بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ آج اس کا موڈ بھی قدرے بہتر تھا۔ کمرے سے بریانی کی خوشبو آ رہی تھی۔ وہ اٹھ کر کمرے کے ایک کونے میں گیا اور ایک رومال کے نیچے ڈھانپی ہوئی پلیٹ لے آیا۔ اس میں حلوہ تھا۔ گاجر کے حلوے پر ابلے ہوئے انڈے کے قتلے اور بادام تھے۔ ہم دونوں نے مل کر کھایا۔ گاجر کا حلوہ اوپر تاجور اور میں نے بھی کھایا تھا۔ کچھ بھی تھا اس ڈکیت گینگ کا کھانا تو مزیدار ہی ہوتا تھا۔

''آج خوب مدارت ہوئی ہے تمہاری؟''

''لیکن خاطر مدارت کا فائدہ تو تب ہوتا ہے جب دل میں بھی خوشی ہو۔ میں تو اندر سے جل رہا ہوں۔ لگتا ہے کہ ایک بھانبھڑ سا رہتا ہے یہاں سینے میں، پتا نہیں وہ کون سا دن ہوگا جب میں یہاں سے نکلوں گا اور چاند گڑھی کے چوک میں کھڑے ہو کر اعلان کروں گا کہ مولوی صاحب کی موت کیسے ہوئی اور اس موت کا ذمّے دار کون کون ہے؟''

''گھبراؤ مت رحیم، سب کچھ ہوگا اور بہت جلد ہو گا۔''

میں نے ایک بار پھر وہ کاغذ اپنی اندرونی جیب سے نکال لیا اور ہم دیے کی روشنی میں اس کے الفاظ پر غور کرنے لگے۔ ہم نے ورق کو الٹ کر پڑھا۔ دائیں سے بائیں کے بجائے بائیں سے دائیں پڑھا۔ اوپر سے نیچے پڑھا، کوئی تسلسل نہیں تھا۔ میں نے کہا۔ ''رحیم، میں نے سنا ہوا ہے کہ ایسی تحریروں کی ایک چابی ہوتی ہے مطلب یہ کہ اگر کوئی ایک لفظ بھی سمجھ میں آ جائے تو پھر پوری تحریر سمجھ میں آ جاتی ہے۔''

''لیکن یہ چابی ڈھونڈے گا کون؟'' رحیم نے زچ ہو کر کہا۔

''ایک لڑکا تو ہے مگر وہ یہاں نہیں ہے۔ کاش وہ یہاں ہوتا یا ہم اس تک پہنچ سکتے۔''

''کون ہے؟''

میں نے اس سے انیق کا ذکر کیا اور بتایا کہ وہ پنجابی، سندھی، بلوچی سمیت بہت سی غیر ملکی زبانیں بھی جانتا ہے۔ با کمال لڑکا ہے۔ دیکھنے میں بالکل عام اور پرکھنے میں خاص الخاص۔ اور واقعی ان لمحوں میں انیق مجھے شدت سے یاد آیا۔ ملنگی ڈیرے پر اس نے جس طرح قدم قدم پر میرا ساتھ دیا۔ اور اپنی جان شدید خطرے میں ڈال کر ریکی کی آزادی کا راستہ ہموار کیا، وہ ناقابلِ فراموش تھا۔

رحیم نے محتاط نظروں سے بیرونی دروازے کی طرف دیکھا اور دھیمی آواز میں بولا۔ ''شاہ زیب صاحب، میں یہاں بند ہوں لیکن آپ تو باہر گھومتے پھرتے ہیں۔ آپ نے سارا جائزہ لے رکھا ہوگا۔ کیا ہم کسی طرح یہاں سے نکل نہیں سکتے؟''

میں نے بلند درختوں پر واقع ان چھوٹی چھوٹی مچانوں کا ذکر کیا، جنہوں نے چاروں طرف سے اس جگہ کو گھیر رکھا تھا اور جہاں چوبیس گھنٹے طاقتور رائفلوں اور ٹیلی اسکوپس والے گارڈز موجود رہتے تھے۔ باتیں کرتے کرتے اچانک میری نگاہ ایک دیوار پر پڑی۔ یہاں کچی پنسل سے کچھ لکھا ہوا تھا۔ میرے پوچھنے پر رحیم نے ذرا شرماتے ہوئے کہا کہ یہ اسی نے لکھا ہے۔ اس نے چند الٹے سیدھے شعر جوڑ رکھے تھے جن میں کسی کے قدموں کی خوب صورت آہٹ کا انتظار تھا۔ اس کے حسین چہرے کی دید کی آرزو تھی جو شبنم سے دُھلے ہوئے پھول جیسا تھا اور جس کی پنکھڑیوں سے جنت کی ہوا کی مہک آتی تھی۔

میں نے کہا۔ ''کوئی منگیتر ہے تمہاری؟ یا کسی کو پسند کرتے ہو؟''

''نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔'' وہ ایک دم سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا۔ ''ایسے ہی بے خیالی میں لکھ ڈالا۔''

اس نے چادر کے پلو سے دیوار کو رگڑ کر جلدی سے الفاظ مٹانے کی کوشش کی۔ اس کوشش میں وہ جزوی طور پر کامیاب ہوا۔ میں نے اسے کریدنے کی کوشش کی مگر جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ پیار محبت یا رومانس والا کوئی معاملہ نہیں ہے۔ بس یہ وہی احساس تھا جو لڑکپن کی عمر کا حصہ ہوتا ہے۔ ایسے ہی کسی کا انتظار، جس کو کبھی دیکھا ہی نہیں، اس کو دیکھنے کی خواہش۔ تصور میں تخلیق کیے ہوئے کسی چہرے کو چھونے کی آرزو۔

ہم ایک بار پھر کاغذ پر لکھے ہوئے ناقابلِ فہم الفاظ کی گتھی کو سلجھانے میں مصروف تھے۔ پہلا فقرہ ہی عجب گنجلک اور مضحکہ خیز تھا۔ رٹسام، پاجب ٹیل وہ۔ روب جم وہ رک ٹلع انکھل اڑپ۔

رحیم نے چبا چبا کر یہ فقرہ پڑھا اور بولا۔ ''پتا نہیں کیوں میرا دل گواہی دیتا ہے کہ یہ خط مولوی جی کی بیٹی زینب والے معاملے سے ہی تعلق رکھتا ہے۔ مجھے تو شک پڑتا ہے کہ یہ لوگ اسے اسپتال سے یا گھر سے اغوا کرنے کا ارادہ رکھتے ہوں گے۔ وہ جتنی بڑی قیمت کی بات کر رہے تھے، اس کے لیے عالمگیر جیسا کمینہ کچھ بھی کر سکتا ہے۔''

رحیم نے اپنی اس خواہش کا اظہار بھی کیا کہ میں کسی طرح اسے ایک ہتھیار فراہم کر دوں۔ وہ از خود یہاں سے نکلنے کی کوشش کرنا چاہتا تھا۔ مجھے پتا تھا کہ یہ اس کی خام خیالی ہے۔ پچھلے چند دنوں میں، میں نے یہاں چلتے پھرتے جو کچھ نوٹ کیا تھا وہ یہ ثابت کرنے کے لیے کافی تھا کہ سجاول سیالکوٹی کو جُل دے کر یہاں سے نکلنا ممکن نہیں۔ کوئی کسی طرح اس گھیرے سے نکل بھی جاتا تو اردگرد کے جنگل میں سجاول کے مسلح افراد موجود تھے۔

گیارہ بجے کے لگ بھگ میں دروازہ مقفل کر کے اور سیڑھیاں چڑھ کر اپنے کمرے میں واپس آ گیا۔ تاجور جاگ رہی تھی۔ حسبِ معمول وہ بستر پر اور میں نیچے چٹائی پر تھا۔ ہم کچھ دیر باتیں کرتے رہے، پھر سونے کے لیے لیٹ گئے۔ میں غنودگی کی حالت میں تھا جب اچانک مجھے کسی گاڑی کی مدھم آواز سنائی دی۔ میرا چونکنا لازمی تھا۔ ابھی تک ہم نے یہاں گھوڑوں اور خچروں کی ٹاپیں ہی سنی تھیں، کوئی گاڑی دکھائی نہیں دی تھی۔ میں نے لالٹین کی لو اونچی کی اور اٹھ کر کھڑکی کے پاس گیا۔ کھڑکی کے پٹ تھوڑے سے کھولے۔ سرد ہوا کا جھونکا اندر آیا۔ اس کے ساتھ ہی آہنی گرل کی دوسری جانب برآمدے اور وسیع صحن کا منظر دکھائی دیا۔ اس کو صحن کے بجائے احاطہ ہی کہنا چاہیے۔ چاروں طرف بلند ٹیلی چٹانیں سر اٹھائے کھڑی تھیں۔ ان چٹانوں سے آگے چیڑ اور پڑتل وغیرہ کے بلند درخت تھے۔ یہ چاندنی رات تھی ابھی دھند بھی نہیں تھی۔ مجھے فاصلے پر ایک گاڑی کی ہیڈ لائٹس نظر آئیں اور ساتھ ہی چار پانچ انسانی ہیولے دکھائی دیے۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا یہ ایک پرانی لینڈ روور جیپ تھی اور عرصۂ دراز سے یہاں اس ڈیرے پر موجود تھی۔

غور سے دیکھنے پر مجھے اندازہ ہوا کہ کسی شخص کو زمین پر لٹایا گیا ہے بلکہ شاید باندھا گیا ہے اور وہ خود کو چھڑانے کے لیے تڑپ اور پھڑک رہا ہے۔ ساتھ ہی اس کی مدھم دور افتادہ آواز بھی کانوں میں پڑ رہی تھی۔ وہ چلنے والی آواز میں

کچھ کہہ رہا تھا مگر فاصلہ زیادہ ہونے کے سبب الفاظ سمجھ میں نہیں آرہے تھے۔

پتا نہیں کہ یہ کون لوگ تھے اور کس کے ساتھ یہ بدسلوکی کررہے تھے۔ بھاری بھرکم جیپ کا انجن پھنکار رہا تھا۔ اس کے اردگرد تاریک پرچھائیں حرکت کرتی نظر آتی تھیں۔ دور کہیں کسی کمرے کے اندر سے شرابی اعظم کی بہکی ہوئی آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ کسی گیت کا ایک ہی مصرعہ بار بار دہراتا چلا جارہا تھا۔ میں نے دیکھا، احاطے میں جس شخص کو باندھ کر زمین پر لٹایا گیا تھا، اس نے ایک بار زور سے حرکت کی اور بلند آواز میں کچھ کہا۔ وہ بہت اذیت میں دکھائی دیتا تھا۔ پھر میں نے ایک ایسا منظر دیکھا جس نے مجھے سرتاپا ہلا دیا۔ جیپ حرکت میں آئی اور بندھے ہوئے شخص کی طرف بڑھی۔ میرے اندازے کے مطابق جیپ کے بائیں جانب والے دونوں پہیے بدنصیب شخص کے سر کے اوپر سے گزر گئے۔ چلاتی ہوئی بلند آواز یکا یک دم توڑ گئی۔ جیپ ریورس ہو کر واپس آئی اور تب ایک بار پھر آگے بڑھی...... جیپ کا وزن بڑھانے کے لیے اس پر کچھ لادا بھی گیا تھا...... اس مرتبہ بھی وہ زمین پر لیٹے شخص کے سر کے اوپر سے گزری۔ یقیناً ایسا مزید تسلی کے لیے کیا گیا تھا، ورنہ یہ بات واضح تھی کہ وہ شخص پہلی مرتبہ جیپ کے نیچے آنے کے بعد ہی جاں بحق ہو چکا تھا۔

''کیا دیکھ رہے ہیں؟'' اچانک عقب سے تاجور کی بھرائی ہوئی آواز سنائی دی۔

''کچھ نہیں، یونہی......'' میں گڑبڑا کر رہ گیا۔

''یہ گاڑی کی آواز کیسی ہے؟'' اس نے غنودہ لہجے میں پوچھا۔

''ان لوگوں کی ہی کوئی پرانی جیپ ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

تاجور وہیں بستر پر بیٹھی رہی اور الجھن آمیز انداز سے میری طرف دیکھتی رہی۔ اس دوران میں بدقسمت شخص کے بے حرکت جسم کو جیپ میں رکھ کر برآمدے کی طرف لایا گیا۔ برآمدے میں اسے جیپ سے اتار لیا گیا۔ کھٹارا جیپ کی ہیڈ لائٹس لاش پر پڑی اور میں جیسے سکتہ زدہ رہ گیا۔ چند سیکنڈ کے لیے لگا کہ دل دھڑکنا بھول گیا ہے۔ یہ رحیم کی لاش تھی۔ وہی رحیم جو قریباً ڈیڑھ گھنٹا پہلے میرے ساتھ گاجر کا حلوہ کھارہا تھا اور کسی طرح یہاں سے نکل جانے کی باتیں کررہا تھا۔ میں نے اسے اس کے لباس سے پہچانا۔ **جین کی** وہی نیلی پتلون جسے پہن کر وہ خود کو بے آرام محسوس کررہا تھا

اور براؤن جیکٹ جس پر سامنے کی طرف سیاہ پٹیاں تھیں۔

میرے جسم کا خون جیسے میرے سر کو چڑھنے لگا۔ میں پلٹ کر دروازے کی طرف گیا۔ ''کہاں جارہے ہیں؟'' تاجور نے کہا اور بستر سے چھلانگ لگا کر مجھے روکنے کی کوشش کی۔

میں اس کی کمزور گرفت سے رکنے والا نہیں تھا۔ میں برآمدے میں پہنچا اور پھر صحن میں آگیا۔ مجھے جیپ کے پاس ہی سجاول سیالکوٹی کھڑا نظر آگیا۔ میری آنکھوں کے سامنے جیسے دھندسی چھارہی تھی۔ میں نے ایک بار پھر جواں سال رحیم کی لاش کی طرف دیکھا۔ خدا کی پناہ...... اس کے سر اور چہرے کا بھرتا بن چکا تھا۔ براؤن جیکٹ کا کالر اور کندھے اس کے خون سے سرخ ہورہے تھے۔ اس کے دونوں ہاتھ اور پاؤں بڑی مضبوطی سے مختلف کپڑوں سے جکڑ دیے گئے تھے۔

''یہ تم نے کیا کیا سجاول؟'' میں سینے کی پوری قوت سے چلایا اور اس کی طرف بڑھا۔ اس سے پہلے کہ میں اپنے ہاتھ اس کے گریبان تک پہنچاتا یا کوئی اور حرکت کرتا، ایک شخص برق رفتاری سے مجھ پر جھپٹا اور دھکا دے کر مجھے پیچھے ہٹا دیا۔ میں اسے پہلی بار یہاں دیکھ رہا تھا۔ وہ چھریرے لیکن نہایت مضبوط جسم کا مالک نظر آتا تھا۔ اس کے دھکے نے مجھے دو تین قدم پیچھے ہٹا دیا۔ اس نے آگے بڑھ کر مجھے دوسری دفعہ دھکیلنے کی کوشش کی تو میرے دماغ میں چنگاریاں بکھر گئیں۔ میں نے اسے گھما کر دیوار سے دے مارا۔ ایک سیکنڈ میں جیسے تہلکہ سا مچ گیا۔ وہ شخص بے حد پھرتی سے مجھ پر جھپٹ پڑا۔ اس کے دو طوفانی مکّے میں نے اپنی کلائیوں پر روکے پھر ٹانگ کی ضرب سے اسے پیچھے ہٹایا۔ ایک لمحے کے اندر ہی مجھے اندازہ ہوگیا تھا کہ مدِمقابل کوئی معمولی شخص نہیں ہے۔ اگر میں نے اسے شروع میں تھوڑی سی بھی ڈھیل دے دی ہوتی تو وہ کوئی بہت کاری وار کر جاتا۔ اگلے تقریباً نصف منٹ تک ہمارے درمیان سخت مارا ماری ہوئی۔ سجاول کے کارندوں کی بلند آوازیں میرے کانوں تک پہنچ رہی تھیں۔ وہ شاید میرے مدِمقابل کو روکنے کی کوشش کررہے تھے۔ اچانک اس نے اپنی غیر معمولی مہارت کا ایک اور ثبوت دیا۔ میری گردن کو اپنے بازو میں دبوچ لیا۔ عرف عام میں اس کو ''نیک لاک'' کہا جاتا ہے۔ یہ خطرناک داؤ بندے کو بے بس کر دیتا ہے۔ میں اس قسم کے پینترے ہزاروں دفعہ بھگت چکا تھا۔ اس سے پہلے کہ میری گردن پر اس کی گرفت مکمل اور مضبوط ہوتی، میں نے اس کی ناف میں گھٹنے کی بھرپور ضرب لگائی۔ اس کی گرفت ذرا نرم پڑی اور میں نے پاؤں کی ضرب سے اسے جیپ کے بونٹ پر پھینک دیا۔ اس نے ایک چنگھاڑ بلند کی اور برق کی طرح میری طرف آیا مگر راستے میں ہی سجاول نے اسے روک لیا۔

''ٹھہرو باقر۔'' سجاول کی گرج دار آواز ابھری......

اور وہ جس کا نام باقر تھا، اپنی جگہ اسی وقت رک گیا۔

اس کا چٹانی چہرہ تمتمایا ہوا تھا اور آنکھوں سے جیسے شعلے نکل رہے تھے۔ میں اپنے تجربے کی بنیاد پر کہہ سکتا تھا کہ وہ ایک اچھا ''لڑاکا'' ہے۔ اس نے بپھری ہوئی سانسوں کے ساتھ کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن سجاول نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا۔ سجاول کی ساری کی ساری توجہ میری طرف تھی۔ وہ عجیب نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں نے آتشیں لہجے میں کہا۔ ''سجاول! یہ تم نے کیا کیا ہے، اس کی جان لے لی۔ کیا قصور تھا اس کا، کیوں اتنی بڑی سزا دی تم نے اِسے؟''

سجاول نے رحیم کی بے چہرہ لاش کی طرف بے پروائی سے دیکھا اور بولا۔ ''تم اس کی بات کررہے ہو؟''

''تو اور کون سی لاش ہے یہاں؟''

''یہ مجرم ہے ہمارا، بھاگنے کی کوشش میں تھا۔ گاڑی کے نیچے آگیا ہے۔'' سجاول نے ایک بار پھر بے پروائی کا انداز اختیار کیا۔

''جھوٹ مت بولو۔ تم نے مارا ہے اِسے۔ اس کی جان لی ہے۔ میں نے خود دیکھا ہے۔''

سجاول نے چند لمحے توقف کیا اور پھر اطمینان سے بولا۔ ''تو کیا ہوا؟ کون سی قیامت ٹوٹ پڑی ہے؟''

''سجاول! تم نے یہ اچھا نہیں کیا۔ تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کو اس کا جواب دینا پڑے گا۔''

سجاول نے مضحکہ خیز انداز میں اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں بھی میرے لیے تمسخر دکھائی دے رہا تھا۔ تب سجاول نے سگریٹ سلگایا اور دھواں میرے چہرے پر چھوڑ کر بولا۔ ''جواب شواب بھی دے لیں گے شاہ زیب صاحب، لیکن پہلے مجھے آپ سے ایک دو سوال کرنے ہیں، اکیلے میں۔''

اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا، سجاول بڑے سکون سے چلتا ہوا ایک اندرونی کمرے کی طرف چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد اس کے دو ساتھیوں نے آٹومیٹک رائفلیں میری جانب سیدھی کرلی تھیں۔ باقر ایک طرف خاموش کھڑا تھا اور ابھی تک مجھے خونی نظروں سے گھور رہا تھا۔

"چلو بھئی سردار صاحب بلا رہے ہیں۔" ایک رائفل مین نے رائفل کو حرکت دیتے ہوئے کہا۔

ان لوگوں نے چند دن پہلے جنگل میں میری زبردست مزاحمت دیکھی تھی اس لیے میرے حوالے سے بڑے چوکس رہتے تھے۔ میری سب سے بڑی مجبوری تاجور تھی۔ ورنہ اپنی طرف اٹھی ہوئی ان رائفلوں کو چکما دینا اور رائفل برداروں سے ٹکرانا میرے لیے بہت زیادہ مشکل نہیں تھا۔ میں رائفل برداروں کے ساتھ اس کمرے کی طرف بڑھا جہاں ایک منٹ پہلے سجاول داخل ہوا تھا۔ تاجور اندر اپنے کمرے میں کھڑکی سے لگی کھڑی تھی اور مجھے بلا رہی تھی۔ میں اس کے پاس رکا۔ اسے تسلی دی اور کہا کہ وہ پریشان نہ ہو، میں سجاول سے بات کر کے دس منٹ میں واپس آجاتا ہوں۔

ہم اندر پہنچے۔ گیس لیمپ کی روشنی میں سجاول رنگین پایوں والی کرسی پر بیٹھا تھا۔ اس کا قد چھ فٹ سے نکلتا ہوا تھا۔ جسم مضبوط، کندھے بھاری اور کمر پتلی تھی۔ وہ عام طور پر سیاہ یا براؤن شلوار قمیص پہنتا تھا، کندھے پر بھاری گرم چادر جھولتی رہتی تھی۔ اس وقت بھی وہ سیاہ شلوار قمیص میں تھا۔ اس نے اپنی تیکھی مونچھوں کو سہلایا اور مجھے اپنے سامنے چارپائی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ دونوں رائفل بردار تذبذب کے عالم میں کھڑے تھے۔ سجاول نے دونوں کو باہر بھیج دیا۔ وہ اب بھی مجھے ٹٹولنے والی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ میری آنکھوں میں جھانک کر بھاری آواز میں بولا۔

"آج مجھے سچ سچ بتاؤ شاہی...... کون ہو تم؟"

"میں نے تمہیں سب کچھ بتا دیا ہے۔" میں نے غصیلے لہجے میں کہا۔

"اور بہت کچھ چھپا بھی لیا ہے۔" وہ ترت بولا۔ "تم وہ نہیں ہو جو خود کو بتاتے ہو اور اس کا ایک ثبوت آج پھر میرے سامنے آیا ہے۔ تم نے ابھی باقر کو آڑے ہاتھوں لیا ہے۔"

"شکر کرو بس آڑے ہاتھوں لیا ہے۔ اس کا کھوپڑا نہیں توڑ دیا۔"

"یہی تو میں کہہ رہا ہوں۔ یہ لڑکا میرے بہترین "لڑنے والوں" میں سے ہے بلکہ بہترین ہے۔ اس نے جس طرح تمہاری گردن اپنے بازو میں لی تھی، یہ تمہارے لیے فل اسٹاپ تھا۔ لیکن تم نے اپنی گردن چھڑالی۔ میں سمجھتا ہوں، یہ غور کرنے والی بات ہے۔"

میں خاموش رہا۔

وہ سگریٹ کا طویل کش لے کر بولا۔ "مجھے لگتا ہے شاہی! تم نے لڑائی مار کٹائی باقاعدہ سیکھ رکھی ہے اور شاید باہر کے ملکوں میں...... پیشہ ور فائٹروں سے لڑتے بھی رہے ہو۔ ویسی ہی خونی کشتیاں جیسی ہم ٹی وی پر دیکھتے ہیں۔"

"مجھے نہیں پتا تم ایسی باتیں کیوں کر رہے ہو۔ میں جو کچھ ہوں تمہارے سامنے ہوں اور مجھے اس بات پر شدید دکھ ہے کہ تمہارے کارندوں نے بیدردی سے اس بے گناہ لڑکے کی جان لی ہے۔"

"تم تو اس طرح بات کر رہے ہو جیسے تمہارا کوئی گہرا رشتہ تھا اس سے۔"

"ہر انسان کا دوسرے انسان سے رشتہ ہوتا ہے۔ یہ جو کچھ میری آنکھوں کے سامنے ہوا ہے، میرے کلیجے کو چیر رہا ہے۔ اس نے کون سا اتنا بڑا جرم کر رکھا تھا کہ اس چھوٹی سی عمر میں تم نے اسے موت کی سزا دے دی؟"

"جن باتوں کا تمہیں پتا نہیں شاہی، وہ نہ ہی کرو تو اچھا ہے۔ فی الحال میں تم سے صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تم...... اصل میں ہو کون۔ اور یہ لڑائی کی ٹریننگ کہاں سے لی ہے تم نے، کہیں فوج یا اسپیشل پولیس وغیرہ سے تو تعلق نہیں تمہارا؟"

"میری کسی بات پر تم نے یقین کیا ہے جو اب کرو گے؟ اگر کوئی شک ہے تو اپنے طور پر تصدیق کرالو۔ میں نے جو کچھ تمہیں بتایا تھا، وہی سچ ہے۔"

"خیر تصدیق تو میں کروں گا اور اس کا میرا اپنا طریقہ ہے۔" اس نے کہا۔ کچھ دیر سگریٹ کے روشن سرے کو گھورتا رہا پھر میری طرف دیکھے بغیر بولا۔ "میں تمہیں باقر سے لڑانا چاہتا ہوں۔ ایک کے ساتھ ایک...... وہ کیا کہتے ہیں، ون ٹو ون۔"

"کیا جاننا چاہتے ہو؟"

"تم کتنے پانی میں ہو۔" وہ گہرا کش لے کر بولا۔

"پانی کا پتا چل گیا، تو پھر کیا ہوگا؟ مجھے اپنا پارٹنر بنالو گے؟"

"کیا پتا؟"

"تو پھر مجھے اپنی جگہ ہی کیوں نہیں دے دیتے۔ خود لڑلو مجھ سے۔ فلموں میں تو ہم نے یہی دیکھا ہے۔ جو جیت جاتا ہے وہ سردار بن جاتا ہے۔"

"فلموں کے سردار اور اس سردار میں بہت فرق ہے شاہی جی۔" سجاول نے سخت طنزیہ لہجے میں کہا۔ یہ بات کہتے ہوئے اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں عجیب سا غرور اور

پُراسراریت ابھر آئی۔

رحیم کی لاش کی دید نے میرے سر میں انگارے سے بھر دیے تھے۔ میں کچھ ایسی ہی کیفیت محسوس کررہا تھا جو ''مراد پور'' میں اپنی چچی اور چچی زاد کی موت کے وقت ہوئی تھی۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ سارے اندیشے بالائے طاق رکھ کر سجاول پر جا پڑوں۔ اسے ماردوں یا خود مر جاؤں۔ لیکن میرے پاؤں میں تاجور کی بیڑی تھی۔ میں اس کے لیے چھوٹے سے چھوٹا خطرہ مول لینے کے لیے بھی تیار نہیں تھا۔ بس صبر کے گھونٹ بھر کر رہ گیا۔

''کیا سوچ رہے ہو؟'' سجاول کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

''سچ پوچھتے ہو تو اس وقت تمہاری کوئی بات میرے پلے نہیں پڑ رہی۔ میرے دماغ میں صرف اس لڑکے کی لاش ہے۔''

سجاول نے کرسی سے ٹیک لگاتے ہوئے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ باہر رات کا گہرا سناٹا تھا۔ دھند کی وجہ سے اب چاندنی دھندلانا شروع ہوگئی تھی۔ سجاول کے کارندے جواں مرگ کی لاش کے ساتھ کچھ کررہے تھے۔ شاید اسے خچر وغیرہ پر لاد رہے تھے۔ سگریٹ کا گہرا کش لے کر سجاول نے کہا۔ ''یوں سمجھو کہ اس منڈے کو ہم نے نہیں کسی اور نے موت کی سزا دی ہے۔ میرے بندوں نے صرف جلاد والا کام کیا ہے اور کچھ نہیں۔''

''کیا کہنا چاہتے ہو؟''

''یہ لڑکا چاند گڑھی کے ایک زمیندار کا مجرم تھا۔ بہت بڑا دھوکا کیا تھا اس نے زمیندار کے ساتھ...... زمیندار اسے مارنے کا فیصلہ کرچکا تھا۔ بالکل پکا فیصلہ کرچکا تھا۔ لیکن اتفاقاً میرے کارندے فخرو نے اسے دیکھ لیا۔ فخرو کو اندازہ ہوا کہ یہ لڑکا ہمارے بہت کام آسکتا ہے۔ اس نے زمیندار سے لڑکے کو مانگ لیا اور یہاں لے آیا۔ یہاں اس نے کچھ دن اور جی لیا، کھا پی بھی لیا۔ اب یہ ہمارے کام آگیا ہے۔''

''کام آنے سے تمہارا کیا مطلب ہے؟'' میں نے جلتے لہجے میں پوچھا۔

وہ کچھ دیر سوچ میں رہا، پھر بولا۔ ''چلو تمہیں بتا ہی دیتے ہیں .... میرے جس لڑکے سے ابھی تمہاری جھڑپ ہوئی ہے۔ اس کا نام باقر ہے۔ تم نے باقرے کا قد کاٹھ اور جسم دیکھا ہوگا۔ وہ اس مرنے والے لڑکے کے بالکل مطابق ہے اور اس باقرے کے پیچھے آزاد کشمیر کی پولیس بڑے زوروشور سے پڑی ہوئی ہے۔ میرا خیال ہے کہ میری بات کچھ کچھ تمہاری سمجھ میں آرہی ہوگی۔''

میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ اور مجھ پر یہ حقیقت کھلی کہ پولیس سے باقر کی جان چھڑانے کے لیے رحیم کو مارا گیا ہے اور اس کا چہرہ مسخ کیا گیا ہے۔

سجاول نے اطمینان سے کہا۔ ''اس لڑکے نے مرتو ویسے بھی جانا تھا اب یہ ہمارے کچھ نہ کچھ کام آگیا ہے۔ ہم اس کی لاش کو کسی ایسی جگہ پھینکیں گے جہاں یہ آوارہ جانوروں سے محفوظ رہے اور کل تک پولیس کی نظر میں بھی آجائے۔ اس کے لباس میں کچھ ایسی چیزیں رکھ دی جائیں گی، جن سے اس کی شناخت باقر کے طور پر ہوگی۔'' سجاول نے اپنی بات ختم کی اور سکون سے دوسرا سگریٹ سلگانے میں مصروف ہوگیا۔

اب بات بالکل واضح ہوگئی تھی۔ سجاول چاند گڑھی کے جس زمیندار کی بات کررہا تھا، وہ اس خبیث عالمگیر کے سوا اور کون ہوسکتا تھا...... پھر مجھے وہ زخم والی بات بھی یاد آئی۔ یہ زخم کچھ عرصہ قبل چاند گڑھی میں بدقسمت رحیم کی کمر پر لگایا گیا تھا۔ یہ زخم بھی یقیناً پولیس اور قانون کو دھوکا دینے کے لیے ہی تھا۔ غالب امکان تھا کہ سجاول کے کارندے باقر کے جسم پر بھی ایسا ہی کوئی زخم موجود تھا۔ ہوسکتا ہے کہ یہ زخم پولیس والوں سے بچتے اور بھاگتے ہوئے ہی اس کے جسم پر آیا ہو۔

شاید سجاول سے میری یہ سنگین گفتگو کچھ دیر مزید جاری رہتی مگر اسی دوران میں چند مہمان اس سے ملنے آگئے۔ یہ بڑے بڑے پگڑوں والے کرخت چہرہ افراد تھے۔ کئی ایک کی کمر سے بڑے بڑے چھرے بندھے ہوئے تھے۔ ان کے حلیوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ سرد رات میں کہیں دور سے سفر کرکے آئے ہیں۔

میں کمرے میں تاجور کے پاس واپس پہنچا۔ وہ سخت مضطرب دکھائی دیتی تھی۔ یقیناً اس نے بھی کچلی مسلی لاش دیکھ لی تھی۔ وہ بستر پر بیٹھی تھی اور لحاف کو اپنے گردیوں لپیٹ رکھا تھا، جیسے وہ کوئی حفاظتی دیوار ہو، جس میں وہ خود کو چھپا رہی ہو۔ اس کی آنکھوں میں غصہ، دکھ اور خوف اس طرح گھل مل گئے تھے کہ ایک کو دوسرے سے جدا کرنا ممکن نہیں تھا۔ پریشان لٹیں چہرے پر جھول رہی تھیں۔

وہ کراہتے ہوئے بولی۔ ''یہ سب کیا ہورہا ہے شاہ زیب! آپ سب کچھ جانتے ہیں لیکن مجھ سے چھپا رہے ہیں۔ کیوں اندھیرے میں رکھ رہے ہیں مجھے؟ اگر ہمیں بھی اس لڑکے کی طرح مرنا ہی ہے تو پھر مجھے ابھی اپنے ہاتھوں

سے ماردیں۔"

رحیم کی لاش کے اندوہناک منظر نے پہلے ہی میرے کاسئہ سر میں کھلبلی مچا رکھی تھی۔ تاجور کے اضطراب نے مجھے مزید دل گرفتہ کر دیا۔ میں نے کہا۔ "تاجور! تمہیں پہلے بھی بتایا ہے، اس طرح رونے دھونے سے کچھ نہیں ہوگا۔ تمہیں ان حالات سے نکلنے کے لیے حوصلہ کرنا پڑے گا۔" میرا لہجہ درشت تھا۔

تاجور نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ کہتے ہیں کہ جس نے کبھی کچھ نہ کہا ہو، وہ پھول بھی مارے تو پتھر کی طرح لگتا ہے۔ تاجور کے زرد چہرے پر رنگ سا آکر گزر گیا۔ میں منہ پھیر کر واش روم کی طرف چلا گیا۔ میرا چہرہ جیسے آگ میں دہک رہا تھا۔ میں نے سردی کے باوجود ٹھنڈے پانی سے ہاتھ منہ دھویا، پھر بھی بے قراری کم نہیں ہوئی تو سر بھی دھو ڈالا۔ دہکتے ہوئے انگارے کچھ ماند پڑے۔ تولیے سے سر رگڑتا ہوا باہر نکلا تو تاجور سہمی ہوئی سی گم صم لیٹی تھی۔ لحاف کی لرزش سے پتا چل رہا تھا کہ رو رہی ہے۔

مجھے اپنے لہجے پر افسوس ہوا۔ لالٹین کی لو نیچی کر کے میں کافی دیر چٹائی پر کمبل اوڑھے لیٹا رہا۔ تاجور کی دبی دبی سسکی کسی وقت کانوں میں شدید جلن پیدا کر دیتی تھی۔ آخر میں اٹھا اور بستر پر جا بیٹھا۔

میں نے اس کے بالوں میں انگلیاں چلائیں۔ اسے سمجھایا، پچکارا۔ اپنے درشت لہجے پر معذرت طلب کی۔ وہ ایک دم پلٹ کر میرے گلے سے لگ گئی اور رونے لگی۔ میں نے اسے اپنی بانہوں میں لے لیا، اس کی آنکھوں سے بہنے والا گرم پانی میرے گریبان کو نم کر رہا تھا۔ اس نے اپنا چہرہ میرے سینے میں یوں گھسا رکھا تھا جیسے اسے ہمیشہ وہیں پر رکھنا چاہتی ہو۔ ہم بستر پر نیم دراز تھے۔ کچھ بول نہیں رہے تھے لیکن خاموشی ہی زبان بن گئی تھی۔

میں نے اس کے آنسو صاف کیے۔ جرأت کر کے اس کی پیشانی پر بوسہ دیا۔ اس نے ایک بار پھر اپنا سر میرے سینے پر ڈال دیا۔ "کون تھا یہ، جس کو مارا ہے انہوں نے؟" وہ بھیگی آواز میں بولی۔

"ان کا کوئی کارندہ تھا۔ لڑکا سا تھا۔ شاید کسی کو زخمی کر کے بھاگنے کی کوشش کر رہا تھا۔" میں نے بات بنائی۔

میں یہ بتا کر تاجور کے خوف میں اضافہ کرنا نہیں چاہتا تھا کہ یہ وہی مؤذن لڑکا رحیم ہے جس سے ملنے میں تہ خانے میں جاتا تھا۔

"کیا یہ ہم کو بھی کسی دن اسی طرح مار ڈالیں گے؟"

"یہ ہمارا بال بھی بیکا نہیں کر سکتے۔ تم مجھ پر بھروسا رکھو۔ میں نے ایسے بہت سے لوگوں سے نمٹا ہوا ہے۔ اللہ نے چاہا تو اب بھی سب اچھا ہوگا۔"

میں اس سے تسلی تشفی کی باتیں کرتا رہا، وہ میرے ساتھ لگی لگی، جیسے غنودگی میں چلی گئی اور پھر سو گئی۔

میری آنکھوں کے سامنے بار بار رحیم کا چہرہ آجاتا تھا۔ اس کی آواز، اس کا نوخیز سراپا۔ وہ آج بڑے اچھے موڈ میں تھا۔ اس نے نہا دھو کر لباس بدلا تھا اور بہت دنوں بعد اچھا کھانا کھایا تھا۔ اسے کیا پتا تھا کہ یہ اچھا کھانا اسی طرح ہے جس طرح قربانی کے جانور کو قربانی سے پہلے کھلایا جاتا ہے۔ وہ بریانی، وہ گاجر کا حلوہ، اس کے آخری لقمے تھے، پھر اسے بیدردی سے مار دیا گیا تھا۔ مجھے وہ چلاتی ہوئی آوازیں یاد آگئیں جو جیپ کے حرکت میں آنے سے قبل میرے کانوں تک پہنچی تھیں۔ مجھے پتا نہیں تھا، یہ کس کی آوازیں ہیں، نہ ہی الفاظ سمجھ میں آئے تھے لیکن اب میں جانتا تھا کہ وہ جواں مرگ رحیم کی پکار تھی، یقیناً اس وقت اس نے موت اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ لی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ اس نے منت سماجت تو نہیں کی ہوگی۔ وہ طیش کے عالم میں ان پر دہاڑا ہوگا۔ ان کو بددعائیں دی ہوں گی اور صلواتیں سنائی ہوں گی۔ وہ ان سب کو مولوی فدا کا قاتل سمجھتا تھا اور مولوی فدا کے قتل کا پچھتاوا ہر وقت اس کی روح کو چھیدتا رہتا تھا۔

اس کے آخری الفاظ میرے کانوں میں گونجنے لگے۔ اسی تہ خانے میں، دو دن پہلے اس نے مجھ سے کہا تھا...... لگتا ہے کہ یہ لوگ مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے، اگر مجھے کچھ ہو گیا تو میرا ادھورا کام ضرور پورا کرنا۔ اگر خود سامنے نہ آنا چاہو تو کسی طریقے سے یہ اطلاع تھانے کچہری تک ضرور پہنچانا کہ مولوی جی کا قتل عالمگیر اور اسحاق نے میرے ذریعے کروایا ہے...... اس وقت میں نے رحیم کو تسلی دی تھی اور اسے کہا تھا کہ وہ خوامخواہ ایسے اندیشے اپنے ذہن میں نہ لائے، وہ یہاں سے نکلے گا اور خود یہ اطلاع پولیس تک پہنچائے گا۔

اس وقت مجھے ہرگز معلوم نہیں تھا کہ رحیم کے اندیشے اتنے ٹھوس ہیں اور موت اس کے اس قدر نزدیک ہے۔

اس کے مرنے کی عمر کہاں تھی۔ یہ تو وہ موسم ہوتا ہے جس میں بھرپور زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔ اڑانیں بھری جاتی ہیں، منزلوں کو تلاشا جاتا ہے، جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھے جاتے ہیں۔ مجھے تہ خانے کی دیوار پر کچی پنسل سے لکھے ہوئے وہ شعر یاد آئے، جن میں کسی ایسے حسین معصوم چہرے کا ذکر تھا جس کو کبھی دیکھا نہیں گیا تھا، کسی ایسے خط کا انتظار جو پتا نہیں کہاں سے آنا تھا، کسی ایسی دستک کا تذکرہ تھا جو خبر نہیں کس نے دینا تھی اور کب؟

اب وہ حسین چہرہ، وہ خط، وہ دستک، سب جواں مرگ رحیم کے ساتھ ہی قبر میں اترنے والے تھے، نجانے کچھ ظالم لوگ، کچے ذہنوں اور نومیدہ پھولوں کو کیوں زہر آلود کر کے فنا کے گھاٹ اتار دیتے ہیں۔ جوشیلے رحیم کی کہانی بھی تو یہیں سے شروع ہوئی تھی۔ اسے عقیدے اور مسلک کی بنیاد پر مولوی فدا کے خلاف اتنا بھڑکایا گیا تھا کہ وہ ان کی جان لینے پر آمادہ ہو گیا۔ اگلے روز میری ملاقات عمر رسیدہ فیض محمد سے اس کے کمرے میں ہوئی۔ وہ مجھ پر بہت برہم نظر آتا تھا۔ اس نے چھوٹتے ہی کہا۔ "تم شکل سے سمجھ دار لگتے ہو پر پتا نہیں کیوں بے وقوفی کر کے اپنے لیے مشکل بھی پیدا کر لیتے ہو۔ پہلے تم نے یہاں آتے ہوئے، راستے میں ہم پر کلاشنکوف چلانے کی کوشش کی، تمہاری زندگی شاید باقی تھی اس لیے یہ کوشش کامیاب نہ ہوئی۔ پھر تمہارا جھوٹ پکڑا گیا کہ تم ہری پورہ سے نہیں چاند گڑھی سے آئے ہو اور تمہارے ساتھ آنے والی لڑکی کا نام شمسہ نہیں تاجور ہے اور وہ زمیندار دین محمد کی بیٹی ہے۔ تمہارے اس جھوٹ پر سردار تمہاری گردن کاٹ کر تمہارے جسم سے وکھری کر سکتا تھا مگر خوش قسمت ہو کہ ماؤ جی کی وجہ سے بچے رہے۔ اب رات کو پھر تم نے غلط حرکت کی۔ تمہیں کیا ضرورت تھی سردار سجاول کے گلے پڑنے کی؟"

"ضرورت تھی۔" میں نے اطمینان سے کہا۔ "مجھ سے اس طرح کا ظلم برداشت نہیں ہوتا۔"

"اور اب جو ظلم تم پر ہوگا، وہ کیسے برداشت کرو گے۔ سردار نے تمہاری شہ زوری کا کچومر نکالنے کے لیے تمہیں بھوکے بگیاڑ (بھیڑیے) کے سامنے ڈالنے کا اعلان کیا ہے۔"

"کون بھوکا بگیاڑ؟"

"یہی باقرا۔ تم اسے کیا سمجھتے ہو۔ یہ خالی ہاتھوں سے دو منٹ کے اندر بندے کو لولا لنگڑا کر کے پھینک دیتا ہے۔ چودہ پندرہ قتل کیے ہوئے ہیں۔ اسے ایسے ہی بگیاڑ نہیں کہا جاتا۔"

"ایسے بگیاڑوں کے منہ میں ہاتھ ڈال کر مجھے ان کا

کلیجا نکالنا اچھی طرح آتا ہے۔ لیکن مجھے تمہارے سردار سجاول کی بات کا مزہ نہیں آیا۔ میں نے اس سے کہا تھا کہ وہ چمچے کو میرے سامنے کیوں لاتا ہے۔ یہ میرے پائے کا بندہ نہیں ہے۔ کوئی بڑا بگیاڑ لے کر آئے یا پھر خود آجائے۔''

فیض نے آنکھیں پھاڑ کر میری طرف دیکھا۔ ''تت...... تم نے یہ بات سردار سجاول سے کہی تھی؟''

''بالکل کہی تھی۔''

فیض کچھ دیر تک گم صم میری طرف دیکھتا رہا، پھر اس نے اپنا ماتھا پکڑ کر سر جھکالیا۔ دس پندرہ سیکنڈ تک اسی طرح بیٹھا رہا تب میری طرف دیکھ کر بولا۔ ''میں غلط نہیں کہہ رہا کہ تم بڑی بڑی بے وقوفیاں کررہے ہو۔ سردار سجاول کے بارے میں کیا جانتے ہو تم، کہ تم نے ان کو اپنے ساتھ لڑنے کا کہہ دیا؟''

''میں بس اتنا جانتا ہوں کہ وہ تمہارا سردار ہے اور یقیناً تم لوگوں کے لیے رستمِ ہند اور رستمِ زماں وغیرہ وہی ہو گا۔''

''تم اس کے بارے میں خاک بھی نہیں جانتے۔'' فیض محمد نے لرزاں لہجے میں کہا۔ ''اگر جانتے ہوتے تو ایسی بات ہرگز نہ کرتے۔'' اس نے چند لمحے توقف کر کے اپنی بڑی بڑی سفید مونچھوں کو سہلایا اور بولا۔ ''تم نے چاند گڑھی میں بھی سردار اور اس کے ساتھیوں کو دیکھا ہوگا، یہاں بھی دیکھ رہے ہو، کیا تم نے کبھی یہ بھی دیکھا ہے کہ سردار نے خود کسی پر ہاتھ اٹھایا ہو، یا لڑائی مار کٹائی میں حصہ لیا ہو؟''

''نہیں، ایسا تو نہیں دیکھا۔'' میں نے کہا۔

''اور شاید دیکھو گے بھی نہیں۔'' فیض نے عجیب لہجے میں کہا۔ ''سردار کا تعلق وادیٔ سون کے ایک پرانے جنگجو قبیلے سے ہے۔''

''تو اس سے کیا ہوتا ہے؟'' میں نے دریافت کیا۔

''اس سے بہت کچھ ہوتا ہے۔ تمہیں بہت سی باتوں کا پتا نہیں۔ تمہارے حق میں بہتر ہے کہ انہیں جان لو۔'' فیض محمد نے کہا اور سگریٹ کا کش لے کر بولا۔ ''یہ بات سب مانتے ہیں کہ سردار کے قبیلے میں پرانے زمانے سے ایک ریت چلی آرہی ہے۔ قبیلے کی ہر نئی نسل میں بڑے بیٹے کا بڑا بیٹا کوئی خاص ہنر لے کر پیدا ہوتا ہے۔ یہ لڑائی کا ہنر ہی ہوتا ہے۔ میں تمہیں بتاتا ہوں...... مثال کے طور پر...... سردار سجاول کے پڑدادا تلوار چلانے کا خاص ہنر رکھتے تھے۔ وہ دونوں ہاتھوں سے برابر مہارت کے ساتھ تلوار چلاتے تھے۔ انگریزوں سے آزادی والی لڑائی میں انہوں نے بہت سے انگریز سپاہیوں اور افسروں کو قتل کیا۔ انہیں پھانسی ہوئی تھی۔ اسی طرح اگلی نسل میں ہاشم خاں کشتی کے فن میں ماہر تھا۔ وہ چھریرے جسم والا ایک ایسا پہلوان تھا جس نے بڑے بڑوں کا پتا پانی کردیا تھا۔ سردار سجاول کے والد کمال کا ''نشانہ'' لے کر پیدا ہوئے تھے۔ اس جیسا نشانے باز سون کی وادی نے آج تک نہیں دیکھا۔ بے شمار لوگ اس بات کے گواہ ہیں کہ وہ اُڑتے پرندے کے سر کو نشانہ بنا سکتے تھے۔ ان کا نام خداداد چل تھا۔ ہمارا سردار خداداد صاحب کا بڑا بیٹا ہے اور اللہ نے اسے بھی ایک خاص فن دے کر بھیجا ہے۔ یہ لڑائی بھڑائی کا فن ہے۔ سردار جس سے لڑتا ہے، اسے اکثر موت کا منہ دیکھنا پڑ جاتا ہے۔''

''لگتا ہے کہ تم کوئی کہانی سنا رہے ہو۔''

''ہے تو کہانی لیکن سو فیصد سچی، دعا کرو، کبھی اس کہانی کی سچائی تمہیں اپنی آنکھوں سے نہ دیکھنا پڑے۔ سردار اول تو کسی سے لڑتا نہیں لیکن جب لڑتا ہے تو پھر طیش کے ریلے میں بہہ جاتا ہے۔ خاص طور پر سردار کے دائیں ہاتھ میں بے حد طاقت ہے۔ شاید یہ وہی طاقت ہے جو مختلف شکلوں میں نسل در نسل اس خانوادے میں آئی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ تمہیں یہ بات عجیب لگے، سردار کے دائیں ہاتھ کی چوٹ سے کئی بار مدِمقابل کی گردن ٹوٹ جاتی ہے۔''

''ہاتھ کی چوٹ یعنی مُکّے سے گردن ٹوٹ جاتی ہے؟'' میں نے تعجب سے کہا۔

''تمہیں حیرانی ہورہی ہوگی، ایسی حیرانی بہت سے لوگوں کو ہوتی ہے لیکن جب کوئی اپنی آنکھوں سے یہ منظر دیکھ لیتا ہے تو پھر اس کو حیرانی نہیں ہوتی، خوف اور دہشت کا حملہ ہوتا ہے اس پر...... اور یہ دہشت بیٹھ جاتی ہے اس کے دل میں۔''

فیض محمد نے مجھے سردار سجاول کے حوالے سے کئی ایسی باتیں بتائیں جن پر یقین کرنا مشکل تھا۔ ان میں سے کچھ باتیں ایسی بھی تھیں جو واضح طور پر اس عقیدت کا شاخسانہ تھیں جو بوڑھا فیض محمد اپنے جوان سردار سے رکھتا تھا۔

اسی دوران میں میری نگاہ پہلوان حشمت پر پڑگئی۔ وہ یہاں اپنے کسی مریض کو دیکھ کر واپس اپنی کوٹھڑی کی طرف جارہا تھا۔ چلتے ہوئے اس کی توند ہچکولے کھا رہی تھی

اور شام کے جھٹپٹے میں اس کا گندمی رنگ مزید گندمی نظر آرہا تھا۔ ایک رائفل بردار رائفل کندھے سے لٹکائے اس کے ساتھ ساتھ تھا۔ سامنے نظر آنے والی دو بلند مچانوں پر جگنو چمک رہے تھے۔ یہ جگنو دراصل وہ سلگتے ہوئے سگریٹ تھے جو اکثر مچان نشین پہرے داروں کے ہاتھوں میں نظر آتے تھے۔

میں فیض محمد کے پاس سے اٹھ کر پہلوان کے ساتھ اس کی کوٹھڑی کی طرف چل دیا۔ پہلوان میری طرف سے کچھ پریشان نظر آرہا تھا۔ کوٹھڑی میں پہنچ کر اس نے مجھ سے کہا۔ ''یہ کیا تماشا لگا دیا ہے تم نے۔ سنا ہے سردار نے کل اپنے ایک خاص بندے سے تمہاری لڑائی کروانے کا فیصلہ کیا ہے اور وہ بندہ ایسا ہے کہ ایک منٹ میں دو جے کے ہاتھ پاؤں توڑ ڈالت ہے۔ تمہیں کیا ضرورت ہے ہر جگہ اپنی جوانی کا ڈھنڈورا پیٹنے کی؟''

میں نے پہلوان کو مؤذن رحیم کے دردناک انجام کے بارے میں بتایا اور تفصیل سے ذکر کیا کہ ان لوگوں نے کس طرح بے رحمی سے اسے موت کے گھاٹ اتارا ہے۔

پہلوان حیران تو ہوا لیکن اس نے خاص دکھ کا اظہار نہیں کیا۔ اپنے مخصوص انداز میں بولا۔ ''جو کچھ بھی ہے لیکن وہ ہمارے مولوی جی کا قاتل تھا۔ اسے اپنے کیے کی سزا ملی۔''

''مگر وہ تو خود اپنے جرم پر شرمندہ تھا۔ اصل قاتلوں کو بے نقاب کرنا چاہتا تھا۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ وہ ایک بہت بڑی ذمے داری ڈال گیا ہے ہم پر۔''

''لیکن اس ذمے داری میں یہ کا ہے کو شامل ہو گیا کہ تم سجاول کے ایک خطرناک بندے سے لڑائی مار کٹائی کرو گے۔ اس سے ہوگا کیا؟ وہ زخمی ہو جاوے گا یا تمہاری ایک دو ہڈیاں ٹوٹ جاویں گی۔''

''یہ لڑائی والا پروگرام میرا بنایا ہوا نہیں ہے پہلوان جی۔ سردار سجاول کو ہی کچھ سوجھی ہے۔ اس سے فائدہ کیا ہو گا، یہ بھی وہی بتا سکتا ہے۔ شاید وہ چاہتا ہے کہ میری وجہ سے باقر کی جو تھوڑی سی بے عزتی ہوئی ہے، اس کا مداوا ہو جائے اور وہ سب کے سامنے مجھے کچھ پھینٹی لگا سکے۔'' میں نے ذرا توقف کرنے کے بعد بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''جہاں تک ہڈی وغیرہ ٹوٹنے کا مسئلہ ہے، تمہارے ہوتے ہوئے، مجھے اس کی کیا فکر؟''

''مجھے تو ابھی تلک یہ سمجھ نا ہیں آئی کہ یہ کس طرح کی لڑائی ہووے گی، کشتی ہووے گی، مُکّے بازی یا پھر چاقو واقو چلاؤ گے تم دونوں؟''

''فیض محمد تو یہی بتا رہا تھا کہ خالی ہاتھ لڑائی ہوگی۔ ایسی لڑائیاں دروازے کی دائیں طرف والے بڑے کمرے میں ہوتی ہیں۔ سردار سجاول بھی موجود ہوتا ہے اور وہ موقع پر دیکھ کر فیصلہ کرتا ہے کہ کس کا پلڑا بھاری رہا ہے۔''

''شاہ زیب، تم نے وہی کام کیا ہے کہ...... آ بیل، مل کر کریں آہ و زاریاں۔'' پہلوان نے حسبِ عادت محاورے کی ہڈی توڑی۔ ''تمہیں بھلا کیا ضرورت پڑی تھی اس پھڈے میں ٹانگ اڑانے کی۔ ہمارا تو بس ایک ہی مقصد ہونا چاہیے کہ ہم کسی نہ کسی طرح یہاں سے نکل جاویں۔ مجھے تو لگت ہے کہ یہاں تاجور کی عزت بھی داؤ پر لگی ہوئی ہے۔ اس کے ساتھ کسی بھی وقت کچھ ہو سکت ہے۔ تم نے دیکھا ہی ہووے گا۔ اس رات وہ سؤر کا تخم وڈا سردار کس طرح تمہارے کمرے کے سامنے بڑھکیں مار رہا تھا۔''

وڈے سردار کی عمر کافی لمبی تھی۔ ادھر پہلوان نے اس کا ذکر کیا ادھر وہ آن موجود ہوا۔ اس کا بھاری بھرکم تھوبڑا غصے سے تمتما رہا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں طوائف زادی نگینہ کا ہاتھ تھا اور وہ اسے جیسے کھینچتا ہوا اپنے ساتھ لا رہا تھا۔ پہلوان کے سامنے آ کر وہ دھاڑا۔ ''یہ تم نے کیا کیا ہے، اپنی اس ماں کے ساتھ؟''

''کک کیا ہوا جی؟'' پہلوان ہکلایا۔

''تمہیں کہا تھا کہ اس کے بازو کی مالش وغیرہ کرنی ہے کہ یہ اوپر نیچے ہل سکے۔ تم نے اس کی ہڈی کچی کر کے توڑ دی۔'' وڈا سردار غصے سے پہلوان پر جھپٹا۔ اس کی ٹانگ کی ضرب پہلوان کی توند پر لگی اور پہلوان سیدھا میری گود میں آیا۔

بوڑھا فیض محمد بھاگتا ہوا موقع پر پہنچا۔ اس نے غصیلے سردار اعظم کو بمشکل روکا اور پوچھا کہ ہوا کیا ہے۔ اعظم پھر دہاڑا۔ ''کس کھوتے کے پتر کو پکڑ کر تم یہاں لے آئے ہو۔ یہ اندھی ماں کا نابینا سرجن پتر...... کہتا ہے مجھے ہڈی پٹھے کا کام آتا ہے، اس نے اس کڑی کی اچھی بھلی جڑی ہوئی ہڈی توڑ دی ہے۔'' اس نے اپنا نچلا ہونٹ دانتوں تلے لے کر ایک بار پھر پہلوان پر جھپٹنا چاہا۔ فیض محمد نے اسے کوشش کر کے روکا۔

پہلوان کا رنگ فق ہو رہا تھا۔ وہ منمنایا۔ ''میں نے تو ایکسرے کے مطابق ہی سب کچھ کیا ہے......''

''کون سا ایکسرے کھینچا تھا تیرے پیو نے یہاں

جنگل میں؟'' وڈا سردار اعظم دہاڑا۔

پہلوان نے جلدی سے جھک کر تکیے کے نیچے سے ایک ایکسرے نکال لیا اور اعظم کو دکھایا۔

اعظم نے ایک بار پھر کھڑے کھڑے پہلوان کی توند پر لات رسید کرنے کی کوشش کی۔ اس مرتبہ میں نے یہ لات اپنی پسلیوں پر کھا کر پہلوان کو بچایا۔ اعظم گرجا۔ ''یہ تین مہینے پہلے کا ایکسرے ہے...... اور ہڈی جڑنے سے پہلے کا ہے۔ الّو کے پتر! تجھے یہ تاریخ لکھی نظر نہیں آرہی تھی، اس کے اوپر......؟''

پہلوان پھر منمنایا۔ ''ایسی بات تھی بھیا جی...... تو مریضہ مجھے ایکسرے دکھاتی ہی نا ہیں۔''

نگینہ چیخ کر بولی۔ ''موٹے، مردود...... موٹے! مریضہ ہوگی تیری ماں...... تو خود ہی تو کہہ رہا تھا کہ کوئی پرانا ایکسرے ہے تو وہ بھی لے آنا......''

خوب ہنگامہ مچا۔ مجھے ڈر محسوس ہوا کہ کہیں پہلوان کی اپنی ہی کوئی ہڈی نہ ٹوٹ جائے۔ فیض محمد نے بڑی ہمت اور دانشمندی سے مسلسل پہلوان کا دفاع کیا۔ اس دوران میں ایک بار پہلوان کو لات رسید کرنے کی کوشش میں شرابی سردار خود گرتے گرتے بچا۔ دوسری مرتبہ اس کی اچٹتی ہوئی سی لات پہلوان کے کولہے پر پڑی۔ آخر سردار اعظم فیصلہ کن انداز میں بولا۔ ''اس کڑی کی ہڈی تو توڑ دی ہے تو نے۔ اب اگر یہ ہڈی تو نے جوڑی نہیں تو سمجھ لے تیری ہڈی بھی ٹوٹے گی۔ اسی جگہ سے اور اسی طرح۔ اور تیرے دونوں گٹے (ٹخنے) بھی توڑوں گا...... تاکہ تو بھاگنے کا سوچے بھی نہ یہاں سے۔'' بمشکل یہ معاملہ وائنڈ اپ ہوا۔

☆☆☆

اور یہ میری اور باقر عرف باقرے کی لڑائی کا منظر تھا۔ اس لڑائی کے لیے بڑے دروازے کے پاس والا وہی کمرا استعمال کیا گیا تھا جہاں سجاول کے چھرے باز اکثر مشق کرتے تھے اور ان کی آوازیں باہر احاطے تک آتی تھیں۔ میری اور باقر کی دست بدست لڑائی شروع ہونے سے پہلے، یہاں دیواروں سے آویزاں تمام کلہاڑیاں اور چھرے وغیرہ ہٹا لیے گئے تھے۔ نیچے فرش تھا، یہ ایک نیم گول سا ہال کمرا نظر آتا تھا۔ بیٹھنے کے لیے سات آٹھ کرسیاں تھیں۔ ان میں سے دو کرسیاں زیادہ بڑی اور آرام دہ تھیں۔ ان پر دونوں بھائی یعنی وڈا سردار اعظم اور چھوٹا سردار سجاول براجمان تھے۔ باقی کرسیوں پر بڑے بڑے پگڑوں والے وہی کرخت چہرہ مہمان تھے جنہیں میں نے جمعے کی رات دیکھا تھا۔ باقی سب لوگوں کو کھڑے ہو کر یہ تماشا دیکھنا تھا۔ یہاں موجود عورتوں کو اس تماشے سے دور بلکہ بے خبر رکھا گیا تھا۔

اندازہ ہوتا تھا کہ اس جگہ اس طرح کی لڑائیاں مار کٹائیاں ہوتی رہتی ہیں۔ غالباً لکڑی کے چھروں یعنی خنجروں سے چھرا بازی کی مشق یہاں پر ہوتی تھی۔ ایک طرف دیوار پر ایک درمیانے معیار کی بڑی سی پینٹنگ بھی لگی ہوئی تھی۔ اس میں گھنی مونچھوں اور سیاہ داڑھی والا ایک تنومند شخص دونوں ہاتھوں میں بڑے بڑے چھرے پکڑے، لڑائی کے ایکشن میں نظر آتا تھا۔ غور سے دیکھنے پر پتا چلتا تھا کہ یہ چھرے نہیں بلکہ چھوٹے سائز کی تلواریں ہیں۔

فیض محمد نے مجھے بتایا تھا کہ لڑائی کا فن کسی روحانی فیض کی طرح سجاول کے خون میں شامل ہے۔ سجاول کا پڑدادا ایک بے مثال تلوار زن تھا۔ دونوں ہاتھوں سے تلوار چلا کر درجنوں افراد کا گھیرا توڑ دیتا تھا اور انہیں خون میں نہلا دیتا تھا۔ شاید یہ سجاول کے اسی بزرگ کی تصویر تھی۔ (بعدازاں یہ اندازہ درست ثابت ہوا)

باقر جین کی پتلون اور جیکٹ میں تھا۔ اس نے خونی نظروں سے مجھے دیکھا اور جیکٹ اتار کر ایک طرف پھینک دی۔ نیچے اس نے ہاف سلیو شرٹ پہن رکھی تھی جس میں سے اس کے بازوؤں کی مچھلیاں نمایاں دکھائی دیتی تھیں۔ میں سفید شلوار قمیص اور جرسی میں تھا، میں نے بھی جرسی اتار کر ایک طرف رکھ دی اور آستینیں اُڑس لیں۔

سجاول سیالکوٹی نے اعلان کرنے والے انداز میں کہا۔ ''یہ کوئی دشمنی یا عداوت کی لڑائی نہیں ہے۔ نہ ہی میں یہ چاہتا ہوں کہ اس لڑائی میں کوئی شدید زخمی ہو۔ کسی کے زیادہ زخمی ہونے کی صورت میں، میں لڑائی فوراً رکوا دوں گا۔ اگر تم دونوں میں سے کسی کو اپنی ہڈی وغیرہ ٹوٹنے کا خطرہ ہو تو وہ بول کر یا اپنا ہاتھ اٹھا کر لڑائی رکوا سکتا ہے۔''

یہ قریباً ویسی ہی شرائط تھیں جو مشہور زمانہ MMA یعنی ''مکس مارشل آرٹ'' کی فائٹس میں ہوتی ہیں۔ مجھے اپنے سامنے نظر آنے والا مدِمقابل بھی ان فائٹس والا کوئی فائٹر ہی لگتا تھا یا کم از کم ان کی طرح دکھائی دیتا تھا۔ یقیناً لڑائی کی فیلڈ میں وہ ایک خطرناک شخص تھا، لیکن اس کی بدقسمتی تھی کہ بے خبری میں آج وہ ایک ایسے شخص کے سامنے آ گیا تھا جو اس میدان میں اس سے کافی آگے تھا۔

"چلو شروع کرو۔" سجاول نے بلند آواز میں کہا۔
باقر دونوں ہاتھ پھیلا کر میرے سامنے آیا۔ میں نے بھی نیم دائرے میں اس کے اردگرد گردش کی۔ یکایک اس نے جھکائی دی اور میری ٹانگوں کی طرف آیا۔ اس کی پھرتی بے مثال تھی لیکن ٹریننگ اور تجربے کی کمی تھی۔ میں نے بہ آسانی اپنی ٹانگیں بچائیں اور اس کو تھوڑا سا آگے آنے دیا، تب میرے گھٹنے کی زوردار ضرب اس کی ٹھوڑی پر لگی اور وہ ڈگمگا کر پیچھے ہٹ گیا۔ میں نے ٹانگ کی ایک ضرب اس کی پسلیوں پر لگائی، دوسری سر پر۔ سر پر چوٹ لگنے سے وہ جیسے آگ بگولا ہو گیا۔ اس نے مجھ پر مکوں کی بارش کر دی۔ ایک دو مکے میرے چہرے پر بھی لگے لیکن میں برداشت کر گیا۔ باقر کے ساتھیوں اور تماشائیوں نے اس کے حق میں بے پناہ شور مچایا۔ وہ ان کے لیے ہیرو کی طرح تھا، لیکن آج یہ ہیرو شومئی قسمت ایک برتر مدِمقابل کے سامنے آ گیا تھا۔

مجھے ایک دو موقع ملے جب میں اسے اپنے ہاتھ کی کاری ضرب لگا سکتا تھا مگر میں اس لڑائی کو فوراً ختم کرنا نہیں چاہتا تھا۔ دوسری طرف مجھے یہ ڈر بھی تھا کہ یہ بے حد پھرتیلا شخص کہیں کوئی اوچھا وار یعنی فاؤل نہ کر جائے۔ اس نے مجھے فرش پر گرانا چاہا لیکن میں نے بہ آسانی پلٹ کر اسے اپنے آگے رکھ لیا۔ اس کھینچا تانی میں اس کی شرٹ پھٹ گئی اور میری قمیص کا بازو بھی ادھڑ گیا۔ اس کی پھٹی ہوئی شرٹ کے اندر سے مجھے اس کی کمر نظر آئی اور ایک زخم کا نشان بھی نظر آیا۔ یہ نشان اس کے کندھے سے شروع ہو کر ریڑھ کی ہڈی کے ساتھ ساتھ نیچے چلا گیا تھا۔ بے شک میرا قیافہ درست ثابت ہوا تھا، یہ وہی نشان تھا جو عبدالرحیم کی کمر پر بھی لگایا گیا تھا، تاکہ اس کی بے چہرہ لاش باقر کی لاش کے طور پر لی جائے۔

میری توجہ شاید چند سیکنڈ کے لیے اس پرانے زخم کی طرف گئی تھی...... باقر نے تڑپ کر میرے نیچے سے نکل کر اوپر آنا چاہا۔ شاید یہاں موجود کوئی شخص بھی میری جگہ ہوتا تو خود کو باقر کی زد سے نہ بچا سکتا۔ میں نے بھرپور کوشش کی اور کامیاب رہا۔ میرے کانوں میں سجاول کی واہ واہ کی صدا پڑی۔ تاہم میری اس کوشش کے دوران میں ایک غلطی ہو گئی تھی۔ اتفاقاً میرے دائیں ہاتھ کا انگوٹھا باقر کی بائیں آنکھ میں لگ گیا تھا۔

وہ پہلے ہی بہت بھنّایا ہوا تھا یا شاید اسے ہزیمت سے بچنے کے لیے کوئی بہانہ ہی چاہیے تھا۔ وہ اپنی آنکھ دبا کر تین چار قدم پیچھے ہٹا۔ پھر ایک چنگھاڑ کے ساتھ تماشائیوں کی طرف گیا۔ اس نے اپنے ایک ساتھی کی کمر سے قریباً دو فٹ لمبا چھرا کھینچا اور آندھی کی رفتار سے میری طرف آیا۔ اس نے بے دریغ میری ٹانگوں کو نشانہ بنایا۔ چھرے کی تیز نوک میری ران کو بوسا دیتی ہوئی گزر گئی۔ دوسرا وار کرنے کے لیے باقر نے ہاتھ اٹھایا ہی تھا کہ سجاول کی کڑکتی ہوئی آواز ابھری۔ "نہیں باقرے...... رک جاؤ۔"

باقرے جہاں کا تہاں رک تو گیا مگر اس کے طیش میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔ اس کی بائیں آنکھ سرخ انگارا دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے چھرا فرش پر پٹخا اور چلاتا ہوا مجھ پر پل پڑا۔ یقیناً وہ اتنا برا فائٹر نہیں تھا جتنا طیش میں آنے کے بعد ہو گیا تھا۔ اس نے اندھا دھند ہاتھ چلائے اور فاش غلطیاں کیں۔ آخر اس کی گردن میرے بازو کے شکنجے میں آ گئی۔

میں نے دانت پیستے ہوئے سرگوشی کی۔ "بچہ جی، اسے کہتے ہیں...... NECK LOCK۔ اب ذرا نکل کر دکھاؤ۔"

جہاندیدہ سردار سجاول سمجھ گیا تھا کہ اب اگر باقرے نے بے وقوفی کی اور اندھا دھند زور لگایا تو ناقابلِ تلافی نقصان اٹھائے گا۔ اس نے اٹھ کر لڑائی رکوا دی اور میرا ہاتھ کھڑا کر کے میرے فاتح ہونے کا اعلان کیا۔

باقر کے ساتھی اور تمام تماشائی مجھے ایسی نظروں سے دیکھ رہے تھے جیسے میرے سر پر سینگ نکل آئے ہوں اور میں ابھی ان سینگوں کے ذریعے ان کے پیٹوں میں سوراخ کرنا شروع کر دوں گا۔ انہیں جیسے باقر کی شکست کا یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔ باقر مسلسل اپنی آنکھ کا رونا رو رہا تھا اور بتا رہا تھا کہ میں نے جان بوجھ کر اس کی آنکھ کو نشانہ بنایا اور یہ کہ وہ اب بھی مجھ سے لڑنے کے لیے تیار ہے۔

بہرحال جو کچھ بھی تھا، وہ اس دس منٹ کی لڑائی میں ایک آدھ منٹ کے سوا مجھ سے مار ہی کھاتا رہا تھا اور یہ صورتِ حال سب نے دیکھی تھی۔ وہ سب گم صم اور ششدر تھے۔ سردار سجاول نے معنی خیز نظروں سے اپنے مہمانوں کی طرف دیکھا۔ وہ بڑے بڑے پگڑ سروں پر سجائے خاموش بیٹھے تھے۔ میں نے انہیں کم ہی بولتے دیکھا تھا۔

سجاول نے میرے پاس آ کر میری پیٹھ تھپکی۔ اس کٹ کا معائنہ کیا جو باقر کے چھرے سے میری ران پر آیا تھا اور جس نے شلوار کا کچھ حصہ بھی چاک کر ڈالا تھا۔ زخم زیادہ

گہرا نہیں تھا۔

سردار سجاول نے کہا۔ ''تمہیں انعام دینے کو دل چاہ رہا ہے۔''

میری آنکھوں کے سامنے موذن رحیم کی لاش آ گئی۔ اس کا خونچکاں جسم، اس کا مسخ چہرہ، کتنی بے دردی سے مارا گیا تھا اسے۔ سجاول کی سفاکی کے لیے میرے سینے میں طیش کی ایک بلند لہر اٹھی۔ بہرحال اپنے تاثرات نارمل رکھتے ہوئے میں نے کہا۔ ''تو دے دو انعام۔''

اس نے ذرا چونک کر میری طرف دیکھا پھر سگریٹ کو نہایت قیمتی لائٹر سے سلگاتے ہوئے بولا۔ ''کیا چاہتے ہو؟''

میں نے کہا۔ ''دے سکو گے سردار؟''

''دے سکا تو ضرور دوں گا۔''

''جس طرح آج باقرے سے لڑائی کی ہے۔ اسی طرح میں تم سے بھی لڑنا چاہتا ہوں۔'' میں نے اپنی آواز اتنی دھیمی رکھی تھی کہ صرف سجاول کے کانوں تک ہی پہنچ سکے۔

سجاول کے چہرے پر عجیب سا رنگ لہرایا۔ اس نے جیسے کچھ کہنے کے لیے لبوں کو حرکت دی لیکن پھر ارادہ بدل دیا۔ یک ٹک میری طرف دیکھتا رہا، تب دوسروں کو دکھانے کے لیے مسکرایا اور دوبارہ جا کر اپنی نشست پر بیٹھ گیا۔ بڑے بڑے پگڑوں والے افراد اس سے کھسر پھسر کر رہے تھے۔

میری جیت کی خبر آناً فاناً سارے ڈیرے میں پھیل گئی تھی۔ اس جیت نے دیکھتے ہی دیکھتے مجھے ان لوگوں کی نظر میں بہت اہم بنا دیا تھا۔ باقر ان کے نزدیک ایک نہایت خطرناک ''لڑاکا'' تھا اور وہ اس بات کی بھرپور توقع کر رہے تھے کہ مجھے چارپائی وغیرہ پر یہاں سے نکالا جائے گا۔ کچھ دیر بعد سجاول نے میرا اور باقر کا معانقہ کرایا اور تاکید کی کہ اب دل میں کسی طرح کی رنجش نہیں رکھنی ہے۔

جیسا کہ میں نے بتایا ہے، اس سنگین مقابلے کی خبر خواتین اور خاص طور سے ماؤ جی سے چھپائی گئی تھی۔ ورنہ وہ مجھے، یعنی اپنے ہونے والے ''داماد پتر'' کو کسی بھی طور اس خطرناک صورت حال کا شکار نہ ہونے دیتیں۔ لیکن جب یہ مقابلہ ہو گیا تو خبر راز نہ رہ سکی۔ یہ شام کا وقت تھا، میں کمرے سے نکل کر احاطے کی طرف گیا تو دور سے ماؤ آتی دکھائی دی، جیسے کوئی ہتھنی جنگل میں آدم زاد کو دیکھ کر اس کی طرف جھپٹ رہی ہو۔ وہ آتے ساتھ ہی میرے ساتھ لپٹ گئی اور منہ سر چومنے لگی۔

''پتا نہیں کیا ہو گیا ہے سجاولے کو۔ میرے جوائی پتر کے پیچھے ہی پڑ گیا ہے۔ پہلے کندھے کی چوٹ، پھر سیڑھیوں سے گرایا اور اب اس کو لڑائی مار کٹائی کا تماشا لگانے کی سوجھی ہے۔ اگر کوئی چوٹ شوٹ لگ جاتی نا تجھے تو میں نے سجاولے کی ٹانگیں توڑ دینی تھیں۔ اچھا بھلا سیانا ہے پھر ایسے نا سمجھی والے کام کرتا ہے۔''

تب ماؤ کی نظر میری کٹی ہوئی شلوار اور ٹانگ کے چیرے پر پڑی، اس نے ایک دم دہائی مچا دی۔ ''ہائے میرا بچہ۔ ٹانگ بچی بھی ہے کہ نہیں۔ کدھر ہے وہ مرن جوگا فیض اور وہ سجاولا۔ میں ذرا پوچھوں تو..... ہائے میرا تو کلیجا نکلا جا رہا ہے۔ کوئی خون بند کرو اس کا۔ کوئی آ کے پٹی باندھو۔ کہاں دفع ہو گئے سب کھل کھلا کے۔''

اس کی نوے فیصد پریشانی مصنوعی تھی۔ ورنہ سجاول کون سا دور تھا۔ اگر وہ چاہتی تو اس سے باز پرس کر سکتی تھی لیکن وہ جانتی تھی کچھ بھی ہے اصل سردار وہی ہے۔ وہ جو کچھ بھی کرتا ہے، اس کے لیے کسی کو جواب دہ نہیں ہے۔ بیٹا ہونا علیٰحدہ بات تھی، سردار ہونا علیحدہ بات۔

وہ میرے منع کرنے کے باوجود مجھے اس حصے میں لے گئی جہاں وہ اور اس کی پوتی مانی رہائش فرماتھیں۔ اس نے اندر آتے ہی شور مچا دیا۔ ''نی مانی! کہاں مر گئی ہے۔ اِدھر آ دیکھ میرے بچڑے کا کتنا خون نکل آیا ہے۔ دیکھ کس طرح ٹانگ لالو لال ہو رہی ہے، کھل کھلا کے۔''

مانی تو شاید بالکل تیار ہی بیٹھی تھی، دوڑتی ہوئی وہاں پہنچ گئی۔ سخت سردی میں بھی وہ کھلے گریبان کی شرٹس پہنتی تھی اور چست پتلون میں جسم کے خطوط نمایاں کرتی تھی۔ اس نے آتے ساتھ ہی بڑی ادا سے سینے پر ہاتھ رکھ کر ''ہائے اللہ'' کہا اور بڑی بے باکی سے میری کٹی ہوئی شلوار کے اندر سے میری ٹانگ کا معائنہ کرنے لگی۔

''اوہو، تمہیں تو پٹی کی ضرورت ہے ڈیئر جانو، آ جاؤ کمرے میں۔ میں اچھی طرح زخم کو صاف بھی کر دیتی ہوں۔ پر یہ سب کچھ ہوا کیسے؟''

ماؤ نے پوتی کو مختصر الفاظ میں آگاہ کیا کہ اس کے چاچا سجاول نے اپنی عادت سے مجبور ہو کر آج پھر دنگل کرایا ہے اور اس دنگل میں شاہ زیب کو باقرے سے لڑایا ہے۔

''باقرے سے؟'' مانی تقریباً چلا اٹھی۔ ''وہ باقرا بگیاڑ، وہ تو بندے کا کچالو بنا دیتا ہے، تم...... تم کیسے بچ گئے ڈیئر جانو۔ کیا چاچے نے لڑائی روک دی تھی۔''

ماؤ فخر سے بولی۔ ''ہاں لڑائی روک دی تھی اس نے

لیکن شاہ زیب کو بچانے کے لیے نہیں، باقرے بگیاڑ کو بچانے کے لیے۔ میرا شاہ زیب پُتر جیت گیا ہے باقرے سے۔ فیقو بتا رہا تھا کہ آج باقرے کی ساری آکڑ شاکڑ دیسی صابن سے دھو دی ہے شاہ زیب نے۔ اگر سجاول، باقرے کو چھڑاتا نہ تو اس کی گردن کا کڑاکا نکال دینا تھا، میرے شیر بچڑے نے۔''

مانی اپنی دادی کی پروا کیے بغیر چھلانگ لگا کر مجھ سے لپٹ گئی۔ میں نے اسے بمشکل خود سے جدا کیا۔

اتنے میں اختری مرہم پٹی کا سامان لے آئی۔ مانی نے مرہم پٹی والا بکس اختری کے ہاتھ سے جھپٹا اور میرے کندھے کا بوسہ لے کر بولی۔ ''ڈیئر! کمال کر دیا تم نے...... اگر واقعی وہی کچھ ہوا جو ماؤ جی بتا رہی ہیں تو پھر تو تم شہزادے ہو ہم سب کے۔ ویسے بھی مجھے پہلے ہی لگتا تھا کہ چاچے نے کوئی ایویں شیویں بندہ نہیں ڈھونڈا ہوگا میرے لیے۔''

وہ مجھے کھینچتی ہوئی کمرے میں لے گئی۔ دروازہ اندر سے بند کر دیا اور مجھے زبردستی بستر پر لٹا دیا۔ اس نے شلوار کو کچھ اور چاک کر کے میرے زخم کو اسپرٹ سے صاف کیا۔ وہ اس صفائی کی حدود کو مزید وسیع کرنے کے موڈ میں تھی لیکن پھر میرے سنجیدہ تاثرات دیکھتے ہوئے ارادہ بدل دیا۔ زخم کچھ ایسا خاص نہیں تھا۔ مرہم پٹی کا تو بس بہانہ ہی تھا، بس یہ آفت کی پرکالہ مجھ سے تین چار دن کی غیر حاضری کا ہرجانہ وصول کرنا چاہ رہی تھی۔ اس نے اپنا سارا بوجھ مجھ پر لاد دیا اور اٹکھیلیاں کرنے لگی۔

اچانک جیسے اسے کچھ یاد آیا اور وہ لال بھبھوکا چہرے کے ساتھ مجھ سے علیحدہ ہو کر بیٹھ گئی۔ میں سمجھا شاید وہ یہ پوچھنا چاہ رہی ہے کہ باقرے جیسے خطرناک بندے کے ساتھ میری ہتھ جوڑی کی وجہ کیا تھی اور میں نے اس جنگلی بگیاڑ کو کیسے زیر کیا لیکن اس کی ذہنی رو کسی اور طرف چل نکلی تھی۔ وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بڑے نخرے سے بولی۔ ''آج مجھے ایک بات صاف صاف بتاؤ ڈیئر! جاناں کو تم نے کیوں بچایا ہے؟''

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ اس نے چاچے سجاول کے خاص بندے فخرو کو زخمی کیا تھا اور بھاگ گئی تھی۔ اسے پکڑ کر یہاں لایا گیا تاکہ اسے فخرو کے حوالے کر دیا جائے مگر درمیان میں تم کود پڑے، اور تم نے اس کی جان بچانے کے لیے اسے میری سہیلی بنا دیا۔''

''تو کیا وہ اچھی سہیلی نہیں ہے۔ ہر وقت تمہیں کمپنی دیتی ہے، تمہیں مفت میں ڈانس سکھا رہی ہے۔ تمہیں نکھار رہی ہے۔''

''وہ سب تو ٹھیک ہے لیکن میں کچھ اور پوچھ رہی ہوں میرے شہزادے، تمہارے پیٹ میں اس کی ہمدردی کا مروڑ کیوں اٹھا۔ مجھے سچی بتاؤ کہیں جاناں سے تمہاری کوئی پرانی جان پہچان تو نہیں؟''

''کیسی بے وقوفی کی باتیں کر رہی ہو، وہ مجھے جانتی تک نہیں۔ میرا نام تک اسے معلوم نہیں اور تم کوئی ٹانکا ڈھونڈ رہی ہو ہم دونوں کے درمیان؟''

''دراصل اس دنیا میں کوئی بلاوجہ تو کسی کے کام نہیں آتا ہے نا۔''

''تم ڈکیت لوگ ہو لیکن بہت سے لوگ انسان بھی ہوتے ہیں۔ وہ انسان ہونے کے ناتے کسی سے ہمدردی کر سکتے ہیں......''

وہ ٹٹولنے والی نظروں سے مجھے دیکھتی رہی پھر جیسے اس نے مطمئن ہو کر سر ہلایا۔ اپنے بوائے کٹ بالوں کو پیچھے کی طرف جھٹک کر بولی۔ ''ویسے ہے بڑے کام کی لڑکی۔ ڈانس جانتی بھی ہے اور دوسرے کو اچھی طرح سمجھا بھی سکتی ہے۔ سری دیوی کے ایک گانے پر میں نے بہت دفعہ ناچنے کی کوشش کی مگر ہر بار پاؤں میں موچ آئی، یا کمر کا پٹھا چڑھ گیا لیکن جاناں نے سمجھایا تو سب کچھ حلوے کی طرح لگا۔ ایسے پکے اسٹیپ بتائے ہیں اس نے کہ ساری عمر نہیں بھولیں گے۔''

میں نے کہا۔ ''ڈانس کرتے ہوئے اگر تمہارا کوئی پٹھا چڑھ جاتا ہے تو اب فکر کرنے کی بالکل ضرورت نہیں۔ یہ جو پہلوان حشمت یہاں آیا ہے بڑے بڑے پٹھوں کو سیدھا کر دیتا ہے۔''

''دفع دور۔'' وہ ناک چڑھا کر بولی۔ ''میں تو ہاتھ بھی نہ لگانے دوں اس موٹے کو۔ بڑے ٹھرکی ہوتے ہیں ایسے چھوٹی چھوٹی آنکھوں والے...... اور کاریگری اس کی خاک ہے۔ اس لڑکی نگینہ کی اچھی بھلی جڑی ہوئی ہڈی اس مشٹنڈے نے توڑ کر رکھ دی ہے۔ نا بینا ہاتھی...... ایکسرے پرانا دیکھ لیا اور شامت تازی بتازی لے آیا...... اچھا دفع کرو...... میں تمہیں کچھ دکھاتی ہوں۔''

''بہت کچھ تو تم پہلے ہی دکھا رہی ہو۔'' میں نے اس کے واہیات گریبان پر اچٹتی سی نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

''کیا مطلب؟'' وہ ادا سے بولی۔

''کچھ نہیں تم دکھاؤ جو دکھانا چاہتی ہو۔''
اس نے ٹیپ ریکارڈر پر گانا لگایا۔ میرے ہاتھوں میں نونو چوڑیاں ہیں...... ذرا ٹھہرو صنم مجبوریاں ہیں......''
اس کے ساتھ ہی اس نے آستینیں اڑسیں اور چھما چھم ناچنا شروع کر دیا۔ جیسا کہ مجھے معلوم ہوا تھا، عرصہ پہلے اس کی ماں اپنے کسی آشنا کے ساتھ بھاگ گئی تھی اور وہ ایک طوائف تھی۔ یہی خون مانی کی رگوں میں بھی دوڑتا تھا اور میوزک و ڈانس سے مانی کی خصوصی دلچسپی کا سبب بھی یہی تھا۔
گانے میں تو ''مجبوریوں'' کا ذکر تھا لیکن مانی اس گانے کی صریح خلاف ورزی کررہی تھی۔ وہ کسی مجبوری کو مجبوری سمجھتی ہی نہیں تھی۔ ناچنے کے دوران میں وہ زبردستی میری بانہوں میں گھس بیٹھتی تھی۔ اسے پتا تھا کہ میں اسے ناراض کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا۔ کیونکہ میں اسے ناراض کرتا تو ماؤ جی ناراض ہوتی۔ ٹین شین میں ماؤ کا بلڈ پریشر فوراً 160 کی حد کراس کرجاتا تھا اور اس کے ساتھ ہی یہ خطرہ ہوتا تھا کہ اس پر غشی طاری ہونے لگے گی۔ بے شک یہ ذہنی صحت کی خرابی کا کوئی معاملہ تھا۔ سجاول نے مجھے کھلے الفاظ میں وارننگ دے رکھی تھی کہ وہ سب کچھ برداشت کر سکتا ہے، لیکن اگر میری وجہ سے اس کی ماں کو کوئی نقصان پہنچا تو وہ کبھی برداشت نہیں کرے گا۔
ماؤ کو یقیناً پتا تھا کہ اس کی پوتی کس قماش کی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ جب مانی میرے ساتھ کمرے میں اکیلی ہوتی تھی تو ماؤ آس پاس موجود رہتی تھی اور اپنی موجودگی کا احساس بھی دلاتی رہتی تھی۔ اس وقت بھی جب مانی ڈانس کے بعد ہانپ کر پکے ہوئے پھل کی طرح میری جھولی میں گری ہوئی تھی اور مزید ''گرنے'' کا ارادہ رکھتی تھی، ماؤ نے دروازے پر دستک دے دی۔
مہناز عرف مانی نے بہت برا سا منہ بنا کر اپنا لباس درست کیا اور لال بھبھو کے چہرے کے ساتھ دروازہ کھول دیا۔ ماؤ نے تیز نظروں سے کمرے کا جائزہ لیا پھر انجان بن کر پوچھا۔ ''دوائی لگ گئی میرے بچڑے کو؟''
میں نے اثبات میں سر ہلایا لیکن دل میں سوچا کہ...... یہ تیری پوتی دوا کیا لگائے گی، یہ تو خود ایک لا دوا بیماری ہے۔
ماؤ نے مجھے اپنے ساتھ لیا اور خاص بات کرنے کے بہانے دوسرے کمرے میں لے آئی۔ مجھے سمجھانے والے انداز میں بولی۔ ''میری پوتی سے تیرا جوڑ کسی اور نے نہیں اوپر والے نے خود بنایا ہے۔ اس سے تیری شادی تو ہو کر ہی رہنی ہے۔ تو اس کی زیادہ فکر نہ کر۔ اس وقت تو اپنی گھر والی کی طرف زیادہ دھیان دے۔ اس کا حق تجھ پر زیادہ ہے، اسے خوش رکھ۔ کھلا پلا...... اور خود بھی ذرا کھل کھلا کر کھایا پیا کر۔ شادی کے بعد بچے میں دیر ہو تو دل میں عجیب عجیب وسوسے آنے لگتے ہیں۔ یہ دیکھ، یہ اخروٹ کا حلوہ بنوایا ہے میں نے تیرے لیے......''
اس نے پلیٹ سے ڈھکی ہوئی ایک پلیٹ اٹھائی اور کوئی آدھ کلو حلوہ میرے سامنے رکھ دیا۔ اس پر پستے اور کھوپرے کے چورے کا چھڑکاؤ کیا گیا تھا۔
میں جانتا تھا اور اچھی طرح جانتا تھا کہ میری یہ خاطرداریاں 'ماؤ' کس وجہ سے کرتی ہے۔ اس نابنجار عورت کے ذہن میں یہ بات گھر کر چکی تھی کہ جب تاجور امید سے ہو جائے گی تو پھر میری اور مانی کی شادی کا راستہ ہموار ہونا شروع ہو جائے گا۔ خاکم بدہن وہ دورانِ حمل تاجور کی موت کی آس لگائے بیٹھی تھی اور یہ سارا شوشہ ماؤ کے کسی پیر فرتوت پیرو سائیں کا چھوڑا ہوا تھا۔
حلوہ کھاتے کھاتے اچانک مجھے کسی کمی کا احساس ہوا۔ میں نے اپنی قمیص کی چیسٹ پاکٹ کو چھوا اور چونک گیا۔ وہ تہ کیا ہوا کاغذ موجود نہیں تھا، جو مجھے مرحوم عبدالرحیم سے ملا تھا اور میں نے سنبھال کر رکھا ہوا تھا۔ وہی ناقابلِ فہم تحریر جس میں رحیم کے بقول کوئی بہت خاص بات موجود تھی۔ دفعتاً مجھے اندازہ ہوا کہ تھوڑی دیر پہلے مانی کے ساتھ ''رومانی دھینگا مشتی'' کے دوران میں وہ کاغذ جیب سے سلپ ہو گیا ہے۔ یقیناً وہ مانی کے کمرے میں ہی گرا تھا۔
مجھے چونکتے دیکھ کر ماؤ نے پوچھا۔ ''کیا ہوا میرے بچڑے، کوئی چیز گم ہو گئی ہے؟''
اس سے پہلے کہ میں جواب میں کچھ کہتا مانی لہراتی بل کھاتی میری طرف آتی دکھائی دی، اس کے ہاتھ میں وہی لکھا ہوا کاغذ تھا۔ ''یہ تمہارا ہے ڈیئر؟'' اس نے کاغذ لہراتے ہوئے کہا۔
''ہاں میری جیب سے ہی گرا ہے۔''
''پر یہ ہے کیا؟ اوٹ پٹانگ لکھا ہوا ہے۔'' اس نے کہا اور پڑھنے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔ ''رتسام بحاص، پاتھب ..... ٹیل وہ ..... روب جم، وہ رک طخ الکھل ..... اڑپ .....'' اس نے سوالیہ نظریں مجھ پر گاڑ دیں۔

میں نے کہا۔ ''بس، یہ مجھے کہیں پڑا ہوا ملا تھا۔ میں نے جیب میں ڈال لیا۔''

''لیکن...... یہ ہے کیا؟''

''خود مجھے بھی پتا نہیں چل سکا۔''

اس نے ایک بار پھر پڑھنے کی کوشش کی اور بولی۔ ''یہ تو مجھے کوئی خفیہ لکھائی لگتی ہے۔ جیسے دوسروں سے چھپانے کے لیے کوئی ''لو لیٹر'' لکھا گیا ہو۔'' وہ شک کی نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔

ماؤ نے بھی خط کو دیکھا۔ ہمیں سمجھ نہیں آئی تھی تو اسے کیا آتی۔ مانی ذرا شوخی سے بولی۔ ''ماؤ جی! ذرا چنگی طرح چھان پھٹک کرلیں اس منڈے کی۔ کہیں کنویں میں دھکا نہ دے دینا مجھے......''

''جا دفع ہو۔'' ماؤ نے پوتی کو ڈانٹا۔ ''ہیرا پتر ہے میرا۔ دیکھ ماتھے سے کیسے نور کی لاٹ نکل رہی ہے۔''

وہ ادا سے ہنسی۔ ''یہ نور کی لاٹ نہیں ہے دادی ماؤ...... یہاں لڑائی میں مُکا شکا لگا ہے شاہ زیب کو۔ ساری جگہ سرخ ہو رہی ہے۔''

''چل ہٹ۔ ایویں ٹرٹر کر رہی ہے۔ مُکے اسے نہیں لگے۔ اس باقرے کو لگے ہیں جو یہاں بگیاڑ بنا پھرتا تھا۔ میرے بچڑے نے میرا سر فخر سے اور اونچا کر دیا ہے.... میرا ڈھول سپاہی...... میرا شیر پُتر۔'' اس نے خوشامدی انداز میں ایک بار پھر میری بلائیں لیں اور اخروٹ کے حلوے کا چمچ بھر کر میرے منہ میں ڈال دیا۔

مانی کاغذ کو دونوں ہاتھوں کی انگلیوں سے تھام کر بولی۔ ''تو پھاڑ دوں اِس کو؟''

''نہیں...... نہیں۔ ہو سکتا ہے کوئی کام کی بات ہو اس میں۔'' میں نے کہا۔ اس نے بے پروائی سے کاغذ میرے ہاتھوں میں دیا اور بولی۔ ''مجھے تو کوئی لو لیٹر ہی لگتا ہے۔'' پھر لہراتی، بل کھاتی ہوئی واپس چلی گئی۔

ماؤ نے میرے کندھے پر اپنا بھاری ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''اس کی باتوں کی پروانہ کیا کر، جھلی ہے۔''

میں نے سوچا۔ 'جھلی تو تم دونوں دادی پوتی ہو بلکہ تم تو اس سے بھی دو ہاتھ آگے نکلی ہوئی ہو۔'

مانی سے میری جان ماؤ نے چھڑائی تھی۔ ماؤ سے میری جان چھڑانے کے لیے فخرو وہاں پہنچ گیا۔ اس نے مجھ سے مخاطب ہو کر ذرا ہانپتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''آپ کو چھوٹے سردار بلا رہے ہیں...... فوراً......''

مجھے اندازہ تھا کہ وہ مجھے کیوں بلا رہا ہے۔ کچھ دیر پہلے میں نے باقرے سے لڑائی کے بعد سردار سجاول سے جو بات کہی تھی، وہ یقیناً سیدھی اس کے کلیجے پر لگی تھی، وہ اندر سے بری طرح تلملایا ہوا نظر آیا تھا۔ اب اس نے فرصت ملتے ہی مجھے بلا بھیجا تھا۔

میں ماؤ سے رخصت ہو کر سجاول کے کمرے میں پہنچا تو وہ بڑے سائز کی کرسی پر پھیل کر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ ڈرنک کم ہی کرتا تھا مگر فی الوقت کر رہا تھا۔ کڑوا کسیلا گھونٹ اپنے معدے میں اتار کر بولا۔ ''یہ کیا حماقت کی ہے تم نے۔ میں سمجھتا تھا، تھوڑی بہت عقل ہو گی تم میں؟''

''کیا ہوا سردار؟''

''تم اچھی طرح جانتے ہو۔'' وہ پھنکارا۔ ''مقابلے کے بعد تم نے مجھ سے لڑنے کی جو بات کی تھی، وہ ہم دونوں تک نہیں رہی ہے۔ اس دنیا میں بس تم ہی سمجھ دار پیدا نہیں ہوئے، اور بہت سے لوگ بھی اُڑتی چڑیا کے پَر گن لیتے ہیں۔ بہت سے لوگوں نے تاڑ لیا ہے کہ تم نے مجھ کو اپنے ساتھ لڑنے کی دعوت دی ہے۔''

''لیکن، میں نے تو اتنی آہستہ آواز میں کہا تھا کہ تم نے بھی مشکل سے سنا تھا۔''

اس نے ایک اور گھونٹ بھر کر کہا۔ ''لیکن کچھ دن پہلے تم نے یہ بات سب کے سامنے کہی تھی۔ فیض وغیرہ بھی

پروفیسر

باہر موسلادھار بارش ہو رہی تھی۔ اندر پروفیسر صاحب ایک کتاب پڑھنے میں مستغرق تھے۔ اچانک بیوی نے ان کا کندھا ہلاتے ہوئے کہا۔ ''بلی تو یہیں گھوم رہی ہے۔''

''ایں؟'' انہوں نے کتاب سے نظریں ہٹا کر پوچھا۔

''میں نے کہا تھا کہ بلی کو باہر پھینک آیئے۔ معلوم ہوتا ہے آپ نے میری بات نہیں سنی۔ بلی ابھی تک کمرے میں موجود ہے۔''

''بلی ابھی تک کمرے میں موجود ہے؟ تعجب ہے میں تو اسے باہر پھینک آیا تھا۔'' پھر معاً گھبرا کر بولے۔ ''ذرا دیکھنا تو بے بی پنگھوڑے میں ہے یا نہیں؟''

ڈیرہ اسماعیل خان سے سلیم خان

موجود تھے۔ موجود تھے یا نہیں؟'' سجاول کی آواز میں طیش کے شعلے تھے۔

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''تو سردار! اس میں اتنا پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ پریشان تو مجھے ہونا چاہیے کہ اپنی حماقت کی وجہ سے میری زندگی داؤ پر لگ جائے گی۔''

میرے طنزیہ لہجے نے اسے اور آگ بگولا کیا۔ میں چاہتا بھی یہی تھا۔ وہ سرسراتی آواز میں بولا۔ ''بڑا غرور ہے تمہارے اندر۔ یہ غرور تمہیں مار ڈالے گا۔ لاش پہچانی نہیں جائے گی تمہاری۔''

''اس کا فیصلہ تو وقت کرے گا۔'' میں نے پھر اس کی آنکھوں میں دیکھ کر کہا۔

اس کا چٹانی چہرہ سرخ انگارا ہو گیا۔ ایک لمحے کے لیے مجھے لگا کہ میں جس لڑائی کی بات کر رہا ہوں، وہ ابھی شروع ہو جائے گی۔

تاہم پھر سجاول نے خود کو سنبھالا۔ شاید وہ سمجھ گیا تھا کہ میں اسے طیش دلانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ خود کو پُرسکون کرنے کے لیے اس نے مشروبِ مغرب کا آدھا گلاس یک بیک گلے میں انڈیل لیا اور سگریٹ کو مٹھی میں دبا کر اس کے دو گہرے کش لے کر بولا۔ ''دیکھو شاہی! میں سمجھتا ہوں کہ تم...... کام کے بندے ہو...... باقرے کو نیچا دکھانے کے بعد تمہاری قدر میری نظروں میں اور بڑھ گئی ہے لیکن تم نے یہ بے وقوفی والی بات کر کے اپنے ساتھ ساتھ مجھے بھی مصیبت میں ڈال دیا ہے۔ تمہیں اس بات سے پیچھے ہٹنا پڑے گا۔ سب کے سامنے بتانا پڑے گا کہ تم اس طرح کی کوئی لڑائی نہیں چاہتے۔''

''میں یہ کیوں کہوں؟'' میں نے اپنا باغی لہجہ برقرار رکھا۔ میری آنکھوں کے سامنے رحیم کی لاش تھی۔

''میں تمہیں ضائع کرنا نہیں چاہتا۔'' سجاول نے دانت پیس کر شعلہ بار لہجے میں کہا۔

''اور میرا خیال ہے کہ تم جان چھڑانا چاہتے ہو۔''

''بکواس بند کرو۔'' وہ اتنی زور سے دہاڑا کہ کمرے کی دیواریں لرزتی محسوس ہوئیں لیکن اگر وہ یہ سمجھتا تھا کہ اس طرح میرا پتا پانی ہو جائے گا، تو یہ اس کی بھول تھی۔

میں اپنی جگہ اطمینان سے بیٹھا رہا۔ وہ چند سیکنڈ بعد پھر پھنکارا۔ ''تم میرے بارے میں کچھ نہیں جانتے ہو۔ اگر میں ان لوگوں کا سردار ہوں تو ایسے ہی نہیں ہوں۔ ایسے ہی نہیں ہوں۔''

''مجھے یہ جاننے کی زیادہ ضرورت بھی نہیں۔ تمہاری طرح میں بھی دو ہاتھ اور دو پاؤں رکھتا ہوں۔ دیکھنا چاہتا ہوں کہ میں کتنے پانی میں ہوں۔''

''باقرے کو پچھاڑ کر تم بانس پر چڑھ بیٹھے ہو۔ تمہارا پانی اتنا گہرا نہیں ہے۔''

''تمہارے سب سے بہتر بندے سے تو گہرا ہی ہے۔'' میں نے بلا جھجک جواب دیا۔

وہ گہری سانس لے کر بولا۔ ''یہ اکیلا ہی نہیں، اس طرح کے اور بندے بھی ہیں میرے پاس...... کسی اور سے لڑ لو۔''

''دیگ کے ایک دانے سے سارے چاولوں کا پتا چل جاتا ہے۔'' میں نے زہرخند انداز میں کہا۔

اس کا پارا ایک بار پھر ساتویں آسمان کی طرف حرکت کرنے لگا۔ اس نے اٹھ کر بے قراری سے کمرے میں دو چکر لگائے، پھر دوبارہ رنگین پایوں والی جہازی سائز کرسی پر بیٹھ گیا۔ لمبی سانس لے کر بولا۔ ''میرے بڑوں کا مجھے حکم ہے۔ میں تمہیں سوچنے کا موقع دیتا ہوں۔''

''میں ابھی انکار کرتا ہوں۔''

''نہیں...... کم از کم دو دن تک سوچو۔'' اس نے پچکارا۔ ''پھر مجھے جواب دینا۔ اس کے بعد میں تمہیں ایک موقع اور دوں گا...... اگر......''

سجاول کی بات ادھوری رہ گئی۔ کہیں دور سے فائرنگ کی آواز سنائی دی تھی، اس کے ساتھ ہی کسی نے عجلت میں سردار کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔

''آجاؤ۔'' سردار سجاول نے کہا۔

فیض ذرا گھبرایا ہوا اندر داخل ہوا۔ ''سردار! اوپر سڑک کی طرف فائرنگ ہو رہی ہے۔ ابھی احمد کا فون آیا ہے۔ کہتا ہے، یہ وہی ملنگ لگتے ہیں۔ کافی سارے بندے لے کر آئے ہیں......''

سجاول نے دانت پیس کر کچھ کہا پھر اپنے قیمتی موبائل سیٹ پر کال ملاتا ہوا احاطے کی طرف چلا گیا۔ فائرنگ کی آوازیں کم وبیش تین چار کلومیٹر کے فاصلے سے آ رہی تھیں اور خاصی مدھم تھیں۔

فیض محمد نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''دیکھو، تمہیں پناہ دینا کتنا مہنگا پڑ رہا ہے ہمیں۔ ملنگوں نے ابھی تک تمہارا پیچھا نہیں چھوڑا۔''

''میں نے کب پناہ مانگی ہے چاچا۔ ہمیں تو قیدی بنایا ہوا ہے تم لوگوں نے۔ چھوڑ دو ہمیں۔ ہم خود ہی نمٹ لیں

گے اُن سے...... اور...... یہ بھی کیا ضروری ہے کہ یہ ملنگ ہی ہوں۔ ہوسکتا ہے کہ کوئی اور دشمن گروپ ہو تمہارا۔''

''نہیں یہ وہی ہیں۔ ہمارے بندوں نے دیکھا ہے انہیں، ان کمینوں نے یہی سمجھ رکھا ہوگا کہ وہاں درختوں پر درجن آدھی درجن بندے ہیں، اس ڈیرے کا انہیں کچھ پتا نہیں ہے اور نہ ہی یہ پتا ہے کہ یہاں سے انہیں کیسا ظالم جواب مل سکتا ہے۔ بڑا نقصان اٹھائیں گے۔''

فائرنگ کی آواز فاصلے سے آرہی تھی مگر پھر بھی پتا چل رہا تھا کہ شدت کی فائرنگ ہے۔ آٹومیٹک اور پمپ ایکشن رائفلیں استعمال ہورہی تھیں۔ کبھی کبھی چھوٹے ہتھیار کی آواز بھی سنائی دے جاتی تھی۔ تھوڑی ہی دیر بعد میں نے اصطبل کی طرف سے گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز سنی۔ تاریکی میں ٹارچیں چمک رہی تھیں۔ قریباً بیس کے قریب گھڑسوار تیزی سے گھوڑے بھگاتے ہوئے احاطے سے باہر نکل گئے۔ وہ سب کے سب مسلح تھے۔ یقیناً سجاول بھی ان میں شامل تھا لیکن میں اسے دیکھ نہیں سکا۔

فیض محمد کو وہیں چھوڑ کر میں تاجور کے پاس کمرے میں پہنچا۔ اسے ابھی تک باقرے سے ہونے والی میری مار کٹائی کی کوئی خبر نہیں تھی۔ تاہم فائرنگ کی آوازوں نے اسے پریشان کررکھا تھا۔

''یہ آوازیں کیسی آرہی ہیں شاہ زیب؟''

''پتا نہیں، میں نے ابھی سنی ہیں۔ شاید یہ لوگ کوئی مشق وغیرہ کررہے ہیں یا چاند ماری۔''

''مگر میں نے ابھی دیکھا ہے، کئی گھڑسوار افراتفری میں باہر نکلے ہیں۔''

''اچھا......؟'' میں نے حیرانی ظاہر کی۔

''جب چاند گڑھی میں یہ سجاول کے بندے حملہ کرتے تھے تو ایسی ہی آوازیں آتی تھیں۔ مجھے بڑا ڈر لگ رہا ہے۔''

میں نے اس کا خوف کم کرنے کے لیے ہلکا پھلکا انداز اختیار کیا۔ ''جب تم ایسے بات کرتی ہو تو مجھے وہی گانا یاد آجاتا ہے۔ بابا، مجھے بڑا ڈر لگ رہا ہے۔''

میرے انداز نے واقعی اس کا خوف کچھ کم کردیا۔ وہ بستر پر بیٹھ گئی اور کان لگا کر آوازیں سننے لگی۔ اچانک اس کی نگاہ میری ران کی خون آلود پٹی پر پڑ گئی۔ اس کی پریشانی میں خاطر خواہ اضافہ ہوگیا۔ میں نے اسے بمشکل یہ کہہ کر مطمئن کیا کہ سجاول کے ایک خردماغ کارندے سے جھڑپ ہوگئی تھی۔ ایک ٹوٹا ہوا شیشہ یہاں لگا ہے۔ اسی دوران میں چھ سات گھڑسواروں کی ایک اور ٹولی گھوڑے بھگاتی احاطے سے نکل گئی۔ تاجور کی ساری توجہ گھڑسواروں کی طرف ہو گئی۔

وہ پُرامید لہجے میں بولی۔ ''شاہ زیب! کیا پتا، یہ پولیس والے ہوں۔''

''ہاں ہو بھی سکتا ہے۔'' میں نے ہاں میں ہاں ملائی۔

میں اسے کیسے بتا سکتا تھا کہ یہ ملنگی ڈیرے کے خونخوار ملنگ ہیں...... اور صرف ہمارے لیے یہاں آئے ہیں۔ کیونکہ ان کی پردے والی سرکار کو مار کر ہم ان کی دنیا اندھیر کرچکے ہیں اور وہ ہمیں ''دردناک عذاب'' دینے کے لیے زمین کی ساتویں تہ سے بھی نکال لینا چاہتے ہیں۔

میری نگاہوں میں وہ سارے خونی مناظر پھر سے گھومنے لگے جو ملنگی ڈیرے کی پُراسرار دیواروں میں پیش آئے تھے۔ پردے والی سرکار کی کراہت آمیز دید...... اس کاریشمی کی جان لینے کی کوشش کرنا اور میرا اس پر چڑھ دوڑنا...... پھر پالتو چیتوں کی خوفناک جھپٹ، ان کی پھڑکتی ہوئی لاشیں، لکڑی کے پل کے آس پاس ہمارے اور ملنگوں کے درمیان خون ریز لڑائی۔ میری، رضوان اور انیق کی زبردست مزاحمت اور اس سب سے بڑھ کر عمر رسیدہ گول کیپر کا آخری اسٹینڈ۔

''کیا سوچ رہے ہیں؟'' تاجور نے مجھے خیالوں سے چونکایا۔

''نہیں، کوئی خاص بات نہیں۔'' میں نے کہا۔

......اگلا قریباً آدھ گھنٹا شدید کشمکش میں گزرا۔ پھر فیض محمد کے تاثرات سے مجھے اندازہ ہوا کہ حسبِ توقع سجاول اور اس کے ساتھی ملنگوں پر غالب رہے ہیں۔ فائرنگ بھی اب تھم چکی تھی۔ ہمارے اردگرد حالات معمول پر نظر آرہے تھے۔ کم وبیش ایک گھنٹے بعد سجاول اور اس کے ساتھی واپس آگئے۔ احاطے میں جلتی ہوئی تین چار مشعلوں کی روشنی میں، میں نے دیکھا، سجاول کے ساتھیوں کی ایک ٹولی، دو افراد کو ہانکتی ہوئی اپنے ساتھ لارہی تھی۔ ان میں سے ایک مرد تھا، دوسری عورت۔ دونوں کی آنکھوں پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ مرد زخمی نظر آتا تھا۔ عورت واویلا کررہی تھی اور ڈکیتوں سے اپنی پشت پر چھڑیاں کھا رہی تھی۔ یقیناً وہ ملنگی ڈیرے کی کوئی ملنگنی ہی تھی۔ شاید وہ پردے والی سرکار کی عقیدت میں اندھی ہوکر اس خطرناک مہم میں مردوں کے ساتھ چلی آئی تھی اور پکڑی گئی تھی، اس کی عمر

چالیس کے آس پاس رہی ہوگی شکل کی بھی معمولی تھی لیکن اس کے ساتھ اب یہاں کچھ بھی ہوسکتا تھا۔ وہ پکار رہی تھی۔ ''مستاں مائی کی دیوانی ہوں...... پردے والی سرکار کی ملنگنی ہوں۔ بہت بری موت مرو گے۔ کیڑے پڑیں گے تمہارے پنڈے میں......''

خطرناک شکلوں والے ڈکیت ان دونوں کو دھکیلتے ہوئے اور گالیاں دیتے ہوئے اندرونی حصے میں لے گئے۔ خدا کا شکر تھا کہ تاجور کی نگاہ ان مناظر سے محفوظ رہی تھی۔ وہ اندر اپنے کمرے میں تھی۔ میں چاہتا تھا کہ میری ملاقات فیض سے ہوجائے تاکہ مجھے پتا چل سکے کہ ملنگوں پر کیا گزری۔ لیکن وہ کہیں دکھائی نہیں دیا۔ واپس کمرے میں جاکر تاجور کو سمجھانے بجھانے میں مجھے کافی وقت لگا۔ میں نے اسے بتایا کہ بظاہر تو یہ ان ڈکیتوں کا کوئی مخالف گروپ لگتا ہے، جسے ان لوگوں نے مار بھگایا ہے۔ رات گئے تک میں جاگتا رہا۔ ایک تو یہ پریشانی تھی کہ ملنگوں نے ابھی تک ہمارا پیچھا نہیں چھوڑا، اور وہ چاند گڑھی میں ریشمی وغیرہ کو بھی نقصان پہنچانے کی چھوٹی بڑی کوشش کرسکتے ہیں۔ دوسری بات یہ تھی کہ رحیم کی تاجور کے بارے میں کہی ہوئی بات میرے ذہن سے نکل نہیں پا رہی تھی۔ ''تاجور کو تیار کرنے میں دو سال کا وقت لگے گا۔'' آخر اس کا کیا مطلب تھا؟ یہ بات کن معنوں میں کہی گئی تھی؟

☆☆☆

اگلے روز تاجور نے ایک ایسا کام کیا، جس کی مجھے ہرگز امید نہیں تھی۔ اس سیدھی سادی لڑکی نے اپنی خداداد ذہانت سے ایک معما حل کر ڈالا۔ میں بیدار ہوا تو وہ بیڈ پر بیٹھی بڑے غور سے کچھ پڑھ رہی تھی۔ دو ریشمی لٹیں دلکش چہرے پر جھول رہی تھیں۔ میں یہ دیکھ کر چونکا کہ اس کے ہاتھ میں وہی ناقابلِ فہم تحریر والا خط ہے۔ غالباً میرے کپڑے جھاڑتے ہوئے اسے یہ ملا تھا۔ مجھے بیدار ہوتے دیکھ کر وہ بولی۔ ''یہ کیا اوٹ پٹانگ لکھا ہے شاہ زیب؟''

''بس اوٹ پٹانگ ہی ہے۔ رحیم نے مجھے دیا تھا۔ اسے بھی پتا نہیں چل سکا تھا۔''

''لیکن میری سمجھ میں آگیا ہے۔ یہ الٹ لکھا ہوا ہے۔'' وہ عام سے لہجے میں بولی۔

میں تڑپ کر اٹھ بیٹھا۔ ''الٹ لکھا ہوا ہے؟ کیا مطلب؟''

وہ کسی استانی کی طرح مجھے سمجھانے لگی۔ ''......یہ دیکھیں نا۔ یہ پہلا لفظ ہے رٹسام۔ یعنی رٹ س ام۔ اب ان حرفوں کو الٹ کر پڑھیں۔ تو یہ بن جائے گا ماسٹر۔ اب اگلا لفظ دیکھیں۔ ی ہے بحاص۔ یعنی ب ح اص۔ اب اس کو الٹا کر پڑھیں تو یہ بنے گا...... ص اح ب...... صاحب۔ یہ بن گیا ماسٹر صاحب۔ آگے لکھا ہوا ہے...... پاجہب ٹیل وہ۔ پا یعنی آپ۔ جہب یعنی بہت...... ٹیل یعنی لیٹ...... وہ یعنی ہو...... اب یہ سارا فقرہ اس طرح ہوگیا...... ماسٹر صاحب! آپ بہت لیٹ ہو۔''

وہ تعریف طلب نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔

میں واقعی ششدر تھا۔ وہ تحریر جس نے بہت دنوں تک عبدالرحیم کو پریشان رکھا تھا اور پھر کئی دنوں سے مجھے اور پہلوان حشمت کو بھی الجھایا ہوا تھا۔ تاجور نے بڑی سادگی سے سلجھا دی تھی اور کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے، کوئی لاینحل معما، یونہی بیٹھے بٹھائے اچانک کسی کی سمجھ میں آجاتا ہے اور معما حل کرنے والے کو خود بھی پتا نہیں ہوتا کہ اس نے کتنا بڑا کام کردیا ہے۔ تاجور اب جوڑ کر اگلا جملہ پڑھ رہی تھی۔

روب جم وہ رک طخ انکھل اڑپ۔ روب جم کو اس نے الٹ کر مجبور پڑھا۔ وہ کو ہو بنایا۔ طخ کو خط...... انکھل کو لکھنا اور اڑپ کو پڑا۔ سارا فقرہ یوں بن گیا۔ مجبور ہوکر خط لکھنا پڑا۔

میں نے خط تاجور کے ہاتھ سے جھپٹ لیا۔ وہ ''معصوم حیرانی'' کے ساتھ میری طرف دیکھنے لگی۔ اس ناقابلِ فہم تحریر کی ''چابی'' مل گئی تھی۔ اب یہ سارا خط لفظ بہ لفظ ''ڈی کوڈ'' ہورہا تھا۔ رٹسام بحاص پاجہب ٹیل وہ۔ ''روب جم'' وہ رک طخ انکھل اڑپ۔ (ماسٹر صاحب آپ بہت لیٹ ہو۔ مجبور ہوکر خط لکھنا پڑا)

میں نے خط پڑھنا شروع کیا اور میری آنکھیں کھلتی چلی گئیں۔ دل کی دھڑکن بڑھتی جارہی تھی۔ یہ کوئی معمولی خط نہیں تھا۔ یہ ایک زبردست انکشاف کی حیثیت رکھتا تھا۔ نیچے کی سطروں میں ایک فقرہ کچھ اس طرح سے تھا...... ''باروجات ایک سبھ چھک اترک (کرتا) وہ اگ۔''

میری نگاہوں کے سامنے چاند گڑھی کے عالمگیر کا مکروہ چہرہ نمایاں تر ہوتا چلا جارہا تھا۔

خونریزی اور بربریت کے خلاف
صف آرا نوجوان کی کھلی جنگ
باقی واقعات آئندہ ماہ پڑھیے

بھینٹ

جمال دستی

نادرو نایاب اشیا کے ساتھ کچھ ہستیاں ایسی ہوتی ہیں جن کا کبھی کوئی نعم البدل نہیں ہوتا... ایک سرمائے کو بچانے کے لیے بعض اوقات لوگ اپنے دوسرے قیمتی سرمائے کو داؤ پر لگا دیتے ہیں... جنگ کے بعد بدل جانے والی صورتِ حال سے جنم لینے والے... تغیرات و سانحات... ہر شخص اس کی لپیٹ میں تھا... اور دور تک تمام تر حادثات کا کوئی تدارک نہیں تھا بلکہ آنکھوں کے سامنے ایسا شہر تھا جس کے در و دیوار پر زنداں کی فصیلوں کا گماں گزرتا تھا...

انجانے ان جانے راستوں سے تعلق رکھنے والی پراثر کہانی کے اسرار...

واماشو اپنے دفتر میں بیٹھا خالی نظروں سے میز پر رکھے ہوئے کاغذات کو دیکھ رہا تھا جن میں رسیدیں، خطوط، معاہدوں کی نقول اور بلز وغیرہ شامل تھے۔ اس کے بائیں ہاتھ پر وہسکی کا گلاس رکھا ہوا تھا جس میں ایک گھونٹ باقی رہ گیا تھا اور اس کے بالکل سامنے دروازے میں سیکریٹری ماوس کھڑی ہوئی مضطرب انداز میں اسے دیکھ رہی تھی۔ اسے وہاں کھڑے ہوئے ایک یا دو منٹ ہو چکے تھے اور وہ انتظار میں تھی کہ باس اسے کیا ہدایات دیتا ہے۔ واماشو نے

نظریں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور سر ہلاتے ہوئے بولا۔
"تم سپرنٹنڈنٹ کو اندر بھیج سکتی ہو۔"

ماؤس مڑی اور اس نے باہر کھڑے ہوئے شخص کو اندر آنے کا اشارہ کیا۔ سپرنٹنڈنٹ کمرے میں داخل ہوا اور واماشو کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ ماؤس نے کمرے کا دروازہ بند کیا اور باہر چلی گئی۔

"میں تمہارے استقبال کے لیے ضرور کھڑا ہوتا میرے دوست لیکن مجھ میں بالکل بھی طاقت نہیں ہے۔" واماشو نے ایک خالی کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا جس پر سپرنٹنڈنٹ گوشی بیٹھ گیا۔ اس نے اپنا ہیٹ اتار کر میز پر رکھا اور کچھ دیر خاموش بیٹھا رہا۔ اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی چھائی ہوئی تھی۔ اس نے رسمی طور پر واماشو سے مصافحہ کرنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی۔

"تم نے میرے بیٹے کو تلاش کر لیا؟" واماشو نے پوچھا اور گلاس ہونٹوں سے لگا کر بچی ہوئی وہسکی معدے میں اتار لی۔

"ہاں، اس کی لاش جھیل چیویرو کے کنارے صبح سویرے ملی ہے۔ یہ جگہ شمالی کنارے پر واقع پکنک پوائنٹ سے تھوڑے ہی فاصلے پر ہے۔" سپرنٹنڈنٹ نے گمبھیر آواز میں کہا۔

واماشو نے سرد آہ بھری اور چھت کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں نمی تیر رہی تھی۔ وہ چھوٹے قد کا تنومند شخص تھا۔ اس کے سر میں وسط سے بال غائب ہونا شروع ہو گئے تھے۔ البتہ گھنی مونچھوں سے چہرہ بارعب نظر آتا تھا۔

"ہم زمانۂ جنگ میں ساتھ رہے ہیں۔ میرے دوست اور ایسے کئی لوگوں کو مرتے ہوئے دیکھا ہے جو ہمارے لیے بھائیوں جیسے تھے۔ لیکن میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ تمہیں کس طرح بتاؤں......" یہ کہتے ہوئے گوشی کی آواز بھرّا گئی۔ اس نے گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔ "انہوں نے تمہارے بیٹے کے ساتھ بہت برا سلوک کیا ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ ایسا مرنے سے پہلے کیا یا بعد میں۔ بہر حال مجھے بہت افسوس ہے۔"

واماشو کے دانت شدتِ جذبات سے بھنچ گئے اور اس نے دونوں ہاتھوں میں اپنا چہرہ چھپا لیا۔ اس کا بدن ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔

"مجھے اس کی موت کا بہت افسوس ہے۔" گوشی نے ایک مرتبہ پھر کہا۔

"مجھے تمہارے پُرسے کی ضرورت نہیں۔ میں کہانیاں سننا نہیں چاہتا بلکہ چاہتا ہوں کہ تم اس شخص کو تلاش کرو جس نے یہ سب کیا ہے۔" واماشو چلّاتے ہوئے بولا۔

"میں اسی لیے خود تم سے ملنے آیا ہوں تاکہ تمہیں یقین دلا سکوں کہ جب تک اس شخص کو گرفتار نہ کرلوں، میں چین سے نہیں بیٹھوں گا۔ میں تمہارا ماتحت رہ چکا ہوں۔ اس لیے تم سے زیادہ میرے لیے کوئی اور اہم نہیں ہو سکتا اور اگر یہ تعلق نہ ہوتا تب بھی بحیثیت ایک ذمّے دار پولیس آفیسر کے میں اپنے فرائض سے غافل نہیں رہ سکتا۔"

واماشو نے اسے گھورا اور طنزیہ انداز میں بولا۔
"یہاں بیٹھ کر باتیں بنانے سے کوئی فائدہ نہیں۔ مجھے نتیجہ چاہیے۔"

"گوشی اس کا اشارہ سمجھ گیا۔ وہ اپنی کرسی سے اٹھا۔ وردی کی سلوٹیں دور کیں۔ اپنا ہیٹ اٹھایا اور مڑ کر دروازے کی طرف جانے لگا۔ ابھی وہ باہر نہیں گیا تھا کہ واماشو نے اس سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

"اور جب تم اسے تلاش کرلو گے۔" واماشو نے اپنی میز کی دراز سے لمبا پستول نکالا اور اس کی نال کا رخ گوشی کے سر کی جانب کرتے ہوئے بولا۔ "تو اسے میرے حوالے کر دینا۔ وہ میرا مجرم ہے اور اسے میں خود سزا دوں گا۔"

گوشی اس کی جذباتی کیفیت کو محسوس کر سکتا تھا اس لیے اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ایک آزاد ملک کا شہری ہونے کے باوجود واماشو ابھی تک قبائلی دور میں زندہ تھا اور اسی زمانے کے قانون کے مطابق بات کرتا تھا۔

واماشو کی رہائش ہائی لینڈ میں واقع ایک وسیع و عریض بنگلے میں تھی جو کئی ایکڑ پر پھیلا ہوا تھا۔ اس کے چاروں طرف بوگن ویلیا کی باڑھ تھی جبکہ بنگلے کی چھتیں ٹین کی چادروں سے بنی ہوئی تھیں۔ بارش ہوتی تو بوندوں کی ٹپ ٹپ سے فضا گونج اٹھتی۔ ورانڈے میں کچھ مرد بیٹھے افریقی بیئر پی رہے تھے۔ واماشو اور کچھ عمر رسیدہ مرد لوہے کی پرانی وضع کی کرسیوں پر جبکہ نوجوان فرش پر بیٹھے ہوئے تھے۔ مکان کے اندر سے عورتوں کے بین کرنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ ان میں سب سے نمایاں آواز اس کی سابقہ بیوی اور مرنے والے بیٹے کی ماں روناکو، کی تھی۔ انہیں لاش نہیں ملی تھی جو ابھی تک پولیس کی تحویل میں تھی۔ وقت آنے پر سپرنٹنڈنٹ خود بند تابوت میں لاش لے کر آتا۔ اس کے آنے تک واماشو خود بھی تنہائی چاہ رہا تھا لیکن بیٹے کی موت کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل چکی تھی اور

اس کے لیے ممکن نہ تھا کہ وہ رشتے داروں اور دوستوں کو روک سکتا جو چیونٹیوں کی طرح قطار در قطار چلے آرہے تھے۔

چوکیدار نے احاطے کا گیٹ کھولا اور ایک لینڈ روور احاطے میں داخل ہوئی۔ اس کی تیز روشنیوں نے لمحہ بھر کے لیے باغ کو منور کردیا۔ پھر وہ گاڑی دوسری کاروں کے عقب میں کھڑی ہوگئی اور اس میں سے ایک طویل قامت ڈرائیور برآمد ہوا جو بارش میں بھیگنے کی پروا کیے بغیر آہستہ آہستہ چلتا ہوا برآمدے کی طرف بڑھ گیا۔ واماشو کی نظریں اسی پر جمی ہوئی تھیں۔ جب وہ قریب آیا تو اس نے برآمدے کی روشنی میں دیکھا کہ وہ ایک عورت تھی۔ واماشو نے اپنی پوری زندگی میں اتنی طویل قامت عورت نہیں دیکھی تھی۔ وہ قدرے جھک کر چل رہی تھی جیسے اپنے قد کو چھپانے کی کوشش کررہی ہو۔ اس کے بال ترشے ہوئے تھے۔ اس نے براؤن سوٹ کے ساتھ سفید بلاؤز پہن رکھا تھا اور اس کے کندھے پہ ایک بیگ بے ڈھنگے انداز سے لٹک رہا تھا۔ برآمدے میں پہنچ کر وہ رک گئی اور اس نے قدیم انداز میں دونوں ہاتھ جوڑ کر لوگوں کو تعظیم کی۔ جواب میں دونوں بیٹھے ہوئے مردوں نے بھی ایسا ہی کیا۔

واماشو اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے پاس گیا۔ وہ بمشکل اس کے سینے تک پہنچ پارہا تھا۔

''نمی تم برزیکو۔'' لڑکی نے مقامی زبان میں روایتی انداز میں کہا۔

''اکاؤنیکوا'' واماشو نے جواب دیا۔

وہ اسے پہچان نہیں سکا۔ بظاہر وہ کوئی دور پرے کی رشتے دار یا کسی دوست کی دوست یا پھر کوئی ایسی عورت ہو سکتی تھی جو تعزیت کے بہانے مفت کا کھانا کھانے چلی آئی ہو۔ ان دنوں زمبابوے کے مختلف علاقوں میں یہ رجحان زور پکڑتا جارہا تھا کہ لوگ شادی بیاہ یا میت کے موقع پر اپنا تعلق ظاہر کرکے کھانا کھانے چلے آتے ہیں۔ اس کی بڑی وجہ بڑھتی ہوئی غربت ہے۔

''میں جانتی ہوں کہ یہ کوئی مناسب موقع نہیں ہے لیکن کیا ہم کچھ بات کرسکتے ہیں؟'' اس عورت نے کہا۔

''تم کون ہو؟'' واماشو نے پوچھا۔

''سی آئی ڈی سراغ رساں مناتسی، مجھے سپرنٹنڈنٹ گوشی نے بھیجا ہے۔''

واماشو دھیمے لہجے میں بولا۔ ''میرے خیال میں اس نے کہا تھا کہ وہ اپنے بہترین آدمی کو بھیجے گا۔''

''میں وہی ہوں۔'' سراغ رساں مناتسی نے سپاٹ آواز میں جواب دیا۔ وہ اس طرح کے تبصروں کی عادی ہو چکی تھی اس لیے انہیں زیادہ اہمیت نہیں دیتی تھی۔

واماشو اسے بیزاری کے ساتھ گھر کے اندر لے گیا جہاں عورتیں دعاؤں میں مصروف تھیں۔ وہ ان کے پاس سے گزرتے ہوئے اسٹڈی میں پہنچے۔ وہ اپنی میز پر بیٹھ گیا لیکن اس نے مناتسی کو کرسی پیش نہیں کی۔ اس کمرے میں ایک بک شیلف تھا جس میں کچھ پرانی کتابیں رکھی ہوئی تھیں۔ ایک دیوار پر دنیا کا نقشہ لٹکا ہوا تھا جبکہ دوسری دیوار پر ایک قطار میں لکڑی کے بنے ہوئے ماسک ٹنگے ہوئے تھے۔

''میں تم سے اس دن کے بارے میں چند سوالات پوچھنا چاہتی ہوں، جب تناشی گم ہوا تھا۔'' مناتسی نے کہا۔

''کیا یہ کسی قسم کا مذاق ہے؟ اس کا جواب میں پہلے ہی دے چکا ہوں جب میں نے گمشدگی کی رپورٹ درج کروائی تھی۔ تمہیں فائل میں دیکھنا چاہیے تھا۔''

''میں جانتی ہوں کہ تمہارے لیے یہ ایک مشکل وقت ہے لیکن اگر تم چاہتے ہو کہ ہم قاتل تک پہنچ سکیں تو ہمیں یہ سب کرنا ہوگا۔ میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ مجھے کیا کرنا ہے اور کیا نہیں۔ میں وہ رپورٹ دیکھ چکی ہوں اور اس میں دی گئی معلومات ناکافی ہیں۔'' اس نے تحمل سے کہا۔ ''دیکھو، مجھے صرف تمہارے لیے ایک دوسرے کیس سے ہٹایا گیا ہے۔ میں جاننا چاہتی ہوں کہ جس روز تناشی غائب ہوا تو کیا ہوا تھا؟''

''یہ دو ہفتے پہلے کی بات ہے۔ وہ سنیچر کا دن تھا۔ میرا لڑکا تناشی کرکٹ کھیلنے سینٹ جونز، جایا کرتا تھا۔ جہاں وہ زیرِ تعلیم تھا۔ میں اسے لینے گیا لیکن وہ وہاں نہیں تھا۔''

''تم عام طور پر اسے کس وقت لینے جاتے ہو؟''

''ویسے تو ڈرائیور اسے لینے جاتا تھا۔'' واماشو نے کہا۔ ''لیکن میں نے اس روز ڈرائیور کو منع کردیا اور کہا کہ میں خود اسے لینے جاؤں گا کیونکہ میں اس کے ساتھ کچھ وقت گزارنا چاہ رہا تھا۔ جب سے میری بیوی کو طلاق ہوئی تھی، تناشی پریشان رہنے لگا تھا اور اسکول میں بھی اسے مشکل پیش آرہی تھی لہٰذا میں نے سوچا کہ یہ اس کے ساتھ وقت گزارنے کا ایک اچھا بہانہ ہوگا۔''

''تم نے بیوی کو طلاق کب دی؟''

''گزشتہ برس۔''

''اور اس کے بعد تم نے دوسری شادی کرلی؟''

''اس معاملے سے تمہارا کوئی تعلق نہیں۔''
''جب تک اس کیس کی تفتیش مکمل نہیں ہو جاتی، اس خاندان کے ہر فرد کے بارے میں جاننا میری مجبوری ہے۔ میں نے تمہارے ہاتھ میں انگوٹھی دیکھی تو خیال آیا کہ نئے ماحول کی وجہ سے وہ ڈسٹرب رہنے لگا ہو۔ ممکن ہے کہ اس نے فرار کے راستے تلاش کیے ہوں اور بُرے لوگوں کی صحبت میں رہنے لگا ہو۔ تم تو جانتے ہی ہو کہ حالات کتنے خراب ہو گئے ہیں۔ ہم ایک پُرتشدد ماحول میں رہ رہے ہیں۔''

یہ کہہ کر وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور دیوار کے قریب جا کر ایک ماسک کا معائنہ کرنے لگی۔ یہ ٹیک کی لکڑی کا بنا ہوا تھا جس پر مقامی آرٹسٹ نے مغربی افریقن ڈیزائن بنایا تھا۔ اس نے آنکھوں کی جگہ بنے ہوئے سوراخوں میں جھانکا۔ پیچھے سفید دیوار نظر آرہی تھی۔

''اس کی گمشدگی کے بعد تمہیں تاوان کی ادائیگی کے لیے کوئی خط ملا؟'' سراغ رساں نے پوچھا۔
''نہیں۔''
''کوئی فون کال، ایس ایم ایس۔ ای میل یا اس قسم کی کوئی چیز؟''
''نہیں، ایسا کوئی پیغام نہیں ملا۔'' واماشو نے جواب دیا۔ وہ کچھ مشتعل نظر آرہا تھا۔

سراغ رساں مناتسی سائڈ بورڈ تک گئی۔ وہاں رکھے ہیرالڈ کے تازہ شمارے سے ایک صاف کاغذ پھاڑا پھر اپنے ہینڈ بیگ سے تمباکو کا پاؤچ نکالا اور ایک چٹکی کاغذ پر چھڑک کر اسے سگریٹ کی طرح رول کی شکل دی اور زبان پھیر کر اسے چپکایا پھر بیگ سے ماچس نکالی اور سگریٹ سلگا کر اس کا کش لیتے ہوئے بولی۔

''یہ ایک غیر معمولی بات ہے۔ انہوں نے ایک امیر لڑکے کو اغوا کیا اور تاوان کے بارے میں کوئی بات نہیں کی۔ اسے میری عقل قبول نہیں کرتی، اگر ان کی جگہ میں ہوتی تو اب تک اس کی رہائی کے عوض ایک بھاری رقم وصول کر چکی ہوتی۔'' پھر اس نے ایک طویل کش لے کر دھواں خارج کیا اور بولی۔ ''کیا تمہارے کچھ دشمن بھی ہیں؟''
''ہر ایک کا کوئی نہ کوئی دشمن ہوتا ہے۔'' واماشو نے جواب دیا۔
''تم کسی کی نشاندہی کر سکتے ہو۔ مثلاً کوئی ایسا شخص جو ماضی میں تمہارا سخت ترین حریف رہا ہو۔ کسی سے تمہاری کوئی کاروباری رقابت ہو یا تم نے کسی کو ٹریفک حادثے میں نقصان پہنچایا ہو۔ میں چاہتی ہوں کہ تم مجھے ان لوگوں کی فہرست بنا کر دو۔ یہ ہمارے لیے ایک اچھا نکتہ آغاز ہوگا۔''

واماشو نے پیڈ پر چند نام لکھے۔ سراغ رساں اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ''تمہیں بتایا گیا ہے کہ انہوں نے اس کے ساتھ کیا کیا۔ اس کا ایک پاؤنڈ گوشت، دونوں ہاتھ، دل، جگر اور آنکھیں سب نکال لیے۔ اگر یہ جسمانی اعضا کا کاروبار کرنے والے گروہ کی کارستانی ہے تو ان کے لیے آنکھیں سب سے اہم ہوتی ہیں۔''

واماشو نے کوئی جواب نہیں دیا اور دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر رونے لگا۔ مناتسی سے اس کی حالت دیکھی نہ گئی۔ اس نے مزید سوالات کرنے کا ارادہ ملتوی کیا اور اس سے اجازت لے کر رخصت ہو گئی۔

☆☆☆

دوپہر کا سورج آگ برسا رہا تھا جب سراغ رساں مناتسی، دومبوشاوا پہنچی۔ اس نے اپنی کار پانچ جھونپڑیوں کے قریب کھڑی کی جو ایک باڑے کی شکل میں بنائی گئی تھیں۔ گرمی کی وجہ سے اس کا جسم پسینے سے شرابور ہو گیا تھا۔

اس نے بریک پر پاؤں رکھے رکھے دروازہ کھولا۔ ایک بڑا پتھر اٹھایا اور اسے اگلے ٹائر کے نیچے لگا دیا کیونکہ اس کی گاڑی کا ہینڈ بریک ڈھیلا ہو گیا تھا اور وہ کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتی تھی۔ پھر وہ کار سے باہر آئی۔ اس نے ایک اور پتھر تلاش کیا اور ٹائر کے آگے لگا دیا۔ اس نے متعلقہ محکمے کو اس خرابی کی اطلاع دی تھی لیکن انہوں نے روایتی سستی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ابھی تک اس جانب کوئی توجہ نہیں دی تھی۔

درختوں کے جھنڈ کے عقب سے ڈرم بجنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ اس نے اپنا دستی بیگ اٹھایا اور دروازے پر دستک دی۔ ایک لڑکی بوسیدہ لباس پہنے جھونپڑی سے باہر آئی اور اس کی طرف لپکی پھر اس نے مسکراتے ہوئے اپنے سفید دانتوں کی نمائش کی اور مقامی زبان میں کچھ کہا جس کے جواب میں سراغ رساں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ چھوٹی لڑکی نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اس جانب لے کر چل دی جہاں سے ڈرم کی آواز آرہی تھی۔ یہ جھونپڑیاں موٹی لکڑی کی بنی ہوئی تھیں اور ان پر پیال کی چھت تھی۔ ان کی دیواریں گولائی میں بنی ہوئی تھیں جبکہ کھڑکیوں میں شیشے لگے ہوئے تھے۔ یہ ایسے خاندان کی رہائش گاہ تھی جن کی گزر اوقات اچھے طریقے سے ہو رہی تھی۔ باہر مرغیوں کا جوڑا اپھر رہا تھا جبکہ کچھ فاصلے پر ایک لڑکا

بھیڑیں چرا رہا تھا۔ یہ منظر دیکھ کر سراغ رساں کو اپنا بچپن یاد آ گیا۔ اس کی پرورش بھی مین ہنگا میں ایسے ہی ماحول میں ہوئی تھی۔

وہاں تقریباً سو کے لگ بھگ افراد موجود تھے۔ دائیں جانب مرد اور بائیں جانب عورتیں بیٹھی ہوئی تھیں اور صرف بوڑھے لوگوں کو بیٹھنے کے لیے اسٹول مہیا کیے گئے تھے۔ سراغ رساں، عورتوں والے حصے میں چلی گئی اور ایک ایسی جگہ پر بیٹھ گئی جہاں سے وہ دوسری عورتوں کے گھنگھریالے بال اور سروں پر لپٹا ہوا کپڑا بہ آسانی دیکھ سکے۔ وہ جگہ خاصی سخت، رف اور گرم تھی۔

''کیا تم ہرارے سے آئی ہو؟'' ایک بوڑھی عورت نے اس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

''میں اس خاندان کی دوست ہوں۔'' سراغ رساں مناتسی نے جواب دیا۔

''اس لڑکے کے ساتھ جو کچھ ہوا، وہ بہت بڑا المیہ ہے۔ یہ وقت بھی دیکھنا تھا کہ ہم بوڑھے، نوجوانوں کو دفنائیں گے۔''

اس محفل میں زیادہ تر بوڑھے اور چھوٹے بچے شامل تھے۔ جوان مرد اور عورتیں اپنے کام کے سلسلے میں جون ہی یا ہرارے گئے ہوئے تھے۔ سامنے ایک پادری ہاتھ میں بائبل لیے ہوئے کھڑا تھا۔ نیچے کی جانب قبریں بنی ہوئی تھیں۔ ان میں سے ایک تازہ قبر کھودی گئی تھی۔ اس کے پاس ہی چھوٹی میز پر تابوت رکھا ہوا تھا۔ اس نے حاضرین کو مخاطب کرتے ہوئے کہنا شروع کیا۔

''واماشو خاندان کے لیے یہ ایک عظیم صدمہ ہے لیکن میرے بھائیو اور بہنو...... ہمیں خدا کی رحمت سے مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ واماشو ایک سچا عیسائی اور میرے چرچ کا رکن ہے اور تم جانتے ہو کہ چرچ کی ذمے داری خدا کے اوپر ہوتی ہے۔ میں تمہیں بتاتا ہوں کہ انسان اپنے اعمال کی بدولت خدا سے قریب ہوتا ہے اور وہ اپنے نیک بندوں کو یہ ذمے داریاں سونپ دیتا ہے۔ میرے نزدیک واماشو سے بہتر عیسائی کوئی نہیں۔ گزشتہ برس جب اس نے نئی بینز خریدی، تب بھی اس نے خدا کو یاد کیا تو اس نے بالکل ویسی کار مجھے بھی لے کر دی۔ اس کا رنگ، ماڈل، سب کچھ ایک جیسا تھا۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ خدا بہت بڑا ہے اسی لیے اس نے کلیسا کے خدمت گاروں کو بھی یاد رکھا۔ میں تمہیں یہ بتانے آیا ہوں کہ ظالم خدا کے قہر سے نہیں بچ سکیں گے۔ خدا تمہارے آنسو پونچھ دے گا۔ وہ تاتاشی کو جنت میں جگہ دے گا۔ خدا ہم سب پر مہربان ہو۔''

مجمع کی آہوں اور سسکیوں سے فضا سوگوار ہو گئی تھی۔ مرنے والے لڑکے کی ماں کی گریہ وزاری نے سراغ رساں مناتسی کا دل ہلا کر رکھ دیا تھا۔ وہ اپنی عادت کے مطابق اس عورت سے ملنے کے لیے بے تاب ہو گئی۔ وہ ہر کیس میں یہی کیا کرتی تھی۔ حالانکہ وہ تدفین میں شرکت کرنے کے لیے صرف اس وجہ سے آئی تھی کہ مرنے والے کے اہلِ خانہ سے مل سکے لیکن اس عورت کا دکھ محسوس کر کے اس کا عزم اور پختہ ہو گیا۔ اس نے تہیہ کر لیا کہ وہ اس عورت کو انصاف دلا کر ہی رہے گی۔ اس کے دکھ کو وہ اپنا محسوس کر رہی تھی۔

تدفین کے بعد لوگ اپنے اپنے گھروں کی جانب رخصت ہونے لگے کہ واماشو اس کے پاس آیا۔ اس کے ماتھے پر پسینے کی بوندیں چمک رہی تھیں اور رونے سے اس کی آنکھیں لال ہو گئی تھیں۔

''تم یہاں کیا کر رہی ہو؟'' اس نے کہا۔ ''تمہیں تو میرے دشمنوں کا تعاقب کرنا چاہیے تاکہ معلوم کر سکو کہ میرے بیٹے کا قاتل کون ہے؟''

''میں یہی دیکھنے آئی تھی کہ شاید یہاں تمہارا کوئی دشمن موجود ہو۔'' مناتسی نے جواب دیا۔

''ان بوڑھے لوگوں میں تم میرے دشمن کو ڈھونڈ رہی ہو، تم کس طرح کی سراغ رساں ہو؟''

''مجھے افسوس ہے۔ میرا مقصد یہ ہرگز نہیں تھا کہ تمہارے دکھ میں اضافہ کروں۔ میرے آدمی پورے شہر میں انہیں تلاش کر رہے ہیں اور اس سلسلے میں جو ممکن ہو سکا، وہ ہم کریں گے۔ میں یہاں اس کی ماں سے تعزیت کرنے آئی تھی۔''

''اسے یہاں رکنے دو تاکہ یہ بھی ایک ماں کے دکھ کو محسوس کر سکے۔'' رونا کو نے کہا جو ان کے عقب میں آ کر کھڑی ہو گئی تھی اور لوگوں کا ایک چھوٹا سا گروپ اس کے گرد موجود تھا۔ وہ بھرائی ہوئی آواز میں کہہ رہی تھی۔

''میرا بیٹا، میرا اکلوتا بیٹا چلا گیا۔ کیا تم اسے واپس لا سکتی ہو؟ تاکہ میں اسے سینے سے لگا سکوں؟''

رونا کو واپس مڑی اور اس سے پہلے کہ مناتسی کچھ کہتی، وہ وہاں سے چلی گئی۔ واماشو بھی کچھ لوگوں کو ساتھ لے کر ڈیرے پر چلا گیا جہاں وہ مشروب سے دل بہلانے لگے۔ مناتسی کچھ دیر قبر کے پاس کھڑی رہی پھر اس نے تھوڑی سی مٹی اٹھا کر اس پر ڈالی پھر اس کے سرہانے ایک اگربتی جلائی۔ وہ چند لمحے سر جھکائے دعائیہ انداز میں کھڑی

رہی پھر جھونپڑیوں میں جاکر دوسری عورتوں میں شامل ہو گئی۔ اس نے اپنی جیکٹ اتاردی اور کھانا بنانے میں ان کی مدد کرنے لگی۔

شام ہونے سے پہلے لوگ اپنے گھروں کو واپس جانے لگے۔ مناتسی نے بھی روانگی کا ارادہ کیا۔ اس لڑکے کی تدفین میں شرکت کر کے وہ اداس ہوگئی تھی۔ ایک جوڑے نے اس سے ہرارے تک کی لفٹ مانگی تو اس نے انکار نہیں کیا۔ اس نے وہاں موجود لوگوں سے اجازت چاہی اور وہاں سے روانہ ہوگئی۔

واماشو اپنے بستر پر لیٹا ہوا تھا جس پر نرم ساٹن کی چادر بچھی ہوئی تھی۔ اس کی نظریں اپنی موجودہ بیوی تسارا پر جمی ہوئی تھیں جو اپنے بندے اور نیکلس اتار رہی تھی۔ وہ سنگار میز کے سامنے بیٹھی ہوئی تھی اور اس کی پشت واماشو کی جانب تھی۔ اس کی سنگار میز سامانِ آرائش سے بھری ہوئی تھی۔ ان میں کاسمیٹکس کے علاوہ غیر ملکی خوشبودار پرفیوم کی بوتلیں بھی تھیں جن کے بارے میں وہ کچھ بھی نہیں جانتا تھا۔ میز کے وسط میں چاندی کا بنا ہوا زیورات کا ڈبا رکھا ہوا تھا جو اس نے شادی کے موقع پر خریدا تھا۔ تسارا نے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا تو شوہر کو اپنی جانب متوجہ پایا۔ ایک فاتحانہ مسکراہٹ اس کے چہرے پر پھیل گئی۔ وہ اپنا میک اپ اتارنے کے بعد بستر پر آگئی اور اس کے پہلو میں لیٹتے ہوئے بولی۔

”تم بہت زیادہ پریشان لگ رہے ہو۔ میں تمہارے ساتھ دومبوتساوا جانا چاہ رہی تھی مگر تم لے کر نہیں گئے۔“

”وہ رونا کو کا گھر ہے۔“ واماشو نے جواب دیا۔

”مجھے اُس کی یا تمہارے خاندان والوں کی پروا نہیں۔ میں صرف تمہارے لیے پریشان ہوں۔ تناشی میرا بھی سوتیلا بیٹا تھا۔ ابھی ہم ایک دوسرے سے قریب بھی نہ ہونے پائے تھے کہ......“

”ایسا مت کہو پلیز۔“ اس نے کہا اور سر جھکا کر گہری سانس لینے لگا۔

”میرے قریب آؤ۔“ تسارا نے کہا اور اس کا سر اپنی گود میں رکھ کر انگلیوں سے سہلانے لگی۔

تسارا صرف تیئس برس کی تھی۔ اس کی قربت میں رہ کر واماشو دوبارہ اپنے آپ کو جوان محسوس کرنے لگا۔ جب پہلی بیوی رونا کو سے مزید کوئی اولاد نہیں ہوئی تو اس نے دوسری شادی کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ کیونکہ اس جیسے صاحب حیثیت شخص سے صرف ایک بیٹے پر قناعت کرنے کی توقع کی نہیں جاسکتی تھی۔ افریقی معاشرے میں زیادہ بچوں والا شخص عزت واحترام کے قابل سمجھا جاتا ہے۔ رونا کو، کو یہ بات سمجھ لینی چاہیے تھی۔ وہ بانجھ ہو چکی تھی جبکہ تسارا ابھی جوان تھی اور اس کے لیے مزید بچے پیدا کرسکتی تھی، اس نے سوچا کہ یہ بھی ممکن ہے کہ رونا کو اسے یہ موقع دے۔

وہ اب بھی رونا کو سے محبت کرتا تھا۔ ان دونوں کی بیس سال کی رفاقت تھی اور وہ اسے نظرانداز نہیں کرسکتا تھا لیکن بچوں کی اہمیت اپنی جگہ تھی۔ یہ ایک معاشرتی ذمے داری تھی جسے پورا کرنا ضروری تھا اور اب وہ اپنے اکلوتے بیٹے سے بھی محروم ہوچکا تھا۔ وہ ابھی تک تسارا کے زانو پر سر رکھے لیٹا ہوا تھا اور جانتا تھا کہ وہ اس کی کمی کو دور کرسکتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی اسے اپنی سوچ پر شرمندگی محسوس ہونے لگی۔ ابھی تو اس کے بیٹے کا کفن بھی میلا نہیں ہوا تھا اور وہ دوسرے بچے کے بارے میں منصوبہ بندی کررہا تھا۔

”زمبابوے پولیس نکمی ہے۔ میں کسی پرائیویٹ سراغ رساں کی خدمات حاصل کرلوں۔“ اس نے تلخی سے کہا۔ ”نہ جانے میں کیوں پولیس کے پاس چلا گیا تھا۔ غیر پیشہ ور، رشوت خور، بالکل نکمی پولیس ہے۔“

اسے کوئی جواب نہ ملا تو اس نے مڑ کر تسارا کی جانب دیکھا۔ وہ گہری نیند سو رہی تھی اور ہلکی سانسوں سے اس کے سینے کا زیروبم نمایاں ہو رہا تھا۔ اس نے سوچا کہ جوانی میں نیند کا غلبہ کچھ زیادہ ہی ہوتا ہے۔ وہ کچھ دیر اسے دیکھتا رہا اور جب اسے یقین ہوگیا کہ وہ اتنی جلدی اٹھنے والی نہیں تو وہ آہستگی سے بستر سے اترا اور دبے پاؤں چلتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

وہ راہداری میں چلتا ہوا خادمہ کے کمرے کے سامنے سے گزرا، اور آخری دروازے تک پہنچ گیا۔ اس نے کمرے کی بتیاں روشن کیں اور وہاں کا جائزہ لینے لگا۔ بستر بے ترتیب حالت میں تھا۔ گندے جوتوں کا ایک جوڑا قالین پر جبکہ میلے کپڑے ایک کونے میں پڑے ہوئے تھے۔ دیواروں پر امریکی گلوکاروں اور فلموں کے پوسٹرز لگے ہوئے تھے جبکہ میز پر کورس کی کتابیں اور کاپیاں رکھی ہوئی تھیں۔ تناشی کا کمرا بالکل اسی حالت میں تھا جیسے وہ اسے چھوڑ کر گیا تھا۔

واماشو نے دروازہ بند کیا اور کمرے کی بتیاں بجھا دیں پھر وہ چلتا ہوا بستر تک آیا اور اس پر لیٹ گیا۔ یہ اس کے بیٹے کا بستر تھا۔ جس کا گدا اس کے بوجھ تلے دب رہا تھا اور اسپرنگ سے آواز نکل رہی تھی۔ وہ اپنے بیٹے کو یاد کر کے

روتے لگا۔ اور اس کی آنکھوں سے آنسو نکل کر بستر کو بھگونے لگے پھر اس نے تکیہ اٹھا کر اپنے سینے پر رکھ لیا۔ اب اس کے پاس تنہائی اور یادوں کے سوا کچھ نہیں بچا تھا۔

☆☆☆

ہرارے کا صنعتی علاقہ اب آہستہ آہستہ کھنڈر میں تبدیل ہو رہا تھا اور اس کی عظمتِ رفتہ کی چند نشانیاں ہی باقی رہ گئی تھیں۔ تباہ حال کارخانے جو کبھی دوسرے ملکوں کو برآمد کرنے کے لیے سامان تیار کرتے تھے، اب بند ہو چکے تھے۔ اس علاقے کی سڑکوں پر کارخانوں میں کام کرنے والے ہنرمند اور مزدور ٹولیوں کی شکل میں چلتے نظر آیا کرتے تھے لیکن اب یہ سڑکیں ویران ہو گئی تھیں اور اب وہاں بے روزگار افراد بلامقصد اِدھر سے اُدھر گھومتے پھرتے تھے۔ کارخانے اور گودام خالی پڑے ہوئے تھے۔ ان کے دروازے اور کھڑکیاں ٹوٹ چکی تھیں اور وہاں نصب مشینیں فروخت ہو گئی تھیں یا ٹوٹ پھوٹ چکی تھیں اور کچھ چوری ہو گئی تھیں۔

گیٹ کھولنے والے سیکیورٹی گارڈ نے نیلی وردی پہن رکھی تھی اور اس کی ران کے ساتھ ایک بید کی چھڑی لٹک رہی تھی۔ وہ سپرنٹنڈنٹ کو دیکھ کر اٹین شین ہو گیا اور اسے فوجی انداز میں سیلوٹ کیا۔ جواب میں گوشی نے بھی سر ہلا دیا۔ وہ کسی غیر فوجی شخص کے سیلوٹ کا جواب دینا نفرت انگیز سمجھتا تھا۔ سراغ رساں مناتسی اس سے ایک دو قدم پیچھے چل رہی تھی۔ سپرنٹنڈنٹ کے برعکس اس نے پولیس یونیفارم نہیں پہن رکھی تھی۔

وہ تعمیراتی مشنری کے سامنے سے گزرتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ ان میں زیادہ تر زمین کھودنے والے بھاری آلات، مٹی ڈھونے والے ٹرک، ٹریکٹرز اور ڈمپر ٹرک تھے جن کا زرد رنگ اُڑ چکا تھا۔ ان کے ڈھانچے بھی زنگ آلود اور مسلسل استعمال کے باعث بوسیدہ ہو چکے تھے۔ وہیں تین روڈ رولر بھی برابر برابر کھڑے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک کا ڈرائیور اپنی سیٹ پر بیٹھا کوئی کتاب پڑھ رہا تھا۔ سراغ رساں مناتسی نے ایک ڈرم کو تھپتھپایا اور اس کا ہاتھ گندگی سے سیاہ ہو گیا۔

"مجھے جنگ کے بعد کوئی کاروبار شروع کر دینا چاہیے تھا۔" گوشی نے کہا۔ "ان مشینوں کو دیکھو، کتنی شاندار ہیں۔"

"لیکن اب ان کی حیثیت بچوں کے کھلونوں سے زیادہ نہیں، یہ پرانا مال ہے۔" مناتسی نے جواب دیا۔

''اب بھی یہ مشینیں قابلِ اعتبار ہیں۔ انہوں نے ان کی مناسب دیکھ بھال نہیں کی۔ تم اپنی لینڈ روور کو دیکھو، کون سا ماڈل ہے؟''

''ایس سو تریسٹھ کا۔''

''یعنی تمہاری عمر سے بھی زیادہ پرانی ہے اور ابھی تک چل رہی ہے۔ یہی حال میری ہنڈائی کا بھی ہے۔''

''اس کی بینز بھی یہاں کھڑی ہوئی ہے۔'' مناتسی نے کہا۔''اس کا مطلب ہے کہ وہ اندر موجود ہے۔''

''بہت خوب۔ تمہارا کام لاجواب ہے لیکن میں پہلے فون کر کے معلوم کر چکا ہوں۔ سیل فون سے یہ آسانی ہو گئی ہے۔''

مناتسی نے زوردار قہقہہ لگایا۔ گوشی گھبرایا ہوا تھا اور اپنی گھبراہٹ کو چھپانے کے لیے مذاق کر رہا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ واماشو نے گزشتہ شب فون کر کے اسے زبردست ڈانٹ پلائی تھی اور اس سے جواب طلب کیا تھا۔ حالانکہ انہوں نے اس معاملے کو حل کرنے کی خاطر دوسرے کیس پس پشت ڈال دیے تھے اور اپنے تمام آدمیوں کو قاتلوں کی تلاش پر لگا دیا لیکن ابھی تک کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا تھا۔ اگر وہ شہر میں رہنے والا کوئی لڑکا ہوتا تو انہیں اتنی فکر نہ ہوتی لیکن شمالی مضافات سے کسی امیرزادے کا قتل ایک سنگین معاملہ تھا جس نے پورے پولیس ڈپارٹمنٹ کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔

وہ اینٹوں سے بنی ہوئی دو منزلہ عمارت میں داخل ہو گئے جس کے صدر دروازے پر واماشو کنسٹرکشن اینڈ انجینئرنگ لمیٹڈ کا بڑا سا بورڈ لگا ہوا تھا اور اس پر کمپنی کا فون نمبر، فیکس نمبر اور ای میل ایڈریس بھی درج تھا۔ استقبالیہ کلرک نے بتایا کہ وہ سیدھے اوپر جا سکتے ہیں۔

''مجھے یہیں رک کر تمہارا انتظار کرنا چاہیے۔ میں نہیں سمجھتی کہ اس وقت وہ مجھے یہاں دیکھ کر خوش ہوگا۔''

''تم میرے ساتھ اس کے غصے کا سامنا کرنے آئی ہو۔ مجھے پڑنے والا ہر تھپڑ تم تک بھی پہنچے گا۔ اسے آفت زدہ کی مدد کرنا کہا جاتا ہے۔ کیا تم نے یہ کورس نہیں کیا۔'' گوشی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''زمبابوے پولیس اکیسویں صدی میں قوم کی خدمت کر رہی ہے۔ ہم کسی ایک شخص کے تابعدار نہیں ہو سکتے۔''

لابی میں قدم رکھتے ہی گوشی کی ساری شگفتگی کافور ہو گئی اور اس کی جگہ گہری سنجیدگی نے لے لی۔ وہ اپنے آپ کو واماشو کے تند و تیز سوالوں کے جواب دینے کے لیے تیار کرنے لگا۔ انہیں زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔ سیکریٹری نے فوراً ہی اندرونی دروازہ کھول کر انہیں واماشو کے دفتر میں بھیج دیا۔ شاید اس بارے میں اسے پہلے ہی ہدایات دے دی گئی تھیں۔ انہیں دیکھ کر واماشو اپنی جگہ سے اٹھا اور اس نے قریب آ کر سپرنٹنڈنٹ سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔

''کیا خبر لائے ہو۔ مجھے جلد از جلد نتیجہ چاہیے۔''

''ہم تمہیں اب تک کی تحقیقات میں ہونے والی پیش رفت سے آگاہ کرنے آئے ہیں۔'' گوشی نے سیاسی انداز اختیار کرتے ہوئے کہا۔ وہ اپنے آپ کو دوبارہ جنگ کے دنوں میں لوٹتا ہوا محسوس کر رہا تھا جب وہ خود گوریلا فائٹر اور واماشو اس کا کمانڈر ہوا کرتا تھا۔

''میں کوئی کہانی سننے کے لیے تیار نہیں ہوں۔'' واماشو نے برہمی سے کہا۔''یہ بتاؤ قاتل پکڑے گئے یا نہیں؟''

''ہم اُن کے بہت قریب پہنچ چکے ہیں اور روزانہ ہی کوئی نہ کوئی نئی بات معلوم ہو رہی ہے اسی لیے میں اپنے ساتھ چیف انویسٹی گیشن آفیسر کو بھی لایا ہوں جس سے تم پہلے مل چکے ہو۔ یہ تمہیں تفصیلات سے آگاہ کرے گی۔'' اس نے طوفان کا رخ اپنی ماتحت کی طرف موڑتے ہوئے کہا۔

''واماشو نے مناتسی کو سر سے پاؤں تک دیکھا اور طنزیہ انداز میں بولا۔''تمہارے جوتے کا نمبر کیا ہے؟''

''میں کچھ سمجھی نہیں۔'' وہ حیران ہوتے ہوئے بولی۔

''میرا مطلب ہے کہ تمہارے جوتے کافی بڑے ہیں۔''

''قد کے لحاظ سے میرا پاؤں بھی بڑا ہے۔'' اس نے جواب دیا۔''اور اس سائز کے زنانہ جوتے نہیں ملتے اس لیے مجبوراً مردانہ جوتے پہنتی ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔ اب بتاؤ تم کیا کہنا چاہ رہی ہو۔''

یہ کہہ کر وہ مڑا اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ عمارت کے عقبی حصے میں ایک بڑا احاطہ تھا جس میں مزید تعمیراتی مشینری نظر آ رہی تھی۔ پانی کی کمی اور عملے کی بے پروائی کے سبب جگہ جگہ سے گھاس خشک ہو چکی تھی اور سوکھی زمین نظر آ رہی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھ پیچھے باندھ لیے اور سراغ رساں کی رپورٹ کا انتظار کرنے لگا۔

''یہ ایک پیچیدہ کیس ہے اور ہمیں ابھی تک کوئی ایسا سراغ نہیں مل سکا جس کی بنا پر آگے بڑھا جا سکے اس لیے

پولیس کے روایتی طریقوں پر انحصار کرنا پڑ رہا ہے۔ اس سلسلے میں ہم نے بڑے پیمانے پر لوگوں سے پوچھ گچھ کی ہے۔ یقیناً تمہیں اس کی رپورٹ مل رہی ہو گی۔ ہم نے اخبارات کے ذریعے بھی لوگوں سے اپیل کی ہے کہ اگر ان کے پاس اس بارے میں کچھ معلومات ہوں تو ہم سے ضرور شیئر کریں۔“

”اور یہ سب کچھ سرکاری خرچ پر ہو رہا ہے۔“ گوشی نے مداخلت کرتے ہوئے کہا اور واماشو اسے گھور کر رہ گیا۔

”جیسا کہ میں بتا رہی تھی۔“ سراغ رساں مناتسی نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”ہم نے عوام سے متعدد بار اپیل کی۔ بچوں، والدین اور سینٹ جان اسکول کے اساتذہ سے انٹرویوز کیے لیکن کسی نے بھی وہاں کوئی غیر معمولی بات نہیں دیکھی پھر ہم نے ان گواہوں کے بھی بیانات قلم بند کیے جو اس وقت جھیل کے قریب موجود تھے۔“

”گزشتہ پندرہ دن میں ایک ہزار سے زیادہ لوگوں سے پوچھ گچھ کی گئی ہے۔“ گوشی نے ایک بار پھر مداخلت کی۔

”اب ہم مجرموں کے کافی قریب پہنچ چکے ہیں۔“ مناتسی نے کہا۔

واماشو نے اپنا سر تھوڑا سا ایک جانب گھمایا اور بولا۔

”ان انٹرویوز سے کیا حاصل ہوا؟“

گوشی اس سوال کا جواب دینے کے بجائے زور زور سے کھانسنے لگا۔ یہ کھانسی اس کی مجبوری تھی کیونکہ اس کے پاس واماشو کے سوال کا کوئی واضح جواب نہیں تھا۔

”کیا تم نے اُن لوگوں کو چیک کیا جن کے ناموں کی فہرست میں نے تمہیں دی تھی؟“

”اس فہرست میں سات نام ہیں۔“ سراغ رساں مناتسی نے کہا۔ ”ان میں سے میں نے چار کے انٹرویوز کر لیے ہیں لیکن کائے نیگی، دوکائے اور جیک ماکا پتا نہیں چل رہا کہ یہ کون لوگ ہیں اور کہاں ملیں گے۔“

”یہ نااہلی کی انتہا ہے۔ اسی وجہ سے یہ ملک تنزلی کی جانب جا رہا ہے۔ یہاں کے لوگ حد سے زیادہ سست اور کاہل ہیں۔ میں ہر روز صبح پانچ بجے اٹھتا ہوں اور سب سے پہلے سوا چھ بجے دفتر پہنچ جاتا ہوں۔ یہ سب کچھ جو تم دیکھ رہے ہو، میں نے سخت محنت اور جدوجہد کے ذریعے حاصل کیا ہے اور تم لوگ سارا دن اپنے دفتروں میں بیٹھ کر شکار کا انتظار کرتے ہو تاکہ گھر جانے سے پہلے اپنی جیب بھر سکو۔

یہ تینوں چینی بزنس مین ہیں۔ اس ملک میں کسی چینی کو تلاش کرنا کون سا مشکل کام ہے۔“ واماشو نے اپنی بات ختم کی اور دوبارہ کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔

”تمہارا بہت بہت شکریہ۔“ مناتسی نے کہا۔

”نہیں، شکریہ تو مجھے تم لوگوں کا ادا کرنا چاہیے کہ خالی ہاتھ میرا وقت ضائع کرنے چلے آئے۔“

”میں ایک ہفتے میں تمہیں قاتل کا نام بتا دوں گی۔“

”بس رہنے دو۔“ واماشو نے اپنا ایک ہاتھ اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔ ”میں پرائیویٹ سراغ رساں کی خدمات حاصل کر رہا ہوں جو کم از کم یہ تو معلوم کر سکے کہ یہ تینوں چینی اس وقت کیا کر رہے ہیں۔“

”سر......“

”گیٹ آؤٹ۔“ وہ چلّاتے ہوئے بولا۔ ”تم دونوں فوراً یہاں سے چلے جاؤ۔“ اس نے دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

سپرنٹنڈنٹ گوشی تھوڑا سا تعظیماً جھکا اور واپس جانے کے لیے مڑ گیا۔ سراغ رساں مناتسی نے بھی اس کی تقلید کی۔ ان کے باہر آتے ہی سیکریٹری اپنی جگہ سے اٹھی اور واماشو کے کمرے کا دروازہ بند کر دیا۔ گوشی سارے راستے اپنا سر ہلاتا رہا۔ اپنی کار کے قریب پہنچ کر اس نے چھت پر ہتھیلی رکھی اور چند لمحوں تک پُرسکون ہونے کی کوشش کرتا رہا پھر سراغ رساں کی طرف مڑ کر بولا۔

”جاؤ، ان تینوں چینیوں کو تلاش کرو۔“

☆☆☆

جب رونا کو، ہائی لینڈ ہوم پہنچی تو ٹیلی وژن پر مقبول ڈراما ٹیمی چل رہا تھا۔ وہ دستک دیے بغیر اندر چلی گئی جیسے پہلے بھی جاتی تھی جب یہ اس کا اپنا گھر تھا۔ واماشو اور تسارا لاؤنج میں بیٹھے ٹی وی دیکھ رہے تھے۔ وہ اسے وہاں دیکھ کر چونک گیا اور بے ساختہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

”تم یہاں کیا کرنے آئی ہو؟“ تسارا نے ناگواری سے کہا۔

”کیا تم اس پالتو کُتیا کو یہ بتاؤ گے کہ میں جانوروں سے بات نہیں کیا کرتی۔“ رونا کو نے زہر آلود لہجے میں کہا۔

”تم کسے کُتیا کہہ رہی ہو؟“ تسارا نے اس کے آگے اپنا ہاتھ کر دیا جس کی چوتھی انگلی میں ایک ہیرے کی انگوٹھی چمک رہی تھی۔ ”تمہیں دستک دے کر اندر آنا چاہیے تھا لیکن تم نے یہ سیکھا ہی نہیں۔“

رونا کو اپنے جبڑے بھینچتی ہوئی بولی۔ ”میں خدا کی قسم

کما کر کہتی ہوں کہ اب اس نے ایک لفظ بھی کہا تو میں اس گھر کو آگ لگا دوں گی۔"

"خدا کے واسطے چپ ہو جاؤ۔" واماشو نے غصے سے کہا۔ اس نے ہمیشہ ایسے انتظامات کیے تھے کہ ان دونوں کا کبھی آمنا سامنا نہ ہو۔ مثلاً بیٹے کی تجہیز و تکفین کے موقع پر اس نے تسارا کو اس کے والدین کے گھر بھیج دیا تھا تاکہ وہ رونا کو کے سامنے نہ آسکے۔ اس نے تسارا کو نرمی سے کہا۔

"براہِ مہربانی اپنے بیڈروم میں جاؤ۔"

وہ اپنی سوکن کو گھورتے ہوئے وہاں سے چلی گئی۔ گو کہ وہ کافی بڑا گھر تھا لیکن جس طرح ایک میان میں دو تلواریں نہیں سماسکتیں۔ اسی طرح گھر خواہ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو' اس میں دو سوکنوں کی گنجائش نہیں ہوتی۔ اس کے جانے کے بعد واماشو اپنی سابقہ بیوی کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولا۔

"تم یہاں کیوں آئی ہو؟"

"یہ اب بھی میرا گھر ہے۔ پورا نہیں تو آدھا ہی سہی۔ جب چاہوں یہاں آسکتی ہوں۔" اس نے سرد لہجے میں کہا۔

"میرا خیال تھا کہ جب تم نے مالبرو ہاؤس لیا تو سارے معاملات طے پا گئے تھے۔ کیا تمہیں پیسوں کی ضرورت ہے؟"

"ہاہاہا۔" اس نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ "تمہارے پاس کیا رکھا ہے جو مجھے دو گے۔ میں یہاں اپنے بیٹے کی چیزیں لینے آئی ہوں۔ میں نے تم سے اپنا بچہ مانگا تھا لیکن تم نے اسے اپنے پاس رکھ لیا پھر بھی اس کی حفاظت نہ کر سکے۔ اس کے لیے میں تم سے ساری زندگی نفرت کرتی رہوں گی۔ اب تم مجھے کیا دو گے۔ تناشی کی جگہ کوئی نہیں لے سکتا۔ اس کی کوئی قیمت نہیں ہے۔"

واماشو نے دونوں ہاتھ اپنی آنکھوں پر رکھ لیے۔ اس کا سر ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔ وہ اسے ایک طرف دھکیلتی ہوئی بیڈروم میں چلی گئی۔ وہ بھی اس کے پیچھے پیچھے گیا اور دروازے میں کھڑا ہو کر اسے تناشی کی چیزیں سمیٹتے ہوئے دیکھتا رہا۔ غیر ارادی طور پر وہ اس کے بستر کی طرف بڑھی لیکن پھر اس نے اپنے آپ کو روک لیا۔ اس نے اپنے بیٹے کے پسندیدہ جوتے، پوسٹر، رگبی کی جرسی، کتابیں اور چند دوسری چھوٹی موٹی اشیا اکٹھی کیں پھر اس نے کمرے پر آخری نگاہ ڈالی اور باہر آگئی۔ تب واماشو کو احساس ہوا کہ وہ اب کبھی دوبارہ اس گھر میں نہیں آئے گی۔ وہ گھر جسے ان دونوں نے مل کر اس وقت خریدا جب اس نے اپنا کاروبار شروع ہی کیا تھا۔

☆☆☆

سراغ رساں مناتسی مدرویل روڈ پر کھڑی اپنے کام کے سلسلے میں مناسب موقع کا انتظار کر رہی تھی۔ اس وقت کافی شدید سردی ہو رہی تھی۔ اس نے تھرماس سے بغیر چینی کی بلیک ٹی نکال کر پی۔ کچھ دیر بعد اس کے سامنے سے اینٹوں سے لدا ہوا ٹرک گزرا۔ پھر اس نے بینز کار کو ڈگلس روڈ کی طرف جاتے ہوئے دیکھا۔ وہ سکون کے ساتھ چائے پیتی اور انتظار کرتی رہی۔ بیس منٹ کے بعد اس نے اپنی گاڑی سو میٹر کے فاصلے پر ایک احاطے میں کھڑی کی۔ رات کی ڈیوٹی پر مامور سیکیورٹی گارڈ اسے نہ پہچان سکا اور اس نے وہاں گاڑی کھڑی کرنے پر اعتراض کیا لیکن جب اس نے اپنا بیج دکھا کر زمبابوے پولیس اور سی آئی ڈی کے الفاظ کہے تو اس نے تیزی سے آگے بڑھ کر بیرونی گیٹ کھول دیا۔

وہ خراماں خراماں گیٹ میں داخل ہوئی۔ اس کا چھوٹا سا ہینڈ بیگ کندھے پر لٹکا ہوا تھا اور اس میں سے ایسی آواز آرہی تھی جیسے اس میں بہت سے سکے بھرے ہوئے ہوں جبکہ مارکیٹ میں ان کا استعمال ترک ہو چکا تھا۔ اس نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ چھ بج کر چالیس منٹ ہوئے تھے۔ وہ استقبالیہ کے سامنے سے گزرتی ہوئی دوسری منزل تک پہنچی اور ایک دروازے پر دستک دی۔

"کیا ہے؟" اندر سے واماشو کے چلّانے کی آواز آئی۔

"کیا میں اندر آسکتی ہوں؟" اس نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

"اوہ، یہ تم ہے۔" وہ اپنی جھنجلاہٹ پر قابو نہ پاسکا۔ "میں سمجھا کہ گارڈ ہوگا۔ تم کیا چاہتی ہو؟"

وہ اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ "میں نے تم سے کہا تھا کہ ایک ہفتے کے اندر واپس آؤں گی۔"

"امید ہے کہ تم میرا وقت ضائع نہیں کرو گی۔"

مناتسی نے میز پر سے اخبار اٹھایا اور اس میں سے کاغذ کا ایک ٹکڑا پھاڑ لیا پھر اپنے ہینڈ بیگ میں سے تمبا کو نکال کر اسے کاغذ پر رکھا اور سگریٹ بنائی پھر اسے بھی ہینڈ بیگ میں رکھ لیا۔ واماشو بے چینی سے یہ تماشا دیکھتا رہا۔

"میں بتاتی ہوں کہ یہ سب کیسے ہوا۔" وہ دھیمی آواز میں بولی۔ "اس سنیچر والے روز تناشی اسکول گیا اور کرکٹ

کھیلتا رہا۔ اس نے اکیس رنز بنائے اور اس کی چودہ سال سے کم عمر کھلاڑیوں کی ٹیم نے سینٹ جارج کو اکتالیس رنز سے ہرا دیا پھر اس نے دوستوں کو خدا حافظ کہا اور کار پارک کی طرف چل دیا۔ تم بعد میں پہنچے تو وہ وہاں نہیں تھا پھر تم نے گھر فون کیا لیکن تناشی گھر بھی نہیں پہنچا تھا۔ تم نے اس کے دوستوں سے پوچھا لیکن اسکول میں کسی نے بھی غیر معمولی بات نوٹ نہیں کی۔"

وہ اسے ٹوکتے ہوئے بولا۔ "ہم پہلے سے یہ سب جانتے ہیں۔"

"ہاں، ہمیں معلوم ہے اور ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ اسے ایک سیاہ بینز میں سوار کیا گیا تھا۔ وہ بالکل تمہاری کار جیسی تھی۔ وہی رنگ، وہی ماڈل۔" مناتسی نے کہا۔

واماشو لال پیلا ہوتے ہوئے بولا۔ "میں نے اُسے اپنی کار میں نہیں بٹھایا۔"

"ہاں، تم نے اسے اپنی گاڑی میں نہیں بٹھایا اور ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ تمہارا کاروبار مندا جا رہا ہے اور آمدنی روز بروز کم ہوتی جا رہی ہے۔ تمہاری تمام مشینری ناکارہ اور زنگ آلود ہو گئی ہے اور تمہیں چینیوں سے سخت مقابلہ درپیش ہے۔ ان کے پاس جدید آلات اور مشینری ہے۔ وہ اپنے مزدور لے کر آئے ہیں جو سستے ہونے کے ساتھ ساتھ محنتی بھی ہیں اور تیزی سے کام کرتے ہیں۔ اس طرح چینیوں کو جو بچت ہوتی ہے، اس سے وہ مقامی اہلکاروں کو خرید لیتے ہیں۔ تم نے اپنے جن دشمنوں کی فہرست دی تھی وہ سب تعمیرات اور سول انجینئرنگ میں تمہارے حریف تھے۔ اس فہرست میں تین زمبابوین اور جنوبی افریقی کمپنیاں تمہارے مقابلے میں زیادہ مضبوط ہیں۔ تم نے ہمیشہ سرکاری ٹھیکوں پر انحصار کیا لیکن اب سرکار بھی مشرق کی جانب دیکھ رہی ہے اور تمہاری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ چینیوں کو کس طرح شکست دی جائے۔ اب مستقبل ان کا ہے اور تم گزرا ہوا ماضی بن چکے ہو۔"

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ان باتوں کا میرے بیٹے کے قتل سے کیا تعلق ہے؟" واماشو اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا۔ اس کی آنکھیں سکڑ گئی تھیں اور پیشانی پر بل پڑ رہے تھے۔ "میں تمہارے باس کو فون کر کے کہتا ہوں کہ تمہیں ملازمت سے برطرف کر دیا جائے۔ تم انتہائی نالائق اور نکمی پولیس آفیسر ہو۔"

"ابھی میری بات ختم نہیں ہوئی۔" سراغ رساں

سر! مجھے مبارکباد دیں۔۔۔ آپ میرے پہلے مریض ہیں

مناتسی نے پُرسکون انداز میں کہا۔ "تم ایک ضعیف الاعتقاد شخص ہو لہٰذا اپنے دشمنوں کو شکست دینے کے لیے تم نے روحانی مشیروں سے رجوع کیا۔ پادری نے تم سے کہا کہ جس طرح ابراہام نے بیٹے کی قربانی دی تھی۔ اسی طرح تمہیں بھی اپنی عزیز ترین ہستی یعنی تناشی سے دستبردار ہونا ہوگا۔ تمہارے پاس دوسری بیوی ہے اور تم مزید بچے پیدا کر سکتے ہو۔ اس طرح تناشی کی قربانی دینے میں تمہیں کوئی عار محسوس نہیں کرنا چاہیے کیونکہ کاروبار کو بچانے کے لیے اس سے زیادہ موثر دوا نہیں ہو سکتی۔"

واماشو کے چہرے کا رنگ سرخ ہو گیا۔ نتھنے پھول گئے اور وہ طوفان کی زد میں آئے ہوئے سرکنڈے کی طرح ہلنے لگا۔

"یہ پادری ہی تھا جس نے تمہارے بیٹے کو اپنی سیاہ بینز کار میں بٹھایا جو تم نے کچھ عرصہ قبل اسے تحفے میں دی تھی کیونکہ وہ بھی تمہاری کار جیسی ہے۔ اس لیے کسی نے بھی اس پر توجہ نہیں دی اور یوں تناشی قربانی کا بکرا بن گیا۔ تمہیں اس کی لاش ٹکڑوں کی صورت میں ملی۔"

واماشو نے دراز کھول کر ممبا پستول نکالا اور اس کی نال کا رخ مناتسی کی طرف کرتے ہوئے بولا۔

"میں نے اس کمپنی کو اپنے ہاتھوں سے بنایا ہے اور تم نہیں جانتیں کہ اس مقام تک پہنچنے کے لیے مجھے کتنی محنت کرنا

بڑی۔ تمہیں کیسا محسوس ہوگا اگر ساری عمر کی کمائی خاک میں ملتی نظر آ رہی ہو۔ کیا تم اسے بچانے کے لیے کچھ نہیں کرو گی؟''

''خواہ اس کے لیے اپنے ہی بیٹے کا قتل کیوں نہ کرنا پڑے؟''

''ہاں تاکہ میرا کاروبار سلامت رہے۔'' اس نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ ''لیکن کوئی بھی یہ بات نہیں جان پائے گا کیونکہ انہیں بتانے کے لیے تم زندہ نہیں رہو گی۔''

''ہوں، تو تمہارا یہ منصوبہ تھا کہ قتل کر کے مجھ سے پیچھا چھڑا لو۔ ممکن ہے کہ فائر کی آواز گارڈ تک پہنچ جائے لیکن تم پیسے سے اس کا منہ بند کر دو گے اور اسے آمادہ کر لو گے کہ وہ بقیہ اسٹاف کے آنے سے پہلے میری لاش کو ٹھکانے لگانے میں تمہاری مدد کرے۔'' وہ سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ''میرا اندازہ صحیح ثابت ہوا لیکن کیا تم مجھے قتل کرنے سے پہلے ایک سگریٹ پینے کی اجازت دو گے؟''

وہ قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔ ''ٹھیک ہے تم اپنی خواہش پوری کر لو لیکن کوئی ہوشیاری مت دکھانا۔''

مناتسی نے اپنا ہینڈ بیگ کھولا۔ اس نے اپنا ہاتھ اندر ڈالا اور فوراً ہی باہر نکال لیا لیکن اس نے بہت سستی دکھائی تھی۔ واماشو کے پاس فوجی تجربہ تھا۔ وہ بوڑھا ضرور ہو گیا تھا لیکن اس کی نظر بہت تیز تھی۔ اس نے فوراً ہی ٹریگر دبا دیا۔ کلک کی آواز ابھری۔ اس نے دوبارہ ٹریگر دبایا۔ ایک اور کلک ہوئی۔ سراغ رساں نے اپنا ہاتھ اوپر اٹھایا۔ اس میں سگریٹ دبا ہوا تھا۔ اس نے وہ سلگایا اور ایک کش لے کر قہقہے لگانے لگی۔ عین اسی وقت سپرنٹنڈنٹ گوشی کمرے میں داخل ہوا اور کہنے لگا۔ ''رہوڈیشیا کے بنے ہوئے یہ پستول ناقابلِ اعتبار ہیں۔ اسی وجہ سے صرف دو سو ہی بنائے جا سکے لیکن شاید تمہارا پستول چل جاتا۔ اگر اس میں گولیاں ہوتیں جو میں پہلے ہی نکال چکا تھا۔''

واماشو نے آہستہ سے پستول میز پر رکھا اور خود کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کا چہرہ تاریک ہو رہا تھا۔ سپرنٹنڈنٹ نے الماری سے وہسکی کی بوتل نکال کر دو گلاس بنائے اور ایک واماشو کو دیتے ہوئے بولا۔ ''پہلے تم نے اپنے بیٹے کو قتل کیا۔ اس کے بعد زمبابوے کی پولیس آفیسر کو مارنے کی کوشش کی۔ جنگ تو ختم ہو چکی ہے لیکن لگتا ہے کہ تم ابھی تک یہ جنگ لڑ رہے ہو۔'' گوشی نے افسردگی سے کہا۔ ''میں نے تم سے کہا تھا کہ یہ میری بہترین آفیسر ہے۔ شاید دوسرا کوئی افسر یہ کیس کبھی نہ حل کر پاتا۔ اب تمہیں موت کی سزا سے کوئی نہیں بچا سکتا لیکن تمہارا دوست ہونے کے ناتے میں ایک موقع دے سکتا ہوں۔''

سراغ رساں مناتسی نے اپنے ہینڈ بیگ سے نائن ایم ایم کا پستول نکالا اور اسے میز پر رکھ دیا۔ پھر اس نے سگریٹ کا گہرا کش لیا اور اس کا دھواں چھت کی جانب چھوڑ دیا۔ گوشی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو وہ کھڑی ہو گئی اور دروازے کی طرف جانے لگی پھر اس نے باہر سے دروازہ مقفل کر دیا۔

وہ دونوں احاطے میں موجود مشینری کے پاس سے گزرتے ہوئے گیٹ تک پہنچے۔ سپرنٹنڈنٹ بالکل خاموش تھا اور اس کا چہرہ سخت نظر آ رہا تھا۔ مناتسی اس سے ایک یا دو قدم پیچھے چل رہی تھی۔

''تم یہ بات اس وقت بھی جانتے تھے کہ یہ قتل اسی نے کیا ہے جب وہ پہلی بار تمہارے پاس آیا تھا۔'' وہ بولی۔

''تمہارے ہوتے ہوئے مجھے کچھ جاننے کی ضرورت نہیں تھی۔''

''اب ہمیں حقائق جاننے کے لیے پادری کے پاس چلنا چاہیے تاکہ اس کیس کو منطقی انجام تک پہنچا سکیں۔'' مناتسی نے کہا۔

''نہیں۔ ہم اُسے نہیں چھیڑ سکتے۔ وہ بہت بارسوخ شخص ہے اور کئی سیاست داں اس کے دوست ہیں۔ ان کے سامنے ہماری کوئی حیثیت نہیں۔ اس ملک میں ہم وہی جنگ لڑ سکتے ہیں جو جیت سکتے ہیں۔ جنگل میں اسی کا راج ہوتا ہے جو طاقت ور ہو۔ ہم اس سے بہتر نتیجہ حاصل نہیں کر سکتے۔ میرے دوست کی عزت رہ جائے گی جب کل کے اخباروں میں یہ خبر شائع ہو گی کہ اس نے اپنے بیٹے کے غم میں خودکشی کر لی۔ سمجھ لو کہ تم نے یہ کیس حل نہیں کیا۔ اس سے تمہارا ریکارڈ تو خراب ہو گا لیکن تم ایک بڑی مصیبت سے بچ جاؤ گی۔ گھر جا کر آرام کرو اور کل صبح نئے کیس کی تیاری شروع کر دو۔''

جیسے ہی وہ گیٹ تک پہنچے، فائر کی زوردار آواز سنائی دی۔ محافظ پریشان نظر آنے لگا لیکن ڈر کے مارے اس کے منہ سے کوئی آواز نہیں نکلی۔ سراغ رساں اور سپرنٹنڈنٹ نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا کیونکہ وہ قتل کے کیس کی تحقیقات کرتے تھے۔ خودکشی کے معاملات سے ان کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ وہ دونوں اپنی اپنی گاڑیوں میں گھر کی جانب روانہ ہو گئے۔ سورج مشرق سے طلوع ہو رہا تھا۔ اور ہرارے میں ایک نئی صبح انگڑائی لے رہی تھی۔

رقابت

سیرینا راض

طالبِ علمی کا دور زندگی کا سب سے یادگار اور سنہرا دور ہوتا ہے... بے فکری... لاابالی پن... زندگی کی ہلچل اور دوستوں کی صحبتیں... محبتیں ہی سب سے اہم تصور کی جاتی ہیں... عمر کی بڑھتی رفتار ان بیتے دنوں کو پیچھے دھکیل دیتی ہے... مگر دوست اور دوستی کا رشتہ تادمِ مرگ قائم رہ سکتا ہے... ساتھ پڑھنے... گھومنے اور روز و شب اکٹھا گزارنے والے ایک گروپ کی کہانی... وہ ساتھ ساتھ تھے... مگر پھر وقت کی پرواز نے انہیں جدا جدا اڑا دیا... اور ایک دن پھر ان سب کو یکجا ہونا پڑا...

تحقیق و تردید کے زاویوں اور اشاروں میں آگے بڑھتی پرفریب کتھا...

سراغ رساں ایلیٹ ہوٹن تازہ کھدی ہوئی قبر کے کنارے گھٹنوں کے بل بیٹھا ہوا تھا جس کی گہرائی قدرے کم تھی کہ اس کی نظر سراغ رساں لیفٹیننٹ اولیور پر گئی جو ڈھلواں ڈرائیو وے تک پہنچ گیا تھا۔ میڈیکل ایگزامنر کے دفتر سے آنے والے لوگ قبر کھودنے کے بعد چند گز کے فاصلے پر کھڑے سراغ رسانوں کے اگلے احکامات کا انتظار کر رہے تھے۔ اولیور آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس کے قریب آیا اور بولا۔ ”تمہیں یہ اطلاع کب ملی؟“

’’آٹھ بجے کے قریب۔ مکان کا مالک اسے منہدم کرنے کے لیے یہاں کی صفائی کروا رہا تھا کہ میٹل ڈیٹکٹر نے اس جگہ کسی چیز کی موجودگی کی نشاندہی کی۔ اس نے تھوڑی سی کھدائی کی اور حیران رہ گیا۔ شاید وہ کسی خزانے کی توقع کررہا تھا۔ اس کا نام اڈولف گرنارڈ ہے اور وہ گزشتہ ساٹھ سال سے اس مکان کا مالک ہے لیکن دس سال سے اسے کرائے پر نہیں دیا۔‘‘

’’اس کی کیا وجہ تھی؟‘‘

’’اس کا کہنا ہے کہ اب وہ بوڑھا ہوگیا ہے اور کرائے داروں سے نمٹنا اس کے بس کا روگ نہیں۔ اسی وجہ سے یہ مکان اس کے لیے کوئی وقعت نہیں رکھتا۔‘‘

’’میرا خیال ہے کہ ہمیں اس پر شبہ نہیں کرنا چاہیے، اگر وہ اس معاملے میں ملوث ہوتا تو لاش کی موجودگی کی اطلاع ہی نہ دیتا۔‘‘

ہوٹن نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اولیور قبر میں جھانکنے سے کیوں کترا رہا ہے جبکہ اسی لاش کی وجہ سے وہ اس اجاڑ جگہ آنے پر مجبور ہوئے ہیں۔

’’ڈیٹکٹر نے کس چیز کی نشاندہی کی؟‘‘ اولیور نے پوچھا۔

ہوٹن سے برداشت نہ ہوسکا اور وہ بولا۔ ’’نیچے جھانک کر دیکھو، تمہیں معلوم ہوجائے گا۔‘‘

اسے معلوم تھا کہ اس لڑکی یا نوجوان عورت کی باقیات پر دھات کی بنی ہوئی صلیب پڑی ہوئی ہے جو ایک ٹوٹی ہوئی رنگین موتیوں کی چین سے منسلک تھی۔ اس لڑکی کا لباس بوسیدہ اور تار تار ہوچکا تھا۔ اس کے لمبے سیاہ بال سلامت تھے لیکن چہرہ بری طرح مسخ ہوچکا تھا۔

’’دیکھنے میں تو یہ نیکلس لگ رہا ہے۔‘‘ ہوٹن نے کہا۔ وہ اپنے ساتھی کی مسلسل خاموشی پر بے چینی محسوس کررہا تھا۔

’’یہ نیکلس نہیں ہے۔‘‘ لیفٹیننٹ اولیور کو بالآخر بولنا ہی پڑا۔ ’’یہ مالا ہے جسے اس نے نیکلس کی طرح پہنا ہوا تھا۔‘‘ یہ کہہ کر وہ اچانک مڑا اور تیزی سے چلنے لگا اور جاتے جاتے پیچھے مڑ کر بولا۔ ’’اس بات کو یقینی بناؤ کہ ہر شخص اپنا اپنا کام کرے۔ تم جانتے ہو کہ تمہیں کیا معلوم کرنا ہے۔‘‘

’’جان۔‘‘ ہوٹن نے اسے پکارا۔ ’’تم ٹھیک تو ہو؟‘‘

’’میں گھر جارہا ہوں۔ تم اپنا کام جاری رکھو۔ میں تم سے کل صبح تفصیل معلوم کرلوں گا...... اور ہاں کل پہلا کام اس مکان کے مالک سے انٹرویو کرنا ہے۔‘‘

’’لگتا ہے تمہارا باس بہت جلدی میں ہے؟‘‘ ایک نوجوان میڈیکل انویسٹی گیٹر نے قریب آتے ہوئے کہا۔ وہ ایک طویل قامت اور پرکشش لڑکی تھی جس نے اپنے سنہرے بالوں کو ہڈ میں چھپا رکھا تھا۔

ہوٹن نے اسے غور سے دیکھا اور مسکراتے ہوئے بولا۔ ’’اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔‘‘

’’گویا اب تم یہاں کے انچارج ہو؟‘‘

’’ہاں مادام، یونہی سمجھ لو۔ میں تمہاری کیا مدد کرسکتا ہوں؟‘‘

اس نے اپنے منہ پر ماسک لگایا اور بولی۔ ’’جو کچھ تم جانتے ہو اس بارے میں تفصیل سے بتاؤ۔‘‘

☆☆☆

کیتھی اولیور نے اپنے شوہر کو جلدی گھر آتے دیکھا تو بولی۔ ’’جان! کیا بات ہے، تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟‘‘

اولیور کے چہرے پر پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی اور بولا۔ ’’شاید موسم کا اثر ہے۔ میں کچھ دیر آرام کروں گا۔ پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔ تم اسپتال جاؤ۔‘‘

وہ ہفتے میں تین دن رضاکارانہ طور پر ایک اسپتال میں کام کرتی تھی۔ اس نے شوہر کی بات کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔ ’’تمہیں بخار تو نہیں ہے؟‘‘

وہ جیسے ہی اس کا ماتھا چھونے کے لیے آگے بڑھی اولیور اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولا۔ ’’مجھے کچھ نہیں ہوا۔ بس تھوڑا سا تھک گیا ہوں۔‘‘

یہ کہہ کر وہ اپنے کمرے کی طرف چل دیا لیکن کیتھی اس کے جواب سے مطمئن نہ ہوئی۔ کچھ دیر بعد جب وہ اسے دیکھنے آئی تو وہ بظاہر سویا ہوا لگ رہا تھا لیکن چالیس سالہ ازدواجی زندگی کے دوران وہ اسے اچھی طرح سمجھ چکی تھی لہٰذا اس کے قریب آکر بولی۔ ’’میں جانتی ہوں کہ تم سونے کی اداکاری کررہے ہو۔ مجھے بتاؤ کہ مسئلہ کیا ہے تاکہ میں تمہاری مدد کرسکوں۔ پلیز مجھ سے کچھ مت چھپاؤ، تمہیں کس چیز کی ضرورت ہے؟‘‘

وہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور تکیے سے ٹیک لگاتے ہوئے بولا۔ ’’ضرورت؟‘‘ اس کے چہرے پر پھیکی سی مسکراہٹ دوڑ گئی۔ اس نے چور نگاہوں سے کیتھی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ’’مجھے معافی کی ضرورت ہے۔ شاید اس طرح......‘‘

☆☆☆

اگلی صبح وہ اپنے دفتر میں بیٹھے کافی پی رہے تھے۔ ہوٹن نے اپنے باس کی طرف دیکھا۔ اس وقت وہ اسے میڈیکل ایگزامنر کی رپورٹ کے بارے میں بتا رہا تھا لیکن اس نے محسوس کیا کہ اولیور کا دھیان کسی اور جانب ہے۔ وہ

بے چینی سے بولا۔

''کیا بات ہے، تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے۔''

''کچھ نہیں، میں سن رہا ہوں۔ مقتولہ ایک عورت تھی اور اس کی عمر غالباً تیس کے لگ بھگ ہوگی اور میڈیکل ایگزامنر کا خیال ہے کہ اس کی موت پسلی میں چھرا گھونپنے سے واقع ہوئی تھی۔ کیا اس نے کچھ بتایا کہ یہ واقعہ کب پیش آیا تھا؟''

''وہ صرف لڑکی کی عمر کا تعین کر سکے ہیں۔ وقوعے کا وقت معلوم کرنے کے لیے انہیں کسی ماہرِ حشریات سے رجوع کرنا ہوگا اور اس میں کچھ وقت لگ سکتا ہے۔''

''لاش کی شناخت ہو سکی؟''

''نہیں۔'' ہوٹن سر ہلاتے ہوئے بولا۔

''سارہ......'' اولیور نے مضبوطی سے کہا۔ ''سارہ کورٹنی۔ میرا خیال ہے کہ اس وقت وہ انیس سال کی تھی۔''

ہوٹن نے حیرت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''تم یہ سب کیسے جانتے ہو جان؟''

''کیونکہ شاید میں بھی اس کی موت کا ذمے دار ہوں۔'' اولیور نے آہستہ سے کہا۔ ''وہ مالا میں نے ہی اسے دی تھی۔'' پھر اس نے کافی کی پیالی میز پر رکھی اور ہوٹن کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔ ''تم مسٹر گرنارڈ سے کب ملاقات کرو گے؟''

ہوٹن گہری سانس لیتے ہوئے بولا۔ ''تقریباً ایک گھنٹے بعد دس بجے۔''

''ٹھیک ہے۔ تمہارے پاس میرا بیان ریکارڈ کرنے کے لیے کافی وقت ہے۔ اس پرانے کیس کو حل کرنے میں یہ تمہارے لیے کارآمد ہوگا۔''

''اوہ میرے خدا۔'' ہوٹن اپنی جگہ سے کھڑا ہوتے ہوئے بولا۔ ''ہم میں سے کوئی ایک ضرور پاگل ہو جائے گا۔'' پھر اس نے دفتر کا دروازہ بند کیا۔ ہال وے میں 'انٹرویو جاری ہے' کی تختی روشن کی اور اپنے باس کے ہمراہ چھوٹے سے تفتیشی کمرے میں چلا گیا۔

''میں اس وقت سترہ سال کا تھا اور ہائی اسکول کی سینئر کلاس میں پڑھ رہا تھا جب میری اس سے ملاقات ہوئی۔ اس وقت تک مجھے ذاتی زندگی میں کوئی تجربہ نہیں ہوا تھا۔ اس لحاظ سے آج کل کے بچے مجھے احمق ہی کہیں گے۔ والدین کی اکلوتی اولاد ہونے کی وجہ سے خود کو تنہا محسوس کرتا تھا اور میری پرورش کٹر کیتھولک فیملی اور اسکول میں ہو رہی تھی۔ لڑکیاں میرے لیے ایک انوکھی چیز تھیں۔ میں انہیں پسند کرتا تھا لیکن یہ نہیں جانتا تھا کہ ان کے ساتھ کس طرح پیش آنا چاہیے۔''

ہوٹن حیرانی کے عالم میں اپنے باس کے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے کبھی اسے اس طرح بولتے ہوئے نہیں سنا تھا اور نہ ہی اس نے کبھی یہ سوچنے کی ضرورت محسوس کی کہ یہ عقلمند اور بردبار شخص جس کے ساتھ وہ طویل عرصے سے کام کر رہا ہے، کبھی لڑکپن کے دور سے بھی گزرا ہوگا۔

''وہ موسمِ بہار کے آخری دن تھے اور ہم لوگ امتحان کی تیاری کر رہے تھے۔ اس وجہ سے اسکول میں بھی آدھے دن بعد چھٹی ہو جاتی تھی۔ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر میں فوٹوگرافی کے لیے دلچسپ مناظر کی تلاش میں گھوم رہا تھا کہ اس سے ٹکرا گیا۔ اس سے پہلے میں نے اتنی خوب صورت لڑکی نہیں دیکھی تھی۔''

''تم اس سے کہاں ملے تھے؟'' ہوٹن نے پوچھا۔

اولیور پھیکی مسکراہٹ سے بولا۔ ''گرنارڈ کا گھر ہمارے گھر سے ملا ہوا تھا۔ میں وہاں سے گزر رہا تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ اس نے اپنا مکان دوبارہ کرائے پر دے دیا ہے۔ وہ سامنے والے پورچ میں کھڑی تھی بلکہ رقص کر رہی تھی۔''

''رقص کر رہی تھی؟'' ہوٹن نے اس کے الفاظ دہرائے۔

''ہاں، وہ پورچ کے شکستہ فرش پر ایک خاص انداز میں جسم کو حرکت دے رہی تھی۔ اس نے سبز رنگ کا لباس پہن رکھا تھا۔ اس کے بال سیاہ اور گھنے تھے۔ جن میں اس نے زرد اور سفید پھول لگا رکھے تھے۔ وہ موسیقی کے بغیر ہی رقص کر رہی تھی۔ اسے دیکھ کر میرے قدم رک گئے پھر میں نے پیچھے ہٹنا شروع کیا لیکن اس نے مجھے دیکھ لیا اور بلند آواز سے بولی۔ ''کیا تم میری تصویریں کھینچنے آئے ہو۔ میری خواہش ہے کہ تم ایسا کرتے۔'' پھر اس نے قہقہہ لگایا اور مسکرانے لگی۔

''ان دنوں میرے پاس لیکا کیمرا ہوتا تھا جو مجھے انعام میں ملا تھا۔ میں نے جواب میں کوئی احمقانہ بات کہی اور اس کی تصویریں بنانے لگا۔ جب پوری ریل ختم ہو گئی تو میں نے کیمرے کی آنکھ سے نظر ہٹا کر دیکھا۔ اس کے ساتھ اور بھی نوجوان لڑکے لڑکیاں کھڑے ہوئے تھے لیکن وہ سب عمر میں مجھ سے بڑے تھے۔ ان سب کے چہروں پر داڑھی مونچھیں نظر آ رہی تھیں جبکہ دونوں لڑکیوں نے میک اپ کیا ہوا تھا۔ وہ سب مجھے دیکھ کر کھسیانی ہنسی ہنس رہے تھے۔

"کیا تم سرکاری فوٹوگرافر ہو؟" ان میں سے ایک دبلا پتلا خوش شکل لڑکا بولا۔ وہ ان سب کے درمیان کھڑا ہوا تھا۔

"یا سرکاری جاسوس؟" ایک اور لڑکا اپنی ہنسی دباتے ہوئے بولا۔ وہ پہلے والے کے مقابلے میں پستہ قد اور مضبوط جسم کا لگ رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا، سارہ میری طرف بڑھی اور میرا بازو پکڑتے ہوئے بولی۔ "یہ میرے ساتھ ہے۔"

"اس کا پورا نام کیا ہے جان؟" ہوٹن نے پوچھا۔

"میں پہلے ہی بتا چکا ہوں۔ اس کا نام سارہ کورٹنی تھا۔ یہ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ وہ سولہ سال کی عمر میں گھر چھوڑ کر آگئی تھی۔ اس سے مجھے یہ تاثر ملا کہ اس نے کسی مرحلے پر قانون کی خلاف ورزی کی اور اب اس نے فرضی نام اختیار کرلیا ہے۔ میں تمہیں بتا نہیں سکتا کہ اس کا لمس پا کر میری کیا کیفیت ہوئی اور میں خوشی سے جھوم اٹھا اور اس کا اظہار میرے چہرے کے تاثرات سے ہورہا تھا کیونکہ سب لوگوں نے قہقہے لگانا شروع کردیے تھے۔"

ایک دراز قد لڑکا مکان سے باہر آیا اور مجھے دیکھ کر حقارت سے بولا۔ "مجھے تو یہ کوئی منشیات فروش لگتا ہے۔"

ایک سنہرے بالوں والی لڑکی اسے دھکا دیتے ہوئے بولی۔ "تمہیں تو ہر کوئی منشیات فروش لگتا ہے۔"

تب تک میں اپنے حواس پر قابو پا چکا تھا۔ میں نے چلاتے ہوئے کہا۔ "میں منشیات فروش نہیں ہوں۔"

"پھر تم یہاں کیمرا لیے کیوں پھر رہے ہو؟" ایک سیاہ بالوں والی لڑکی نے پوچھا۔

"میں اپنے اسکول کے فوٹوگرافی کلب کا ممبر ہوں۔"

"کون سا اسکول؟" اسی لڑکی نے پوچھا۔

میں نے اپنے بلیزر کوٹ کے مونوگرام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "ویسٹیکس کیتھولک......"

وہ سب چند لمحے خاموش رہے پھر دوبارہ قہقہے لگانے لگے۔ سارہ نے مجھے اپنی طرف کھینچا اور میری ٹھوڑی اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے بولی۔ "یہ بہت پیارا ہے اور میں اسے چاہتی ہوں۔"

سیاہ بالوں والی لڑکی نے مجھے غصے سے دیکھا اور وہاں سے چلی گئی۔ جو لڑکا سب سے پہلے مجھ سے مخاطب ہوا تھا۔ کہنے لگا۔

"لڑکے، تم یہیں رہتے ہو؟"

مجھے اس کا لڑکا کہنا اچھا نہیں لگا۔ بہرحال میں نے جواب دیتے ہوئے کہا۔ "اگلا مکان میرا ہے۔ یہاں سے دو فرلانگ کے فاصلے پر۔"

"پھر تم ہمارا ایک کام کرو۔ اپنے گھر والوں اور دوستوں کو ہمارے بارے میں کچھ مت بتانا۔ ہم کسی مشکل میں پڑنا نہیں چاہتے۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے کہا اور یہی میری پہلی غلطی تھی۔

سارہ نے میرا نام پوچھا اور اپنے گروپ کے لوگوں کا تعارف کروانے لگی۔ گروپ لیڈر کا نام اینڈریو رافیل تھا۔ وہ اسٹیٹ کالج میں پڑھ رہا تھا اور مستقبل میں لٹریچر کا پروفیسر بننا چاہتا تھا۔ اس نے لمبے بالوں والے لڑکے کا نام سونی جورڈن بتایا جو کسی مقامی راک بینڈ میں ڈرم بجاتا تھا۔ سنہرے بالوں والی لڑکی کا نام ڈیبی لینڈری تھا، وہ فٹ بال میچوں میں چیئرلیڈر کے طور پر نظر آتی تھی۔ ایک بدصورت لڑکا آگے بڑھا اور اس نے اپنا نام لیون بارنر بتایا۔ سیاہ بالوں والی لڑکی اینڈریو کی گرل فرینڈ تھی۔ اس نے اپنا نام بتاتے ہوئے کہا۔ "نینسی، تمہارے لیے اتنا ہی جاننا کافی ہے۔ میری تصویر مت لینا۔" پتھریلے اور سانولے چہرے والے کا نام اسٹیوارٹ لی تھا۔"

یہ کہہ کر اولیور ایک لمحے کے لیے رکا پھر کہنے لگا۔ "اگر مجھے اس وقت ان میں سے کسی ایک کے بارے میں بھی معلوم ہوتا تو میں فوراً ہی گھر چلا جاتا اور انہیں ہمیشہ کے لیے بھول جاتا۔"

ہوٹن نے اس جھوٹ پر کوئی توجہ نہیں دی اور بولا۔ "تمہاری نظر بہت تیز ہے کہ تم نے اتنی سی دیر میں سب کچھ دیکھ لیا جبکہ میں تو یہ بھی نہیں بتا سکتا کہ آج ناشتے میں کیا کھایا تھا۔"

"شاید فوٹوگرافی کی وجہ سے مجھ میں یہ خصوصیت آگئی کہ میں تفصیل سے ہر چیز دیکھنے لگا۔ خاص طور پر لوگوں کے چہرے اور ان کے تاثرات۔" اولیور نے وضاحت کی پھر اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "میں نے بقیہ موسم بہار اور تقریباً ساری گرمیاں اس مکان کا چکر لگاتے گزار دیں جس پر 'پیپی ویلی' کی تختی نصب تھی لیکن اپنے گھر والوں کو اس بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ سارہ اور میں محبت کرنے لگے تھے۔ یہ میری زندگی کا پہلا تجربہ تھا۔ میں اس کے حسن سے مسحور ہوگیا۔ مجھے اس سے محبت ہوگئی تھی اور میں اس کی خاطر کچھ بھی کرسکتا تھا۔

"گروپ کے زیادہ تر لوگ مجھے نظرانداز کرتے تھے کیونکہ میں ان جیسا نہیں تھا۔ سارہ نے کبھی اصرار نہیں کیا اور نہ ہی میں نے کبھی اسے منشیات استعمال کرنے سے روکا حالانکہ مجھے ایسا کرنا چاہیے تھا۔ وہ ہر طرح کا نشہ کرتی تھی

اور اس دوران میں اس کے محافظ یا نرس کے طور پر کام کرتا کہ کہیں وہ اپنے آپ کو نقصان نہ پہنچا لے۔ ان لوگوں میں صرف اینڈریو ہی واحد شخص تھا جو اس کے بارے میں تھوڑا بہت فکرمند رہتا تھا۔ ایک روز جب میں وہاں پہنچا تو اینڈریو لیونگ روم میں اس کا ہاتھ تھامے اسے کچھ سمجھا رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی بولا۔

''اچھا ہوا تم آ گئے۔ آج میرے پاس تمہاری ننھی منی جادوگرنی کی نگہداشت کے لیے بالکل وقت نہیں ہے۔'' پھر وہ اٹھا اور میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ ''کوشش کرو کہ یہ ہلکا نشہ کرے۔ میں نہیں چاہتا کہ اس کی وجہ سے کسی کو ہم پر شک ہو جائے۔ مجھے سمسٹر شروع ہونے سے پہلے بہت تیاری کرنا ہے۔ اس لیے میرے پاس اس کی دیکھ بھال کے لیے بالکل وقت نہیں ہے۔'' یہ کہہ کر وہ اپنے کمرے میں چلا گیا۔

میں سارہ کے برابر میں بیٹھ گیا۔ اس کا چہرہ سرخ اور آنکھ سے آنسو بہہ رہے تھے۔ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ''مجھے افسوس ہے۔ میں حد سے بڑھ جاتی ہوں۔ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے۔''

میں نے اپنا ایک بازو اس کی گردن کے گرد ڈالا اور اسے اپنی طرف کھینچ لیا۔ وہ میرے سینے سے لگتے ہوئے بولی۔ ''تم نے ہمیشہ میرا ساتھ دیا ہے۔ میں تم پر بھروسا کر سکتی ہوں۔ میرے پیارے جان!''

میں نے اپنے آپ سے عہد کیا کہ اگر ان لوگوں نے اسے یہاں سے نکال دیا یا وہ خود جانا چاہے تو میں اس کا خیال رکھوں گا۔ پھر اس نے مجھے اپنے بارے میں بتایا کہ وہ کیوں گھر چھوڑ کر آئی جبکہ وہ ابھی اسکول میں پڑھ رہی تھی اور پچھلے تین سال سے سکون کی تلاش میں دربدر بھٹک رہی ہے پھر اس کا موڈ اچانک ہی خوش گوار ہو گیا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولی۔ ''چلو پارک چلتے ہیں۔ آج کا دن بہت خوب صورت ہے اور میں کچھ وقت باہر گزارنا چاہتی ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ تیار ہونے کے لیے چلی گئی۔

لیون ڈائننگ روم سے لڑکھڑاتا ہوا باہر آیا۔ اس کے ہاتھ میں مشروب کا گلاس تھا۔ دوسرے ہاتھ سے اس نے سگریٹ سلگائی اور مجھے گھورتے ہوئے بولا۔ ''تم دونوں کو یہاں سے چلے جانا چاہیے۔ اپنا کوئی اور انتظام کر لو۔''

''کیوں؟'' میں نے غصے سے کہا۔

وہ چند قدم پیچھے ہٹا۔ معلوم نہیں وہ پہلے سے نشے میں تھا یا میرے بدلے ہوئے رویے نے اسے حواس باختہ کر دیا۔ اس نے معافی مانگنے کے انداز میں ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ ''میرا مطلب تھا کہ موسم گرما ختم ہو رہا ہے اور سردیاں شروع ہوتے ہی حالات تبدیل ہو جائیں گے۔ معاف کرنا میں تو تمہارے فائدے کے لیے کہہ رہا تھا۔'' یہ کہہ کر وہ کچن میں چلا گیا۔

سارہ تیار ہو کر آئی اور میرا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولی۔ ''باہر ایک خوب صورت دنیا ہمارا انتظار کر رہی ہے۔ چلو دن گزارنے کے لیے کوئی خوب صورت جگہ تلاش کرتے ہیں۔''

اس روز اظہار محبت کے طور پر میں نے اسے موتیوں کی مالا دی جو میرے پاس واحد زیور تھا۔ وہ کیتھولک نہیں تھی اس لیے اسے نیکلس سمجھی اور اسی انداز میں گلے میں ڈال لیا۔ دوسرے دن مجھے جسمانی معائنے کے لیے حاضر ہونے کا نوٹس ملا۔ میں اٹھارہ برس کا ہو رہا تھا اور مجھے لازمی فوجی خدمات کے لیے کسی بھی جگہ بھیجا جا سکتا تھا۔ جب میں نے یہ خبر ہپی ویلی کے مکینوں کو سنائی تو سارہ رونے لگی۔ اس نے میری سالگرہ کے لیے کیک اور موم بتیوں کا انتظام کیا تھا۔ اس موقع پر سب لوگ موجود تھے۔ انہوں نے اپنے اپنے انداز میں اس پر تبصرہ کیا۔ ٹینسی نے پہلی بار مجھ سے نرم لہجے میں مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''ممکن ہے کہ تمہارے اچھے نمبر آ جائیں اور تمہیں نہ جانا پڑے۔''

پھر اس نے دوسرا دھماکا کرتے ہوئے کہا۔ ''ہمیں ہر حال میں یہاں سے جانا ہوگا۔'' اس نے ایک کاغذ ہوا میں لہراتے ہوئے کہا۔ ''ایسا لگتا ہے کہ گرنارڈ کو کسی نے ہمارے بارے میں بتا دیا ہے۔ یہاں کتنے زیادہ لوگ رہ رہے ہیں اسی لیے اس نے لیز منسوخ کر دی ہے۔''

''تم نے ہی کسی سے کچھ کہا ہوگا۔'' سونی نے مجھے طعنہ دیتے ہوئے کہا۔

''میں نے تم سے خاموش رہنے کے لیے کہا تھا۔'' اینڈریو اس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے بولا۔

''میں نے کسی سے کچھ نہیں کہا۔'' میں نے احتجاج کرتے ہوئے کہا۔ ''اسے خود ہی اندازہ ہو گیا ہوگا۔ جب وہ ٹائلٹ کی مرمت کرنے یہاں آیا تھا۔''

ڈیبی میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔ ''تم ان لوگوں کی باتوں کا برا مت منانا۔ صرف اپنا خیال رکھو۔ ہمارا مسئلہ دوسری جگہ تلاش کرنا ہے۔ میں تو ٹیکساس واپس جا رہی ہوں۔''

اس کے جانے کے بعد اینڈریو بولا۔ ''میں اسٹوڈنٹ یونین کے دفتر جا رہا ہوں۔ یہ معلوم کرنے کہ ان

کے پاس کرائے کے لیے کوئی اپارٹمنٹ ہے۔''
نینسی اس کا راستہ روک کر کھڑی ہو گئی اور بولی۔
''میں تمہارے ساتھ جاؤں گی۔''
وہ کچھ دیر خاموش رہا پھر بولا۔ ''ٹھیک ہے۔ دوسرے کمرے میں چل کر بات کرتے ہیں۔''
سارہ ان دونوں کو جاتا ہوا دیکھتی رہی۔ میرے بازو پر اس کی گرفت ڈھیلی ہونے لگی تھی۔ سونی بدستور کمرے کے وسط میں کھڑا جھول رہا تھا۔ اس نے ایک اور سگریٹ سلگا لیا تھا اور مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھتے ہوئے مسکرا رہا تھا۔ اسی روز سہ پہر میں سارہ نے انکشاف کیا کہ وہ اینڈریو سے محبت کرنے لگی ہے۔ میری آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ یوں لگا جیسے قسمت اچانک ہی مجھ سے روٹھ گئی تھی۔ پہلے مجھے طبی معائنے کے لیے پیش ہونے کا خط ملا پھر مالک مکان نے انہیں گھر خالی کرنے کا نوٹس دیا اور اب سارہ نے میرے سر پر یہ بم پھوڑ دیا تھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ پورا جسم مفلوج ہو گیا ہے۔ میں حرکت کرنے یا بولنے کے قابل نہ رہا تھا۔ میں خاموشی سے بستر پر لیٹا آنسو بہاتا رہا۔
''ویسے بھی ہم لوگوں کو یہاں سے جانا پڑ رہا ہے۔'' وہ میرے ردعمل کو نظر انداز کرتے ہوئے بولی۔ ''نینسی پر اس ماحول کا اثر ہو گیا ہے اور وہ اینڈریو پر اپنا حق جتانے لگی ہے۔ ہر کوئی یہ دیکھ سکتا ہے۔''
میں بستر سے نیچے اتر آیا اور بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ''کب سے یہ سلسلہ جاری ہے۔ میرا مطلب ہے تم اور اینڈریو......''
''تمہیں اس طرح نہیں سوچنا چاہیے۔'' اس نے کہا۔ ''ہم سب آزاد ہیں۔ تم بھی بالآخر کسی کو اپنا بنا لو گے۔ ہمارا ساتھ دیر تک نہیں رہ سکتا۔ ہم دونوں بہت مختلف ہیں جبکہ میں اور اینڈریو ایک جیسے ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے ہم جنم جنم سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔''
میں نے جوتے پہنتے ہوئے کہا۔ ''کیا نینسی کو یہ بات معلوم ہے؟''
''میرا خیال ہے کہ اینڈریو اسے اب بتا رہا ہے۔ ہمارے خیال میں یہی بہتر ہے کہ وہ خود اسے بتا دے۔''
میں دروازے کی طرف بڑھا اور بولا۔ ''میرے پیچھے مت آنا ورنہ جان سے مار دوں گا۔''
میں لڑکھڑاتا ہوا باہر نکلا تو میرا سامنا سونی سے ہو گیا۔ وہ میرا ہاتھ پکڑ کر کچن میں لے گیا۔ اس نے مجھے ایک اسٹول پر بٹھایا اور ٹکیولا کی بوتل کھول کر میرے لیے ایک گلاس بنایا۔ اس وقت مجھے اس کی ضرورت تھی۔ میں نے لمحوں میں وہ گلاس خالی کر دیا اور اس کے ساتھ ہی مجھے کھانسی کا شدید دورہ پڑا۔ سونی نے میرے لیے ایک اور گلاس بھرا۔ اور میرے سامنے رکھتے ہوئے بولا۔
''تھوڑی سی اور پی لو۔ اس وقت تمہیں اس کی ضرورت ہے۔''
اس کے بعد مجھے نہیں معلوم کہ کیا ہوا۔ میری آنکھ طلوع آفتاب کے وقت کھلی۔ میرا سر بری طرح چکرا رہا تھا۔ میں نے اٹھنے کی کوشش کی تو دیکھا کہ ایک تازہ مٹی کے ڈھیر کے پاس پڑا ہوا تھا۔ پوری توانائی کو مجتمع کرتے ہوئے لڑکھڑاتے قدموں سے مکان کی طرف بڑھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ سب جا چکے تھے۔ میں نے ایک ایک کمرا دیکھ ڈالا لیکن وہاں چند پرانے کپڑوں اور ایک پوسٹر کے سوا کچھ نہیں تھا۔ دیوار پر لگی گھڑی صبح کے سات بجا رہی تھی۔ گویا میں رات بھر وہیں پڑا رہا پھر مجھے اپنے والدین کا خیال آیا۔ وہ کتنے پریشان ہو رہے ہوں گے۔ جب گھر پہنچا تو معلوم ہوا کہ پورے دو دن غائب رہا ہوں۔ گھر والوں کو مطمئن کرنا بہت مشکل تھا لیکن میں نے کسی نہ کسی طرح انہیں ٹال دیا۔ سونی نے آخری وقت میں میرے ساتھ شرارت کی تھی۔ اس نے شراب میں منشیات ملا دی تھی۔ یہ میں نہیں جانتا کہ اس نے ایسا کیوں کیا۔''
ایلیٹ اپنے باس کو دیکھ رہا تھا جس کے چہرے پر دکھ، پریشانی اور خوف اس طرح نمایاں تھا جیسے یہ واقعات کل ہی پیش آئے ہوں۔ ایک طویل وقفے کے بعد جان نے افسردگی سے کہا۔ ''ویت نام کی جنگ کے دوران اس سے زیادہ خوفناک واقعات پیش آئے جنہوں نے ان ڈراؤنے خوابوں کی جگہ لے لی اور کچھ عرصے بعد میں اپنے آپ کو قائل کرنے میں کامیاب ہو گیا کہ میں کسی قبر کے برابر میں نہیں لیٹا ہوا تھا۔''
ہوئن نے ریکارڈر کا بٹن آف کیا اور دونوں کچھ دیر خاموش بیٹھے رہے پھر نوجوان سراغ رساں نے اس سکوت کو توڑا۔ ''گویا تم خود بھی نہیں جانتے کہ تم نے اس لڑکی کو قتل کیا تھا۔ یقیناً ایسے حالات تھے لیکن اس سے زیادہ کچھ نہیں۔''
''میں سمجھتا ہوں کہ میرے پاس قتل کا محرک اور مواقع موجود تھے۔''
ہوئن نے ایک نظر ان نوٹس پر ڈالی جو اس نے اولیور کے بیان کے دوران لکھے تھے۔ ''تم نے کوئی جرم نہیں کیا لیکن تم ایسا محسوس کر رہے ہو؟''

''میں تمہارے بھروسے کی قدر کرتا ہوں۔'' اولیور بولا۔ ''لیکن ہمارا کام وفاداری نبھانا نہیں بلکہ سچ کی تلاش ہے۔''

''تم یہ بات نظرانداز کررہے ہو باس کہ تمہارے علاوہ اور لوگ بھی مشتبہ ہوسکتے ہیں۔'' ہوٹن نے کہا۔

''تمہارا اشارہ کن لوگوں کی جانب ہے اور کیوں؟'' اولیور حیران ہوتے ہوئے بولا۔

''پہلا نمبر نینسی کا ہے۔ تم کیا سمجھتے ہو جب اسے سارہ اور اینڈریو کے تعلق کے بارے میں معلوم ہوا ہوگا تو وہ خوش ہوئی ہوگی؟ دوسرا نام سونی کا ہے۔ وہ تمہیں پسند نہیں کرتا تھا۔ ممکن ہے کہ اسے سارہ کے ساتھ تمہارا میل جول اچھا نہ لگا ہو اور اس نے تمہیں شراب میں منشیات گھول کر پلا دی۔ صرف اس لیے کہ اس کے جانے سے پہلے کسی کو سارہ کے قتل کا پتا نہ چلے اور تم پر شک کیا جائے۔ میری نظر میں اسٹیوارٹ بھی مشتبہ ہے۔ وہ مجھے ایک خبطی شخص معلوم ہوتا ہے اور ایسے لوگوں کا دن اچھا نہ گزرے تو وہ کچھ بھی کرسکتے ہیں۔''

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو ایلیٹ۔ میں نے اس پر غور نہیں کیا۔'' اولیور نے کہا۔ ''لیکن پھر بھی تم مجھے اس سے خارج نہیں کرسکتے۔''

''یہ میں نے کب کہا؟'' ہوٹن اٹھتے ہوئے بولا۔ ''اب تمہیں گھر جانا چاہیے۔ چیف سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں، اب یہ مجھ پر چھوڑ دو۔''

''چیف یہ بیان سننا چاہے گا۔'' اولیور نے وضاحت کی۔ ''اس طرح اسے سمجھنے میں آسانی رہے گی۔''

''ٹھیک ہے۔ میں اس کی ایک نقل اسے بھیج دوں گا۔''

☆☆☆

''سارہ کورنی، ہاں وہ مجھے یاد ہے گو کہ زیادہ نہیں کیونکہ اسے دیکھے ہوئے کافی عرصہ ہوگیا ہے۔''

ہوٹن اس بوڑھے شخص کے سامنے والی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اسے تلاش کرنے میں کوئی دقت نہیں ہوئی۔ وہ ایک گھنٹے کی مسافت پر واقع یونیورسٹی ٹاؤن میں رہائش پذیر تھا۔ پروفیسر اینڈریو رائیل نے اپنے شاندار دفتر میں اس کا استقبال کیا۔ ہوٹن نے جیب سے ایک چھوٹی سے نوٹ بک نکالی اور بولا۔ ''کیا وہ تمہاری گرل فرینڈ نہیں تھی؟''

''گرل فرینڈ؟'' رائیل نے بہ آواز بلند کہا۔ ''میں ایسا نہیں سمجھتا لیکن یہ تم کیوں کہہ رہے ہو؟''

ہوٹن نے اس کے الفاظ نوٹ بک میں لکھے اور بولا۔ ''کیونکہ تم اس سے محبت کرتے تھے پروفیسر۔ کچھ یاد آیا؟''

رائیل نے اپنا چشمہ اتار کر میز پر رکھا اور بولا۔ ''کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ تم کس سلسلے میں آئے ہو۔ کیا مجھ پر شک کیا جارہا ہے؟''

''نینسی کے بارے میں کیا کہو گے۔ وہ بھی تو کسی زمانے میں تمہاری گرل فرینڈ تھی؟''

''ہاں، یہ درست ہے۔'' رائیل نے اس کی بات سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔ ''وہ میری واحد گرل فرینڈ تھی اور ہم نے زمانۂ طالب علمی میں ہی شادی کرلی تھی۔ وہ اب بھی میری بیوی ہے۔''

''اس وقت وہ کہاں ہے؟''

''کیوں؟'' رائیل کاٹ کھانے کے انداز میں بولا۔ ''کیا وہ بھی مشتبہ ہے؟''

ہوٹن سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''لگتا ہے کہ یہ لفظ تمہارے ذہن سے چپک کر رہ گیا ہے جبکہ میں صرف ان لوگوں کو تلاش کرنے کی کوشش کررہا ہوں جنہوں نے آخری بار سارہ کو دیکھا تھا۔ یہی سوال میں تم سے بھی کروں گا۔''

''میرا خیال ہے کہ ہپی ویلی میں آخری روز اسے دیکھا تھا۔'' اس نے مسکرانے کی کوشش کی۔ ''ہم نے ہی اس مکان کا نام ہپی ویلی رکھا تھا۔''

''یہ میں پہلے سے جانتا ہوں۔ مجھے ہپی ویلی کے بارے میں سب کچھ معلوم ہے۔ آخری دن سے تمہاری کیا مراد ہے؟''

''ہمیں مکان خالی کرنے کا نوٹس ملا تھا اور ہم سب اپنا سامان باندھ رہے تھے۔ میرا خیال ہے کہ میں نے اسے ضرور جاتے ہوئے دیکھا ہوگا۔''

''وہ اکیلی گئی تھی یا کسی کے ساتھ؟'' ہوٹن نے پوچھا۔

''وہ اس لڑکے اولیور کے ساتھ گئی تھی جس سے ان دنوں اس کی دوستی چل رہی تھی۔ وہ ایک ساتھ جنگل کی طرف گئے تھے۔''

''بڑی حیران کن بات ہے۔ تمہیں سارہ یاد نہیں لیکن تینتالیس سال گزر جانے کے باوجود اس کے بوائے فرینڈ کا نام یاد ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے اپنی نوٹ بک اور قلم اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''اگر تمہیں یاد ہو تو ان سب

لوگوں کے نام لکھ دو جو اس مکان میں تمہارے ساتھ ٹھہرے ہوئے تھے اور وہ اب کہاں ملیں گے؟''

''میں کیوں لکھوں؟'' رانیل پھنکارتے ہوئے بولا۔

''وہ دیکھ چکا تھا کہ ابھی تک ہوشن نے اپنی نوٹ بک میں ایک لفظ بھی نہیں لکھا تھا۔

''کیونکہ ہمیں اولڈ پپی ویل سے ایک لاش ملی ہے جس کے بارے میں ہمارا خیال ہے کہ وہ سارہ کورٹنی کی ہے۔ وہ ایک کم گہرائی کی قبر میں پڑی ہوئی تھی۔ میں نہیں سمجھتا کہ اس نے خود ہی اپنے آپ کو وہاں دفن کیا ہوگا۔ تمہیں ہماری مدد کرنی چاہیے ورنہ......'' اس نے باقی جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

رانیل نے اسے گھورتے ہوئے نوٹ بک اپنی جانب کھسکائی اور اس پر تیزی سے کچھ لکھنے لگا۔

☆☆☆

نینسی رانیل نے بڑی سرد مہری سے اس کا استقبال کیا اور اسے کرسی بھی پیش نہیں کی۔ ہوشن نے اس کا پرانا نام پوچھا تو وہ غصے سے بولی۔ ''میں نہیں سمجھتی کہ اس کا سارہ کورٹنی سے کوئی تعلق ہے۔''

''گویا تمہارے شوہر نے پہلے ہی فون کر کے بتا دیا ہے۔ تم دونوں کے درمیان کیا بات ہوئی؟''

''اس سے تمہیں کوئی سروکار نہیں ہونا چاہیے۔''

''تمہارے شوہر نے سارہ سے آخری ملاقات کے بارے میں جو کچھ بتایا، کیا تم اس سے متفق ہو؟''

''بالکل۔''

''کیا تم ٹھیک بتا سکتی ہو کہ آخری بار تم نے اسے کیا کرتے ہوئے دیکھا تھا؟''

''وہ اور جان اولیور ایک ساتھ پپی ویلی سے گئے تھے۔''

''یعنی وہ دونوں ڈرائیو وے سے نکل کر سڑک کی طرف جا رہے تھے۔''

اس نے تائید میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''ہاں۔''

''پھر وہ کس طرف مڑ گئے؟''

وہ کچھ ہچکچاتے ہوئے بولی۔ ''میرا خیال ہے کہ بائیں جانب۔ جہاں جان رہتا تھا۔''

''تم دونوں کے بیانات میں فرق ہے۔'' ہوشن نے نوٹ بک پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ ''تمہارے شوہر کا کہنا ہے کہ وہ جنگل کی طرف گئے تھے؟''

وہ کچھ دیر اسے دیکھتی رہی پھر بولی۔ ''اس بات کو چالیس سال سے زیادہ ہو چکے ہیں۔ کیا تمہیں اتنی تفصیل یاد رہ سکتی ہے؟''

''میں نہیں جانتا۔'' ہوشن نے جواب دیا۔ ''کیونکہ ابھی میں چالیس کا نہیں ہوا۔''

''اس سے زیادہ میں کچھ نہیں بتا سکتی جب تک کہ تم میرے وکیل سے بات نہ کر لو۔''

''تمہارا وکیل......'' ہوشن حیران ہوتے ہوئے بولا۔ ''کیا وہ کوئی سودا کرنا چاہتا ہے؟''

وہ اپنی کرسی سے اٹھ کر دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ''چلے جاؤ۔ کیا مجھے معلوم نہیں کہ تم جان اولیور کو بچانے کے لیے یہ بھاگ دوڑ کر رہے ہو۔ تم نہیں جانتے کہ کس سے بات کر رہے ہو۔ میرا شوہر یونیورسٹی میں ڈین بننے والا ہے اور میں اس شہر کی تمام فلاحی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی ہوں۔ تمہارا چیف ضرور میری بات سنے گا۔''

ہوشن کچھ کہے بغیر دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ باہر جانے سے پہلے اس نے مڑ کر دیکھا اور بولا۔ ''میں یہ سمجھنے پر مجبور ہوں کہ تم اس تحقیقات میں تعاون نہیں کرنا چاہتیں۔''

یہ کہہ کر اس نے نینسی کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ وہ کافی گھبرائی ہوئی اور پریشان لگ رہی تھی۔ رانیل نے اپنی بیوی کے علاوہ جن دو لوگوں کے بارے میں اشارہ دیا وہ سونی جورڈن اور ڈیبی لینڈری تھے۔ ہوشن بڑی کوشش کے بعد ڈیبی سے رابطہ کرنے میں کامیاب ہو سکا جو اب چھ بچوں کی نانی دادی بن چکی تھی۔ اس نے بڑے وثوق سے کہا کہ جب وہ پپی ویلی سے جا رہی تھی تو سارہ وہاں موجود تھی جبکہ اسٹیوارٹ دو سال پہلے مر چکا ہے۔ وہ کچھ عرصہ بحالی کے مرکز میں بھی رہا، وہاں سے واپس آنے کے بعد اس نے دوبارہ نشہ کرنا شروع کر دیا جس نے بالآخر اس کی جان لے لی۔ ڈلاس پولیس سے ڈیبی کے صاف ستھرے ریکارڈ کی تصدیق ہو گئی جبکہ مقامی میڈیکل ایگزامنر نے بھی اسٹیوارٹ کی موت کی تصدیق کر دی۔ اس طرح ڈیبی اور اسٹیوارٹ دونوں ہی مشتبہ افراد کی فہرست سے خارج ہو گئے۔

لیون بارنز اب ویکس ٹاؤن شپ کے ایک گرجا میں پادری کے فرائض انجام دے رہا تھا اور ریورینڈ بارنز کے نام سے پہچانا جاتا تھا۔ اس نے ہوشن کا شناختی کارڈ دیکھنے کے بعد اسے اندر بلا لیا اور اس کی آمد کا مقصد

دریافت کیا۔

''میں تم سے پپی ویلی کے بارے میں بات کرنے آیا ہوں۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم کسی زمانے میں وہاں رہ چکے ہو۔''

''مجھے اس جگہ سے نفرت ہے۔''

''اس کی کوئی خاص وجہ؟'' ہوٹن نے پوچھا۔

''ایک نہیں کئی وجوہات ہیں۔ کیا مجھے تمہارے سامنے ان سب کا اعتراف کرنا ہوگا جبکہ میں کئی سال پہلے ایسا کر چکا ہوں۔ اور اب ان باتوں کو دہرانا نہیں چاہتا۔ میں بڑی مشکل سے صحیح جگہ تک پہنچا ہوں۔''

''مجھے تمہارے ماضی سے کوئی دلچسپی نہیں۔'' ہوٹن اپنی تھوڑی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔ ''میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ آخری روز پپی ویلی میں کیا ہوا تھا۔ جب تم لوگ وہاں سے رخصت ہو رہے تھے۔ کیا تم کسی کو وہاں چھوڑ کر آئے تھے؟''

''مجھے اپنا ماضی یاد کرنے کی کوئی خواہش نہیں ہے۔''

''اس کا مطلب ہے کہ تم کچھ چھپا رہے ہو۔'' ہوٹن زور دیتے ہوئے بولا۔ ''ہمیں اس مکان کے پچھواڑے سے ایک لاش ملی ہے۔''

''کس کی؟ تم کس کی بات کر رہے ہو؟''

''سارہ کورٹنی۔ یقیناً وہ تمہیں یاد ہوگی۔''

پادری کا چہرہ سفید پڑ گیا اور وہ کرسی سے پھسل کر فرش پر جا گرا۔ ہوٹن نے اس کی نبض دیکھی اور اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد پادری کے حواس بحال ہوئے تو ہوٹن نے اسے کرسی پر بٹھاتے ہوئے کہا۔ ''بہتر ہوگا کہ مجھے اس دن کے بارے میں سب کچھ بتا دو ورنہ میں تمہیں گردن سے پکڑ کر پولیس اسٹیشن لے جاؤں گا۔''

پادری نے بے بسی سے اسے دیکھا اور پھر اس کی زبان فرفر چل پڑی۔

☆☆☆

ہوٹن مسلسل تین گھنٹے ڈرائیو کرنے کے بعد سونی جورڈن تک پہنچا۔ وہ نیویارک کے علاقے چیلسیا کے ایک اسٹور میں کام کر رہا تھا۔ کئی مرتبہ دستک دینے کے بعد شیشے کے پیچھے ایک چہرہ نمودار ہوا۔ ''کون ہے؟''

''سراغ رساں ایلیٹ ہوٹن۔ میں تم سے پپی ویلی کے بارے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔''

اس نے تھوڑا سا دروازہ کھول کر ہوٹن کا شناختی کارڈ دیکھا اور اسے اندر بلا لیا۔ اس کی رہائش دکان کے عقبی حصے میں تھی۔ اس نے ہوٹن کو کرسی پیش کی اور بولا۔ ''یہ جگہ مجھے اپنے چچا سے ورثے میں ملی ہے۔ وہ یہاں بوچر شاپ چلاتا تھا۔ تم کس سلسلے میں آئے ہو؟''

''ہمیں پپی ویلی کے پچھواڑے سے سارہ کورٹنی کی لاش ملی ہے اور تمہارے ایک دوست کا کہنا ہے کہ تم آخری آدمی تھے جو سارہ کے ساتھ دیکھے گئے۔''

''سارہ، ہاں وہ سبز آنکھوں والی لڑکی۔ میں تو اس پر مرتا تھا۔'' وہ بے خودی کے عالم میں بولا پھر اس نے ایک دم پینترا بدلا اور کہنے لگا۔ ''کون سا دوست؟ میرا کوئی دوست نہیں ہے۔''

''لیون بارنر کا کہنا ہے کہ اس نے تم دونوں کو پپی ویلی سے رخصت ہوتے وقت بحث کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ تم اسے اپنے ساتھ لے جانا چاہ رہے تھے اور اس کے دوست کو پہلے ہی نشہ آور دوا پلا کر بے ہوش کر دیا تھا۔ غالباً اس کا نام جان اولیور تھا۔ اسے راستے سے ہٹانے کا مقصد ہی یہی تھا کہ تم اس لڑکی کی عزت لوٹ سکو۔''

''اسے جاسوسی کرنے کی عادت تھی۔ جب میں نے اسے اپنے اردگرد منڈلاتے دیکھا تو اسے گھسیٹتا ہوا

خارش

ایک آدمی ایک نجومی کے پاس آیا اور کہنے لگا۔ ''نجومی صاحب میرے بائیں ہاتھ میں کھجلی ہو رہی ہے۔''

نجومی نے ہاتھ دیکھتے ہوئے خوش خبری سنائی۔

''عنقریب آپ کے ہاتھ میں دولت آنے والی ہے۔''

''نجومی صاحب میرے دائیں ہاتھ میں بھی کھجلی ہے۔'' آدمی بولا۔

''عنقریب جو دولت آئے گی وہ جانے والی ہے۔'' نجومی نے قدرے تشویش سے کہا۔

''نجومی صاحب! میرے تو بائیں پاؤں میں بھی کھجلی ہے۔'' اس نے انکشاف کیا۔

''عنقریب آپ کوئی بڑا سفر کرنے والے ہیں۔'' نجومی نے چند لمحوں کے غور و فکر اور حساب کتاب کے بعد بتایا۔

''نجومی صاحب! میرے تو دائیں پاؤں میں اور کمر میں بھی کھجلی ہے۔'' وہ بے چینی سے بولا۔

یہ ذرا ٹیڑھا مسئلہ ہے۔ اس کے لیے تم کو سفید مگرمچھ کا انڈا اور ہرن کی کھال لانا ہوگی یا پھر مجھے تین ہزار روپے دے دو تو میں بندوبست کر لوں گا... یہ...!''

اس نے نجومی کی بات کاٹ کر کہا۔ ''تیری ایسی کی تیسی۔ مجھے تو کئی روز سے خارش ہے۔ میں تیرے گن آزمانے کے لیے یوں ہی چلا آیا تھا!''

دروازے تک لے گیا اور اسے باہر دھکیل دیا۔ اس کا سوٹ کیس پہلے سے تیار تھا۔ میں نے وہ بھی باہر پھینک دیا۔''

''اور اولیور؟''

''ہاں، میں نے اس کی شراب میں نشہ آور دوا ملائی تھی۔ لیکن اتنی زیادہ مقدار میں نہیں کہ وہ مر جائے۔''

''اس کے بعد تمہارا راستہ صاف ہو گیا اور تم نے سارہ کی عزت لوٹ لی۔''

''نہیں۔ مجھے وہ اچھی ضرور لگتی تھی لیکن اس نے بھرپور مزاحمت کی اور مجھ پر چاقو سے حملہ کر دیا۔ اگر اینڈریو اور نینسی وہاں نہ آجاتے تو وہ مجھے مار ڈالتی۔''

''پھر کیا ہوا؟'' ہوٹن نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔

''نینسی نے اس کے منہ پر تھپڑ مارا اور وہ دونوں لڑنے لگیں۔ میں نے ایک تولیے سے اپنا زخم صاف کیا۔ بیگ اٹھایا اور وہاں سے چلا آیا۔''

''اس وقت ڈیبی اور اسٹیوارٹ کیا کر رہے تھے؟''

''وہ دونوں پہلے ہی وہاں سے جا چکے تھے۔''

''اس دوران اولیور کہاں تھا؟''

جورڈن نے قہقہہ لگاتے ہوئے جواب دیا۔ ''مجھے کیا معلوم۔ کچھ نہیں کہہ سکتا کہ وہ کہاں تھا۔''

''اس کا مطلب ہے کہ آخر میں وہاں سارہ، نینسی اور اینڈریو ہی رہ گئے تھے۔''

''شاید، اس سے زیادہ میں کچھ نہیں بتا سکتا۔''

ہوٹن اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا۔ ''تمہارا بہت بہت شکریہ۔ میرے لیے اتنا ہی کافی ہے۔''

وہ میڈیکل ایگزامنر کے دفتر پہنچا تو سنہرے بالوں والی میڈیکل انویسٹی گیٹر نے ایک دلفریب مسکراہٹ کے ساتھ اس کا استقبال کیا اور بولی۔ ''میں نے ابھی تھوڑی دیر پہلے تمہارے دفتر فون کیا تھا۔ تمہارے لیے اچھی خبر نہیں ہے۔''

ہوٹن نے پسندیدہ نظروں سے اسے دیکھا۔ وہ لمبے قد اور متناسب جسم کی پُرکشش لڑکی تھی اور اس نے کوئی انگوٹھی بھی نہیں پہن رکھی تھی۔ اس نے کہا۔ ''تم جو کچھ بھی بتاؤ گی۔ وہ میرے فائدے کے لیے ہی ہوگا۔''

لڑکی نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا پھر اس کے چہرے پر ایک دلکش مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے کلپ بورڈ ہوٹن کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''جس لڑکی کی لاش ملی ہے۔ وہ سارہ کورٹنی کے دانتوں کے ریکارڈ سے مختلف ہے۔ یہ سارہ کی لاش نہیں ہے۔''

ہوٹن نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''میں جانتا تھا کہ تم جو کچھ کہو گی، وہ بہتری کے لیے ہی ہوگا۔''

وہ تھوڑا سا حیران ہوتے ہوئے بولی۔ ''اب تم کیا کرو گے؟''

''میں یہاں سے جا کر قاتل کو گرفتار کرلوں گا۔''

''لیکن تم تو اسے نہیں جانتے۔''

''ایملی کوبرن۔'' اس نے لڑکی کی نیم پلیٹ پڑھتے ہوئے کہا۔ ''میں تم سے ایک ڈیٹ کی شرط لگاتا ہوں کہ شام ہونے سے پہلے قاتل کو گرفتار کرلوں گا۔ بولو منظور ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے لڑکی کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔

دل ہی دل میں مسکراتے ہوئے ایملی نے اس کے چہرے کو بغور دیکھا اور اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے بولی۔ ''منظور ہے۔''

ہوٹن اپنی کار میں بیٹھا مکان پر نظریں جماتے ہوئے تھا۔ رافیل کو گرفتار ہوئے بیس منٹ ہو چکے تھے اور پولیس والوں کو کہہ دیا گیا تھا کہ اسے ٹیلی فون کرنے کی اجازت دے دی جائے پھر اس نے فون کی گھنٹی کی مدھم آواز سنی اور پانچ منٹ بعد گیراج کا دروازہ کھلا۔ ایک سلور جیگوار زوردار آواز کے ساتھ باہر آئی اور ایکسپریس وے کی طرف مڑ گئی۔

راستہ بند دیکھ کر مسز رافیل کار سے باہر آئی اور کسی نوجوان لڑکی کی طرح بھاگنے لگی لیکن وہ آفیسر مورین فشر کا مقابلہ نہ کر سکی جس نے اسے چند گز کے فاصلے پر دوڑ کر پکڑ لیا۔ ہوٹن خود یہ کام کرنا چاہتا تھا لیکن وزن زیادہ ہونے کی وجہ سے اس کے لیے دوڑ لگانا مشکل تھا۔ ہوٹن وہاں پہنچا تو اسے دیکھ کر وہ رونے اور چلانے لگی۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ قانونی چارہ جوئی کی دھمکی بھی دے رہی تھی پھر اچانک ہی خاموش ہوگئی۔

''گڈ آفٹرنون سارہ۔'' ہوٹن نے کہا۔

''تم کچھ ثابت نہیں کر سکتے۔'' وہ چیلنج کرتے ہوئے بولی۔ دن کی روشنی میں اس کی سبز آنکھیں چمک رہی تھیں۔

''ہم بہت جلد سب کچھ جان جائیں گے۔'' ہوٹن نے کہا۔ ''اس وقت نینسی کی باقیات کا ڈی این اے ٹیسٹ ہو رہا ہے۔ خوش قسمتی سے ہم اس کی بہن کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو گئے جس سے اس کا موازنہ کیا جائے گا اور رہوڈ آئی لینڈ پولیس تمہارے فنگر پرنٹس بھی ہمیں بھیج رہی ہے۔

جوانی میں تمہاری انگلیاں بے ڈھب تھیں۔"
سارہ کا چہرہ مرجھا گیا اور وہ برسوں کی بیمار نظر آنے لگی۔ پھر سنبھلتے ہوئے بولی۔ "اینڈریو نے اسے قتل کیا تھا، وہ اسے اکیلے نہیں جانے دے رہی تھی۔ اسے اپنی طرف گھسیٹ رہی تھی۔"
"بڑی دلچسپ بات ہے۔" ہوٹن اپنی ہنسی دباتے ہوئے بولا۔ "وہ بھی انٹرویو روم میں تمہارے بارے میں یہی کہہ رہا ہے کہ تم نے نینسی کو اپنے راستے سے ہٹانے کے لیے قتل کیا تھا کیونکہ تمہاری نظریں اینڈریو پر تھیں اور اسی لیے تم نے نینسی کو مار ڈالا تاکہ وہ تمہارا ہو جائے۔ اس کا کہنا ہے کہ تم نے قتل کا الزام اس پر عائد کرنے کی دھمکی دی تھی جس سے ڈر کر اس نے تم سے شادی کر لی اور صرف یہی ایک وجہ ہے جو وہ تمہارے ساتھ رہ رہا ہے۔"
سارہ نے ایک زوردار چیخ ماری اور ہوٹن کی طرف لپکی۔ اس کے نکیلے ناخن ہوٹن کے چہرے کی جانب بڑھ رہے تھے۔ ہوٹن نے بروقت اس کا ارادہ بھانپ لیا اور ایک طرف کو جھکتے ہوئے اپنا بھاری جوتا اس کے پیر پر رکھ دیا۔ وہ لڑکھڑا کر زمین پر گری اور سسکیاں لینے لگیں۔
"تم نے بھی وہی غلطی کی جو بہت سے دوسرے لوگ کرتے ہیں۔" ہوٹن اسے دیکھتے ہوئے بولا۔ "تم سمجھ رہی تھیں کہ زیادہ وزن ہونے کی وجہ سے میں اپنی جگہ سے حرکت نہیں کر سکوں گا اور اس طرح تم اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاؤ گی لیکن اس طرح تم اپنے جرم کی پردہ پوشی نہیں کر سکتیں۔"

☆☆☆

ہوٹن کو اپنے دروازے پر دیکھ کر جان اولیور حیران رہ گیا اور بولا۔ "تمہیں یہاں نہیں آنا چاہیے تھا ایلیٹ۔ چیف کو معلوم ہو گیا تو تمہاری خیر نہیں۔ ویسے بھی یہ ٹھیک نہیں ہے۔ اس سے تمہاری تحقیق متاثر ہو سکتی ہے۔"
"کیتھی کیسی ہے؟" ہوٹن اس کی تشویش کو نظرانداز کرتے ہوئے بولا۔
"ٹھیک ہے۔ تم کہو، کیسے آنا ہوا؟"
"تمہارے لیے ایک خبر ہے اور وہ یہ کہ جس لڑکی کی لاش قبر سے ملی تھی وہ سارہ نہیں بلکہ نینسی ہے۔ مزید یہ کہ میں نے اصلی سارہ کو گرفتار کر لیا ہے جس نے نینسی کو قتل کیا اور کئی برسوں سے پروفیسر اینڈریو کے ساتھ نینسی بن کر رہ رہی ہے۔"
اولیور اپنی جگہ پر منجمد ہو کر رہ گیا۔ ہوٹن اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "اب تم پُرسکون ہو جاؤ۔ تمہارا اس قتل سے کوئی تعلق نہیں۔"
"ایلیٹ۔" اولیور نے کہنا شروع کیا۔ "میں بتا نہیں سکتا کہ یہ جان کر مجھے کتنا سکون ملا لیکن میری مالا کے موتی اس قبر میں کیسے پہنچ گئے؟"
ہوٹن سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "تم سے یہی غلطی ہوئی۔ ان موتیوں کو دیکھ کر تم نے فرض کر لیا کہ وہ سارہ کی لاش تھی جبکہ وہ بکھرے ہوئے تھے اور تم نے کہا تھا کہ سارہ نے اس مالا کو نیکلس کی طرح گلے میں ڈال لیا تھا۔ یقیناً وہ اس وقت ٹوٹ کر بکھر گئے ہوں گے جب سارہ اور اینڈریو نے نینسی کی لاش کو گڑھے میں ڈالا اور وہ موتی اس پر گر گئے۔ ان دونوں میں سے کسی نے بھی اس پر توجہ نہیں دی یا انہوں نے سوچا ہوگا کہ اگر لاش کبھی دریافت ہوئی تو اس سے ان کے فریب کو تقویت ملے گی اور یہی سمجھا جائے گا کہ یہ سارہ کی لاش ہے۔ دیکھا جائے تو وہ کسی حد تک اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے تھے۔ میں خود بھی کوئی سرا تلاش نہیں کر سکا لیکن جورڈن سے ملنے کے بعد اس کی ایک بات میرے دماغ سے چپک کر رہ گئی۔ اس نے کہا تھا کہ سارہ کی آنکھیں سبز تھیں۔ تم نے بھی اپنے بیان میں یہی بات کہی تھی پھر میں نے ویسی ہی آنکھیں اس وقت دیکھیں جب نینسی رائیل دروازہ کھولنے آئی لیکن اس نے کمرے میں اندھیرا کر رکھا تھا پھر جب لیبارٹری رپورٹ سے پتا چلا کہ اس قبر سے ملنے والی لاش سارہ کی نہیں تھی تو مجھے اس اندھیرے کی وجہ سمجھ میں آ گئی۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا، اس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ تم خود سمجھ سکتے ہو۔"
یہ کہہ کر وہ کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا اور بولا۔ "اب تم جا کر کیتھی کو یہ خبر سنا دو تاکہ اسے بھی اطمینان ہو جائے۔"
اولیور بھی کھڑا ہو گیا اور اپنے ماتحت کا ہاتھ تھامتے ہوئے بولا۔ "تم نے بہت زبردست کام کیا ہے۔ بہت بہت شکریہ! تم خود کیتھی کو یہ خبر کیوں نہیں سناتے۔ وہ تم سے اس کی تفصیل جاننا چاہے گی۔"
"ہاں۔" ہوٹن نے کہا۔ "میں ضرور رک جاتا لیکن مجھے ایک خوب صورت لڑکی کو اپنی کارکردگی کی رپورٹ دینی ہے۔ وہ میرا انتظار کر رہی ہوگی۔" پھر وہ دروازے پر پہنچ کر مڑا اور کہنے لگا۔ "مجھے افسوس ہے کہ تمہاری گرل فرینڈ ایک قاتل تھی۔ حیرت ہے کہ رقابت میں کوئی اس حد تک بھی جا سکتا ہے۔"

آوارہ گرد

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی | قسط 24

مندر، کلیسا، سینی گاگ، دھرم شالے اور اناتھ آشرم... سب ہی اپنے اپنے عقیدے کے مطابق بہت نیک نیتی سے بنائے جاتے ہیں لیکن جب بانیوں کے بعد نکیل بگڑے ذہن والوں کے ہاتھ آتی ہے تو سب کچھ بدل جاتا ہے... محترم پوپ پال نے کلیسا کے نام نہاد راہبوں کو جیسے گھناؤنے الزامات میں نکالا ہے، ان کا ذکر بھی شرمناک ہے مگر یہ ہو رہا ہے... استحصال کی صورت کوئی بھی ہو، قابل نفرت ہے... اسے بھی وقت اور حالات کے دھارے نے ایک فلاحی ادارے کی پناہ میں پہنچا دیا تھا... سکھ رہا مگر کچھ دن، پھر وہ ہونے لگا جو نہیں ہونا چاہیے تھا... وہ بھی مٹی کا پتلا نہیں تھا جوان کا شکار ہو جاتا... وہ اپنی چالیں چلتے رہے، یہ اپنی گھات لگا کر ان کو نیچا دکھاتا رہا... یہ کھیل اسی وقت تک رہا جب اس کے بازو توانا نہ ہو گئے اور پھر اس نے سب کچھ ہی الٹ کر رکھ دیا... اپنی راہ میں آنے والوں کو خاک چٹا کر اس نے دکھا دیا کہ طاقت کے گھمنڈ میں راج کا خواب دیکھنے والوں سے برتر... بہت برتر قوت وہ ہے جو بے آسرا نظر آنے والوں کو نمرود کے دماغ کا مچھر بنا دیتی ہے... پل پل رنگ بدلتی، نئے رنگ کی سنسنی خیز اور رنگا رنگ داستان جس میں سطر سطر دلچسپی ہے...

تحیر... سسنی اور ایکشن میں ابھرتا ڈوبتا دلچسپ سلسلہ...

میرے چونکنے کی وجہ بظاہر معمولی سہی لیکن ایک بات نے مجھے کھٹکا ضرور دیا تھا کہ اگر متوقع طور پر اغوا کنندگان کا تعلق "ٹائیگر ٹیگ" سے تھا تو پھر پاکستان میں ان کا شکار صرف میں یا میرا کوئی ساتھی ہونا چاہیے تھا (اگرچہ میرا ساتھی بھی دور کی بات تھی، کیونکہ اصل شکار تو میں ہی تھا ان کا) تو پھر یہ اُن کا دوسرا "شکار" کون تھا؟

میرے ذہن میں یہی سوال بار بار گردش کر رہا تھا۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ اسے بھی لگے ہاتھوں میرے ساتھ ہی اغوا کیا گیا ہو۔ یوں اگر ہم دونوں ہی ٹائیگر ٹیگ کے متوقع اور مذکورہ ٹاپ ایجنٹوں کے چنگل میں پھنس چکے تھے تو اس کا مطلب تھا کہ یہ دوسرا قیدی بھی کوئی معمولی حیثیت کا آدمی نہیں ہوسکتا تھا مگر یہ تھا کون......؟

میں نے ایک بار پھر اس کا جائزہ لینے کی کوشش کی۔ جب میں دوبارہ اس کی جانب متوجہ ہوا تو اسی وقت اسے ہوش آ گیا......... وہ ایک دم ہی ہڑبڑا کر بیٹھنے کی کوشش میں بنک بیڈ اور چھت کے درمیان پھنس کر رہ گیا، کیونکہ اس کا بنک بیڈ میرے بیڈ سے اوپر اور کمرے کی چھت کے قریب تھا۔ نتیجے میں اس کا سر زوردار آواز سے چھت سے ٹکرایا تھا اور بندھے ہوئے ہاتھوں میں بھی اینٹھن ہوئی تھی۔ وہ بے اختیار ہولے سے کراہ کے رہ گیا تھا۔ تبھی اس کی مجھ پر نگاہ پڑی اور وہ بوکھلا کر بولا۔

"کک...... کون ہو تم؟ اور...... اور، مجھے تم نے یہاں......" اس کی بات ادھوری رہ گئی، کیونکہ اسی وقت اس کی نظر میرے دونوں ہاتھوں کے آہنی جکڑ بند پر پڑی تو وہ ہونق سا ہو کر میرا منہ تکنے لگا، ہم دونوں کے چہرے بہت قریب اور آمنے سامنے ہو گئے، فرق صرف یہ تھا کہ وہ بنک بیڈ پر تھا اور میں کھڑا تھا۔

"میرا بھی یہی حال ہے دوست!" میں نے ہلکی سی مسکراہٹ سے کہا تو وہ اپنا سر جھٹکنے لگا، یوں جیسے وہ کوئی خواب دیکھ رہا ہو۔ میں اسے بغور تکنے لگا۔ سانولا رنگ، عمر پینتیس چالیس کے لگ بھگ، چہرے پہ ہلکی سی سیاہ داڑھی ابھری ہوئی تھی، سر کے بال گھنے اور بکھرے بکھرے تھے۔ صحت اچھی تھی، قد بھی مناسب ہی معلوم ہوتا تھا، وہ خاصا پریشان اور افسردہ نظر آ رہا تھا، جیسے ان حالات سے پہلی بار سابقہ پڑا ہو...... مجھے اس پر حیرت ہوئی کہ بظاہر ایک عام سا دکھائی دینے والا یہ بندہ ٹائیگر ٹیگ والوں کو مطلوب کیسے ہوسکتا ہے......؟ کہیں ایسا تو نہ تھا کہ کسی غلط فہمی کے نتیجے میں ان کے چنگل میں آ پھنسا ہو......؟

"تم بھی......؟" وہ بولا۔

"ہاں! میں بھی......!" میں نے پھر مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔

"تم ہنس رہے ہو......؟ تم ضرور اس کے ساتھی ہو گے۔" وہ شک بھری نظروں سے میری طرف تکتے ہوئے بولا۔

"تمہاری عقل پر ماتم ہی کر سکتا ہوں دوست!" میں نے اس بار متانت سے کہا۔ "دیکھ بھی رہے ہو کہ میرا بھی تم سے کچھ مختلف حال نہیں اور پھر بھی ایسی بے وقوفانہ بات......"

میری بات سن کر وہ بے اختیار ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ صورت شکل سے وہ خاصا سنجیدہ اور سمجھدار آدمی نظر آتا تھا مگر سادہ لوح بھی لگتا تھا۔ عمر میں مجھ سے آٹھ، دس سال بڑا ہی ہوگا مگر جانے کیوں اس کی حرکات و سکنات کسی پندرہ سولہ سالہ لڑکے جیسی تھیں۔

"سوری یار...... ناراض کیوں ہوتے ہو!" وہ جھینپ کر بولا۔ "شاید مجھے غلط فہمی ہو گئی تھی۔"

"شاید نہیں، یقیناً کہو۔" میں نے کہا۔ "ویسے تم ہو کون؟ اور انہوں نے تمہیں کس مقصد کے لیے پکڑا ہے......؟"

"پکڑا ہے......؟" وہ چونکا۔ "مجھے پکڑا کب ہے انہوں نے......؟ میں تو ان کے ساتھ تھا۔"

"کیا......؟" میں جیسے زور سے چیخا۔ میرے لیے اس کا یہ انکشاف چونکا دینے والا ہی نہیں بلکہ حیران کن تھا۔

"تت...... تم ان کے ساتھ تھے؟" اب چونکنے اور بوکھلانے کی باری میری تھی۔

"ہاں! لیکن میں اپنے بارے میں بعد میں بتاؤں گا تمہیں۔" وہ ہنوز مجھے شاکی۔۔ نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ "کیونکہ میری حقیقت تم سے زیادہ اہم اور رازداری کی متقاضی ہوگی۔" میں اس آدمی کی عجیب سی گفتگو پر ایک الجھن آمیز حیرت میں مبتلا ہو گیا۔ گویا کہاں تو میں خود کو ایک اہم قیدی تصور کیے ہوئے تھا اور اب پتا چلا تھا کہ یہاں تو مجھ سے بھی زیادہ خود کو اہم سمجھنے والا قیدی موجود ہے۔

"یہ بات مت کرو، ان لوگوں کے لیے اہم ہم دونوں ہی ہوں گے۔" میں نے دوسری طرف گردن موڑ کر پورٹ ہول کی جانب دیکھا، شاید وہاں سے کچھ نظر آ جائے لیکن تاریک خلا کے سوا وہاں کچھ نہ تھا۔ لہٰذا دوبارہ اس کی طرف گردن موڑ کر مزید بولا۔

''ہم دونوں ہی اہم ہیں اور اہم ہی قسم کے لوگوں کے ہتھے چڑھے ہیں، یعنی خطرناک لوگ۔'' میں نے دانستہ ٹائیگر ٹیگ کا ذکر نہیں کیا تھا۔

میری بات نے اسے سوچوں میں گم کر دیا۔ پھر جیسے اپنا سر دھنتے ہوئے بولا۔ ''بات تو تمہاری بھی ٹھیک ہے! مگر اس وقت اہم بات یہ ہے کہ......'' وہ رکا پھر چلایا۔ ''میرے خدا...... ! ہم کہیں کسی بحری جہاز میں تو نہیں ہیں؟ ی ی یہ...... کمرا ڈول رہا ہے تھوڑا تھوڑا۔''

''بہت دیر سے تمہیں پتا چلا، خیر دیر آید درست آید۔'' میں نے کہا۔ وہ اب اِدھر اُدھر دیکھنے لگا پھر چھت کو گھورنے لگا۔

''تم کچھ کہہ رہے تھے......'' میں نے اسے یاد دلایا۔ یہ شخص خود میرے لیے ایک معما بنا ہوا تھا، اور حد سے زیادہ وہمی اور محتاط بھی نظر آرہا تھا۔ میرے یاد دلانے پر وہ بولا۔

''میں جو کہنا چاہ رہا تھا وہ مجھے پتا چل گیا ہے کہ ہم کسی علاقے یا جگہ پر نہیں بلکہ پانی میں تیر رہے ہیں، او خدایا...... یہ بد بخت کہاں لے جا رہے ہیں مجھے؟''

''صرف تمہیں نہیں، مجھے بھی لے جا رہے ہیں۔'' میں نے اپنے تئیں اس کی تصحیح کرنی چاہی تو وہ اس بار جھلا کر بولا۔

''مجھے تم سے کوئی غرض نہیں ہے۔ مجھے اس وقت صرف اپنی فکر ہو رہی ہے۔ میری بیوی، میرے بچے پریشان ہو رہے ہوں گے کس قدر......''

مجھے اس کی صاف گوئی اچھی لگی تھی اور مجھے اس سیدھے سادے انسان پر ترس بھی آیا کہ یہ بے چارہ بال بچے دار تھا۔ تاہم میں بولا۔ ''دیکھو دوست! اس وقت ہم واقعی محاورتاً نہیں بلکہ شاید حقیقتاً ایک ہی کشتی کے سوار ہیں۔ اس طرح اگر اپنا اپنا منہ موڑے دیوار کی طرف دیکھتے رہیں گے تو کچھ نہیں کر پائیں گے، تم نے وہ محاورے نہیں سنے، ایک اور ایک گیارہ...... اور ایک سے دو بھلے۔''

''میں اکیلا ہی بھلا......'' وہ بولا۔

''جہنم میں جاؤ پھر۔'' میں نے بھی زچ ہو کر کہا اور اس کی طرف سے منہ موڑ کر کمرے کے دروازے کی طرف دیکھنے لگا۔

''اے مسٹر! تمیز سے بات کرو مجھ سے...... جانتے نہیں تم کہ کون ہوں میں......!'' وہ اس بار اپنی بھاری اور کھردری آواز کو رعب دار بنانے کی کوشش کرتے ہوئے بولا تو میں نے اس کی طرف دیکھے بِنا ہی بے پروا انداز میں کہا۔

''تم خود کو اگر تیس مار خاں سمجھ رہے ہو تو میں بھی طرم خاں ہوں، بس اب تم اپنے فائدے کی سوچو اور میں اپنے فائدے کی سوچوں گا۔'' مجھے بھی اس کی بے رخی اور رکھائی پر غصہ آگیا تھا۔

دس، پندرہ منٹ اسی طرح خاموشی میں گزر گئے، ہم نے آپس میں پھر کوئی بات نہیں کی۔ میں اپنے طور پر اس کے اور ان دونوں نامعلوم اغوا کنندگان کے بارے میں سوچنے لگا۔ اس کی بات مجھے ابھی تک کھٹک رہی تھی۔ بہ قول اس کے وہ ان کے ساتھ تھا...... یعنی اس کے کہنے کا مطلب تو مجھے یہی سمجھ میں آیا تھا کہ وہ انہیں جانتا تھا، یا پھر ان کے درمیان .... خاصی دیر تک بات چیت بھی ہوئی تھی۔

وہ خاصا مستقل مزاج ثابت ہو رہا تھا، مزید کئی منٹ بیت گئے مگر اس نے بات کر کے نہیں دی، جبکہ مجھے اندر سے بے چینی کھائے جا رہی تھی۔

اچانک دروازے پر کھٹر کھٹر ہوئی، میں چونکا، وہ بھی بدکا اور جب دروازہ کھلنے لگا تو وہ اپنے بنک سے نیچے میرے ساتھ ہی آن کھڑا ہوا۔ اس کا بنک ذرا اونچا ہونے کے باعث اسے اپنے دونوں ہاتھ بلند کرنے پڑے تھے۔

دروازے سے ایک موٹا تازہ سیاہ رو شخص اندر داخل ہوا۔ قد اس کا ٹھگنا اور جسم خوب گھٹا ہوا تھا، سر کے بال چھوٹے اور تیل میں چپڑے ہوئے محسوس ہوتے تھے، آنکھوں میں وحشت سی ناچ رہی تھی اور موٹے کالے بھدے ہونٹوں پر سفاکی تیرتی نظر آتی تھی۔ اس نے صرف ایک صدری (بنیان ٹائپ قمیص) پہن رکھی تھی اور نیچے خاصے کھلے گھیر والی شلوار پہن رکھی تھی۔ ایک کان کی لو سے پیتل کا بالا جھول رہا تھا، پہلی ہی نظر میں مجھے وہ کسی جہاز کا خلاصی لگا تھا۔ وہ غیر مسلح تھا۔ دروازے پر ہی رک کر تھوڑی دیر تک ہم دونوں کو اپنی وحشیانہ نظروں سے گھورتا رہا، اس کے بعد ہماری جانب بڑھا۔ اس نے مجھے نظر انداز کر دیا اور اپنی جیب سے چابیوں کا ایک گچھا نکال کر دوسرے قیدی کی زنجیر نما ہتھکڑی کھولنے لگا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ میں اسے کون سی زبان میں مخاطب کروں؟ اسی اثنا میں وہ قیدی اس سے ملتجیانہ لہجے میں بولا۔

''د د...... دیکھو! م...... مجھے کچھ بھی نہیں معلوم، میں تو خود سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اتنے عرصے سے گمنامی کی زندگی گزار رہا تھا...... میرا یقین......'' اس کا جملہ نامکمل ادھورا رہ گیا، کیونکہ اسی وقت اس موٹے خلاصی کا ہتھوڑے جیسا گھونسا اس کے جبڑے پر پڑا۔

اس کے حلق سے ''اوغ'' کی کراہ آمیز آواز ابھری اور وہ بے چارہ اپنا مضروب جبڑا ابھی نہ سہلا سکا۔

''اب اپنا منہ بند رکھنا اور شرافت سے میرے ساتھ چلو۔'' خلاصی درشت لہجے میں بولا۔

ان دونوں کے درمیان انگریزی میں ہی گفتگو ہوئی تھی، قیدی کی انگریزی تو صاف اور شستہ تھی لیکن ملاح ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں بولا تھا۔ اس کے لہجے کو میں نے خاموشی سے بھانپنے کی کوشش کی تھی جو مجھے کسی اور ہی خطے کی محسوس ہوئی۔ اس کے تیور صاف بتا رہے تھے کہ اگر میں نے بھی بلاضرورت اپنا منہ کھولا تو بڑی قزاق نما یہ خلاصی مجھے بھی ایک پنچ جما دے گا اس لیے میں چپ ہی رہا۔ پھر اس قیدی کو اپنے ساتھ لے جاتے وقت اس نے ایک نگاہِ غلط میرے چہرے پر بھی ڈالی تھی۔

ان کے جانے کے بعد دروازہ بند کر دیا گیا۔ میں عجیب مخمصے کا شکار ہو گیا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ آخر میں کہاں ہوں؟ کہاں لے جایا جا رہا ہوں اور مجھے اغوا کرنے والے آخر کون لوگ ہیں؟ کیونکہ اب تک تو میرا یہی خیال تھا کہ میں ٹائیگر فیگ والوں کے ہتھے چڑھا ہوا ہوں، جس کا اندازہ مجھے ان کے حلیے، زبان اور لب و لہجے سے ہوا تھا لیکن اب آنکھ کھلی تو گویا ایک اور ہی جہاں دیکھ رہا تھا۔

ایک جگہ بندھے ہوئے رہنے سے مجھے خود بھی سخت کوفت ہو رہی تھی۔ میں منتظر تھا کہ میری بھی کسی کے سامنے پیشی ہو تا کہ حالات کا کچھ علم ہو سکے۔ مذکورہ قیدی سے کچھ امید بندھی تھی اور اس کی باتوں سے اندازہ بھی ہوا کہ وہ ان ''نامعلوم'' افراد یا ''گروہ'' کے بارے میں کچھ جانتا بھی تھا لیکن وہ نجانے کیوں میرے سامنے اپنی زبان کھولنے سے کترائے ہوئے تھا۔

میرے پاس اب انتظار کے سوا اور چارہ بھی کیا تھا۔ تاہم پریشانی سے بڑھ کر مجھے اس بات پر تشویش ضرور ہو رہی تھی کہ عابدہ کا معاملہ کھٹائی میں پڑ سکتا تھا۔ اس کی پیشی میں دن ہی کتنے رہ گئے تھے اور اس کے حق میں گواہی دینے کے سلسلے میں میری کوششیں اکارت جاتی دکھائی دے رہی تھیں۔

عابدہ کو سزا اور امریکا کی بھیانک جیل میں جانے سے بچانے کے لیے میں کچھ نہیں کر پایا تھا اب تک، اس پر مستزاد میں خود غیر یقینی حالات کا شکار ہو گیا تھا۔ میرا اپنا کچھ پتا نہیں تھا کہ میں کن لوگوں کی قید میں تھا اور ان کا مقصد کیا تھا۔

مجھے عابدہ کو سزا ہونے کے تصور سے ہی ہول آرہا تھا۔ اس کے بارے میں سوچ سوچ کر میرا دماغ پگھلنے لگا اور مجھے کسی طور قرار نہیں مل رہا تھا۔ کبھی دماغ میں آتش فشانی کی سی کیفیت طاری ہونے لگتی تو کبھی بے بسی کے مارے میرا دیواروں سے سر ٹکرانے کا جی کرتا۔ نجانے میں کن لوگوں کی قید میں تھا اور وہ مجھے کہاں اور کس اجنبی سرزمین کی طرف لے جانے کا قصد کیے ہوئے تھے؟

کمرے میں کوئی وال یا ٹیبل کلاک مجھے کہیں نظر نہیں آرہا تھا کہ جس سے مجھے وقت کا اندازہ ہو پاتا۔ جبکہ اس تکون کمرے کی دیوار پر بنے واحد کھڑکی نما پورٹ ہول کے پار مجھے ہنوز نیم اندھیرے کے سوا کچھ نہیں دکھائی دے رہا تھا، جس سے یہ اندازہ تو ہو ہی جاتا کہ وقت رات کا ہی ہے۔

بہرکیف...... میرے پاس انتظار کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا سو میں دوبارہ اپنے بنک بیڈ پر ٹک کر بیٹھ گیا۔ میں نے اپنے ہاتھوں کی زنجیر کا جائزہ لیا، وہ ایک اندرونی قفل کے ذریعے بندھی ہوئی تھی جسے چابی سے ہی کھولا جا سکتا تھا، یعنی اس کے ساتھ زور آزمائی کرنے کی کوئی گنجائش نہ تھی ماسوائے ہتھوڑی کی ضربات کے، جس کا حصول مجھے ابھی ناممکن ہی نظر آرہا تھا۔

اس وحشی خلاصی کو قیدی سمیت گئے میرے اندازے سے بیس پچیس منٹ ہوئے تھے کہ اچانک دروازے پر آہٹ کی آواز ابھری۔ میرا دل دھڑکا کہ شاید اب ''پیشی'' میری تھی۔ مگر میں اسی طرح بیٹھا دھڑکتی نظروں سے دروازے کی طرف تکتا رہا۔ دروازہ کھلا اور وہی موٹا تازہ غصیلا خلاصی نمودار ہوا، وہ اکیلا ہی تھا۔

''نیچے اترو......'' دروازے سے اندر داخل ہوتے ہی وہ میری طرف گھورتے ہوئے کرخت لہجے میں بولا۔ میں نے فوراً اس کے حکم کی تعمیل کی، یہ حکم صادر کرنے تک وہ میرے قریب آکر ہتھکڑی نما زنجیر میں چابی ڈال کر اسے کھولنے لگا۔ میرے جی میں تو آئی کہ ہاتھ کھلتے ہی میں اس پر قابو پانے کی کوشش کروں لیکن ابھی یہ سب قبل از وقت ہی ہوتا۔ کیونکہ مجھے یہاں کہ حالات اور ''تیرتے'' محل وقوع کا پوری طرح اندازہ نہ تھا۔ ایک اور بات میرے لیے اچنبھے کا باعث تھی۔ خلاصی ابھی تک مجھے غیر مسلح نظر آرہا تھا۔ جس سے ظاہر... ہوتا تھا کہ اسے اپنی ''راجدھانی'' کا کچھ زیادہ ہی زعم ہے۔

میرے دونوں ہاتھ آزاد کرتے ہی اس نے مجھے

آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔ میں نے دروازے کی طرف قدم بڑھا دیے۔ کمرے سے نکلا اور ایک اوپن ٹاپ راہداری میں آگیا...... تب ہی ایک خوشگوار سی مگر قدرے خنک سمندری ہواؤں کے جھونکے نے میرا استقبال کیا۔ میری وزدیدہ نظریں بڑی تیزی سے اطراف کا جائزہ لینے لگیں۔ منظر ڈھلتی شام کا ہی تھا۔ میں دنگ رہ گیا...... سمجھا تو میں یہی تھا کہ میں کسی چھوٹی موٹی لانچ پر ہوں مگر...... یہاں تو میرے سامنے ایک سپر ٹاپ لگژری بوٹ (YACHT) کا منظر تھا۔ یہ ایک خاصی بڑی کشادہ اور آرام دہ سفری کشتی تھی، جسے ایڈونچر پسند طویل سفر میں استعمال کیا کرتے ہیں۔ اس میں ایک پورے گھر جیسا آرام اور ضرورت کی ہر اشیا موجود ہوتی ہے۔

یک منزلہ یہ بوٹ سفید اور نیلے رنگ کی تھی۔ ہم آگے بڑھ رہے تھے۔ جلد ہی ہم راہداری سے منسلک ایک اسٹین لیس اسٹیل کی نیم گردشی سیڑھیوں کے قریب پہنچے تو اس بحری قذاق نما خلاصی نے مجھے درشت آواز میں اسی کی جانب بڑھنے کا کہا۔ میں اپنا ایک ہاتھ اس کی دھاتی ریلنگ پر رکھے قدم طے کرنے لگا۔

تھوڑی دیر بعد میں اوپر ایک کھلے اور کشادہ سے عرشے پر تھا۔ عرشہ بھی کیا تھا، یوں لگتا تھا جیسے میں کسی دور افتادہ دل فریب جزیرے کے ساحل پر بنے دیدہ زیب ہٹ کی چھت پہ آگیا ہوں۔ بوٹ مناسب رفتار سے کھلے پانیوں میں رواں دواں تھی۔ بیکراں سمندر میں جھکتی شام کا یہ منظر دل فریب معلوم ہوتا تھا۔

بوٹ کا ڈیک بقعۂ نور بنا ہوا تھا۔ یہاں کچھ فینسی لائٹس بھی لگی ہوئی تھیں۔ میرے دائیں جانب بوٹ کا نیم قوس کی صورت میں شیشے کا بونٹ پھیلا ہوا تھا، جس کی خوب صورت ونڈ اسکرین کے پس منظر میں مجھے لمبے چوڑے پینل کے پار ایک آرام دہ نشست گاہ دکھائی دے رہی تھی۔ وہاں ہلکی سبز روشنی تھی، اعلیٰ درجے کا فرنیچر سجا تھا۔ اس کی چھت پر ریلنگ کے سہارے مجھے دو سانولے بدن کی طرح دار حسینائیں کھڑی دکھائی دیں۔ وہ انڈین لگ رہی تھیں مجھے۔ وہ اوپر سے نیچے اور سامنے اطراف میں پھیلے بیکراں سمندر کا نظارہ کرنے میں مصروف تھیں، ایک نے میری... طرف دیکھ کر ایک فضائی بوسہ بھی اچھال دیا تھا، اور پھر دونوں ہی کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔

سامنے نیم دائرے کی صورت میں مختصر سا فولڈنگ فرنیچر بچھا ہوا تھا جو کرسیوں اور ایک میز پر مشتمل تھا۔ وہاں میں نے ایک نیکر پوش گینڈے کو بیٹھے دیکھا۔ میں اسے گینڈا ہی کہوں گا، جو اپنی جسامت میں ایسا ہی نظر آرہا تھا۔ خوب گٹھے ہوئے مگر ٹھوس نظر آنے والے جثے کے علاوہ اس کی پیشانی پہ عین درمیان ایک بڑا سا گومڑ بھی نکلا ہوا تھا۔ میں نے ایسے لوگ دیکھ رکھے تھے، جن کی گردن کے پیچھے گدی پر یا سامنے کی طرف تھیلی نما (sac) گلہڑ جھولتا رہتا تھا۔ کسی کے چھوٹے گومڑ کی صورت میں عین پیشانی پر بنا ہوتا تھا۔ اس کی معمولی سرجری کروالی جاتی تھی مگر مستقل طور پر یہ ختم نہیں ہوتا تھا، کچھ عرصے بعد یہ دوبارہ پیشانی پر ابھر آتا تھا۔

اس کا سر گنجا تھا، رنگ قدرے سانولا۔ آنکھیں چھوٹی اور گول تھیں، ناک کچھ چپٹی اور ہونٹ ذرا پتلے تھے، بادی النظر میں مجھے اس کی شبیہ میں منگول نسل کی جھلک صاف محسوس ہوئی تھی۔

اس نے اپنے ٹھوس اور کسرتی جسم پر فقط نیکر اور اوپر صدری نما کوئی شے پہن رکھی تھی۔ اس کے بازوؤں کی مچھلیوں کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ یہ بھرپور جسمانی قوت کا بھی حامل ہوگا۔ اس کے سامنے میز پر ایک بوتل اور دو پیگ رکھے ہوئے تھے۔ ایک خالی تھا، دوسرا ادھ بھرا۔ تین چار خلاصی اس کے دائیں بائیں بظاہر بے پروا انداز میں کھڑے ہوئے تھے۔ باقی چند دوسرے اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ چند ایک کو میں نے آنکھوں سے دوربین لگائے دور سمندر کی وسعتوں میں جھانکتے ہوئے مصروف بھی دیکھا۔

ایک بات پر مجھے حیرت ہوئی تھی کہ ان میں سے کسی کے پاس بھی اسلحہ نام کی کوئی چیز تک نہیں تھی یا پھر کم از کم اس وقت مجھے تو نہیں نظر آرہی تھی۔ یہ سب مجھے کسی اور ہی قومیت کے دکھائی دے رہے تھے۔ دوسری قومیت کے یہ لوگ کہیں سے بھی ”ٹائیگر ٹیگ“ کے معلوم نہیں ہوتے تھے۔ کیونکہ جب میں ان کے (ٹائیگر ٹیگ) کے ان دو ایجنٹوں کے ہتھے چڑھا تھا تو میں نے عادت کے مطابق پہلی ہی نظر میں ان دونوں کی شکل و صورت، حتیٰ کہ لب و لہجہ تک بھی ان کی وضع قطع سمیت نوٹ کیا تھا، جو ان سے سر بہ سر مختلف تھا۔ وہ شستہ لہجے میں اور رواں انگلش بول رہے تھے اور لب و لہجے سے وہ امریکی یا برطانوی لگتے تھے لیکن یہ لوگ میرے ان سارے تجزیوں کے برعکس محسوس ہوئے تھے، لیکن سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ پھر یہ کون تھے......؟ اور میں ان کے ہتھے کیسے چڑھ گیا......؟ کہیں میں کسی کے منہ سے

چھین لیا جانے والا ''نوالہ''...... تو نہیں بن کر رہ گیا تھا؟ تاہم ابھی میں نہ جان سکا تھا اور نہ ہی یہ اندازہ قائم کر سکا تھا کہ یہ کون سے ملک کے باشندے تھے؟

مجھے وہ دوسرا ساتھی قیدی بھی نظر نہیں آیا تھا۔ نجانے انہوں نے اس بے چارے کا کیا کیا تھا؟ البتہ ایک لرزا دینے والا خیال ضرور دماغ میں ابھرا تھا کہ کہیں ان خبیثوں نے اس بے چارے کو زندہ ہی تو نہیں سمندر برد کر دیا تھا۔

بہرحال...... یہی گینڈے جیسی ساخت کا مالک شخص ہی مجھے ان کا سرغنہ دکھائی دیا تھا جس کے قریب مجھے لے جا کر کھڑا کر دیا گیا۔

وہ پہلے تو چند ثانیے اپنی برماتی نظروں سے مجھے گھورتا رہا اس کے بعد شکستہ سی انگریزی میں بولا۔

''بیٹھ جاؤ......''

اس کی آواز خاصی کھردری اور کھرکھراتی ہوئی تھی جس میں تحکمانہ عنصر صاف عیاں تھا، تاہم میں بھی اس کے چہرے پر اپنی نگاہیں جمائے اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ مجھے لانے والا اب اپنے متوقع سرغنہ کے عقب میں جا کر سینے پر ہاتھ باندھے کھڑا ہو گیا۔ اس کی بھی گھورتی نظریں میرے چہرے پر مرکوز ہو گئی تھیں۔

میں دانستہ سردست اس گینڈے سرغنہ کے بولنے کا منتظر رہا، اس کی ایکسرے کرتی نظریں بدستور میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ پھر وہ آگے کو ذرا جھکا اور بوتل سے خالی پیگ کو بھرنے لگا تو بے اختیار ہی میرے منہ سے نکلا۔

''تھینکس ......! میں ڈرنک نہیں کرتا......''

''ہم م م......'' اس کے حلق سے ابھرتی اس قلیل سی ہمکاری نما آواز میں بھی مجھے ایک سرسراتی ہوئی سنسنی کا احساس ہوا۔ تاہم اس نے پیگ بھر لیا تھا اور پھر وہی پیگ اٹھا کر اس نے اپنے گٹھے ہوئے وجود کو واپس کرسی کی پشت گاہ سے ٹکا دیا۔ ایک گھونٹ بھرنے کے دوران میں بھی وہ مجھے اپنی برماتی آنکھوں سے گھورتا رہا۔ میں بھی سنجیدگی سے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے رہا۔ گھونٹ بھرنے کے بعد اس نے مجھے میرے پورے نام سے پکارا۔

''مسٹر شہزاد احمد خان...... ! تم خود کو اب جسمانی طور پر ہی نہیں بلکہ ذہنی طور بھی ہمارے درمیان سمجھو، کیونکہ اب اسی میں ہی تمہاری بہتری اور ہمارے لیے امن ہے۔''

میں نہیں جانتا تھا کہ اس کی بات کا اصل مقصد کیا ہو سکتا ہے مگر میں اس سے جو کہنا چاہتا تھا، وہ ہولے سے کھنکھار کر بولا۔

''بہتر تو یہی تھا کہ مجھے یہ معلوم ہو کہ میں کن لوگوں کے درمیان اور کس حیثیت سے ہوں......''

میں نے اپنے تئیں بڑے نپے تلے انداز میں اس سے ٹو دی پوائنٹ بات کی تھی لیکن میں نے دیکھا کہ میری بات سن کر اس کے منگولی چہرے پر ایک تندی کی لہر ابھری، اس کی تنگ گول پیشانی شکنوں سمیت سکڑ سی گئی اور آنکھوں میں کرختگی نمایاں ہونے لگی مگر میں نے بھی اس کے ان تاثرات کا کوئی نوٹس لیے بغیر اپنے چہرے سے کسی بھی قسم کا کوئی ڈر، خوف ابھرنے نہیں دیا۔

میری ایک ہی بات نے اسے جیسے ہتھے سے اکھاڑ ڈالا اور اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ اس نے طیش ناک انداز میں اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا پیگ میز پر پٹخنے کے انداز میں رکھا تو جام چھلک کر میز پر پھیلنے لگا جبکہ بلوریں پیگ ہلتی میز کی سطح پر پڑا ہنوز اس کے ہتھوڑے جیسے ہاتھ کی مٹھی میں دبا رہا اور وہ خود بھی اسی انداز میں تھوڑا جھکا رہتے ہوئے میری جانب خونخوار سی نظروں سے گھورتا رہا۔ میں نے تب بھی کسی قسم کی گھبراہٹ یا بوکھلاہٹ کا تاثر ظاہر نہیں ہونے دیا تھا اور اسی طرح اطمینان سے جما کرسی پر بیٹھا اسے تکتا رہا۔ وہ شاید اپنی منگولوں والی فطرت پر اترنے لگا تھا۔

''آئندہ ہم سے کوئی سوال کرنے کی جرأت مت کرنا...... گریٹ ماسٹر کا ایک ہی قول ہے، جو قیدی یا مفتوح سوال کرے اس کی زبان کاٹ کر پھینک دو۔'' بھیڑیے جیسی غراہٹ تلے یہ کہتے ہوئے اس نے اسی طرح جھکے جھکے انداز میں اپنے نیکر کے اندر سے ایک عجیب طرح کا چاقو نکالا، عجیب اس طرح کہ چاقو کا پھل دودھاری تھا۔ ایک طرف تو تیز چمکتی دھار تھی تو دوسری کانٹے دار۔ نجانے اس نے کس کو ''گریٹ ماسٹر'' کہا تھا جس کے قول کا پاس نہ کرتے ہوئے اس نے میرے ساتھ بڑا احسان جتایا تھا۔ لمحہ بھر کو متوقف ہونے کے بعد وہ قدرے سیدھا ہوا تو اس نے جام بھی اٹھا لیا جو اس نے ابھی تک اپنی غصے سے بھینچی ہوئی مٹھی کی گرفت سے نکالا نہیں تھا۔ چھلکنے کے بعد وہ نصف رہ گیا تھا۔

''بہتر ہے۔'' میں نے مصلحتاً ہولے سے مفاہمانہ انداز میں کہا۔ وہ سیدھا ٹک کر بیٹھ گیا اور اسی کرختگی کے انداز میں بولا۔

''آئندہ محتاط رہنا۔'' کہتے ہوئے اس نے وہسکی کا ایک اور گھونٹ بھرا۔ میرے اس طرح تحکمانہ انداز میں

بولنے سے اس کی نجانے کون سی جبلّت کی تسکین ہوئی تھی لیکن مجھے یہ آگاہی مل گئی تھی کہ مجھے مفتوح رہتے ہوئے اس کی کون سی کمزوریوں سے کھیلنا ہے۔ کیونکہ میں ابھی تک اندھیرے میں تھا۔ مجھے ایک ذرا بھی ان کے بارے میں اندازہ نہیں ہو پایا تھا۔

''گڈ! مجھے بھی انداز پسند ہے۔'' وہ بولا۔ میں بھی اس کی طرف دیکھ کر ہولے سے مسکرایا اور بلی کے تھیلے سے باہر نکلنے کا بے چینی کے ساتھ منتظر رہا۔

''تم سب سے پہلے خود کو ہمارا قیدی ہی سمجھو اور اس سے زیادہ مال مسروقہ بھی۔ تمہاری بیک وقت یہی حیثیت ہے لیکن ساتھ ہی تمہیں ہمارا احسان مند بھی ہونا چاہیے کہ ہم نے تمہیں ایک بڑی مصیبت میں پھنسنے سے بھی بچالیا ہے، دوسرا احسان تمہیں ہمارے گریٹ ماسٹر کا یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس نے ہمیں تمہارے سلسلے میں خصوصی طور پر یہ ہدایات بھی دی ہیں کہ تمہیں ہماری قید میں کسی قسم کی کوئی بھی تکلیف نہ ہونے پائے مگر یہ بھی یادرہے کہ گریٹ ماسٹر کی تمہارے سلسلے میں یہ رعایت مکمل طور سے مشروط ہے، اس وقت تک جب تک تم ہم سے تعاون کرتے رہوگے، یعنی چپ چاپ ہمارے حکم کی تکمیل اور بس......''

''اس کے لیے میں تمہارے گریٹ ماسٹر کا مشکور رہوں گا اور میری کوشش بھی یہی ہوگی کہ اس نے میرے سلسلے میں جو شرط رکھی ہے اس سے مستفید ہوتا رہوں۔''

میں نے اندر سے بڑے کڑے اور بظاہر حتمی انداز میں کہا۔ یہ کہتے ہوئے زندگی میں پہلی بار مجھے اپنی عزتِ نفس کے مجروح ہونے کا بھی بڑی شدت سے احساس ہوا تھا۔ کسی کے آگے اس قدر تعمیل میں جھک جانا میرا شیوہ نہیں تھا لیکن حقیقت بھی یہی تھی کہ میں اس سے پہلے اس طرح کے غیر یقینی حالات سے دوچار نہیں ہوا تھا۔ میرے پیروں تلے اول تو زمین ہی نہیں تھی، تھی بھی تو بحرِ رواں پر، جس کی سرحدوں اور ساحلوں کا مجھے کچھ بھی اندازہ نہیں تھا۔

اپنے دیس کی سرحدوں میں ہونے کی اور بات ہوتی ہے، اور باہر اور...... اسی لیے...... پل کے پل ان سارے معاملات کا ادراک کرتے ہوئے میں نے بھی حسبِ حالات اپنے اوپر سے جنگجو شہزری کا لبادہ اتار پھینکا تھا۔ یہ انداز عارضی تھا۔ حالات اور اپنے دفاع کا جہاں اور جیسے بھی ادراک ہوتا...... میں پھر پیچھے ہٹنے اور جھکنے والا نہیں تھا۔ کیونکہ سرحد پار ہونے کا میرے نزدیک ایک اندازہ یہ بھی تھا کہ...... میں جلد بہ دیر عابدہ کے قریب ہونے والا ہوں۔

''نخ...... نخ...... نخ'' میری بات پر اس نے پیگ والا ہاتھ اپنے پیچھے ہاتھ لپیٹے کھڑے ساتھی کی طرف اونچا کیا، اس نے فوراً اس کے ہاتھ سے پیگ لے کر اپنے ہاتھ میں تھام لیا تو گینڈے نے اپنے دونوں ہاتھوں سے تالیاں بجائیں، پھر اس بار اپنا خالی ہاتھ اونچا کیا تو عقب میں کھڑے اسی خلاصی نے مؤدبانہ انداز میں دوبارہ اسے وہ پیگ تھمادیا۔

''مجھے...... سے جی کوہارا...... کہتے ہیں......'' کہتے ہوئے اس نے اپنا ایک ہاتھ مصافحے کے لیے میری جانب بڑھایا اور میں نے بھی گویا طوعاً و کرہاً اپنا ایک ہاتھ اس کی طرف بڑھادیا۔ مجھے اعتراف تھا کہ اس کا ہاتھ گرفت میں لیتے ہی مجھے اس کے گینڈے جیسے توانا بدن میں ٹھاٹھیں مارتا، طاقت و توانائی کا ایک سمندر موجزن محسوس ہوا تھا۔ اس خنک موسم میں بھی اس کے ہاتھ کی گرفت میں ایک گرمی کا احساس اس کی رگوں میں دوڑتے لہو کی گرماہٹ کا پتا دیتی تھی، جسے لپکنے جھپکنے اور پلٹ کر جھپٹنے...... جیسے بہانوں کی چنداں ضرورت نہیں ہوتی۔

اس کا نام مجھے اس کی ہیئت کی طرح عجیب ہی محسوس ہوا تھا...... سے جی کوہارا...... یہ کس خطے کے باشندے کا نام ہوسکتا تھا؟ میں اندازہ ہی لگاتا رہ گیا مگر جانے کیوں مجھے ساتھ ہی یہ احساس بھی ہو چلا تھا کہ میں اس سے کسی کم خطرناک صورتِ حالات کا شکار بھی نہیں ہوں...... بہت سنبھل کر، بالفاظ دیگر پھونک پھونک کر قدم اٹھانا تھا مجھے۔

ایک بھرپور مصافحے کے بعد ہم دونوں ہی اپنی کرسیوں کی پشت گاہوں سے ٹیک کر سیدھے ہو کے بیٹھ گئے تھے۔ کسی قسم کی جلد بازی میرے لیے نقصان دہ ثابت ہوسکتی تھی، جبکہ مجھے اپنے بجائے اس کے منہ کے ''کھلنے'' کا انتظار بڑے صبر و استقامت سے کرنا تھا۔ دشمن اس بار نجانے کس انداز میں اور اپنی پوری قوت کے ساتھ مجھ پر حاوی ہو چلا تھا، اور مجھے اس کی ''سائیکی'' کو سمجھ کر آگے بڑھنا تھا، اسٹیپ بائی اسٹیپ۔

لہٰذا میں خاموش رہا اور بظاہر بے پروا انداز میں اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے بولا، مقصد اسے اب میرا یہ جتانا تھا کہ مجھے کچھ ''جاننے'' کی مطلق پروا نہ تھی۔

''یہ کشتی بہت خوب صورت ہے...... خاص طور پر......'' آخر میں یہ کہتے ہوئے میں نے دوبارہ تھوڑا سر اٹھا

کر کیبن کی چھت کی ریلنگ کے ساتھ لگی کھڑی ان دونوں نیم عریاں انڈین لڑکیوں کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا۔ یہ حرکت میں نے دانستہ اسے کچھ دکھانے اور اپنے آپ پر باور کرانے کے لیے کی تھی۔ میں نے دیکھا تھا کہ وہ بڑی گہری نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں اپنی طرف سے اس کی آنکھوں اور پیشانی پر الجھن آمیز سلوٹیں ابھارنے میں کامیاب رہا تھا۔ اس میں کوئی شک نہ تھا کہ میرے بارے میں اسے بہت سی باتوں کے سلسلے میں پہلے ہی سے ''بریفنگ'' دے دی گئی تھی۔ میرا مزاج، فطرت اور وہ سب کچھ جس سے میرے دیدہ و نادیدہ دشمن کسی نہ کسی حوالے سے واقف تھے۔ یہی سبب تھا کہ اس کی آنکھوں میں تیرنے والی الجھن اور پیشانی پر پڑنے والی سلوٹیں اسے ملنے والی ''بریفنگ'' کی نفی کرتی محسوس ہوئی ہوں گی۔

''تم عورتوں میں دلچسپی لینے والے تو نہیں لگتے......''

اس نے شاکی نظروں سے میری جانب دیکھا اور میں چونکا۔ اس کی بات میرے لیے خلافِ توقع تھی، یوں تو اس کا غصیلا مزاج ایسے ہی لوگوں جیسا تھا جو بات بات پر یکدم بھڑک اٹھتے ہیں، اور ایسے ہی لوگوں کے بارے میں میرا ذاتی خیال تھا کہ وہ عاقل بھی ہوتے ہیں مگر ان کی غصہ ور طبیعت ان کی عقل کے آگے مانع رہتی ہے۔ اسی لیے مجھے توقع نہ تھی کہ وہ بہت جلد میرے بارے میں اس طرح کی بات کر ڈالے گا۔ میں نے بات بناتے ہوئے جھینپی جھینپی مسکراہٹ سے کہا۔

''انسان کا مزاج بدلتے ہوئے موسموں جیسا ہی ہوتا ہے، مسٹر سے جی کوہارا......! ویسے پوچھ سکتا ہوں کہ آپ نے کیسے میرے بارے میں ایسا شریفانہ اندازہ قائم کرلیا......؟''

''تم بہت دلچسپ آدمی ہو......'' وہ پہلی بار مسکرا کر دوستانہ انداز میں بولا۔ ''بات تمہاری بھی ٹھیک ہی ہے...... ویسے اندازہ میں نے یہ دیکھ کر لگایا تھا کہ تم شراب کو چھوتے بھی نہیں اور ذوق رکھتے ہو شباب کا......''

میں اس کی بات پر لاحول ہی پڑھ سکتا تھا جو اس طرح کی خرافات کو ''ذوق'' کہہ رہا تھا لیکن مجھے تو اس کی ہاں میں ہاں ملانی تھی اور ساتھ ہی اپنی ''حیثیت'' کو بھی مدِنگاہ رکھتے ہوئے پھونک پھونک کر قدم اٹھانا تھا۔

''بعض لوگ یہ دونوں ذوق رکھتے ہیں اور کچھ لوگ صرف ایک......'' با دلِ ناخواستہ مجھے بھی اس طرح کی بدذوقی کی سطح میں اترنا پڑا...... ٹھیک اسی وقت ایک خلاصی نما کارپرداز اس کی طرف آیا۔ اس نے ہاتھ میں سنگل لینس ٹیلی اسکوپ تھام رکھی تھی۔ وہ مودبانہ انداز میں اس کے کان کی طرف تھوڑا جھکا اور نیچی آواز میں اس سے کچھ کہا۔ میں نے کان دھرنے کی سعی چاہی مگر زبان میرے لیے اجنبی تھی۔ کوہارا کو میں نے اٹھ کر کھڑے ہوتے دیکھا۔ اس نے نووارد کے ہاتھ سے دوربین لی اور ڈیک کی ریلنگ کی طرف چلا گیا۔ پھر اپنی ایک آنکھ سے لگا کر دور سمندر کی وسعتوں کی طرف کچھ دیکھتا رہا...... پھر اس نے اپنے اسی آدمی کی طرف بڑھ کر، جو تکون کمرے سے مجھے لایا تھا، سے تحکمانہ انداز میں کچھ کہا، اس نے جواباً مودبانہ انداز میں اپنے سر کو اثباتی جنبش دی تھی اور وہ آدمی فوراً کیبن کی طرف جانے والے ایک گلیارے کی طرف بڑھ گیا۔ اس اثنا میں کوہارا اپنی کرسی کی طرف آیا مگر بیٹھا نہیں۔ اس کے چہرے پر گمبھیرتا طاری تھی، اسے اپنی جانب تکتا پا کر میں بھی اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

''ہمارے کچھ دوست مہمان یہاں پہنچ رہے ہیں...... تمہیں یقیناً اُن سے مل کر کوئی خوشی تو نہیں ہوگی لیکن...... اس میں تمہارا فائدہ ہی ہوگا۔'' اس نے اسی لہجے و انداز میں مجھ سے کہنا شروع کیا اور جانے کیوں مجھے اپنے وجود میں نامعلوم سی سرسراہٹ کا احساس ہونے لگا۔

''لیکن معاملہ ایک ڈیل کا ہے...... تمہارے کسی نقصان کے بغیر...... مگر شرط وہی ہے جو گرینڈ ماسٹر اور اس کے دوست چاہتے ہیں، یعنی تعاون اور تعمیل...... دیٹس اِٹ۔''

''بہت بہتر......'' میں نے اپنے سر کو خفیف سی جنبش دی۔

''گڈ......'' اس نے چہک کر اپنی باچھیں پھیلا دیں۔ اس کم بخت نے دھونس دھمکی سے مجھے اپنا ''معمول'' بنالیا تھا اور ظاہر ہے میں بھی اس وقت تک ہی مجبور تھا جب تک کہ مجھے حالات کا صحیح طرح ادراک نہیں ہوجاتا۔ کیونکہ اس بار میں یکسر مختلف حالات سے دوچار تھا...... جو غیر یقینی اور اپنے ہی خطرناک بھی معلوم ہوتے تھے۔

''بیٹھ جاؤ......'' اس نے کہا اور خود بھی اپنی کرسی سنبھال لی۔ تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ کہیں سے بگل کی آواز ابھری۔ ساتھ ہی لہروں کے شور کے سنگم میں کسی بھاری انجن کی گھرگھراتی آواز بھی سنائی دی تھی۔ شاید اس کے دوست مہمان پہنچ گئے تھے۔ کوہارا اسی طرح اطمینان سے بیٹھا شغل کرتا رہا، جبکہ میرا سکون غارت ہوگیا تھا۔

بگل بجتے ہی عرشے پہ ہلچل سی مچ گئی۔ تب ہی مجھے کوہارا کے عقب میں ڈیک کی ریلنگ کے پار کسی لانچ کا... مستول اور اوپری حصہ حرکت کرتا دکھائی دیا۔ ایک نسبتاً بلند مستول پر مجھے جس ملک کا پھریرا لہراتا نظر آیا، اسے دیکھ کر میں بری طرح ٹھٹکا اور ساتھ ہی جسم میں سنسنی دوڑتی چلی گئی۔

وہ مخصوص پھریرا انڈین نیول آرمی کا تھا۔ جس کا مطلب تھا کہ میں بحر عرب یا بحر ہند کے کسی سی چینل پر اور انڈیا کے ساحل کے قریب تھا۔ صورتِ حال کچھ کچھ اپنی تمام تر خطرناکی کے ساتھ مجھ پر آشکارا ہونے والی تھی، سب سے پہلے تو یہ حقیقت واضح ہوئی تھی کہ میں کہاں تھا، دوسرے یہ کہ انڈین نیول آرمی کا پرچم دیکھ کر میرے ذہن میں بلیو تلسی کے کرنل سی جی بھگوانی کا تصور ابھرا تھا اور یہ دونوں ہی حقیقتیں کم از کم میرے حق میں نہیں تھیں۔

''تمہارے مہمان آگئے ہیں شاید۔'' میں نے ہولے سے کہا۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں بھی چپ رہا۔ البتہ میرے سینے میں ہلچل سی مچی ہوئی تھی، اس میں کیا شک تھا کہ آنے والے یہ ''مہمان'' مجھے جانتے تھے اور میرے لیے ہی یہاں آئے تھے۔

مزید تھوڑی دیر اسی ہلچل میں گزری اور پھر میں نے دیکھا...... جس گلیارے میں کوہارا...... کا پہلے والا کارپرداز غائب ہوا تھا وہیں سے وہ دوبارہ نمودار ہوا تو اس کے ہمراہ تین افراد اور بھی تھے جو بہترین تراش کے سوٹ میں ملبوس تھے۔ سے جی انہیں دیکھ کر اطمینان بھرے انداز میں کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا، جبکہ میں دھڑکتے دل کے ساتھ اپنی کرسی پر جما بیٹھا رہا۔ بلیو تلسی اور کرنل سی جی بھگوانی کا مکروہ تصور ذہن میں ابھرتے ہی میرے اندر کا جنگجو شہزی بیدار ہونے لگا تھا۔

یہ وہ ذلیل لوگ تھے جنہوں نے میرے باپ پر تشدد کے پہاڑ توڑ ڈالے تھے، میں ان خبیثوں کو کیسے معاف کرسکتا تھا۔ اب مجھے تقدیر کے اس ''بہانے'' پر یقین آرہا تھا کہ وہ مجھے اس طرح حادثاتی طور پر ہی سہی، اپنے ملک کی سرحد سے دور کرکے کون سے کام لینا چاہتی تھی۔

کوہارا ان کے استقبال کے لیے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا مگر میں نے اپنی کرسی نہیں چھوڑی تھی اور بدستور اسی طرح اپنی جگہ جما بیٹھا ان تینوں کی جانب دیکھے جارہا تھا۔ ان میں دو مرد اور ایک عورت تھی۔ ایک مرد خاصا پختہ عمر اور خاکستری رنگت، چوڑے شانوں والا درمیانہ قامت تھا، سر بیچ سے گنجا اور قلمیں بڑھی ہوئی تھیں جہاں سفیدی جھلک رہی تھی۔ اس نے سفید براق رنگ کا سوٹ پہن رکھا تھا، جبکہ دوسرا مرد نسبتاً قدرے دراز قامت اور جوان تھا۔ اس کا رنگ گندمی تھا۔ چہرے کے نقوش خوبرو تھے، صحت اچھی تھی، اور لڑکی بھی جوان اور خاصی حسین نظر آتی تھی۔ اس کے سیاہ بال شانوں پر سمندری ہواؤں میں لہرا رہے تھے۔ چہرہ اس کا کتابی تھا۔ اس نے اپنی دلنشیں آنکھوں پر سیاہ نفیس فریم والی عینک چڑھا رکھی تھی جو اس کے صورت خوب چہرے پر جچ رہی تھی۔ اس کی عمر کا اندازہ مجھے چوبیس پچیس سال سے زیادہ کا نہیں محسوس ہوتا تھا۔

جوان مرد اور اس لڑکی نے سیاہ رنگ کا سوٹ پہن رکھا تھا۔ لڑکی بھی کوٹ سوٹ میں جچ رہی تھی۔ وہ قریب آئے تو تینوں ہی میری جانب بڑے غور سے دیکھنے لگے، پختہ عمر کا آدمی مجھے خاصا خرانٹ محسوس ہوا جبکہ جوان مرد اور عورت خاصے چالاک اور تیز دکھائی دے رہے تھے۔

''ہائے گائیز...... ویل کم ٹو مائی بوٹ!'' کوہارا نے ان کے استقبال کے لیے اپنے دونوں بازو پھیلاتے ہوئے دوستانہ خوشدلی سے کہا اور باری باری انہوں نے ایک دوسرے سے مصافحہ کیا۔ خرانٹ مرد اب کی بار خاصی تیز نظروں سے مجھے گھورنے لگا تھا جبکہ جوان مرد کی چابک دست نظریں تیزی سے اب اطراف میں گردش کررہی تھیں اور لڑکی مجھے عجیب سی نگاہوں میں لیے ہوئے تھی۔

ان لوگوں کے درمیان مختصر سے رسمی کلمات کا تبادلہ ہوا اور پھر اسی وقت کوہارا نے گردن موڑ کر میری طرف دیکھا تھا اس کے میری طرف دیکھنے کے انداز میں گھورنے کا عنصر محسوس کرکے ناچار میں نے بھی اپنی کرسی چھوڑ دی اور اپنے حلق سے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا مگر میں نے ان تینوں سے ملنے کی کوشش کی نہ ہی مصافحے کے لیے ان کی طرف اپنا ہاتھ بڑھایا۔ تب ہی کوہارا نے ان سے تعارف کے طور پر فقط میرا نام بتایا اور آخر میں ان کا تعارف کراتے ہوئے مسکراتے ہوئے بولا۔

''ان سے ملو مسٹر شہزاد......! یہ چندر ناتھ ہیں۔'' اس نے اسی سفید سوٹ پوش اور پکی عمر کے آدمی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا اور پھر اس کے ساتھ کھڑے نسبتاً جوان مرد کا بھی تعارف کرایا، جس کا نام شیام پانڈے تھا جبکہ عورت کا مس کوریلا بتایا گیا تھا۔

میں نے ان کی طرف دیکھ کر کوئی جنبش نہیں کی تھی مگر پکی عمر والے چندر ناتھ نے اپنی گول گول چندی آنکھوں

سے گھورتے ہوئے اپنا ہاتھ مصافحے کے لیے میری طرف بڑھا دیا، اس کی نظریں بالکل سپاٹ تھیں، ناچار مجھے بھی اس سے ہاتھ ملانا پڑا، پھر باری باری اسی طرح مجھ سے اس کے باقی دونوں ساتھیوں نے بھی ہاتھ ملایا۔

چند ثانیوں بعد کوہارا نے مجھ سمیت اپنے مہمانوں کو اندر کیبن میں چلنے کا کہا۔ جبکہ اس کا ہم زبان و ہم نسل کارپرداز، ہم سے ذرا دیر پہلے ہی واپسی کے لیے مڑ چکا تھا، اور ہم پانچوں گلیارے سے گزرتے ہوئے اندر ایک کشادہ کیبن میں آ گئے۔

کیبن کی شان ہی نرالی تھی۔ مجھے ایسا لگا تھا جیسے میں کسی عالیشان کوٹھی کے پُرتعیش ڈرائنگ روم میں آ گیا ہوں۔ اس کی سج دھج ہی کسی بیش قیمت محل کی آرام دہ اور کشادہ نشست گاہ سے کیا کم ہو گی۔

ضرورت کی کیا شے تھی جو وہاں موجود نہ تھی۔ اعلیٰ درجے کا فرنیچر، گول اور قدرے بیضوی چھت سے جھولتا فانوس، فینسی لائٹیں، ایک طرف بار کاؤنٹر بنا ہوا تھا، وہاں کوہارا کا ایک آدمی وہسکی اور پیگ نکالنے میں مصروف ہو گیا تھا۔ کھڑکیوں کے دیدہ زیب پردے سرکے ہوئے تھے جہاں سے باہر تاریک پڑتے سمندر کا نظارہ تھا۔

ہم سب وہاں نیم دائرے کی صورت میں بچھے فرنیچر پر براجمان ہو گئے۔

اس دوران میں باری باری ان تینوں کے بشروں کا بھی جائزہ لے رہا تھا۔ لڑکی کی آنکھوں میں مکاری مگر دلآویز لبوں پر معنی خیز سی مسکراہٹ رقصاں تھی، اس میں بھی میرے لیے کسی طنز کا عنصر ہی غالب نظر آیا تھا مجھے، جبکہ اس کے ساتھی جوان مرد کا چہرہ سپاٹ تھا البتہ چندر ناتھ کے چہرے پر سنجیدگی اور قدرے ناگواری کے تاثرات تھے، اور یہ ابھی اچانک ہی اس کے چہرے پہ نمودار ہوئے تھے، اس کی وجہ کا مجھے کچھ اندازہ تو تھا مگر تھوڑی ہی دیر بعد مجھے اپنے اس قیاس کی تصدیق بھی ہو گئی۔ وہ ہم سے پہلے وہاں موجود تھا۔

سے جی کوہارا کا وہ خاص اور ہم نسل کا کارپرداز جس کا نام مجھے بھوبک معلوم ہوا تھا، کیونکہ اسی وقت کوہارا نے اسے اپنی زبان میں آواز دے کر بلایا تھا اور ساتھ ہی ایک مخصوص اشارہ بھی کیا تھا، وہ فوراً اس کے قریب آ کر رکوع کے بل اس کی بات سننے کے لیے جھک گیا اور نجانے پھر کوہارا نے اس سے کیا کہا تھا۔ وہ مودّبانہ انداز میں اپنے سر کو اثباتی حرکت دیے پلٹ کر کیبن نما اس پُرتعیش نشست گاہ سے نکلتا چلا گیا۔

''میرا خیال ہے بات کر لی جائے سی جی بھجوانی صاحب سے......؟''

دفعتاً کوہارا نے چندر ناتھ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور کرنل بھجوانی کا ذکر سنتے ہی میرے اعصاب شل ہونے لگے...... دل کی دھڑکنیں جو پہلے ہی موجودہ حالات پر بے طرح بے ترتیب تھیں۔ اب کوہارا کے منہ سے اس خبیث کا نام سن کر بتدریج مجھے اپنے ان اندیشناک خیالات کی ازخود ہی تصدیق ہونے لگی تھی، جس سلسلے میں کچھ پوچھنے سے کوہارا نے مجھے سختی بلکہ درشتی سے منع کر رکھا تھا۔ تاہم میں اپنی اندرونی کیفیات پر قابو پائے خاموش بیٹھا رہا کہ اور مزید جانے کیا کیا کچھ پردۂ غیب سے سامنے آنے والا تھا۔

''مسٹر کوہارا......!'' چندر ناتھ نے جواباً ایک نظر غلط سی میرے چہرے پہ ڈالتے ہوئے اس سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''پہلے ہمیں یہ تو پتا چلے کہ یہ یہاں ہے کس حیثیت سے؟''

میں نے دیکھا، اس کی بات پر کوہارا کے چہرے پہ پہلے چونکنے اور پھر قدرے بدمزگی کے تاثرات ابھرے جس پر اس نے ہلکی مسکراہٹ کی ملمع کاری سجاتے ہوئے کہا تو اس کے جملوں اور لہجے میں ایک طرح کے دبنگ اور دبدبے کا عنصر غالب تھا۔

''یہ یہاں اسی حیثیت سے ہے جو ہم اور تم چاہتے تھے۔''

''لیکن......'' چندر کچھ کہتے کہتے رہ گیا۔

''گریٹ ماسٹر کا یہی انداز ہوتا ہے مسٹر چندر ناتھ! ان کا اپنا ایک اصول ہے جسے کوئی نہیں بدل سکتا'' کوہارا یہ کہتے ہوئے ایک لحظے کے لیے رکا اور پھر اس بار بڑی کاٹ دار سنجیدگی سے اپنا پہلا سوال دہرا دیا۔ اس کی بات سن کر چندر ناتھ نے بے اختیار کچھ اس انداز کی ہمکاری خارج کی جیسے اسے اپنی طبیعت کے برخلاف کوئی بات برداشت کرنا پڑ رہی ہو۔ تاہم اس نے اپنے گنجے سر کو بھی خفیف سی جنبش دی تھی اور ساتھ ہی اپنی جیب سے ایک بڑا ٹیب نما سیل نکال کر کوئی نمبر ملانے لگا۔

''چیف...... ! مشن چیزڈ...... آگے کیا حکم ہے؟''

رابطہ ہوتے ہی چندر ناتھ نے انتہائی مودّبانہ لہجے میں کہا اور پھر دوسری طرف سے اپنے ''چیف'' کی کسی بات پر ''یس'' کہتے ہوئے اس نے فوراً سیل کوہارا کی طرف بڑھا دیا اور ساتھ ہی ہولے سے بولا۔

"چیف آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔"

کوہارا نے اس سے سیل لے کر اپنے کان سے لگایا اور گمبھیر آواز میں بولا۔ "ہیلو! مسٹر بھجوانی! آپ سے کیا گیا وعدہ پورا ہوا...... اب آپ اپنا وعدہ یاد رکھیے گا۔"

یہ کہتے ہوئے وہ دوسری جانب سے اس کی باتیں خاموشی سے سنتا رہا۔ اس کے بعد بولا۔

"اس کی فکر نہ کریں...... بہتر یہی ہوگا کہ آپ اپنی مہلت کے اندر اندر یہ کام جتنی جلدی ہو سکے، اسے نمٹا دیں کیونکہ ہمیں بہت جلد آگے بھی روانہ ہونا ہے۔ جی...... جی، اس کی آپ بالکل فکر نہ کریں، ہماری دوستی اور ساتھ نبھانے کی بنیاد ہی اس بات پر قائم ہے کہ ہم اسی طرح ایک دوسرے سے تعاون کرتے رہیں اور کامیابیاں ہمارا مقدر بنتی رہیں...... او...... اچھا! آپ ابھی ماسٹر سے بات کرلیں، پھر میں کروں گا اور...... آپ کا آدمی عارضی طور پر آپ کے حوالے ہوگا......"

اس کے بعد اس نے سیل دوبارہ چندر ناتھ کو دے دیا۔

میں بظاہر خاموشی سے ایک صوفے پر بیٹھا، دھڑکتی سماعتوں سے ان کی باتیں سن رہا تھا اور ساتھ ہی مجھے کئی باتوں کا ادراک بھی ہوتا جا رہا تھا۔ عارضی طور پر میری کرنل بھجوانی کو حوالگی، میری سمجھ سے بالاتر تھی۔

اس سارے کھیل میں اب میرے دماغ کے اندر کرنل سی جی بھجوانی کا نام تو پختہ ہو ہی چکا تھا، البتہ اب کوہارا کی باتوں سے "لولووش" کے نام کا بھی اضافہ ہو چلا تھا۔

ایک اور بات کا میں نے اندازہ لگایا تھا کہ یہاں یوٹ میں کوہارا اپنے ہم نسلوں سے اپنی زبان میں (جو میرے لیے اجنبی تھی) میں باتیں کررہا تھا لیکن اپنے "گریٹ ماسٹر" سے اس نے انگریزی ہی میں بات کی تھی جس کا مطلب تھا کہ کوہارا اگر (میرے اندازے کے مطابق) لولووش کا مقربِ خاص کارپرداز تو تھا لیکن وہ اس کی قومیت یا علاقے سے نہیں تھا۔

کوہارا نے بھومک کو اشارہ کیا، اس نے بہ یک ترنت ایک آٹو موبائل ڈیوائس اس کے سامنے لا کر ٹیبل پر رکھ دی، جس کا کوئی بٹن بھومک پش کر چکا تھا یہی وجہ تھی کہ ذرا ہی دیر بعد اس سے ہلکی بپ کی آواز ابھری اور کوہارا نے ایک آلہ سماعت جیسی کوئی شے اپنے کان میں پھنسا دی اور صوفے سے اپنی پشت ٹکا کر آرام سے بیٹھا رہا اور اگلے ہی لمحے وہ کسی سے انتہائی مودبانہ انداز میں باتیں کرنے لگا۔

"ماسٹر! تو پھر اجازت ہے؟ قیدی ان کے حوالے کر دیا جائے؟"

"جی ہی...... ماسٹر! میں کہہ دوں گا ان سے کہ قیدی کو کوئی نقصان نہیں پہنچنا چاہیے۔ اس کے علاوہ میں اس سے بھی بات کرلوں گا۔ بھومک ساتھ جائے گا۔"

اس کے بعد اس نے چندر ناتھ کی طرف دیکھ کر اپنے سر کو ہولے سے اثباتی جنبش دی۔ اس دوران میں خلاصی ان کے سامنے ڈرنکس رکھ چکے تھے۔

کوہارا شاید لولووش سے ہی باتیں کررہا تھا۔ مجھے اس کی زبانی یہ سن کر اچنبھا بھی ہوا اور ایک طرح سے دلی طمانیت کا بھی احساس ہوا تھا کہ یہ نہ صرف مجھے سردست کوئی نقصان پہنچانا نہیں چاہتے تھے بلکہ کسی اور کو بھی مجھے کوئی گزند پہنچانے سے مانع رکھے ہوئے تھے اور شاید یہی وجہ تھی کہ چندر ناتھ کا موڈ پھر آف ہونے لگا تھا، تاہم ابھی وہ کچھ بولا نہیں لیکن اس کا یہ بھی مطلب نہیں تھا کہ میں کسی "خطرناک خوش فہمی" کا شکار ہو جاتا، کیونکہ بہرحال کرنل سی جی بھجوانی (بلیوٹلسی) اور لولووش (اسپیکٹرم) والوں کی دشمن فہرست میں میرا نام یقیناً ٹاپ آف دی لسٹ پر ہی ہو سکتا تھا، جنھیں میں... اب تک کئی محاذ پر زبردست شکست سے دوچار کرتا رہا تھا اور اپنے حالیہ اور مشترکہ منصوبے "بلیک کوبرا" کی تباہی کے بعد تو ان سے ذرا سی بھی بھلائی کی توقع رکھنا عبث اور نری بے وقوفی ہوتی۔ چنانچہ اگر یہ لوگ میرے ساتھ اپنے کسی اہم مفاد کی وجہ سے رعایت برت رہے تھے تو یہ ایسا ہی تھا کہ اپنے شکار کو "تیار" کر کے ہڑپ کیا جاتا ہے۔

بہرحال ان کی باتوں سے یہ تو پتا چلتا تھا کہ بلیوٹلسی اور اسپیکٹرم کے درمیان خاصا مضبوط گٹھ جوڑ قائم ہے۔

ساتھ ہی میں ایک حیرت آمیز الجھن کا بھی شکار تھا کہ عارضی طور پر یہ مجھے بلیوٹلسی کے حوالے کس مقصد کے لیے کرنا چاہتے تھے؟ اور کیوں؟ جبکہ میں تو دونوں کا ہی اہم شکار تھا۔ اس قلیل مہلت میں بلیوٹلسی یا کرنل بھجوانی مجھ سے ایسا کیا کام لینا چاہتا تھا کہ جسے پورا کرنے کے بعد وہ مجھے زندہ سلامت اور ذرا سی بھی گزند پہنچائے بغیر دوبارہ کوہارا کے سپرد کر دیتا اور پھر نجانے یہ مجھے کہاں لے جانے کا ارادہ رکھتے تھے؟

پینے پلانے کی یہ محفل زیادہ طویل نہ چل سکی۔ چندر ناتھ اور اس کے دونوں ساتھی ایک ایک پیگ چڑھانے کے بعد رخصت ہونے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔

"اب ہم چلیں گے...... مسٹر کوہارا......!" چندر ناتھ نے گمبھیر آواز میں کہا اور کوہارا نے معنی خیز سی مسکراہٹ اس کی

طرف اچھال دی، ساتھ ہی وہ بھی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

چندر ناتھ نے ایک بار پھر میری جانب چبھتی ہوئی خرانٹ نظروں سے دیکھا، وہ مجھ پر خاصا ''بھرا'' ہوا دکھائی دے رہا تھا، پھر اس نے اپنی ساتھی لڑکی کوریلا کو مخصوص اشارہ کیا۔ وہ فوراً اپنے کوٹ کی اندرونی جیب سے ایک اسٹین لیس اسٹیل کی ہتھکڑی نکال کر میری جانب بڑھی اور مجھے کھڑے ہونے کا کہا۔

''ہم...... میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا کہ...... یہ سب کیا ہے......؟'' میں کوریلا کے اشارے پر اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑا تو ہوگیا تھا لیکن یہ کہے بنا بھی نہ رہ سکا تھا، میرا مخاطب کوہارا ہی تھا۔

''تمہاری زبان میں کیا لگا ہے، دیکھو ذرا......''

کوہارا نے میرا سوال نظر انداز کرتے ہوئے اچانک ہی مجھ سے کہا اور آنکھیں سکیڑے میرا منہ تکنے لگا۔ غیر ارادی طور پر میں ...... اپنی زبان منہ سے باہر نکال کر نیچی نگاہیں کر کے اسے دیکھنے لگا تو اسی وقت ایک گھونسا میری ٹھوڑی پر پڑا، اور ذرا ادھ نکلی زبان میرے ہی دانتوں تلے دب کر کٹ سی گئی۔ اس اذیت نے میرے حلق سے چیخیں نکال دیں، جن کا اختتام کراہوں پر ہوتا رہا۔ میرے منہ سے خون کی موٹی لکیریں بھل بھل کرتی گرنے لگیں، آنکھوں سے باعثِ تکلیف کے آنسو بہہ نکلے تھے۔

یہ سفاکانہ حرکت کوہارا کی تھی، جو مجھے اپنی چڑھی ہوئی طیش ناک آنکھوں سے گھور رہا تھا۔

''میں نے کہا تھا نا...... کہ تمہیں کوئی سوال نہیں کرنا۔ آئندہ محتاط رہنا۔''

یہ کہتے ہوئے اس نے اپنی نیکر کی جیب سے رومال نکال کر میری جانب بڑھا دیا۔ میں نے دیکھا چندر ناتھ میری اس درگت پر پہلی بار خبیثانہ انداز میں مسکرایا تھا۔ وہ شاید مجھے تشدد کی حالت میں ہی دیکھنا چاہتا تھا۔

میری آنکھوں میں یک بیک خون اتر آیا۔ دماغ میں شورش سی ہونے لگی، کاش! کوئی اور موقع ہوتا تو میں اس حرام زادے کی اس ظالمانہ حرکت پر اس کا بڑا بھیانک حشر کرتا۔

''یہ تم پر میرا ادھار رہا...... کوہارا......!'' میں اپنے دل میں عہد کیا، اور اپنی جلتی بلکتی کیفیات پر قابو پانے کی سعی چاہتے ہوئے، اس کا دیا ہوا رومال اپنے منہ میں رکھ لیا۔

میں نے بڑی مشکلوں سے اپنی آتش فشاں کیفیات پر قابو پایا تھا، جانتا تھا کہ اس وقت میرے قدم کسی اجنبی سرزمین پر ہیں، یہاں دو چار کو مار گرا کے جاتا بھی تو کدھر......؟ بغیر ویزا اور پاسپورٹ کے تو میں سرحد پار...... مجرم نہ ہوتے ہوئے بھی مجرم ہی گردانا جاتا۔

''اس کی پٹی کر دو......'' اس بار کوہارا نے اپنے ہم قوم بھونک سے انگریزی میں کہا۔

''اس کی ضرورت نہیں، ہماری لانچ میں یہ کام نمٹا لیا جائے گا......'' چندر ناتھ نے کہا۔ اس خبیث کے چہرے سے ہنوز حظ اٹھانے والے تاثرات چسپاں تھے، وہ کمینہ شاید مجھے ایسی ہی مضروب حالت میں دیکھنے کا زیادہ متمنی تھا مگر کوہارا نے بلا تبصرہ اس کی بات رد کردی اور بھونک کو گھورا۔ وہ جلدی سے حرکت میں آیا۔

تھوڑی دیر بعد مجھے ایک چھوٹے سے اسٹور نما کمرے میں لے جاکر میری کٹی ہوئی زبان کی مرہم پٹی کردی گئی۔

سردست میں بولنے سے قاصر تھا۔ مجھے اس لڑکی نے ہتھکڑی ڈال دی، اس طرح کہ میرے دونوں ہاتھ پشت کی جانب تھے۔

ہم سب کیبن سے باہر آگئے مگر اس بار ڈیک کی طرف جانے کے بجائے گلیارے میں آکر عقب میں بڑھ گئے، جہاں چند قدموں کے فاصلے پر ایک سیڑھی لگی ہوئی تھی جو قریب کھڑی نسبتاً چھوٹی لانچ سے منسلک تھی، اسی سیڑھیوں کے ذریعے ہم دوسری لانچ پر اتر گئے۔

یہ سب کچھ طے شدہ نظر آتا تھا۔ اس کا صاف مطلب تھا کہ میرے سلسلے میں بلیوٹکسی اور اسپیکٹرم کے درمیان کوئی خفیہ معاہدہ پہلے ہی سے طے تھا اور میرے لیے ابھی ان کے حکم کی تعمیل کے سوا کچھ نہ تھا۔

لانچ میں آتے ہی میری آنکھوں پر پٹی باندھ دی گئی تھی اور کسی گندی سی جگہ پر بٹھا دیا گیا۔ تھوڑی دیر بعد لانچ میں حرکت پیدا ہونا شروع ہوگئی اور اس کا سویا فرش گویا گھر گھراتی آواز میں بیدار ہوگیا۔

میری زخمی زبان پر نجانے کون سا مرہم لگایا گیا تھا کہ اس کی تکلیف پوری طرح رفع تو نہیں ہوئی تھی لیکن شدت ضرور کم ہوگئی تھی، ظاہر ہے پٹی لگنے کے باعث میں ابھی کچھ بولنے سے بھی قاصر تھا۔

مجھے فرش پر ہی بٹھایا گیا تھا۔ ایک بات یاد تھی مجھے کہ ان لوگوں کو مجھے صحیح سالم دوبارہ کوہارا کے حوالے کرنا تھا۔ جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ بلیوٹکسی اور اسپیکٹرم کے گٹھ جوڑ کے بیچ کس قدر مضبوط دوستی اور خیر خواہی کی ڈور بندھی ہوئی ہے۔

زبان پر لگے مرہم کا اثر کم ہونے سے میرے زخم

سے دوبارہ ٹیسیں سی اٹھنے لگی تھیں۔ اس تکلیف سے دوبارہ مجھے اپنی آنکھوں سے پانی بہتا محسوس ہونے لگا، جو بندھی ہوئی پٹی میں جذب ہو رہا تھا۔

اس تیز رفتار لانچ کا سفر، میرے اندازے کے مطابق لگ بھگ کوئی ڈیڑھ دو گھنٹے جاری رہا ہوگا۔ اس کے بعد وہ کہیں رک گئی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد مجھے اپنے قریب کہیں کھڑ بڑ کی آوازیں سنائی دیں، لگا کچھ ایسا ہی تھا جیسے کسی نے کوئی بھاری دروازہ کھسکایا ہو۔ اس کے بعد قدموں کی آواز کے ساتھ ہی کوئی میرے قریب آیا تھا۔ مجھے بازو سے پکڑ کر بڑی بیدردی سے اٹھا کے کھڑا کر دیا گیا۔ اندازے اور ان کی آپس کی باتوں سے مجھے پتا چلا تھا کہ یہ دو افراد تھے اور بلیو ٹلسی کے شیام اور کوریلا ہی تھے۔

پھر سب کچھ کافی تیزی سے نمٹایا گیا، یعنی لانچ سے باہر اور پھر وہاں سے ایک ہیلی کاپٹر میں سوار کرانے تک، سب عجلت میں نمٹایا گیا تھا، صاف لگتا تھا کہ انہیں خاصی جلدی تھی۔

ہیلی کاپٹر کے کسی نامعلوم منزل کی جانب پرواز کرنے تک بالکل خاموشی رہی۔

ابھی میرے پاس خود کو تن بہ تقدیر کرنے کے سوا اور کوئی آپشن نہیں تھا اور یہی میں کر رہا تھا۔ مجھے اپنے ساتھیوں بالخصوص، ماں جی اور اول خیر وغیرہ کی بھی فکر تھی کہ وہ بے چارے میرے اس طرح اچانک اور پُراسرار غیاب پر کس قدر پریشان اور تشویش زدہ ہو رہے ہوں گے۔ زہرہ بانو اور شکیلہ بھی میرے لیے کم پریشان نہیں ہوں گی۔ بے چارہ اول خیر تو پاگلوں کی طرح میری تلاش میں سرگرداں ہوگا اور کبیل دادا بھی اب میرے لیے کم پریشان تو نہیں ہو رہا ہوگا۔ مجھے اس بات کا بھی قلق تھا کہ کبیل دادا سے زہرہ بانو کے سلسلے میں گفتگو کرنے کے بعد مجھے زہرہ بانو سے اصل بات کرنے کا موقع ہی نہ مل سکا تھا۔

جلد ہی یہ سفر بھی تمام ہوا اور ہیلی کوپٹر کسی جگہ پر اترا، مجھے اسی طرح باہر نکال کر اتارا گیا، جیسے کسی ''موسٹ وانٹڈ'' مجرم کو بیدردی سے گھسیٹ کر اتارا جاتا ہے، یہاں مجھے پہلی بار اپنے سلسلے میں گہری تشویش کا احساس ہوا کہ میں اب بھی ایسے حالات کا شکار ہوں جس کے نتائج میرے حق میں انتہائی خراب بھی نکل سکتے تھے، مزید یہ کہ مجھے ایسی کسی خوش فہمی میں بھی مبتلا نہیں ہونا چاہیے، جیسا کہ میں کوہارا کی قید میں ہونے لگا تھا۔ بے شک وہاں میرے ساتھ قیدیوں جیسا گھٹیا سلوک تو نہیں کیا گیا تھا مگر جانتا تھا کہ وہاں بھی ایک وقت تک ایسا چلتا رہتا، ہمیشہ نہیں، کیونکہ میں بہرحال اپنے خطرناک اور بھیانک ترین دشمنوں کے نرغے میں تھا اور ان سے کسی بھی صورت میں رعایت کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی۔

ہیلی کوپٹر سے اترنے سے لے کر آگے بڑھنے تک...... میں نے اپنی دیگر حسیات کو پوری طرح بیدار کر رکھا تھا۔ ہیلی کوپٹر سے اترتے ہی میرے جوتوں نے پختہ زمین کو چھوا تھا اور آگے بڑھنے تک میں نے اپنے کانوں سے کچھ ایسی آوازیں بھی سنی تھیں، جیسے میں کسی گنجان شہر کے بجائے کہیں دور افتادہ ویرانے میں ہوں۔ اس کا اندازہ مجھے گرد و پیش کے دم بہ خود سناٹے سے ہوا تھا۔

جلد ہی میرے قدموں نے ایک ایسے فرش کو چھولیا، جو قدرے چکنا تھا۔ اس کے فوراً بعد مجھے روک دیا گیا، اسی وقت میری سماعتوں سے کسی بھاری آہنی گیٹ کے کھلنے کی آواز ٹکرائی اور پھر مجھے آگے دھکیلا گیا، ہم تھوڑی دیر تک مختلف راہداریوں سے گزرتے رہے، کہیں چلے کہیں رکے، بالآخر ایک جگہ مجھے کسی لوہے کی کرسی پر بٹھا دیا گیا۔ اس کے بعد میری آنکھوں سے پٹی اتار دی گئی۔ چند ثانیے تو میری آنکھوں کے گرد سیاہ دھبے سے ناچتے رہے۔ میرے دونوں ہاتھ ہنوز پشت کی جانب بندھے ہوئے تھے، اس لیے میں اپنی آنکھوں کو مسلنے سے بھی قاصر تھا۔ یہی سبب تھا کہ آنکھوں سے پٹی کھلنے کے بعد بھی تھوڑی دیر تک میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھایا رہا۔ رفتہ رفتہ چھٹا تو تیز سی روشنی دکھائی دی اور میں نے خود کو ایک بلند چھت اور سپاٹ در و دیوار والے کمرے میں پایا۔ جس کا فرش ہی نہیں در و دیوار بھی سیلن زدہ سے ہو رہے تھے۔

چھت کے عین وسط میں لمبی الیکٹرک وائر کے ساتھ فقط ایک ہی بلب روشن تھا۔ اس کی روشنی میں مجھے وہاں دو ہی افراد کھڑے دکھائی دیے۔ یہ شیام اور کوریلا ہی تھے، چندرناتھ نجانے کہاں غائب ہو گیا تھا۔

میرا حلق پیاس کی شدت سے خشک ہو رہا تھا...... زبان کی تکلیف بھی بیدار ہونے لگی تھی۔ نجانے میں کب سے بھوکا پیاسا تھا؟ معدہ خالی ہونے کے باعث وہاں آگ سی مچی ہوئی تھی۔ کچھ اندازہ نہیں ہو پا رہا تھا کہ میں پہلے والے واقعے کے کتنی دیر تک بے ہوش پڑا رہا تھا۔ کم بخت کوہارا نے بھی مجھے کچھ کھانے پینے کو نہیں پوچھا تھا۔ سوائے مے نوشی کے، جسے، میں نے تو ہاتھ بھی لگانا گوارا نہیں کیا تھا۔

''مم...... مجھے پپ...... پانی تو پلا دو ایک گلاس......''

میرے سوکھے پڑتے حلق سے کراہ آمیز لکنت زدہ الفاظ

خارج ہوئے۔ وہ دونوں میرے دائیں بائیں اسٹیچو بنے کھڑے تھے مگر انہوں نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا، زبان زخمی ہونے کی وجہ سے مجھے بولنے میں بھی دقت ہو رہی تھی۔ یہی سبب تھا کہ الفاظ میرے واضح نہیں تھے، بولتے ہوئے ایسا ہی لگتا تھا، جیسے کوئی گونگا بولنے کی کوشش کررہا ہو۔

اس حرام زادے کوہارا نے میرے جسم کے نازک حصے میں اچانک اور دھوکے سے وار کیا تھا اور میں اس پر بری طرح خار کھائے ہوئے تھا۔

میں نے دوبارہ بولنے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ اچانک کمرے کا دروازہ کھلا، دروازہ میرے دائیں بازو پر تھا، میں نے گردن موڑ کر دیکھا، تین افراد اندر داخل ہوئے تھے۔ ان میں ایک تو وہی پکی عمر والا خرانٹ، چندر ناتھ تھا، دوسرا جوان سا مرد تھا، اس کے جسم پر مخصوص لباس تھا، وہ کوئی محافظ ٹائپ کا آدمی نظر آتا تھا، جبکہ اس کے ہمراہ ایک، لمبا تڑنگا اور قوی الجثہ شخص بھی تھا، اس کے جسم پر نیلی اور خاکی وردی نما چست لباس تھا، وہ پہلی ہی نگاہ میں مجھے کوئی آفیسر قسم کا ہی آدمی لگا، رنگت خاکستری تھی، آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی تھیں اور ان میں غضب کا کینہ بھرا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ چہرے پر کرختگی کے تاثرات کھنڈے ہوئے تھے، مجھ پر نظر پڑتے ہی وہ سوا ہو گئے۔

اندر داخل ہوتے ہی تینوں گویا طے شدہ پوزیشن میں میرے قریب آن کھڑے ہوئے تھے۔ چندر ناتھ میرے بائیں طرف کوریلا کے قریب، جبکہ کرخت صورت آفیسر میرے عین سامنے، اور اس کا محافظ اس کے بائیں جانب تن کر کھڑا ہو گیا۔

اس آفیسر کے چہرے پر میں نے نظریں جما دی تھیں جو خود بھی میری طرف بڑی کٹیلی اور خار کھائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

''پپ...... پانی۔'' میرے منہ سے نکلا اور اسی وقت کمرے میں چٹاخ کی آواز ابھری۔ اس کرخت صورت آفیسر کا دایاں ہاتھ حرکت میں آیا تھا، اس نے ایک زوردار تھپڑ میرے چہرے پر رسید کر دیا تھا۔ میں کرسی سے نیچے گرتے گرتے بچا۔ اس نے نفرت انگیزی سے اپنے سیاہ بدرو ہونٹ، دانتوں سمیت بھینچ رکھے تھے۔

''جی تو کرتا ہے، تمہیں زہر پلا دوں......'' دفعتاً ہی وہ آفیسر غیظ آلودہ لہجے میں مجھے گھورتے ہوئے بولا۔ ''لیکن......!''

اس نے تہدیدی انداز میں اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ میں نے کرسی پر دوبارہ سنبھل کر نیم بازسی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا۔ اس نے پاس کھڑے چندر ناتھ سے تحکمانہ انداز میں پوچھا۔

''اس کا منہ زخمی ہے، اور مجھے اس کی زبان سے کام لینا ہے۔ کیا یہ ٹھیک طرح سے بات کرسکتا ہے؟''

''یس چیف!'' چندر ناتھ نے فوراً تحکمانہ انداز میں جواب دیا۔ ''میں نے ابھی آپ کو بتایا تھا ناں کہ لولووش کے بری آدمی کوہارا نے......''

''اوکے...... اوکے!'' اس کرخت رو مزاج آدمی نے اپنا ایک ہاتھ کھڑا کر کے خاصی بیزاری سے کہا اور چندر ناتھ کے منہ کو گویا بریک لگا دیا۔ میں نے اس کرخت رو آفیسر کے چہرے سے صاف محسوس کیا تھا کہ وہ کوہارا کے لیے کوئی سخت جملہ اپنے منہ سے نکالنا چاہتا تھا لیکن شاید میری وہاں موجودگی کے باعث رک گیا تھا۔

''مجھے اچھی طرح دیکھ لو نیڈی ایجنٹ......! میں کرنل سی جی بھوانی ہوں......'' کہتے ہوئے اس نے مجھے قہر آلود نظروں سے گھورا۔ مجھے...... پہلے ہی اس کا اندازہ ہو چکا تھا' نا بھی ہوتا تو کوئی فرق نہ پڑتا۔ یہی سبب تھا کہ میں نے اپنے چہرے سے ایسے کسی قسم کے تاثرات کو ظاہر نہ ہونے دیا۔ وہ خبیث اپنا تعارف کرانے کے بعد تھوڑی دیر تک اپنی اندر کو دھنسی ہوئی کینہ پرور آنکھوں کو سکیڑے میرے چہرے کا جائزہ لیتا رہا اور میری آنکھوں سے ایسا کوئی ''خاطر خواہ'' تاثر نہ پا کر وہ مزید بھڑکا اور اسی لہجے میں بھیڑیے جیسی آواز میں غرایا اور اپنے ایک ہاتھ سے میری گردن دبوچ لی، پھر میرے چہرے کے قریب اپنا مکروہ چہرہ کیے بولا۔

''تم...... تم نے مجھے بہت زک پہنچائی ہے، گن گن کر بدلا لوں گا اب...... تمہیں میری طاقت کا اندازہ تو ہو گیا ہوگا ناں...... میلوں دور رہ کر میں نے تمہیں کس طرح ایک نامراد چوہے کی طرح دبوچ لیا ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے ایک زوردار جھٹکے سے میری گردن چھوڑ دی، میں پھر کرسی سے گرتے گرتے بچا تھا وجہ اس کی یہی تھی کہ میرے دونوں ہاتھ پشت کی طرف بندھے ہوئے تھے، اور میں بیلنس قائم نہیں کر پاتا تھا، یوں بھی کرسی چھوٹی اور بغیر ''ہتھیوں'' کی تھی۔ جس پر میرا جیسا لمبا چوڑا آدمی بیٹھ تو نہیں سکتا تھا، صرف ٹک سکتا تھا۔

مجھے اس کے پُرغرور لہجے کی تہ میں دبی شکست آمیز

خجالت اور جھنجلاہٹ صاف محسوس ہوئی تھی۔ کیونکہ میرے ہاتھوں ''میچوئیل ری پلیسمنٹ'' والی کامیاب مہم جوئی کے بعد اس کے اس غرور اور گھمنڈ کی ساری دھجیاں بکھر کر رہ گئی تھیں اور اب وہ باؤلا کتا بنا ہوا تھا۔

بہرکیف میں خاموش ہی رہا۔ جانتا تھا کہ میں اس وقت ایک ایسے بھارتی فرعون آفیسر کے سامنے موجود ہوں جو میرے وطن کا دشمن ہے اور اس کا شمار بھارتی آرمی کمانڈ کی اس لابی میں ہوتا تھا جو نہ صرف میرے وطن کو دولخت کرنے کی قبیح سازش میں شامل رہے تھے، بلکہ اسے سہ لخت (خاکم بدہن) کرنے کی مذموم اور دیرینہ منصوبہ بندی میں اپنی ''باقیات'' سمیت بلیوتلسی کی صورت، ہنوز کارفرما تھے۔

یہی وہ مردود اور سفاک درندہ صفت انسان تھا جو میرے محب الوطن اور غیور باپ کو اپنے ٹارچر سیل میں انسانیت سوز تشدد کا نشانہ بناتا رہا تھا۔ اسے دیکھ کر میری آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا اور میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ میرے دونوں ہاتھ آزاد ہوتے اور میں اسے ادھر ہی واصلِ جہنم کر ڈالتا۔

میری خاموشی کا اس نے نجانے کیا مطلب لیا۔ تاہم بولا۔

''افسوس تو اس بات کا ہے کہ تم اب بھی پورے طور پر میرے قبضے میں نہیں ہو لیکن کسی خوش فہم مغالطے میں مت رہنا نیڈی......! تم یہاں سے جا کر بھی ہماری ہی گرفت میں رہو گے اور جب ہم چاہیں گے تمہیں کسی مرے چوہے کی طرح دوبارہ اِدھر لا پٹخیں گے۔''

کہتے ہوئے اس کی بدرو سیاہ باچھوں سے غصیلے پن کے باعث جھاگ کی لکیریں سی بہہ نکلیں۔

''تم مجھ سے اب کیا چاہتے ہو......؟'' بالآخر میں نے کہا اور اس بار دانستہ ٹوٹے پھوٹے لہجے میں الفاظ اپنے حلق سے برآمد کیے تھے۔ جسے سن کر وہ سیدھا ہو کر یک دم کسی بولائے ہوئے سؤر کی طرح بدکا اور قریب کھڑے چندر ناتھ سے تیز لہجے میں بولا۔

''یہ کیا ہے چندر؟ مجھے اس کا رواں اور صاف لہجہ چاہیے، اس آواز میں تو وہ لوگ اسے پہچاننے سے ہی انکاری ہو جائیں گے......؟'' اس کی بات پر چندر ناتھ کچھ گھبرا سا گیا، میں خود بھی اس خبیث کی اس بات پر اندر سے چونکے بنا نہیں رہ سکا تھا۔ آخر وہ کن لوگوں کو میری آواز سنانا چاہتا تھا؟ کیا میرے اپنوں کو......؟ کیا بھجوانی انہیں میری آواز سنا کر انہیں کسی بات پر بلیک میل کرنا چاہتا تھا؟ مگر کیوں؟ مجھے اس بات نے ایک تفکر آمیز الجھن میں ڈال دیا۔

''چ...... چیف! آپ ذرا مجھے دو تین گھنٹوں کی مہلت دے دیں، میں اسے اس قابل......''

''چندی......! تم جانتے ہو ہمارے پاس وقت کم ہے۔'' وہ چیخا۔ ''اسے انہیں واپس بھی کرنا ہے۔ کیا یہ دو تین گھنٹوں میں ٹھیک ہو جائے گا؟''

''یس چیف! میں اسے ابھی میڈیکل پینل لے جاتا ہوں، وہاں......''

''نو، نو، نیور......'' کرنل سی جی بھجوانی اپنا ایک ہاتھ بلند کرتے ہوئے بولا۔ ''میں اتنا وقت نہیں افورڈ کر سکتا۔''

''چیف! میرے ذہن میں ایک تجویز آئی ہے۔'' معاً میرے بائیں جانب کھڑے شیام نے بھجوانی سے کہا۔ ''ہم لولوش سے تھوڑی مزید مہلت مانگ لیتے ہیں۔ کیونکہ اس میں قصور اس کے اپنے ساتھی کا ہی ہے۔ اسی نے ہی اسے زخمی کیا ہے۔''

''شیام ٹھیک کہہ رہا ہے چیف! ہمارے پاس اپنی بات کا جواز ہے۔'' ساتھ کھڑے چندر ناتھ نے فوراً اپنے ماتحت ساتھی کی تائید کر ڈالی مگر سی جی ان دونوں کی طرف غصیلی نظروں سے گھورتے ہوئے بولا۔

''مہلت تو میں نے اس سے ویسے بھی لینے کا پہلے ہی سے سوچ رکھا ہے مگر میں اس مہلت کو اس نیڈی کے علاج میں نہیں کھپانا چاہتا...... تم لوگوں کی عقل گھاس چرنے گئی ہوئی ہے......؟'' اس کی جھڑکی پر وہ دونوں سن ہو کر رہ گئے اور تب ہی اچانک میرے قدرے دائیں جانب کھڑی سبک اندام کوریلا نے نہایت مؤدبانہ انداز میں کرنل سی جی سے کہا۔

''سر......! میرے خیال میں یہ اداکاری کر رہا ہے......'' وہ آگے بھی کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن... کرنل سی جی کو یک دم غصے سے اپنی جانب گھورتا دیکھ کر چپ ہو گئی اور وہ دانت پیس کر اس سے بولا۔

''مس کوریلا......! میرے سامنے خیال کی نہیں یقین کی بات کرو۔''

''یس...... سر! م...... میں...... یہی کہنا چاہ رہی تھی کہ یہ اپنی زخمی زبان کا فائدہ اٹھا کر ہم سے ناٹک کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ کیونکہ میں نے اسے کوہارا کی لانچ میں اتنا غلط بولتے ہوئے نہیں دیکھا تھا لیکن ہماری کچھ باتیں سننے کے بعد یہ مکر کرنے لگا ہے لیکن ہمیں اس کی بھی پروا نہیں ہونی چاہیے اور اس سے ہم صرف بات ہی نہیں بلکہ اس کی ویڈیو اینڈ وائس کلپ دیکھا کر بھی اپنا اصل مقصد حاصل کر سکتے ہیں۔''

"ہاں...... ذہن میں تو میرے بھی یہی بات آتی ہے۔" کرنل سی جی نے اس کی بات پر اتفاق کیا اور پھر تحکمانہ انداز میں کوریلا سے بولا۔

"مس کوریلا......! تم اسے کل کے لیے ذرا بریف کر دو کہ ہم کرنا کیا چاہتے ہیں...... تاکہ یہ کسی قسم کی خلل اندازی نہ کر سکے اور تم......" کہتے ہوئے وہ چندر ناتھ کی طرف گھوما۔

"سر......!" خود سے مخاطب ہوتا دیکھ کر چندر ناتھ نے اپنے سر کو خم دیتے ہوئے مودبانہ کہا۔

"کل صبح مجھے پاکستان سے چلنے والے اس لائیو پروگرام کی ویڈیو ڈسک چاہیے، ایچ ڈی میں، کلیئر......؟"

"یس چیف! شیور۔" چندر ناتھ نے اسی طرح مودبانہ انداز میں اپنے سر کو دھیرے سے اثبات میں حرکت دی۔ اس کے بعد کرنل سی جی نے اپنے ہونٹ بھینچ کر مجھ پر ایک پُرطیش نگاہ ڈالی اور اپنے وردی پوش ہمراہی کے ساتھ کمرے سے باہر نکلتا چلا گیا۔ اس کے پیچھے چندر ناتھ اور شیام بھی ہولیے۔

اب صرف کمرے میں کوریلا اور میں رہ گئے، نجانے اس کو مجھ سے کیا کہنا تھا، وہ میں اس کی زبانی سننے کے لیے بری طرح بے چین تھا لیکن میرا ذہن کرنل سی جی کی اس نئی بات پر اٹک کر رہ گیا تھا کہ آخر پاکستان میں کل کون سا ایسا اہم پروگرام نشر ہونے والا تھا، جس کی ویڈیو کلپ حاصل کرنے کے لیے اس نے چندر ناتھ کو پابند کیا تھا؟

"تم نے بلاوجہ اس بری قصاب کو ہارا...... کے سامنے منہ کھول کر اپنی زبان زخمی کر ڈالی......" کوریلا چند قدم چل کر میری طرف گھوم گئی۔ اب نجانے اس کے لہجے میں صنفِ نازک والی "نزاکت" تھی یا پھر اس نے ویسے ہی مجھ سے اظہارِ ہمدردی کرنا چاہا تھا، تاہم اس کے نرم رویے سے حوصلہ پاکر میں نے ہولے سے مسکرا کر کہا۔

"لیکن بہ قول آپ کے، میں ناٹک کر رہا تھا۔"

"ناٹک تو تم کر رہے تھے، اس میں کیا شک ہے۔" اس نے کہا۔

"پلیز......! مجھے پانی تو پلا دو۔" یہ کہتے ہوئے میرا اپنے سوکھے ہونٹوں پہ زبان پھیرنے کو جی چاہا مگر زخمی ہونے کے باعث حرکت بھی دینے سے قاصر ہی رہا۔

"پانی مل جائے گا......" وہ بولی۔ "لیکن ایک شرط پر۔"

"کیسی شرط......؟"

"مجھ سے پورا تعاون کرو گے؟"

مگر

تین غیر حاضر دماغ پروفیسر ریلوے اسٹیشن پر کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ وہ باتوں میں اتنے محو تھے کہ گاڑی آنے کی خبر تک نہ ہوئی۔ چند منٹ بعد سیٹی بجی تو وہ چونکے اور گھبرا کر ایک ڈبے کی طرف دوڑے۔ دو تو کسی نہ کسی طرح چڑھ گئے لیکن تیسرے صاحب نہ چڑھ سکے۔

ایک قلی نے کہا۔ "کوئی بات نہیں صاحب جی! دوسری گاڑی سے چلے جانا۔"

پروفیسر بولے۔ "وہ تو میں چلا ہی جاؤں گا مگر ان دونوں کا کیا ہوگا جو مجھے چھوڑنے آئے تھے۔"

ثبوت

بیوی نے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "میری تو قسمت ہی پھوٹ گئی تم سے شادی کر کے۔ کیسے کیسے قابل اور ذہین لڑکے مجھ سے شادی کرنا چاہتے تھے۔"

"اس میں کچھ شک نہیں کہ وہ قابل اور ذہین تھے۔" شوہر نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ "اور تم سے شادی نہ کر کے انہوں نے اپنی قابلیت کا ثبوت بھی دے دیا تھا۔"

مجبوری

پاگل خانے کے دورے پر آئی ہوئی ایک خاتون سوشل ورکر وہاں کے سپرنٹنڈنٹ کے ساتھ ایک راہداری سے گزریں تو راستے میں کھڑی ایک خاتون کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر وہ کانپ کر رہ گئیں۔ کچھ آگے جا کر انہوں نے نیچی اور خوفزدہ سی آواز میں سپرنٹنڈنٹ سے پوچھا۔ "خدا کی پناہ! کیسی خوفناک صورت تھی۔ کیا یہ خطرناک ہے؟"

"کبھی کبھی ہو جاتی ہے۔" سپرنٹنڈنٹ نے ٹالنے والے انداز میں کہا۔

"پھر آپ لوگ اسے کوٹھری میں بند کیوں نہیں رکھتے۔ کیا یہ آپ لوگوں کے قابو میں نہیں آتی؟" خاتون نے تشویش سے پوچھا۔

"مجبوری ہے کہ اسے کسی کوٹھری میں بند نہیں کیا جا سکتا اور نہ وہ کسی کے قابو میں آتی ہے۔ دراصل وہ میری بیوی ہے۔" سپرنٹنڈنٹ نے ٹھنڈی سانس لے کر جواب دیا۔

شاہ کوٹ سے احمد پرویز کی مجبوری

’’کروں گا۔‘‘ میں نے فوراً کہا۔ ’’میں تو خود یہ چاہتا ہوں کہ آخر پتا تو چلے کہ مجھے یہاں کیوں اور کس مقصد کے لیے لایا گیا ہے؟ اور......‘‘

’’ابھی سب معلوم ہو جاتا ہے۔‘‘ اس نے میری بات کاٹی اور پھر اپنے کوٹ کے کالر میں منہ ڈال کر کسی سے کچھ کہا۔ اس کے ذرا دیر بعد ہی ایک طرح دار حسینہ اندر داخل ہوئی، یہ نسبتاً کم عمر تھی، اور شوخ و چنچل بھی نظر آ رہی تھی۔ اس نے اپنے ہاتھ میں ایک میڈیکل باکس سے مشابہ کیس تھامے ہوئے تھا اور دوسرے ہاتھ میں پانی کی بوتل تھی۔

اپنی تربیت کے دوران میں مجھے بھارتی انٹیلی جنس، بالخصوص ’’را‘‘ کے بارے میں یہی بتایا گیا تھا کہ جاسوسی وغیرہ کے سلسلے میں یہ لوگ کم عمر اور حسین لڑکیوں سے بھی کئی اہم کام لیا کرتے تھے، جو اپنے حسن و شباب کو دشمنوں کے خلاف ایک خطرناک ’’ہتھیار‘‘ کی صورت استعمال کرتے تھے لیکن یہ مکمل طور پر تربیت یافتہ بھی ہوتی تھیں۔ بلیوٹلسی نے بھی یہی وتیرہ اختیار کر رکھا تھا، اس لیے میں جانتا تھا کہ بظاہر نازک اندام لڑکیاں اپنے اندر کس قدر خطرناکیاں چھپائے ہوئے ہوں گی۔

تاہم میں ایک بات یہ بھی جانتا تھا کہ آفٹر آل یہ صنفِ نازک ہی تھیں۔ میں نے میٹھی میٹھی مسکراہٹ سی اپنے چہرے پہ طاری رہنے دی تھی۔ اس نے بھی اسی طرح مسکراتے ہوئے پہلے تو باکس نیچے رکھا پھر پانی کی بوتل کھول کر میرے منہ کے قریب کر دی۔ میں نے تھوڑا آگے جھک کر بوتل سے اپنا منہ لگا لیا، اس نے بوتل کو تھوڑا اونچا کیا اور میں گھونٹ گھونٹ پانی پینے لگا، دفعتاً مجھے ٹھسکا لگا تو لڑکی نے یک دم بوتل میرے منہ سے ہٹا دی۔

’’آرام سے پانی پیو، تمہاری زبان بھی زخمی ہے۔‘‘ اس لڑکی نے مسکرا کر کہا۔ مجھے اس کا لہجہ بھی ملائمت آمیز اور میٹھا محسوس ہوا۔ میں جھینپے ہوئے انداز میں مسکرایا۔ اس نے پھر پانی کی بوتل میرے منہ سے لگا دی، بوتل خالی ہو گئی تو اس نے ہٹا دی اور بوتل نیچے رکھ دی۔ پھر اپنا میڈیکل باکس کھولنے لگی۔ وہ شاید بلیوٹلسی کے میڈیکل ونگ سے تعلق رکھتی تھی اس لیے اپنا کام بڑی مشاقی سے انجام دینے لگی۔ پرانی پٹی کھول کر ایک ٹارچ جلا کر زخم کا جائزہ لیا پھر اس میں مرہم لگا کر ہلکی سی چپچی نما پلاسٹر ٹیپ لگا دی۔ مجھے کچھ سکون ملا۔ پھر اس نے دو قسم کی دوائیوں کی شیشیاں نکال کر دو دو گھونٹ پلائے۔

اس کے بعد وہ نرس نما لڑکی اپنا سامان سمیٹے خاموشی سے لوٹ گئی۔ میں نے کوریلا کا شکریہ ادا کیا۔

’’اب یقیناً تم مجھ سے تعاون کرو گے، تاکہ میں اپنا کام جلد نمٹا سکوں۔‘‘ وہ بدستور مسکراتی نگاہوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ اس کی بات سے مجھے ایسا لگا جیسے یہ مجھے اپنے کسی کام کے لیے ’’آسان‘‘ بنانے کی سعی چاہ رہی ہو۔

’’شکریہ! ویسے آپ یہ سب کچھ نہ بھی کرتیں، تو بھی آپ جیسی حسین اور مہربان خاتون کے ساتھ میں یوں بھی تعاون ضرور کرتا۔‘‘ اس نے میری بات کا کوئی جواب نہ دیا اور ایک بار پھر اپنے کوٹ کا ایک کالر اونچا کر کے، بہت دھیمی آواز میں کسی سے باتیں کرنے لگی۔ میں دانستہ اس کی طرف مسکرا کر دیکھنے لگا لیکن اس کے چہرے پہ اب نرم میٹھی مسکراہٹ عنقا ہو چکی تھی، اس کی جگہ سپاٹ سی متانت کھنڈ آئی تھی۔ وہ اسی لہجے میں مجھ سے بولی۔

’’اب میری بات غور سے سنو!‘‘ وہ رکی، میں اس کی طرف ہمہ تن گوش ہو گیا۔ اس نے اپنی بات جاری رکھی۔

’’کل صبح دس بجے پاکستان میں تمہارے باپ تاج دین شاہ کے سلسلے میں ایک بڑی اور اہم تقریب کا انعقاد کیا جا رہا ہے۔ وہاں اسے ملکی سطح پر زبردست خراجِ تحسین پیش کیا جائے گا اور اس کی شخصیت کو ’’ڈکلیئر‘‘ کیا جائے گا کہ اس نے آج سے کئی سال پہلے ایک گمنام پاکستانی سپاہی کی حیثیت سے وطن کی خاطر کیسی قربانی دی تھی اور اپنا گھر بار سب تیاگ دیا تھا، وغیرہ۔ اسے ایک بڑے ملکی آرمی اعزاز سے نوازنے کا بھی اعلان کیا جائے گا......‘‘ وہ اتنا بتا کر خاموش ہوئی۔ میرا رُواں رُواں یہ سن کر جوشِ مسرت و فخر و انبساط سے جھوم اٹھا۔

اس کا مطلب تھا کہ میجر ریاض باجوہ نے اپنا فرض بڑی خوش اسلوبی سے نبھا دیا تھا۔ جیسا کہ انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ ایک آدھ روز میں میرے باپ کو لینے کے لیے آئیں گے اور ان سے متعلق وہ ساری ڈاکومینٹری اور میڈیکل تصدیق وغیرہ کے بعد ان کی شخصیت کو ایک بڑے اعزاز کے ساتھ ہائی لائٹ کریں گے۔ مجھے اس بات کا افسوس بھی ہو رہا تھا کہ میں اس عظیم تقریب میں موجود نہیں تھا لیکن...... پھر اچانک ہی میرے اندر ایک اندیشناک اور لرزا دینے والا خیال بھی ابھرا کہ آخر یہ سب مجھے بتانے یا دکھانے کا ان بلیوٹلسی والوں کا کیا مقصد تھا؟ یہی وہ وقت تھا جب مجھے کرنل سی جی بھجوانی کی وہ دھمکی یاد آنے لگی جو اس نے مجھے میرے ہاتھوں عبرت ناک شکست اٹھانے کے بعد

اس وقت دی تھی جب میں بیگم ولا میں موجود تھا۔ اس نے کہا تھا کہ وہ بہت جلد مجھے ایک ''تحفہ'' دینے والا تھا، تو کیا وہ خبیث اس عظیم تقریب میں ایسا کچھ ''خطرناک'' کرنے کا ارادہ کیے ہوئے تھا۔ اس روح فرسا خیال نے ہی مجھے اندر سے لرزا کر رکھ دیا۔

''اب تمہیں کیا کرنا ہوگا.....'' وہ آگے بتانے لگی۔

میں سرتاپا سماعت بن گیا۔

''.....اس ڈکلیریشن اور پروگرام کے ختم ہونے کے بعد تمہیں اپنے کسی ساتھی سے فون پر بات کروائی جائے گی۔'' یہ کہہ کر وہ رکی۔ اس کی بات پر مجھے کچھ تسلی ہوئی کہ یہ لوگ ایسا کوئی خطرناک کام کرنے کا ارادہ نہیں رکھتے تھے، اس تسلی کی وجہ ایک اور بھی تھی کہ اس ملکی سطح کی اس اہم تقریب کی ظاہر ہے سیکیورٹی بھی اتنی ہی سخت ہوگی اور دوسرے یہ کہ پاکستان میں، میں نے اسپیکٹرم ہی نہیں بلکہ بلیوتلسی کا بھی خاطر خواہ حد تک قلع قمع کر ڈالا تھا۔

''مجھے اپنے ساتھی سے کب اور کیا بات کرنا ہوگی.....؟'' قدرے طمانیت حاصل ہو جانے کے بعد میں نے بالآخر اس کی طرف دیکھ کر پوچھا تو وہ بولی۔

''پروگرام ختم ہونے اور دیکھ لیے جانے کے بعد تمہیں بتایا جائے گا۔ ہوسکتا ہے کہ تمہیں بھی اس کی ویڈیو کلپ دکھا دی جائے تاکہ تم ہماری بات کو صحیح طرح سے اور ہمارے مطابق ایکسپریس کر سکو.....'' میں نے چپ سادھ لی۔ تھوڑی دیر بعد وہ چلی گئی، اس کے جانے کے ذرا دیر بعد ہی مجھے پینے کے لیے سوپ اور اسی طرح کی کوئی رقیق شے دی گئی۔ میری زبان زخمی ہونے کی وجہ سے میں سرِدست کچھ کھانے سے بھی قاصر تھا۔

کوریلا کمرے سے جا چکی تھی۔ نیند سے میرا اب سر بھی چکرانے لگا تھا، تھکاوٹ بھی ہونے لگی تھی، ایک ہی رخ میں پشت کی سمت بندھے ہوئے میرے دونوں ہاتھوں کی وجہ سے پورے جسم میں اکڑن سی پیدا ہونے لگی تھی، شکر تھا کہ میں کرسی سے اٹھ کر کھڑا ہو سکتا تھا اور میں نے ایسا ہی کیا۔ لہٰذا میں اٹھ کر دیوار کے کونے میں جا کر، اس کے سہارے زمین پر بیٹھ گیا۔ اور دیوار پر ہی سر ٹکا کر آنکھیں موند لیں۔

نہ جانے کتنی دیر گزری تھی کہ مجھے کسی نے جگا دیا۔ وہی رقیق سی خوراک دی گئی، اور اسی نوعمر نرس نما لڑکی نے دوبارہ میری زبان کی پٹی کر دی تھی، بلکہ اس بار اس نے صرف مرہم لگا دیا تھا، ایک انجکشن بھی میرے بازو میں ٹھونک دیا تھا۔ کچھ پین کلر وغیرہ کھلائی گئی۔

مجھے نہیں معلوم تھا کہ میں کب تک سویا رہا تھا۔ کمرے میں قدرے بلندی پر ایک چھوٹا چوکور سا سلاخ دار روشن دان تھا، جس کے پار مقدور بھر نظر آنے والا آسمان سفیدی مائل نیلا ہو رہا تھا، اندازہ ہوا کہ صبح ہو چکی تھی یا پھر دن کا کوئی وقت تھا۔

نرس اپنا کام نمٹا کر چلی گئی۔ اس کے ذرا دیر بعد ہی کوریلا آگئی۔ وہ اکیلی ہی تھی۔ اس نے بے تاثر سی نگاہوں سے مجھے دیکھا اور سپاٹ لہجے میں مخاطب ہوئی۔

''تم تیار ہو؟'' وہ اب کی بار کسی بھی مسکراہٹ کا اظہار نہیں کر رہی تھی۔ اس نے اس بار بزنس کوٹ سوٹ کے بجائے وردی نما چست لباس پہن رکھا تھا۔

''کس بات کی تیاری؟'' میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''مبارک باد تو میں تمہیں کسی صورت میں نہیں دے سکتی لیکن یہ بتائے دیتی ہوں کہ تمہارا باپ تاج دین شاہ ایک ملکی غازی ہیرو کے روپ میں نمایاں حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ اب ہمارا کام قدرے آسان ہو جائے گا۔'' وہ رکی تو میں اندر سے بری طرح الجھ سا گیا۔ اپنے باپ کی نمایاں حیثیت اختیار کرنے کی خوشی اپنی جگہ لیکن مجھے الجھن اس بات پر ہو رہی تھی کہ یہ لوگ آخر کرنا کیا چاہتے تھے؟ میں نے اس کی طرف شاکی نظروں سے گھورتے ہوئے پوچھا۔

''تم لوگ کیا چاہتے ہو؟''

''اپنے آدمی سندر داس کی رہائی۔'' وہ بولی۔

''یہ اب ناممکن ہے۔'' میں نے نفی میں سر ہلایا۔

''تم یہ کام ممکن بناؤ گے۔'' وہ زہریلے لہجے میں بولی۔ اس کی آنکھوں سے یک بیک چنگاریاں سی پھوٹنے لگیں۔

''تو ٹھیک ہے، مجھے میرے ملک پہنچا دو، میں تمہارا آدمی چھڑانے کی پوری کوشش کروں گا۔'' میں نے اس کی ناکامی سے حظ اٹھاتے ہوئے ہلکی سی مسکراہٹ سے کہا تو اس نے نفرت انگیز انداز میں اپنے ہونٹ سکیڑ کر ایک زوردار تھپڑ میرے چہرے پہ رسید کر دیا۔ تھپڑ خاصا زوردار تھا جس نے ایک لمحے کو میرا دماغ ہی جھنجھنا ڈالا تھا۔ مجھے اپنے دائیں گال پر جلن کا احساس ہونے لگا۔ ایک عورت کے ہاتھ کے تھپڑ میں اتنا دم ہونا کوئی اچنبھے کی بات اس لیے نہیں تھی کہ کوریلا کوئی عام عورت نہیں تھی بلکہ تربیت یافتہ بلیوتلسی ایجنٹ تھی۔ اس کے ہاتھ میں ''مردانہ سختی'' یا طاقت، اس کی تربیت کا مظہر تھی۔

''اپنی اوقات میں رہ کر بات کرو اور مذاق مجھے بالکل پسند نہیں۔'' وہ بپھرے ہوئے لہجے میں بولی۔ میں اس کی طرف دیکھ کر تاؤ دلانے والی مسکراہٹ سے بولا۔

''جس کی جان پر بنی ہوئی ہو، وہ بھلا کیا مذاق کرے گا بے چارہ..... تم ہی غلط سمجھی تھیں۔''

''بس! اب بکواس بند.....'' وہ جھٹکے دار لہجے میں مجھے گھور کر بولی۔ ''ہم اپنا ساتھی تمہارے ذریعے ہی آزاد کروائیں گے۔''

''اوہ......'' میں نے ہنوز اسے خار دلانے والے انداز میں اپنے ہونٹ سکیڑے اور استہزائیہ طنز سے بولا۔ ''یعنی قیدی کے بدلے قیدی۔''

''ہاں!'' اس نے اثبات میں اپنا سر ہلایا۔ ''ہمیں اسی موقع کا انتظار تھا جب تمہارے باپ کی حیثیت اور شناخت بڑے پیمانے پر آشکارا ہو، تاکہ تمہاری اہمیت بھی اپنی جگہ تسلیم کی جاسکے اور تم عام انسان نہیں بلکہ اب ایک غازی اور محب وطن سپاہی کے بیٹے بھی کہلاؤ۔ یوں ایک اعلیٰ فوجی اعزاز یافتہ سپاہی کے بیٹے کی واپسی کے لیے تمہارے ملک کی انٹیلی جنس ہمارے آدمی (سندر داس) کو چھوڑنے پر مجبور ہو جائے۔'' وہ اپنے انکشافات بیان کرنے کے بعد میری طرف فاتحانہ مسکراہٹ سے دیکھنے لگی۔ بلاشبہ انہوں نے اپنے تئیں ایک بڑی مضبوط و مربوط چال چلی تھی اور اس بات میں بھی کوئی شک نہ تھا کہ میری اپنی ذاتی حیثیت اپنی جگہ مگر اب میرے باپ کے حوالے سے میری بھی جو شناخت اور اہمیت ڈکلیئر ہو چکی تھی، اس کا کوئی بدل نہیں ہو سکتا تھا۔ میں اپنی اس شناخت پر جتنا فخر کرتا، وہ کم ہوتا، یہی تو وہ شناخت تھی جس کی تلاش میں، میں نے رات دن ایک کر ڈالے تھے اور جس کی وجہ سے میں خود کو ادھورا سمجھتا رہا تھا، اسی شناخت کے حصول نے میری زندگی کا ڈھب بھی بدل کر رکھ دیا تھا۔ اس کے بغیر میں نے نہ جانے کتنے ماہ و سال ایک بے چین سی تڑپ میں بتائے تھے، آج میری برسوں کی وہ دلی تمنا قبول ہو چکی تھی۔ جبکہ وزیر جان کے حوالے سے میں اللہ سے یہی دعا مانگتا رہا تھا اگر خدانخواستہ وہی میری شناخت نکلا تو اس سے بہتر تو میں یتیم ہونے کو ہی ترجیح دیتا یا پھر موت کو۔ ظاہر ہے ایک ملک دشمن اور جرائم پیشہ انسان کی اولاد کہلوانا میرے لیے ڈوب مرنے کا ہی مقام ہوتا۔

تقدیر کی بھی یہ کیسی بوالعجبی تھی کہ اتنی بڑی خوش خبری میں اپنے دشمنوں کے منہ سے سن رہا تھا۔ تاہم میں بہت مطمئن تھا اور اسی طمانیت بھری مسکراہٹ سے میں نے قریب کھڑی کوریلا کی طرف دیکھا۔ وہ بھی میرے چہرے کو تکے جا رہی تھی۔

''ہوں......!'' میں نے ایک ہنکارا بھرا۔ ''تو تم لوگوں کا خیال ہے کہ اس طرح میرے بدلے میں تمہیں اپنا آدمی مل جائے گا......؟''

''ہاں! ہمیں پورا وشواس ہے، کیونکہ تم اب معمولی حیثیت کے آدمی نہیں رہے، ایک اعزاز یافتہ سپاہی کے بیٹے ہو اور اتنے ہی اہم بھی جتنا کہ تاج دین شاہ کی پوری فیملی کو ہونا چاہیے۔'' کوریلا نے مکاری سے مسکراتے ہوئے کہا۔ میں اسے اب کیا بتاتا کہ یہ ان کی کتنی بڑی بھول تھی کہ وہ ایسا سمجھ رہے تھے۔

اول تو میں ایسا خود ہی نہیں چاہ سکتا تھا کہ میرے بدلے میں سندر داس جیسا انتہائی تربیت یافتہ بلیو ٹلسی ایجنٹ ان کے حوالے کر دیا جاتا، نہ ہی میجر ریاض باجوہ وغیرہ ایسا کوئی قدم اٹھانے کا سوچتے بھی، یہ الگ بات تھی کہ وہ دوسرے آپشنز پر غور ضرور کرتے، رہی بات عزیزوں اور بہی خواہوں کی تو وہ بے چارے اس صورتِ حال سے ضرور پریشان اور تشویش زدہ ہو سکتے تھے۔ اسی بات نے مجھے پریشان سا کر ڈالا تھا، جسے بھانپتے ہی کوریلا خوش فہمی کے احساس سے مجھ سے بولی۔

''لگتا ہے اب تمہارے ہوش ٹھکانے آگئے ہیں۔''

''میں تو پہلے ہی ہوش میں تھا اے نازنین ماہ جبیں! لیکن مجھے تم لوگوں کے ہوش میں آنے کا بڑی شدت سے انتظار ہے۔'' کوریلا کا خوب رو چہرہ جو ذرا دیر پہلے میرے چہرے سے جھلکتی عارضی پریشانی کا تاثر بھانپ کر ایک خوش فہمی کے احساس سے گل رنگ ہوا جا رہا تھا، میرے کاٹ دار طنزیہ جواب نے اسے یک دم تاریک کر ڈالا۔ وہ پھر جارحانہ موڈ میں نظر آنے لگی، اس نے مارے طیش کے اپنے ہونٹوں کو دانتوں تلے پیس رکھا تھا۔ میں اس کی طرف بے پروانہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ مزید بھڑکی اور چند قدم آگے بڑھ کر میرے چہرے پر جھکی اور اپنے ہاتھ کی مٹھی میں میرا چہرہ جکڑتے ہوئے دانت پیس کر بولی۔

''ساری اکڑفوں ناک کے راستے نکل جائے گی تمہاری جب تمہارے پیاروں کو یہ پتا چلے گا کہ تم سرحد پار اور کن لوگوں کی گرفت میں ہو اور ان کی نیندیں حرام ہو جائیں گی۔''

''تمہارا ہاتھ بہت نرم اور گداز ہے۔'' میں نے

پُرسکون لہجے میں کہا۔ ''ایسے خوب صورت ہاتھ کی گرفت بھی پھولوں کے جیسی لگتی ہے...... آہ! پلیز، تھوڑی دیر اور تھامے رکھو اسی طرح میرے چہرے کو......''

میری اس بات نے جیسے جلتی پر تیلی کا کام کیا، وہ پہلے سے زیادہ بھڑک اٹھی، اس کے حسین تمتماتے چہرے سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس کا بس نہیں چل رہا کہ وہ اپنے لمبے ناخنوں سے میرا چہرہ کھرونچ ڈالے، کیونکہ اس کا خیال تھا کہ میں اس کی بات یا اس کے انکشاف سے پریشان ہو جاؤں گا اور ان سے کسی رعایت کی بھیک مانگوں گا، جبکہ اس کے برعکس میں نے اس کی سب باتوں کو محض استہزا آمیز مذاق میں اُڑا دیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس کے ہاتھ کی ''خوب صورت'' گرفت میرے چہرے پہ لمحہ بہ لمحہ بڑھتی چلی گئی، حتیٰ کہ اس کے ناخن تک میری ٹھوڑی اور گال کی جلد میں دھنسنے کے قریب ہو گئے، میرا چہرہ اتنا چھوٹا نہ تھا کہ اس کے ایک ہاتھ کی گرفت میں ہی سما جاتا مگر جتنا سما سکتا تھا اتنا وہ اسے گھائل کرنے کی کوشش میں لگی رہی اور بالآخر میں نے ہنسنا شروع کر دیا...... اس نے ایک جھٹکے سے میرا چہرہ چھوڑ دیا۔

اسی وقت کمرے میں قدموں کی آہٹ ابھری، جسے سن کر وہ یک دم ایک طرف ہو کر کھڑی ہو گئی لیکن اس کی نگاہیں بار بار دروازے کا جائزہ لے رہی تھیں۔

وہ چار افراد تھے جو دروازے سے اندر داخل ہو رہے تھے۔ کرنل سی جی بھجوانی، چندرناتھ، شیام اور چوتھا کوئی مخصوص وردی پہنے ہوئے ان کا ہی ساتھی ایجنٹ نظر آتا تھا۔ (یہ کل والا آدمی نہیں تھا)

اندر داخل ہوتے ہی کرنل سی جی نے اپنی کینہ توز نظریں میرے چہرے پر جما دیں۔ مجھے وہ خاصا خار کھایا ہوا نظر آ رہا تھا۔ پھر اس نے کوریلا کی طرف دیکھ کر اپنے سر کو ہولے سے جنبش دی، جسے سمجھ کر کوریلا نے فوراً اپنی وردی کے اندر سے ایک بڑا سا اسمارٹ فون نکالا اور پھر کوئی نمبر پنچ کرنے لگی۔ رابطہ ہوتے ہی اس نے فون کان سے لگا لیا۔

میں اب اپنی آنکھیں ذرا سکیڑے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

میرے اندر دھکڑ پکڑ جاری تھی۔ دوسری طرف سے ہیلو کی آواز ابھری۔ غالباً اس نے اسپیکر آن کر رکھا تھا۔

''ہیلو'' کی آواز پر میں نے غور کیا لیکن وہ میرے لیے اجنبی تھی۔ میں نہیں جانتا تھا کہ کوریلا نے کہاں کا نمبر ملایا ہوگا؟ خیال یہی تھا کہ بیگم ولا کا نمبر ملایا ہوگا جس کی فوراً ہی تصدیق بھی ہو گئی جب کوریلا نے دوسری طرف سے ہیلو کی آواز سنتے ہی استفساریہ کہا۔

''یہ بیگم ولا کا نمبر ہے؟''

''جی ہاں! آپ کو کس سے بات کرنی ہے اور آپ کون صاحبہ بول رہی ہیں؟'' دوسری جانب سے پوچھا گیا۔ وہ شاید زہرہ بانو کا کوئی آدمی تھا۔

''مجھے کسی ذمے دار آدمی سے بات کرنی ہے، شہزاد احمد خان شہزی کے سلسلے میں۔''

کوریلا کی اس بات پر دوسری جانب چند لمحے کے لیے سناٹا چھا گیا۔ پھر ہولڈ کرنے کے لیے کہا گیا، اس کے ذرا ہی دیر بعد ایک بے چین، گھبرائی ہوئی متوحش سی نسوانی آواز ابھری۔

''ہ...... ہیلو...... کک...... کون؟ شش...... شہزی......؟ کون بول رہا ہے؟''

اس آواز کو میں پہچان گیا تھا، یہ زہرہ بانو تھی۔ کوریلا نے سرد وسپاٹ لہجے میں کہا۔

''ہیلو، اپنا تعارف کرواؤ، تم کون ہو؟''

''میں زہرہ بانو ہوں......'' دوسری جانب سے زہرہ بانو کی آواز ابھری۔ اس کی آواز میں اعتماد آنے لگا تھا، اور وہ شاید خود کو بھی کچھ سنبھالنے لگی تھی۔ اِدھر کوریلا نے ایک نگاہ اپنے چیف پر ڈالی۔ کرنل سی جی نے ہولے سے اپنے سر کو اثباتی جنبش دی۔

''شہزاد احمد خان ہمارے پاس ہے، زندہ سلامت......''

''لیکن تم کون ہو؟''

''بات مت کاٹو، اور صرف ہماری سنو۔'' کوریلا نے زہریلے لہجے میں کہا۔ اس سے اس کا چہرہ وہ لگ ہی نہیں رہا تھا جو پہلے مسکراتا رہتا تھا، وہ پل کے پل مجھے ایک زہریلی ناگن کے روپ میں نظر آنے لگی تھی۔

''شہزاد خان اس وقت تک ہمارے پاس زندہ اور محفوظ رہے گا، جب تک ہمارا مطالبہ تسلیم نہیں کر لیا جاتا۔''

''کیا مطالبہ ہے تم لوگوں کا؟'' اسمارٹ فون کے اسپیکر پر زہرہ بانو کی آواز ابھری، لہجہ اس نے اپنا مضبوط رکھنے کی کوشش کی تھی لیکن اس کی تہ میں چھپی ہوئی تشویش بھی ہویدا تھی۔

''پہلے اپنے آدمی سے بات کر لو، تاکہ تمہاری تسلی ہو جائے کہ ہم جھوٹ نہیں بول رہے ہیں۔'' یہ کہتے ہوئے کوریلا نے فون میرے کانوں سے لگا دیا۔

''ہیلو...... ہیلو...... شہزی! تت...... تم ٹھیک تو ہو ناں......؟ ی...... یہ کون لوگ ہیں؟ تم کہاں ہو؟'' دوسری

جانب سے زہرہ بانو کی ہراساں سی آواز ابھری۔

’’میں...... جہاں بھی ہوں، بالکل محفوظ...... ہوں اور میرے بارے میں تم لوگوں کو...... پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں...... او......!‘‘ آخری لفظ میرے منہ میں ہی رہ گیا تھا، کیونکہ اسی وقت پاس کھڑے کرنل سی جی نے میرے لات رسید کر کے مجھے کرسی سمیت الٹ دیا تھا۔ کوریلا یک دم ایک طرف ہو گئی اور سی جی کی طرف دیکھنے لگی، اس کا سیاہ رُو چہرہ شدتِ غیظ تلے لال بھبوکا ہو رہا تھا۔ اس نے آگے ہاتھ بڑھایا اور کوریلا نے اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا سیل اس کی جانب بڑھا دیا۔

’’سنو......! شہزاد خان کو واپس اور زندہ سلامت دیکھنا چاہتے ہو تو ہمارا آدمی تم لوگوں کو واپس کرنا پڑے گا، ورنہ ہم اس کا وہ حشر کریں گے جو اس کے باپ تاج دین شاہ کا کیا تھا، بلکہ اس سے بھی برا ہو گا اس کے ساتھ اگر تم لوگوں نے ہمارا مطالبہ تسلیم نہ کیا۔‘‘

کرنل سی جی بھجوانی باؤلے کُتّے کی طرح بولے جا رہا تھا، اس کی حالت واقعی ایک خارش زدہ کُتّے کے جیسی ہو رہی تھی۔

میں ابھی تک رسن بستہ حالت میں سیلن زدہ، ننگے فرش پر لڑھکا پڑا ہوا تھا۔ کرسی ایک طرف کو الٹی پڑی تھی۔ کرنل سی جی بھجوانی کی غصیلی اور غراتی ہوئی آوازیں میرے کانوں میں پگھلے ہوئے سیسے کی طرح اتر رہی تھیں۔ وہ بدبخت ہنوز زہرہ بانو سے مخاطب تھا۔

اس مردود نے اپنے بھاری بھرکم بوٹ کی لات میرے پیٹ پر رسید کی تھی، جس کے باعث مجھے اپنے پیٹ میں خاصی دیر تک اینٹھن کا احساس ہوتا رہا تھا۔

’’غور سے سن لو، شہزاد اس وقت تم لوگوں کی سوچ سے بھی میلوں دور ہے، جہاں چڑیا کا بچہ بھی پر نہیں مار سکتا، اس لیے کسی فضول قسم کی مہم جوئی کا خیال بھی اپنے دل میں مت لانا، صرف معاملے کی بات ہو گی، اِس ہاتھ لو اُس ہاتھ دو......‘‘

’’وہ...... دیکھو! پہلے ہمیں پتا تو چلنا چاہیے کہ شہزاد اس وقت کن لوگوں کی قید میں ہے اور......؟‘‘ دوسری جانب سے زہرہ بانو کی پریشان کن آواز ابھری تھی، جبکہ سی جی درمیان میں ہی اس کی بات کاٹ کر بھیڑیے جیسی غراہٹ خارج کرتے ہوئے بولا۔

’’زیادہ چالاک بننے کی کوشش تمہیں مہنگی پڑ سکتی ہے، صرف معاملے کی بات سننا ہے تو آگے بات کی جائے، بہ صورتِ دیگر...... شہزاد گیا......‘‘ اس کے لہجے سے سفاکی عیاں تھی۔

’’نن...... نہیں، میں معاملے کی بات کی طرف آ رہی ہوں، مجھے بتاؤ، ہمیں کیا کرنا ہو گا؟‘‘

’’رینجرز فورس کے میجر ریاض باجوہ کے قبضے میں ہمارا ایک اہم آدمی سندر داس ہے، وہ ہمیں چاہیے۔ تمہیں، شہزاد مل جائے گا۔‘‘ سی جی نے کہا اور ساتھ ہی اس نے قریب کھڑے شیام کو اشارہ کیا، اس نے اپنے چیف کا اشارہ بھانپ کر فوراً کرسی سیدھی کی اور مجھے بازوؤں سے سنبھال کر اس پر دوبارہ بٹھا دیا۔

پیٹ میں سی جی بھجوانی کے بھاری بوٹ والی لات نے مجھے اندر سے سخت تکلیف میں مبتلا کر دیا تھا، دونوں ہاتھ میرے، پشت کی طرف بندھے ہونے کے سبب میں دہرا ہو کر پیٹ تھامنے سے قاصر تھا۔ کرسی بھی بغیر پشت گاہ والی تھی، میں ٹیک بھی نہیں لگا سکتا تھا اور مجھے اکڑ کر اس پر بیٹھنا پڑ رہا تھا۔

’’لیکن ہم یہ کام کیسے کر سکتے ہیں؟ ہمارا تو ان کے ساتھ ایسا کوئی ایشو نہیں ہے؟‘‘ زہرہ بولی۔

’’تم نے فقط میجر ریاض باجوہ کو اطلاع پہنچانی ہے اور ہمارے درمیان تم رابطے کا کام کرو گی، بس!‘‘ بھجوانی زہرخند آواز میں بولا۔

’’یہ مشکل ہو گا، ہمارا اُن کے ساتھ کوئی بھی قریبی تعلق نہیں ہے۔ نہ ہی وہ ہماری کسی بات پر بھروسا کریں گے۔‘‘

’’مجھے جو کہنا تھا کہہ دیا، اب تم جانو اور تمہارا کام......‘‘ کرنل بھجوانی بولا۔ ’’جب تک ہمارا مطالبہ تسلیم نہیں کر لیا جاتا، تب تک شہزاد ہماری قید میں رہے گا اور ہمارا قید خانہ کسی ٹارچر سیل سے کم نہیں، جلدی ہمارا کام کرو اور شہزاد کو ہر روز توڑے جانے والے تشدد سے بچا لو، آخر کو وہ ملک کے ایک عظیم سپاہی کا بیٹا ہے، اس کی رہائی کے سلسلے میں بہت کچھ کر سکتے ہو تم سب...... ہاں! معاملہ رازداری کا متقاضی ہے، بالکل اسی طرح جس طرح ہمارے آدمی کے سلسلے میں رازداری برتی جا رہی ہے، بہ صورتِ دیگر...... آگے تم لوگ خود سمجھ دار ہو......‘‘ اس نے تہدیدی انداز میں دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

رابطہ منقطع کرنے کے بعد کرنل بھجوانی نے فون دوبارہ کوریلا کی طرف بڑھا دیا اور تحکمانہ انداز میں بولا۔

’’آئندہ تم یا شیام ان لوگوں سے رابطے میں رہو گے، اس کے بعد کی بریفنگ چندر ناتھ تمہیں دیتا رہے گا، دیٹس اِٹ۔‘‘

اپنے چیف کی بات پر تینوں نے مؤدبانہ انداز میں

وہ اپنے سرخم کیے تھے۔ تاہم چندر ناتھ نے پوچھا۔

''چیف! کیا اسے اب واقعی کو ہارا کو کب سپرد کرنا ہوگا؟'' اس کا اشارہ میری طرف تھا اور میں اپنے پیٹ کی تکلیف بھلا کر اس کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ کرنل بھجوانی نے اس کی طرف دیکھ کر سنجیدہ لہجے میں کہا۔

''ہمارے اسپیکٹرم اور لولووش کے ساتھ دیرینہ اور مشترکہ مفادات وابستہ ہیں، ہم اسے ہرگز ناراض کرنے کا خطرہ نہیں مول لے سکتے، ابھی ان کا ایک اہم مہرہ وزیر جان پاکستان میں موجود ہے اور پاکستان کے خلاف ہماری دیرینہ سازشوں کے سلسلے میں وہ ہمارے بھی کام آتا رہے گا...... اس لیے یہ اسپیکٹرم کی قید میں رہے یا ہماری، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یہ ہمارا مشترکہ قیدی ہے۔''

''لیکن سر! اگر ہمارا مطالبہ مان لیا گیا تو ہمیں اس کی (میری) ضرورت پڑ سکتی ہے لیکن اس وقت یہ......'' کوریلا دانستہ ہی کچھ کہتے کہتے رکی تھی۔

''آئی نو دیٹ، اٹس او کے!'' کرنل بھجوانی نے اپنے ایک ہاتھ کے اشارے سے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''ہمیں ابھی اس سے جو مقصد حاصل کرنا تھا کر لیا، پاکستانی رینجرز فورس نے اب تک سندر داس سکینہ کو انٹیلی جنس کے حوالے کر دیا ہوگا۔ جبکہ اس کے (میرے) بہی خواہ ہاتھ جھاڑ کر ان کے پیچھے پڑ جائیں گے، اس طرح سندر داس کو وہ لوگ اتنی جلدی موت سے ہمکنار کرنے کا سوچیں گے بھی نہیں۔ مجھے آشا تو ہے کہ پاکستانی انٹیلی جنس اپنے غازی اور اعزاز یافتہ سپاہی کے بیٹے کو ہمارے آدمی کے بدلے میں تبادلہ کروانے پر مجبور ہو جائیں، مگر اس کے (میرے) بہی خواہ بھی کم نہیں ہیں کسی سے، وزیر جان اور وہاں موجود ہمارے چند بچے کھچے ایجنٹوں کی انفارمیشن کے مطابق شہزاد کے ساتھی اس پر جان چھڑکتے ہیں۔ ان کا وہاں ایک مضبوط گروہ ہے، جو اپنا ایک اثر رکھے ہوئے ہیں۔''

''چیف! یہ بھی ہو سکتا ہے کہ شہزاد کے ساتھی ہماری بات ماننے کے بجائے اپنے ساتھی کو چھڑانے کے لیے ہمارے خلاف خفیہ کمانڈو ایکشن کرنے کی کوشش کریں؟'' شیام نے اپنا نقطہ نظر پیش کیا تو سی جی بھجوانی نے ایک استہزائیہ سی نگاہ میرے چہرے پر پھینکتے ہوئے اسی لہجے میں کہا۔

''یہ پھر اپنی موت کو دعوت دینے کے مترادف ہوگا۔ گڈ لک......'' وہ یہ کہہ کر اپنے آدمیوں کے ساتھ کمرے سے نکلتا چلا گیا۔

یہ لوگ میرے سامنے اس قدر یقین سے یہ سب باتیں کر رہے تھے جیسے میں واقعی ہمیشہ کے لیے ان کی قید میں آ چکا ہوں اور دنیا کی کوئی طاقت مجھے ان کی ''مشترکہ'' قید سے نہیں چھڑا سکتی تھی۔ یہی زعم اور غرور انسان کو لے ڈوبتا ہے، کرنل بھجوانی اور لولووش اسی غرور میں مبتلا تھے۔

بے شک ان لوگوں نے مجھے ایک مربوط پلاننگ کے بعد نہ صرف بے دست و پا کر دیا تھا بلکہ سرحد پار پہنچا دیا تھا اور اب بھی نجانے میں اور کہاں کہاں کن کن لوگوں کے مفاد کے لیے پہنچایا جانے والا تھا؟ اس کا مجھے کچھ کچھ اندازہ تو ہو چلا تھا مگر سرحد پار میرے ساتھ کھیلے جانے والے اس ہولناک کھیل میں تن تنہا ان سارے حالات کا خود ہی اللہ کے بھروسے پر مقابلہ کرنا تھا، جو معمولی بات نہ تھی لیکن مجھے اصل فکر اپنی نہیں، بلکہ پاکستان میں موجود میرے ساتھیوں کی تھی جو بے چارے اس صورتِ حال سے کس قدر پریشان ہو رہے ہوں گے، اول خیر اور شکیلہ سمیت وہ بھی میرے پیارے اور خیر خواہ...... سمجھ تو جائیں گے کہ میں کن لوگوں کی قید میں ہو سکتا ہوں۔ وہ بھی یقیناً اتنی دور بیٹھے میری رہائی کے لیے کوئی لائحہ عمل سوچ سکتے تھے مگر انہیں کیا معلوم تھا کہ میں اب کہاں کہاں در بدر کیا جانے والا تھا؟ اور وہ اپنی اس خطرناک مہم میں کہاں تک کامیاب ہو سکتے تھے؟ یہ وہ نہیں جانتے تھے مگر مجھے اس کا اندازہ تھا کہ وہ بھی اس سلسلے میں کچھ نہیں کر سکتے تھے۔

ایک مسلمان کی حیثیت سے مایوسی میرے نزدیک گناہ کے مترادف تھی۔ اس گناہ کا تو میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا اور ڈٹ کر، ایک چیلنج سمجھ کر میں نے ایسے حالات کا مقابلہ کیا تھا، جب موت کو میں نے اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھا تھا۔

بے شک میں اب تک اپنی زندگی کے بہت خراب اور غیر یقینی حالات سے گزرتا رہا تھا، بلکہ جم کر اس کا مقابلہ بھی کیا تھا مگر یہاں معاملہ اور ہی لگتا تھا۔ سرحد پار، بے سروسامانی کے عالم میں ایک ملک سے دوسرے ملک شروع ہونے والی، براعظم، براعظم آوارہ گردی، اسے میں حالات کا دھارا کہوں یا ستم تقدیر...... لیکن اب تک میں نے جس سے استادی سیکھی تھی، وہ حالات کا یہی بہتا دھارا ہی تو تھا۔

☆☆☆

میں اپنی زندگی میں اس طرح کی پہلی بار ہی رہائی نما ''قید'' کو دیکھ رہا تھا، جب مجھے ''یوز ٹو'' کرنے کے بعد دوبارہ اسی طرح واپس وہیں پہنچایا جا رہا تھا، جہاں سے لایا

گیا تھا لیکن وہ کہتے ہیں ناں کہ کوئی بھی شے اپنی جگہ سو فیصد پرفیکٹ نہیں ہوتی۔ کہیں نہ کہیں رتی ماشہ کا کھوٹ، انیس بیس کا فرق رہ جاتا ہے، تو یہاں بھی میرے ساتھ یہی ہوا۔

جب مجھے لولوش کے دستِ راست کوبارا کی بوٹ کی طرف روانہ کیا جا رہا تھا تو میری آنکھوں پہ پٹی کو شاید عجلت میں باندھا گیا تھا، جس کے باعث میری ایک آنکھ کی اوپری طرف ایک باریک سی درز کھلی رہ گئی تھی۔ میں جانتا تھا کہ اس کا میری رہائی یا فرار سے کوئی تعلق نہیں ہوسکتا لیکن میں وطن دشمنوں کا یہ ٹھکانا اپنی یادداشت میں محفوظ تو رکھ سکتا تھا، جہاں بیٹھ کر میرے وطن کے لیے گھناؤنی سازشیں تیار کی جاتی تھیں اور یہی وہ جہنم کدہ تھا، جہاں میرے باپ پر اس درندہ صفت انسان، کرنل سی جی بھجوانی نے طرح طرح کے ظلم کے پہاڑ توڑے تھے۔

یہ بھی شکر تھا کہ وقت دن کا ہی تھا، ورنہ رات کی تاریکی میں مجھے شاید گردوپیش کے اس محلِ وقوع کا اتنا پتا نہیں چلتا۔

سب سے پہلے میں نے کمرے سے نکلتے وقت اس باریک جھری سے جائزہ لینا شروع کیا۔ میں جس سیلن زدہ اور ننگی اینٹوں والے کمرے میں تھا، وہ کمرا وہاں صرف ایک ہی نہیں تھا، ایسے اور کمرے بھی مجھے ایک راہداری سے گزرتے ہوئے دائیں بائیں دکھائی دیے تھے، ان میں بیشتر سے تو مجھے چیخنے چلّانے کی بھی آوازیں سنائی دی تھیں، یہ مجھے پورا ہی ایک ٹارچر سیل ہی کی طرح لگا تھا۔ دو تین موڑ کاٹنے کے بعد مجھے ایک سنگل پٹ والے دروازے سے باہر نکالا گیا تو مجھے یوں لگا جیسے کسی پرانی کلاسک بلیک اینڈ وائٹ فلم کا منظر یک دم بدل گیا ہو اور اس کی جگہ کسی نئی رنگین فلم کا منظر آگیا ہو۔

ایک چکنے فرش والا وسیع و عریض ہال تھا۔ یہاں مجھے کچھ مسلح وردی پوش دکھائی دیے، نیم دائرے کی شکل میں میزیں تھیں، گول موٹے ستون تھے اور کہیں ایک دو جگہ پر پینل نصب تھے، جہاں چھوٹی بڑی اسکرینز جرک کرتی نظر آتیں، مجھے سیدھے ہاتھ لے جا کر ایک سلائڈنگ ڈور سے باہر نکالا گیا اور یہاں سے ایک قدرے طویل راہداری پر چلتے ہوئے ہم وسیع و عریض احاطے میں آگئے، جہاں درمیان میں ایک ہیلی پیڈ بنا ہوا تھا۔ وہاں ایک ہیلی کوپٹر پہلے سے موجود تھا، یہ شاید وہی تھا جس میں ہم سوار ہو کر گزشتہ شب یہاں پہنچے تھے۔ پٹی کی ''اتفاقیہ'' جھری سے جھانکتے ہوئے میں نے دھیان رکھا تھا کہ ''اندھے پن'' کی اداکاری باری رکھوں اور گردوپیش کے جائزے لینے میں احتیاط برتوں تاکہ کسی کو مجھ پر شبہ نہ ہونے پائے۔

میرے ہمراہ اس بار صرف شیام اور کوریلا تھے، چندرناتھ اس مرتبہ نہیں چلا تھا۔ یہ دونوں مجھے لیے ہیلی کوپٹر کے پچھلے حصے میں سوار ہوگئے۔ پائلٹ اندر موجود تھا۔ ہمارے سوار ہوتے ہی کوپٹر کے دیوہیکل پنکھے حرکت میں آگئے اور اس کے ذرا دیر بعد وہ فضا میں بلند ہوگیا۔ یہاں سے بھی میں نے گردوپیش پر نظر ڈالنے کی کوشش چاہی تھی، کافی کوشش اور وقت طلب حرکات و سکنات کے بعد مجھے آس پاس نیچے خاصا بڑا جنگل پھیلا ہوا نظر آیا تھا۔

ہیلی کوپٹر جس رخ پر تھا وہاں نیچے مجھے ایک بل کھاتی ندی دکھائی دینے لگی، جس کے اطراف میں بھی خاصا بڑا گھنا جنگل تھا، اس کے بعد جنگل کی حدود تمام ہوتے ہی بنجر پہاڑیاں اور سنگلاخ ویرانے تھے، پار اس کے پہنچے تو مجھے ریت کے میدان نظر آنے لگے، میں ان ساری نشانیوں کو ذہن میں رکھتا گیا، ایک مینار بھی نظر آیا جس کی حالت خستہ تھی، یہ شاید ساحلی علاقہ تھا اور کبھی یہ مینار ''واچ ٹاور'' کے طور پر استعمال ہوتا ہوگا۔ اب یہاں چیلوں اور کوؤں نے گھونسلے بنالیے تھے، وہی اس کے گرد منڈلاتے ہوئے مجھے دکھائی دیے تھے۔ کیونکہ اس کے بعد سمندر کی حدود شروع ہوگئی تھی۔

ہیلی کوپٹر اب قدرے نیچی پرواز پر تھا۔ جہاں اس کا رخ تھا وہیں نیچے مجھے ایک لانچ ساحل کنارے دکھائی دی، ہیلی کوپٹر اس کے قریب جا اترا، مجھے نیچے اتارا گیا، اس کے بعد لانچ کی طرف بڑھے۔ اس میں چار مسلح افراد موجود تھے، ہم عرشے پر ہی کھڑے رہے، لانچ کا انجن، شاید ہیلی کوپٹر کو فضا میں گردش کرتے دیکھتے ہی اسٹارٹ کردیا گیا تھا، ہمارے سوار ہوتے ہی لانچ گڑگڑاتے ہوئے کھلے سمندر کی طرف بڑھ گئی اور بتدریج اس کی رفتار تیز ہوتی چلی گئی۔

مجھے کچھ تسلی اور اطمینان ہوا کہ میں کرنل سی جی بھجوانی کی قید سے تو نکلا، ورنہ وہ خبیث درندہ صفت انسان میرا جانے کیا حشر کرنے والا تھا لیکن مجھے لولوش یا کوبارا سے بھی خیر کی کوئی امید نہ تھی۔ وہ میرے لیے اس سے بھی بڑھ کر جلاد ثابت ہوسکتے تھے۔ گویا میں ان کے بیچ کھلونا بنا دیا گیا تھا، جو چاہے لیتا اور مجھ سے کھیلنا شروع کردیتا۔ آج مجھے لگ پتا رہا تھا کہ سرحد پار کی جنگ کیا ہوتی ہے، انسان خود کو بالکل بے دست و پا سمجھنے لگتا ہے۔ جائے تو کہاں جائے، والی صورتِ حال ہوتی ہے اس کے لیے۔

تھوڑی دیر بعد ہماری لانچ کوہارا کی عالیشان ''بوٹ'' سے جا لگی۔ ایک خودکار سیڑھیوں کے ذریعے کوریلا اور شیام مجھے لے کر بوٹ پر اترے، اور حسب وعدہ مجھے انہوں نے کوہارا کے حوالے کر دیا اور اس سے تھوڑی دیر تک باتیں کرنے کے بعد واپس لوٹ گئے۔

سمندر پر نکلا یہ دن پوری تب و تاب سے چمک رہا تھا۔ اوپر کھلے نیلے آسمان پر آبی پرندے اُڑتے پھر رہے تھے۔ موسم خاصا خوشگوار ہو رہا تھا۔ میں عرشے پر ہی موجود تھا جہاں کوہارا اور اس کا بری نسل کا آدمی بھومک موجود تھا، چند دیگر خلاصی بھی تھے، وہ اِدھر اُدھر مصروف سے نظر آ رہے تھے۔ کوہارا وہیں عرشے پر دھری فولڈنگ چیئر پر ٹانگیں پھیلائے بیٹھا تھا، اس کے سامنے میز پر ناشتے وغیرہ کا سامان رکھا ہوا تھا، دو تین ناریل بھی پڑے تھے، وہی دونوں انڈین لڑکیاں اس کے قریب بیٹھی ناریل کی ''آنکھ'' پھوڑے ان میں اسٹرا ڈالے اس کا پانی پینے میں مشغول تھیں۔

''بیٹھو! ناشتا کر لو، معاف کرنا، کل تو میں نے تمہیں کھانے کا کچھ پوچھا ہی نہیں، بھوک تو لگی ہوگی تمہیں، آجاؤ۔'' وہ میری طرف دیکھ کر کھرکھراتی آواز میں بڑے سکون پرور لہجے میں بولا۔ میں جانتا تھا کہ اس ''سکون'' کی تہ میں کس قدر اچانک اور قہر بار طوفان چھپا رہتا ہے۔ بھوک تو مجھے جانے کب سے لگی ہوئی تھی۔

میں خاموشی سے اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ میز پر ناشتے کے نام پر سی فوڈ ہی کی بہتات نظر آ رہی تھی، جن میں تلی ہوئی فش، کچھ شکاری پرندوں کے بھنے ہوئے سالم پٹھور کے علاوہ ابلے ہوئے انڈے اور جیم، بٹر اور بریڈ وغیرہ رکھے تھے۔ آبِ ارغواں کی دو بوتلیں اور تین پیگ بھی رکھے تھے۔ چائے یا کافی کا فلاسک بھی نظر آتا تھا۔

میرے دونوں ہاتھ ہنوز پشت کی سمت بندھے ہوئے تھے، اور میرا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ سوالات تو بہت کلبلا رہے تھے میرے ذہن میں، جنہیں نوکِ زباں پر میں نہیں لا سکتا تھا، اسی لیے خاموش بیٹھا رہا تو اس نے قریب کھڑے بھومک کو اشارہ کیا، اس نے فوراً آگے بڑھ کر میرے دونوں ہاتھوں کے جکڑ بند کھول دیے۔

ایک ہی رخ پر اور کافی دیر تک دونوں ہاتھ بندھے رہنے سے میرے دونوں بازوؤں میں اینٹھن سی ہونے لگی تھی۔ اسی لیے آزاد ہوتے ہی میں نے پہلے اپنے دونوں اکڑے ہوئے ہاتھوں کو وارم اپ کیا، پھر کوہارا کا شکریہ ادا کر کے میں بھی ناشتے پر گویا ٹوٹ پڑا تھا۔ میں دانستہ ندیدے پن کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ مقصد یہی تھا میرا کہ کوہارا...... نے مجھ سے متعلق اپنے اندر جو تاثر قائم کر رکھا تھا، میں اس کی نفی کرتا رہوں، ورنہ وہ صرف ''تذکرے'' کی حد تک ہی میری خطرناکیوں سے واقف تھا۔ دونوں انڈین لڑکیاں مجھے اس طرح ناشتا کرتے ہوئے دیکھ کر ہولے سے ہنسی تھیں، میں نے بھی ان کی طرف جھینپی جھینپی مسکراہٹ سے دیکھا تھا۔

ناشتے کے بعد میں ایک مگ میں کافی انڈیل کر پینے لگا۔ کسی نے صحیح تو کہا ہے کہ خالی پیٹ انسان کی عقل بھی کام نہیں کرتی ہے نہ دماغ۔ قوتِ بخش ناشتا کرنے کے بعد میں اپنے جسم میں توانائی سی محسوس کرنے لگا تھا۔ ساتھ ہی میں نے تیزی سے سوچنا شروع کر دیا تھا اور منتظر تھا کہ کوہارا اپنی زبان خود ہی کھولے، مجھے اس سے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہ پڑے، ورنہ کم بخت پھر مجھے زخمی کر سکتا تھا۔ جبکہ زبان بھی ابھی میری پوری طرح سے ٹھیک نہیں ہو پائی تھی، اگرچہ پہلے کی نسبت کافی افاقہ تھا۔

''ناشتے کا شکریہ! میں تمہارا اور گریٹ ماسٹر کا مشکور ہوں کہ ایک قیدی کی حیثیت دینے کے باوجود مجھے یہاں دوستانہ ماحول دے رکھا ہے۔'' میں نے اس کا منہ کھلوانے کے لیے چالاکی سے اس کی اور لولووش کی تعریف بھی کر ڈالی اور حسب توقع کوہارا نے بھینچی بھینچی مسکراہٹ سے میری طرف دیکھ کر اپنے اور اپنے ''گریٹ ماسٹر'' کی شان میں قصیدہ پڑھنا شروع کر دیا۔

''گریٹ ماسٹر کا یہی انداز ہوتا ہے ہمیشہ، حالانکہ تم اس کے دشمن نمبر ایک ہو مگر پھر بھی اس نے تمہارے سلسلے میں مجھے یہی حکم دے رکھا ہے کہ میں تم پر اس وقت تک کسی قسم کی سختی نہ برتوں جب تک کہ تم بلا ضرورت اپنا منہ نہیں کھولو گے۔''

''میں اب یہی کر رہا ہوں......'' میں نے گرما گرم کافی کا ایک تلخ گھونٹ بھر کے کہا۔

''لیکن گریٹ ماسٹر کی دشمنی والی بات پر میں شرمندہ ہوں کہ ایسا نہیں ہے، میں تو آج تک گریٹ ماسٹر سے ملا بھی نہیں ہوں مگر ہو سکتا ہے کہ نادانستہ طور پر بلاواسطہ ہمارے بیچ کچھ ہو گیا ہو تو اس کی معذرت چاہوں گا۔'' میں چاہتا تھا کہ وہ میری اس بات پر کوئی تبصرہ کرے تاکہ بات سے بات نکلتی رہے مگر وہ اچانک بات بدل کر مجھ سے مستفسر ہوا۔

''ان لوگوں نے تم پر کسی قسم کا کوئی تشدد تو نہیں کیا تھا؟'' میں اس کا اشارہ سمجھ کر نفی میں سر ہلاتے ہوئے جواباً

بولا۔ ''نہیں، ادھار تو وہ مجھ پر بہت کھائے بیٹھے تھے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس میں بھی گریٹ ماسٹر کی مہربانی کا دخل ہوگا، ورنہ تو کرنل بھجوانی مجھے چھوڑنا تو کجا، یوں بغیر کوئی گزند پہنچائے رہ بھی نہیں سکتا تھا، جس قدر وہ مجھ پر بھرا بیٹھا تھا۔''

''ہوں ں ں......'' اس نے صرف ایک ہنکارا بھرا اور پھر مجھے اس وقت مایوسی ہوئی جب اس نے قریب دست بستہ کھڑے بھوک کو مخصوص اشارہ کیا اور اس نے مجھے اپنے ساتھ چلنے کا اشارہ کیا۔

تھوڑی دیر بعد ہی میں اسی کمرے میں تھا، جہاں پہلے میں مقید تھا، اس بار بھی مجھے میرے بنک بیڈ کی راڈ کے ساتھ ہتھکڑی لگا کر باندھ دیا گیا۔ وہاں وہی کل والا میرا ہم وطن قیدی بھی اپنے بنک بیڈ پر دراز حالت میں موجود تھا مگر اس کی ہیئت کذائی دیکھ کر مجھے ایک جھٹکا لگا، وہ خاصا زخمی حالت میں تھا، پہلی ہی نگاہ میں مجھے یہ احساس ہو چلا تھا کہ اس بے چارے پر خاصا تشدد کیا گیا تھا۔ میری سوئی ایک بار پھر اپنے حالات سے ہٹ کر پھر اس پر اٹک گئی۔

اس کی بے رخی کے باوجود مجھے اس پر ترس آیا، وہ بہر حال میرا ہم وطن تھا اور میری طرح غیروں کی قید میں تھا، یہ تھا کون اور کیوں ان کی قید میں تھا؟ یہ ایک بڑا سوالیہ نشان تھا میرے ذہن میں لیکن یہ مجھ سے کسی بھی قسم کے تعاون پر رضامند نہیں ہوا تھا، نا کچھ بتاتا بھی تھا اپنے بارے میں، اس بے وقوف کو میں نے پہلے اشاروں میں اور پھر واضح لفظوں ... میں یہ باور بھی کروانے کی کوشش چاہی تھی کہ ہم دونوں ایک سے دو بھلے تھے اور محاورتاً نہیں بلکہ حقیقتاً ایک ہی کشتی کے بھی سوار تھے مگر وہ اپنی ہٹ کا پکا نکلا تھا، اس نے میرے ساتھ ذرا بھی تعاون کر کے نہیں دیا۔

خیر، بھوک کی موجودگی میں، میں نے اس پر کوئی توجہ نہیں دی۔ اس کے کمرے سے نکلتے ہی میں اس کی طرف متوجہ ہوا۔ اب وہ ہولے ہولے کراہنے لگا تھا، اس کے دونوں ہاتھ بنک کے آہنی راڈ سے بندھے ہوئے تھے۔ میں نے بہ غور اس کے زخموں کا جائزہ لیا، اس کے چہرے، ماتھے اور بازوؤں پر سوجن تھی اور ٹانگوں میں بھی زخم محسوس ہوا تھا، کیونکہ اس کی ٹائٹ پینٹ پر پنڈلی اور ران کی طرف خون جم کر اپنی رنگت بدلنے لگا تھا، یہی حال اس کے سینے، پشت اور پہلو کا تھا۔

''کیا ہوا دوست؟ انہوں نے تمہیں اتنا کیوں مارا ہے؟'' میں نے کہتے ہوئے اس کا گال ہولے سے تھپتھپایا اور ساتھ ہی اسے ہوش دلانے کی بھی کوشش چاہی۔

''آ آ...... آہ...... ب...... بہت مارا ہے مم...... مجھے ان ظالموں نے۔'' وہ کراہا۔

''مجھے بے حد افسوس ہوا ہے تمہیں اس حالت میں دیکھ کر......'' میں نے ازراہِ ترحم اس سے کہا۔ ''کاش! تم مجھ پر بھروسا کرو اور مجھے ان کا اپنی طرح ایک قیدی ہی سمجھو تو شاید ہماری زیادہ نہیں تو تھوڑی بہت مشکلات آسان ہو جائیں......''

''مم...... میں......'' وہ کہتے کہتے رکا، باعثِ تکلیف ... اس سے کچھ بولا ہی نہیں جا رہا تھا۔ میں نے پھر اسے ہولے سے تھپک کر حوصلہ دیا اور بولا۔

''اللہ تم پر رحم کرے دوست! یہ لوگ واقعی بے حد ظالم ہیں۔ تم کچھ حوصلہ پکڑو تو پھر بات کرتے ہیں، ویسے تمہاری زیادہ طبیعت تو خراب نہیں ہے ناں؟'' میں نے ازراہِ ہمدردی آخر میں پوچھا، تو وہ بہ مشکل اپنے سر کو ہلکی سی جنبش دیتے ہوئے بولا۔

''بس! ٹھ...... ٹھیک ہی ہوں میں......'' وہ ذرا کسمسایا، میں نے اسے سہارا دیا تو وہ میرے چہرے کی طرف غور سے دیکھنے لگا۔

''اتنا تو بتا دو کہ تمہارا تعلق کس ملک سے ہے؟ پاکستان، یا انڈیا سے؟'' میں نے سوال کیا۔

''تم کس ملک کے رہنے والے ہو؟'' اس نے الٹا مجھ سے پوچھ لیا، اس پر بھی میں نے شکر کیا کہ چلو مجھ سے ہی سہی، کچھ سوال تو کیا، لہٰذا میں نے جواباً کہا۔

''میں تو پاکستان کا رہنے والا ہوں......''

''میں بھی پاکستانی ہوں۔'' اس نے ایک گہرا سانس لے کر بتایا۔

''تو تم بھی واقعی ان کے قیدی ہو......؟'' اس نے شاکی سے لہجے میں پوچھا۔ مجھے اس کے بچکانا سوال پر پھر سے غصہ تو آیا مگر میں نے ضبط سے کام لیتے ہوئے کہا۔

''تم بتاؤ کہ مجھ میں تمہیں ایسی کیا خوبیاں دکھائی دے رہی ہیں جس سے میں تمہیں ان کا قیدی نہیں بلکہ ساتھی لگ رہا ہوں؟''

''یہ لوگ جس قدر سفاک اور درندہ صفت ہیں اتنے ہی چالاک اور ذہین بھی'' وہ بولا۔ ''ہوسکتا ہے کہ مجھ سے کچھ اگلوانے کے لیے انہوں نے تمہیں میرے ساتھ ہی قیدی بنا کر رکھا ہو، تاکہ میں تمہارے ساتھ گھل مل جاؤں۔''

''اچھا......!'' میں نے طنزیہ کہا۔ وہ شاید پاکستان کی جیلوں میں ایسا ہوتا دیکھ کر یا سن کر ایسا کہنے پر مجبور تھا۔

جہاں واقعی کسی عادی اور ڈھیٹ مجرم سے کوئی راز اگلوانے کے لیے یہ حربہ استعمال کیا جاتا تھا۔ میں نے کہا۔

''ہاں دوست! تمہاری بات بھی اپنی جگہ ٹھیک ہی ہے، یہ ہوتا ہے مگر پاکستانی جیلوں میں، جبکہ ہم اپنے ملک سے کوسوں دور بھارت کے کسی ویران ساحل پر موجود ہیں اور کسی بڑے عالمی گینگسٹر کی قید میں بھی...... یہاں ایسی چالیں نہیں چلی جاتیں، کیونکہ یہ خود ہی براہِ راست قیدی کے منہ سے سب کچھ اگلوانے کا فن جانتے ہیں لیکن سب سے پہلی بات یہ کہ میں نے تو ابھی تک تم سے ایسی کوئی بات پوچھی بھی نہیں ہے، جس سے تم میرے سلسلے میں شک و شبے میں پڑ جاؤ۔''

''ہوں! لیکن انہوں نے کل تمہیں کہاں غائب کر دیا تھا؟'' اس نے پھر سوال داغا، تو میں نے اس غرض سے کہ شاید میرے ہی سچ بولنے سے وہ مجھ پر بھروسا کر لے اور کچھ اپنے اور ان کے درمیان معاملہ داری کے بارے میں بتانے پر مجبور ہو جائے۔

لیکن میں نے اسے مزید اپنے اعتماد میں لینے کی غرض سے محتاط ہو کر اور کچھ باتوں سے پہلو تہی کرتے ہوئے مختصر لفظوں میں بتانے لگا۔

''میرا معاملہ شاید تم سے زیادہ خطرناک اور نازک ہو، یوں سمجھو میں پاکستان کی ایک خفیہ انٹیلی جنس سے تعلق رکھتا ہوں، یا رکھتا تھا، اور اپنے وطن میں کچھ ایسے ملک دشمن عناصر اور ایجنٹس کا خاتمہ کرنے کا بیڑا اٹھایا جو پاکستان کی جڑیں کھوکھلی کر رہے تھے، ان میں سرفہرست، اسپیکٹرم اور بلیوٹکسی جیسی ملک دشمن سرگرمیوں میں ملوث خفیہ تنظیمیں......''

''اِی...... اِی...... ایک منٹ!'' اس نے بری طرح چونک کر درمیان میں میری بات کاٹ دی۔ ''ابھی تم نے کون سی تنظیم کا نام لیا تھا؟''

''بلیوٹکسی؟''

''نہیں، اس سے پہلے۔''

''اسپیکٹرم!''

''ہاں...... ہاں! یہی...... ان سے تمہاری کیا دشمنی ہے؟'' وہ بھونچکا... ہو کر مستفسر ہوا۔

''اصل دشمنی میری انہی کے ساتھ تو ہے۔'' میں نے ایک گہری ہمکاری خارج کرتے ہوئے کہا تو وہ بولا۔

''تو کیا تم واقعی خفیہ ایجنسی سے تعلق رکھتے ہو؟'' وہ ابھی تک حیرت کے سمندر میں غوطہ زن تھا اور میں نے دیکھا اس کے بشرے سے اب قدرے اعتماد اور طمانیت کے تاثرات ہویدا ہونے لگے تھے۔

''باقاعدہ تو نہیں تھا لیکن حادثاتی طور پر شامل ہو گیا تھا۔'' میں پھر بتانے لگا، وہ بڑے غور سے ہمہ تن گوش رہا، اور یک ٹک میری جانب دیکھنے لگا۔

میں نے اسے اپنے بارے میں تفصیل سے آگاہ کر دیا کہ ابتدا میں میری کن لوگوں سے دشمنی تھی اور پھر میں کس طرح حالات کے دھارے میں بہتا ہوا کہاں سے کہاں جا پہنچا۔ وغیرہ۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے تکے جا رہا تھا۔ اسے اسپیکٹرم کے ذکر پر چونکتا پا کر میں سمجھ گیا تھا کہ وہ بھی کسی نہ کسی حوالے سے اس کا ستایا ہوا لگتا تھا، یہ الگ بات تھی کہ میرے ذہن میں اس کے سلسلے میں ایک اندیشناک خدشے نے بھی سر ابھارا تھا کہ کہیں یہ اسپیکٹرم کا باغی یا کوئی بھگوڑا افعال ایجنٹ نہ ہو...... جو اس تنظیم کو ''ری جوائن'' بھی کر سکتا تھا۔

''یہ لو دوست! میں نے اب تمہیں اپنے بارے میں تفصیل سے آگاہ کر دیا۔'' چند ثانیوں کی پُرسوچ خاموشی کے بعد میں نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''تمہیں اگر اب مجھ پر بھروسا ہو چکا ہے تو اب ذرا تم بھی اپنے بارے میں مجھے اسی طرح تفصیلاً آگاہ کر دو...... تاکہ ہم دونوں مل کر آگے کی سوچ سکیں۔''

میں نے اب پکا تہیہ کر رکھا تھا کہ اگر اب بھی اس نے اپنا منہ نہیں کھولا تو اس سے بالکل کنارہ کشی اختیار کر لوں گا لیکن اس کی نوبت ہی نہ آسکی، اس نے بنک پر لیٹے لیٹے میری طرف اپنا چہرہ کر کے انتہائی متاثر کن لہجے میں بولا۔

''دوست! میں تمہیں سلام پیش کرتا ہوں...... کاش! میرے دونوں ہاتھ آزاد ہوتے تو میں تمہیں باقاعدہ سلیوٹ بھی پیش کرتا اور تم جیسے بہادر، ثابت قدم اور جری انسان کو میں اپنے گلے لگاتا۔ دوست! کیا نام بتایا تھا تم نے اپنا......؟'' وہ آخر میں استفسار یہ بولا۔

''شہزاد احمد خان عرف شہزی۔'' میں اس کی طرف دیکھ کر ہولے سے مسکرایا۔ وہ آگے بولا۔

''ہاں! شہزاد خان! میں اب تم سے کچھ نہیں چھپاؤں گا، اس لیے کہ تم نے یہ صحیح کہا تھا کہ ہم دونوں واقعی ایک ہی کشتی کے سوار ہیں اور ایک سے دو بھلے ہو سکتے ہیں، تو دوست! مجھے تم اپنے ساتھ سمجھو لیکن تم اب بھی اسپیکٹرم کی خطرناکی اور اس کے مکروہ اور گھناؤنے عزائم سے شاید پوری طرح واقف نہیں...... تم نے ابھی اسپیکٹرم کی ہولناکی کا وہ تصور بھی نہیں کیا ہوگا جو میں جانتا ہوں۔'' وہ اتنا کہہ کر رکا۔

میری یک ٹک نگاہیں اس کے بشرے پر جمی ہوئی تھیں۔ لگتا ایسا ہی تھا جیسے وہ اپنے اور ''اسپیکٹرم'' کے بارے میں کوئی چونکا دینے والا انکشاف کرنے والا ہو۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد اس نے اپنے نام سے ابتدا کی۔

''میرا نام...... بشام پھلگری ہے......''

مجھے اس نام پر ایک جھٹکا سا لگا، یہ نام مجھے کچھ سنا ہوا لگا اور اس کی بات آگے بڑھنے سے پہلے ہی میں نے اسے یہاں ٹھہرنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''ایک منٹ دوست! مجھے یہ نام سنا ہوا لگتا ہے، ذرا مجھے سوچنے دو کہ میں نے یہ کب اور کہاں سنا تھا۔''

''یقیناً سنا ہوگا۔'' وہ میری طرف دیکھ کر ہلکے سے مسکرایا تھا۔ ''تم بھی ''پاور ایجنٹ'' تھے۔'' اس کے چہرے پہ معنی خیز تاثرات نمودار ہو گئے تھے۔

میں اپنے ذہن پر زور دینے لگا، اس نام کا اگر ایک سے زیادہ بار تذکرہ ہوتا تو شاید میں اتنی جلدی نہیں بھولتا، پیہم زورِ خیال کے بعد اچانک میرے ذہن میں ایک جھماکا ہوا۔

''اسپیکٹرم...... بشام پھلگری...... آرکیالوجسٹ...... لاڑکانہ...... اوہ......'' یہ نام میرے سوچتے ذہن میں گڈمڈ ہونے لگے اور مجھے دھیرے دھیرے یاد آنے لگا تھا یہ سب جب...... میجر ریاض باجوہ صاحب نے مجھے ''اسپیکٹرم'' اور اس کے خفیہ مقاصد کے بارے میں آگاہ کیا تھا، جس کے مطابق ''اسپیکٹرم'' نے خود کو ایک بین الاقوامی سطح پر ایک ''معتبر ادارے'' کی صورت میں متعارف کرر کھا تھا۔ بظاہر جس کا مقصد اپنے طور پر دنیا بھر کے تاریخی نوادرات کی حفاظت، نیز ایسے نوادرات بھی جو کسی ملک یا قوم کا تاریخی ورثہ ہوتے ہیں، ان کی گمشدگی یا برآمدگی کی صورت میں انہیں ان کے صحیح اور حق بجانب مقام پر رہنے دیا جائے، ان کے اہم مقاصد میں شامل ہے۔ اب تک یہ تنظیم، یعنی ''اسپیکٹرم'' بے شمار چوری شدہ نوادرات برآمد کر کے انہیں ان کے اصل ورثا تک پہنچا چکی تھی۔

اس تنظیم کو دنیا کے بیشتر ممالک کی مالی اعانت بھی حاصل تھی اور اس کے ممبر پوری دنیا میں پھیلے ہوئے تھے وغیرہ۔

''تم بشام پھلگری...... ایک آرکیالوجسٹ، ذہین اور فرض شناس تعلیم یافتہ نوجوان، تمہارا تعلق صوبہ سندھ کے مشہور تاریخی شہر لاڑکانہ سے ہے، اسپیکٹرم کے سابقہ اور ہونہار فیلڈ آفیسر اور فعال ممبر......! کیا غلط کہا میں نے کچھ......؟''

ساری یادداشت کھنگالنے کے بعد میں نے خاصے مسرت بھرے جوش سے کہا تو اس نے ایک حیرت آمیز سی مسکراہٹ سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''یو آر ایبسولوٹلی رائٹ...... مسٹر شہزاد خان! میں وہی بشام پھلگری ہوں...... جو ایک عرصے سے اسپیکٹرم کو چھوڑنے کے بعد گمنامی کی زندگی گزارنے پر مجبور تھا۔'' وہ یہ کہہ کر ذرا سانس لینے کو رکا، میں ہمہ تن گوش اس کی طرف دیکھتا رہا۔

''بلاشبہ اسپیکٹرم ابتدا میں بین الاقوامی طرز کا ایک معتبر ادارہ تھا اور عالمی سطح پر اس کی ایک ساکھ تھی اور بڑے فعال طریقے سے کام کر رہی تھی، اس تنظیم نے کئی بڑے ممالک کے چوری شدہ یا گم شدہ نوادرات لوٹانے کے کارہائے نمایاں انجام بھی دیے تھے، یہی وجہ تھی کہ کئی ترقی یافتہ ممالک میں اس کی پذیرائی ہوتی رہی، اور مختلف ممالک سے اس تنظیم کو بڑے بڑے فنڈ ملنے لگے لیکن یہ سب تب تک رہا، جب تک مسٹر ڈی کارلو...... اسے آرگنائز کرتے رہے، جن کا شمار اس تنظیم کے بانیوں میں ہوتا تھا۔ لولوش ان کے نائب کی حیثیت رکھتا تھا۔ جو اصل میں جرائم کی دنیا کا ایک بڑا ڈون تھا۔ اس نے اسپیکٹرم کو ہائی جیک کر لیا اور پھر اس تنظیم کی نیک نامی اور فعل کاری کو غلط طریقے سے استعمال کرنا شروع کر دیا۔ یہ نہ صرف مختلف ممالک کی بدنام زمانہ خفیہ ایجنسیوں کے لیے خطیر معاوضوں پر ایک ملک کے راز دوسرے ملک کے ہاتھوں پہنچانے لگے بلکہ ان وسیع تر مفادات میں بھی ان کا پورا پورا ساتھ دینے لگے، کیونکہ اس تنظیم کی ساکھ پہلے ہی پچاس سے زائد ممالک میں قابلِ تحسین ہی نہیں بلکہ عزت و تکریم کی نظر سے دیکھی جاتی تھی۔ لولوش نے اگرچہ بہت پہلے سے ہی اس کی جڑوں کو اپنے مطابق سینچنا شروع کر دیا تھا، مقاصد تو اب بھی اس کے وہی تھے مگر در پردہ لولوش اسے جرائم کے راستے پر ڈال چکا تھا۔ جو راضی رہے وہ اس کے لیے کام کرتے رہے، جنھوں نے انکار کیا انہیں خاموشی سے موت کی نیند سلا دیا گیا۔ میرے جیسے لوگ کنارہ کش ہو کر روپوشی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہو گئے لیکن میں خود ایک اہم وجہ کے تحت دوبارہ ان کے نرغے میں آ گیا......''

اتنا بتا کر وہ خاموش ہو گیا۔ میں بڑی یکسوئی اور غور سے اس کی باتیں سن رہا تھا۔ یہ بالکل ویسا ہی سین تھا جیسا کہ میرے سلسلے میں ''اطفال گھر'' میں ہوا تھا، جب تک

حاجی محمد اسحاق اسے نیک نامی سے چلاتے رہے تو سب ٹھیک تھا مگر ان کی موت کے بعد اس ادارے کو چوہدری ممتاز خان نے ہائی جیک کر کے اپنے حواری گگل خان کو اس کا سرغنہ بنا دیا اور بچوں کو علمی و دینی تعلیم کے بجائے جرائم کا نصاب پڑھایا جانے لگا، پھر اطفال گھر جرائم کا اڈا بن گیا۔

اچانک ماضی کی باتیں میرے ذہن میں گھوم گئیں۔

''آخر وہ ایسی کیا وجہ تھی، جس نے تمہیں دوبارہ اسپیکٹرم کے نرغے میں پھنسا دیا؟'' وہ میرے سوال پر بے اختیار ایک گہری سانس لے کر رہ گیا، پھر ایک نگاہ دروازے کی طرف ڈال کر ہولے سے بولا۔

''یہ بات انتہائی خطرناک، حساس اور رازداری کی متقاضی ہے، ابھی میں نہیں بتا سکتا، دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں لیکن میرا وعدہ ہے تم سے کچھ نہیں چھپاؤں گا...... بلکہ تمہیں ہی تو بتاؤں گا اور مجھے تمہاری مدد کی بھی ضرورت پڑے گی، میں اسی وجہ کے تحت تو اب تک زندہ ہوں، اوران درندہ صفت لوگوں کے ہاتھوں بار بار تشدد کا نشانہ بنتا رہا ہوں، ورنہ تو یہ لوگ مجھے بھی کب کا موت کے گھاٹ اتار چکے ہوتے، لہٰذا ابھی صرف ان سے چھٹکارا پانے کی سوچو......''

''مجھے تمہاری بات سے اتفاق ہے دوست! لیکن کہیں ایسا نہ ہو جائے تم اور میں جدا کر دیے جائیں، جیسا کہ کل ہوا تھا، یہ تمہیں نجانے کہاں لے گئے تھے، مجھے خود بھی تمہاری طرف سے تشویش ہو گئی تھی، اور پھر یہ اہم راز، راز ہی رہ جائے، اگر ایسا کوئی ہاٹ ایشو نہیں ہے تو مجھے بھی اس کے جاننے میں کوئی دلچسپی نہیں ہے مگر دوست اس وقت ہم دونوں ہی غیر یقینی حالات کا شکار ہیں، آگے تم جو بہتر سمجھو......''

میری بات نے اسے بھی کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا۔ میں نے اس کی تسلی کے لیے مزید کہا۔ ''یوں بھی ہم اپنی زبان میں باتیں کر رہے ہیں، یہ لوگ کہاں یہ سمجھیں گے؟''

''ان کے پاس ایسے ٹرانسلیٹر ڈیوائسز موجود ہیں جو کسی بھی زبان کو کنورٹ کر سکتے ہیں۔'' یہ کہتے ہوئے وہ چھت کو اور پھر کمرے کی دیواروں کو تکنے لگا۔ پھر ایک گہری سانس لیتے ہوئے بالآخر بہت دھیمی آواز میں بولا۔

''میرا خیال ہے تمہیں بتائے دیتا ہوں۔ سنو غور سے...... تین سپر اور منی پاور کے ممالک دنیا کو ایڈولف ہٹلر کی طرح تیسری جنگِ عظیم میں جھونکنے والے ہیں۔ ان میں امریکا، روس اور بھارت شامل ہیں۔ ان تینوں ممالک کے جنگی جنونی جنرلوں نے اپنے اس خفیہ پلان کو ''ورلڈ بگ بینگ'' کا نام دیا ہے، اور اس گھناؤنے انسانیت سوز مقصد کے لیے تین ممالک کو ''یوز'' (استعمال) کیا جائے گا۔ اس میں ایک ایران ہے، دوسرا ہمارا ملک پاکستان اور تیسرا چین ہے۔ یہ ایک عالمی سازش ہے۔ دیکھو دوست انسان کی فطرت میں تغیر و تبدل کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ وہ ایک جگہ زیادہ دیر تک نہیں بیٹھ سکتا، اس کی فطرت میں سکون ہے نہ آرام...... وہ چاہتا ہے کچھ نہ کچھ ہوتا رہے، پہلی اور دوسری جنگِ عظیم بھی ایسے ہی جنونی جنرلوں کا شاخسانہ تھی۔ انسان کی فطرت میں ہی جنگ ہے۔

خیر...... میں تمہیں بتا رہا تھا، موئن جودڑو لاڑکانہ میں ڈوکری کے مقام پر ایک مشہور تاریخی کھنڈرات کا حامل علاقہ ہے، جہاں آج سے کچھ سال پہلے...... سندھیالوجی کے ایک پروفیسر کریم بخش نظامانی نے کھدائی کروائی تھی، ان کی برسوں کی تحقیق کے مطابق موئن جودڑو کے جس مقام پر کھدائی کرنا مقصود تھا، وہاں آریائی دور کا نایاب نوادر موجود ہونے کے امکانات ہیں جو گزشتہ کھدائیوں کے دوران نہیں مل سکا تھا۔ مذکورہ پروفیسر تاریخ اور آرکیالوجی میں ڈبل پی ایچ ڈی ہیں اور بہت قابل مانے جاتے ہیں۔ کھدائی کی گئی تو واقعی آریائی دور کا وہ نادر نمونہ ان کے ہاتھ لگ گیا، جس کی تحقیق و تلاش میں انہوں نے رات دن ایک کر ڈالے تھے۔ ان کی شبانہ روز تحقیق کے مطابق وہ نادر و نایاب نمونہ ایک اژدھے کی شکل کا ہے جس نے ایک بڑا سا پھن کاڑھا ہوا ہے اور اس کے منہ میں ایک چمکتا ہوا بیش قیمت ہیرا جگمگا رہا ہے، جو کوہ نور ہیرے (کوہ نور، برصغیر سے برآمد ہونے والا وہ ہیرا جو برطانیہ کے قبضے میں ہے اور ملکہ الزبتھ کے تاج کی زینت بنا ہوا ہے، جسے لوٹانے یا حاصل کرنے کے لیے محض عمومی کوششیں کی جاتی رہی ہیں، دوسری طرف بھارت بھی اس کوشش میں مصروف ہے) سے بھی زیادہ اہمیت کا حامل انمول اور بیش قیمت ہے۔

''پروفیسر کریم بخش نے اس ہیرے کا نام ''طلسم نور ہیرا'' ...... رکھا تھا، اور یہ نام رکھنے کی وجہ وہ اپنی عرق ریزی اور نجانے کتنی اجنبی، نامانوس اور متروکہ زبان کی تحقیق کے مطابق، ایسی پُراسراریت بتاتے تھے جو اس ہیرے سے وابستہ تھیں۔ نجانے کیا بات تھی جو میں نے اس ہیرے کی بازیافت کے بعد محسوس کی تھی وہ یہ کہ پروفیسر کریم بخش نظامانی گم صم اور عجیب سے رہنے لگے تھے، ان کی بے پایہ خوشی کو جیسے ایک اسرار بھری چپ کھا گئی تھی۔

''جب میں نے طلسم نور ہیرے کو کھدائی کے بعد پہلی بار دیکھا تو اسے دیکھتے ہی مجھ پر ایک عجیب سا سحر طاری

ہو گیا تھا، ایک بڑے سے کالے اژدھے کے کھولے ہوئے منہ کے اندر کسی بچے منکے کی طرح وہ رکھا ہوا تھا۔ اس وقت دنیا میں سب سے بڑے، قیمتی اور تاریخی عظمت کے حوالے سے کوہ نور ہیرے کی اہمیت جانی جاتی ہے۔ کوہ نور ہیرا خوب صورتی میں بھی اپنی مثال آپ ہے لیکن پاکستان سے برآمد ہونے والا یہ طلسم نور ہیرا خوب صورتی اور وزن اور سائز میں اس سے بھی نسبتاً بڑا تو تھا ہی، نیز تاریخی ورثے کے حوالے سے بھی اس کی عظمت کوہ نور ہیرے سے بڑھ کر ہی تھی، ازیں علاوہ اس ہیرے میں مجھے ایک عجیب سی پُراسراریت بھی محسوس ہوئی تھی، میں اس پر باوجود کوشش کے زیادہ دیر اپنی نظریں نہیں جما پا رہا تھا، ملٹی ڈائمنشنل (Multidimensional) یعنی کئی رخی یہ ہیرا مجھے اپنے اندر سے غیر مرئی لہریں چھوڑتا ہوا محسوس ہو رہا تھا، جو میری آنکھوں کے راستے میرے پورے وجود میں سرائیت ہو رہی تھیں، جب میں نے تھوڑی کوشش سے اس پر اپنی نگاہیں جمانا چاہیں تو مجھے یوں لگا جیسے میں گردوپیش سے لاتعلق کسی اور ہی دنیا کی طرف پرواز کرنے لگا ہوں، میری سماعتوں میں عجیب و غریب خوفناک آوازیں آنے لگیں، جس میں چیخ و پکار، پھنکاریں، تیروتفنگ، میدان جنگ کا سا سماں اور دیوہیکل درندوں کی دہاڑیں، بے ہنگم قہقہوں کے درمیان آہیں اور سسکیاں اور نجانے کیسی کیسی دل ہولا دینے والی آوازیں تھیں۔ پھر مجھے اپنا وجود منتشر سا محسوس ہونے لگا تھا کہ اچانک مجھے کسی نے شانوں سے پکڑ کے جھنجوڑا، میں جیسے ایک خواب سے بیدار ہو گیا، میں نے دیکھا، پروفیسر صاحب نے مجھے سنبھالا ہوا تھا، وہ خود بھی مجھے پریشان اور ژولیدہ خاطر نظر آرہے تھے۔ بعد میں انہوں نے اس پُراسرار ہیرے سے متعلق انکشاف کرتے ہوئے بتایا کہ یہ ہیرا آج ہزاروں سال پہلے آریائی اور دراوڑی قوموں کے بیچ جنگ و جدل اور خون ریزی کا باعث بنا ہوگا، اور اسی وجہ سے یہ لوگ تباہ و برباد ہوئے، ان میں پُراسرار علوم کے ماہر بھی تھے، یہ ہیرا ان کے کسی بڑے دیوتا کا تھا لیکن جب میں نے پروفیسر صاحب سے اپنی اس عجیب و غریب کیفیات سے متعلق پوچھا تو انہوں نے کچھ اس انداز میں لاعلمی کا مظاہرہ کیا تھا کہ جس سے مجھے شک گزرا کہ وہ بہت کچھ جانتے تھے مگر بتانے سے بچنا چاہ رہے تھے، تاہم اسی قدر ہی بتایا کہ بعض چیزوں کا تاثر ہی ایسا ہوتا ہے کہ وہ قوت متخیلہ پر اثر پذیر ہو کر حواسوں پر اثر انداز ہوتا ہے، یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے ہم کسی اچھی چیز یا اچھے منظر کا مثبت تاثر لیتے ہیں، اور بُرے کا تلخ، یہ ہیرا بھی چونکہ زمانہ قدیم سے تعلق رکھتا ہے اور تم نے بھی اپنے ذہن میں ویسا ہی تاثر رکھتے ہوئے اسے دیکھا اور اس میں کھو گئے، پھر وہ آریائی اور دراوڑی قوموں کے متعلق بتانے لگے کہ آریائی سفید فام اور دراوڑ گہرے رنگ کے تھے، جبکہ آریائی، دراوڑیوں کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے تھے، اور انہیں ''داس'' کہتے تھے، جس کا مطلب ''غلام'' تھا۔ ان کے بیچ بڑی زبردست طبقاتی تقسیم تھی، دراوڑی بھی خود کو کم نہیں سمجھتے تھے، یہ بالکل ایسا ہی جیسے، آج جرمن، روس یا امریکا خود کو دنیا کی عظیم قوم کہتے ہیں اور اپنے سے کم طاقت والی قوموں کو زیر کرنے کے لیے جنگ کرنے کے درپے رہتے ہیں۔

''تاہم ابھی اس نادر و نایاب ہیرے کی پاکستان کے حوالے سے ملکیت کے باضابطہ دعویٰ کا اعلان بھی نہیں ہوا تھا کہ بدقسمتی سے یہ چوری ہو گیا۔ کسی کو پتا بھی نہ چل سکا کہ وطنِ عزیز کو کس قدر اہمیت کی حامل اور انمول شے سے محروم کر دیا گیا تھا۔ پروفیسر کریم بخش کو طلسم نور ہیرے کی چوری کا اس قدر ملال ہوا کہ وہ دل کے دورے کا شکار ہو کر دارفانی سے ہی کوچ کر گئے۔

''مرنے سے پہلے وہ اس بات پر متفکر تھے کہ اگر یہ ہیرا...... نہ ملا تو یہ...... دنیا میں تیسری جنگِ عظیم کا سبب بن سکتا ہے، کاش! یہ جلد ہمیں مل جائے، ورنہ اس کے اثرات کسی ہائیڈروجن اور ایٹم بم سے کم نہیں ہوں گے۔

''میرا تعلق بھی چونکہ آثار قدیمہ سے تھا اور پروفیسر کریم بخش نظامانی صاحب کے سب سے زیادہ قریب تھا۔ مجھے بھی اس نادر و انمول ہیرے کی چوری ہونے کا سخت ملال تھا لیکن میں مایوس نہیں ہوا، میں نے بے حد کوشش کی کہ کسی طرح حکومت اور مقتدر حکومتی حلقے اس ہیرے کی تلاش میں میرا ساتھ دیں مگر انہیں تو اپنی خرمستیوں سے ہی کہاں فرصت تھی۔ ان کے لیے تو یہ سب ایک دیوانے کا خواب ہی تھا مگر وہ نہیں جانتے تھے کہ وطنِ عزیز کو کس قدر اہمیت کے حامل تاریخی نوادر سے محروم کر دیا گیا تھا، جو اگر پاکستان میں ہوتا تو اس کا کس قدر فائدہ ملک کو ہوتا۔ مگر افسوس کسی حکمراں جماعت نے اسے تلاشنے یا کھوجنے کا بیڑا نہ اٹھایا، بالآخر میں نے اپنے تئیں کوشش چاہی تو اسی دوران ''اسپیکٹرم'' نامی تنظیم کا میں نے ایک روز اخبار میں تذکرہ سنا، جو اپنے طور پر چوری یا گم شدہ نوادرات کو تلاش کر کے ان کا جائز مقام دلانے کے لیے خاصی شہرت رکھتی تھی، اسی اخبار

میں اس کے تازہ ترین کارنامے کی بھی خبر چھپی تھی، جس میں اس نے بدھا (گوتم بدھ) کے ایک ایسے مجسمے کو تلاش کیا تھا جو تھائی لینڈ کی ملکیت تھا۔

''مجھے اپنی مراد برآتی نظر آنے لگی اور میں نے اس تنظیم کے بارے میں معلومات وغیرہ حاصل کرنے کے بعد نیویارک، مسٹر ڈی کارلو کو ایک خط لکھا، انہوں نے خود بھی مجھ سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا اور ایک ہفتے کے وزٹ ویزا پر میں امریکا روانہ ہوگیا، کیونکہ اسپیکٹرم کا ہیڈ آفس وہیں تھا اور اب بھی ہے۔ وہیں میں نے مسٹر ڈی کالو سے اس سلسلے میں تفصیل سے بات چیت کی تو وہ بھی اس ہیرے کی تلاش کے سلسلے میں کمربستہ ہوگئے، بلکہ مجھے بھی اس تنظیم میں شمولیت کی دعوت دے ڈالی جو میں نے فوراً قبول کرلی۔

''چونکہ گم شدہ نوادرات کے سلسلے میں اس تنظیم کے ممبرز اپنی سی ذاتی کوششیں کرتے تھے اسی لیے انہیں خاص تربیتی کلاسز سے گزارا جاتا تھا، مجھے بھی اس کے لیے دوبارہ انہی کے ذریعے اسپانسر شپ ملی اور یوں میں بھی وہاں دو ماہ کی تربیتی ٹریننگ حاصل کرچکا تھا، اس میں اپنے دفاع سے لے کر نوادرات کے کھوج اور ان کی برآمدگی سے لے کر اسلحہ چلانے تک کے جدید اور سائنٹیفک طریقے اور دیگر حربوں سے آشنائی کروائی گئی تھی۔

''تاہم اس میں کوئی شک نہ تھا کہ طلسم نور ہیرے کی تلاش میں میرے پاس وسائل نہ ہونے کے برابر تھے لیکن اسپیکٹرم، یعنی مسٹر ڈی کارلو نے اس سلسلے میں میری مدد کی، میں نے بھی ان کی تنظیم کے لیے بہت کام کیا مگر ابھی تک میں اپنے اصل مقصد میں کامیاب نہ ہوسکا تھا۔ یعنی طلسم نور ہیرے کی بازیافت...... مگر میں ناامید نہیں تھا۔ میں اپنے طور پر کھوج میں لگا رہا...... بالآخر میری کوششیں رنگ لائیں اور مجھے اتنا تو پتا لگ ہی گیا کہ وہ نادر ہیرا اژدھے سمیت جس نے چوری کیا تھا یا یوں کہہ لو کروایا گیا تھا وہ وہیں کا ایک مقامی بااثر زمیندار تھا، جسے نوادر جمع کرنے کا جنون کی حد تک شوق تھا اور اپنے اس شوقِ جنوں میں ہر وہ حد پار کرڈالنے میں عار محسوس نہیں کرتا تھا، جب بھی اس مقام میں کھدائی ہوتی تھی وہ زمیندار اپنے ہاریوں کو مزدور کے روپ میں ان کے بیچ شامل کرکے ان کے ذریعے چوری کرواتا تھا اور یہ بھی اس کے کسی مزدور کا ہی کام تھا۔ میں چونکہ وہیں کا رہنے والا تھا اسی لیے وہاں کے ماحول کو زیادہ بہتر طریقے سے جانتا تھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ وہاں کی پولیس علاقے کے ایک بااثر زمیندار کے خلاف کارروائی کیا کرے گی، بلکہ الٹا اسے ''باخبر'' کردے گی کہ اس کے خلاف کیا ہوتے چلا ہے، اسی لیے میں اس کے خلاف کوئی ایکشن لینے کے سلسلے میں کسی جلد بازی سے کام نہیں لینا چاہتا تھا۔ میری کوشش تھی کہ کسی اعلیٰ ذمے دار افسر سے ہی اس سلسلے میں بات کروں، بہرحال میری کوششیں رنگ تو لائیں اور سب سے پہلے اس مزدور کو گرفت میں لیا گیا، جس نے مذکورہ وڈیرے کے کہنے پر وہ اژدھے والا ہیرا چوری کیا تھا، یوں اس بااثر وڈیرے پر بھی ہاتھ ڈالا گیا۔ وہ صاف مکر گیا، اور اپنی ضمانت وغیرہ کی کوشش کرنے لگا اور پھر وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا، وہ رہا ہوگیا۔ میں سخت مایوس ہوا، کیسے لوگ تھے یہ، جو اپنے ہی ملک کا ایک قیمتی اثاثہ چوری کرکے بیٹھے تھے، آرام سے میں بھی نہیں بیٹھا تھا، میں چونکہ اسپیکٹرم کا ایک نمائندہ اور باقاعدہ ممبر تھا، اسی لیے میں نے ایک آفیشلی رپورٹ تیار کرکے، فوراً نیویارک، مسٹر ڈی کارلو کو ارجنٹ ارسال کی اور اس سلسلے میں انہیں اپنے عزائم سے بھی آگاہ کرنا ضروری سمجھا کہ اب میں خود ذاتی طور پر اس کے کھوج کے لیے کوشاں ہونا چاہتا ہوں، وغیرہ...... چونکہ اسپیکٹرم کے ایجنٹ بیشتر ممالک میں پھیلے ہوئے تھے، البتہ پاکستان میں صرف میں ہی ایک تھا، یا پروفیسر کریم بخش نظامانی مرحوم...... جبکہ بھارت میں اسپیکٹرم کی ممبر سازی کی نفری خاطر خواہ تھی، وہاں اس کے ممبرز کی تعداد گیارہ کے قریب تھی۔ وہیں سے میری مدد کو سوشیلا اور وکرم کو بھیجا گیا۔ یہ دنوں تنظیم کے بڑے فعال ممبر تھے۔ ہمیں اس سلسلے میں مذکورہ تنظیم سارا خرچہ پانی اور وہ تمام وسائل تفویض کرتی تھی، جس کی بنا پر ہم اپنا مشن پایہ تکمیل تک پہنچاتے تھے۔ لہٰذا اگر طلسم نور ہیرا برآمد کرلیا جاتا تو لازمی طور پر اس کا کریڈٹ اسپیکٹرم کو جاتا اور یہ اس کا حق بھی بنتا تھا۔

''بہرکیف...... میری مدد کو جو دو ممبران آئے تھے، میں نے انہیں بریف کیا اور پھر ہم نے اپنے تئیں اس بااثر زمیندار کے خلاف خفیہ کارروائی کا آغاز کردیا۔ سوشیلا اور وکرم اسپیکٹرم کے سینئر ممبر تھے اور ان کی مدد سے ہم نے وہ ہیرا بالآخر مذکورہ زمیندار کی حویلی کے خفیہ تہ خانے سے برآمد کرلیا۔

''سوشیلا اور وکرم کی رہائش وغیرہ کا بندوبست میرے پاس ہی تھا۔ میں نے ان دونوں کا شکریہ ادا کیا اور ان کے روانہ ہونے سے پہلے ہی میں نے ان کے کہنے پر ایک آفیشلی لیٹر کی صورت میں رپورٹ تیار کرکے اسپیکٹرم

کے ہیڈ آفس نیویارک روانہ کر دی۔

"وہ طلسم نور ہیرا میرے پاس تھا اور میں اسے اگلے دن متعلقہ محکمے کے سپرد کرنے کا ارادہ کیے ہوئے تھا۔ وہ رات سوشیلا اور وکرم میرے پاس رہے، اگلے دن وہ دونوں علی الصباح انڈیا روانہ ہو گئے۔ ہیرا میرے پاس تھا۔ اگلے دن میں جاگا۔ ہیرا دیکھا تو مجھے کچھ بھی محسوس نہ ہوا، نہ وہ کیفیات نہ وہ تاثر نہ وہ اثر پذیری جو اسے دیکھ کر مجھے ہوتی تھی، بعد میں مجھ پر یہ بھیانک انکشاف ہوا کہ وہ ہیرا نقلی تھا، اصلی ہیرا وکرم یا سوشیلا یا پھر وہ دونوں ہی چوری کر کے لے گئے تھے۔

"میں نے فوراً مسٹر ڈی کارلو سے رابطہ کیا تاکہ اس سلسلے میں ان سے بات کر سکوں تو مجھ پر ایک سنسنی خیز انکشاف ہوا کہ وہ ایک روز پہلے ہی ٹریفک حادثے میں ناگہانی موت کا شکار ہو چکے تھے۔ مجھے ان کی اچانک موت کا دکھ بھی ہوا اور تشویش بھی کہ اب کیا ہوگا؟ کون میری مدد کرے گا؟ وکرم یا سوشیلا میں سے کوئی ایک یا دونوں مجھے "ہاتھ" دکھا گئے تھے، کس کے کہنے پر؟ یہ میں نہیں جانتا تھا۔ میں کئی دن اسی ادھیڑ بن میں رہا کہ اب کیا کروں اور کیا نہ کروں، کہ مجھے لولووش کی فون کال موصول ہوئی، اس نے مجھے بتایا کہ اب وہ اسپیکٹرم کا روح رواں ہے۔ چونکہ میری رپورٹ اسے مل چکی تھی کہ ہیرا میں حاصل کر چکا ہوں، تو اس نے مجھ سے ہیرے کے بدلے سودے بازی کرنا چاہی، اسے ابھی نہیں معلوم تھا کہ وہ ہیرا تو ایک بار پھر چوری ہو چکا تھا۔ مگر مجھے اس کی بات پر سخت طیش آیا اور مجھے طرح طرح کی دھمکیاں دینے لگا پھر رفتہ رفتہ اس کی بھی مزید قلعی کھلتی چلی گئی کہ لولووش کس قماش کا آدمی تھا اور اس نے اسپیکٹرم جیسے معتبر ادارے کو اپنے ذاتی مفادات کی خاطر کس راستے پر ڈال دیا ہے، لہٰذا پھر میں بھی ان سے کنارہ کش ہو گیا اور اسپیکٹرم سے ہر طرح کا تعلق، رابطہ توڑ دیا، نہ صرف یہ بلکہ میں نے اپنا استعفیٰ بھی لکھ کر بھیج دیا لیکن لولووش کی مسلسل دھمکیاں مجھے ملتی رہیں، وہ اب بھی یہی سمجھ رہا تھا کہ ہیرا میرے پاس ہے لیکن میں اس سے یہ جھوٹ بول رہا ہوں کہ وہ چوری ہو گیا ہے۔ حالانکہ میں اسے بتا چکا تھا، اور ہر طرح سے یقین دلانے کی کوشش چاہی تھی، مگر وہ یہی سمجھے ہوئے تھا، میں ان کا اصلی چہرہ دیکھنے کے بعد ان سے متنفر ہو گیا ہوں، جب اس نے مجھ سے طلسم نور ہیرے کے سلسلے میں خفیہ سودے بازی کرنی چاہی تھی۔

"میں جانتا تھا کہ لولووش کتنا بڑا گینگسٹر بن چکا ہے، اسی لیے مجھے اس سے خوف آنے لگا، اور میں روپوشی کی زندگی گزارنے لگا۔ میں نے نوکری بھی چھوڑ دی اور دکان وغیرہ کھول کر معمولی زندگی بسر کرنے لگا۔ انہی دنوں میں نے شادی بھی کر لی، اللہ نے مجھے دو جڑواں بیٹے بیٹی کا باپ بھی بنایا، میں اپنی سادہ مگر پُرسکون زندگی سے بہت مطمئن اور خوش تھا کہ اچانک میں ان کے ہتھے چڑھ گیا اور اب یہ مجھے برما لے جا رہے ہیں، لولووش کے سپرد کرنے...... اور مجھے اسی بات کا خوف ہے کہ وہ مجھے جان سے ہی مار دے گا۔ میری بیوی بھری جوانی میں بیوہ ہو جائے گی اور چھوٹے بچے یتیم ہو جائیں گے۔ کیونکہ لولووش میری کسی بات پر یقین نہیں کرتا، اس کا یہی اصرار ہے کہ وہ ہیرا اب بھی میرے قبضے میں ہے۔"

☆☆☆

وہ تمام تفصیل بتانے کے بعد خاموش ہو گیا لیکن اپنے بیوی بچوں کو یاد کر کے اس کی آنکھیں بھیگ چکی تھیں۔ میں نے اس کی ساری کتھا سننے کے بعد چند ثانیوں کی پُرسوچ خاموشی اختیار کیے رکھی اور پھر اس سے بولا۔

"مجھے ایک بات سمجھ نہیں آئی...... تم جیسا بہادر اور محب وطن آدمی بھلا اس قدر ہمت ہار کے کیوں بیٹھ گیا تھا؟ کیا تمہارے دل میں کبھی یہ خیال تک نہیں آیا کہ سوشیلا اور وکرم تمہیں اُلو بنا کر وہ ہیرا چوری کر کے لے گئے اور تم نے اسے دوبارہ بازیاب کرانے کی کوشش تک نہ کی؟ جبکہ پہلی بار جب یہ ہیرا چوری ہوا تھا تو تم نے اپنی انتھک کوششوں سے بالآخر یہ ہیرا اس بااثر زمیندار کے قبضے سے برآمد کرا لیا تھا، پھر تم نے ہمت کیوں ہاری......؟"

میری بات سننے کے بعد وہ ایک گہری سانس خارج کر کے بولا۔ "اپنے ملک کا معاملہ اور تھا اور اس وقت مسٹر ڈی کارلو بھی زندہ تھے، تنظیم اپنے اصل اغراض و مقاصد میں پوری طرح فعال تھی، مجھے اس کی سپورٹ حاصل تھی لیکن ڈی کارلو کے مرنے اور تنظیم کے ہائی جیک ہونے کے بعد، میں بے حوصلہ ہو گیا اور پھر اس بار معاملہ بھی دوسرے ملک کا تھا، ہیرا چوری کر کے سرحد پار پہنچا دیا گیا تھا۔"

"تمہاری بدقسمتی یہ ہوئی کہ تم ہیرے کی برآمدگی کے سلسلے میں ایک تحریری رپورٹ نیویارک مسٹر ڈی کارلو کو لکھ کر بھیج چکے تھے، جو لولووش کے ہاتھ لگ گئی، اب وہ بھلا کیسے اس بات کا یقین کرے گا؟ وہ یہی سمجھے ہوئے ہوگا کہ تمہاری اپنی نیت میں فتور آ چکا ہے اور تم خود اس ہیرے کا کسی سے سودا کر کے کھرب پتی بننے کا خواب دیکھ رہے ہو۔"

"بالکل یہی ہوا ہے میرے ساتھ۔" وہ بولا۔ "اسے خطرناک غلط فہمی ہوگئی ہے، جو لگتا ہے اب میری جان لے کر ہی چھوڑے گی۔"

اس بکھونی کمرے میں سناٹا طاری رہا۔ میرے لیے یہ خبر بڑی سنسنی خیز تھی۔ طلسم نور ہیرے جیسا بے مثال و نایاب نوادر پاکستان کی ملکیت تھا مگر وہ ملکی سطح پر ہائی لائٹ ہونے سے پہلے ہی اُڑا لیا گیا اور ان چوروں کا تعلق بھی اسی ملک (بھارت) سے تھا۔ اب یہ بدبخت لولوش اسے ہتھیانے کے چکروں میں تھا۔ اس ہیرے سے متعلق مجھے بھی تجسس ہوا اور اس تجسس کی وجہ اس کی وہ پُراسرار خاصیت تھی جو بشام نے مجھے بتائی تھی لیکن میرے دل و دماغ میں اس کی یہ بات بھی کسی کانٹے کی طرح چبھ رہی تھی کہ جب اس نے اپنی کتھا کے دوران پاکستانی محقق پروفیسر کریم بخش نظامانی کے بہ قول یہ ہیرا اگر اپنے جائز مقام (پاکستان) سے ہٹا دیا گیا تو یہ تیسری عالمی جنگ کا باعث بھی بن سکتا تھا۔ بہ صورت دیگر یہ نادر و نایاب ہیرا پاکستان کی ملکیت میں رہا تو یہ اس کے لیے (پاکستان کے لیے) سودمند ثابت ہوتا رہے گا۔

تو گویا اب صورتِ حال یہ تھی کہ یہ لوگ ہم دونوں "قیدیوں" کو برمالے جانے کا ارادہ کیے ہوئے تھے، جہاں لولوش بے چینی سے ہمارا منتظر تھا۔ لولوش نے گویا ایک تیر سے دو شکار کیے تھے، ایک طرف ہیرے کے حصول کے سلسلے میں بشام چھلگری کو قابو کیا تھا اور دوسری طرف اڈیسہ کمپنی کے شیئرز حاصل کرنے اور گویا "لگے ہاتھوں" مجھے اپنے حلیف بلیو تلسی والوں کے ساتھ اپنے بھرپور تعاون اور دوستانہ جذبات کو فروغ دینے کے لیے "یوز تو" بھی کرنے کی کوشش کی تھی۔ گویا مجھے دہرے مفادات کے لیے استعمال کیا جا رہا تھا۔ یہ اس کی ذہانت اور سہ رخی عملی کارروائی کا کمال تھا کہ وہ اپنی حد تک کامیاب جا رہا تھا مگر میں جانتا تھا کہ اسے اس طرح کچھ حاصل ہونے والا نہیں ہے۔

"کیا سوچنے لگے دوست؟" مجھے سوچوں کے بھنور میں غلطاں پاکر بشام نے کہا تو میں اس گرداب سے ابھر کر بولا۔

"آں...... کچھ نہیں، تمہارے لیے حالات واقعی تشویش ناک حد تک مخدوش ہیں، تمہاری بدقسمتی یہ ہے کہ لولوش کو تم سے ایک ایسی شے درکار ہے جو تمہارے پاس نہیں لیکن لولوش اس بات پر پورا یقین کیے بیٹھا ہے کہ وہ تمہارے قبضے میں ہے۔"

"ہاں! مجھے بھی اسی تشویش نے پریشان اور خوف زدہ کر رکھا ہے۔" وہ تشویش بھرے لہجے میں بولا۔ "سوچتا ہوں اب کہ...... کیا ضرورت تھی مجھے اس ہیرے کے پیچھے بھاگنے کی؟ جب ملک کے ذمے داران و مقتدران نے ہی اس کی حفاظت کے سلسلے میں کسی سنجیدگی کا مظاہرہ نہیں کیا تو مجھے کیا ضرورت پڑی تھی اپنی زندگی کو خطرے میں ڈالنے کی؟ اگر مجھے کچھ ہوگیا تو بعد میں میرے بیوی بچوں کا کیا بنے گا؟ کوئی انہیں نہیں پوچھے گا۔" یہ کہتے ہوئے وہ آزردہ ہونے لگا۔

ہمارے ملک کا یہی...... بڑا المیہ ہے، ملک کے سچے خدمت گاروں اور وطن پرستوں کو کیا ملتا ہے؟ ایک میڈل...... اور بس! مجھے ایک واقعہ یاد آگیا تھا، کسی شہید سپاہی کا گھرانا غربت اور تنگ دستی کی زندگی گزار رہا تھا، بھوک نے ڈیرے ڈال رکھے تھے اور کوئی ان کا پرسانِ حال نہ تھا، آخر میں اس میڈل یافتہ شہید کی بیوہ نے بھوک سے تنگ آکر اپنے شوہر کو ملنے والا سونے کا میڈل بیچ ڈالا تھا۔

رہی ہیرے والی بات تو اس کا مجھے بھی قلق تھا۔ میں یہ قطعی برداشت نہیں کر سکتا تھا کہ طلسم نور جیسا ہیرا، جس پر صرف میرے ملک کا حق تھا وہ دوسرے کے پاس چلا جائے۔ میرا فرض تھا کہ میں اسے حاصل کرنے کی جستجو کروں۔

"دیکھو بشام! ملک و قوم کی سچی خدمت کرنے والے کبھی بھی دل میں کسی صلے یا اعزاز کا لالچ نہیں رکھتے، ان کا مطمحِ نگاہ صرف اور صرف خدمت ہوتا ہے اور بس! مجھے تم پر فخر ہے کہ تم نے یہی کچھ کیا۔ مگر تم ہمت مت ہارو، میں تمہارے ساتھ ہوں اور تم میرے ساتھ اور سب سے بڑا ہمارا ساتھ اللہ کا ہے۔ بس تم ایک بات واضح کر دو کہ کیا واقعی تم اب بھی یہ چاہتے ہو کہ وہ طلسم نور ہیرا، جس پر صرف ہمارے ملک کا حق ہے، اسے ہم دوبارہ حاصل کریں؟"

میری بات پر اس نے قدرے چونک کر میری طرف دیکھا تو مجھے اس کی آنکھوں میں جوش کی ایک لہر سی مترشح ہوتی محسوس ہوئی۔ بولا۔

"کیوں نہیں دوست! میں بھلا کیسے نہیں چاہوں گا اپنے استاد پروفیسر کریم بخش صاحب مرحوم کی دن رات کی عمر گزار محنتوں کے ثمر، طلسم نور ہیرہ حاصل کروں، جس پر ہماری دھرتی ماں کا حق ہے اور اس کا زیور بھی۔ اسی صدمے نے ہی تو پروفیسر صاحب کی جان لی تھی کہ اس بیش قیمت اور خدا کے دیے ہوئے تحفے کی ہم حفاظت نہ کر سکے۔ اسے حاصل کرنے کی دلی تمنا اور جوش اب بھی میرے سینے میں

ٹھاٹھیں مارتا ہے مگر جب اپنے حالات اور وسائل کی طرف دیکھتا ہوں تو سر جھکا لیتا ہوں۔''

''بس دوست! اپنا یہی جوش اور ہمت جواں رکھنا، انشاء اللہ ہم اس زیور کو حاصل کر کے رہیں گے۔'' میں نے بھی اسی جوش سے کہا تو وہ پہلی بار میری طرف دیکھ کر مستحکم انداز میں مسکرایا اور میں نے بھی اس کا پوری طرح ساتھ دیا۔

میں نے اس سے پوچھا۔ ''ایک بات بتاؤ..... کیا تمہیں پورا یقین ہے کہ طلسمِ نور ہیرا، وکرم اور سوشیلا نے ہی چرایا ہے؟''

''پورا سو فیصد یقین ہے مجھے.....'' میری بات پر وہ بہ یک ترنت بولا۔ ''کیونکہ ہیرے کی برآمدگی کے فوراً ہی بعد میں نے اسے اپنی تحویل میں لے لیا تھا اور یہ دنوں اس رات میرے پاس ہی رہے تھے، اگلے دن وہ روانہ ہوئے تو میں چند گھنٹوں تک رپورٹس وغیرہ اور چند دیگر اہم نوعیت کے کاموں میں مصروف رہا، بعد میں جب میں اپنے ضروری امور وغیرہ سے فارغ ہوا تو یوں ہی ایک نظر میرا اس ہیرے کو دیکھنے کا جی چاہا تو مجھ پر یہ سنسنی خیز انکشاف ہوا کہ ہیرا چرایا جا چکا تھا، جبکہ اس کی جگہ یہ نقلی ہیرا رکھ دیا گیا تھا۔''

''حیرت ہے'' میں نے کہا۔ ''بہ قول تمہارے وکرم اور سوشیلا تو اسپیکٹرم کے سینئر اور قابلِ بھروسا ممبران تھے۔''

''نیت بدلتے کب دیر لگتی ہے دوست!'' وہ ایک تلخ سی مسکراہٹ سے بولا۔ ''یہ تو پھر اس نادر و نایاب ہیرے کی بات تھی جو انمول تھا۔''

''کیا خبر وہ ہیرا ان دونوں کے بجائے کسی ایک نے ہی چرایا ہو؟'' میں نے کہا۔ ''یعنی وکرم یا پھر..... سوشیلا نے؟''

''خیال تو مجھے بھی یہی آتا ہے لیکن بات تو وہی ہے کہ ہیرا چرایا جا چکا ہے، اب چاہے، سوشیلا نے چرایا ہو یا وکرم کی یہ حرکت ہو؟''

''اگر تو یہ صرف ان میں سے کسی ایک کی ہی حرکت ہے تو پھر یہ سب اچانک نہیں ہوا ہوگا بلکہ پہلے سے سوچی سمجھی اسکیم کے تحت ہوا ہوگا۔'' میں نے پُرغور لہجے میں کہا۔

''ممکن ہے۔'' اس نے عام سے لہجے میں جواب دیا۔

''کیا تمہیں وکرم یا سوشیلا کے بارے میں تفصیلاً آگاہی ہے؟'' میں نے کہا اور اپنی بات کی وضاحت چاہی۔ ''میرا مطلب ہے، ان کا یہاں بھارت میں کچھ اتا پتا؟ وہ کہاں رہتے ہیں اور کیا کرتے ہیں؟''

''کچھ زیادہ تو نہیں.....'' وہ ذہن پر زور دیتے ہوئے بولا۔ ''لیکن..... اتنا ضرور معلوم ہے کہ وہ ممبئی ... ... شہر میں رہتے ہیں۔''

''اگر تم کسی طرح ہیڈ آفس سے ان کی پوری بائیوڈیٹا تلاش کرنے کی کوشش کرتے تو شاید ان کا کھوج لگا سکتے تھے۔''

''کون میری مدد کرتا؟'' وہ تلخی سے بولا۔ ''اپنے ملک کا تو یہ حال تھا کہ پہلی بار ہیرا جس بااثر زمیندار نے چرایا، اس کا تو کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکا اور میں نے ہی وہ اپنی کوششوں سے اس کے قبضے سے بازیاب کروایا۔ دوسری بار چوری ہوا تو معاملہ غیر ملک کا تھا، میں کیا کر سکتا تھا، بددل ہو گیا تھا میں۔''

''ہم.....'' وہ صحیح کہہ رہا تھا۔

کمرے میں چند ثانیے خاموشی طاری رہی۔

میں اب سوچنے لگا کہ لولووش کے ہم دونوں ہی انتہائی اہم اور ''قیمتی'' قیدی تھے، انتہائی مطلوبہ بھی..... وہ ہم میں سے اس وقت تک کسی کو جان سے نہیں مارنے کا اردہ نہیں رکھے ہوئے تھا، جب تک کہ اپنا مقصد حاصل نہ کر لیتا لیکن بشام کو رہائی درکار تھی اور مجھے لولووش پر قابو پانا تھا، اس کے لیے میں کل رات سے ہی اپنے ایک پلان پر اچھی طرح غور و خوض کر چکا تھا۔ اس پلان میں کرنل سی جی کو جہنم واصل کرنا بھی شامل تھا۔

''کمال ہے، ابھی تک یہ لوگ روانہ کیوں نہیں ہوئے ہیں؟'' معاً بشام نے خود کلامیہ انداز میں بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ اس بات پر تو خود مجھے بھی حیرت تھی کہ ''بوٹ'' ابھی تک روانہ کیوں نہیں ہوئی تھی۔

''ہو سکتا ہے بوٹ میں کوئی خرابی ہو گئی ہو؟'' میں نے کہا۔ ''لیکن ہمیں اس موقع سے فائدہ اٹھانے کی پوری کوشش کر لینی چاہیے۔''

''کیسے؟ ہمیں تو یہ کم بخت لوگ ایک لمحے کے لیے بھی نہیں چھوڑتے۔'' وہ بولا۔ ''صرف حوائج ضروریہ کے وقت چند سیکنڈوں کے لیے ہاتھوں کی ہتھکڑی کھولتے ہیں اور پھر اسی حالت میں لے آتے ہیں ہمیں۔''

''میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی ہے، بشرطیکہ تم میرا ساتھ دو.....'' میں نے اسرار بھری مسکراہٹ سے اس کی طرف دیکھا تو وہ بھی ہلکی سی مسکراہٹ سے بولا۔

''کیا اب بھی تم ایسی باتیں کرو گے دوست؟''

''جانتا ہوں!'' میں نے دوستانہ انداز کی مسکراہٹ سے کہا۔

''بتاؤ مجھے کیا پلان ہے تمہارا؟'' اس نے پورے اشتیاق سے پوچھا اور میں اسے نیچی آواز میں اپنے منصوبے

سے دھیرے دھیرے آگاہ کرتا چلا گیا۔ پورا منصوبہ جان لینے کے بعد اس کے چہرے پر پہلی بار ایک مسرت آمیز حیرانگی کے تاثرات ابھرے تھے، جیسے اسے بھی میری طرح اس منصوبے کی کامیابی کا پورا یقین ہو۔

''تم واقعی بہت ذہین ہو دوست! تمہاری پلاننگ رسکی سہی لیکن اس میں کامیابی کے بھی پورے چانسز ہیں۔'' وہ مجھ سے توصیفی لہجے میں بولا۔ میں ہلکے سے مسکرا دیا۔

تھوڑی دیر گزری، دروازے میں کھڑ بڑ کی آواز ابھری۔ ہم یہی سمجھے کہ وہی بھومک ہوگا لیکن جب دروازہ کھلا تو وہاں بھومک کے ساتھ کوہارا بھی موجود تھا۔ دونوں کے چہروں پہ بڑی زہر خند مسکراہٹ تھی۔ میرے اندر بے چینی کی ایک لہر نے کروٹ لی اور کسی خطرناکی کا احساس ہونے لگا۔

''ہم...... !اس کا مطلب ہے تم سچ بول رہے تھے۔'' کوہارا نے ایک نگاہِ غلط مجھ پر ڈالنے کے بعد بشام کی طرف دیکھ کر سرسراتے لہجے میں کہا، مجھے اس کے لہجے میں خطرناکی کی بو آتی محسوس ہوئی۔ اس کا یوں کہنا۔ ''اس کا مطلب ہے تم سچ بول رہے تھے۔'' کسی ہولناک شاخسانے کا ہی پتا دیتا محسوس ہوا تھا مجھے...... کیا مطلب تھا اس کا......؟ کیا اس خبیث جلاد نے ہماری باتیں سن لی تھیں؟ مگر کیسے؟ ہم تو اپنی زبان میں باتیں کر رہے تھے، تب پھر مجھے بشام کی بات یاد آئی، جب میں نے اس سے اصرار کیا تھا کہ وہ مجھے اس راز سے آگاہ کر ڈالے جس کے باعث وہ مصیبت میں گرفتار تھا اور یہ اگر سن بھی رہے ہوں تو ہماری زبان کیا سمجھیں گے تو، بشام نے خدشہ ظاہر کیا تھا کہ ان کے پاس وائس ٹرانسلیٹر ڈیوائسز موجود ہوتی ہیں، کیونکہ انہیں مختلف ممالک کے ممبران کے اکثر وائس میسجز بھی موصول ہوتے ہیں۔ یہی سبب تھا کہ میرے ذہن میں لامحالہ یہی شبہ ابھرا تھا۔

میں نے دیکھا، کوہارا نے بھومک کو ایک مخصوص اشارہ کیا۔ وہ آگے بڑھا اور مجھے پرے ہونے کا درشت سا اشارہ کیا اور پھر بشام کے ہاتھوں کی ہتھکڑی کھولنے لگا۔

''کک...... کہاں لے جا رہے ہو مجھے......؟'' بشام نے بھومک کی طرف دیکھ کر منہ کھولا۔ میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا، بھومک کے بھدے بھدے ہونٹوں پر جو ایا سفاک مسکراہٹ تھی مگر اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ میں وحشت زدہ سا ہونے لگا، مجھے شاید کسی ''ہولناکی'' کا احساس ہو چلا تھا۔

''اسے کہاں لے جا رہے ہو؟'' میں نے دروازے پر کھڑے گینڈے جیسے کوہارا سے پوچھا تو اسی وقت بھومک نے میری گردن اپنے ہتھوڑے جیسے ہاتھ کی گرفت میں لے لی اور بھیڑیے جیسی غراہٹ سے مشابہ آواز میں بولا۔

تم اپنا منہ بند رکھو، ورنہ......'' اس نے تہدیدی انداز میں اپنا جملہ ادھورا چھوڑا اور زوردار جھٹکے سے میری گردن چھوڑ دی۔ بشام گھگیانے لگا تھا۔ اسے شاید کسی خطرناکی کا احساس ہو چلا تھا۔

''یہ اب ہمارے کام کا نہیں رہا ہے اس لیے اس کے بوجھ سے ہم اپنی بوٹ کو ہلکا کرنا چاہتے ہیں۔ ہاہاہا......!'' کوہارا نے میری طرف دیکھ کر بڑے ہولناک لہجے میں کہا اور پھر جانے کے لیے واپس مڑا، میں اس کی بات سن کر سرتاپا لرز اٹھا۔ یہی حال بشام کا ہوا۔ وہ موٹے تازے خلاصی بھومک کی گرفت میں زور زور سے مچلنے لگا۔

''مم...... مجھے چھوڑ دو...... خ خ...... خدا کے لیے، مجھے مت مارو...... مم...... میرے بچ...... چھو...... چھوٹے بچے ہیں۔'' وہ دوہائی دیے جا رہا تھا مگر بھومک یا کوہارا جیسے قسائیوں پر اس کی داد و فریاد کا کوئی اثر نہیں ہوا، بھومک نے ایک خوفناک نال والا پستول نکال لیا تھا۔ میں حلق کے بل جنونیوں کی طرح چلایا۔

''کوہارا...... !فار گاڈ سیک! اس بے چارے کے ساتھ یہ ظلم مت کرو۔''

مگر کوہارا جا چکا تھا اور بھومک بھی۔

دروازہ بند کر دیا گیا۔ مجھے بشام کے چلانے اور زندگی کی بھیک مانگنے کی لرزا دینے والی آوازیں بدستور سنائی دے رہی تھیں اور میرا دل اندر سے کٹ رہا تھا، میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ ہتھکڑی سے اپنے ہاتھ آزاد کروا کے اس منحوس کمرے کا دروازہ توڑتا ہوا، بھومک پر جھپٹ پڑوں مگر میں خود بے بس تھا۔

اچانک ''ٹھائیں'' کی آواز ابھری۔ مجھے ایک دم سکتہ ہو گیا۔ بشام کے چلانے اور فریادیں کرنے کی آوازیں بھی گولی کی اس آواز کے ساتھ ہی دم توڑ گئیں، میرے ماؤف ہوتے دماغ اور دم بہ خود سماعتوں میں جو آخری بے رحم سی آواز ابھری تھی وہ...... پانی میں کسی کے گرنے کی زوردار چھپاکے کی آواز تھی۔

خونی رشتوں کی خود غرضی اور پرائے بن جانے والے اپنوں کی بے غرض محبت میں پرورش پانے والے نوجوان کی سنسنی خیز سرگزشت کے مزید واقعات آئندہ ماہ

ایک زمانہ تھا کہ ہمارے یہاں میوزیکل، رومینٹک اور خوب صورت کہانیوں کی خوب صورت فلمیں بنا کرتیں۔ کیسے کیسے ہنر مند ہماری فلم انڈسٹری سے وابستہ تھے۔ موسیقار، کہانی نویس، ہدایت کار، اداکار، صداکار اور کتنی خوب صورت فلمیں دیکھنے کو ملتی تھیں۔

پھر معاشرے کی طرح فلموں میں بھی تشدد کا دور شروع ہو گیا۔ اس کے ساتھ کہانیاں بھی بے تکی اور بے مقصدی ہونے لگیں۔ فلموں میں بدمعاشوں کا دور شروع ہو

متوالا

منظر امام

سلور اسکرین کا اپنا نشہ ہوتا ہے... اس کا سحر ہر شخص کو جکڑ لیتا ہے... ایسے ہی دل فریب طلسم کدہ سے تعلق رکھنے والے فلم ساز کی کتھا... منفرد اور یادگار کہانیوں کی تلاش اسے سرگرداں رکھتی تھی... بالآخر وہ ایک ایسے کھنڈر تک جا پہنچا جہاں ایک پُراسرار اور محبت بھری کہانی... آج بھی سانس لے رہی تھی...

فراق عشق میں دھواں دھواں ہوجانے والے متوالوں کا فسانہ تحیر...

گیا۔

بالا بدمعاش، ڈاکو بدمعاش، فلاں گجر، اس قسم کی فلمیں بننے لگیں اور فلم انڈسٹری تباہ ہوتی چلی گئی۔ ایسی فلمیں کسی خاص طبقے کو تو متاثر کرتی ہوں، لیکن سنجیدہ لوگوں نے پاکستانی فلمیں دیکھنا بند کر دیں۔

سینما ہالز جہاں ایک زمانے میں فیملیز بھی جایا کرتی تھیں، ویران ہوتے چلے گئے۔ ایسے میں حالات نے پھر ایک کروٹ لی اور کچھ پڑھے لکھے، باہر کے ملکوں سے تربیت یافتہ لوگوں نے فلمیں بنانے کی ٹھان لی۔ یوں کامیاب اور بامقصد فلموں کا ایک نیا دور شروع ہو گیا۔

سینما گھر پھر سے آباد ہونے لگے۔ فیملیز نے سینما گھروں کا رخ کر لیا اور فخریہ طور پر پاکستانی فلموں پر گفتگو ہونے لگی۔

میں نے یہ تمہید اس لیے باندھی ہے کہ میرا تعلق بھی جدید فلمیں بنانے والے اسی گروہ سے ہے۔ برطانیہ سے فلم ڈائریکشن کی تعلیم لی ہے اور خدا کے فضل سے اتنا سرمایہ بھی ہے کہ دو چار فلمیں خود ہی پروڈیوس کر سکتا ہوں۔

اسی لیے میری پہلی فلم بے حد کامیاب رہی۔ اس نے ریکارڈ بزنس کیا۔ اس کامیابی نے مزید حوصلہ دلایا اور دوسری فلم بنانے کا ارادہ کر لیا۔

ہم جیسے لوگ جو فارمولا فلمیں نہیں بنانا چاہتے، ان کے ساتھ سب سے بڑی پرابلم سبجیکٹ کی ہوتی ہے۔ ایسا سبجیکٹ جو باندھ کر رکھ دے۔ جس میں روزمرہ کی زندگی اپنی پوری توانائی اور سچائی کے ساتھ دکھائی دے۔

بہر حال سبجیکٹ کی تلاش میں تھا کہ میرے دفتر میں ایک لڑکی آ گئی۔ میرے سیکریٹری نے مجھے انٹرکام پر اطلاع دی تھی۔ ''سر! مس غزالہ آپ سے ملنا چاہتی ہیں۔''

''کون ہیں یہ؟'' میں نے پوچھا۔

''آڈیشن کے لیے آئی ہیں سر۔'' اس نے بتایا۔

''تو اس کو انجم رضوی کے سپرد کرو۔ وہ اس کا اسکرین ٹیسٹ وغیرہ لے لے گا۔''

''لیکن وہ آپ سے ملنا چاہ رہی ہیں۔'' سیکریٹری نے بتایا۔ ''ان کی ممی بھی ان کے ساتھ ہیں۔''

''ٹھیک ہے، بھیج دو میرے پاس۔'' میں نے انٹرکام بند کر دیا۔

کچھ دیر بعد دو خواتین کمرے میں داخل ہوئیں۔ ان میں سے ایک ادھیڑ عمر کی تھی اور دوسری ایک جوان لڑکی تھی۔ وہ واقعی خوب صورت اور اسمارٹ لڑکی تھی۔ بالکل فریش چہرہ تھا۔ اس نے مغربی لباس پہن رکھا تھا جو اس پر بہت نچ رہا تھا۔

''میں غزالہ ہوں۔'' لڑکی نے اپنا تعارف کروایا۔

''اور یہ میری ممی ہیں۔'' اس نے ماں کی طرف اشارہ کیا۔

''بیٹھ جائیں پلیز۔'' میں نے سامنے رکھی کرسیوں کی طرف اشارہ کیا۔

دونوں بیٹھ گئیں۔ میں نے غور سے اس لڑکی کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک چمک سی تھی جبکہ اس کی ماں اس کے برعکس بے باک سی دکھائی دے رہی تھی۔

''سر! غزالہ آپ کے پاس چانس کے لیے آئی ہے۔'' اس کی ماں نے بتایا۔

''تو اس کے لیے آپ میرے اسسٹنٹ سے مل لیتیں۔'' میں نے کہا۔ ''وہ ان کا اسکرین ٹیسٹ وغیرہ لے لیتا۔''

''نہیں سر جی، یہ اسسٹنٹ وغیرہ کی کہانی ٹھیک نہیں رہتی۔'' وہ ایک عجیب انداز سے بولی۔

''کیا مطلب؟'' میں نے چونک کر پوچھا۔

''مطلب یہ ہے سر کہ جو لڑکی اسسٹنٹ وغیرہ کے چکر میں پھنس جائے وہ پھر وہیں تک رہتی ہے۔ وہ آگے نہیں جا پاتی۔ اسی لیے ڈائریکٹ بات کرنا زیادہ اچھا ہوتا ہے۔''

''خوب!'' میں نے ایک گہری سانس لی پھر اس لڑکی کی طرف دیکھا۔ ''کیا تم نے پہلے بھی کوئی کام کیا ہے؟''

''کالج کے ڈراموں میں حصہ لیتی رہی ہوں۔'' اس نے بتایا۔

''اور یہ ڈانس بہت زبردست کرتی ہے۔'' اس کی ماں بول پڑی۔ ''اتنا زبردست کہ دیکھنے والے پھڑک کر رہ جائیں۔''

''ممی نے مجھے ایک بات سمجھا دی ہے۔'' غزالہ نے کہا۔ ''اور وہ بات یہ ہے کہ جب سمندر میں کود رہی ہو تو اپنے آپ کو بھیگنے سے نہیں بچا سکتیں۔''

''سر جی۔'' اس کی ماں بول پڑی۔ ''میں نے اس کو ہر بات سمجھا دی ہے۔ یہ فلم میں کام کے لیے ہر قسم کی قربانی دینے کے لیے تیار ہے۔''

ہر قسم کی قربانی اس نے ایک معنی خیز انداز میں کہا تھا۔

مجھے ان دونوں سے کراہیت محسوس ہونے لگی۔ اس قسم کے لوگوں نے ہمارے فلمی ماحول کو تباہ کر کے رکھ دیا تھا اور اب پھر اس قسم کے لوگ دوبارہ چلے آرہے تھے۔ کیونکہ اب فلم نے ایک نئی کروٹ لی تھی۔ نئے امکانات روشن ہو رہے تھے۔

اور میں چونکہ ایک کامیاب فلم ساز اور ہدایت کار ہوتا جارہا تھا اسی لیے مجھ پر جال ڈالنے کی کوشش ہو رہی تھی۔

''ٹھیک ہے بی بی۔'' میں نے ایک گہری سانس لی۔ ''اب آپ یہ بتائیں کہ فیملی بیک گراؤنڈ کیا ہے آپ کا؟''

''جی فیملی بیک گراؤنڈ سے اگر آپ کا مطلب یہ ہے کہ ہمارا گزارا کیسے ہوتا ہے تو خدا کے فضل سے سب کچھ ہے ہمارے پاس۔'' اس کی ماں نے بتایا۔ ''اس کے ابو بہت کچھ چھوڑ کر مرے ہیں۔ ہمارے چار مکانات ہیں جن کے کرائے ہی اتنے آتے ہیں کہ آرام سے گزر جاتی ہے۔''

''یس سر۔'' وہ لڑکی بول پڑی۔ ''سب کچھ ہے ہمارے پاس۔ اپنی گاڑی، اپنا گھر، بس مجھے شوق ہے، اس کے علاوہ میں اور کیا کہہ سکتی ہوں۔''

میری میز پر ایک اسکرپٹ رکھا ہوا تھا۔ یہ اسکرپٹ کسی فلم کا نہیں تھا بلکہ فائنل آڈیشن تھا۔ لب و لہجے کی جانچ کے لیے میں نے مختلف جذبات اور کیفیات کے ڈائیلاگ لکھے ہوئے تھے۔ انہیں پڑھوا کر دیکھتا تھا۔

''چلیں، یہ ڈائیلاگ پڑھ کر دکھائیں۔'' میں نے کہا۔

اول تو اس سے پڑھا ہی نہیں جارہا تھا پھر اس کا لہجہ اور تلفظ اتنا خراب تھا کہ میں چکرا کر رہ گیا۔

''بی بی، تمہارا لہجہ اور تلفظ تو بہت خراب ہے۔'' میں نے کہا۔ ''تم کس بنیاد پر اداکاری کرنے نکلی ہو۔ تمہارے ساتھ تو بہت محنت کی ضرورت ہے۔''

''اسی لیے تو کہہ رہی ہوں سر جی۔ کہ اس کے ساتھ خاص توجہ دیں۔'' اس کی ماں بول پڑی۔ ''اور یہ ویسے بھی ہر قربانی کے لیے تیار ہے۔''

اس نے دوسری بار یہ بے تکی بات کی تھی۔ بہر حال، اس دن میں نے ان کا فون نمبر وغیرہ لکھ کر کسی طرح ان کو روانہ کر دیا تھا۔

کئی دن گزر گئے۔ میں اور کاموں میں مصروف ہو گیا۔ وہ لڑکی اور اس کی ماں سوچنے کا ایک مواد یہ دے گئی تھی کہ شہرت اور پیسوں کے لیے انسان کس حد تک جا سکتا ہے۔ بقول ان کے کوئی کمی نہیں تھی ان کے پاس سب کچھ تھا اس کے باوجود......

ابھی تک کوئی ایسا سبجیکٹ نہیں مل سکا تھا جس پر توجہ سے کام کیا جا سکتا۔ اسی دوران میں ایک کہانی میرے پاس آگئی۔

اس کہانی نے تڑپا کر رکھ دیا۔ وہ تھر کے ماحول کی ایک کہانی تھی۔ دخترِ صحرا کی کہانی تھی۔ صحرا کی سخت اور پریشان کر دینے والی زندگی کی کہانی تھی۔

میں نے اس کہانی کے ملتے ہی اپنے ساتھیوں سے مشاورت کر لی۔ ان ساتھیوں میں کیمرا مین نجیب تھا۔ میری اسسٹنٹ رانیہ اور فائزہ تھیں۔ نائب ہدایت کار امان اللہ تھا۔ سب کی یہی رائے تھی کہ کہانی بہت اچھی ہے۔ اس پر بہت زبردست فلم بن سکتی ہے۔

''لیکن میں تو تھر جا کر ریکی کرنا چاہوں گا۔'' میں نے کہا۔ ''اور تم سب میرے ساتھ چلو گے تاکہ تم بھی اپنے اپنے پوائنٹ آف ویو سے دیکھ سکو۔''

''چلنا کب ہے؟'' فائزہ نے پوچھا۔

''جتنی جلدی ممکن ہو۔'' میں نے بتایا۔ ''ہو سکتا ہے کہ ہم پرسوں ہی نکل لیں۔''

☆☆☆

ہمارے سامنے قدرت کا شاہکار دور دور تک پھیلا ہوا تھا۔ ریگستان کا اپنا حسن ہوا کرتا ہے۔ اس کے تیور دن میں کچھ اور ہوتے ہیں اور رات میں کچھ اور......

دن میں سورج آگ برساتا ہے اور رات کو آسمان شبنم کے موتی برساتا ہے۔ آپ صحرا میں چاند کو دیکھ لیں تو بس اسی کے ہو کر رہ جائیں۔

آسمان اتنا شفاف ہوتا ہے کہ لاکھوں ستارے آپ کو دکھائی دیتے ہیں۔ نہ جانے کتنی داستانیں اور کتنی کہانیاں صحراؤں میں پروان چڑھتی ہیں۔

مشہور مہم جو ناول نگار رائیڈر ہیگرڈ نے ''گرد باد'' جیسا ناول لکھ کر صحرا کو امر کر دیا ہے۔ بہر حال ہم بھی صحرا میں اپنی کہانی کی تکمیل کے لیے آئے تھے۔ سبجیکٹ وہی تھا۔ یعنی حسن اور محبت کا لیکن اینگل مختلف تھا۔ اس کے ساتھ ماحول بھی مختلف تھا۔

ہم پانچ آدمی تھے۔ جن کے بارے میں پہلے بتا چکا ہوں۔ ہم اپنی پوری تیاری کے ساتھ آئے تھے۔ صحرا کو

جاننے والے ایک شخص نے کہا تھا۔ ''صاحب جی، آپ کبھی صحرا پر بھروسا مت کیجیے گا۔ یہ بہت بے وفا ہوتا ہے۔ کسی وقت بھی اپنا تیور بدل سکتا ہے۔ آپ کو راستے سے بھٹکا سکتا ہے۔ کچھ دیر پہلے کچھ اور ہوتا ہے۔ کچھ دیر کے بعد اس کا رنگ کچھ اور ہوجاتا ہے۔''

''پھر کیا کیا جائے؟''

''کسی جاننے والے کو ساتھ لے لیجیے گا۔ بہت سے مل جائیں گے۔ رانی کوٹ میں آپ کو ایسے بندے مل جائیں گے جو آپ کو صحرا میں لے جائیں۔''

''یعنی گائیڈ قسم کی کوئی چیز۔''

''ہاں، یہی سمجھ لیں۔'' اس نے کہا۔ ''تھوڑے سے پیسے لیں گے پھر آپ کو صحرا کی سیر کرادیں گے۔ یاد رکھیں اگر آپ کسی گائیڈ کے بغیر گئے اور راستے میں بھٹک گئے تو پھر بھٹکتے ہی رہیں گے۔ صحرا آپ کو باہر جانے کا راستہ نہیں دے گا۔''

رانی کوٹ سے ہمیں ایک رہبر مل گیا تھا۔ رمیش کمار نام تھا اس کا۔ اچھا بندہ تھا۔ اس کی اردو بھی بہت صاف تھی۔ کراچی میں کئی سال رہ کر گیا تھا۔

اس طرح ہم پانچ کے علاوہ ایک رمیش کمار بھی ہوگیا تھا۔

پہلے دن اس نے پوچھا۔ ''صاحب! یہ بتاؤ، آپ لوگوں کو ریگستان میں کیا کسی خاص جگہ کی تلاش ہے؟ کیونکہ ریگستان تو ایک ہی جیسا ہوتا ہے۔ ریت کے اونچے نیچے ٹیلے۔ کہیں کہیں صحرائی پودے اور جھاڑیاں۔ ان کے بعد پھر دور تک پھیلا ہوا ریگستان۔ آپ لوگ کیا کسی خاص جگہ پر جانا چاہتے ہیں؟''

''ہاں رمیش، کوئی ایسی جگہ جہاں کوئی پرانا محل یا کھنڈر وغیرہ ہو۔'' میں نے بتایا۔ ''جس کے اردگرد کا ماحول بہت پُراسرار اور بہت عجیب ہو۔''

''پھر تو میں آپ کو روپ متی کے کھنڈر کی طرف لے چلتا ہوں۔'' اس نے کہا۔

''روپ متی کا کھنڈر؟''

''ہاں صاحب، ایک شہزادی تھی روپ متی۔ اس کے لیے اس کے باپ راجا وکرم سنگھ نے ریگستان میں ایک چھوٹا سا محل بنوادیا تھا۔ وہ اس محل میں رہتی تھی۔''

''دلچسپ! کیا روپ متی کی کوئی کہانی بھی ہے۔''

''جی صاحب، اس بے چاری کی بہت زوردار کہانی ہے۔''

''چلو، ہم وہ کہانی بعد میں سنیں گے۔ پہلے یہاں سے چلنے کی تیاری کرو۔ تم میرے آدمیوں کو بتاؤ کہ صحرا میں سفر کے لیے ہمیں کیا کیا ساتھ رکھنا ہے۔''

رمیش کمار نے میرے اسسٹنٹ امان اللہ کو ایک فہرست لکھوا دی۔ ہم نے اسی دن وہ سارا سامان خرید لیا اور دوسری صبح اپنے سفر پر روانہ ہوگئے۔

رمیش نے جس کھنڈر کے بارے میں بتایا تھا وہ تقریباً تیس کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ شہروں میں تو شاید اتنے فاصلے کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ لیکن صحرا میں یہ سفر بہت دشوار ہوتا ہے۔ ایک ایک قدم بوجھل ہوتا چلا جاتا ہے۔

ہم نے حماقت یہ کی کہ اس سفر پر دن کے وقت چل پڑے تھے جبکہ ہمیں رات کو نکلنا تھا۔ بہرحال پانچ چھ کلومیٹر کے بعد ہی ہماری ہمت جواب دے گئی اور ہم نے پڑاؤ کرلیا۔

ہم چھولداریاں ساتھ لے کر آئے تھے۔ بے پناہ گرمی تو خیر برداشت کرنی تھی لیکن چھولداریوں کی وجہ سے دھوپ سے نجات مل گئی تھی۔

ہم نے بارہ بجے کے قریب چھولداریاں لگائی تھیں اور شام تک ان ہی میں رہے تھے۔

مغرب کے بعد جب سورج نے اپنا سفر طے کرلیا۔ رات اتر آئی تو ہم نے کھانے سے فارغ ہوکر پھر اپنا سفر شروع کردیا۔

اور رات کا یہ سفر اتنا خوش گوار تھا کہ ہم بچوں کی طرح خوش ہورہے تھے۔ صحرا کی ٹھنڈی ہواؤں نے ہم میں ترنگ جگادی تھی۔

پچیس کلومیٹر کا سفر پتا ہی نہیں چلا تھا۔

اب ایک عظیم الشان کھنڈر ہمارے سامنے تھا۔ روپ متی کا محل، جہاں اس کو رکھا گیا تھا اور جس کی کہانی رمیش ہمیں بتانے والا تھا۔

وہ ایک بڑا محل ہوگا۔ کیونکہ کھنڈر بتا رہا تھا کہ عمارت عظیم تھی۔

کئی کمرے، دالان، دیواریں، بلند چھتیں اور بہت کچھ۔ لیکن ان سبھوں پر وقت کی گرد جم چکی تھی۔ بے رحم ریگستان نے اس کو اپنی ریت سے تقریباً ڈھانپ دیا تھا۔

اس وقت چاند روشن تھا۔ اس کی روشنی میں وہ کھنڈر بہت پُراسرار اور بھیانک دکھائی دے رہا تھا۔ سچ یہ ہے کہ ہم سبھوں پر ایک ہیبت اور خوف سا طاری ہوگیا تھا۔

''باس۔'' فائزہ نے میرے پاس آکر میرا بازو تھام

لیا۔ ''یہ جگہ تو آسیب زدہ معلوم ہوتی ہے۔''

''انسان تو خود سب سے بڑا آسیب ہے۔'' میں نے اپنے خوف کو دور کرنے کے لیے کہا۔ ''گھبراؤ نہیں۔ ہم یہاں سے کچھ فاصلے پر پڑاؤ ڈالیں گے۔''

''ہم نے یہ جگہ تو دیکھ لی ہے باس۔'' امان اللہ نے کہا۔ ''کیوں نہ اب واپس چلیں پھر پورے یونٹ کو لے کر آئیں گے۔''

رمیش کمار بول پڑا۔ ''نہیں صاحب، اس طرح واپس جانا ٹھیک نہیں ہوگا۔ رات بہت ہوگئی ہے۔ ہم تھوڑا ہی آگے جائیں گے تو دن نکل آئے گا۔ یہیں پڑاؤ کرنا پڑے گا۔''

''تو پھر کیا کہتے ہو؟''

''وہ دیکھو۔'' اس نے ایک دیوار کی طرف اشارہ کیا۔ وہ ایک اونچی دیوار تھی۔ ''صاحب، دن کے وقت اس دیوار کا سایہ زمین پر پڑے گا۔ ہم وہیں اپنی چھولداریاں لگا لیتے ہیں۔ پورا دن دیوار کے سائے میں آرام سے گزر جائے اور کل اندھیرا ہوتے ہی یہاں سے واپسی کے لیے نکل لیں گے۔''

''ہاں، تمہارا مشورہ معقول ہے رمیش۔''

ذرا سی دیر میں اس دیوار کے ساتھ چھولداریاں نصب کردی گئیں۔

ہم جب اطمینان سے بیٹھ گئے تو میں نے رمیش سے پوچھا۔ ''ہاں، بھائی، اب بتاؤ روپ متی کی کیا کہانی ہے۔''

''صاحب، وہ اس علاقے کے راجا وکرم سنگھ کی بیٹی تھی۔ بہت خوب صورت۔ وہ جب پیدا ہوئی تھی تو راجا نے اس کی جنم کنڈلی نکلوائی۔ اس میں یہ نکلا کہ راج کماری اپنے باپ کی موت کا سبب بن جائے گی۔ اس کو محل سے الگ رکھنا ہوگا۔ جب وہ اٹھارہ برس کی ہوگی تب اس پر سے بُرے اثرات ختم ہو جائیں گے۔ اس وقت باپ بیٹی ایک دوسرے کو دیکھ سکتے ہیں۔''

''عجیب سی بات ہے۔ ایسا بھی کیا ڈرنا۔'' میں نے کہا۔

''ہاں صاحب، ہمارے یہاں ایسا ہی ہوتا ہے۔ ہم اس پر بہت یقین رکھتے ہیں۔'' رمیش نے اپنی بات آگے بڑھائی۔ ''تو راجا نے یہ محل بنوا دیا۔ اس دوران روپ متی کی صورت کسی مرد نے نہیں دیکھی تھی۔''

''اور عورتوں نے۔'' رانیہ نے پوچھا۔

''ہاں، عورتیں اس کو دیکھ سکتی تھیں۔ اس کی ماں اس کو دیکھ سکتی تھی۔ وہ بُرے اثرات صرف باپ کے لیے تھے۔ اسی لیے محل کے اندر اس کی پرورش ہوتی رہی۔ پھر بھی وکرم سنگھ کو یہ ڈر لگا رہتا تھا کہ کہیں آتے جاتے اس کی نظر نہ پڑ جائے۔ اس لیے اس نے یہ محل بنوا کر اس کو الگ کردیا۔''

''کیا ماں بھی اس کے ساتھ تھی؟''

''ماں ساتھ تھی صاحب، وہ کبھی اپنے محل میں رہتی اور کبھی یہاں آجاتی۔ اس محل میں راجا نے سب کچھ بھر دیا تھا۔ جس جس چیز کی ضرورت ہو سکتی ہے' وہ سب تھا۔ راج کماری کی خدمت کے لیے بہت سی عورتیں رکھ دی گئی تھیں۔ راجا کو خبریں ملتی رہتی تھیں کہ اس کی بیٹی اچھی طرح پروان چڑھ رہی ہے۔ وہ بہت خوب صورت نکلی ہے' اس کی تعلیم و تربیت کا بھی اس نے پورا انتظام کردیا تھا۔''

''تو یہ تربیت اس کو کون دیتا تھا؟'' فائزہ نے پوچھا۔

''مرد ہوتے تھے۔ گرو لوگ۔ اسے تلوار چلانا سکھایا جاتا، تیر چلانا سکھاتے، اس کے علاوہ ساستروں کی تعلیم دی جاتی۔''

''تو کیا ان پر بُرے اثرات نہیں پڑ سکتے تھے؟''

''نہیں۔ کیونکہ یہ پیش گوئی صرف باپ کے لیے تھی۔'' رمیش نے بتایا۔ ''صرف باپ کی جان کو اس سے خطرہ ہو سکتا تھا۔''

''چلو، سمجھ گئے۔ اس کے بعد کیا ہوا؟''

''اس کے بعد یہ ہوا صاحب کہ نہ جانے کس طرف سے ایک بنجارا اس طرف بھٹکتا ہوا آنکلا۔ راج کماری روپ متی اب سترہ برس کی ہوچکی تھی۔ اس کا حُسن بے مثال تھا جو دیکھنے والوں کو باندھ کر رکھ دیتا تھا۔ تو وہ بے چارہ بنجارا بھی بندھ کر رہ گیا۔''

''وہ روپ متی تک کیسے پہنچ گیا تھا؟'' امان اللہ نے پوچھا۔

''وہ نہیں پہنچا تھا صاحب۔ خود روپ متی اس تک پہنچی تھی۔'' رمیش نے بتایا۔ ''اس کے پاس ایک گھوڑی تھی۔ وہ شام کے بعد اس گھوڑی پر سوار ہوکر دور دور نکل جاتی۔ اس کو بہت اچھی گھڑ سواری آتی تھی۔ اس کے سکھانے والوں نے اسے یہ سب سکھا دیا تھا۔ اس علاقے میں چونکہ کسی اور کا آنا جانا نہیں تھا اسی لیے وہ بے فکر ہوکر نکل جاتی۔ ایک رات وہ اسی طرح محل سے باہر نکلی۔ چاند پوری طرح روشن تھا۔ اس روشنی میں دور دور تک دیکھا جا سکتا تھا۔ اس نے کسی کو زمین پر گرا ہوا دیکھا۔ پہلے تو وہ گھبرا

گئی ہوگی۔ پھر ہمت کر کے اس کے پاس پہنچ گئی۔ یہ وہی بنجارا تھا صاحب، جو اس ریگستان کی طرف سے بھٹکتا ہوا اس طرح آنکلا تھا اور تھکن سے چور ہو کر بے ہوش ہو کر گر گیا تھا۔

''روپ متی اس وقت اکیلی تھی۔ وہ جب محل سے باہر گھڑسواری کے لیے نکلتی تو اپنے ساتھ پانی کی بوتلیں بھی رکھ لیتی تھی۔ اس نے بنجارے کے منہ پر پانی کے چھینٹے دیے۔ اس کو تھوڑا پانی پلایا اور جب وہ کسی طرح ہوش میں آگیا تو اسے ایک خفیہ راستے سے محل میں لے آئی۔''

ہم سب بہت دلچسپی اور سکون کے ساتھ رمیش کی کہانی سن رہے تھے۔ اس دوران رانیہ سب کے لیے چائے بنا کر لے آئی تھی۔

ایسے ماحول، ایسی فضا اور ایسے مقام پر چائے پینے کا مزہ ہی کچھ اور ہوتا ہے۔

''صاحب، روپ متی اس بنجارے کی دیکھ بھال کرتی رہی۔ اس نے اس بنجارے کو ایسی جگہ چھپا رکھا تھا جہاں کسی اور کی نظر نہیں جاسکتی تھی۔''

''اس بنجارے کا نام کیا تھا؟'' نجیب نے پوچھا۔

''وہ ایک مسلمان تھا صاحب۔'' رمیش نے بتایا۔

''یہ بھی بعد میں پتا چلا تھا۔ پھر ہوا یہ کہ ان دونوں کے درمیان محبت کا رشتہ قائم ہوگیا۔ کیونکہ روپ متی نے زندگی میں پہلی بار غلاموں کے علاوہ کسی اور مرد کو دیکھا تھا۔

''یہ محبت اتنی گہری ہوگئی تھی کہ ان دونوں نے ایک ساتھ جینے مرنے کا ارادہ کرلیا۔ روپ متی نے اس کو اپنے بارے میں بتایا۔ اس نے بتایا کہ اس کا نام شاکر ہے اور وہ ایک مسلمان تاجر کی اولاد ہے۔ وہ شکار کی تلاش میں بھٹکتا ہوا اس طرف آنکلا تھا۔ اس کے پاس پانی ختم ہوگیا تھا۔ صحرا کی گرمی اس سے برداشت نہیں ہوئی اور وہ بے ہوش ہو کر گر گیا تھا۔''

''روپ متی نے اس کے ساتھ اس محل سے نکل جانے کا ارادہ کرلیا۔ ہوسکتا ہے کہ شاکر نے اسے سمجھایا بھی ہو لیکن روپ متی تو اس کے عشق میں پاگل ہو رہی تھی۔''

''بہر حال ایک رات کو یہ دونوں اس محل سے نکل گئے۔ وہ اپنے ساتھ گھوڑے نہیں لے جاسکتے تھے کیونکہ محل میں پہریداری کی جاتی تھی۔ دونوں پیدل ہی فرار ہوئے تھے۔ رات تو خیریت سے گزر گئی۔ لیکن اس کے بعد کا دن ان کے لیے قیامت کا ثابت ہوا۔ سورج پوری آب و تاب کے ساتھ طلوع ہو چکا تھا۔ روپ متی ایک نازک لڑکی تھی۔ اس نے ایسی گرمی کہاں برداشت کی ہوگی۔ بہر حال وہ صحرا میں ایک دوسرے کے سہارے چلتے رہے اور آخر کار ایک جگہ نڈھال ہو کر گر پڑے۔''

''اب یہ دیکھیں کہ قسمت کے کیسے کھیل ہوا کرتے ہیں۔ اس صحرا میں اس کا باپ وکرم سنگھ اپنے کچھ سپاہیوں کے ساتھ شکار کھیلنے آیا ہوا تھا۔ اس نے ان دونوں کو دیکھا تو حیران رہ گیا خاص طور پر روپ متی جیسی حسین لڑکی کو دیکھ کر اس کے ہوش اُڑ گئے تھے۔ اس نے پہلی بار اسے دیکھا تھا اس لیے اسے معلوم ہی نہیں ہوسکا کہ یہ اس کی اپنی اولاد ہے۔

''اس کے کہنے پر اس کے سپاہی ان دونوں کو اٹھا کر خیمے میں لے آئے۔ جہاں انہیں ہوش میں لایا گیا۔ دوسری طرف خود روپ متی بھی اپنے باپ کو نہیں پہچانتی تھی۔ وکرم سنگھ نے ان دونوں کے نام پوچھے۔ شاکر نے اپنا نام بتایا اور روپ متی نے اپنے بارے میں بتایا کہ وہ شاکر کی بیوی ہے اور اس کا نام زبیدہ ہے۔ اس نے اس خوف سے نام خود بتایا تھا کہ کہیں اس کے باپ کو پتا نہ چل جائے۔

''قصہ مختصر یہ کہ راجا وکرم کی نیت خراب ہوگئی۔ اس نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ وہ اس لڑکی کو اس کے اپنے خیمے میں پہنچا دیں۔ شاکر سے یہ بات برداشت نہیں ہو سکی۔ اس نے وکرم کے پاس رکھی ہوئی تلوار اٹھا کر وکرم کی گردن اُڑا دی۔ وکرم کے آدمیوں نے یہ دیکھ کر شاکر اور روپ متی دونوں کو مار ڈالا۔ اس دوران روپ متی کے محل سے روپ متی کو تلاش کرتے ہوئے کچھ لوگ آگئے۔ انہوں نے روپ متی کو پہچان لیا۔ پھر کیا تھا۔ ہر طرف ایک کہرام مچ گیا۔ اور اس طرح یہ کہانی لوگوں تک پہنچ گئی اور آج تک ان علاقوں میں سنی اور سنائی جاتی ہے۔''

''یہ تو بہت المناک کہانی ہے رمیش۔'' فائزہ نے کہا۔

''ہاں جی، بہت المناک۔ کہانیاں تو اسی طرح جنم لیتی اور سینہ بہ سینہ سفر کرتی ہیں۔''

ہم لوگ بہت دیر تک خاموش رہے۔ اس دوران میں رات بھی ڈھلنے لگی تھی۔ یہی طے پایا کہ اس وقت صحرا میں سفر مناسب نہیں ہوگا۔ کیونکہ کچھ دیر کے بعد سورج طلوع ہو جائے گا پھر وہی بلا کی گرمی ہلکان کر کے رکھ دے گی۔''

روپ متی کی جو کہانی رمیش نے سنائی تھی، اس نے ہم سبھوں کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ امان اللہ تو یہ کہنے لگا کہ سر یہ سبجیکٹ ہی اتنا زبردست ہے کہ اس پر فلم بنائی جاسکتی ہے۔''

''وہ تو ہے۔'' میں نے اس کی تائید کی۔ ''میں اس پر ایک بھرپور اسکرپٹ لکھواؤں گا۔ اگلی بار ہم اسی پر کام

کریں گے۔''

وہ دن ہم نے اس محل کی دیوار کے سائے تلے گزارا۔ رمیش نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ ہم سورج کی تمازت سے محفوظ رہے تھے۔

مغرب ہوگئی۔ صحرا کی تپش کچھ کم ہوئی تو ہم نے واپسی کے لیے سامان باندھنا شروع کردیا اور اس وقت محل کے اندر سے ایک آواز آئی۔

کسی مرد کے گانے کی آواز۔ وہ کوئی صحرائی گیت گا رہا تھا اور کیا آواز تھی اس کی۔ جیسے کسی نے ہمیں باندھ کر رکھ دیا ہو۔ اتنی خوب صورت اور میٹھی آواز ہم نے بہت کم سنی ہوگی۔

''رمیش یہ کس کی آواز ہے؟'' میں نے حیران ہوکر پوچھا۔

''پتا نہیں صاحب۔ شاید کوئی محل کے اندر کسی کمرے میں ہے۔''

''چلو چل کر دیکھتے ہیں۔''

''نہیں صاحب۔'' نجیب ڈر گیا۔ ''خدا جانے کون سی بلا ہو۔''

''کسی بلا کی آواز اتنی خوب صورت نہیں ہوتی۔'' میں نے کہا۔ ''کوئی انسان ہے۔''

''ہاں صاحب، وہ کوئی بندہ ہے۔'' رمیش نے ایک طرف اشارہ کیا۔ ''وہ دیکھیں، وہ کچھ بکریاں دکھائی دے رہی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ کوئی چرواہا ہے۔ عام طور پر چرواہے اپنی بکریوں کو لے کر اس طرف آنکلتے ہیں اور اس محل کے کسی کمرے میں رات گزارتے ہیں۔''

''آؤ دیکھتے ہیں کون ہے؟''

ہم سب اس آواز کی طرف چل پڑے۔ وہ ایک چرواہا ہی تھا، جو ایک کمرے میں بیٹھا ہوا اپنی دُھن میں مگن گائے جارہا تھا۔

اس وقت اتنی روشنی نہیں تھی کہ ہم اسے دیکھ سکتے۔ ہم نے ٹارچ روشن کرلی تھی۔ وہ بے چارہ ہمیں دیکھ کر بُری طرح خوف زدہ ہوگیا تھا۔

میں نے اس کے پاس جاکر اسے تسلی دی۔ ''گھبراؤ نہیں، ہم بھی تمہاری طرح انسان ہیں۔ ہم نے باہر پڑاؤ کر رکھا تھا۔ اب واپس جارہے تھے کہ تمہاری آواز کھینچ لائی، کون ہو تم؟''

اس کو اردو نہیں آتی تھی۔ رمیش نے ترجمان کے فرائض انجام دیے۔ اس نے بتایا کہ اس آدمی کا نام راجن ہے۔ یہ قریب کی ایک بستی میں رہتا ہے اور بکریاں لے کر کبھی کبھی اس طرف آنکلتا ہے۔''

''اس سے کہو کہ اس کی آواز بہت خوب صورت ہے۔ میں اس کو شہر لے جاکر اس کی آواز کی تربیت کرا کے اس کو اپنی فلم میں استعمال کرنا چاہتا ہوں۔ اس کی آواز دھوم مچادے گی۔''

رمیش نے پھر مقامی زبان میں اس سے بات کی۔ اس چرواہے نے کچھ کہا۔ جس کے بعد رمیش بہت حیران دکھائی دینے لگا تھا۔

اس نے بتایا۔ ''صاحب، عجیب کہانی ہے۔ یہ بتا رہا ہے کہ اس کی ایک محبوبہ تھی جس کا نام روپ متی تھا۔''

''روپ متی؟'' ہم سب چونک پڑے۔

''ہاں صاحب، روپ متی ایک عام سا نام ہے۔ بہت سی لڑکیوں کا ہوتا ہے۔ تو اس کی محبوبہ کا بھی تھا۔ یہ بتا رہا ہے کہ وہ شروع ہی سے لوک گیت گاتا رہا ہے۔ مقامی لوگ اس کی آواز کو بہت پسند کرتے ہیں۔ پھر یہ ہوا کہ روپ متی کو ایک دن ریگستان کے ایک سانپ نے کاٹ لیا۔ وہ مرگئی۔ اس کے بعد سے وہ اب تک اپنی محبوبہ کی یاد میں گیت گاتا رہتا ہے۔''

''رمیش اس سے پوچھو کہ وہ ہمارے ساتھ شہر چلے گا۔ اس کو ڈھیروں پیسے ملیں گے۔ اس کا اپنا مکان ہوگا، گاڑی ہوگی۔ سب کچھ ہوگا اس کے پاس۔''

رمیش نے پھر اس سے بات کی۔ کچھ دیر بعد اس نے بتایا۔ ''نہیں صاحب، یہ اس بات کے لیے تیار نہیں ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ اس کی آواز مرنے والی روپ متی کی امانت ہے۔ وہ اس کو بازار میں نہیں بیچے گا۔''

اور اس وقت اچانک مجھے وہ دونوں ماں بیٹی یاد آگئیں۔

جو فلم میں کام کے لیے اپنی سب سے بڑی دولت یعنی عزت کی قربانی دینے کو تیار تھیں اور ایک یہ متوالا تھا جو اپنی آواز سے جادو جگا سکتا تھا۔ لیکن اس کی غیرت آواز تک کا سودا کرنے کو تیار نہیں تھی۔

ہم سبھوں نے باقاعدہ اس چرواہے کی عظمت کو سیلیوٹ کیا اور بوجھل قدموں اس کھنڈر سے روانہ ہوگئے۔ اس متوالے نے پھر کوئی گیت چھیڑ دیا تھا اور اس کی خوب صورت آواز اس صحرا کو آنسوؤں سے بھگوتی ہوئی دور بہت دور تک پھیلتی چلی گئی تھی۔

انوکھا منصوبہ

علی اسد

بعض اوقات چھوٹی سی نادانی ایسا روگ بن جاتی ہے... جس کا مداوا ممکن ہی نہیں... دل میں شک کی گرہ پڑ جائے تو پھر قصہ بربادی پر منتج ہوتا ہے... یورپ کی فضائوں میں گھومتی ایک دلچسپ اور سسپنس سے بھرپور تحریر... ایک انوکھے انداز کی منصوبہ سازی کرنے والے فطین کرداروں کی روداد... ہر کردار اپنی جگہ مستعد اور دیانت دار تھا... مگر ایک کے اندازِ فکر نے اچانک رخ بدل لیا...

جاں سے گزر جانے والے موسم کا حسلہ... فریب و نادانی کا گھائل نامہ

وہ المناک خبر انتونیو لیونی کو جمعرات کی صبح اس وقت ملی جب وہ اپنے آفس میں ''آرٹ کلکٹر'' میگزین کی ورق گردانی کر رہا تھا۔ اس کا آفس آرٹ گیلری کے اوپر ہی تھا جبکہ آرٹ گیلری، روم کی سب سے مشہور سڑک ڈی اسپانا پر واقع تھی اور اس کے مرکزی دروازے پر خوش نما لفظوں میں ''گیلری لیونی'' لکھا تھا۔

لیونی نے اپنے آفس کی ایک دیوار کو تڑوا کر وہاں بڑی سی بالکونی اور بیٹھک بنوائی تھی تا کہ وہاں آرٹ کے قدرداں آ کر بیٹھ سکیں، شوروم میں رکھی پینٹنگز دیکھ سکیں اور کاروباری گفتگو کر سکیں۔

ان دنوں وہ اور اس کی بیوی سانتے ہی کاروبار کو سنبھالے ہوئے تھے، ورنہ کسی زمانے میں چھ افراد اس کی معاونت کرتے تھے۔ ان دنوں وہ خسارے کا شکار تھا اور بینک سے لی ہوئی بھاری رقم کا قرض دار ہو چکا تھا۔ اس قرضے پر اسے ہر سال سود ادا کرنا پڑتا تھا۔

انتھونی کی میز کے پیچھے خوب صورت سے شیلف میں ایک قدیم ریڈیو رکھا ہوا تھا۔ اس نے ریڈیو کی سوئی کسی ایسے چینل پر سیٹ کر رکھی تھی جہاں سے ہمہ وقت پرانے زمانے کی موسیقی نشر ہوتی رہتی تھی۔

اس روز صبح اچانک موسیقی کا پروگرام ختم کر دیا گیا اور ویٹیکن سٹی سے ایک اہم نیوز بلیٹن نشر کیا جانے لگا کہ پوپ کا انتقال ہو گیا ہے۔ اس روز صبح جب وہ ناشتا کر رہے تھے، انہیں دل کا دورہ پڑا اور وہ جاں بر نہ ہو سکے۔

انتونیو لیونی نے اپنے ہاتھ سے میگزین ایک طرف رکھ دیا اور تقریباً دو منٹ تک سکتے کے عالم میں بیٹھا رہا۔ اس کے دل و دماغ میں دھماکے سے ہو رہے تھے۔ بالآخر اس نے فون کا ریسیور اٹھایا اور ایک نمبر ڈائل کیا۔ پہلی گھنٹی کے بعد ہی دوسری طرف سے ریسیور اٹھا لیا گیا۔

''یس؟'' کسی نے کہا۔

''بوبیو! کیا تم نے یہ خبر سنی؟''

''ہاں ابھی ٹی وی پر سنی ہے۔''

''میرا خیال ہے کہ ہمارا منصوبہ خاک میں مل گیا۔ میرے خدا! پوپ کی موت کوئی معمولی بات نہیں ہے۔'' اس نے تشویش ظاہر کی۔

''خود کو پُرسکون رکھو لیونی۔ پوپ کی موت یقیناً ایک بڑا سانحہ ہے مگر اس سے ہمارا منصوبہ کیوں متاثر ہونے لگا؟''

''میرا خیال ہے کہ تم معاملے کی تہ تک نہیں پہنچ پا رہے ہو۔ ان حالات میں ہم اپنے منصوبے کو پایۂ تکمیل تک کیسے پہنچا سکیں گے؟ پوپ کا انتقال کوئی معمولی بات تو نہیں ہے۔ سارا شہر تہ و بالا ہو جائے گا۔ پادریوں کی بڑی میٹنگ ہو گی اور وہ نیا پوپ چنیں گے۔ اس وقت سیکیورٹی کا انتظام اپنے عروج پر پہنچا ہوا ہو گا، اس لیے...''

''جو کچھ تم کہنا چاہ رہے ہو، میں اسے بہ خوبی سمجھ رہا ہوں لیونی۔'' بوبیو نے بات کاٹ کر کہا۔ ''مگر اس کے باوجود مجھے یقین ہے کہ ہم اپنے منصوبے پر عمل کر سکیں گے۔''

''میں ٹرینو سے ملنا چاہتا ہوں۔'' لیونی نے سراسیمگی سے کہا۔ ''میں اس معاملے میں اس وقت تک کوئی قدم نہیں اٹھاؤں گا تاوقتیکہ ٹرینو سے ملاقات نہ کر لوں۔''

''ٹھیک ہے، میں ٹرینو سے رابطہ قائم کر کے اس سے تمہاری بات کرا دوں گا۔'' بوبیو نے کہا۔ ''ہم سب چاہتے ہیں کہ تم سکون سے کام کر سکو۔''

☆☆☆

بوبو بلیونی نے ریسیور کو کریڈل پر رکھا اور اپنی الماری کی دراز سے سگریٹ کا پیکٹ نکال کر ایک سگریٹ سلگانے لگا۔

''تمبا کو نوشی تمہیں ہلاک کر دے گی۔'' بستر پر لیٹی ہوئی لڑکی نے کہا۔ ''تم اسے چھوڑ کیوں نہیں دیتے؟''

''میں سگریٹ پینا چھوڑ چکا تھا مگر اب پھر شروع کر رہا ہوں۔'' بوبو نے کہا۔ وہ سینتیس سال کا چاق و چوبند شخص تھا اور آرٹ سے دلچسپی رکھتا تھا لیکن اس کے ساتھ المیہ یہ تھا کہ وہ گزشتہ تین برسوں سے اپنی کوئی پینٹنگ فروخت نہیں کر پایا تھا۔ اس لیے اس کا مستقبل غیر محفوظ تھا۔ بوبو نا امید نہیں تھا۔ اسے معلوم تھا کہ وینیزیا میں ایک اسٹوڈیو اور آرٹ اسکول فروخت ہو رہا ہے۔ اگر وہ اسے خرید لے گا تو اچھی پینٹنگز فروخت کر لے گا اور آرٹ میں بھی اسے شد بد حاصل ہو جائے گی۔ بس وہ دونوں چیزیں خریدنے کے لیے اسے رقم درکار تھی۔

اس نے ٹی وی آف کر دیا اور لڑکی کی طرف مڑتے ہوئے بولا۔ ''میں چاہتا ہوں کہ تم اپنے والدین سے ملاقات کرنے فرینزی چلی جاؤ۔ میں نے تمہارے لیے ٹکٹ کا بندوبست کر لیا ہے۔ تم ان سے ملنے کے لیے بہت بے قرار تھیں نا؟''

اس نے شیلف سے پرس اٹھا کر اس میں سے نوٹ نکالے اور دس ہزار لیرے گننے کے بعد لڑکی کی طرف بڑھا دیے۔ یہ رقم اسے ٹرینو کی طرف سے منصوبے پر عمل کرنے کے لیے پیشگی ادا کی گئی تھی۔ ''جب تم ان سے ملاقات کرنے جاؤ گی تو تمہیں ایک نیا لباس بھی تو چاہیے ہوگا۔''

''میں سمجھ نہیں پا رہی ہوں۔ جب میں واپس آؤں گی تو...؟'' لڑکی نے بستر سے اٹھتے ہوئے کہا۔ اپنی برہنگی کو اس نے چادر سے چھپا لیا تھا۔

''واپسی پر تم میرے ہی ساتھ رہو گی۔'' بوبو نے کہا۔ ''اچھا اب جلدی سے اٹھو اور کپڑے پہن لو۔ تمہیں مارکیٹ سے جو چھوٹی موٹی شاپنگ کرنا ہے، کر ڈالو۔ اس کے بعد ٹرین کے لیے ٹکٹ بک کرانا ہے۔''

اٹھارہ منٹ بعد وہ لڑکی وہاں سے چلی گئی تو بوبو پھر ٹیلی فون کی طرف مڑا اور اس نے البا ٹرینو کا نمبر ڈائل کیا جو جزیرہ سسلی پر رہتا تھا۔

صبح کا وقت تھا اور البا ٹرینو اپنی بیوی مارگریتا کے ساتھ اپنے محل نما مکان کے ٹیرس پر ناشتا کر رہا تھا۔ اس کا مکان سمندر کے کنارے پالرمو سے کچھ فاصلے پر تھا۔

اس ٹیرس پر بیٹھ کر ناشتا کرنا ان کا معمول تھا۔ اس کی ساس چونکہ دیر سے بیدار ہوتی تھی اس لیے ناشتے میں شامل نہیں ہو پاتی تھی... اور ٹرینو کو اس پر خوشی ہوتی تھی۔

ناشتا کرنے کے بعد وہ امریکن کافی پی رہا تھا اور نیویارک ٹائمز کی خبروں پر نظر دوڑا رہا تھا۔

اس کے مکان کے علاوہ قرب وجوار کی زمین بھی اس کی تھی جہاں مرغیاں، بطخیں اور گائے بھینسیں پالی جاتی تھیں۔ اس کے علاوہ تھوڑی سی کاشت کاری بھی ہوتی تھی۔ اسی لیے وہ ناشتے اور کھانے میں اپنے فارم اور کھیت کی چیزیں استعمال کرتے تھے۔

جب ٹیلی فون کی گھنٹی بجی تو مارگریٹا کی پیشانی پر شکنیں نمودار ہو گئیں۔ اس لیے کہ اسے شبہ تھا کہ اس کا شوہر ان دنوں کسی لمبے چکر میں گرفتار ہے اور اس سے کوئی بات چھپا رہا ہے۔ اس نے اندازہ لگایا تھا کہ کوئی اور عورت اس کی زندگی میں داخل ہونے کی کوشش کر رہی ہے یا پھر وہ کوئی غیر قانونی کام کر رہا ہے۔

ٹرینو اندر چلا گیا اور اس نے برآمدے کے ایکسٹینشن فون کا ریسیور اٹھایا۔ ''یس! میں البا ٹرینو بول رہا ہوں۔''

''ٹرینو! کیا تم نے وہ خبر سنی؟'' بوبیو نے پوچھا۔

''میں نے ابھی اخبار اٹھایا ہے کہ تم نے فون کر دیا۔''

''خبر اخبارات میں نہیں ملے گی۔ ٹی وی پر آئی ہے کہ پوپ دوم کا انتقال ہو گیا ہے۔''

البا ٹرینو دو قدم ٹیرس کی طرف بڑھا اور اس نے بلند آواز سے کہا۔ ''ریٹا! ٹی وی آن کرو۔''

وہ مارگریٹا کو ریٹا کہہ کر پکارتا تھا۔

''ہاں... تو کیا کہہ رہے ہو؟'' اس نے بوبیو سے کہا۔

''تھوڑی دیر پیشتر لیونی نے مجھے فون کیا تھا۔ وہ پوپ کی موت سے نروس ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ ہمیں اپنا منصوبہ ترک کر دینا چاہیے۔''

''پوپ کی موت کا اس سے کیا تعلق؟''

''یہی میں نے بھی اس سے کہا تھا۔'' بوبیو بولا۔

''اب صرف چار روز رہ گئے ہیں۔''

''ہاں۔ مجھے معلوم ہے لیکن لیونی کا کہنا ہے کہ وہ کوئی قدم اٹھانے سے پہلے تم سے ملاقات کرنا چاہتا ہے۔''

''وہ کیوں؟ منصوبہ اور اس کی جزئیات تو طے کی جا چکی ہیں۔''

''اس کا کہنا ہے کہ سیکیورٹی بہت سخت ہو گی۔''

''اوہ!'' البا ٹرینو نے آہستہ سے کہا۔

اسے معلوم تھا کہ ویٹیکن سٹی کی نگرانی سوئٹزرلینڈ کے گارڈ کرتے ہیں جن کی تعداد تقریباً ایک سو ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ سارے شہر میں سوٹ بوٹ میں ملبوس درجنوں افراد گھومتے رہتے ہیں اور اجنبیوں کو روک کر سوالات شروع کر دیتے ہیں۔ انہیں یہ اختیارات پوپ پر قاتلانہ حملے کے بعد دیے گئے تھے۔

اب ممکن تھا کہ پوپ کی موت کے بعد کوئی بڑی انتظامی تبدیلی واقع ہو گئی ہو اور اسی لیے لیونی گھبراہٹ کا شکار ہو۔

''ٹھیک ہے... میں کل ہی روم آ رہا ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''حالانکہ منصوبے کے مطابق مجھے پرسوں آنا تھا۔''

''تم کس فلائٹ سے آؤ گے؟ میں تو میسو پر موجود رہوں گا۔''

''میں فلائٹ سے نہیں، فیری سے آؤں گا... اپنی کار سمیت۔ فیری مجھے نپولی سے مل جائے گی۔ یہ فاصلہ ایک سو اسی کلومیٹر ہے جو فیری تین گھنٹے میں طے کرلے گی۔ آج رات میں اپنے اپارٹمنٹ پہنچ کر تمہیں فون کروں گا۔ تم وہاں پہنچنا۔ ہم ایک چھوٹا سا پیگ لے کر حالاتِ حاضرہ پر گفتگو کریں گے۔'' اس نے ریسیور کو کریڈل پر رکھا اور مڑا۔

اس کی بیوی ریٹا ٹیرس کے دروازے میں کھڑی اسے گھور رہی تھی۔

''تم اتنی عجلت میں روم کیوں جا رہے ہو؟'' اس نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔

''ایک چھوٹا سا کاروباری معاملہ نمٹانا ہے۔'' وہ بولا۔

ریٹا غالباً اس کے جواب سے مطمئن نہیں ہوئی اس لیے اس کے ساتھ خواب گاہ تک چلی آئی۔

''البا ٹرینو! میں حقیقت معلوم کرنا چاہتی ہوں۔'' اس نے کہا۔

''میں تمہارے سوال کا جواب دے چکا ہوں پھر تمہاری بے اطمینانی کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔'' وہ قدرے ناگواری سے بولا۔

''تم جھوٹے ہو۔'' وہ پھنکاری۔

ٹرینو نے اس کی طرف توجہ دیے بغیر پیکنگ شروع کر دی جبکہ ریٹا ایک آرام کرسی پر نیم دراز ہو گئی۔

اپنا سوٹ کیس تیار کرنے کے بعد وہ اس کے قریب آ کر بیٹھ گیا۔ اس نے کہا۔ ''اس کاروباری دورے میں ممکن ہے کہ مجھے چند روز وہاں ٹھہرنا پڑ جائے۔''

''ٹرینو! تم نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ تم میرے وفادار رہو گے۔ روم میں وہ عورت رہتی ہے جس سے پہلے تمہارا

معاشقہ چلا تھا اور جو تمہارے بستر کی زینت بنتی تھی۔ اس کا نام تو تمہیں یاد ہی ہوگا... سانتے... اس وقت وہ آرٹ ڈیلر لیونی کی بیوی ہے۔ یقیناً تم اس سے ہی ملاقات کرنے جا رہے ہو؟'' اس نے ناک سکیڑ کر کہا۔

''اوہ ریٹا! ایسی باتیں مت کرو پلیز۔ میں وعدہ کر چکا ہوں کہ آئندہ تمہارا وفادار رہوں گا... اور جہاں تک غیر قانونی کاموں کا تعلق ہے، میں ان سے توبہ کر چکا ہوں۔''

ریٹا کو معلوم نہیں اس کے وعدے پر اعتبار آیا کہ نہیں مگر جب البا ٹرینو وہاں سے رخصت ہونے لگا تو وہ ہنسنے بولنے اور مسکرانے لگی۔

☆☆☆

اسی روز سہ پہر کے وقت ویٹیکن سٹی کے سرکاری محل کے آفس میں فون کی گھنٹی بجی تو پادری جوزف نے ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف اس کا چچا البا ٹرینو اس کی خیریت پوچھ رہا تھا۔ پادری جوزف ٹرینو نے اپنی خیریت سے آگاہ کیا۔

''میں چاہتا ہوں کہ کل رات کا کھانا تم میرے ساتھ کھاؤ۔'' ٹرینو نے کہا۔ ''تاکہ ہم موجودہ صورتِ حال پر تفصیلی گفتگو کر سکیں کہ پوپ کی موت سے ہمارے منصوبے پر کوئی اثر تو نہیں پڑے گا۔''

''ٹھیک ہے البا!''

''میرا خیال ہے کہ ہوٹل ہسلر بہتر رہے گا۔ تم آٹھ بجے تک وہاں آجانا۔''

''میں ضرور آؤں گا۔'' جوزف ٹرینو نے جواب دیا پھر ریسیور کو کریڈل پر ڈال دیا۔ وہ ایک بڑے منصوبے پر عمل کرنے جا رہے تھے جس کے بعد ان کے وارے نیارے ہونے والے تھے!

☆☆☆

دوسرے روز فادر جوزف ٹرینو نے چند دوسرے پادریوں کے ساتھ ویٹیکن سٹی کی گلیوں اور بازاروں میں چہل قدمی کی۔ دنیا بھر سے پادری اور ننز آئی ہوئی تھیں اور شہر پر سوگواری طاری تھی۔ ڈاک خانوں، پیٹرول پمپ، ریڈیو اسٹیشن، میوزیم اور آرٹ گیلریوں پر کوئی غیر معمولی سرگرمی دکھائی نہیں دی۔ سوئٹزر لینڈ کے گارڈ پوری طرح چوکنا تھے لیکن وہ خصوصی طور پر سے کسی چیز کی چیکنگ نہیں کر رہے تھے۔

اخبارات کے دفاتر پر جمگھٹا تھا۔ اس لیے کہ لوگ یہ جاننے میں دلچسپی رکھتے تھے کہ آئندہ پوپ کون ہوگا؟ پوپ کی کرسی ابھی تک خالی تھی۔

پوپ کی موت کا سرکاری اعلان دوسرے روز صبح کر دیا گیا تھا اور اس کی تصدیق چار بڑے ڈاکٹروں نے کر دی تھی۔ اگلے روز پوپ کی تدفین ہونا تھی۔

اس روز رات کو وہ ہوٹل ہسلر میں اپنے چچا کے سامنے بیٹھا تھا اور ان کے آگے اٹلی کی عمدہ شراب رکھی تھی۔ ''یہ عجیب اتفاق ہے کہ ہم پوپ کی تدفین کے ایک روز بعد اپنے عظیم منصوبے پر عمل کرنے جا رہے ہیں۔''

''بے شک! یہ عجیب ہے لیکن اس کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ ہم اپنا منصوبہ ترک کر دیں۔'' اس کے چچا البا ٹرینو نے کہا۔

''منصوبہ ترک کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔'' جوزف نے کہا۔

''گڈ!'' ٹرینو نے کہا۔ ''تمہاری معلومات کے لیے بتا دوں کہ ہمارے معزز گاہک ارجنٹائن، جاپان، شام اور کویت سے آچکے ہیں۔''

''وہ آچکے ہیں؟'' جوزف نے حیرت سے کہا۔

''ہاں، لیونی نے اس کی تصدیق کی ہے مگر وہ مضطرب ہے اور اس کا کہنا ہے کہ ہم اپنا منصوبہ ترک کر دیں۔''

''پھر تم نے کیا کہا؟''

''میں نے اس سے اتفاق کیا۔''

''اتفاق کیا!'' جوزف نے حیرت سے کہا۔

''ہاں۔ پھر میں نے اس تلخ حقیقت پر روشنی ڈالی کہ وہ دوالیا ہو چکا ہے۔ بینک اس کی گیلری پر قبضہ کر لے گا۔ اس کی کار نیلام ہو جائے گی، میں نے اس کی بیوی سانتے کو بتایا کہ اس کے زیورات بھی نیلام ہو جائیں گے۔''

''اوہ! تو تم نے سانتے سے بھی ملاقات کر لی۔ شیم شیم!'' جوزف نے مسکرا کر کہا۔

''میں اس سے براہِ راست مخاطب نہیں ہوا تھا۔'' البا ٹرینو نے اپنے شانے جھٹک کر کہا۔

''تم بے فکر رہو۔ میں اپنی چچی مارگریٹا سے کچھ نہیں کہوں گا۔''

''ہاں... تو ہم لیونی کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے کہ جب میں اس سے منفق ہوا تو اس نے مجھ سے اتفاق کیا کہ ہمیں اپنا منصوبہ ترک نہیں کرنا چاہیے۔'' وہ بولا۔ ''اس کی بیوی نے بتایا کہ لیونی کے خواب و خیال میں روپہلی بیٹلے کار بسی ہوئی ہے۔ وہ بینک کا قرض ادا کرنے کے بعد کار خریدنا چاہتا ہے۔ اور ہاں، تمہارا کیا ارادہ ہے؟''

''میں اپنے منصوبے پر قائم ہوں۔ یہ تمہیں معلوم ہی ہو گا کہ یہ منصوبہ میں نے ہی بنایا ہے۔ اس لیے کہ مجھے ایک نیک کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے بھاری رقم کی ضرورت ہے۔''

''اسی لیے مجھے تم سے محبت ہے، بھتیجے۔'' البا ٹرینو نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے محبت آمیز لہجے میں کہا۔

☆☆☆

اس رات جب فادر جوزف واپس چرچ پہنچا تو اس کے تیرہ نائب پادریوں نے پوچھا۔ ''صورتِ حال کیا ہے فادر؟''

''بالکل ٹھیک ہے... اور ہم منصوبے کے مطابق اس پر عمل کریں گے۔'' جوزف مسکرا کر بولا۔

...اور پھر اس وقت اس کے ذہن میں ایک بیش قیمت پینٹنگ ''ماسک آف پیٹر'' کا خیال آگیا۔

سینٹ پیٹرز کی کھدائی کے دوران ایک تہ خانے سے رومی شہنشاہ نیرو کے زمانے کی ایک پینٹنگ ملی تھی جس کی قیمت کا کوئی اندازہ نہیں لگا سکا تھا۔ بس یہی کہا جا سکا تھا کہ وہ چھ سو کروڑ ڈالرز کی ہو سکتی ہے۔ اس لیے نا قابلِ فروخت ہے!

☆☆☆

پوپ کی تدفین کے دن ویٹیکن سٹی کو عام آدمیوں کے لیے بند کر دیا گیا تھا مگر اس کے بعد حالات پھر معمول پر آگئے۔ اس لیے فادر لیتھ جو اندرونی طور پر فادر جوزف ٹرینو سے ملا ہوا تھا، اس کے آفس میں ایک درخواست لے کر داخل ہوا۔

فادر جوزف نے اسے اوپر سے نیچے تک دیکھا پھر درخواست پڑھی اور بولا۔ ''تم بارہ پادریوں کے لیے درخواست دے رہے ہو کہ وہ ویٹیکن لائبریری میں وقت گزارنا چاہتے ہیں؟''

''جی ہاں موسیو! وہ مختلف قوموں کے نمائندے ہیں۔''

''مجھے ان بارہ بھائیوں کے بارے میں کوئی علم نہیں ہے جو ہمارے مہمان خانے میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔''

''وہ ویٹیکن میں نہیں ٹھہرے ہیں موسیو! وہ حقیقت میں سوسائٹی کے ہیڈ کوارٹر بورگو سانتو اسٹریٹ پر ٹھہرے ہوئے ہیں۔''

''پوپ کی موت کے ایک روز بعد انہیں چاہیے تھا کہ وہ دعا کرنے کے لیے قبرستان میں جاتے لیکن وہ لائبریری میں وقت گزارنا چاہتے ہیں، حیرت ہے۔''

''بات دراصل یہ ہے کہ وہ لوگ پوپ کی سوانحِ حیات مرتب کرنا چاہتے ہیں، اس لیے وہ چند کتابوں سے نوٹس اتاریں گے۔'' فادر لیتھ نے ملائمت سے کہا۔ ''لیکن آپ اسے مناسب نہیں سمجھتے تو...''

''نہیں، نہیں میرا یہ مطلب نہیں ہے۔'' فادر جوزف نے اس کا جملہ قطع کرتے ہوئے کہا۔ ''میں اس میں کوئی حرج نہیں سمجھتا۔''

''کیا میں آپ کو ان بارہ پادریوں کے ناموں کی فہرست دوں تاکہ آپ پاس پر ان کے ناموں کا اندراج کرسکیں؟''

''اوہ نہیں... میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے۔'' جوزف نے کہا۔ پھر اس نے میز کی دراز سے گتے کے بارہ پاس نکال کر ان پر سرکاری مہر لگائی اور اسے دیتے ہوئے بولا۔ ''جب تم ان پاسوں کو واپس کرو تو خود ہی ناموں کا اندراج کردینا۔''

''ٹھیک ہے موسیو!'' وہ بولا۔ ''ان ناموں کو میں خود ہی پاسوں پر درج کردوں گا۔''

''اور یہ گائیڈ بک اس شخص کے لیے ہے جو ان کی راہنمائی کرے گا۔''

''آپ کے تعاون کا شکریہ موسیو!'' وہ بولا۔ ''میں ان لوگوں کے ساتھ خود ہوں گا۔''

☆☆☆

اس روز چار بجے سہ پہر فادر لیتھ کی معیت میں وہ بارہ پادری وہاں پہنچ گئے جو ایک سازشی منصوبے میں حصہ لے رہے تھے۔

سوئٹزرلینڈ کے آفیسر نے ان کی طرف خشمگیں نگاہ سے دیکھا اور روکھے لہجے میں بتایا کہ یہ جگہ ٹھیک پونے پانچ بجے بند کردی جاتی ہے۔ اندر کیمرا لے جانے کی اجازت نہیں ہے۔ فادر لیتھ اس کا شکریہ ادا کرکے اندر چلا گیا۔ ویٹیکن لائبریری میں دنیا کی قیمتی کتابیں رکھی تھیں جن پر ماہر جلد سازوں نے ہاتھ سے چرمی جلدیں چڑھائی تھیں۔ حال ہی میں وہاں گوٹنبرگ لائبریری سے بائبل کا ایک نسخہ بھی لاکر رکھا گیا تھا۔

عجائب گھر میں سونے اور چاندی کے زیورات تھے جو رومن شہنشاہوں نے استعمال کیے تھے اور ان کے علاوہ دنیا کی بیش قیمت پینٹنگ ''ماسک آف پیٹر'' تھی۔

وہاں سے کسی چیز کے چوری ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا، اس لیے کہ عمارت کے چپے چپے کی ہمہ وقت نگرانی کی جاتی تھی۔ ان گارڈز کی ڈیوٹیاں وقتاً فوقتاً تبدیل ہوتی رہتی تھیں۔

داخلے کے وقت وہ بارہ پادری ایک ساتھ اندر گئے تھے مگر اندر پہنچ کر وہ دو، تین اور چار کی ٹولیوں میں تقسیم ہوگئے۔

ان میں سے تین عجائب گھر میں داخل ہوئے۔ وہ دروازے پر متعین گارڈ کی طرف دیکھ کر مسکرائے اور انہوں نے سر ہلائے۔ وہ اندر چلے گئے تو ایک گارڈ تیس سیکنڈ بعد اندر گیا اور ایک چکر کاٹ کر واپس آگیا۔ اسی اثنا میں تین پادری مزید آگئے اور پہلے والے تین میں سے دو واپس آگئے۔ اس کے بعد دو پادری مزید داخل ہوئے اور تین واپس آگئے۔ جو پانچ بچ گئے تھے، ان میں سے تین اور اندر چلے گئے۔ کچھ واپس آگئے۔ اس طرح سے آنے جانے کا سلسلہ جاری رہا اور وہاں پر متعین گارڈوں کے لیے یہ دھیان رکھنا دشوار ہوگیا کہ کون کب گیا تھا اور کب واپس آیا۔

ہر پادری کے ہاتھ میں ایک نوٹ بک یا اسکیچ بک تھی جس پر وہ یادداشتیں نقل کررہے تھے۔ گارڈز کے نزدیک یہ کوئی قابل اعتراض بات نہیں تھی۔ انہوں نے بعد میں بھی بیان دیا کہ کسی بھی پادری کو ''ماسک آف پیٹر'' سے دلچسپی نہیں تھی۔

سوائے فادر لیتھ کے سارے پادری روایتی ڈھیلے ڈھالے گاؤن اور پاجامے میں ملبوس تھے۔ ان لبادوں کے نیچے بہرحال کوئی چھوٹی سی چیز چھپائی جاسکتی تھی۔

وہ گارڈ جو سب سے آخر میں نکلا اس کا بیان تھا کہ جب پادریوں کا آخری گروپ عجائب خانے سے نکلا تو کوئی بھی چیز چوری نہیں ہوئی تھی۔ وہ گارڈ جو دروازے پر کھڑا تھا اس نے قسمیں کھا کر کہا کہ پادری اپنے ساتھ جو چیزیں لے گئے تھے بس وہی واپس لے کر آئے تھے۔ صدر دروازے پر جو گارڈ ڈیوٹی انجام دے رہا تھا اس نے پاسوں پر اخراج کی مہریں لگائی تھیں۔ اسے کوئی بات غیر معمولی معلوم نہیں ہوئی۔ سوائے اس کے کہ پادری جاتے وقت زور زور سے باتیں کررہے تھے۔

دوسری صبح چھ بجے جب لائبریری اور عجائب خانے کی صفائی کے لیے ایک ملازم اندر گیا تو گھبرا کر واپس آگیا اور ایک گارڈ کو بلا کر لے آیا۔ اس نے عجائب گھر کی دیوار کی طرف اشارہ کیا جہاں سے ''ماسک آف پیٹر...'' دنیا کی بیش قیمت پینٹنگ غائب تھی!

☆☆☆

اس شام انتونیو لیونی کے پہاڑی والے محل نما مکان کے ٹیرس پر چار معزز اشخاص بیٹھے تھے جن کی خوش ذائقہ شراب سے تواضع کی جارہی تھی اور ماہر باورچیوں نے ان کے لیے لذیذ ڈشیں تیار کی تھیں۔

ان چاروں کی پشت پر ذاتی باڈی گارڈ تھے اور دو کے

دائیں شانے کے قریب مترجم بھی موجود تھے۔ ان کے علاوہ البا ٹرینو تھا۔

''یہ ایک خوب صورت سہانی شام ہے۔'' ٹرینو نے اپنی سابقہ بیوی سانتے سے کہا۔ وہ بھی روم کا سب سے خوب صورت اور وجیہہ جوڑا سمجھے جاتے تھے اور فوٹوگرافران کی تصویریں اتارنے کے لیے کیمرے لے کر ان کے پیچھے دوڑتے تھے۔

''یہ دنیا کے دولت مند افراد ہیں۔'' سانتے نے کہا۔ ''معلوم نہیں ان کے پاس کتنی دولت ہوگی؟''

''یہ ارب پتی... یا ممکن ہے کھرب پتی ہوں۔''

''معلوم نہیں کیا بات ہے کہ میں اندازہ لگانے سے قاصر رہتی ہوں کہ اتنی دولت، کتنی ہوتی ہوگی؟''

''تم ابھی تک خوش مزاج ہو سانتے۔'' ٹرینو نے کہا۔

''مجھے اس کی خوشی ہے۔''

''تم سے علیحدہ ہونے کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ میرا مزاج بھی تبدیل ہوگیا ہے۔'' وہ شراب کا ایک گھونٹ لے کر بولی۔ ''اس عورت کے ساتھ تمہاری زندگی کیسی گزر رہی ہے؟''

''ایسے غیر صحت مندانہ سوالات مت کرو سانتے! تم جیسی دل کش عورتوں کو ایسے سوالات نہیں کرنا چاہئیں۔''

''کیا میں اب بھی خوب صورت ہوں؟''

''تم سدابہار ہو۔'' وہ بولا۔ ''اچھا، میں ذرا لیونی سے دو چار باتیں کرنا چاہتا ہوں۔''

پھر وہ مردوں کے ایک گروپ کی طرف چلا گیا۔ معزز گاہکوں میں ایک وکٹر بلا نکا تھا۔ دراز قامت، خوش شکل اور متاثر کن شخصیت کا مالک۔ اس کا تعلق جرمنی سے تھا۔ دوسری جنگ عظیم میں اس کے والدین اسلحے کا کاروبار کرتے تھے اس لیے وہ لکھ پتی بن گئے۔ ان کے بیٹے یعنی وکٹر نے وہ رقم جنوبی امریکا کی ہیروں کی کان میں لگا دی جس سے وہ ارب پتی ہوگیا۔ اس کے پاس آرٹ کا ایک بڑا خزانہ تھا اور بیش بہا پینٹنگز خریدنا اس کا مشغلہ تھا۔

دوسرا مہمان کروسکا تا تھا۔ جاپانی نژاد، جس کا دنیا میں سب سے بڑا مچھلیاں شکار کرنے کا بحری بیڑا تھا۔ اس کا مکان نگوریا میں تھا اور اس کے طویل و عریض مکان میں مشرقی پینٹنگز کا سب سے بڑا ذخیرہ تھا۔

بے ہاما چمکیلی آنکھوں والا ایک ذہین شخص تھا جو قدرے فربہ تھا۔ وہ دمشق کے ساٹھ کمروں والے مکان میں رہتا تھا۔ وہ درآمد برآمد کرتا تھا۔ اس کی دولت کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ وہ آرٹ کا شیدائی تھا مگر ایسی پینٹنگز میں دلچسپی رکھتا تھا جن کا تعلق کسی نہ کسی پہلو سے مذہب سے ہوتا تھا۔

اس کے علاوہ شیخ عماد تھا جس کا تعلق کویت سے تھا۔ اس کے بہت سے تیل کے کنوئیں تھے اور وہ دنیا کے پچاس مال دار ترین لوگوں میں سے ایک تھا۔ خلیج فارس میں اس کا محل تھا جہاں دنیا کی نادر پینٹنگز لگی تھیں۔

ان چاروں میں یہی بات مشترک تھی کہ وہ آرٹ کے قدردان تھے مگر چوری کی پینٹنگز نہیں خریدتے تھے۔

اس محفل میں ایک موقع پر البا ٹرینو نے مہمانوں سے معذرت کی اور دوسرے کمرے کی طرف جانے لگا۔ وہ ایک راہ داری تھی جہاں بہت سے کمروں کے دروازے کھلتے تھے۔ ایک دروازہ کھلا ہوا تھا اور سانتے کسی سے ٹیلی فون پر محو گفتگو تھی۔ وہ ٹھٹک کر ٹھہر گیا۔

''نہیں۔ میں آئندہ چند گھنٹوں تک کہیں نہیں جا سکتی۔ جب اس کے مہمان رخصت ہوجائیں گے اور وہ سونے کے لیے خواب گاہ میں چلا جائے گا۔ یعنی آدھی رات کے قریب... ہاں، مجھے یقین ہے۔''

ٹرینو نے اذیت و کرب سے سوچا کہ کاش سانتے، لیونی کے ساتھ اتنی ہی خوش رہ سکے جیسے ریٹا اس کے ساتھ ہے مگر یہ ان کا مسئلہ تھا۔ وہ اس میں دخل دینے والا کون تھا؟

وہ آگے چلا گیا۔ پھر اس نے لیونی کی دی ہوئی چابی سے ایک کمرے کا دروازہ کھولا اور سوئچ بورڈ پر انگلی مار کر روشنی کردی۔ سامنے والی دیوار پر ''ماسک آف پیٹر'' لگی تھی۔

البا ٹرینو نے سر اٹھایا اور ایک گہرا سانس لیا۔ اس کی ساری زندگی غیر قانونی کام کرتے ہوئے گزر گئی تھی۔ وہ چور تھا اور یہ اس نے اپنی زندگی میں سب سے بڑی چوری کی تھی۔

اس پینٹنگ پر اس نے مخملی کپڑا ڈال دیا اور پھر ملحقہ کمرے میں جا کر دو مسلح گارڈز کو بلا لایا۔ وہ پینٹنگ کے دونوں طرف کھڑے ہوگئے اور انہوں نے اپنے ریوالور نکال لیے۔ ان ریوالوروں کی نالوں کا رخ سامنے کے بجائے فرش کی طرف تھا۔

البا ٹرینو پھر ٹیرس کی طرف گیا اور اس نے کہا۔ ''اگر آپ لوگ مناسب سمجھیں تو میرے ساتھ آکر اس پینٹنگ کو دیکھ لیں۔''

وہ چاروں معززین اپنی جگہ سے کھڑے ہوگئے۔ انہوں نے اپنے باڈی گارڈز کو سرگوشیوں میں ہدایات دیں اور پھر البا ٹرینو اور لیونی کے ساتھ اس کمرے میں پہنچ گئے جہاں ''ماسک آف پیٹر'' آویزاں تھی۔

وہاں چار کرسیاں پڑی تھیں، لیونی کے اشارے پر وہ چاروں وہاں بیٹھ گئے۔ لیونی اس میز کی طرف چلا گیا جو دائیں جانب تھی۔ وہ مسلح گارڈز سے بولا۔ ''تم لوگ باہر جاؤ، دروازہ بند کرلو۔ خبردار! کسی کو اندر نہ آنے دینا۔''

جب گارڈ وہاں سے چلے گئے تو اس نے مہمانوں سے مخاطب ہوکر کہا۔ ''معزز مہمانانِ گرامی! آپ لوگوں کو یہاں اس لیے بلایا گیا ہے کہ آپ دنیا کی ایک قیمتی ترین پینٹنگ کی بولی دے سکیں۔ بولی رازداری سے دی جائے گی اور کسی کو کانوں کان اس کی خبر نہیں ہوگی۔ آرٹ کا یہ نادر شہ پارہ اس سے پہلے کبھی فروخت کے لیے پیش نہیں کیا گیا۔ نئے چرچ کی تعمیر کے لیے جب سینٹ پیٹرز کی کھدائی ہوئی تھی تو شہنشاہ نیرو کے مقبرے کے تہ خانے سے یہ پینٹنگ دستیاب ہوئی تھی۔ آپ لوگ اس کی بولی کاغذ پر لکھ کر اور ایک لفافے میں بند کر کے میرے حوالے کردیں۔ خیال رہے کہ بولی چھ سو کروڑ ڈالرز سے کم نہیں ہونی چاہیے۔ ضابطے کے مطابق پینٹنگ اسی مہمان کو ملے گی جس کی بولی سب سے زیادہ ہو گی۔ جس مہمان کی بولی منظور ہوگی اسے رقم کی ادائیگی بیئرر بونڈز میں کرنا پڑے گی جو آسانی سے مارکیٹ میں دستیاب ہوتے ہیں۔ پینٹنگ کو ڈپلومیٹک بیگ میں رکھ کر بھیجا جائے گا۔ اور اب...'' اس نے ڈائس کے پاس سے ہٹ کر کہا۔

''میں آپ چاروں کو ایک ایک کاغذ دے رہا ہوں۔ آپ اس پر وہ رقم درج کردیں جو آپ مناسب سمجھتے ہیں۔ اس کے علاوہ میں آپ کو ایک نیوز بلیٹن کی کاپی دے رہا ہوں جس سے آپ کو پینٹنگ کی اہمیت اور اس کی قدر و قیمت کا اندازہ ہوجائے گا۔''

ان چاروں نے شام کا نیوز بلیٹن دیکھا۔ اس کی سرخی تھی۔ ''دنیا کی بیش قیمت پینٹنگ ویٹیکن سٹی سے چوری کرلی گئی۔''

درحقیقت اس کی قدر و قیمت اور انفرادیت کی وجہ سے ہی وہ افراد اسے خریدنے پر آمادہ ہوئے تھے اور انہوں نے گویا اس حقیقت کو نظرانداز کردیا تھا کہ پینٹنگ چوری کی تھی۔

''کل یہ خبر دنیا کے سارے اخبارات میں شائع ہو جائے گی۔'' لیونی نے کہا۔

بلیٹن میں تفصیل درج تھی کہ ویٹیکن سٹی کی لائبریری سے قیمتی پینٹنگ چوری کرلی گئی ہے اس لیے رومن پولیس نے سارے روم کی ناکا بندی کردی ہے تاکہ اس پینٹنگ کو یہاں سے نہ لے جایا جاسکے۔

''معزز مہمانان! ماسک آف پیٹر آپ کی خدمت میں...!'' لیونی نے کہا اور پینٹنگ پر پڑا ہوا مخملیں کپڑا ہٹا دیا۔

چاروں مہمانوں نے تجسس، اشتیاق اور تحیر سے اس پینٹنگ کو دیکھا۔ وہ چاروں اتنے دولت مند تھے کہ جس چیز کی خواہش کرتے تھے، وہ ان کے پاس ہوتی تھی۔ اس لیے وہ ایک دوسرے کو کینہ توز نگاہ سے دیکھ رہے تھے۔

''اب آپ لوگ کاغذ پر رقم لکھ کر نیچے اپنے دستخط کر دیں اور مہریں لگا کر لفافے میں بند کردیں۔ کل بارہ بجے دن کو آپ میں سے اس مہمان کو آگاہ کردوں گا جس کی بولی سب سے زیادہ ہوگی۔ وہ یہاں بیئرر بونڈز لے کر آئے گا اور یہ پینٹنگ لے جائے گا۔ اب آپ جائیں اور آپ کی قسمت...''

جاپانی بحری بیڑے کا مالک کروسکا تا نے سب سے پہلے کاغذ پر کوئی رقم لکھی اور اس پر دستخط کرنے کے بعد مہر لگا کر لفافے کو بند کیا پھر لیونی کے حوالے کردیا۔

وقفے وقفے سے باقی تین صاحبِ ثروت لوگوں نے بھی اپنی بولی تحریر کر کے لیونی کے حوالے کردی۔ وکٹر بلا نکا نے کہا۔ ''مسٹر لیونی! اگر تم اجازت دو تو میں مہر لگا کر سادہ کاغذ لفافے میں رکھ دوں؟ باقی تین حضرات میں سے جو سب سے زیادہ رقم تحریر کرے گا تم اس سے دس فیصد زیادہ رقم میرے کاغذ پر لکھ دینا۔ وہ مجھے منظور ہوگی۔''

''میں آپ کے جذبے کی قدر کرتا ہوں مگر یہ ضابطے کے خلاف ہوگا۔ آپ نہایت دیانت داری سے رقم لکھ کر لفافہ بند کردیں۔'' لیونی نے مسکرا کر کہا۔

وکٹر بلا نکا نے رقم لکھ کر اپنا لفافہ اس کے سپرد کیا اور وہاں سے نکل گیا۔

☆☆☆

اٹالین نیشنل پولیس نے دوسرے روز دوپہر کے وقت ان بارہ پادریوں کو گرفتار کرلیا جو سب سے آخر میں عجائب گھر اور لائبریری میں گئے تھے۔

پولیس نے ان سے سوالات کیے اور پوچھ گچھ کی مگر پادریوں نے ''ماسک آف پیٹر'' کی گمشدگی سے لاعلمی ظاہر کی۔ وہ یہ بھی نہیں بتا سکے کہ ان کے گروپ کے تیرھویں پادری فادر جوزف ٹرینو کہاں ہیں۔

☆☆☆

اسی روز سہ پہر کے وقت کویت کے شیخ عماد نے اپنے ہوٹل کے کمرے میں ایک کال ریسیو کی۔ دوسری طرف سے انتونیو لیونی اس سے مخاطب تھا۔

لیونی اس وقت اپنے مکان کی مطالعہ گاہ میں تھا جہاں

اس کے علاوہ سانتے، البا ٹرینو اور بوبیو موجود تھے۔ اس روز سارے ملازمین کو چھٹی دے دی گئی تھی۔

''جناب عالی! آپ کو مبارک باد دیتے ہوئے مجھے از حد مسرت ہو رہی ہے۔ آپ کی پیشکش سات کروڑ بیس لاکھ ڈالرز ہمیں منظور ہے۔ آپ میرے مکان پر تشریف لے آیئے اور رقم کی ادائیگی کر کے پینٹنگ لے جایئے۔''

شیخ عماد تیس منٹ بعد لیونی کے پہاڑی مکان پر پہنچ گیا۔ وہ بیئرر بونڈز کو چھ سوٹ کیسوں میں بھر کر لایا تھا۔ وہ پینٹنگ اس کے حوالے کر دی گئی۔

جب شیخ اپنے ملازمین کے ساتھ وہاں سے چلا گیا تو بوبیو بلیونی نے تہ خانے سے ''ماسک آف پیٹر'' کی ایک اور نقل نکالی اور ایزل پر لگا دی۔ اس اثنا میں لیونی، کروسکا تا کو فون کرنے لگا۔ اس نے رابطہ قائم ہونے کے بعد اسے مبارک باد دی اور کہا کہ اس کی بولی سب سے زیادہ تھی اس لیے وہ اتنی مالیت کے بیئرر بونڈز لے آئے۔

کروسکا تا آیا اور نقلی پینٹنگ لے گیا۔

''کتنی حیرت انگیز بات ہے کہ ان دو متمول افراد میں سے کسی نے بھی پینٹنگ کو غور سے دیکھنے کی زحمت گوارا نہیں کی... اس لیے کہ وہ ہماری کہانی اور روم میں پھیلی ہوئی خبروں سے متاثر ہو چکے تھے۔''

''انہیں متاثر ہونا ہی چاہیے تھا۔ اس لیے کہ ہم نے اصل پینٹنگ کی نقل نہایت عمدگی سے تیار کی تھیں۔''

یکے بعد دیگرے دو اور دولت مند افراد بیئرر بونڈز لے کر آئے اور پینٹنگ کی نقل لے کر چلے گئے۔ انہیں مبارک باد دے کر یہ بتایا گیا تھا کہ ان کی بولی سب سے زیادہ تھی۔

اس روز چھ بجے تک ان کے پاس پونے دو ارب ڈالرز بیئرر بونڈز کی شکل میں جمع ہو چکے تھے۔ لیونی نے نہایت دیانت داری سے بوبیو کو اٹھائیس کروڑ کے بونڈز دے دیے کیونکہ اس نے پینٹنگ کی نقل تیار کرنے میں پورا تعاون کیا تھا۔

بوبیو نے بونڈز ایک بریف کیس میں بھر لیے اور ان لوگوں سے ہاتھ ملا کر رخصت ہو گیا۔ لیونی اسے رخصت کرنے باہر تک گیا تھا۔ اس اثنا میں البا ٹرینو نے اپنے بھتیجے جوزف ٹرینو کو فون کیا اور کہا کہ وہ لیونی کے مکان پر آ کر اپنا حصہ لے جائے۔

جوزف ٹرینو ایک غیر اہم اور تنگ گلی والے مکان میں مقیم تھا۔ اس نے اپنے حلیے میں کافی تبدیلی کر لی تھی اس لیے اسے پہچانا نہیں جا سکتا تھا۔

پھر اس نے باقی ماندہ بونڈز کا حساب کتاب کر کے سب کے حصے بنا دیے۔ کسی نے اس کی تقسیم سے اختلاف نہیں کیا اس لیے کہ وہ اتنی بھاری رقم تھی کہ اس کے بارے میں انہوں نے پہلے کبھی نہیں سوچا تھا۔

''میرا خیال ہے کہ اس عظیم خوشی میں ہم کوئی اچھی سی شراب کیوں نہ پئیں؟'' البا ٹرینو نے تجویز پیش کی۔ اس کے چہرے سے مسرت پھوٹ رہی تھی۔ سانتے اس کمرے سے تھوڑی دیر کے لیے چلی گئی تھی۔

''ہمارے کاروباری معاملات ابھی ختم نہیں ہوئے۔'' لیونی نے خشک لہجے میں کہا اور میز کی دراز کھول کر ایک ریوالور نکال لیا۔ ''مجھے ابھی اپنی کچھ ذاتی الجھنیں نمٹانا ہیں۔''

''یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟'' البا ٹرینو حیرت سے بولا۔

''گزشتہ رات سانتے خواب گاہ سے باہر چلی گئی تھی، یہ سوچ کر کہ میں سو رہا ہوں حالانکہ میں جاگ رہا تھا۔ پھر جب وہ رات تین بجے واپس آئی تو میں اس وقت بھی جاگ رہا تھا۔ میں نے اس پر سختی کی تو اس نے اعتراف کیا کہ اس نے رات تمہاری بانہوں میں گزاری ہے۔''

''لیونی! یہ جھوٹ ہے۔''

''اوہ... کیا واقعی؟'' لیونی نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ''تم لوگوں کے درمیان عشق و محبت کا سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوا۔ گزشتہ رات اس نے یہ بات مجھے خود بتائی تھی۔ جب میں نے اس سے شادی کر لی اور وہ میری بیوی بن گئی تو میں نے اسے عزت دی، اس کی قدر کی مگر وہ ذہنی طور پر تم سے منسلک رہی، تمہیں ہی پوجتی رہی۔ یقیناً تم لوگ اس دوران آپس میں ملتے رہے ہو گے اور تم نے زندگی کے ہر لمحے سے لذت کشید کی ہو گی... آوارہ... باسٹرڈ!''

''لیونی! تم غلط سوچ رہے ہو۔ یہ صحیح نہیں ہے۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ...''

''تمہاری بات پر مجھے کیسے یقین آ سکتا ہے؟'' لیونی نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ ''گندی نالی کے کیڑے! تم اس موقع پر سچ کیسے بول سکتے ہو؟ اب جبکہ میں تمہارے سامنے ریوالور لیے کھڑا ہوں، تم حقیقت کا اظہار کیسے کر سکتے ہو؟ تم نے ایک مقدس عبادت گاہ سے پینٹنگ چوری کرنے کا منصوبہ تیار کیا ہے جس میں تمہارا غلیظ بھتیجا بھی شامل ہے۔''

''میں نے؟'' ٹرینو نے چونک کر کہا۔ ''کیا اس منصوبے میں تم شامل نہیں ہو؟''

''ہاں۔ میں شامل ہوں لیکن ایک مجبوری کے تحت۔ اگر میں یہ سب نہ کرتا تو بینک میری قرقی کر لیتا اور مجھے دوالیا

قرار دے دیا جاتا۔ زندہ رہنے کے لیے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑتا ہے، مگر تم نے یہ سب محض تفریحاً کیا ہے۔ بہر حال، یہ باتیں تو ہوتی رہیں گی۔ پہلے تم یہ اعتراف کرو کہ تم گزشتہ رات سانتے کے ساتھ تھے۔''

''میں ایسا کوئی اعتراف نہیں کر سکتا۔ اس لیے کہ یہ حقیقت نہیں ہے۔''

لیونی اس کی طرف مزید ایک قدم بڑھا اور اس نے فائر کر دیا۔ البا ٹرینو کے پاس بچاؤ کا کوئی راستہ نہیں تھا، اس لیے گولی ٹھیک اس کے سینے پر دل کے مقام پر لگی۔ اس نے ایک کرب آمیز چیخ ماری اور فرش پر چت گر گیا۔ چند لمحوں تک ہاتھ پاؤں پھینکتا رہا پھر ساکت ہو گیا۔ سینے سے نکلنے والے خون نے اس کے کپڑوں کو داغ دار کر دیا تھا۔

فائر کی آواز کافی دور تک گونجی تھی اس لیے اس کی بیوی سانتے دوسرے کمرے سے وہاں آ گئی۔ ''لیونی! یہ تم نے کیا کیا؟'' وہ حیرت سے بولی۔

''گزشتہ رات تم اس کے ساتھ تھیں نا؟'' لیونی نے کہا اور ریوالور لے کر اس کی طرف مڑا۔

''البا ٹرینو کے ساتھ؟ نہیں تو۔'' اس نے حیرت سے کہا۔

''تمہیں اس کا اعتراف کرنا پڑے گا۔'' لیونی نے خوفناک لہجے میں کہا۔ ''اس لیے کہ مرنے سے پہلے البا نے اس کا اعتراف کیا تھا۔''

''نہیں۔ یہ غلط ہے۔ اس نے تمہیں گمراہ کیا ہے۔''

''یہ سچ ہے۔ تم رات کو اس کے ساتھ تھیں۔ میں جانتا ہوں سانتے!''

''میں گھر سے باہر تو گئی تھی مگر...''

لیونی نے ٹریگر پر دباؤ ڈالا تو فائر ہو گیا اور گولی سانتے کے پیٹ پر پڑی۔ وہ بھی چیخ مار کر فرش پر گر گئی۔ تاہم وہ فوراً ہی ہلاک نہیں ہوئی۔ اس پر نزع طاری تھا اور وہ ہاتھ پاؤں مار رہی تھی۔

''مرنے سے پہلے اپنے گناہوں کا اعتراف کر لو سانتے! اس سے تمہاری روح کو سکون ملے گا۔'' لیونی نے جھک کر سرگوشی میں کہا۔ ''رات تم اس کے ساتھ تھیں نا؟''

سانتے کا ہاتھ اپنے پیٹ پر تھا جہاں سے خون ابل رہا تھا۔ اس کا وہ ہاتھ خون میں لتھڑا ہوا تھا۔ اس کا بدن کانپ رہا تھا اور ایسا لگتا تھا کہ وہ چند گھڑیوں کی مہمان ہے۔ ''میں... میں باہر... گئی تھی... نئی پینٹنگ... خریدنے... تمہارے لیے... تمہیں، تمہیں سرپرائز دینا چاہتی...''

لیونی اسے چھوڑ کر بھاگتا ہوا گیراج کی طرف گیا تو وہاں سچ مچ رو پہلے رنگ کی ایک پینٹنگ کھڑی تھی... اس کے خوابوں کی تعبیر!

''اوہ میرے خدا!'' اس نے تاسف سے کہا۔

پھر وہ تقریباً دوڑتا ہوا اس کمرے میں گیا لیکن سانتے اپنے کرب سے نجات پا چکی تھی۔ اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں۔ تھرتھرانے والا جسم اب ساکت ہو چکا تھا۔

اس المناک منظر کو دیکھ کر لیونی بہت دل گرفتہ ہوا۔ اس نے اپنے ریوالور کی نال کنپٹی پر رکھی اور ٹریگر دبا دیا!

☆☆☆

جوزف ٹرینو نے شیو کر کے ڈاڑھی صاف کر دی تھی اور وہ چست جینز پہنے ہوئے تھا۔ جب وہ ٹیکسی سے لیونی کے پہاڑی مکان کے قریب اترا تو اس کے ہاتھ میں دو بڑے بریف کیس تھے۔

وہاں اس وقت کوئی ملازم اور گارڈ نہیں تھا اس لیے وہ بلا رکاوٹ اندر چلا گیا۔ اندرونی کمرے میں اسے تین لاشیں ملیں۔ انہیں دیکھ کر اسے سکتہ سا ہو گیا۔

وہ گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا اور اس نے اپنے چچا ٹرینو کا سر زانو... پر رکھ لیا اور بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

''اوہ میرے خدا... اوہ میرے خدا!'' اس کے منہ سے بس اتنا ہی نکل رہا تھا۔ پھر جب اس کی طبیعت تھوڑی دیر بعد سنبھل گئی تو اس نے اپنے گناہوں کی معافی مانگنا شروع کر دی۔ ''یسوع مسیح! یہ میں نے کیا کیا؟'' وہ گھٹنوں کے بل کھڑا ہو گیا اور اس نے اپنے ہاتھ جوڑ دیے۔ ''مسیح! میری مدد کر۔ میں نے جو گناہ کیا ہے مجھے اس کی سزا دے... لیکن میں نے کوئی گناہ نہیں کیا ہے۔ مجھے تو تیری سربلندی اور سرفرازی کے لیے رقم درکار تھی۔ میں تیرے بندوں کی مدد کرنا چاہتا تھا... لیکن میں نے اس کے لیے ایک غلط راستہ اختیار کیا... مجھے اس کی سزا ملنی چاہیے۔''

وہ کافی دیر تک روتا، گڑگڑاتا رہا۔ پھر اسے احساس ہوا کہ سہ پہر گزر چکی ہے اور شام کا دھندلکا شہر کو اپنی لپیٹ میں لے رہا ہے۔

'مگر یہ سب کیسے ہوا؟' وہ سوچ رہا تھا۔ 'کیا کسی گاہک کو یہ معلوم ہو گیا تھا کہ پینٹنگ نقلی ہے اور اس نے واپس آ کر سب کو شوٹ کر دیا؟'

لیکن نہیں۔ لیونی کی میز پر بیئرر بونڈز کا ڈھیر رکھا تھا۔ اگر گاہکوں میں سے کوئی واپس آتا تو اپنی رقم واپس لے جاتا۔ یہ بونڈز وہاں نظر نہ آتے۔

تو کیا یہ حرکت بوبیو کی ہے؟ وہ کہاں ہے؟ وہ کہیں بھی

ہے، یہ اس کی حرکت نہیں ہو سکتی، اس لیے کہ اگر اس نے یہ سب بیئرر بونڈز کے لیے کیا تھا تو انہیں وہاں چھوڑ کیوں دیا؟ سارے بونڈز کیوں نہیں لے گیا؟ اور ہاں... البا ٹرینو نے اسے فون پر تو بتا دیا تھا کہ بوبیو اپنا حصہ لے کر چلا گیا ہے۔ تو پھر؟

وہ وہاں سکون سے بیٹھ گیا اور صورتِ حال کا جائزہ لینے لگا۔ البا، لیونی اور سانتے۔ ریوالور صرف ایک تھا۔ کسی ایک نے دو کو گولی ماری تھی اور پھر خودکشی کر لی تھی۔

کیا سانتے نے اپنے شوہر اور سابق عاشق کو گولی ماری ہے؟ مگر کس لیے؟ وجہ قتل کیا ہو سکتی ہے؟ وہ بیئرر بونڈز لے کر غائب نہیں ہونا چاہتی تھی۔ ورنہ خودکشی نہ کرتی۔

وہ جھک کر جاسوسوں کی طرح لاشوں کا جائزہ لینے لگا۔ ایک گولی البا ٹرینو کے سینے میں لگی تھی۔ دوسری نے سانتے کے پیٹ کو نشانہ بنایا تھا جبکہ تیسری گولی لیونی کے دماغ کے پار ہو چکی تھی۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ لیونی نے خودکشی کی ہے۔ گویا اس معاملے کا پینٹنگ کی چوری، اس کی نقلوں کی فروخت سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ یہ ایک ذاتی المیہ تھا۔ چنانچہ اسے اپنا منصوبہ ترک نہیں کرنا چاہیے تھا۔

جوزف نے اپنے ساتھ لائے ہوئے بیگوں کی زپیں کھولیں اور ان میں سلیقے سے بونڈز بھر لیے۔ تھوڑی سی تلاش و جستجو کے بعد اسے اصلی ''ماسک آف پیٹر'' مکان کے تہ خانے سے مل گئی۔ اس نے غسل خانے سے کئی تولیے اکٹھا کر لیے اور پھر اصل پینٹنگ کو ان میں لپیٹ دیا اور تیسرے بیگ میں رکھ دیا۔ وہ چپٹا اور چار انچ چوڑا بیگ خاص اس مقصد کے لیے لایا تھا۔

اس نے اپنے چچا کی جیبوں کی تلاشی لی تو اسے کار کی چابی مل گئی۔ بیئرر بونڈز کے بیگ کافی بھاری تھے۔ وہ ایک ایک کر کے ان بیگوں کو باہر لے گیا اور کار میں رکھ دیا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے کار اسٹارٹ کر دی اور پہاڑی والے مکان سے نیچے آ گیا۔

☆☆☆

دو روز بعد ویٹیکن چرچ کی انتظامیہ کو ایک لفافہ ڈاک سے وصول ہوا جس میں ایک پبلک لاکر کی چابی رکھی تھی۔ وہ لاکر ریلوے اسٹیشن پر تھے۔

ویٹیکن سٹی کی خصوصی پولیس اور بم اسکواڈ کا عملہ وہاں پہنچا اور اس نے لاکر کو کھولا تو ''ماسک آف پیٹر'' اس میں رکھی مل گئی۔ وہ چار بڑے تولیوں میں لپٹی ہوئی تھی۔

اسی روز صبح پریس کے نمائندوں کو لیونی کے ملازمین نے مکان میں بلا کر وہ تین لاشیں دکھائیں۔ اخباری نمائندوں نے اسے محض ایک جذباتی معاملہ سمجھا۔ میاں، بیوی اور سابقہ عاشق۔ یہ محبت کی وہ تکون تھی جو برسوں سے چلی آ رہی تھی اور بنائے فساد تھی۔

جب پینٹنگ مل گئی تو وہ ویٹیکن چرچ کے عجائب گھر میں لگا دی گئی اور پولیس نے شہر کی ناکا بندی ختم کر دی۔ پھر ان بارہ پادریوں کو بھی رہا کر دیا جنہیں محض شبہے میں گرفتار کر لیا گیا تھا۔

بوبیو بلیونی نے ایک وین کرائے پر لی، اس میں اپنا آرٹ کا سامان بھرا اور وہاں سے وینس چلا گیا۔ اسے لیونی کے پہاڑی مکان میں پیش آنے والے واقعات سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ وہاں اس نے ایک ساحلی مکان خرید لیا اور آرٹ اسکول قائم کر لیا۔

ان بارہ پادریوں کو ڈاک سے ایک ایک ہزار بیئرر بونڈز ملے جو گتے کے ڈبوں میں پیک تھے۔ انہوں نے نئے ناموں سے پاسپورٹ بنوائے اور روم سے نکل گئے۔ اپنے ملکوں میں پہنچ کر انہوں نے نئی شخصیت اختیار کر لی۔

البا ٹرینو کی تدفین کے بعد جزیرہ سسلی پر اس کی بیوہ مارگریٹا کو اپنے بھتیجے کا فون موصول ہوا اور اس نے روتے ہوئے بتایا کہ چچا کی موت کسی غلط فہمی کے نتیجے میں ہوئی ہے اور میڈیا نے محبت کی تکون کی کہانی گھڑ کر بے پر کی اڑائی ہے جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ''چچی! میں آپ کو اس کے سوا کچھ نہیں بتا سکتا۔'' جوزف نے گلوگیر آواز میں کہا۔ ''چچا نے کچھ رقم بنائی تھی لیکن وہ اس سے غریبوں کی مدد کرنا چاہتے تھے۔ میں کل ڈاک سے آپ کو یہ رقم بھیج رہا ہوں۔ آپ چاہیں تو اس سے کوئی بھی فلاحی کام شروع کر سکتی ہیں۔''

ریٹا اس سے بہت کچھ پوچھنا چاہتی تھی لیکن دوسری طرف سے سلسلہ منقطع ہو گیا۔ دوسرے روز ڈاک سے اسے ایک پیکٹ ملا جس میں دو سو سے زیادہ بیئرر بونڈز تھے۔ انہیں کیش کرانے پر اسے پانچ کروڑ امریکی ڈالرز ملے۔

اس رقم سے اس نے ایک یتیم خانہ کھول لیا۔

یوں منفی انداز سے شروع ہونے والی کہانی جو کچھ اس طرح سے بیان کی جا سکتی تھی کہ تیرہ پادریوں نے مل کر ویٹیکن چرچ سے ایک پینٹنگ چوری کر لی، مثبت انجام کے ساتھ ختم ہوئی... کہ ان میں سے متوفی کرداروں کے سوا سب نے نقلی پینٹنگ کی فروخت سے فلاحی ادارے قائم کر لیے اور لوگوں کی خدمت کرنے لگے۔

خوابیدہ عذاب

محمد فاروق انجم

ایک حادثہ زندگی کی پُرسکون ندی میں گویا تلاطم برپا کر دیتا ہے... اس کی طمانیت بھری زندگی میں اچانک ہی ایک خواب در آیا... بے کلی و ہلچل نے اس کے گرد ڈیرے ڈال لیے... وہ نیند سے کوسوں دور بھاگنے لگا... مگر کب تک... سچ کا زہر پینا ہی پڑتا ہے...

ایک خواب کی حکمرانی جو تعبیر کی صورت میں ریزہ ریزہ ہو کے بکھر گیا...

راشد نیند سے ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ اس کی سانسیں تیز تھیں اور ماتھے پر پسینے کی خفیف نمی دکھائی دے رہی تھی۔ چہرے پر عجیب سا خوف عیاں تھا اور اس کے ہاتھ لرز رہے تھے۔ اُس نے سائڈ ٹیبل پر سے گھڑی اُٹھا کر کمرے کی ہلکی روشنی میں وقت دیکھا اور پھر گھڑی اسی جگہ رکھنے کے بعد جگ سے گلاس میں پانی ڈال کر چند گھونٹ پیئے اور اپنے آپ کو پُرسکون رکھنے کی کوشش کرنے لگا۔

کچھ دیر کے بعد اس کی حالت بہتر ہوئی تو اس نے

پہلو میں لیٹی اپنی بیوی نازیہ کی طرف دیکھا جو گہری نیند سوئی ہوئی تھی۔ اس نے بیڈ کی پشت سے ٹیک لگائی اور آنکھیں موند لیں۔

اس کی عمر تیس سال سے زیادہ تھی۔ نیند سے ہڑبڑا کر اُٹھنے کی وجہ وہ خواب تھا جسے اس نے پچھلے بارہ دن میں تیسری بار دیکھا تھا۔

ایک ہی خواب کو تیسری بار دیکھ کر وہ پریشان ہی نہیں بلکہ خوفزدہ بھی ہو گیا تھا۔ وہ خواب میں دیکھتا تھا کہ وہ کسی اجنبی جگہ پر موجود ہے جس کی ایک ایک دیوار اور راستہ اسے اچھی طرح سے ذہن نشین ہو چکا تھا، اُس جگہ وہ ایک لڑکی کو چھری سے وار کر کے قتل کر رہا ہے۔ لڑکی کی چیخیں اس کی سماعت میں ابھی تک موجود تھیں۔ اُسے لڑکی کی چیخوں کی آواز سے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ اس آواز سے مانوس ہے۔ لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ آواز کس لڑکی کی تھی۔ خواب میں اس نے لڑکی کا چہرہ بھی پوری طرح سے نہیں دیکھا تھا اس لیے وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ وہ خواب میں کس لڑکی کو قتل کر رہا ہے۔

ایک ہی خواب کو ایک ہی طرح تیسری بار دیکھنا پریشان کن ہی نہیں بلکہ اب اذیت کا باعث بھی بن چکا تھا۔ اُس نے اپنے اس خواب کا تذکرہ نازیہ سے بھی نہیں کیا تھا لیکن اب تیسری بار اس خواب کو دیکھنے کے بعد وہ سوچ رہا تھا کہ اس کا ذکر وہ نازیہ سے بھی کر دے، اس کے دماغ میں عجیب سے وسوسے آنے لگے تھے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ شاید نازیہ سے اس خواب کا تذکرہ کرنے سے اس کی پریشانی اور خوف کم ہو جائے۔

راشد نے ایک بار پھر وقت دیکھا، رات کے ساڑھے تین بج چکے تھے۔ نینداس کی آنکھوں سے معدوم ہو چکی تھی۔ اس کی سوچ کا محور وہ خواب تھا۔

راشد بیڈ سے اُٹھا اور کمرے میں ٹہلنے لگا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اسے ایسا خواب بار بار کیوں دکھائی دے رہا ہے؟ وہ جتنا سوچ رہا تھا اتنا ہی پریشان ہو رہا تھا۔ پھر اس نے کمرے کی ہلکی روشنی بھی بند کر دی اور کمرے میں مکمل اندھیرا ہو گیا۔ وہ سونا چاہتا تھا۔ وہ بیڈ پر لیٹ گیا۔ اندھیرا کرنے کے باوجود اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ وہ مسلسل کروٹیں لیتا رہا اور پھر جانے کب اس کی آنکھ لگ گئی۔

☆☆☆

راشد کو اس کی بیوی نازیہ نے جگایا۔ راشد نے آنکھیں ملتے ہوئے اس کی طرف دیکھا تو نازیہ بولی۔ ''صبح کے دس بج گئے ہیں اُٹھنے کا ارادہ نہیں ہے کیا؟''

''دس بج گئے ہیں؟'' راشد یکدم سیدھا ہو گیا۔

''اتنا بے چین ہونے کی ضرورت نہیں ہے، آپ نے کونسا آفس جانا ہے۔'' نازیہ نے گویا اسے یاد دلایا تو راشد ڈھیلا پڑ گیا۔

''ہاں... مجھے کونسا آفس جانا ہے۔'' راشد نے مرجھایا سامنہ بنا کر کہا۔

''آپ نہا لیں میں ناشتا بنا رہی ہوں۔'' نازیہ نے کھڑکی کے آگے پڑے پردوں کو کھینچ کر ایک طرف ہٹایا تو دن کی روشنی سے کمرا اور بھی روشن ہو گیا۔

''پراپرٹی ڈیلر کا فون تو نہیں آیا؟'' راشد نے بیڈ سے اُٹھتے ہوئے پوچھا۔

''پراپرٹی ڈیلر کا فون آیا تو نہیں ہے، کیا اس کا فون آنا تھا؟'' نازیہ نے دروازے کی طرف جاتے ہوئے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔

''وہ کہہ رہا تھا کہ میں ساڑھے نو بجے تک فون کروں گا، اس کے پاس پلاٹ خریدنے کے لیے کوئی گاہک ہے۔'' راشد بولا۔

''دس گیارہ بجے تو یہ لوگ آتے ہیں۔ میں ناشتا بنانے جا رہی ہوں۔'' نازیہ یہ کہہ کر کمرے سے باہر نکل گئی اور راشد کمرے سے ملحق باتھ روم میں چلا گیا۔ اس وقت اس کے دماغ میں وہ خواب بالکل بھی نہیں تھا جس خواب کو اس نے رات تیسری بار دیکھا تھا۔ مگر اس نے نازیہ سے اس کا ذکر نہیں کیا۔

راشد کی نازیہ سے ڈیڑھ سال قبل شادی ہوئی تھی۔ نازیہ پڑھی لکھی تھی اور شادی سے قبل وہ اپنے انکل کے پراپرٹی آفس میں کام کرتی رہی تھی۔ نازیہ کے انکل کا پوش علاقے میں اسٹیٹ ایجنسی کا آفس تھا۔ نازیہ وہاں آنے والی فیملیز کو گھر دکھاتی اور ان کے ساتھ خریداری کے معاملات بھی طے کرتی تھی۔ نازیہ کے انکل نے جو اس کے ساتھ کمیشن طے کیا تھا، وہ بھی ہر ماہ اسے اچھا خاصا مل جاتا تھا۔ پراپرٹی کیسے بیچی اور خریدی جاتی ہے، اس کے داؤ پیچ سے نازیہ خوب واقف ہو گئی تھی لیکن پھر اس کی شادی ہو گئی۔

راشد ان دنوں پریشان تھا کیونکہ وہ جس پرائیویٹ کمپنی میں کام کرتا تھا وہاں کے جنرل منیجر کے ساتھ اس کی منہ ماری ہو گئی تھی اور اس نے اپنا اثر و رسوخ استعمال کرتے ہوئے راشد کو نوکری سے نکلوا دیا تھا۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اب نوکری کے بجائے اپنا ذاتی کاروبار کرے گا۔ اس کے پاس کاروبار کرنے کے لیے اتنا سرمایہ نہیں تھا۔ اس کے پاس

ایک پلاٹ تھا۔ وہ اسے فروخت کر کے کاروبار کرنا چاہتا تھا لیکن کئی پراپرٹی ڈیلرز کو کہنے کے باوجود اس کا وہ پلاٹ فروخت نہیں ہو رہا تھا۔

جیسے جیسے دن گزرتے جا رہے تھے، راشد کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔ جن پراپرٹی ڈیلرز کو نازیہ جانتی تھی، اس نے ان کو بھی کہہ رکھا تھا لیکن فی الحال پلاٹ کا کوئی گاہک نہیں آیا تھا۔

راشد نہانے کے بعد باتھ روم سے باہر نکلا تو نازیہ ہاتھ میں موبائل فون لیے کھڑی تھی۔ راشد کے باہر آتے ہی وہ بولی۔

''پراپرٹی ڈیلر کا فون تھا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ میں نے پلاٹ دکھا دیا ہے اور ایک شخص پلاٹ خریدنے کے لیے راضی ہے۔''

''بہت خوب۔'' راشد خوش ہو گیا۔

''وہ آدھے گھنٹے تک اس شخص کو لے کر ہمارے پاس آ رہا ہے۔ پراپرٹی ڈیلر کا کہنا تھا کہ وہ گھر بیٹھ کر اطمینان سے ڈیل کریں گے۔'' نازیہ نے بتایا۔

''کیا یہ بہتر نہیں تھا کہ وہ مجھے اپنے دفتر میں بلا کر ڈیل کر لیتا۔'' راشد نے کہا۔

''ایسا پراپرٹی ڈیلر تب کرتے ہیں جب وہ اپنی کسی پارٹی کو خفیہ رکھنا چاہتے ہوں تا کہ کوئی دوسرا پراپرٹی ڈیلر نہ دیکھ لے۔ اور ہماری پارٹی مارکیٹ میں عیاں نہ ہو جائے۔ مجھے لگتا ہے کہ وہ شخص پراپرٹی ڈیلر کا قابلِ بھروسا انویسٹر ہوگا۔'' نازیہ نے بتایا۔

''ہاں بھئی تم بھی یہ کام کرتی رہی ہو۔ پراپرٹی ڈیلروں کے خفیہ ہاتھوں کو خوب جانتی ہو۔'' راشد مسکرایا۔

''باتیں چھوڑو اور ناشتا تیار ہے جلدی سے آ جاؤ۔'' نازیہ نے راشد کا موبائل فون بیڈ پر رکھا اور کمرے سے باہر چلی گئی۔ راشد آئینے کے سامنے کھڑا اپنے بال خشک کر رہا تھا کہ اچانک اسے وہی خواب یاد آ گیا۔ اس کی سماعت میں نسوانی چیخیں سنائی دینے لگیں جو وہ خواب میں سن چکا تھا۔ اس کے ساتھ وہ منظر بھی اسے دکھائی دینے لگے جو وہ خواب میں دیکھتا رہا تھا۔

راشد کا چہرہ پریشانی میں ڈوب گیا۔ وہ کھڑا سوچنے لگا کہ جانی پہچانی وہ آوازیں کس عورت کی تھیں؟ کیا وہ سب کچھ نازیہ کو بتا دے؟

''ناشتا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔'' باہر سے نازیہ کی تیز آواز آئی اور سوچتے سوچتے راشد نے تولیا ایک طرف رکھا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

ٹھیک پون گھنٹے کے بعد بیل ہوئی تو راشد نے دروازہ کھولا۔ سامنے خوش پوش پراپرٹی ڈیلر کھڑا مسکرا رہا تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے سے گرم جوشی سے مصافحہ کیا اور اس وقت راشد کی کھلی ہوئیں باچھیں مرجھا سی گئیں جب پراپرٹی ڈیلر ناصر کے ساتھ آیا ہوا شخص سامنے آیا اور ناصر نے تعارف کرایا۔

''یہ نواز صاحب ہیں اور آپ کا پلاٹ خریدنا چاہتے ہیں۔''

راشد نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا اور با دل ناخواستہ مصافحہ کیا، جبکہ نواز کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ راشد تذبذب میں مبتلا انہیں اندر لے آیا۔

ناصر بیٹھتے ہی بولا۔ ''بات یہ ہے کہ ان کو جلدی ہے۔ اس لیے ہم چائے وغیرہ میں وقت ضائع کرنے کے بجائے کام کی بات پر آتے ہیں۔ نواز صاحب نے وہ پلاٹ دیکھ لیا ہے۔ ان کو پسند ہے اور یہ اسے خریدنا چاہتے ہیں وہ بھی کیش میں، یعنی پلاٹ خریدنے کے لیے یہ کوئی وقت نہیں لیں گے۔ آپ کی بتائی ہوئی قیمت بھی میں نے بتا دی ہے اب آپ روبرو سودا کر لیں۔''

''سودا کیا کرنا ہے ناصر صاحب، انہوں نے اس پلاٹ کی جو قیمت مانگی ہے میں وہ دینے کو تیار ہوں۔'' نواز اس کی طرف عجیب سی نظروں سے دیکھتے ہوئے مسکرا رہا تھا۔

''لیجیے پھر تو سودا ہو گیا۔'' ناصر یکدم خوشی سے اچھلا۔

''میں اب اس پلاٹ کی وہ قیمت نہیں لینا چاہتا۔'' راشد نے متانت سے کہا۔

''کیا مطلب؟'' ناصر چونکا۔

''ابھی آپ کے آنے سے پہلے مجھے ایک دوسرے پراپرٹی ڈیلر کا فون آیا تھا۔ وہ اس پلاٹ کو آپ سے زیادہ پیسوں میں خریدنا چاہتا ہے۔'' راشد نے بتایا۔

''ایک دو لاکھ کی بات ہے تو میں وہ بھی دے دیتا ہوں۔'' نواز نے جلدی سے کہا۔ اس کے لہجے میں بے نیازی تھی جیسے اتنی رقم اس کے لیے کوئی معنی نہ رکھتی ہو۔

''لو یہ مسئلہ بھی حل ہو گیا...'' اس بار بھی ناصر کھل اٹھا۔ اسے اپنا کمیشن پکا ہوتا نظر آ رہا تھا۔

''مسئلہ حل نہیں ہوا۔ مجھے بہت زیادہ پیسے مل رہے ہیں۔'' راشد نے خشک لہجے میں کہا۔

''کتنے زیادہ پیسے مل رہے ہیں؟'' ناصر نے پوچھا۔

''یہ چھوڑیں کہ مجھے کتنے زیادہ پیسے مل رہے ہیں۔ فی الحال میں اس پارٹی سے ڈیل کروں گا۔ اگر میرا اس سے سودا ہوجائے تو ٹھیک ہے ورنہ پھر میں آپ لوگوں کی پیشکش پر سوچوں گا۔'' راشد نے ایسے کہا جیسے اب وہ چاہتا ہو کہ دونوں اُٹھ کر چلے جائیں۔

''راشد صاحب آپ کی بات سمجھ میں نہیں آئی۔ پہلے آپ نے ہمیں گھر بلا لیا اب جبکہ سودا بھی ہو رہا ہے اور آپ کی منشا کے مطابق ہو رہا ہے، آپ کسی اور پارٹی کو بیچ میں لے آئے ہیں۔'' ناصر نے بھی سنجیدگی اختیار کر لی۔

''ادھر آپ کا فون آیا اور آپ کے فون کے بعد دوسرے پراپرٹی ڈیلر کا فون آگیا۔ جو بات تھی، میں نے آپ کو بتا دی۔ مجھے ان کے پاس جانا ہے۔ ہم پھر ملاقات کریں گے۔'' راشد اُٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ ناصر کے چہرے کی ہوائیاں اُڑی ہوئی تھیں۔

''آپ کیا چاہتے ہیں، ہم آپ کی ڈیمانڈ پوری کر دیتے ہیں۔'' نواز اپنی جگہ جما بیٹھا رہا۔

''ان سے بات ہونے کے بعد آپ سے بات ہوگی۔'' راشد نے کہتے ہوئے اس کی طرف دیکھا بھی نہیں۔

''میں پانچ لاکھ روپے اور بڑھا دیتا ہوں۔'' نواز نے کہتے ہوئے اپنی ایک ٹانگ دوسری کے اوپر رکھ لی۔

''لیجیے اب تو انہوں نے کوئی کسر نہیں چھوڑی۔'' ایک بار پھر ناصر کے چہرے پر خوشی آگئی۔

''مجھے جانا ہے، ان باتوں میں ہمارا وقت ضائع ہو رہا ہے۔'' راشد نے خشک لہجے میں کہا اور دم بخود ناصر اپنی جگہ سے کھڑا ہوگیا، اس کے ساتھ نواز بھی کھڑا ہوگیا۔

''آپ اچھا نہیں کر رہے راشد صاحب۔ اس وقت پراپرٹی کے کام میں بہت بحران ہے۔ بیچنے کے لیے سب کھڑے ہیں اور خریدار کوئی بھی نہیں ہے۔ وقت کو ہاتھ سے جانے نہ دیں، اس آفر کو غنیمت جانیں۔'' ناصر نے سمجھانے کی کوئی کوشش کی۔

''ہم پھر بات کریں گے۔'' راشد کے لہجے میں کوئی تغیر نہیں آیا اور اس کا چہرہ پہلے سے بھی زیادہ سپاٹ ہوگیا۔

ناصر اور نواز کو جانا ہی پڑا۔ راشد دروازے کی طرف چل پڑا۔ دونوں کے جاتے ہی اس نے دروازہ بند کر دیا۔

سامنے نازیہ کھڑی اسے عجیب نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ نازیہ نے کہا۔ ''یہ کیا، کیا تم نے؟''

''کیا کیا ہے میں نے؟'' راشد چلتا ہوا کرسی کے پاس گیا اور بیٹھ گیا۔

''نقد پیسوں میں ہمارا پلاٹ بک رہا تھا اور وہ بھی اس کی اصل قیمت سے پانچ لاکھ روپے زیادہ میں اور تم نے جھوٹا بہانہ کر دیا۔'' نازیہ کو اس پر حیرت ہو رہی تھی۔

راشد چند ثانیے چپ بیٹھا سوچتا رہا اور پھر متانت سے بولا۔ ''جانتی ہو کہ پراپرٹی ڈیلر کے ساتھ کون تھا جو میرا پلاٹ خریدنا چاہتا تھا؟''

''کون تھا؟'' نازیہ نے سوالیہ نگاہوں سے پوچھا۔

''وہ نواز تھا۔ میرا کلاس فیلو نواز جس نے پڑھائی کے دوران میں ہمیشہ مجھ پر رعب ڈال کر رکھا تھا۔ اس نے ہمیشہ میرا مذاق اُڑایا تھا، اس نے مجھے ذلیل کرنے کا کبھی کوئی موقع ضائع نہیں کیا، اس نے ایک بار اپنے آوارہ دوستوں کے ساتھ مل کر مجھے اتنا پیٹا تھا کہ مجھے تین دن تک اسپتال میں رہنا پڑا۔'' راشد چپ ہوگیا۔ اس کے چہرے پر کرب عیاں ہوگیا۔ وہ پھر بولا۔ ''مجھے نواز سے نفرت ہے۔ اتنی نفرت جتنی کوئی شاید ہی کسی سے کرتا ہو۔ اپنے گھر میں اس کا وجود میں نے کیسے برداشت کیا، یہ میں ہی جانتا ہوں۔ وہ مجھے اس پلاٹ کی ڈبل قیمت بھی دیتا تو میں اسے وہ پلاٹ نہ بیچتا۔ میں نے اسے پہچان لیا اور شاید وہ بھی مجھے پہچان گیا لیکن ہم ایک دوسرے کے لیے انجان بنے رہے۔ شاید تم نے غور نہیں کیا کہ اس کی آنکھوں میں میرے لیے کیسی تضحیک آمیز چمک تھی۔''

''تمہارا ماضی، تمہاری نفرت سب کچھ ایک طرف... لیکن یہ سوچو کہ اس وقت ہمیں پیسوں کی شدید ضرورت ہے۔ ہماری جمع پونجی ختم ہو رہی ہے۔ وہ پلاٹ جتنی جلدی بک جائے ہمارے لیے اتنا ہی اچھا ہے اور تم اپنی ضرورت کو بھول کر نفرت کو سینے سے لگائے بیٹھے ہو؟ ہمیں کیا وہ نواز ہے، یا زید ہے... ہم کو وہ پلاٹ بیچنا ہے اور بس۔'' اس کی بات سن کر نازیہ بولی۔

راشد نے اس کی طرف گھور کر دیکھا اور غصے سے بولا۔ ''میں اپنا پلاٹ اس ذلیل آدمی کو نہیں بیچوں گا۔ کسی بھی قیمت پر نہیں... بالکل بھی نہیں، کبھی بھی نہیں۔''

''پراپرٹی اس وقت مندی کا شکار ہے۔ کتنے ہفتوں کے بعد ایک خریدار آیا تھا اور اسے تم نے اپنی نفرت کی بھینٹ چڑھا دیا۔'' نازیہ کے لہجے میں تاسف تھا۔

''میں تمہیں بھوکا نہیں مرنے دوں گا لیکن اپنا پلاٹ اسے نہیں بیچوں گا۔ ہرگز نہیں بیچوں گا۔'' راشد غصے سے چیخا اور اُٹھ کر چلا گیا۔ نازیہ کھڑی غصے سے تلملاتی رہی۔

☆☆☆

رات تک ناصر کی راشد کو چار بار فون کال آچکی تھیں اور وہ پوری کوشش کررہا تھا کہ کسی طرح سے راشد اپنا پلاٹ نواز کو فروخت کرنے کے لیے رضامند ہوجائے۔ لیکن ہر بار راشد یہی کہتا رہا کہ ابھی اس کی ایک دوسری پارٹی سے بات چیت چل رہی ہے۔

دوسرے دن ناصر نے پھر راشد کو فون کردیا۔ اس بار بھی راشد نے کچھ ایسا ہی جواب دیا۔ اس کے بعد راشد کو ناصر کی طرف سے فون آنا بند ہوگئے۔

چار دن گزر گئے اور کسی دوسرے پراپرٹی ڈیلر کی طرف سے بھی کوئی فون نہیں آیا۔ راشد خود بھی ایک ایک پراپرٹی ڈیلر کے پاس گیا لیکن کوئی خریدار نہیں تھا۔ ہر پراپرٹی ڈیلر بحران کا رونا رو رہا تھا۔ ہر ایک کے پاس گاہک نہ ہونے کی کئی وجوہات تھیں۔ ایک پراپرٹی ڈیلر تو اتنا مایوس تھا کہ اس نے یہاں تک کہہ دیا کہ پراپرٹی کا کام اب ختم ہوگیا ہے۔ انویسٹر دوسرے کاموں کی طرف چلا گیا ہے۔ ایسی باتیں سن کر راشد مایوس ہوگیا مگر پھر بھی وہ نواز کو اپنا پلاٹ کسی قیمت پر فروخت نہیں کرنا چاہتا تھا۔

راشد کی پریشانی بڑھ گئی۔ جمع پونجی اب اتنی رہ گئی تھی کہ راشد سوچنے پر مجبور ہوگیا تھا کہ وہ اب کیا کرے؟

اس رات کھانے کی میز پر نازیہ نے کہا۔ ''تم نے دیکھا ہے کہ تمہارے بینک میں کتنے پیسے بقایا رہ گئے ہیں؟''۔

''ہاں۔'' راشد نے مختصراً اثبات میں گردن ہلادی۔

''ہم اور کتنے دن گزارا کرسکتے ہیں؟'' نازیہ سنجیدہ تھی۔

''کوئی نہ کوئی بہتری نکل ہی آئے گی۔'' راشد بولا۔

''کیسے بہتری نکلے گی؟ ہمارے پاس اس پلاٹ کے سوا اور کچھ نہیں ہے جہاں سے ہم پیسہ حاصل کرسکیں۔'' نازیہ نے اس کی طرف دیکھا۔

''میں کوشش کررہا ہوں۔'' راشد بولا۔

''تم اپنی ضد چھوڑ دو اور اپنا پلاٹ نواز کو بیچ دو۔'' نازیہ نے سمجھایا۔

''شٹ اپ... خبردار، اگر تم نے اس کا نام لیا یا مجھے یہ مشورہ دیا کہ میں اپنا پلاٹ اسے بیچ دوں۔ میں اپنے آپ کو بیچ دوں گا لیکن اسے پلاٹ نہیں بیچوں گا۔'' اس کی بات سن کر راشد پیچ پا ہوگیا۔

''اور اگر نواز کسی اور پراپرٹی ڈیلر کے پاس چلا گیا اور کسی اور کو سامنے کھڑا کرکے وہ پلاٹ خرید لیا تو تم کیا کرو گے؟'' نازیہ کی اس بات نے راشد کو سوچنے پر مجبور کردیا۔ یہ بات تو اس کے دماغ میں آئی ہی نہیں تھی۔

''ہاں ایسا بھی ہوسکتا ہے۔'' راشد سوچتے ہوئے بولا۔

''پھر کیا اس خوف سے تم اپنا پلاٹ کسی کو نہیں بیچو گے؟''

نازیہ نے اپنی نگاہیں اس کے چہرے پر جمادیں۔

''میں اس سے بہت نفرت کرتا ہوں۔ میں برباد ہوجاؤں گا لیکن اُسے پلاٹ نہیں بیچوں گا۔ وہ مجھ سے پلاٹ خرید کر میرے سینے پر کھڑا ہوکر ہنسے گا۔'' راشد نے کہا۔

''پھر تم ایسا کرو میرا زیور بیچ دو۔''

''اس سے کیا ہوگا؟''

''میرے پاس جتنا زیور ہے اس سے کاروبار تو نہیں ہوسکتا، لیکن گھر کے خرچے کے لیے کافی ہیں، کم از کم ہم چند ماہ آرام سے گزار لیں گے۔'' نازیہ نے کہا۔

''ہرگز نہیں... میں ایسا نہیں کروں گا۔ میں پھر سے نوکری تلاش کروں گا۔ اور ابھی اپنا پلاٹ نہیں بیچوں گا۔'' راشد بولا۔

''اب میں تمہیں نوکری نہیں کرنے دوں گی۔'' نازیہ نے مصمم ارادے سے کہا۔

''وہ کیوں؟'' اس نے نازیہ کی طرف دیکھا۔

''مجھے بزنس کا خواب دکھا کر تم پھر نوکری کرنا چاہتے ہو؟ اب ایسا نہیں ہوگا۔''

''ٹھیک ہے، میں سوچتا ہوں کہ مجھے کیا کرنا ہے۔''

''ویسے میرے دماغ میں ایک تجویز ہے۔''

''کیا تجویز ہے؟''

''میں اس پلاٹ کی بات اپنے انکل سے کرتی ہوں۔ ان کے پاس بڑے بڑے انویسٹر ہیں۔ وہ سب میرے انکل پر اعتماد کرتے ہیں اور ان کے کہنے پر پیسہ لگادیتے ہیں۔ وہ لاہور میں ہوتے ہیں۔ میں ان کو اس پلاٹ کے بارے میں کہتی ہوں، وہ باہر کی پارٹی کو ہمارا پلاٹ بیچ دیں گے۔ کم از کم نواز یہاں کسی اور پراپرٹی ڈیلر سے رابطہ کرکے کسی اور کو فرنٹ مین بنا کر ہمارا پلاٹ نہیں خرید سکے گا۔'' نازیہ نے اپنی تجویز بیان کی۔

''تمہاری تجویز بہت اچھی ہے۔ اس طرح ہم اپنا پلاٹ دوسرے شہر کے کسی خریدار کو بیچ دیں گے۔ تم ابھی اپنے انکل سے رابطہ کرو۔'' راشد فوراً راضی ہوگیا۔

اسی وقت نازیہ نے اپنے انکل کو کال کی اور پھر بولی۔ ''ان کا فون بند ہے۔ میں کچھ دیر کے بعد ان سے رابطہ کروں گی۔''

اس بات کو آدھا گھنٹا گزر گیا۔ راشد اپنے کمرے میں بیٹھا تھا کہ نازیہ نے بتایا۔

"انکل سے رابطہ ہوگیا ہے۔ میں نے ان کو سب کچھ بتادیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ وہ پلاٹ بیچنا ان کے لیے مشکل نہیں ہے۔ وہ اس پلاٹ کو وہاں بیٹھے بیٹھے بیچ دیں گے۔"

"بہت خوب..." راشد خوش ہوگیا۔

"ہمیں ایک بار لاہور جانا پڑے گا۔" نازیہ نے کہا۔

"کوئی بات نہیں ہم چلے چلیں گے۔ کب جانا ہے؟" راشد خوش تھا۔

"شاید ایک دو دن میں۔" نازیہ بولی۔

"تمہارے انکل پہلے خریدار کو ہمارے پاس بھیجیں گے پلاٹ دیکھنے کے لیے؟" راشد نے پوچھا۔

نازیہ سوچنے لگی۔ "ممکن ہے کہ ایسا ہو... اور یہ بھی ممکن ہے کہ ایسا نہ ہو۔"

"بہرحال جیسا وہ مناسب سمجھیں۔" راشد کے مرجھائے ہوئے چہرے پر توانائی آگئی تھی۔

ایک گھنٹے کے بعد ناصر کا فون آگیا۔ رابطہ ہوتے ہی اس نے کہا۔ "میں نے سوچا کہ میں خود ہی رابطہ کرلوں۔ کیا خیال ہے بیعانہ لے کر ہم آجائیں۔"

"کس چیز کا بیعانہ؟"

"اس پلاٹ کا بیعانہ۔"

"میں نے وہ پلاٹ بیچ دیا ہے۔"

"بیچ دیا ہے؟ کتنے کا؟" وہ یکدم چونکا۔

"اب وہ بک گیا ہے تو بتانا ضروری نہیں ہے کہ کتنے کا بکا ہے۔ بہرحال آپ نواز سے کہہ دیں کہ اس پلاٹ کا خیال ذہن سے نکال دے۔" راشد نے بات ختم کرنی چاہی۔

"وہ پلاٹ کس نے خریدا ہے؟" ناصر نے کریدا۔

"یہ بتانا بھی ضروری نہیں ہے۔ خدا حافظ۔" راشد نے روکھے پن سے کہہ کر فون بند کردیا۔

اس فون کال نے راشد کا منہ ایسا کردیا تھا جیسے اس نے ایک ساتھ بہت سی کڑوی چیزیں کھالی ہوں۔ اُسے نواز سے نفرت تھی۔ ماضی میں جو کچھ اس نے اس کے ساتھ کیا تھا، وہ ابھی تک اسے یاد تھا۔ وہ اس کا ذکر بھی سننا نہیں چاہتا تھا، اس کے باوجود پراپرٹی ڈیلر نے نواز کے لیے اسے پھر فون کردیا تھا۔

☆☆☆

اُس رات ..... راشد نے خواب دیکھا کہ وہ ریلوے اسٹیشن کے نزدیک لکڑی کی بینچ پر بیٹھا ایک طرف دیکھ رہا ہے۔ اچانک اس کے سامنے ایک ٹرین آکر رکتی ہے اور مسافر باہر نکلنے لگتے ہیں۔ پھر اندر سے ایک لڑکی باہر نکلتی ہے۔ اس کا چہرہ واضح نہیں ہے، اس کے ہاتھ میں موبائل فون ہے اور وہ کسی کی کال سن رہی ہے۔ جس ہاتھ سے اس نے موبائل فون پکڑا ہوا ہے اس ہاتھ کی ایک انگلی میں اس نے چمکتی ہوئی انگوٹھی پہنی ہوئی ہے۔ اس انگوٹھی میں سفید پتھر بھی جڑا ہوا ہے۔ اچانک راشد کی آنکھ کھل گئی اور وہ آنکھیں کھول کر خالی نظروں سے چھت کو دیکھنے لگا۔

راشد نے گردن گھما کر نازیہ کی طرف دیکھا۔ وہ کروٹ لیے سو رہی تھی۔ راشد سوچنے لگا کہ یہ کیسا خواب تھا؟

تھوڑی دیر بعد اس نے آنکھیں بند کرلیں اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔ بند آنکھوں سے بھی اس خواب کو محو کرنا مشکل ہو رہا تھا لیکن راشد آنکھیں بند کئے لیٹا رہا اور پھر اسے نیند آگئی۔

☆☆☆

جیسے ہی ناشتا کرنے راشد کمرے سے باہر نکلا، نازیہ نے بتایا۔ "ناشتا کر کے جلدی سے تیار ہوجاؤ ہمیں لاہور جانا ہے۔"

"انکل نے بلایا ہے؟" اس نے چونک کر پوچھا۔

"انکل کی ابھی تھوڑی دیر پہلے کال آئی تھی۔ انہوں نے نقشہ دکھا کر ایک پارٹی سے پلاٹ کی بات کرلی ہے۔ ہم پلاٹ کا بیعانہ لینے جارہے ہیں۔" نازیہ نے بتایا۔

"کیا واقعی؟" راشد کے چہرے پر خوشی دکھائی دینے لگی۔

"ہاں واقعی... انکل کہہ رہے تھے کہ بیعانہ لینے کے لیے ہم لوگوں کا آنا بہت ضروری ہے کیونکہ اسٹامپ پیپر پر دستخط کرنے ہوتے ہیں۔ باقی رقم وہ ایک ہفتے کے بعد ہمیں دیں گے۔" نازیہ بولی۔

"کوئی بات نہیں دو گھنٹے کا تو سفر ہے۔ ابھی نکلتے ہیں۔" راشد نے کہا۔

"ایک بات اور بیعانہ لینے کے لیے ہمیں انکل کے آفس بھی نہیں جانا پڑے گا۔ ان کا آدمی کاغذات لے کر جہاں ہم کہیں گے وہاں آجائے گا۔ آپ کے دستخط ہوں گے، آپ بیعانہ لیں گے اور ہم فارغ۔" نازیہ نے مسکراتے ہوئے کہا اور چٹکی بجائی۔

"تمہارے انکل نے ہمیں آفس کیوں نہیں بلایا؟" راشد کو کچھ حیرت ہوئی۔

"وہ بہت مصروف رہتے ہیں۔ میں نے بھی تقاضا نہیں کیا۔ کیونکہ میرے دماغ میں ایک پلان ہے۔ ہم وہاں سے پیسے لیں گے اور شہر گھومنے نکل جائیں گے۔ ویسے بھی ہمیں

اپنا پلاٹ بیچنے سے غرض ہے، ان کے آفس میں جانا ضروری نہیں ہے۔"
"یہ بھی تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔" راشد مسکرایا۔
"اب جلدی سے تیار ہوجاؤ۔" نازیہ نے کہا اور دونوں جانے کی تیاری کرنے لگے۔ جب وہ گھر سے نکلنے لگے تو نازیہ بولی۔
"کیا خیال ہے ٹرین میں چلیں؟ مجھے ٹرین کا سفر اچھا لگتا ہے۔"
ٹرین کا نام سنتے ہی راشد چونکا اور اسے رات والا خواب یاد آگیا۔ اس کی اچانک خاموشی پر نازیہ نے پوچھا۔
"کیا ہوا؟"
"نہیں کچھ نہیں... چلو ٹرین میں چلتے ہیں۔" راشد نے حامی بھرلی۔
آدھے گھنٹے بعد وہ دونوں ٹرین میں بیٹھے سفر کررہے تھے۔ نازیہ بہت خوش تھی جبکہ راشد کو مختلف وسوسوں نے گھیرا ہوا تھا۔ ان ہی سوچوں میں وہ لاہور اسٹیشن پہنچ گئے۔
رش کچھ زیادہ ہی تھا۔ ٹرین سے باہر نکلنے کے لیے مسافروں کی دھکم پیل شروع ہوگئی تھی۔ اس دھکم پیل میں راشد ٹرین سے پہلے اُتر گیا جبکہ نازیہ اندر ہی رہ گئی۔ راشد باہر کھڑا ہوکر نازیہ کے اُترنے کا انتظار کرنے لگا۔ مسافروں کا رش کم ہوا تو نازیہ بھی باہر نکلی لیکن اس وقت راشد چونکا اور اس کے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی جب اس نے دیکھا کہ نازیہ نے اپنا موبائل کان سے لگایا ہوا ہے اور وہ کسی کی کال سن رہی ہے اور جس ہاتھ میں اس نے موبائل فون پکڑا ہوا تھا، اس ہاتھ کی ایک انگلی میں اس نے انگوٹھی پہنی ہوئی تھی جس کے اندر چمکدار سفید پتھر جڑا ہوا تھا۔ یہ انگوٹھی راشد نے ہی نازیہ کو تحفے میں دی تھی، اس انگوٹھی کو خواب میں دیکھنے کے باوجود اس کا دھیان اس انگوٹھی کی طرف نہیں گیا تھا۔
راشد کا دماغ گھوما اور اسے اپنا ایک خواب سچ ہوتا دکھائی دیا۔ وہ زیرِلب بڑبڑایا۔
"او خدایا... کہیں میرا وہ خواب بھی سچ نہ ثابت ہوجائے جو میں کئی بار دیکھ چکا ہوں۔"
نازیہ ٹرین سے نیچے اُتری اور راشد کے پاس جاکر کھڑی ہوگئی۔ راشد تو ایسے کھڑا تھا جیسے وہ اپنے خیالوں میں کہیں اور ہی پہنچا ہوا ہو۔ یہ بھی سچ تھا کہ راشد کو پتا نہیں چلا تھا کہ نازیہ اس کے پاس آکر کھڑی بھی ہوگئی ہے۔
"کیا ہوا راشد؟" نازیہ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔
راشد چونکا۔ "تم آگئیں... کس کا فون تھا۔"
"رش میں سمجھ نہیں آیا... چلو چلتے ہیں۔" نازیہ نے کہا۔
"اب کہاں جانا ہے؟" راشد نے دائیں بائیں دیکھا۔
"یہیں کہیں بیٹھ جاتے ہیں۔ میں انکل کو فون کرتی ہوں۔ یہیں سے رقم لے کر ہم سیر و تفریح کے لیے نکل جائیں گے۔" نازیہ نے کہا اور دونوں ایک طرف چل پڑے۔ نازیہ نے فون اپنے کان سے لگالیا۔ وہ کسی سے بات کرنے لگی۔ ریلوے اسٹیشن میں لوگوں کا شور تھا اور راشد کا دھیان اپنے خواب کی طرف تھا۔
"انکل کہہ رہے ہیں کہ بیس منٹ میں ان کا آدمی آرہا ہے۔ ہم کینٹین میں بیٹھ کر کچھ کھا پی لیتے ہیں۔" نازیہ نے... فون کان سے الگ کر کے راشد کو بتایا۔
"میرا کھانے کو دل نہیں چاہ رہا ہے۔" راشد پریشانی میں مبتلا تھا۔
"میرا کونسا کھانے کو دل چاہ رہا ہے۔ ہم کو محض وقت گزاری کرنی ہے۔ کیا بات ہے تم مجھے پریشان دکھائی دے رہے ہو؟"
"نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔"
"مجھے لگ رہا ہے۔"
"تمہارا وہم ہے... چلو ایک ایک کپ چائے پی لیتے ہیں۔" دونوں نے کینٹین کی طرف تیز تیز قدم بڑھا دیے۔
کینٹین صاف ستھری تھی اور وہاں کچھ اور لوگ بھی براجمان تھے جن میں خواتین بھی تھیں۔ دونوں ایک خالی میز پر بیٹھ گئے۔ راشد نے چائے کا آرڈر دے دیا۔ اچانک راشد کی نظر سامنے دیوار پر پڑی۔ وہاں صبح کے منظر کی ایک تصویر لٹک رہی تھی۔ راشد کا دل ایک بار پھر دھڑکا کیونکہ وہ یہ تصویر خواب میں دیکھ چکا تھا۔ پھر اچانک اسے یاد آیا کہ خواب میں جب اس نے یہ تصویر دیکھی تھی تو تصویر کے پاس ہی کہیں آگ بھی بھڑکی تھی اور دوسرے ہی لمحے وہ آگ بجھ گئی تھی۔ راشد سوچنے لگا کہ کیا ایسا بھی ہوگا۔ یہ سوچتے ہوئے وہ متلاشی نگاہوں سے دائیں جانب دیکھ رہا تھا کہ اچانک اس کی نظر چولہے پر چائے بناتے ہوئے آدمی پر گئی اور عین اس وقت چولہے کی آگ یکدم بھڑکی اور اس آدمی نے فوراً گیس سلنڈر بند کردیا اور دوسرے ہی لمحے آگ بجھ گئی۔
راشد گھبرا گیا۔ اسے اپنا گلا خشک ہوتا ہوا معلوم ہونے لگا۔ اسے یقین ہوگیا کہ اس کا خواب سچ ثابت ہوگا۔ اس کے خواب کی نشانیاں سچ ہورہی ہیں۔ اس سے پہلے کہ اس کا خواب مزید سچ ہو اور اس کے ہاتھوں کسی کا قتل ہوجائے وہ

اس جگہ سے چلا جائے۔

اچانک راشد ڈر گیا کیونکہ نازیہ کے موبائل فون کی بیل ہوئی تھی اور راشد ایسے ڈر گیا جیسے جانے کیا ہو گیا ہو۔ فون کان کو لگانے سے پہلے نازیہ نے راشد کی طرف دیکھا۔

''کیا ہوا؟''

''کک... کچھ نہیں۔''

''ایک منٹ میں کال سن کر آتی ہوں۔'' نازیہ کہہ کر اُٹھ کر چلی گئی۔ راشد گھبرایا ہوا بیٹھا تھا۔ اس نے یہ بھی نہیں پوچھا کہ وہ کال سننے کے لیے باہر کیوں جا رہی ہے۔

پانچ منٹ کے بعد نازیہ واپس آگئی اور آتے ہی بولی۔

''انکل کا فون تھا، انہوں نے پیسے اور کاغذات دے کر آدمی بھیج دیا ہے۔ وہ آدمی مجھے جانتا ہے کیونکہ جب میں انکل کے پاس کام کرتی تھی تو وہ بھی اس وقت کام کرتا تھا۔''

''مجھے یہاں گھبراہٹ ہو رہی ہے۔ یہاں سے چلتے ہیں۔'' راشد کے جسم میں بے چینی کی لہر دوڑنے لگی تھی۔

''گھبراہٹ کیوں ہو رہی ہے؟'' نازیہ نے اطمینان سے پوچھا۔

''مجھے نہیں پتا... اُٹھو چلتے ہیں۔'' راشد کا چہرہ اُترا ہوا تھا۔

''کہاں چلنا ہے؟''

''واپس چلتے ہیں۔''

''کیا ہوا ہے راشد؟ واپس چلنا ہے۔ انکل کا آدمی آرہا ہے۔'' نازیہ کو اس کی بات سن کر اُلجھن سی ہونے لگی۔

اسی وقت ان کی چائے آگئی۔ راشد کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ وہ عجیب سی نظروں سے دائیں بائیں بھی دیکھ رہا تھا۔ اُس وقت راشد اور بھی پریشان ہو گیا جب اس نے ایک طرف براجمان ایک عورت کی طرف دیکھا۔ اس کا جائزہ لیتے ہوئے راشد کی نگاہ اس کے پیروں کی طرف چلی گئی۔ اس نے سنہری چپل پہنی ہوئی تھی۔ خواب میں راشد جس عورت کو قتل کر رہا تھا اس نے سنہری چپل ہی پہنی ہوئی تھی۔

راشد کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اس نے اس عورت کے چہرے کی طرف دیکھا اور دل ہی دل میں بولا۔

''کیا یہ عورت میرے ہاتھوں قتل ہو گی...؟ لیکن کیوں؟''

اچانک پھر نازیہ کا فون بجنے لگا اور وہ اُٹھ کر اس طرف چلی گئی جہاں پاس ہی کھانے پینے کا سامان تیار ہو رہا تھا اور چولہا جل رہا تھا۔ راشد نے نازیہ کے اُٹھنے پر خاص دھیان نہیں دیا وہ اپنی پریشانی اور اُلجھن میں کھویا ہوا تھا۔

ٹھیک اس وقت راشد کی نظر ایک آدمی پر پڑی۔ جو ابھی کینٹین کے اندر آیا تھا۔ اس آدمی کو راشد نے خواب میں بھی دیکھا تھا۔ جو چہرے اس کے سامنے دھندلے تھے، وہ اب واضح ہونے لگے تھے۔ راشد کی نگاہیں اس پر مرکوز تھیں۔ راشد اپنے دل میں کہہ رہا تھا کہ ابھی اس کے ساتھ کوئی آدمی ٹکرائے گا اور اس کی کلائی پر بندھی گھڑی کی پن نکل جائے گی اور وہ کلائی سے اُتر کر نیچے گر جائے گی۔ بالکل ایسا ہی ہوا اور جونہی ایک آدمی اس آدمی سے ٹکرایا، اس کی گھڑی کھل کر نیچے گر گئی۔

اب راشد کے لیے رکنا ممکن نہیں تھا۔ خواب میں جس عورت کا خون ہوا تھا وہ بھی اس جگہ موجود تھی اور جو مناظر اس نے خواب میں دیکھے تھے، وہ بھی ایک ایک کر کے اس کے سامنے حقیقت بن کر آگئے تھے۔ وہ جلدی سے اُٹھا اس نے دائیں بائیں دیکھا اور نازیہ پر نظر پڑتے ہی وہ اس کی طرف بڑھا۔ نازیہ اس کی جانب پشت کیے کسی کے ساتھ فون پر بات کر رہی تھی۔ وہ تیزی سے اس کے قریب گیا اور عین اس کے پیچھے کھڑا ہو کر ابھی اسے مخاطب کرنے ہی والا تھا کہ اس نے سنا، نازیہ کہہ رہی تھی۔

''...اس میں شکریے کی کیا بات ہے نواز صاحب۔ میں اپنے تجربے کی بنیاد پر اپنے شوہر کا پلاٹ آپ کو بیچ رہی ہوں لیکن اب آپ ایک دو دن میں سودا پورا کر کے پلاٹ اپنے نام کروالیں تاکہ کوئی گڑبڑ نہ ہو...''

راشد یہ سنتے ہی غصے سے پاگل ہو گیا۔ اس نے وحشیانہ انداز میں نازیہ کو کندھے سے پکڑ کر اپنی طرف گھمایا اور چیخ کر بولا۔ ''تم مجھے دھوکا دے کر اس کے ہاتھ بیچ رہی ہو جس سے میں نفرت کرتا ہوں... اس کا ساتھ دے رہی ہو...'' راشد نے پاس پڑی تیز چھری اُٹھالی۔ نازیہ نے جیسے ہی راشد کو خون آلود نظروں کے ساتھ کھڑا دیکھا، وہ بُری طرح... گھبرا گئی لیکن راشد نے چھری کے وار کرنے شروع کر دیے۔ نازیہ چیخی۔

''راشد... نہیں... مجھے معاف کر دو... دگنی قیمت کے لالچ نے مجھے اندھا کر دیا تھا...'' وہ چیختی چلاتی رہی اور راشد پاگلوں کی طرح اسے مارتا رہا اور جس مانوس آواز کو وہ خواب میں سن کر نہیں جان سکا تھا کہ وہ آواز کس کی تھی، اب اس پر واضح ہو گیا تھا کہ وہ چلانے کی آواز اس کی بیوی کی تھی۔ اور جب نازیہ کا بے جان خون آلود جسم زمین پر گرا، راشد نے ہانپتے ہوئے دیکھا کہ خواب میں نظر آنے والی وہ سنہری چپل نازیہ نے بھی پہنی ہوئی تھی۔

[illegible]

ارشد بیگ

چالاکی و عیاری... جعل سازی و سمجھداری اس وقت دھری رہ جاتی ہے جب سامنے والا سوا سیر ہو... موقع سے فائدہ اٹھانے والے ایک شاطر کی حکمتِ عملی... دوسروں کی سوچوں اور ارادوں کو گرفت میں رکھنے کا موقع اس کے ہاتھ میں تھا... مگر تقدیر کی پذیرائی کا حق دار کوئی اور تھا۔

محبت کے پھیکے رنگوں میں نئے اور تازہ رنگ بھرنے کی خواہش کا نوحہ

سراغ رساں سارجنٹ ہربرٹ نے ایس جیک کلب کے عقب میں واقع منیجر کے دفتر کے دروازے پر دستک دی۔

اندر سے منیجر کوسٹیلا کی آواز آئی۔ ’’آجاؤ، ہربرٹ۔‘‘
کوسٹیلا ایک سیاہ فام تھا جس کی عمر پینتالیس برس کے لگ بھگ تھی۔ وہ ایک کامیاب شخص تھا لیکن اس وقت افسردہ دکھائی دے رہا تھا۔

’’تم نے مجھے بلایا ہے، کوسٹیلا؟‘‘ ہربرٹ نے کہا۔
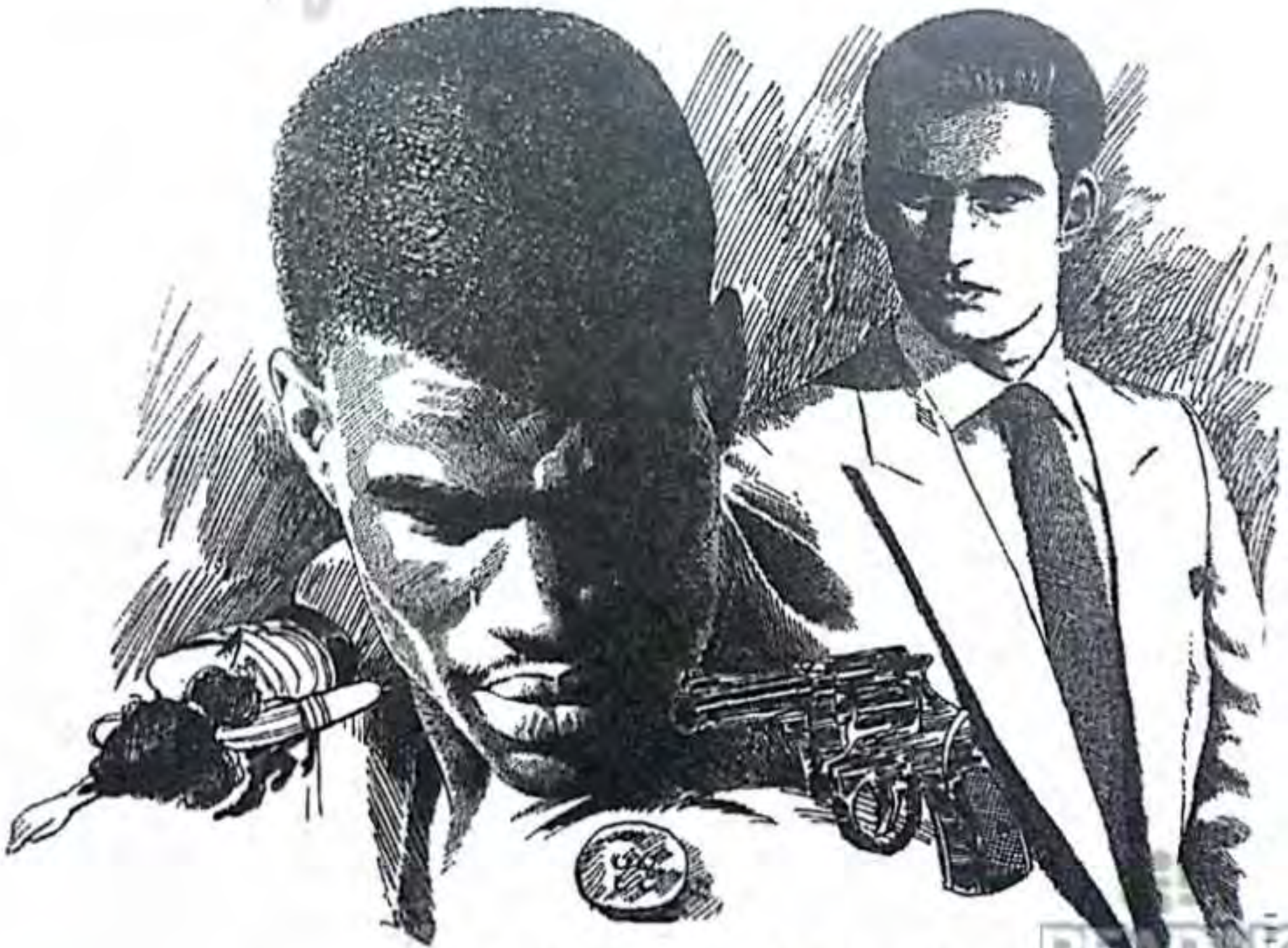
کوسٹیلا نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ''یقیناً، ہاں لڑکے۔''

''کیوں، تم مجھ سے کس سلسلے میں ملنا چاہتے ہو، کوسٹیلا؟''

''میں نے سنا ہے کہ تم میری بیوی سیلی کی موت کے اسباب کے بارے میں تفتیش کرتے پھر رہے ہو؟''

''ہاں، یہ بات درست ہے۔''

''اس تفتیش کو جاری رکھنے کے لیے کچھ ہاتھ لگا؟''

''زیادہ کچھ تو نہیں بس ایک بٹن ہاتھ لگا ہے اور کچھ بھی نہیں۔'' سراغ رساں ہربرٹ نے اپنے کوٹ کی جیب سے داہنا ہاتھ باہر نکالا اور اسے سیدھا کرتے ہوئے کوسٹیلا کے سامنے کر دیا۔ اس کی انگلیوں میں ایک بڑا سا بٹن دبا ہوا تھا۔

''ہربرٹ سلواین۔ ایک دیہاتی لڑکا ایک اچھا پولیس مین ثابت ہو رہا ہے۔ باوردی نہیں، سادہ لباس... اور سادگی سے روپے اینٹھنے کا دھندا کر رہا ہے۔ تم اپنی جیب میں ڈھیر ساری رقم بھر رہے ہو۔ جب سے تم نے یونیفارم اتارا ہے۔ اب تک کتنی رقم اکٹھی کر چکے ہو، ہربرٹ؟'' نیجر نے کہا۔

ہربرٹ کا چہرہ کرخت ہو گیا۔ ''کوئی خاص رقم نہیں ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

''جب تم سرکل ول سے یہاں آئے تھے تو نرے دیہاتی اور مفلس تھے لیکن تم ایک اسمارٹ لڑکے تھے، ہربرٹ۔ مجھے امید ہے کہ تم بدستور اسمارٹ بنے رہنا چاہتے ہو۔''

''اس بات کا کیا مطلب ہے؟''

''تمہارا محکمہ کہتا ہے کہ میری بیوی نے خودکشی کی ہے۔ گورونر کا بھی یہی کہنا ہے لیکن تم اس بات کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہو۔ تمہارے ارادے کمزور نہیں پڑے۔ ہوسکتا ہے کہ میری بیوی نے خودکشی نہ کی ہو۔ مجھے سیلی کا چوتھا، آخری اور امیر ترین شوہر ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ وہ کئی لوگوں کو برباد کر چکی تھی، ہربرٹ۔ تم اس حقیقت سے بہ خوبی واقف ہو۔''

ہربرٹ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''اسے عمدہ چیزیں پسند تھیں... لباس، ہیرے جواہرات، پرفیومز...''

''اس ٹاؤن کی کوئی بھی خوش تراش نقوش والی عورت اتنی سنگ دل اور پیارے چہرے والی نہیں تھی جتنی کہ میری بیوی سیلی تھی۔ جب ہماری ملازمہ نے اسے ہمارے اپارٹمنٹ میں مردہ پایا تو میرا دل پاش پاش ہو گیا۔ لیکن اب وہ مر چکی ہے، ہربرٹ۔ تو پھر تم اس کیس کو ختم کیوں نہیں کرتے؟''

''انہوں نے مجھ سے کہا ہے کہ میں کیس کو جاری...''

کوسٹیلا نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ''جبکہ میں نے سنا ہے ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں نے تو یہ سنا ہے کہ تم اس کیس کو جاری رکھنے کے لیے بضد ہو... تم گھنٹوں اس پر کام کر رہے ہو۔ اس میں تمہاری دلچسپی کا کیا سبب ہے؟ تم اس کے دام اینٹھنا چاہتے ہو؟ کیا ایسا ہی ہے؟ تمہارا خیال ہے کہ ایک دولت مند شخص نے سیلی کو گلا گھونٹ کر مار دیا ہے؟ تم اسے بلیک میل کرنا چاہتے ہو؟ تم بلیک میل کی رقم سے اعلیٰ طبقے میں ایک مقام حاصل کرنا چاہتے ہو؟''

ہربرٹ نے مسکراتے ہوئے شانے اچکا دیے۔ وہ اٹھ کر کمرے کے دوسرے حصے کی جانب بڑھ گیا۔ اس نے وہاں موجود الماری کا پٹ کھول دیا۔

''اے سنو!'' کوسٹیلا نے غراتے ہوئے کہا۔ ''یہ تم کیا کر رہے ہو؟''

الماری کے اندر ہینگرز پر چار سوٹ لٹکے ہوئے تھے۔ ہربرٹ نے اپنے کوٹ کی جیب میں سے بٹن نکالا اور اسے الماری میں لٹکے ہوئے ہر سوٹ سے باری باری چھو کر دیکھنے لگا۔ اس دوران میں اسے پسینا آنے لگا۔ جب وہ چوتھے سوٹ کے پاس پہنچا تو کوسٹیلا اس کے عقب میں آ کر کھڑا ہو گیا۔ ایک سیاہ رنگ کا اعشاریہ دو کا آٹومیٹک ریوالور اس کے ہاتھ میں تھا۔

''اس کوٹ کا ایک بٹن غائب ہے، کوسٹیلا۔''

''ہاں، ایسا ہی ہے، ہربرٹ۔''

''وہ تمہاری بیوی تھی۔''

کوسٹیلا پیچھے ہٹ گیا۔ ''تم جانتے ہو، کیوں۔ غلطیاں اس کی تھیں۔ لیکن وہ مجھ سے کہتی تھی کہ وہ مجھ سے پیار کرتی ہے لیکن اسے مجھ سے کبھی پیار نہیں رہا۔ مجھے یہ بات بھی گوارا تھی اور میں بقیہ زندگی اسی طرح گزار سکتا تھا لیکن بات یہ تھی کہ اس کی حرکتیں مجھے پاگل کیے دے رہی تھیں۔''

ہربرٹ خاموش رہا۔ بس سر ہلا دیا۔

''میں اس شہر کا ایک بڑا آدمی ہوں، ہربرٹ۔ ایک اسمارٹ شخصیت کی حیثیت سے میری ایک شہرت ہے اور ایک دیہاتی لڑکی مجھے بے وقوف بنا رہی تھی جیسے کہ میں کوئی سادہ لوح ہوں اور تماشا بن رہا ہوں۔ اس نے مجھ سے جو کچھ بھی کہا تھا، وہ سب جھوٹ تھا۔ وہ مجھے یہ یقین دلاتی تھی کہ وہ مجھ سے محبت کرتی ہے۔ مجھ سے۔ بگ ایل کوسٹیلا سے۔''

ہربرٹ کا ہاتھ اپنے کوٹ کی جیب میں رینگ گیا۔

''اور پھر وہ میرا بھی مضحکہ اڑانے لگی۔ وہ تمام وقت میرا پیسا صرف کرتی تھی اور مجھے جل دیتی رہتی تھی۔ پھر اس نے بے تحاشا پینا شروع کر دی، بہت زیادہ باتیں کرنے لگی۔ میں جانتا تھا کہ ایسا ہونے والا ہے۔ وہ قہقہے لگاتی تھی اور ہر کسی کو میرے بارے میں بڑے بڑے لطیفے سناتی تھی۔ وہ انہیں بتاتی تھی کہ کس طرح وہ بگ ایلی کوسٹیلا کو نچوڑ رہی ہے۔''

کوسٹیلا یہ کہہ کر ایک لمحے کے لیے خاموش ہو گیا۔ پھر ایک دم پھٹ پڑا۔ ''میں نے اپنا ذہن بنا لیا تھا۔ وہ لوگوں کو خودکشی پر، شراب نوشی کرنے اور منشیات کا عادی بننے پر مجبور کر دیتی تھی۔ اس نے آخری مرتبہ میرا مذاق اڑایا تو میں نے... میں نے اسے قتل کر دیا... اس کے اپنے تکیے کے ذریعے جب وہ سو رہی تھی۔ زہر خورانی تو بس ایک دکھاوا تھا... تاکہ اس کی موت کو خودکشی کا رنگ دیا جا سکے۔ اس نے یقیناً جدوجہد کے دوران میرے کوٹ کا بٹن توڑ لیا تھا۔ مجھے اس کا پتا نہیں چلا۔''

ہربرٹ نے شانے اچکا دیے۔ ''لگ رہا ہے کہ یہ بٹن تمہیں بجلی کی کرسی پر پہنچا دے گا، کوسٹیلا۔''

کوسٹیلا کا چہرہ پھیکا پڑ گیا۔ ''نہیں، میں نے تمہیں یہاں ایک وجہ سے... نہیں دو وجوہ سے بلایا ہے۔ جب میں نے تم سے یہاں آنے کو کہا تھا تو مجھے علم نہیں تھا کہ میرے کوٹ کا بٹن تمہارے پاس ہے۔ اس ثبوت سے تمہاری جیت کا امکان بڑھ گیا ہے لیکن صرف ایک حد تک۔ یہ بٹن تمہارے لیے ڈھیروں رقم کا انتظام کر سکتا ہے۔''

''واقعی؟''

''یہ بٹن مجھے واپس فروخت کر دو۔ اس کی کیا قیمت طلب کرتے ہو، ہربرٹ۔''

''تم اس کی قیمت ادا نہیں کر سکتے۔''

''شاید کر سکوں۔ شاید میں تم سے اس کے لیے کوئی بھاؤ تاؤ طے کرنے میں کامیاب ہو جاؤں۔ تم بھی ایک طرح سے ایک مشکل میں مبتلا ہو، ہربرٹ۔ تم ایک بلند حوصلہ شخص ہو۔ تم ایک دور دراز دیہی علاقے سے اپنے لیے دولت کمانے یہاں آئے ہو۔ تم ایک بددیانت پولیس مین ہو...... رشوت خور...... زبردستی پیسا اینٹھنے والے فنکار۔ اگر تمہارے محکمے کو تمہارے بارے میں یہ سب کچھ پتا چل جاتا ہے، تو پھر ہربرٹ؟''

''تو پھر میں ختم ہو جاؤں گا۔ آل رائٹ؟''

''یقیناً تم ختم ہو جاؤ گے لیکن میرے پاس تمہاری رشوت خوری کے ثبوت موجود ہیں، ہربرٹ۔ سوری، مجھے وہ حاصل کرنے پڑے۔ اپنی ذات کے تحفظ کے لیے۔ اب میں شکر گزار ہوں کہ وہ میرے پاس موجود ہیں۔ تمہارے ہاتھ میں موجود بٹن کی میں ایک قیمت ادا کروں گا اور وہ تمہارے زبردستی پیسا اینٹھنے کے کاروبار کے بارے میں میری خاموشی کا ایک حصہ ہوگا۔ میں تمہاری منہ مانگی رقم نہیں دوں گا بلکہ اپنی خاموشی کی قیمت اس میں سے منہا کر دوں گا۔ اگر تم ایک ایماندار پولیس مین ہوتے تو مجھ سے دنیا کی کوئی بھی شے طلب کرنے کے حق دار ہوتے۔ لیکن اب جو معاملہ ہے تو تمہیں اس بٹن کی ایک معقول رقم طلب کرنی ہوگی۔ لیکن اس سے پہلے اس دوسری وجہ کی بات ہو جائے جس کے لیے میں نے تمہیں یہاں طلب کیا ہے۔''

ہربرٹ استفہامیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

''ہمیں تھوڑی دیر کے لیے کہیں چلنا ہوگا ہربرٹ۔ میری بیوی کی ملازمہ اس وقت اپارٹمنٹ میں موجود تھی جب میں نے سیلی کو قتل کیا۔ اس نے مجھے قتل کرتے دیکھ لیا تھا۔ وہ اپنی زبان بندی کے لیے دس لاکھ ڈالر طلب کر رہی ہے۔''

ہربرٹ کی مسکراہٹ سرد پڑ گئی۔ ''لگتا ہے کہ تم مشکل میں مبتلا ہو چکے ہو۔''

''ہاں، ایسا ہی ہے۔ اب تم میری مدد کرو گے۔'' کوسٹیلا نے کہا۔

''وہ کیوں؟''

''اس لیے کہ میں تم دونوں میں سے صرف ایک کو رقم ادا کرنا چاہتا ہوں۔ تم بے ایمان تو ہو لیکن اسمارٹ بھی ہو۔ لہٰذا میری چوائس تم ہو۔ لیکن تمہارے ذہن میں کوئی ایسا ویسا خیال نہ آ جائے اس لیے اپنے شولڈر ہولسٹر میں رکھا ہوا ریوالور مجھے تھما دو... ذرا احتیاط سے۔''

ہربرٹ نے اپنا ریوالور کوسٹیلا کے حوالے کر دیا۔

☆☆☆

سیلی کی ملازمہ ایلس کا اپارٹمنٹ شہر کے شمالی علاقے میں تھا۔

ایلس نے انہیں اندر بلا لیا۔ جب وہ اندر آ گئے تو کوسٹیلا نے دروازہ بند کر دیا۔ اس کے ہونٹوں پر چھائی مسکراہٹ سرد تھی۔

''میں تمہیں کوئی رقم ادا نہیں کروں گا، ایلس۔'' کوسٹیلا نے کہا۔ ''جانتی ہو، مجھے پتا چل گیا تھا کہ تم میری بیوی کو لوٹ رہی تھیں۔''

''یہ جھوٹ ہے۔''

کوسٹیلا نے شانے اچکا دیے۔ ''یہ بات کون کہہ سکتا ہے؟ تم تو نہیں کہہ سکتیں۔ میں پولیس کو بتاؤں گا کہ میں اس پولیس افسر کو تمہیں حراست میں لینے کے لیے ساتھ لایا تھا لیکن تم نے مزاحمت کی اور اس جدوجہد میں مجھے تمہیں شوٹ کرنا پڑ گیا۔''

ایلس کے سخت چہرے پر اینٹھن کے آثار اُمڈ آئے۔ ''یہ تمہاری خام خیالی ہے۔ میں اس قسم کی کسی بھی چال کے لیے تیار تھی۔'' یہ کہتے ہوئے ایلس نے اپنے ڈھیلے ڈھالے لبادے کے اندر سے ایک جھٹکے کے ساتھ ایک چھوٹا سا سیاہ رنگ کا آٹومیٹک ریوالور نکالا اور مزید کچھ کہے بغیر فائر کر دیا۔

کمرے میں ایک دھماکا ہوا۔

کیونکہ ایلس پر جنون کی کیفیت طاری تھی اس لیے نشانہ خطا ہو گیا اور گولی کوسٹیلا کے بھاری بھرکم جسم کو چھو نہ سکی۔

کوسٹیلا نے ہربرٹ کا وہ ریوالور نکالا جو اس نے اپنے کلب میں ہربرٹ سے لیا تھا اور دانستہ ایلس پر گولی چلا دی۔

ایلس کا جسم لڑکھڑایا اور وہ قالین پر ڈھیر ہو گئی۔

وہ مر چکی تھی۔

کوسٹیلا مسکرانے لگا۔ اسے اپنے مقصد میں کامیابی حاصل ہو گئی تھی۔ ''سب کچھ پرفیکٹ ہو گیا۔ اس نے مجھ پر گولی چلائی تھی۔ میں نے اپنے دفاع میں جواباً گولی چلائی۔ یہ سب کچھ تمہاری آنکھوں کے سامنے ہوا ہے۔ تم عینی گواہ ہو۔ اب پولیس کو طلب کر لو، ہربرٹ۔'' کوسٹیلا نے یہ کہہ کر بے ساختہ ایک قہقہہ لگایا۔ ''میرا مطلب دوسرے پولیس والوں سے ہے۔''

ہربرٹ نے اثبات میں سر ہلا دیا اور فون کی جانب بڑھ گیا۔ فون کرنے کے بعد وہ خاموشی سے کمرے میں ٹہلتا رہا۔

کچھ دیر بعد پولیس سائرن کی آوازیں نزدیک آنے لگیں۔ جب دروازہ کھلا تو کمرا پولیس کے آدمیوں سے بھر گیا۔

انسپکٹر بیری، ہربرٹ سے مخاطب ہوا۔ ''یہ سب کیسے ہوا، ہربرٹ؟''

ہربرٹ ملازمہ کی لاش کے پاس جھک گیا۔ اس نے ملازمہ کی لاش کے پاس پڑا ہوا اپنا ریوالور اٹھا لیا جو کوسٹیلا نے ایلس کو مارنے کے بعد وہیں فرش پر پھینک دیا تھا۔ ہربرٹ نے اپنا ریوالور کوٹ کے اندر اپنے خالی ہولسٹر میں ڈال دیا اور سیدھا کھڑا ہو گیا۔

کوسٹیلا کا سانس اوپر کا اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔

''اس شخص نے اسے گولی ماری ہے۔'' ہربرٹ نے انسپکٹر بیری کو بتایا۔ ''یہ بلا اشتعال حرکت تھی۔ میں اس کے ہمراہ یہاں آیا تھا۔ اس عورت نے کوسٹیلا کو اپنی بیوی کو قتل کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ اس قتل کی عینی گواہ تھی اور اسے بلیک میل کرنا چاہتی تھی۔ اس لیے کوسٹیلا نے بلیک میل کی رقم ادا کرنے سے بچنے کے لیے اسے قتل کر دیا۔''

''تم اس کے ہمراہ یہاں کیوں آئے تھے، ہربرٹ؟''

''اوہ، میں معصوم نہیں ہوں۔ اس نے مجھے دھمکی دی تھی کہ اگر میں نے اس کی مدد نہیں کی تو وہ محکمے میں میرا بھانڈا پھوڑ دے گا۔ میں رشوت لیتا رہا ہوں...''

''تم؟''

''ہاں۔'' ہربرٹ نے تلخ لہجے میں کہا۔ اس کی آواز رندھ گئی۔ ''میں یہاں دولت کمانے کے لیے آیا تھا۔ وہاں سرکل ول میں جب میری بچی مر گئی تھی تو میری ایک ہی خواہش باقی رہ گئی تھی۔ میں اپنے بیوی کو واپس پا لوں۔ ہماری بچی کے مرنے کے بعد وہ دیوانی ہو گئی تھی اور مجھے چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ ہمارے پاس ڈاکٹروں کو دینے کے لیے کوئی پیسا نہیں تھا جو ہم اپنی بچی کا علاج کروا سکتے اور بچا سکتے۔ میری بیوی یہاں چلی آئی تھی۔ میں نے اس کا پیچھا کیا اور اسے واپس حاصل کرنے کی کوشش کی۔ اور اس کی واپسی کا صرف ایک ہی طریقہ تھا کہ میں بے تحاشا دولت حاصل کر لوں... اتنی زیادہ کہ وہ میرے پاس واپس آجائے... اس کے لیے مجھے وقت درکار تھا۔ میں اسے جتانا چاہتا تھا کہ وہ غلطی پر ہے۔ سو میں نے دولت مند بننے کے لیے رشوت لینا شروع کر دی... میں اس کے لیے کچھ بھی کرنے کو تیار تھا۔

''کوسٹیلا نے مجھے آج رشوت دینے کی کوشش کی۔ اس کا کہنا تھا کہ مجھے اس کی مدد کرنا ہوگی لیکن اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ میں جس وجہ سے رشوت لے رہا تھا، وہ وجہ باقی نہیں رہی تھی۔ مجھے اب دولت کی خواہش نہیں رہی تھی... اس وقت سے نہیں جب سے کوسٹیلا نے سیلی کو قتل کر دیا تھا۔''

''اس کی وجہ؟'' انسپکٹر بیری نے جاننا چاہا۔

''بے شک، کوسٹیلا کو سیلی کے چوتھے شوہر ہونے کا اعزاز حاصل تھا... لیکن سیلی میری مرنے والی بچی کی ماں تھی اور میں اس کا پہلا شوہر تھا۔'' ہربرٹ نے انتہائی افسردگی سے اپنی بات ختم کر دی۔
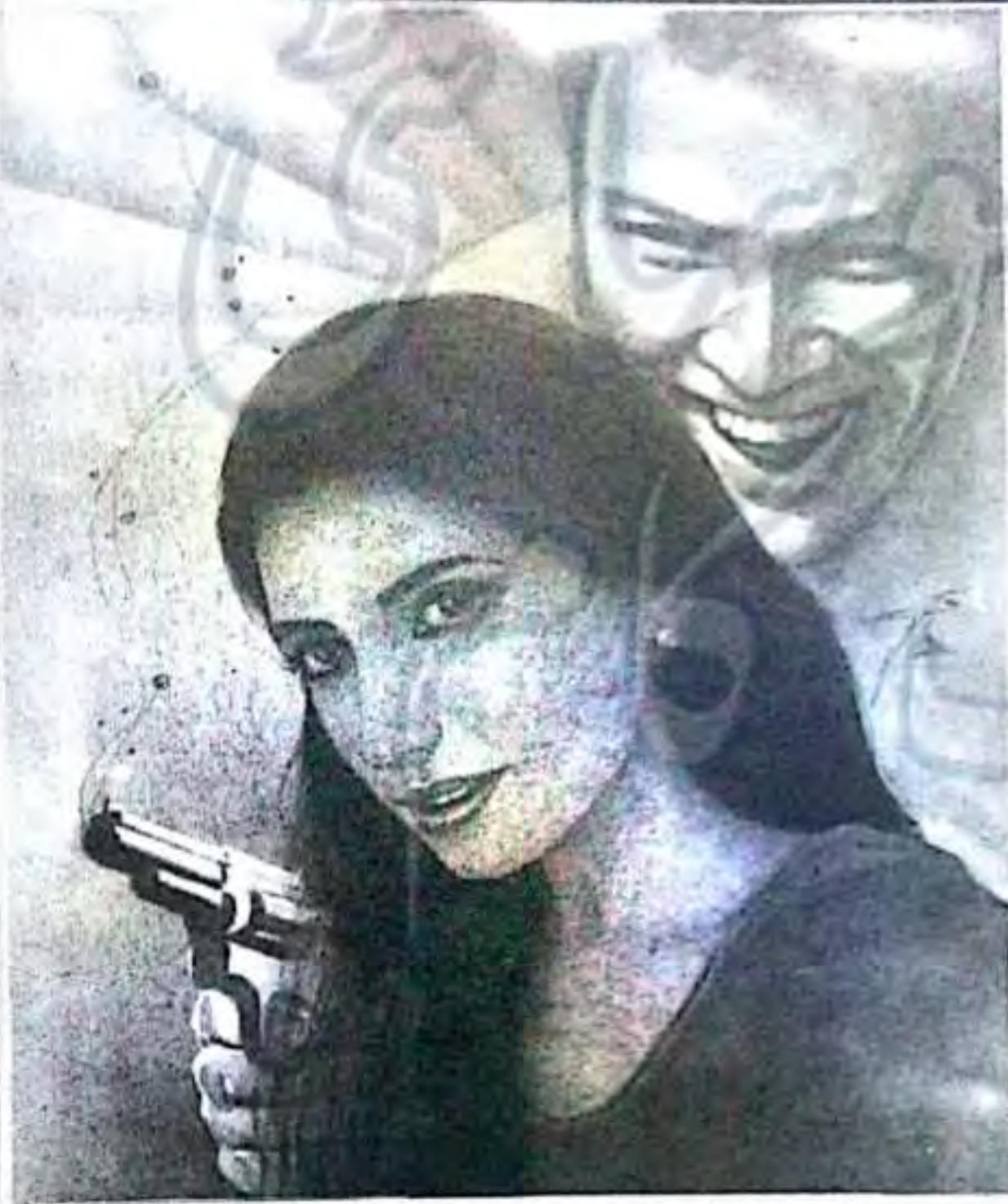
ذات بد ذات

شکیل صدیقی

زندگی کی اپنی حدیں ہوتی ہیں... اور ہزار ہا گزر گاہیں... اور ان مصروف گزر گاہوں پر ہم چلتے رہتے ہیں... دوڑتے رہتے ہیں... ہر ایک لمحے میں کسی نہ کسی سے ملاقات ہوتی ہے... اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں... اور پھر بچھڑ جاتے ہیں... ایک دوسرے سے جدا ہو کے تنہائی کے بیکراں سمندر میں اجنبیت کا غلاف تن پر چڑھا لیتے ہیں... ایک ایسے ہی شخص کی پریشانی... جو اپنوں اور غیروں کے درمیان تنہا و لاچار تھا... اس کی یادداشت اور انسان شناسی کو خطرات لاحق تھے... بد فطرت اور بدذات عفریتیں اس کے تعاقب میں تھیں... اس کا سچ پناہ کی تلاش میں تھا... اور ہر جگہ جھوٹ کی حکمرانی تھی... تاحدِ نگاہ کوئی چارہ ساز تھا... نہ غمگسار تھا...

پیچ در پیچ پھیلی جاں گسل کیفیات و جذبات کی عکاس تیکھی تحریر کے ابہام

سوچ کی طنابیں ٹوٹ رہی تھیں۔

سب کچھ خلط ملط سا ہو رہا تھا۔ یادوں کا کوئی سرا ہاتھ نہیں آ رہا تھا کہ میں اسے تھام کر شعوری سطح پر واپس آجاتا۔ دماغ سائیں سائیں کر رہا تھا۔ سورج کی تیز اور نکیلی شعاعیں میرے وجود میں کبھی جا رہی تھیں۔ مجھے دکھائی دے رہا تھا مگر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کچھ دکھائی نہ دے رہا ہو۔ میں نے گہری سانس لی تو مچھلیوں کی بُو سی محسوس ہوئی۔ کیا میں کسی ساحل پر پڑا تھا؟

کیا میں نے شراب زیادہ پی لی تھی؟ مگر نہیں، میں تو دو پیگ سے زیادہ نہیں پیتا۔ پھر کیا ہوا تھا؟ دماغ پر لاکھ زور دینے کے بعد بھی یاد نہیں آیا کہ جب میں ہوش میں تھا تو کیا کررہا تھا؟ تھوڑی دیر بعد وہ کیفیت ختم ہوگئی اور شعوری سطح پر کچھ خاکے سے بننے لگے۔ وہ خاکے آپس میں مدغم ہورہے تھے۔ ایک چہرہ بار بار ابھر کر سامنے آرہا تھا۔ مجھے یاد آیا کہ وہ نرگس ہے، میری بیوی۔

میں نے اس سے شادی کرلی تھی۔ خوشی اور وارفتگی سے مجھ پر شادیٔ مرگ کی سی کیفیت طاری ہوگئی تھی اور میں اپنی آنٹی شکنتلا کو اس بارے میں نہیں بتا پایا تھا۔ سوچا جب پریم نگر میں اس کے ساتھ داخل ہوں گا تو ان کے لیے ایک سرپرائز ہوگا۔ حیرت سے اُن کا منہ کھلے کا کھلا رہ جائے گا اور وہ مسرت آگیں لہجے میں کہیں گی۔

''راجیش تم نے کم از کم مجھے اس کی اطلاع تو دے دی ہوتی۔ بہرحال میں تمہارے انتخاب کی داد دیتی ہوں۔''

جب میں نے آنکھیں کھولیں تو خود پر ایک لڑکی کو جھکے ہوئے پایا۔ اس کے جسم کی بھینی بھینی خوشبو میری قوتِ شامہ سے ٹکرا رہی تھی۔ وہ کون تھی؟ میں اسے پہچان نہیں پایا۔ ایک اجنبی لڑکی مجھ پر اتنی مہربان کیوں تھی؟ میرا اس سے کیا تعلق تھا؟

''ڈارلنگ، شکر ہے کہ تمہیں ہوش آگیا۔'' اس نے مترنم آواز میں کہا۔ ''میں تو ڈر گئی تھی۔''

اس نے مجھے سہارا دیا کہ میں اٹھ جاؤں۔ میں نے زور لگایا اور بیٹھنا چاہا لیکن اس میں ناکام رہا۔ اس لیے کہ ریڑھ کی ہڈی میں اتنی شدید تکلیف ہوئی تھی کہ میرے منہ سے کراہ نکل گئی اور میں دوبارہ ہوش و حواس سے بیگانہ ہوگیا۔ تاریکی کی ایک دبیز تہ تھی جو میرے وجود پر غالب آتی جارہی تھی۔

جب میں دوبارہ فہم و ادراک کی وادی میں آیا تو میری سماعت سے کچھ آوازیں ٹکرائیں۔ ''میں نے اسے اعصاب کو سکون پہنچانے والی دوائیں دے دی ہیں۔ گھبرانے کی بات نہیں ہے۔ یہ ٹھیک ہوجائے گا۔ لیکن اسے ہوا کیا تھا؟'' یہ آواز میرے دائیں جانب سے آئی۔ آواز مانوس تھی۔ میں اسے پہلے بھی بارہا سن چکا تھا۔

''ان کا سر دروازے سے ٹکرا گیا تھا تب سے یہ بے ہوش ہیں۔'' ایک نسوانی آواز نے بائیں جانب سے جواب دیا۔ وہ آواز میرے لیے نامانوس تھی۔ میں نے اسے پہلے کبھی نہیں سنا تھا۔

میں نے آنکھیں کھولیں تو خود کو ایک کار میں بیٹھے پایا۔ وہ میری ہی کار تھی، جو اس وقت میرے مکان کے پورچ میں رکی تھی۔ اس کا دروازہ کھولا گیا پھر مجھے سہارا دے کر اتارا گیا۔ میرا ایک ملازم سبھاش نزدیک کھڑا تھا۔ ''شکر ہے مالک، آپ آگئے۔ مالکن آپ کی طرف سے بہت پریشان تھیں۔''

وہ آنٹی شکنتلا کو مالکن کہتا تھا اور صحیح کہتا تھا اس لیے کہ اس محل نما مکان کی وہی بلاشرکتِ غیرے مالک تھیں۔ مجھے سہارا دے کر وہ اندر لے گئے۔ میرا کمرا دائیں سے تیسرا تھا۔ آنٹی لاؤنج میں کھڑی تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی انہوں نے تشویش سے کہا۔ ''ارے راجیش! تمہیں کیا ہوگیا ہے؟ کیا تم نے آج پھر شراب زیادہ چڑھا لی ہے؟ تم اب تک کہاں تھے؟ میں تمہاری طرف سے بہت پریشان تھی۔''

وہ حسبِ معمول سفید بلاؤز اور چاکلیٹی ساڑی میں تھیں۔ انہوں نے اپنے بالوں میں جوڑا لگایا ہوا تھا۔ ہلکے میک اپ کے ساتھ انہوں نے ہلکی جیولری پہن رکھی تھی۔ وہ ہمیشہ کی طرح سادہ مگر پُروقار لگ رہی تھیں۔ مجھے اس کیفیت میں دیکھ کر اُن کے چہرے سے تشویش جھلک رہی تھی۔

''نہیں، اسے چوٹ لگ گئی ہے۔'' اسی مانوس آواز نے بتایا۔ ''میں اسے انجکشن دے دوں گا تو یہ صحت یاب ہوجائے گا۔''

اپنی وضع قطع اور چال ڈھال سے وہ شخص کوئی ڈاکٹر لگ رہا تھا۔ البتہ اس کے جسم پر سفید روایتی کوٹ نہیں تھا۔ اس کی آنکھوں پر نظر کا چشمہ تھا جس سے وہ بڑی حد تک سنجیدہ اور بُردبار نظر آرہا تھا۔

''تم کون ہو؟'' آنٹی نے اس لڑکی سے پوچھا۔

''میں نرگس ہوں، ان کی بیوی۔'' اس نے مسکرا کر کہا۔ ''کیا راجیش نے آپ کو اپنی شادی کی اطلاع نہیں دی؟''

''نرگس؟ کون نرگس؟ راجیش نے تو مجھے تمہارے بارے میں کبھی کچھ نہیں بتایا۔'' وہ حیرت سے بولیں۔

وہ مجھے کمرے تک لے آئے۔ کمزوری غالباً بہت بڑھ چکی تھی اس لیے کہ دو چار قدم کا فاصلہ بھی میرے لیے دوبھر ہوگیا تھا۔ مجھے شدید چکر آرہے تھے اس لیے میں بستر پر گر گیا۔ میرا سانس پھول گیا تھا۔ وہ خواب گاہ بلاشبہ میری ہی تھی اس لیے کہ وہاں کی ہر چیز نیلے رنگ کے شیڈ میں تھی۔

جو میرا پسندیدہ تھا۔ نیلی چھت، آسمانی پردے، اور بستر کی نیلی چادر۔ سائڈ ٹیبل پر رکھا ہوا گل دان بھی نیلا تھا اور اس میں ہلکے نیلے پھول لگے تھے۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ وہ لڑکی نہایت توجہ سے ساری چیزیں دیکھ رہی ہے۔

''راجیش! ڈاکٹر صاحب تمہیں انجکشن دے رہے ہیں۔ بھگوان نے چاہا تو جلد صحت یاب ہو جاؤ گے۔'' اس لڑکی نے اپنائیت سے مجھ پر جھک کر کہا۔ مچھلیوں کی بساندھ سے مجھے نجات مل چکی تھی اور اب ''پوائزن'' مجھ پر سوار تھی۔ پوائزن ایک خاص قسم کا پرفیوم ہے جو نرگس استعمال کرتی تھی۔ لیکن اس وقت اس لڑکی نے وہ پرفیوم لگا رکھا تھا اس لیے وہ سرتاپا مہک رہی تھی۔ اسے دیکھنے کے بجائے سونگھنے کو دل چاہ رہا تھا۔ اس میں بے پناہ کشش تھی، چنانچہ میں مشکل ہی سے اس پر سے نگاہ ہٹا پا رہا تھا۔ اس لڑکی کے بال سنہری تھے۔ وہ نرگس تو نہیں تھی، لیکن اس جیسی معلوم ہوتی تھی۔

اچانک مجھے یاد آیا کہ میری بیوی نرگس کے بال بھی سنہری تھے۔ مگر وہ تھی کہاں؟ میں نے اس کی تلاش میں گرد و پیش پر نظریں دوڑائیں لیکن اس کا سراپا نظروں میں نہ سما سکا۔ اضطراب کی ایک لہر میرے رگ و پے میں دوڑنے لگی۔ یہ لڑکی کون تھی جو میرے سر پہ سوار ہو گئی تھی اور اتنی اپنائیت سے باتیں کر رہی تھی اور اس نے خود کو میری بیوی بتا دیا تھا۔

نرگس تو نظر نہیں آئی البتہ دائیں جانب مجھے اپنے فیملی ڈاکٹر گوپال کھڑے دکھائی دیے۔ وہ ایک اسمارٹ اور ذہین شخص تھے، ان کی عمر تقریباً پچاس برس تھی۔ وہ بیماریوں کا پتا چٹکی بجاتے ہی لگا لیتے تھے اور پھر تیر کی طرح نشانے پر لگنے والی دوا تجویز کر دیتے تھے۔ وہ انجکشن تیار کر رہے تھے۔ میں بچپن سے انہیں اپنے مکان پریم نگر میں آتے جاتے دیکھ رہا تھا۔ ''ڈاکٹر صاحب! آپ یہاں کیسے دکھائی دے رہے ہیں؟ کیا کوئی بیمار ہے؟'' میں نے مسکرا کر کہا اور ان سے مصافحہ کیا۔ غالباً ان کی آواز اب تک میری سماعت سے ٹکراتی رہی تھی۔

''میں تمہارے ہی لیے آیا ہوں۔'' انہوں نے جوابی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''مجھے تمہاری بیوی نے ہوٹل سے فون کر دیا تھا۔ جب میں وہاں پہنچا تو تم بے ہوش تھے۔ بہرحال ہم تمہیں اٹھا کر پریم نگر لے آئے۔ جب سے میں تمہارے ساتھ ہوں۔'' انہوں نے میری آستین اٹھا کر انجکشن کی سوئی میرے بازو میں لگا دی۔

''ہم سے آپ کی کیا مراد ہے؟'' میں نے استفسار کیا۔ ''میری بیوی نرگس کہاں ہے؟''

''ڈارلنگ! میں یہاں ہوں۔'' اس لڑکی نے ایک ادائے دلبری سے کہا اور مجھ پر جھکنے لگی۔ اب مجھے اس لڑکی سے خوف آنے لگا تھا جو خواہ مخواہ میرے گلے لگ رہی تھی۔ میرے اضطراب میں لحظہ بہ لحظہ اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ مجھے تو یہ تک معلوم نہیں تھا کہ وہ کون ہے اور کہاں سے آئی ہے!

''یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟'' میں نے ناک سکیڑتے ہوئے کہا۔ ''مجھے صحیح صحیح بتاؤ کہ نرگس کہاں ہے اور تم کون ہو؟''

''میں تمہاری بیوی نرگس ہوں۔'' اس نے لگاوٹ آمیز انداز سے کہا اور مجھ سے قریب تر ہوتی چلی گئی۔ اس کا یہ آزادانہ انداز مجھے پسند نہیں آیا۔

''ڈاکٹر صاحب! یہ کیا بکواس کر رہی ہے؟'' میں نے احتجاجی لہجے میں کہا اور ان کی طرف ملتجیانہ انداز سے دیکھا۔ وہ میرے ہیجان پر مسکرا رہے تھے۔ یقیناً وہ مجھے ذہنی مریض سمجھ رہے ہوں گے۔ ان کے اس انداز سے میں سہم گیا۔ یہ درست ہے کہ میں نے جلدی میں نرگس سے شادی کر لی تھی اور کسی کو اس کی اطلاع نہیں دے پایا تھا۔ اب وہ لڑکی میرے سر پر سوار ہو گئی تھی اور نہایت بے باکی سے خود کو میری بیوی بتا رہی تھی۔

''کام کی زیادتی نے تمہارے ذہن پر بُرا اثر ڈالا ہے۔'' ڈاکٹر گوپال نے سر کو خفیف سی جنبش دے کر کہا۔ ''چنانچہ تمہارا نروس بریک ڈاؤن ہو گیا ہے۔ اپنے کاروباری دورے پر تین ہفتے پیشتر روانہ ہونے سے پہلے تم ہی نے تو کہا تھا کہ اب لوٹو گے تو دُلہن کو ساتھ لے کر آؤ گے۔ تم دُلہن کے ساتھ تو واپس آ گئے ہو، لیکن تمہاری یادداشت میں کچھ نقص پیدا ہو گیا ہے۔ دماغ کا ایک حصہ کام نہیں کر رہا ہے۔ یہ وقتی بات ہے۔ میری دوا سے درست ہو جائے گا۔ تم کل مجھ سے ضرور ملاقات کر لینا۔'' انہوں نے یقین دہانی کرانے کے لیے میرے شانے پر تھپکی دی۔

میں تذبذب میں گرفتار ہو گیا۔ کیا وہ لڑکی واقعی میری بیوی ہے؟ مگر نہیں اس میں اور نرگس میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ تو پھر وہ کون تھی؟ میرا دماغ ایک بار پھر یادوں کے بھنور میں گرفتار ہو گیا۔ ذہن میں آندھیاں سی چلنے لگیں۔ بہت سے چہرے پس منظر سے پیش منظر میں آ رہے تھے اور آپس میں مدغم ہو رہے تھے۔ میں نے ڈاکٹر گوپال کا چہرہ پڑھ لیا تھا۔ وہ اس لڑکی کو میری بیوی سمجھ رہے تھے۔ صورتِ حال کچھ عجیب سی تھی کہ میں کوشش کے باوجود انہیں بتا نہیں پا

رہا تھا کہ حقیقت کیا ہے۔ وہ مجھے نرگس سمجھ رہے ہیں، وہ نرگس نہیں ہے۔

وہ لڑکی بستر سے اٹھ گئی۔ پھر اس نے اپنا چست لباس کھینچ کھانچ کر درست کیا اور میری طرف ایک قاتلانہ مسکراہٹ پھینکتے ہوئے بولی۔ ''ڈارلنگ! میں آنٹی کے پاس جارہی ہوں۔ اگر میری ضرورت پڑے تو آواز دے لینا۔'' اس کے بعد وہ اپنے سینڈلوں سے کھٹ کھٹ کرتی ہوئی آنٹی شکنتلا کے کمرے کی طرف چلی گئی۔

اس کے جانے کے بعد میں نے اطمینان کا گہرا سانس لیا۔

''تمہاری یادداشت رفتہ رفتہ درست ہوجائے گی۔'' ڈاکٹر گوپال نے کہا۔ ''اس لیے کہ تم بے ہوشی کے دوران میں نہ معلوم کیا کیا کچھ کہتے رہے ہو۔ اسے خود فراموشی کی کیفیت کہتے ہیں۔ میری دی ہوئی دوا پابندی سے استعمال کروگے تو سب ٹھیک ہوجائے گا۔''

''ڈاکٹر صاحب میری بات تو سمجھنے کی کوشش کیجیے۔ وہ میری بیوی نہیں ہے۔ کوئی فراڈ ہے۔'' میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''مجھے نرگس نے سب کچھ بتا دیا ہے۔'' ڈاکٹر رسانیت سے مسکرایا۔ ''تم نے اپنے کاروباری دورے کے دوران ایک پل بھی آرام نہیں کیا۔ تم صرف کام کرتے رہے۔ کیا تمہارے جسم کا تم پر کوئی حق نہیں ہے؟ اگر تم نے شادی کرہی لی تھی تو تمہیں چاہیے تھا کہ اپنی بیوی کے جذبات کا خیال کرتے ہوئے اس کے ساتھ بھی کچھ وقت گزارتے۔ یہ دیکھتے کہ تمہارے گرد کی دنیا میں کیا کچھ ہورہا ہے۔ پہاڑ، وادیاں، مرغزار اور باغوں میں کھلے ہوئے پھول تمہارے نزدیک کوئی اہمیت نہیں رکھتے؟ زندگی کے تو بہت سے پہلو ہوتے ہیں۔ روشن اور دل فریب۔ تم نے اس طرف دیکھنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ اب میں تمہیں تلقین کرتا ہوں کہ سب کچھ چھوڑ کر آرام کرو اور اپنی بیوی کی طرف توجہ دو۔ اس نے بھی تو کچھ سپنے دیکھے ہوں گے۔ ان سپنوں میں تمہیں رنگ آمیزی کرنا ہے۔'' اس نے کسی پروفیسر کی طرح مجھے چھوٹا سا لیکچر دیا۔

میں ایک ہوزری کی فیکٹری کا مالک تھا اور خود ہی سیلز مین۔ اس لیے مجھے سال کے ایک خاص مہینے میں انڈیا کے بڑے شہروں کا دورہ کرنا پڑتا تھا۔ میری فیکٹری کے تیار کیے ہوئے بنیائن، موزے اور انڈرویئر پسند کیے جاتے ہیں اس لیے ان کی مانگ ہے۔ میں دو ہفتے پہلے کاروباری دورے پر گیا تھا اور اس بار بھاری آرڈر لے کر آیا تھا۔ مگر ڈاکٹر گوپال تو کہہ رہے تھے کہ میں تین ہفتے پہلے گیا تھا۔ یہ کیا بوالعجبی تھی؟ میں نے ایک ہفتہ کہاں اور کس کے ساتھ گزارا تھا؟ میری زندگی کا وہ ایک ہفتہ کیسے گزر گیا کہ مجھے اس کی خبر ہی نہ ہوسکی؟

''تم نے اپنی شادی کے بارے میں کامنی کو تو بتا دیا ہوگا؟'' ڈاکٹر نے پوچھا۔

''نہیں۔'' میں نے آہستہ سے کہا۔ یہ جواب دیتے ہوئے مجھے پشیمانی سی ہورہی تھی۔ اس لیے کہ کامنی میری محبوبۂ دل نواز رہ چکی تھی۔ ہم نے ایک دوسرے کے شانے پر سر رکھ کر ساتھ مرنے اور جینے کی قسمیں کھائی تھیں۔ ممکن ہے کہ میں اس سے شادی کر لیتا، لیکن درمیان میں نرگس آگئی۔ میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ جو کچھ ہوا ٹھیک ہی ہوا اس لیے کہ میرا خیال ہے کہ بھگوان نے روئے زمین پر نرگس سے زیادہ خوب صورت اور سلیقہ مند لڑکی پیدا ہی نہیں کی تھی۔

''اسے بتادینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔'' ڈاکٹر نے کہا۔ ''ویسے تمہاری مرضی ہے۔ بہرحال اب تمہیں نرگس کا خیال تو رکھنا ہی ہے۔ اچھا اب میں چلتا ہوں۔'' اس نے اپنا بیگ اٹھایا اور وہاں سے چلا گیا۔

سبھاش انہیں گیٹ تک چھوڑنے گیا تھا۔

ڈاکٹر کے دیے ہوئے انجکشن نے کام کر دکھایا اور میں بہتری محسوس کرنے لگا۔ ریڑھ کی ہڈی کا درد غائب ہوچکا تھا۔ میں بغیر سہارے کے اٹھ کھڑا ہوا اور ٹوائلٹ میں چلا گیا۔ وہاں میں نے ہاتھ منہ دھویا اور بال سنوار کر آئینے میں اپنا جائزہ لیا۔ میرے چہرے پر کبیدگی اور تردّد تھا، گزرے ہوئے بے ہنگم اور منتشر واقعات کا عکس مترشح تھا۔ میں خوب صورت اور وجیہہ ہوں، مگر اس وقت مجھے اپنا چہرہ اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

''راجیش کیا تم ٹوائلٹ میں ہو؟'' اس لڑکی نے خواب گاہ سے پوچھا۔

''ہاں۔'' میں نے کہا اور وہاں سے نکل آیا۔ وہ میرے تکیے پر ٹیک لگائے نیم دراز تھی اور نسوانی حربے استعمال کر رہی تھی۔ میں نے اسے نظر انداز کر دیا اور قدرے ترش لہجے میں کہا۔ ''اب بتاؤ کہ نرگس کہاں ہے؟ اگر تم نے زبان نہیں کھولی تو میں تمہارے ساتھ بہت بُرا سلوک کروں گا۔''

وہ اٹھ کر بیٹھ گئی اور روہانسے لہجے میں بولی۔ ''راجیش،

تمہیں نہ جانے کیا ہو گیا ہے؟ تم نے مجھ سے ہی تو شادی کی ہے۔ میں ہی تو نرگس ہوں۔''

میں نے اس کے شانے تھام کر جھٹکے دیے تو اس نے ہار نہیں مانی اور اپنا وزن مجھ پر ڈال دیا اور میرے سینے سے آ لگی۔ میں اس عمل سے گھبرا گیا اور میں نے اسے پیچھے دھکیل دیا۔ پھر کرختگی سے پوچھا۔ ''تم نے آنٹی شکنتلا کو اپنے بارے میں کیا بتایا ہے؟''

''وہی جو سچ ہے۔'' اس نے بے چارگی سے کہا۔ ''انہوں نے جب یہ سنا کہ تم نے مجھ سے شادی کر لی ہے تو خوشی کا اظہار کیا اور یہ تجویز رکھی کہ اس خوشی میں سب دوستوں اور رشتے داروں کو بھی شریک کرنا چاہیے اور انہیں پارٹی دینا چاہیے، ممکن ہے کہ وہ صبح تم سے اس موضوع پر بات کریں۔''

میں نے اسے جھنجلاہٹ میں دھکا دیا تو وہ بستر سے گر پڑی۔ مگر اس کے انداز سے جھلاہٹ کا پرتو نہیں جھلک رہا تھا، اس کے بجائے اس کی آنکھوں میں دعوت تھی۔ دل لبھانے والے اشارے تھے۔ وہ لگاوٹ بھری نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ اس نے وہی پرفیوم لگا رکھا تھا جو نرگس لگایا کرتی تھی۔ ''پوائزن'' جو عام طور پر نہیں ملتا تھا۔ اس کے جسم پر نرگس کے کپڑے تھے جو بالکل فٹ آ رہے تھے اس لیے کہ وہ قد و قامت میں اسی جیسی تھی۔

مجھے کئی بار اپنی دماغی کیفیت پر شبہ ہوا کہ کہیں میں کسی واہمے کا شکار تو نہیں ہو گیا ہوں۔ ممکن ہے وہی میری بیوی ہو اور میرے دماغ پر کسی نامعلوم ہستی نرگس نے قبضہ جما لیا ہو؟

میں الماری کی طرف گیا اور میں نے اسے کھولا تو اندر وہی سوٹ کیس رکھا دکھائی دیا جو میں اپنے سفری دورے پر ساتھ لے گیا تھا۔ میں نے اس کی زپ کھولی تو اس میں نرگس کے کپڑے رکھے نظر آئے۔ اس کی شلواریں، جمپر، دوپٹے اور ساڑیاں، وغیرہ۔ اس کے علاوہ شادی کا... سرٹیفکیٹ بھی تھا۔ مجھے یاد ہے کہ جب شادی کے بعد میں نے جوہو کے ساحل پر ہوٹل ''راج کمار'' میں کمرا ایک کرایا تھا تو نرگس نے وہ سرٹیفکیٹ سنگار میز کے کلپ میں پھنسا دیا تھا۔ اس نے مجھے ہدایت کی تھی کہ میں اسے فریم کرا لوں، کیوں کہ وہ ایک یادگار چیز ہے۔

اس سرٹیفکیٹ کو دیکھ کر میرے دل سے ایک ہوک اٹھی۔ میں نے سوچا کہ اب یہ ڈراما ختم ہونا چاہیے۔ میں اس لڑکی کو زبان کھولنے پر مجبور کروں کہ وہ اپنی اصلیت سے آگاہ کرے۔ مگر اس کی ترکیب کیا ہو سکتی تھی؟ میں پولیس کو فون کر کے بتا دوں، لیکن کیا بتا دوں؟ خود کو سچا ثابت کرنے کے لیے میرے پاس کیا ثبوت تھا؟ میں کیسے کہتا کہ یہ لڑکی میری بیوی نہیں ہے؟ میرے پاس تو نرگس کی کوئی تصویر بھی نہیں تھی کہ پولیس کے سامنے پیش کرتا۔ یہ تو فلموں اور ناولوں والی بات ہوتی کہ میں کہتا کہ میری بیوی بدل گئی ہے۔ یہ لڑکی کسی سازش کی بنا پر میرے ساتھ چپکی ہوئی ہے۔

وہ لڑکی لگاوٹ بھرے انداز میں بولنے لگی۔ اس نے وہ ساری باتیں کیں جو میں نے نرگس سے کی تھیں۔ مجھے حیرت ہونے لگی کہ اسے وہ ساری ذاتی باتیں کیسے معلوم ہو گئی تھیں؟ کیا اس کا نرگس سے کوئی خاص تعلق تھا؟

مجھے جب اس لڑکی سے چھٹکارا پانے کی کوئی صورت دکھائی نہ دی تو میں دوبارہ باتھ روم میں چلا گیا۔ نرگس میرے حواسوں پر کچھ اس طرح سے چھائی ہوئی تھی کہ اس کا سراپا مجھے آئینے میں نظر آ رہا تھا۔ ایک ملکوتی سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر چھائی ہوئی تھی۔

میں نے گزرے ہوئے لمحات کو تازہ کیا۔ یاد آیا کہ ہوٹل ''راج کمار'' کا منیجر رام لعل میری مدد کر سکتا ہے۔ اس لیے کہ اس نے میرے لیے کمرا ایک کیا تھا اور اس نے نرگس کو اچھی طرح سے دیکھا تھا۔ اس کی یادداشت میں یقیناً نرگس کا سراپا محفوظ ہو گا۔ میں وہاں جا کر اپنی تحقیق کا آغاز کر سکتا تھا۔ میں نے اس خیال کے تحت اپنے کپڑے تبدیل کیے اور کمرے سے نکل آیا۔ وہ لڑکی کمرے سے جا چکی تھی۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا۔

اس کے علاوہ مجھے ایک بات اور یاد آئی کہ میں نے کرشن اسٹریٹ کے پوسٹ آفس سے اپنے سب سے بہترین دوست پردیپ کو خط لکھا تھا۔ جس میں اپنے سفر کی رُوداد، نرگس سے ملاقات اور اس سے شادی کا احوال اور سب ضروری اور غیر ضروری باتیں تحریر کی تھیں۔ وہ اتنا بے تکلف تھا کہ میں اس سے کوئی بات نہیں چھپاتا تھا۔ ہاں، یاد آیا کہ جب خط کے آخر میں چند سطریں بچ گئی تھیں تو میں نے نرگس سے کہا تھا کہ وہ بھی کچھ لکھنا چاہے تو لکھ سکتی ہے۔

نرگس نے مجھے اپنا جیون ساتھی تسلیم کرتے ہوئے اچھے مستقبل کی امید ظاہر کی تھی۔

میں نے سوچا اگر وہ خط مجھے مل جائے تو میں نرگس کی تحریر سامنے رکھ کر اس لڑکی کی تحریر سے ملا سکتا ہوں اور پھر اسے جھوٹا ثابت کر سکتا ہوں۔ اس خیال کے تحت میں نے

پردیپ کو فون کیا۔ مگر گھنٹی بجتی رہی اور کسی نے ریسیور نہیں اٹھایا۔

میں نے ریسیور کو کریڈل کر دیا تو مجھے اپنے دوست راجندر کا خیال آیا، جو محکمۂ پولیس میں ملازم تھا۔ میں نے سوچا کہ اسے ساری بات بتا کر لڑکی کو گرفتار کرا دوں۔ پھر وہی الجھن درپیش ہوئی کہ میں اس لڑکی کو فریبی اور مکار کیسے ثابت کروں گا؟ میرا اپنا کیس مضبوط نہیں تھا۔ میں نے سوچا کوئی کلیو مل جائے تو پھر اس سے بات کرنا مناسب ہوگا۔

میں اپنے کمرے سے نکل کر لاؤنج میں گیا تو میں نے کچن ٹیبل پر اس لڑکی کو آنٹی شکنتلا کے ساتھ چائے پیتے دیکھا۔ وہ ہنس ہنس کر لگاوٹ سے باتیں کر رہی تھی جس سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اس نے آنٹی کا دل مٹھی میں لے لیا ہے۔ جھوٹی اور پُرفریب باتیں کر کے اس نے ثابت کر دیا ہے کہ وہ میری بیوی نرگس ہے۔

آنٹی کی عمر چالیس برس کے لگ بھگ ہوگی۔ انہوں نے کسی نامعلوم مصلحت کی وجہ سے شادی نہیں کی تھی۔ وہ میرے پتاجی کی بہن تھیں اور انہیں ورثے میں ایک بڑی جائداد ملی تھی اور وہ اس بڑے مکان ''پریم نگر'' کی مالکہ تھیں۔ والدین کے انتقال کے بعد میرا کوئی ٹھکانا نہیں تھا چنانچہ میں بھی ان کے ساتھ ہی رہنے لگا تھا۔ میری وجہ سے انہیں اور ان کی وجہ سے مجھے سہارا مل گیا تھا۔

ان میں ایک عجیب سی بات تھی کہ جو بات ان کے دماغ میں بیٹھ جاتی تھی، وہ مشکل ہی سے نکلتی تھی۔ اگر وہ لڑکی انہیں یقین دلا چکی تھی کہ وہ میری بیوی ہے تو اب میرے لیے انہیں یہ یقین دلانا کہ وہ میری بیوی نہیں ہے، بے حد دشوار تھا۔

آنٹی نے میری طرف استفہامیہ نظروں سے دیکھا اور پیشانی پر سلوٹیں سجا کر کہا۔ ''راجیش! کہاں جا رہے ہو؟ کیا تمہیں ڈاکٹر کی نصیحت یاد نہیں ہے؟ اس نے آرام کرنے کو کہا تھا اور تم سیر کے لیے چل پڑے؟ یہ کیا مذاق ہے؟ چلو اپنی خواب گاہ میں جاؤ۔''

''آنٹی میں ایک گھنٹے میں آجاؤں گا۔'' میں نے مسکرا کر کہا۔ ''میں اب شادی شدہ ہوں۔ مگر آپ مجھے بچہ ہی سمجھتی ہیں۔''

''ہاں۔ تم میرے بچے ہی ہو۔'' انہوں نے تنبیہی انداز سے کہا۔ ''چنانچہ میں جو کچھ کہہ رہی ہوں، اس پر عمل کرو۔''

''میری طرف سے اتنا فکرمند نہ ہوں۔ ڈاکٹر نے مجھے پُراثر انجکشن لگایا ہے۔ اب میں خود کو چاق و چوبند پا رہا ہوں۔ اچھا اب میں چلتا ہوں۔ بائے۔''

میں لاؤنج سے نکل آیا اور آنٹی شکنتلا میری طرف تشویش سے دیکھتی رہ گئیں۔ جب میں نے دروازے کے ناب کو ہاتھ لگایا تو انہوں نے پیچھے سے کہا۔ ''تھوڑی دیر پیشتر کامنی کا فون آیا تھا۔ میں نے اسے خیریت سے آگاہ کر دیا ہے لیکن یہ نہیں بتایا کہ تم نے شادی کرلی۔۔۔''

وہ نام سن کر ایک بار پھر میرے جسم میں سنسنی دوڑنے لگی۔ تاہم میں اپنی کمزوریاں آنٹی پر ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا اس لیے دروازہ کھول کر باہر آگیا۔ پورچ میں جا کر میں نے چابی لگا کر اپنی کار کا دروازہ کھولا اور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد میں مرکزی سڑک پر جا رہا تھا اور میرے دماغ پر مختلف النوع خیالات کی یلغار تھی۔

جب میں ایک فلم اسٹوڈیو کے قریب سے گزرا تو میں نے وہاں خاصی ہلچل دیکھی۔ ممبئی میں دوسرے صوبوں سے نقل وحرکت کر کے آنے والوں کی کمی نہیں تھی اسی لیے وہاں کے فٹ پاتھ رات کو آباد ہوتے تھے۔ وہ سب جو وہاں آ کر آباد ہوتے تھے ان کے دل میں ایک ہی خواہش جاگزیں ہوتی تھی کہ وہ کسی طرح سے فلمی اداکار بن جائیں۔ اگر امیتابھ بچن نہ بن سکیں تو کم از کم گوندا ہی بن جائیں۔

جب ایسے لوگوں کو فلم انڈسٹری میں کام نہیں مل پاتا تھا تو وہ کسی مل میں کام تلاش کرنے لگتے تھے اور رات کو فٹ پاتھ پر سو جاتے تھے۔ جب سارے مسائل ممبئی حل کر دیتا تھا تو لوگ اس شہر کا رخ کیوں نہ کرتے؟

ہوٹل راج کمار جوہو کے ساحل پر واقع ہے اور اس کے چاروں طرف مغلیہ طرز کے باغات ہیں۔ اس کے گیٹ پر ہاتھی بندھا رہتا ہے اور اندرونی آرائش مشرقی انداز کی ہے۔ ویٹر شاہی خادموں جیسی پوشاک پہنتے ہیں اور داخل ہونے والے مہمانوں کو جھک کر فرشی سلام کرتے ہیں۔ اس کی اندرونی دیواروں پر مغلیہ فرماں رواؤں کی پینٹنگز لگی ہیں جن سے ان کے جاہ وجلال کا اندازہ ہوتا ہے۔

میں اس میں داخل ہونے کے بجائے سائیڈ والے راستے سے پارک میں چلا گیا۔ وہاں گھنے درختوں کی وجہ سے سایہ تھا اور ہوا مشامِ جاں کو معطر کرتی ہوئی چل رہی تھی۔ مناسب فاصلوں پر میزیں لگی ہوئی تھیں۔ میں ان میں سے ایک پر بیٹھ گیا۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں نرگس سے میری ملاقات ہوئی تھی۔ اس کی یاد آئی تو آتی چلی گئی۔

عالمِ تصور میں دیکھا کہ وہ برہنہ پا ریت پر چل رہی

ہے اور اس کے منہ سے مسرت آگیں آوازیں نکل رہی ہیں۔ اس کے نقشِ پا کو سمندر سے آنے والی شرارتی لہریں مٹا دیتی تھیں۔ میں اس نظارہ ہائے دل فریب میں کچھ اتنا کھو سا گیا کہ میں گرد و پیش کو فراموش کر بیٹھا۔ وہ واقعات جو ایک لڑی میں پروئے ہوئے تھے قطار در قطار میرے پردۂ تصور پر ابھر رہے تھے۔

مجھے یاد آنے لگا کہ جب میں ممبئی واپس آیا تھا تو سیدھا پریم نگر کی طرف جانے کے بجائے سی سائڈ کی طرف چلا آیا تھا۔ کیوں کہ مجھے ڈاکٹر گوپال کی ہدایت یاد تھی کہ میں کاروباری دورے سے واپس آنے پر خود کو آرام دوں۔ میرے جسم کا بھی مجھ پر حق ہے۔ پس میں نے ان ہدایت پر عمل کرتے ہوئے ہوٹل میں ایک کمرا بک کرایا اور اپنا سامان وہاں رکھ کر ساحل کے ایک بار میں چلا گیا تھا۔ اس بار کی آرائش بانس سے کی گئی تھی۔ بانس کی کھپچیاں در و دیوار پر نصب کی گئی تھیں اور ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے ہم کسی جھونپڑی میں بیٹھے ہوں۔

میں نے اپنے لیے وہسکی کا ایک پیگ منگوایا تھا اور اس کے دو چار گھونٹ لیے ہوں گے کہ میں نے ایک لڑکی کو پیراکی کے لباس میں سمندر کی طرف جاتے دیکھا۔ اس کی بغل میں ڈائیونگ بورڈ تھا۔ میں نے اپنا پیگ جلدی سے حلق میں انڈیلا اور بل ادا کر کے اس سمت میں گیا جہاں وہ گئی تھی۔ وہ پیراکی کرنے سے پہلے ڈائیونگ بورڈ پر بیٹھی اپنے جسم پر لوشن مل رہی تھی۔ سورج کی کرنوں میں اس کا جسم دمک رہا تھا۔

''ہیلو۔'' میں نے آہستہ سے سیٹی بجا کر کہا۔

اس نے میری طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا اور اپنے کام میں مصروف رہی۔

''سنو! میں اس دنیا میں تنہا ہوں اور میرے من کا کاغذ ابھی کورا ہے۔ کہو تو اس پر تمہارا نام لکھ دوں؟''

''اس دنیا میں سب ہی تنہا ہیں، مسٹر۔'' اس نے میری طرف ایک نگاہِ غلط انداز اچھالتے ہوئے کہا۔

اس کا جواب عامیانہ نہیں بلکہ فلسفیانہ تھا۔ جس سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ عام سی لڑکی نہیں ہے۔ وہ ان لڑکیوں میں شامل تھی جو انسان کی ذات کی تکمیل کر دیتی ہیں۔ میں اس سے بات کرنے کی کوشش کر رہا تھا مگر وہ درخورِ اعتنا نہیں سمجھ رہی تھی۔ ''ٹھیک ہے، اگر تمہیں میری موجودگی گوارا نہیں ہے تو میں چلا جاتا ہوں۔'' میں نے مایوسی سے کہا۔

''بیٹھ جاؤ۔'' اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔

میں اس کے نزدیک بیٹھ گیا۔ سوچا وقت گزاری کے لیے پہلے اپنا تعارف کراؤں اور اس کے بعد اس کے کوائف حاصل کروں۔ یہی ایک طریقہ تھا جس سے میں دائرۂ شناسائی میں داخل ہو سکتا تھا۔ میں نے اسے اپنے بارے میں بتانا شروع کر دیا۔ تھوڑی دیر بعد احساس ہوا کہ میں

یقین

عینک ساز۔ ''آئیے...... آئیے! جناب آپ کو کس قسم کی عینک لگوانی ہے؟''

گاہک۔ ''آپ کو کیسے اندازہ ہوا کہ مجھے عینک لگوانی ہے۔''

عینک ساز۔ ''اندازہ نہیں سر...... مجھے تو آپ کو دیکھتے ہی یقین ہو گیا تھا کہ آپ کو عینک کی ضرورت ہے۔ کیونکہ آپ دروازے کے بجائے کھڑکی کے راستے اندر آئے ہیں۔''

درویش

ایک شخص نے تین مچھلیاں پکڑیں، ان میں سے دو بڑی تھیں اور ایک چھوٹی۔ اس شخص نے دو بڑی مچھلیوں کو عمدہ چارا دے کر پانی میں اچھال دیا اور چھوٹی مچھلی کو باسکٹ میں ڈال لیا۔ قریب ہی ایک بوڑھا شخص یہ تماشا دیکھ رہا تھا، اس نے اس کا سبب پوچھا تو اس شخص نے کہا۔

''پبلسٹی کا دور ہے بڑے میاں۔ اب وہ دونوں مچھلیاں دوسری بڑی مچھلیوں کو بتائیں گی کہ اچھا چارا بلا قیمت ملتا ہے۔ میں دراصل بڑی مچھلیوں کے چکر میں ہوں۔''

تیاری

ایک لڑکے نے اپنے دوست کو فون کیا۔ دوسری جانب سے اس لڑکے کی بہن نے جواب دیا۔ ''زوہیب اس وقت آپ سے بات نہیں کر سکتا۔ وہ اسکول جانے کے لیے تیار ہو رہا ہے۔ وہ ناشتا کر رہا ہے۔ دادی اماں اس کے بالوں میں کنگھی کر رہی ہیں، بہن میز کے نیچے گھسی اسے جوتے پہنا رہی ہے۔ ماں اس کی کتابیں اور کاپیاں اکٹھی کر رہی ہیں اور معاف کرنا اسکول کی بس آ رہی ہے۔ مجھے زوہیب کے باہر جانے کے لیے دروازہ بھی کھولنا ہے، اوکے بائے......''

لاہور سے عبدالجبار رومی انصاری کی سوغات

بے تکان بول رہا ہوں۔ میں نے اپنی زندگی کے پردہ ہائے راز افشا کر دیے ہیں اور اب میرے پاس بتانے کو کچھ نہیں رہا ہے۔ سو میں خاموش ہو گیا۔ مناسب یہ تھا کہ اب اس اپسرا کا تعارف حاصل کیا جائے۔ میں نے چند لمحوں کے بعد سوال کیا۔ ''کیا تم اپنے خاندان کے ساتھ رہتی ہو؟''

''نہیں۔'' اس نے مختصراً کہا۔

''ممبئی میں کام کرتی ہو؟''

''نہیں۔'' اس نے مسکرا کر کہا۔

اس کی مسکراہٹ میرے لیے حوصلہ افزا تھی۔ میں اس کے مزید قریب ہو گیا۔ اس نے باتیں شروع کر دیں۔ وہ شام ہم نے اکٹھا گزاری۔ پھر ایسی کئی اور شامیں ہماری زندگی میں آئیں۔ ایک ہفتے کے بعد میں نے محسوس کیا کہ میں اس کی الفت میں گرفتار ہو چکا ہوں۔ دلچسپ بات یہ کہ وہ ہر شام مجھ سے وہیں ملا کرتی تھی۔ اس نے مجھے اپنا پتا نہیں بتایا تھا۔ میں نے پوچھنے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔

عالمِ سرشاری میں ایک روز خیال آیا کہ اب کاروبارِ حیات میں دلچسپی لینا چاہیے۔ میں تو یہاں وقت گزاری کے لیے آیا تھا اور یہیں کا ہو کر رہ گیا۔ اب اپنے آشیانے کی طرف چلنا چاہیے۔ ساری دنیا کو چھوڑ کر اس پری پیکر کے تعاقب میں چل دینا مناسب نہیں ہے۔ اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا۔

اس شام میں نے ایک ڈانس فلور پر رقص کے دوران میں اس سے جب یہ کہا کہ اب وقتِ جدائی آ پہنچا ہے تو اس نے میرے سینے میں منہ چھپاتے ہوئے کہا۔ ''مگر میں تو جدائی کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ میرا خیال ہے کہ میں تمہاری محبت میں گرفتار ہو چکی ہوں۔''

''میرا بھی کچھ یہی خیال ہے۔'' میں نے مسکرا کر کہا۔ ''کیوں نہ ہم شادی کر لیں۔ اس لیے کہ محبت کرنے والے ایک ہونا چاہتے ہیں۔''

اس نے میرے شانے پر سر رکھ کر اثبات میں سر ہلا دیا۔

پھر میں نے اس سے شادی کر لی۔ اس کے بعد جو کچھ پیش آیا، وہ میں پیشتر بیان کر چکا ہوں۔ کرب کی ایک ٹیس میرے سینے میں اٹھی۔ اس سے جدائی کا خیال بھی سوہانِ روح تھا۔ مجھے پسینا آنے لگا۔ میں تھوڑی دیر بعد وہاں سے اٹھا اور ہوٹل میں داخل ہو گیا۔ منیجر رام لعل کے کمرے میں داخل ہونے کے لیے ہال سے گزرنا پڑا۔ جب میں اس کے آفس میں داخل ہوا تو وہ کاغذات الٹ پلٹ رہا تھا۔ مجھ پر نظر پڑی تو اس نے مجھے پہچان لیا اور نشست پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ''اب تو آپ کی طبیعت بہتر معلوم ہوتی ہے۔'' اس نے خوش اخلاقی سے کہا۔

''کیا مطلب؟'' میں چونکا۔

''مطلب یہ کہ جب آپ اپنی شریمتی جی کے ساتھ آئے تھے تو نشے میں مدہوش تھے اور آپ سے بات نہیں کی جا رہی تھی۔'' اس نے وضاحت کی۔

''آج جب میں یہاں سے رخصت ہو رہا تھا تو کیا وہی عورت میرے ساتھ تھی جو میری بیوی کی حیثیت سے یہاں آئی تھی؟'' میں نے سوال کیا۔

''ہاں، بالکل وہی تھی۔'' اس نے مسکرا کر کہا۔ ''آپ اتنی جلدی دوسری عورتوں کے ساتھ کیسے گھوم سکتے ہیں؟''

اس کا جواب سن کر میں تذبذب میں گرفتار ہو گیا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے اسے کسی نے سکھا پڑھا رکھا ہے اور وہ دوسروں کی زبان بول رہا ہو۔ بہرحال میں اسے سچ بولنے پر مجبور نہیں کر سکتا تھا اس لیے مایوس ہو کر ہوٹل راج کمار سے نکل آیا۔ جب میں اپنی کار کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا تو کچھ میں نہیں آیا کہ اب کدھر جانا چاہیے اور نرگس کو کہاں تلاش کرنا چاہیے؟

مایوسی سے نجات پانے کے لیے میں نے ایک بار کے قریب کار روکی اور ایک پیگ وہسکی حلق سے اتاری اس کے بعد راجندر کو فون کیا۔ فون اس کی بیوی نے اٹھایا۔ اس نے میری آواز پہچان لی اور بتایا کہ راجندر ایک کام سے گیا ہوا ہے اور ایک گھنٹے بعد پولیس ہیڈ کوارٹر پہنچے گا۔

کھانے کا وقت ہو گیا تھا اس لیے میں ایک ریستوراں ''بلیک کوئن'' میں چلا گیا۔ مالابار اسٹریٹ پر وہ ایک اچھا ریستوراں تھا جہاں ذائقے دار بھیل پوری ملتی تھی۔ میں جب ہلکا لنچ کرنا چاہتا تھا تو بھیل پوری کھا لیتا تھا۔

جب میں لنچ کر رہا تھا تو نرگس کے بارے میں سوچنے لگا کہ اگر راجندر نے اس کا اتا پتا پوچھا تو میں کیا بتاؤں گا؟ حقیقت یہ تھی کہ میں اس کی اصل عمر اور اس کے والدین سے بھی واقف نہیں تھا۔ شادی کے سرٹیفکیٹ میں اس نے جو کچھ لکھوایا تھا وہ درست تھا یا نادرست، میں اس کے بارے میں کچھ نہیں بتا سکتا تھا۔

مجھے یاد آیا کہ جب میں اپنی شادی کا جشن ''سن اینڈ سی'' میں منا رہا تھا تو ایک آدمی ہماری میز پر آ گیا تھا جس کے رخسار پر زخم کا گہرا سا نشان تھا اور سب سے نمایاں اس کی ناک تھی جو طوطے کی چونچ کی طرح نوکدار اور مڑی ہوئی تھی۔

اس نے بتایا کہ اس کی بیوی مدراس چلی گئی ہے اس

لیے وہ بہت اداس ہے۔ یہاں اس کا کوئی شناسا نہیں ہے اس لیے ہماری میز پر آگیا ہے۔ میں نے کہا تھا کہ کوئی بات نہیں وہ ہماری خوشیوں میں شریک ہوسکتا ہے اور اپنی تنہائی دور کرسکتا ہے۔ حالانکہ اس کا چہرہ خوشنما نہیں تھا مگر وہ مجھے بے ضرر سا انسان معلوم ہوا۔

لنچ کرنے کے بعد میں نے راجندر کو فون کیا تو اس کے نائب نے سلسلہ ملا دیا۔ میں نے کہا۔ ''راجندر! میرے دوست میں بہت پریشان ہوں۔ میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔''

''ملاقات ایک گھنٹے کے بعد ہوسکتی ہے۔'' اس نے تحمل سے جواب دیا۔ ''گاندھی اسکوائر پر پہنچ کر دائیں جانب مڑ جانا، وہاں ایک بار ہے، گوگو۔ میں وہاں تمہیں منتظر ملوں گا۔''

میں نے ہاں تو کردیا تھا، لیکن یہ سوچ کر ایک بار پھر گومگو میں مبتلا ہوگیا کہ اب ایک گھنٹا کہاں گزاروں؟ یاد آیا کہ کامنی کی طرف چلنا چاہیے۔ ویسے تو اب اس سے کچھ کہنے اور سننے کو کچھ نہیں رہا تھا۔ اس لیے کہ ہم نے اسکول کے زمانے سے ساتھ رہنے کی قسمیں کھائی تھیں اور ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر ممبئی کے ساحلوں پر گھوما کرتے تھے، لیکن جب میں کاروباری دورے پر لندن گیا تھا اور وہاں سے واپس آیا تھا تو میں نے محسوس کیا تھا کہ وہ کھنچی کھنچی سے رہنے لگی ہے اور مجھ سے بات کرنے سے اجتناب برت رہی ہے۔

ممکن ہے اس کی وجہ یہ ہو کہ میں نے لندن جانے سے پہلے اس کا اظہار کیا تھا اب ہم دونوں شادی کرلیں گے لیکن میری مصروفیات کی وجہ سے معاملہ التوا میں پڑ گیا۔ بہرحال واپس آنے کے بعد بھی جب ایسی کوئی بات نہیں ہوئی تو وہ مایوس ہوگئی۔ جب کہ میں اپنے کاروبار کو لندن تک پھیلانا چاہتا اور اس کے بعد شادی کے جھمیلوں میں پڑنا چاہتا تھا۔ اس لیے ٹھہر گیا تھا۔ میں نے اسے آگاہ کردیا تھا، لیکن وہ نہ مانی اور اس نے مجھ سے قطع تعلق کرلیا۔

میں نہرو ہال کے قریب اس کے اپارٹمنٹ پر پہنچا اور اطلاعی گھنٹی بجائی۔ دروازہ اسی نے کھولا تھا۔ میں اسے دیکھ کر مبہوت رہ گیا۔ دل اسے دیکھ کر بے ترتیبی سے دھڑکنے لگا۔ ''کامنی! کیا میں اندر آسکتا ہوں؟ میرے پاس وقت کم ہے۔'' میں نے مہمل سا جملہ ادا کیا۔ یاد آیا کہ میری بے ہوشی کے دوران اس کا فون آیا تھا اس کے بارے میں پوچھنا چاہیے تھا۔ ''مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنا ہے۔''

''اب کہنے کے لیے کیا رہ گیا ہے؟'' اس نے مایوسی سے کہا۔

''تم نے مجھے فون کیا تھا؟ تم کیا کہنا چاہتی تھیں؟''

''بس ایسے ہی۔ غالباً میں ہیجان کا شکار تھی۔'' وہ بولی اور دروازہ بند کرنے لگی تو میں نے اپنا پاؤں اڑا دیا۔

''کامنی! میں نے شادی کرلی ہے۔'' میں نے سرگوشی میں کہا۔

''مبارک ہو۔'' اس نے کہا اور جھٹکے سے دروازہ بند کرلیا۔ اندر سے اس کی چھوٹی بہن اور ماں کی آواز آرہی تھی۔ میں چند لمحوں تک وہاں کھڑا رہا اور اس کے بعد چلا آیا۔

☆☆☆

جب میں ''گوگو'' میں داخل ہوا تو میں نے راجندر کو دائیں گوشے کی ایک میز پر بیٹھا دیکھ لیا۔ وہ اپنے حلق سے بیئر اتار رہا تھا۔ وہ اسکاٹ لینڈ کی بہترین بیئر تھی۔ جو گوگو والے خاص طور پر اسکاٹ لینڈ سے درآمد کرتے تھے۔ جب میں بیٹھ گیا تو اس نے میرے لیے بھی ایک بوتل کا آرڈر دے دیا اور سگریٹ سلگا کر پوچھا۔ ''کیا بات ہے راجیش تم کیوں پریشان ہو؟ کاروبار میں کوئی الجھاوا ہے یا ممبئی کی انڈرورلڈ نے بھاری رقم کا مطالبہ کردیا ہے؟''

''نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔'' میں نے پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''تو پھر کیا بات ہے؟ خطۂ سرطان خطۂ جدی میں گھس گیا ہے؟'' اس نے شگفتگی سے کہا۔

''بات کچھ ایسی ہے کہ تمہیں میری ذہنی حالت پر شبہ ہونے لگے گا مگر......''

''تم اس کی پروانہ کرو۔'' وہ بولا۔ ''دیوانہ تو میں تمہیں اب بھی سمجھتا ہوں۔'' وہ مسکرایا۔

میں نے اسے وہ کچھ سنا دیا جو مجھ پر گزری تھی۔ پھر اس کے چہرے پر ردعمل تلاش کرنے لگا۔

''ہوں۔ کافی سنسنی خیز کہانی ہے۔ بالکل کسی ڈائجسٹ کا شاہ کار لگتی ہے۔ اچھا یہ بتاؤ کہ تمہارا فیملی ڈاکٹر کیا کہتا ہے؟ میرا خیال ہے کہ اس کا نام گوپال ہے؟''

''ہاں۔ وہ وہی کچھ کہہ رہا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے لڑکی کا ساتھ دے رہا ہو۔ میرا مطلب ہے کہ مجھے ایسا لگ رہا ہے۔ لڑکی نے اسے جوہو کے ساحل پر واقع ہوٹل راج کمار میں بلایا تھا۔ راجندر! میرے دوست اس حرافہ لڑکی کو وہ سب باتیں معلوم ہیں جو نرگس کو معلوم ہیں۔ بے حد ذاتی قسم کی باتیں۔''

''کیا اس کی شکل نرگس سے مشابہ ہے؟''

”نہیں، البتہ اس کے بال بالکل ویسے ہی ہیں۔“
”ممکن ہے اس نے انہیں رنگ لیا ہو۔“
”میں اس بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ہوٹل کا منیجر رام لعل کا کہنا ہے کہ جب میں اس ہوٹل سے جا رہا تھا تو اپنی بیگم نرگس کے ساتھ وہاں سے رخصت ہوا تھا۔“
”بہرحال تم نے نرگس کے ساتھ کافی وقت گزارا ہے، یہ بتاؤ کہ آخری بار کیا ہوا تھا؟“
”آخری بار ہم ایک ہوٹل میں بیٹھے تھے کہ اچانک ایک شخص آ گیا اور ہمارے ساتھ شریک ہو گیا۔ اس کے رخسار پر زخم کا ایک لمبا سا نشان تھا اور ناک طوطے کی طرح مڑی ہوئی اور لمبی تھی۔ اس کے بعد کیا ہوا، مجھے معلوم نہیں۔“ میں نے جواب دیا۔
”جس جج کے سامنے تمہارا نکاح ہوا تھا اگر وہ بھی یہ کہہ دے کہ جو لڑکی تمہارے ساتھ ہے، وہ تمہاری بیوی نرگس نہیں ہے تب بھی کوئی فرق نہیں پڑتا، اس لیے کہ جب تک تم اپنی حقیقی بیوی نرگس کا سراغ نہیں لگا لو بات نہیں بنے گی۔“ راجندر بولا۔
”تم ٹھیک کہتے ہو۔“ میں نے مردنی سے کہا۔
”وہ طوطے کی ناک والا اگر دوبارہ تمہارے سامنے آیا تو کیا تم اسے پہچان لو گے؟“
”ہاں۔“ میں نے یقین سے کہا۔
”تمہارا کیس عجیب سا ہے۔“ اس نے بیئر کا ایک گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ ”نرگس کو کوئی نہ کوئی تو جانتا ہوگا۔ اگر اس کے والدین نہیں تھے تو خالہ خالو، چچا چچی یا ماموں ممانی تو ہونا چاہئیں۔ پھر یہ کہ اس کے بھائی بہن یا کزن تو ہوں گے یا وہ دنیا میں یک و تنہا تھی؟ اسے تلاش بھی کیا جا سکتا ہے لیکن یہ بھی پتا لگانا ہے کہ دوسری لڑکی کون ہے؟ اس کا پس منظر کیا ہے؟“
میں خاموش رہا اس لیے کہ میں کوئی سراغ رساں تو تھا نہیں کہ گتھیاں سلجھاتا ہوا مجرموں کے ٹھکانے تک پہنچ جاؤں۔
”جن لوگوں نے دوسری لڑکی کو تمہارے سر پہ مسلط کیا ہے انہوں نے ہی نرگس کو غائب کیا ہے۔ اگر وہ اسے چھوڑیں گے تو ساری بات عیاں ہو جائے گی۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کتنے عرصے تک اسے دنیا کی نگاہوں سے چھپائے رکھیں گے۔ ممکن ہے اسے ختم ہی کر ڈالیں؟“ راجندر بولا۔
میرے رگ و پے میں سنسنی دوڑنے لگی۔ میں نے اس پہلو پر تو غور ہی نہیں کیا تھا۔
”اس دوسری لڑکی کے انگلیوں کے نشانات تم مجھے حاصل کر کے دے دو۔ اس کے لیے گلاس مناسب رہے گا۔ وہ جس گلاس میں پانی پیے اسے کاغذ میں لپیٹ کر مجھے دے دینا۔ میں انگلیوں کے ان نشانات کو چیک کروں گا۔ ممکن ہے وہ کسی ریکارڈ میں مل جائیں۔ اچھا اب میں چلتا ہوں۔“ اس نے اپنا گلاس خالی کر کے میز پر رکھا اور کھڑا ہو گیا۔
”تم اس کیس کی باقاعدہ رپورٹ درج کرو گے؟“ میں نے سوال کیا۔
”ابھی تو میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔ جب یہ کیس معلوم ہوگا تو دیکھا جائے گا۔ ہاں تم نے کہا تھا کہ پوسٹ آفس سے تم نے اپنے دوست پردیپ کو خط لکھا تھا۔ جس کی چند سطریں نرگس نے بھی لکھی تھیں۔ اگر وہ خط مل جائے تو ہم کامیابی کی راہ پر لگ سکتے ہیں۔“ اس نے مجھ سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ ”میں ڈاکٹر گوپال کو بھی چیک کروں گا۔“
”میں اب پردیپ کے پاس جا رہا ہوں۔“ میں نے اسے بتایا۔
جب وہ چلا گیا تو میں نے بھی اپنا گلاس خالی کر کے میز پر رکھا اور بار سے نکل آیا۔ اس لیے کہ بل راجندر نے ادا کر دیا تھا۔ وہ پولیس والا تھا مگر اس کی خصلتیں ان سے مختلف تھیں۔
سورج غروب ہو چکا تھا اور اسٹریٹ لائٹس روشن ہو گئی تھیں۔ میں نصف گھنٹے میں پردیپ کے مکان پر پہنچ گیا۔ اس کے دروازے پر لگی اطلاعی گھنٹی بجائی لیکن کسی نے کوئی جواب ہی نہیں دیا۔ مجھے بہت مایوسی ہوئی، نہ معلوم کہاں چلا گیا تھا۔ اپنی کار کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھنے کے بعد میری سمجھ میں نہ آیا کہ اب کیا کرنا چاہیے؟
یہی بہتر معلوم ہوا کہ میں اپنے مکان پریم نگر واپس چلا جاؤں۔ میں نے کار اسٹارٹ کی اور شاہراہ اندرا گاندھی پر چلنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد احساس ہوا کہ میرا تعاقب کیا جا رہا ہے۔ میں نے ڈاج دینے کے لیے کار کو سائڈ روڈ پر موڑ دیا، جس کا نام شاستری گارڈن روڈ تھا۔ اب میں کہاں جا رہا تھا مجھے خود پتا نہیں تھا۔ مجھے یک گونہ اطمینان ہوا کہ میں اب تک واہموں میں مبتلا نہیں تھا۔ کوئی حقیقت میں میرے پیچھے پڑا ہوا تھا۔
میں نے اس کار کو ڈاج دینے کے لیے مختلف راستے اختیار کیے لیکن پیچھے والی کار سے نجات حاصل نہ کر سکا۔ پھر خیال آیا کہ اس شخص کا چہرہ دیکھنے کی کوشش کرنا چاہیے جو میرا تعاقب کر رہا۔ اس کی تکنیک یہی ہو سکتی تھی کہ میں اپنی کار کی

رفتار اچانک کم کر دوں۔ دوسری کار لامحالہ مجھ سے آگے نکل جائے گی۔ ہوا بھی یہی، جب میں... ایک کھمبے کے نیچے ٹھہر گیا تو دوسری کار تیزی سے آگے چلی گئی۔ مگر اس کی رفتار اتنی تیز تھی کہ میں یہ دیکھنے سے قاصر رہا کہ اس کی ڈرائیونگ سیٹ پر کون ہے یا کار کا نمبر کیا ہے۔ نا معلوم کیوں ایک شبہ سا تھا کہ اسے طوطے کی ناک والا ڈرائیو کر رہا ہے۔ غالباً مجھے اس کے رخسار پر زخم کا نشان بھی نظر آیا تھا۔

اب میں نے اس کار کا تعاقب شروع کر دیا۔ لیکن آگے جا کر جہاں سے سڑک دو طرفہ ہو جاتی تھی، اس کی ٹیل لائٹس غائب ہو گئیں۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کس راستے پر چلی گئی؟

میں نے محسوس کیا کہ میں بری طرح سے تھک گیا ہوں۔ اس لیے مجھے پریم نگر جانا چاہیے۔ میں نے کار کو دوسرے راستے پر موڑا اور آگے جا کر جب پتا چلا کہ میں ابوالکلام ایونیو پر ہوں تو میں دائیں طرف مڑ گیا اور پریم نگر پہنچ گیا۔ اپنی خواب گاہ میں جانے کے بجائے میں لاؤنج میں پڑے ہوئے صوفے پر لیٹ گیا اور میں نے آنکھیں بند کر لیں۔

آہٹ سن کر تھوڑی دیر بعد آنٹی شکنتلا آ گئیں۔ انہوں نے میرے سر پہ ہاتھ پھیرا تو میں نے آنکھیں کھول دیں۔ انہوں نے محبت آمیز لہجے میں کہا۔ ''تم کافی تھکے ہوئے معلوم ہوتے ہو، اب تک کہاں آوارہ گردی کرتے رہے؟ کہو تو چائے بنا دوں؟'' میں نے نفی میں سر ہلایا تو انہوں نے کہا۔ ''تم اپنی خواب گاہ میں نرگس کے پاس کیوں نہیں جاتے؟''

''میں یہیں ٹھیک ہوں۔'' میں نے ترش لہجے میں کہا۔

''ڈاکٹر گوپال تمہاری غیر موجودگی میں آیا تھا۔ اس نے گولیوں کی یہ شیشی دی ہے اور کہا ہے کہ اگر نیند نہ آئے تو اس کی دو گولیاں کھا لینا۔'' انہوں نے کہا اور دوا کی شیشی تھما کر وہاں سے اپنے کمرے کی طرف چلی گئیں۔

ان کے جانے کے بعد پھر سناٹا طاری ہو گیا۔ سمجھ میں نہیں آیا کہ میں پریم نگر سے کتنی دیر کے لیے باہر رہا ہوں۔ میں نے راجندر سے ملاقات میں وقت نہیں گزارا تھا بلکہ انتظار میں وقت گزر گیا تھا۔ سوچا کہ پردیپ کو فون کرنا چاہیے۔ ہوسکتا ہے کہ وہ جہاں گیا تھا وہاں سے واپس آ گیا ہو۔

اس کے نمبر ڈائل کرنے کے بعد مجھے ریسیور کافی دیر تک کان سے لگائے رکھنا پڑا۔ اس کی غنودہ آواز آئی۔

''ہیلو؟''

''میں راجیش بول رہا ہوں۔ تم کہاں چلے گئے تھے؟''

''میں امیتابھ بچن کی نئی فلم کا آخری شو سمیتا کے ساتھ دیکھنے چلا گیا تھا۔''

''پردیپ تمہیں وہ خط یاد ہے جو میں نے اپنی آمد کے فوراً بعد لکھا تھا؟''

''ہاں۔''

''کیا وہ خط تم مجھے واپس دے سکتے ہو؟''

''ارے! اس کی کیا ضرورت پڑ گئی؟'' وہ ہنس کر بولا۔ ''یہ میں نے پہلی بار سنا ہے مکتوب الیہ کو خط واپس کیا جائے۔''

''اس کی ضرورت پڑ گئی ہے۔ اسے تلاش کر کے بتاؤ۔''

یقیناً وہ طوعاً وکرہاً اپنے بستر سے اٹھا ہوگا۔ تھوڑی دیر بعد کاغذ کی سرسراہٹ سنائی دی۔ پھر اس کی آواز آئی۔ ''لفافہ تو مل گیا ہے۔ لیکن خط ندارد ہے۔ معلوم نہیں کہاں گیا؟ ہوسکتا ہے سمیتا کو معلوم ہو۔ صبح اس سے پوچھ کر بتاؤں گا۔''

صوفے پر لیٹنے کی وجہ سے گردن میں درد ہونے لگا تھا، اس لیے میں اپنی خواب گاہ میں چلا گیا۔ وہ پُراسرار لڑکی وہاں نہیں تھی۔ میں نے بستر پر گر کر آنکھیں بند کر لیں۔ تھوڑی دیر بعد نرگس کا چہرہ دکھائی دیا۔ وہ باہیں پھیلا کر مجھے بلا رہی تھی۔ میں دوڑ کر اس کی طرف چلا گیا۔ میں نے اسے اپنی بانہوں میں لے لیا۔ جذبے بے لگام ہوئے تو سارا حجاب جاتا رہا۔ ہمیں بے قابو ہوتے دیر نہ لگی۔

تھوڑی دیر بعد مجھے ہوش آیا تو میں نے کھلی آنکھوں سے دیکھا کہ وہ تو وہی لڑکی ہے جسے میں نے حقارت سے کئی بار ٹھکرایا تھا۔ وہ آنکھیں بند کیے آسودگی سے لیٹی تھی اور گہرے گہرے سانس لے رہی تھی۔ میں گم صم تھا کہ یہ کیا ہوا؟ وہ لمحہ کب وارد ہوا جب وہ میری خواب گاہ میں داخل ہوئی۔ میں نے لباس پہنا اور دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

رونگٹے کھڑے ہو رہے تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ میں نے یہ کیا کر دیا؟ اس بنیاد پر تو وہ لڑکی مجھے بلیک میل کر سکتی تھی۔

میں بستر پر لیٹ گیا۔ بہت دیر بعد اطلاعی گھنٹی بجنے کی آواز آئی۔ بہت خفیف سی۔ میں نے کھڑکی کھول کر دیکھا۔ پورچ میں ایک اور کار کھڑی تھی۔ صبح کے چار بج

رہے تھے۔ میں نے سوچا اس وقت کسی کو ملاقات کی کیا پڑ گئی۔ میں کمرے سے نکل کر پورچ میں گیا تو میں نے انسپکٹر راجندر کو کھڑے دیکھا۔

''خیریت؟ اس وقت کیسے زحمت فرمائی؟''

''جوہو کے ساحل سے ذرا ہٹ کر ایک لڑکی کی لاش ملی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم اسے دیکھ لو اس لیے کہ متوفی کے سر کے بال سنہری ہیں۔''

یہ اطلاع پا کر میرا دل جیسے اچھل کر حلق میں آ گیا۔ دھڑکن سماعت میں سنائی دینے لگی۔

☆☆☆

ہم سرد خانے میں پہنچے تو لاش ایک چبوترے پر رکھی نظر آئی۔ وہ سفید کپڑے سے ڈھکی ہوئی تھی۔ ڈاکٹر کی رپورٹ کے مطابق اسے ہلاک کرنے سے پہلے اس پر تشدد کیا گیا تھا۔ اس کے ہاتھ کی انگلیوں کے ناخن توڑ دیے گئے تھے۔ راجندر نے لاش کے چہرے سے کپڑا ہٹایا تو میری دنیا جیسے تاریک ہو گئی۔ اگر اس نے مجھے سنبھال نہ لیا ہوتا تو میں غالباً فرش پر گر جاتا۔

میں سیکڑوں کیا ہزاروں اور لاکھوں میں پہچان سکتا تھا کہ وہ ساکت وصامت لاش میری بیوی نرگس کی ہے! اس کی پھٹی پھٹی سی آنکھیں مجھ سے سوال کر رہی تھیں۔ میری آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ انسپکٹر کو سمجھنے میں دیر نہ لگی۔ وہ جو کچھ پوچھنا چاہتا تھا اس کا جواب اسے مل چکا تھا۔

''ہاں۔ یہ نرگس ہے۔'' میں نے جیسے سرگوشی میں کہا۔ لفظ میرے حلق میں اٹک رہے تھے۔

میں مردہ خانے سے نکل کر آفس میں چلا گیا اور وہاں ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد انسپکٹر راجندر آ گیا۔ میں نے کہا۔ ''اب تو تمہیں کوئی شبہ نہ رہا ہوگا کہ میرے خلاف سازش ہو رہی ہے؟ تم اس لڑکی کو گرفتار کر لو گے نا؟''

''نہیں، میرے دوست اب تو یہ ثابت کرنا بے حد دشوار ہو گیا ہے کہ وہ لڑکی نرگس نہیں ہے۔ صورتِ حال پہلے سے زیادہ پیچیدہ ہو چکی ہے۔''

''کیا تمہیں میری بات کا یقین نہیں ہے؟'' میں نے جھنجلا کر پوچھا۔

''یقین ہے، لیکن جب ہم عدالت میں مقدمہ پیش کریں گے تو وہاں ثبوت اور دلائل پیش ہوں گے اور تمہارے پاس کہنے کو کوئی بات نہیں ہوگی۔'' اس نے توقف سے کہا۔ ''آؤ میں تمہیں پریم نگر چھوڑ آؤں۔''

پریم نگر کی طرف جاتے ہوئے راجندر نے دوست کے بجائے انسپکٹر کی حیثیت سے جو باتیں کیں، ان سے ظاہر ہو رہا تھا کہ میں پولیس کی نظروں میں مشکوک ہو چکا ہوں۔ بہر حال میں کوئی صفائی پیش نہیں کر سکتا تھا۔

جب راجندر نے مجھے پریم نگر پر اتار دیا تو میں اندر جا کر تھوڑی دیر تک لاؤنج میں بیٹھا رہا، اس کے بعد اٹھا اور بوجھل قدموں سے لائبریری میں چلا گیا۔ اس کی سب سے نچلی دراز کھول کے میں نے ایک خفیہ حصے میں ہاتھ ڈالا تو میری انگلیاں ایک ریوالور سے ٹکرائیں۔ میں نے اسے نکال لیا۔ میں حالتِ جنون میں تھا اور سوچ رہا تھا کہ اس لڑکی کو ہلاک کر دیا جائے جس نے نرگس کی جگہ لے لی تھی۔ پھر خیال آیا کہ اس طرح تو مجھے پھانسی پر چڑھا دیا جائے گا۔ ہونا تو کچھ ایسا چاہیے تھا کہ سانپ مرجائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔

ریوالور وہیں رکھ کر میں نے میز کی دراز بند کر دی اور اپنی خواب گاہ کی طرف چلا گیا۔ وہ لڑکی محوِ خواب تھی۔ اس کے بال تکیے پر بکھرے ہوئے تھے اور ہاتھ پاؤں بے ہنگم زاویوں پر مڑے ہوئے تھے۔ میں نے اس کے ریشمی بالوں کو بے رحمی سے پکڑا اور انہیں مروڑتے ہوئے کہا۔ ''نرگس مر چکی ہے جس کی جگہ تم نے لے رکھی ہے۔ میں تمہیں بھی اسی طرح سے ہلاک کروں گا۔''

''اوہ! میرے بال تو چھوڑو۔'' اس نے چیخ کر کہا۔ ''مجھے تکلیف ہو رہی ہے۔''

اس کی چیخ سن کر آنٹی شکنتلا آ گئیں۔ انہوں نے وحشت سے کہا۔ ''یہ کیا کر رہا ہے، لڑکے؟ کیا اسے ختم کر دے گا؟ اپنی بیوی کو؟ جس کے ساتھ تُو نے محبت کی شادی کی ہے؟''

میں نے اس لڑکی کے بال چھوڑ دیے۔

میں اس خواب گاہ سے نکلنا ہی چاہتا تھا کہ اچانک فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس سے پہلے کہ وہ لڑکی ریسیور اٹھاتی، میں نے اٹھا لیا۔ ہیلو کہنے پر دوسری طرف سے کامنی کی آواز سنائی دی۔ وہ بولی۔ ''میں تم سے ابھی اور اسی وقت ملنا چاہتی ہوں، راجیش۔ جب تم آئے تھے تو میں نے تمہیں منع کر دیا تھا۔ وہ محض میرا جذباتی پن تھا۔''

''اچھا میں تمہیں بعد میں فون کروں گا۔'' میں نے کہا اور ریسیور کریڈل کر دیا۔

''شادی ہوتے ہی تم نے نرگس سے ایک احمقانہ سلوک شروع کر دیا۔ میں تو ایسا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔'' آنٹی نے کہا۔

''بات ہی کچھ ایسی ہوگئی۔'' میں نے مایوسانہ لہجے میں کہا۔

''اچھا اب میں اپنے کمرے میں جا رہی ہوں۔ میری طبیعت خراب ہو رہی ہے۔ تمہاری ان حرکتوں سے دماغ ماؤف ہوا جا رہا ہے۔''

ان کی باتیں سن کر مجھے تعجب ہوا اس لیے کہ وہ کبھی بیمار نہیں پڑی تھیں۔ کیا وہ بھی کسی سازش کا شکار ہو رہی تھیں یا یہ سب میرا واہمہ تھا؟ ان کی باتیں سن کر مجھے تشویش ہو رہی تھی۔

میں تیسرے کمرے میں چلا گیا۔ وہاں سے میں نے پردیپ کو فون کیا۔ ''تم نے سمیتا سے پوچھ لیا؟ وہ خط بہت اہم ہے اس لیے کہ اس میں نرگس نے بھی چند سطریں لکھی تھیں۔''

''ہاں۔ میں نے سمیتا سے پوچھا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ خط تو گوگی نے لے لیا تھا۔'' گوگی ان کی سات سالہ بچی تھی جو ماڈرن ایج اسکول میں پڑھتی تھی اور بلاشبہ ذہین و فطین تھی۔ میں جب بھی اس سے باتیں کرتا تھا، میرا دل خوش ہو جاتا تھا۔

''اچھا میں تمہارے مکان پر پہنچ رہا ہوں۔'' میں نے کہا اور فون منقطع کر دیا۔

دن بھر کی بھاگ دوڑ کے بعد نیند بری طرح ستا رہی تھی اور آنکھیں بوجھل ہو رہی تھیں۔ لیکن اس خط کو حاصل کیے بغیر چارہ نہیں تھا۔ تشویش یہ ہونے لگی تھی کہ گوگی نے وہ خط پھاڑ نہ دیا ہو۔ میری سوچیں بے ترتیب ہونے لگیں۔ جب میں پردیپ کے مکان پر پہنچا تو میاں بیوی ناشتے کی میز پر تھے۔ میں بھی ان کے ساتھ بیٹھ گیا۔ سمیتا جلدی جلدی کچھ کہنے لگی۔ وہ پوچھ رہی تھی کہ میں نے ایسی جلدی میں شادی کیوں کر لی؟ کیا کوئی مجبوری تھی؟ میری نگاہیں گوگی کو تلاش کر رہی تھیں مگر وہ نظر نہیں آ رہی تھی۔

جب وہ جذباتی کیفیت سے نکل آئے تو میں نے پوچھا۔ ''تم نے وہ خط گوگی بیٹی سے لے لیا تھا؟''

''تم اتنے گھبرائے ہوئے کیوں ہو؟'' سمیتا نے شوخی سے پوچھا۔ ''اس خط میں ایسی کیا بات تھی کہ اگر وہ نہ ملا تو تیسری عالمی جنگ چھڑ جائے گی؟''

''مذاق چھوڑو بھابی، گوگی کہاں ہے؟ میں اس سے خود پوچھ لیتا ہوں۔ اسے بلاؤ۔''

''وہ تو اسکول جا چکی ہے۔'' اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''تم تو جانتے ہی ہو کہ اسکول جاتے وقت کیسی بھگدڑ مچ جاتی ہے جیسے کوئی محاذ پر جا رہا ہو۔''

میں نے ناشتے سے ہاتھ کھینچ لیا اور پلیٹ سرکا دی۔

''کیوں؟'' سمیتا نے پوچھا۔

''دل نہیں چاہ رہا ہے۔ تم میرے ساتھ اسکول چلو۔ ممکن ہے وہ خط اس کے بیگ میں ہو۔''

''چلتی ہوں۔'' سمیتا نے کہا۔ ''مگر تم پہلے چائے تو پی لو۔ ہمارے ہاں کی چائے تو تمہیں پسند ہے نا؟ ہم خاص دارجلنگ کی چائے منگواتے ہیں۔''

میں نے سر کو اثباتی جنبش دی۔ دل تو نہیں چاہ رہا تھا لیکن میں سمیتا کا دل بھی نہیں توڑنا چاہتا تھا۔

چائے پی کر پردیپ نے مجھ سے مصافحہ کیا اور آفس جانے کی تیاری کرنے لگا۔ وہ ٹاٹا ریلوے میں ورکشاپ سپروائزر تھا اور اس کی تنخواہ اچھی تھی۔

جب ہم اسکول میں پہنچے تو بچیوں کو پی ٹی کرائی جا رہی تھی۔ سمیتا کی درخواست پر گوگی کو اس کی استانی نے ہم سے ملنے کی اجازت دے دی۔ وہ دوڑتی ہوئی ہماری طرف آئی اور مجھے دیکھتے ہی لپٹ گئی۔ ''آپ میرے لیے کیا لائے ہیں انکل؟'' اس نے پہلا سوال یہ کیا۔

''میں ذرا جلدی میں آ گیا ہوں۔'' میں نے اس کا سر سہلاتے ہوئے کہا۔ ''شام کو آؤں گا تو بہت سی چیزیں لاؤں گا۔ اچھا یہ بتاؤ کہ وہ خط کہاں ہے جو میں نے تم لوگوں کو لکھا تھا؟''

گوگی تذبذب میں تھی اور کوئی جواب نہیں دے پا رہی تھی۔ اسے ہچکچاتے دیکھ کر اس کی ماں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ''انکل کو اس خط کی ضرورت ہے، بتاؤ وہ کہاں ہے؟'' غالباً اس کا لہجہ ترش ہو گیا تھا اس لیے گوگی نے منہ بسورنا شروع کر دیا۔ ''وہ تو اس آدمی نے لے لیا۔''

''کس آدمی نے؟'' سمیتا نے ڈپٹنے والے انداز سے کہا۔

اس کی ٹیچر نزدیک کھڑی تھی۔ اس نے ہم سے معذرت کی کہ ہم بچی کو تنہا چھوڑ دیں ورنہ اس کے ذہن پر برا اثر پڑے گا اور وہ سارے دن اپنی پڑھائی پر توجہ نہیں دے سکے گی۔ ہم اسے چھوڑ کر باہر آ گئے اس لیے کہ زیادہ ڈرانے دھمکانے کی صورت میں گوگی دہاڑیں مار کر رونے لگتی اور سب کے لیے مصیبت کھڑی ہو جاتی۔ سمیتا نے بڑبڑانے والے انداز سے کہا۔ ''حیرت ہے کہ اس نے خط کسی شخص کو کیوں دے دیا۔ جب کہ وہ کہہ رہی تھی کہ میں

اسے اپنی دوستوں کو دکھاؤں گی۔ اس میں انکل نے میرے لیے بہت سی دعائیں لکھی ہیں۔''

میرا دماغ تیزی سے سوچنے میں مصروف تھا۔ میں نے اندازہ لگا لیا کہ جب میں پردیپ سے فون پر گفتگو کررہا تھا تو یقیناً اس حرافہ لڑکی نے ایکس ٹینشن پر میری گفتگو سن لی تھی۔ اس نے اپنے ساتھیوں کو آگاہ کردیا ہوگا تو انہوں نے گوگی کو ڈرا دھمکا کر وہ خط لے لیا ہوگا جو میرے لیے بہت اہمیت رکھتا تھا۔

میں نے سمیتا کو اس کے گھر چھوڑا اور اپنے مکان پریم نگر کی طرف چل پڑا۔ کامنی مجھے باہر ہی مل گئی۔ میں نے کار گیٹ سے باہر ہی روک لی اور اس کی خیریت پوچھی پھر کہا۔ ''جب تم یہاں آہی گئی تھیں تو تمہیں آنٹی سے ملاقات کرنا چاہیے تھی اور اندر بیٹھنا چاہیے تھا۔''

''دراصل میں تم سے تنہائی میں کچھ کہنا چاہتی تھی۔ میں اندر گئی تھی اور میں نے تمہاری بیوی کو دیکھ لیا ہے۔ وہ لاجواب ہے۔'' اس نے ستائشی لہجے میں کہا۔ اس کے لہجے میں رقابت اور جلاپا نہیں تھا جیسا کہ ہندوستانی عورتوں میں ہوتا ہے۔ ''میں نے آنٹی شکنتلا کی خیریت بھی دریافت کرلی ہے۔ ان کی طبیعت زیادہ ہی خراب ہے۔ راجیش ان کا توجہ سے علاج کراؤ۔''

ہم باتیں کرتے ہوئے کار پورچ میں داخل ہوگئے۔ اس نے میرے چہرے پر لکھی ہوئی وحشت پڑھ لی اور پوچھا۔ ''راجیش! یہ تمہیں کیا ہوگیا ہے؟ شادی ہونے کے بعد تو تمہارے چہرے پر بشاشت ہونی چاہیے تھی، مگر میں دیکھ رہی ہوں کہ معاملہ الٹا ہے۔ کیا بات ہے تمہارے ذہن پر کون سا کابوس سوار ہے؟''

اس کی اپنائیت کو پاکر میں جیسے قابو سے باہر ہوگیا۔ بہرحال وہ بھی دل کے قریب تھی اور میری غم گسار۔ میں نے اسے سب کچھ بتادیا۔ جب میری کہانی ختم ہوئی تو میں نے اس کے چہرے میں اس کہانی کا عکس تلاش کیا۔ وہ گومگو کی کیفیت میں تھی اور اس کی آنکھیں حیرت سے پھیلی ہوئی تھیں۔

''میں نے جو کچھ کہا ہے تمہیں اس پر اعتبار ہے؟''

''ہاں۔'' اس نے جیسے سرگوشی میں کہا۔ ''تمہارے خلاف کوئی بہت بڑی سازش ہورہی ہے۔''

''بتاؤ مجھے کیا کرنا چاہیے؟'' میں نے پوچھا۔ ''اس گرداب سے نکلنے کا کوئی راستہ سمجھ میں آرہا ہے؟''

''تم پولیس سے رجوع کیوں نہیں کرتے؟''

''پولیس تو الٹا مجھ پر شک کررہی ہے۔ راجندر میری طرف سے مطمئن نہیں ہے۔''

''تو پھر کیا کرو گے؟'' اس نے بے بسی سے کہا۔ ''اگر میں تمہارے کسی کام آسکتی ہوں تو بتاؤ؟''

''کوئی کچھ نہیں کرسکتا۔'' میں نے مایوسی سے کہا۔ ''اچھا یہ بتاؤ کہ تم کس لیے آئی تھیں اور مجھ سے کیا کہنا چاہتی تھیں؟''

''راجیش! میں وہ......'' اس نے اٹکتے ہوئے کہا۔ پھر بات کو گول کرتے ہوئے بولی۔ ''میں بس یوں ہی آگئی تھی، خیریت پوچھنے۔ اچھا اب میں چلتی ہوں۔''

میں نے اسے بہت کریدا لیکن اس نے جیسے کچھ بتانے کی قسم کھالی تھی۔ پھر میں نے اسے اس کے فلیٹ پر چھوڑنے کی پیش کش کی لیکن یہ بھی اس نے قبول نہیں کیا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ بس سے چلی جائے گی۔ اس نے الوداعی طور پر کہا۔ ''راجیش! محتاط رہنا۔ حالات و واقعات تمہارے خلاف جارہے ہیں۔ بھگوان تمہیں اپنی پناہ میں رکھے۔''

جب وہ دعائیہ کلمات ادا کرکے چلی گئی تو اپنی کار میں بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ اب ڈاکٹر گوپال کی طرف چلنا چاہیے اس لیے کہ آنٹی شکنتلا کی بیماری کے بارے میں بتانا ضروری ہے۔ وہ ایک سمجھدار ڈاکٹر ہے۔ میں نے کار اسٹارٹ کی اور اس کے کلینک پہنچ گیا۔

وہ ایک قدیم طرز کی عمارت میں رہتا تھا اور اسی میں اس کا کلینک بھی تھا.... جب استقبالیہ پر پہنچا تو میں نے کاؤنٹر پر ایک لڑکی کو بیٹھے دیکھا۔ اس نے مجھ سے چند سوالات کیے اور اندر جانے کی اجازت دے دی۔

ڈاکٹر گوپال اس وقت مصروف نہیں تھا۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔ ''راجیش! وہ تمہارا دوست انسپکٹر راجندر میرے پاس آیا تھا۔ اس نے سمندر سے ملنے والی لاش کے بارے میں بتایا۔ پھر یہ بھی کہ تم نے اسے نرگس کی حیثیت سے شناخت کرلیا ہے۔ میں نے تمہیں تلقین کی تھی کہ اب آرام کرو۔ لیکن تم نے معلوم نہیں خود کو کن جنجالوں میں پھنسا لیا ہے۔''

''تم میری طرف سے اتنے فکرمند نہ رہو۔''

''میں تمہارا ڈاکٹر ہوں اس لیے مجھے فکر کرنے کی عادت ہے۔ مگر تمہیں اس لڑکی کی لاش پر نرگس کا شبہ کیوں ہوا؟ میرا خیال ہے کہ وہ لڑکی جو تمہارے مکان پریم نگر میں ہے وہی نرگس ہے۔'' اس نے سمجھانے والے انداز سے

کہا۔ ”میں تو سمجھا تھا کہ تمہاری ذہنی کیفیت اب بہتر ہوگئی ہوگی لیکن ......“

ڈاکٹر کا یہ ریمارک مجھے بہت ناگوار گزرا۔ میں نے کہا۔ ”میں تمہیں آنٹی کے بارے میں بتانے آیا تھا کہ ان کی طبیعت بہت خراب ہے۔“

”مجھے جب فرصت ملے گی تو میں پریم نگر آؤں گا۔“ اس نے سر ہلا کر کہا۔

میں اس کے کلینک سے نکل آیا۔ باہر آیا تو میں نے اپنی کار کی ڈرائیونگ سیٹ پر راجندر کو بیٹھے دیکھا۔ ”راجیش! تمہیں میرے ساتھ پولیس ہیڈکوارٹر چلنا ہوگا۔ انچارج صاحب تم سے کچھ پوچھنا چاہتے ہیں۔“

میں نے کچھ کہے بغیر ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ وہ اتر کر اپنی گاڑی میں بیٹھ گیا۔

انچارج ونود پستہ قامت تھا۔ وہ چہرے سے سخت گیر لگتا تھا لیکن اس کی آواز ملائم تھی۔ ”راجیش! اس لڑکی کو صرف تم نے ہی شناخت کیا ہے جس کی لاش سمندر سے ملی تھی۔ اس سے تمہارا کیا رشتہ تھا؟“

”یہ تو میں راجندر کو بتا چکا ہوں کہ وہ میری بیوی تھی۔“ میں نے ناگواری سے کہا۔

”اگر وہ تمہاری بیوی تھی تو اسے کس نے ہلاک کیا اور وہ تم سے کب جدا ہوئی؟“ اس نے تیکھے انداز سے کہا۔

”میں بے ہوش تھا اس لیے وثوق سے نہیں کہہ سکتا کہ کہاں تھا۔ بہرحال مجھے اپنی بیوی کے پاس ہونا چاہیے تھا۔“

”تم نے راجندر کو جو کہانی سنائی تھی، وہ احمقانہ تھی۔ اس پر کسی کو اعتبار نہیں آسکتا۔ تمہارے گھر پر جو عورت ہے اسے اپنی بیوی تسلیم کر لینے میں بھلا کیا حرج ہے؟“ اس نے پولیس والوں کے انداز سے کہا۔

”تم دس بار بھی پوچھو گے تو میری کہانی وہی رہے گی۔“ میں نے جھلا کر کہا۔

”او کے۔ اب تم جا سکتے ہو۔“ اس نے اپنے سامنے پڑے ہوئے کاغذات دیکھنا شروع کر دیے۔

میں اس کے آفس سے اٹھ کر باہر آ گیا۔ یقین نہ آیا کہ ونود نے محض یہ کہنے کے لیے مجھے وہاں بلایا تھا۔ میرا قیاس تھا کہ اس کے پس پردہ کوئی اور بات بھی تھی۔ میں اپنی گاڑی کے قریب پہنچا ہی تھا کہ راجندر آ گیا۔ ”میں تمہاری بیوی، میرا مطلب ہے اس لڑکی سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں جو تمہارے گھر پر مقیم ہے۔“ وہ بولا۔ میں نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ پولیس جیپ کی طرف بڑھ گیا جس میں دو کانسٹیبل بیٹھے تھے۔

ہم آگے پیچھے روانہ ہو گئے۔

جب میں پریم نگر پہنچا تو میں نے اس لڑکی کو کچن میں کھڑا دیکھا۔ وہ ایک گلاس منہ سے لگائے کچھ پینے میں مصروف تھی۔ مجھے دیکھ کر اس نے گلاس رکھ دیا اور میرے گلے میں بانہیں ڈالنے کی کوشش کی۔ میں نے اس کا ہاتھ جھٹک کر پوچھا۔ ”آنٹی کی طبیعت اب کیسی ہے؟“

”ان پر بے ہوشی طاری ہے۔ میں نے نازک صورتِ حال دیکھ کر ڈاکٹر گوپال کو فون کر دیا تھا۔ وہ آنے والا ہوگا۔“ اس نے جواب دیا۔

”ڈرائنگ روم میں چلو۔ ایک انسپکٹر تم سے پوچھ گچھ کے لیے آیا ہے۔“

وہ بے خوفی سے ڈرائنگ روم کی طرف بڑھنے لگی۔ میں اس کے پیچھے تھا۔ وہ راجندر کے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئی۔ ”میں راجیش کی بیوی ہوں۔ انسپکٹر صاحب آپ مجھ سے کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟“

”میں راجیش کا دوست ہوں اور تھوڑا سا تبادلۂ خیال کرنے آیا ہوں۔ آپ کا پورا نام کیا ہے؟“

”نرگس ہنجرانی۔“ اس نے جواب دیا۔ ”کیوں میرے شوہر نے آپ کو نہیں بتایا؟“

”نہیں۔“

”ان کی طبیعت آج کل کچھ خراب ہے۔“ اس نے مجھ پر ایک اچٹتی سی نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔

”میں ابھی آتا ہوں۔“ میں نے کہا اور وہاں سے اٹھ گیا پھر میں کچن میں گیا۔ وہ گلاس کاؤنٹر پر رکھا تھا جس میں وہ لڑکی پانی پی رہی تھی۔ میں نے اس گلاس کو اٹھا کر کاغذ میں لپیٹا اور ایک خالی ڈبے میں رکھ کر عقبی دروازے سے نکل گیا۔ پولیس جیپ میں دو کانسٹیبل بیٹھے تھے۔ میں نے راجندر کا حوالہ دے کر وہ ڈبا ایک کانسٹیبل کو دے دیا۔ جب میں ڈرائنگ روم میں واپس آیا تو میں نے اس لڑکی کو راجندر سے بے تکلفی سے باتیں کرتے دیکھا۔ صاف معلوم ہوتا تھا جیسے اس نے راجندر کو اپنی دل فریب اداؤں سے مسحور کر لیا ہے۔

”مسز راجیش! آپ کے شوہر کی پوزیشن اس وقت بہت مشکوک ہے۔“ اس نے کہا اور اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔

”یہ تو ہولناک بات ہے۔“ لڑکی بولی۔

”تم میری دوستی کو آڑے نہ آنے دینا۔“ میں نے

راجندر سے کہا۔ ''ضرورت پڑنے پر تم مجھے گرفتار کر لینا۔''

راجندر نے کچھ کہے بغیر اپنی کیپ سر پر لگائی اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے لڑکی سے پوچھا۔ ''تم نے اسے کیا بتایا تھا؟''

وہ مجھے دل آویز نگاہوں سے دیکھتی رہی اور اس نے جواب دینے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ میں نے اسے وہیں چھوڑا اور اپنی آنٹی کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ ان کی خیریت دریافت کرنا ضروری ہو گیا تھا۔ مجھے یہ دیکھ کر دکھ ہوا کہ وہ غنودگی کے عالم میں بستر پر پڑی ہیں۔ دراصل ڈاکٹر گوپال نے انہیں مسکن دوائیں دی تھیں۔ اس کا کہنا تھا کہ ان کے لیے یہی بہتر ہیں۔ مجھے ان کی بیماری سے تشویش ہو رہی تھی اس لیے کہ وہ اتنی علیل کبھی نہیں ہوئی تھیں۔ میرا دل وسوسوں اور اندیشوں کا شکار تھا۔ کیا ان کے لیے بھی کوئی سازش تیار کی جا رہی تھی؟ کوئی انہیں بھی ہلاک کرنا چاہتا تھا۔

یہ اور ایسے بہت سے سوالات تھے جن کے جوابات میرے پاس نہیں تھے۔ میں نے فریج سے وہسکی کی بوتل نکالی اور پیگ بنا کر حلق سے اتارا۔ مکان پر وحشت زدہ خاموشی طاری تھی۔ میں بھی اس وحشت کا شکار تھا۔ یاد آیا کہ جب چاندنی راتیں شباب پر ہوا کرتی تھیں تو میں آنٹی کے ساتھ مکان کے عقبی لان میں چلا جایا کرتا تھا۔ وہاں ہم نے پودوں کو ایک خاص اسٹائل سے کٹوایا تھا اور آرام کرنے کے لیے بہترین کرسیاں اور میزیں ڈلوائی تھیں۔ بعض اوقات ہم شام کی چائے بھی وہاں پیتے تھے۔

جب میں لان میں پہنچا تو میں نے آنٹی اور اس لڑکی کی خواب گاہ میں روشنی دیکھی۔ ایک شخص دور کھڑا تھا اور ان کھڑکیوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ چاندنی مدھم تھی اس لیے یہ اندازہ نہیں ہو پا رہا تھا کہ وہ کون ہے۔ میں اسے دیکھ کر ایک درخت کی آڑ میں ہو گیا۔ اس شخص نے جھک کر کوئی چیز اٹھائی اور اسے کھڑکی کی طرف پھینکا۔ میں آہٹ پیدا کیے بغیر اس کے قریب پہنچ گیا اور میں نے اسے للکار کر کہا۔ ''اے! تم کون ہو اور یہاں کیا کر رہے ہو؟''

میری آواز پر وہ گھوما اور اس نے میری ناک پر مُکا مار دیا۔ میرا جسم جھنجھنا گیا تاہم میں نے اسے برداشت کیا۔ اس لیے کہ اگر میں اس پُراسرار شخص پر ہاتھ ڈالنے میں کامیاب ہو جاتا تو بہت سے عقدے کھل سکتے تھے اور بہت سے رازوں سے پردہ اٹھ سکتا تھا۔ اس شخص کے چہرے پر ربر کا ایک ماسک چڑھا ہوا تھا۔ میں نے لپک کر اس شخص کو کمر سے تھام لیا اور گھاس پر دے مارا۔ وہ ایک غراہٹ کے ساتھ گر پڑا مگر فوراً ہی اٹھا اور تیزی سے لان کے بیرونی دروازے کی طرف بھاگا۔

میں اس کے پیچھے دوڑ رہا تھا کہ اس نے جھک کر گھاس پر سے ایک پھاوڑا اٹھایا اور طاقت سے میری طرف پھینکا۔ وہ میرے چہرے سے ٹکرایا تو شدید تکلیف کا احساس ہوا۔ میں گھاس پر گر پڑا۔ میرا سر چکرانے لگا تھا۔ دو تین منٹ اس کیفیت میں ضائع ہو گئے۔ جب بینائی درست ہوئی تو میں اپنی جگہ سے اٹھا اور مکان کے گرد چکر لگایا لیکن اس شخص کا کوئی پتا نہ چل سکا۔

اپنے کمرے میں پہنچ کر میں نے سر درد کی دو گولیاں پانی کے ساتھ لیں اور بستر پر لیٹ گیا۔ نصف گھنٹے کے بعد درد تو جاتا رہا لیکن تشویش میں اضافہ ہو گیا۔ وہ کون تھا اور کیا کرنے آیا تھا؟ میں نے راجندر کے گھر کا نمبر ملایا۔ اس نے کافی دیر بعد ریسیور اٹھایا اور میری آواز سننے کے بعد بولا۔ ''اتنی رات گئے بھی تمہیں چین نہیں ہے۔ ایسا کون سا واقعہ ہو گیا کہ تم اسے بیان کرنے کے لیے فون کر بیٹھے؟''

''اس سے بھی زیادہ ہولناک واقعہ ہوا ہے۔'' میں نے کہا اور اسے اس شخص کے بارے میں بتایا۔

''ٹھیک ہے صبح دیکھیں گے۔'' اس نے کہا اور ریسیور کریڈل کر دیا۔

میں نے پھر تکیے سے ٹیک لگا لی۔ اچانک مجھے کامنی کا خیال آیا۔ اگر میں اس سے ایک ملاقات کر لوں تو ممکن ہے اس پیچیدہ کہانی کے کچھ تانے بانے کھل جائیں۔ رات کافی ہو چکی تھی لیکن اسے دیکھنے میں کوئی حرج نہیں تھا اس لیے کہ وہ صبح دیر سے اٹھتی تھی اور دس بجے ڈیوٹی پر جاتی تھی۔ ان کا خاندان مختصر سا تھا، جس میں اس کی چھوٹی بہن اور ماں شامل تھی۔ ان دونوں کی کفالت کامنی ہی کرتی تھی۔ میں دھوراجی اپارٹمنٹ پر پہنچ گیا۔ وہ دوسری منزل پر رہتی تھی۔ اس کے فلیٹ کی کھڑکیاں روشن تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ جاگ رہی ہے۔ میں نے اطلاعی گھنٹی بجائی۔ کوئی جواب نہیں آیا۔ میں نے بے تاب ہو کر آوازیں دینا شروع کر دیں۔

اس کا دروازہ تو نہیں کھلا البتہ سامنے والے فلیٹ کا دروازہ کھل گیا اور لحیم شحیم عورت نے ناگواری سے کہا۔ ''اے کائے کو دوسروں کی نیند کھراب کرتا ہے؟ کیا چاہیے؟ کس سے ملنا مانگتا ہے؟'' وہ اینگلو انڈین تھی اور اس کی آنکھوں میں خمار تھا۔

''کامنی سے ملنے کا ہے۔'' میں نے اسی کے لہجے میں

جواب دیا۔
''آج وہ ایدر نہیں ہے۔'' اس نے جواب دیا۔ ''اپنے ڈیڈی کے پاس گیا ہوا ہے۔''

کامنی کے باپ نے دوسری شادی کر لی تھی مگر وہ کامنی اور اس کی بہن کو فون کر کے بلوالیتا تھا۔ میں وہاں سے بے نیل ومرام چلا آیا۔ جب میں کار میں بیٹھ رہا تھا تو میں نے اپنا موبائل نکالا اور اس کی ڈائرکٹری دیکھی۔ اس میں کامنی کے باپ کا نمبر تھا۔

میں نے ان نمبروں پر رابطہ کیا تو دوسری طرف سے اس کے باپ کی آواز سنائی دی۔ جب میں نے استفسار کیا تو اس نے جواب دیا کہ کامنی اس کے پاس نہیں آئی ہے۔ میں نے موبائل آف کر کے جیب میں رکھ لیا اور سوچنے لگا کہ آج کے دن وہ کہاں جاسکتی ہے؟

میں واپس پریم نگر کی طرف چل پڑا۔ جب میں پورچ میں کار کھڑی کر رہا تھا تو اس کی ہیڈ لائٹس کسی عجیب سی چیز پر پڑیں۔ وہ چیز لان کے قریب پڑی تھی۔ میں نے ہیڈ لائٹس آن رہنے دیں اور اس چیز کے قریب گیا تو معلوم ہوا کہ وہ ایک سینڈل ہے۔ جب کامنی مجھ سے ملاقات کے لیے آئی تھی تو میں نے وہ سینڈل اس کے پاؤں میں دیکھا تھا۔ میں نے دوسرا سینڈل تلاش کیا مگر وہ کہیں نہ ملا۔

میں نے مایوسی سے کار کی ہیڈ لائٹس آف کیں اور گھر میں داخل ہو گیا۔ حالات وواقعات کا انداز لگانے میں دیر نہ لگی کہ کامنی مجھ سے ملنے آئی تھی لیکن اس کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آگیا ہے۔ میرا دل ڈوبنے لگا۔ اب وہ کہاں ہوگی؟

وہ سینڈل لے کر میں اپنے کمرے میں داخل ہوا تو وہاں کا منظر ہی عجیب تھا۔ میز کی ساری درازیں الٹی پڑی تھیں اور روشنائی کی شیشی کا ڈھکن کھلا ہوا تھا اور اس سے سیاہ روشنائی گر کر میز پر پھیلی ہوئی تھی۔ مجھے حیرت ہوئی کہ کسی کو میرے کمرے کی تلاشی لینے کی کیا ضرورت پڑ گئی؟ اسے کس چیز کی تلاش تھی؟ میں تو میز کی درازوں میں کوئی قیمتی چیز نہیں رکھتا ہوں؟

میں اس لڑکی کے کمرے کی طرف گیا۔ وہ سو رہی تھی۔ صبح ہو رہی تھی اور کمرے کی کھڑکی سے ہلکی دھوپ آنا شروع ہو گئی تھی۔ میں نے اس کے بال تھام کر اسے اٹھایا۔ اس نے مجھے دیکھ کر بُرا نہیں منایا۔ مسکرا کر کہا۔ ''ساری رات تم نے کہاں گزاری؟ کیا میری قربت گوارا نہیں ہے۔''

سرکاری نوکری

''ہاں! تو آپ معذوروں کے کوٹے پر نوکری چاہتے ہیں..... کیا معذوری ہے آپ کی؟''
''آپ دیکھ رہے ہیں کہ میری ایک ٹانگ نہیں ہے..... یہ دھماکے میں اُڑ گئی تھی!''
''ویری گڈ! آپ کو ابھی لیٹر مل جائے گا۔ کل سے نوکری پر آجائیں۔''
''بہت شکریہ!''
''یہ سرکاری نوکری ہے۔ دفتری اوقات صبح نو سے شام پانچ تک ہیں..... یہ خیال رکھیں کہ آپ کو ہر حال میں گیارہ بجے دفتر پہنچنا ہے۔''
''وقت تو نو بجے سے ہے پھر مجھے گیارہ بجے.....!''
''میں نے کہا نا کہ یہ سرکاری نوکری ہے۔ ہم لوگ نو سے گیارہ تک اِدھر اُدھر گھوم پھر کر گپ شپ اور مزاج پرسی کرتے ہیں..... گیارہ بجے کام شروع ہوتا ہے۔ آپ چلنے سے معذور ہیں۔ دو گھنٹے تک کیا کریں گے۔''

کراچی سے افشین بلال کا تعاون

میں نے ناگواری سے کہا۔ ''یہ دیکھ رہی ہو؟''
''ہاں، سینڈل ہے مگر تم اسے میرے لیے لائے ہو تو دوسرا کہاں ہے؟''
''بکواس بند کرو۔'' میں نے آنکھیں نکالیں۔ ''جانتی ہو یہ کس کا ہے؟''
''مجھے کیا پتا؟'' اس نے سادگی سے کہا۔
''تم جھوٹ بول رہی ہو۔'' میں نے اس کے بال مروڑے۔
اس نے ہلکی سی چیخ ماری اور اس کا جسم کانپنے لگا۔
''اور میرے کمرے کی تلاشی کس نے لی ہے؟''
''معلوم نہیں۔'' اس بار بھی اس کا لہجہ سچائی اور دیانت داری پر مبنی تھا۔

میں نے وقت ضائع کرنا مناسب نہیں سمجھا اور اس کے بال چھوڑ دیے۔ اب وہاں ٹھہرنا فضول تھا اس لیے میں وہاں سے نکل آیا۔ آنٹی اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر واش بیسن کی طرف جا رہی تھیں۔ ان کی آنکھیں دھنسی ہوئی تھیں اور جسم کانپ رہا تھا۔ میں نے ان کے قریب جا کر پوچھا۔ ''اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟''
''ٹھیک نہیں ہے۔ میرا خیال ہے کہ اب میں چند

دنوں کی مہمان ہوں۔'' انہوں نے لرزیدہ آواز میں کہا۔
''میں آپ کو چھوڑ کر کہیں جانا نہیں چاہتا ہوں، لیکن مجبوری آن پڑی ہے اس لیے جا رہا ہوں۔ اس اثنا میں ڈاکٹر اور میری نام نہاد بیوی آپ کی خدمت کرے گی۔''
''تو کہاں جا رہا ہے؟'' انہوں نے اپنائیت سے پوچھا۔
''یہ میں ابھی نہیں بتاؤں گا۔''
وہ ایک کرسی پر بیٹھ گئیں اور انہوں نے کہا۔ ''میں تجھے ایک دلچسپ بات بتاؤں؟''
''ہاں، ضرور۔''
''ڈاکٹر گوپال نے کئی بار مجھے شادی کی پیش کش کی ہے۔ مگر میں ٹال دیتی ہوں۔ اب اس کا اصرار بڑھ گیا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ......''
''آپ کا کیا ارادہ ہے؟ کیا آپ اس سے شادی کرنا چاہتی ہیں؟''
''نہیں۔ میں اب باقی زندگی تنہا گزارنا چاہتی ہوں۔'' انہوں نے حتمی لہجے میں کہا۔
''ٹھیک ہے تو اسے صاف جواب دے دیں۔ یہ پروا نہ کریں کہ اس کا دل ٹوٹ جائے گا۔ وہ مضبوط ہاتھوں پیروں کا مالک ہے اس لیے اس کا دل آسانی سے نہیں ٹوٹے گا۔''
وہ مسکراتی ہوئی واش بیسن کی طرف چلی گئیں۔
میں نے اپنے کمرے میں جا کر موبائل پر راجندر کے نمبر آن کیے اور اسے بتایا کہ کامنی کا ایک سینڈل مجھے اپنے لان میں ملا ہے۔ ساری بات سن کر اس نے شکریہ کہا اور موبائل آف کر دیا۔ میں نے محسوس کر لیا کہ اس کے رویے میں کشیدگی آچکی ہے۔ وہ پہلے جیسا راجندر نہیں رہا۔
مجھے کاروبار کی طرف توجہ دینا چاہیے تھی۔ کاروباری دورے سے آتے ہوئے تین دن ہو چکے تھے اور سیکڑوں عجیب واقعات پیش آچکے تھے، جن کی کوئی توجیہہ نہیں کی جاسکتی تھی۔ اس لیے میں نے چار گھنٹے سونے کے بعد اپنے آفس کا رخ کیا اور اپنی فیکٹری کے سپروائزر کو اپنے کمرے میں بلا کر ساری اہم باتیں سمجھائیں۔ اسے بتایا کہ کتنا مال کہاں بھیجنا ہے۔ کوالٹی کیا رکھنا ہے اور کب تک نیا آرڈر تیار کرانا ہے۔ وہ ہوشیار اور تیز شخص تھا اس لیے سمجھ گیا۔ پھر میں نے اسے دوسرے شہروں کے آرڈر دے دیے۔
تھوڑی سی نیند لینے کے بعد میں تازہ دم ہو گیا تھا اس لیے میں ایک بار پھر جوہو کی طرف چل پڑا تاکہ نرگس کے بارے میں معلومات اکٹھا کر سکوں۔ آخر کوئی تو ایسا ہوگا جو اس کے بارے میں جانتا ہوگا۔
جس کاک ٹیل بار میں میں نے اس کے ساتھ جام لنڈھائے تھے، ممکن ہے وہاں کوئی اس کے بارے میں جانتا ہو۔ اس لیے میں نے وہاں جانے کا فیصلہ کیا۔ اس کا نام سن اینڈ سی تھا۔ بار میں اس وقت کوئی نہیں تھا۔ بارٹینڈر ٹی وی پر کرکٹ میچ کا ورلڈ کپ فائنل دیکھ رہا تھا۔ اس نے آواز بہت دھیمی کر رکھی تھی تاکہ گاہکوں کی آواز بھی سن سکے اور ان کے آرڈر کی تعمیل کر سکے۔
میری طرف اس نے توجہ نہیں دی۔ میں ایک منٹ تو نشست پر بیٹھا رہا اور اس کے بعد اپنی جگہ سے اٹھا اور کاؤنٹر کے قریب پڑے ہوئے اسٹولوں میں سے ایک پر بیٹھ گیا۔ بارٹینڈر میری طرف دیکھنے لگا تو میں نے پوچھا۔
''تم مجھ سے واقف ہو؟''
''نہیں۔'' اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔
''مجھے تمہاری مدد درکار ہے۔''
اس نے بے پروائی سے شانے اُچکائے۔ میں نے اسے پیشکش کی کہ وہ چاہے تو میری طرف سے دو جام پی سکتا ہے۔ جب دونوں جام اس کے حلق کے نیچے اتر گئے تو اس کے چہرے پر چمک نظر آئی۔ اس نے پیمانہ کاؤنٹر پر رکھتے ہوئے پوچھا۔ ''ہاں، تم کیا معلوم کرنا چاہتے ہو؟''
''تمہیں یاد تو ہوگا کہ میں یہاں ایک حسین و جمیل لڑکی کے ساتھ آیا کرتا تھا؟ اس کا کیا نام تھا؟''
''اس کا نام تو تمہیں معلوم ہونا چاہیے۔'' اس نے ترش روئی سے کہا۔
''میں تم سے پوچھ رہا ہوں تاکہ تمہاری یادداشت تازہ ہو جائے۔''
''کیا تم پولیس انفارمر ہو؟'' اس نے مجھے مشکوک نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔
میں نے اسے یقین دلایا کہ میں ایسی کوئی چیز نہیں ہوں۔ تب وہ بولا۔ ''اس کا نام موگی چڑجی تھا۔ اگر تمہیں اس سے زیادہ معلومات درکار ہیں تو میں ایک لڑکی کا پتا بتا سکتا ہوں جو اس کی گہری دوست ہے۔''
اس نے اپنی جیب سے موبائل نکال کے کسی کے نمبر ملائے پھر سلسلہ ملنے کے بعد دھیمی آواز میں گفتگو کرتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے موبائل آف کر کے جیب میں رکھ لیا اور ایک کاغذ پر چند سطریں گھسیٹ کر میری طرف بڑھا دیں۔ ''لو، اس پتے پر پہنچ جاؤ اور لڑکی ساوتری سے جو چاہو

معلوم کرلو۔''

وہ باندرہ کا پتا تھا۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور وہاں سے نکل آیا۔ باندرہ پہنچ کر میں نے پریم پترا اپارٹمنٹ تلاش کیا جو سہولت سے مل گیا۔ اس کی تیسری منزل پر پہنچ کر میں نے تین سو تین کے فلیٹ کی اطلاعی گھنٹی بجائی تو ایک سرو قامت لڑکی نے دروازہ کھولا اور میری طرف استفہامیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔ ''کیا تم ساوتری ہو؟'' میں نے سوال کیا۔

''اگر تمہیں سن اینڈ سی کے چارلی نے بھیجا ہے تو اندر آجاؤ۔'' اس نے ایک طرف ہٹ کر مجھے اندر آنے کا اشارہ کیا۔

میں اندر چلا گیا۔ ساوتری کا جسم بے حد متناسب تھا۔ وہ سرو قد، آہو چشم، شہابی رنگت کی مالک تھی۔ اس میں وہ ساری خصوصیات تھیں، جو قصہ گو کی داستانوں میں ہوتی ہیں۔ اس نے اپنی بائیں آنکھ دبا کر کہا۔ ''میں ایک ہزار روپے لیتی ہوں۔ چند گھنٹے یا ساری رات۔''

''میں دینے کو تیار ہوں مگر میں یہاں شب بسری کے لیے نہیں آیا ہوں۔ کچھ معلومات اکٹھا کرنا چاہتا ہوں۔ اگر تم فراہم کرسکو......؟''

''اس کے بھی ایک ہزار روپے ہوں گے۔'' وہ کاروباری انداز میں بولی۔

میں نے اپنا پرس نکال کر ایک ہزار کا نوٹ کھینچا اور اس کی ہتھیلی پر رکھ دیا۔ جسے اس نے فوراً سنبھال لیا۔

''تمہاری ایک سہیلی جس کا نام نرگس ہے۔ مگر اسے تم لوگ موہی چٹرجی کہتے ہو۔ وہ کہاں مل سکتی ہے؟''

''وہ اس زندگی سے چھٹکارا چاہتی تھی اس لیے اس نے شادی کرلی۔ اب وہ یہاں نہیں رہتی۔''

''کون سی زندگی؟'' میں نے لرزتے دل سے پوچھا۔

''تم نہیں سمجھے؟ وہ میری طرح.... کال گرل تھی۔ جسم فروشی کرتی تھی۔'' وہ بولی۔ ''میں تمہارے لیے ایک پیگ تیار کروں؟''

''نہیں۔'' میں نے مردنی سے کہا اور دو چار عام سے سوالات کر کے اس کے فلیٹ سے باہر آگیا۔ میں زلزلے کی سی کیفیت سے دوچار تھا۔ میرے دل کی دنیا زیر و زبر ہو رہی تھی۔ کنول کے جس پھول کو میں نے اپنے کالر میں سجالیا تھا، وہ کیچڑ کا پھول تھا۔ کاش زمین پھٹ پڑتی اور میں اس میں سما جاتا۔

میرا دماغ مختلف النوع خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ میں صحیح طور پر ڈرائیونگ نہیں کر پاؤں گا اس لیے میں جا کر ایک بار میں بیٹھ گیا۔ دو پیگ پینے کے بعد حواس قابو میں آئے تو میں نے کار کا اسٹیئرنگ سنبھالا اور پریم نگر کی طرف روانہ ہوگیا۔ راستے میں، میں نے موبائل نکال کر راجندر کا نمبر ملایا اور اسے یہ ہولناک بات بتائی۔

''بہت خوب! تم تو سراغ رساں بنتے جارہے ہو۔ مجھے تمہاری بات پر یقین ہے، لیکن میں اس کی تصدیق کرنا چاہوں گا۔ میں اپنے طور پر اس علاقے میں جاؤں گا اور تمہیں بتاؤں گا۔'' اس نے کہا اور مختصر سی گفتگو کر کے سلسلہ منقطع کردیا۔

پریم نگر پہنچ کر میں آنٹی کے کمرے میں گیا۔ وہ حسرت و یاس کی تصویر بنی اپنے بیڈ پر لیٹی تھیں۔ ان کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ کچھ کہنا چاہتی ہوں مگر کہہ نہ پارہی ہوں۔ ان کی آنکھوں میں مردنی تھی۔ ''آنٹی! آنٹی!'' میں نے بے تابی سے پکارا۔ انہوں نے جواب دینا چاہا لیکن آواز نہ نکلی۔

''ٹھہرو، میں ڈاکٹر گوپال کو فون کرتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

اس سے موبائل پر رابطہ کر کے میں نے اسے جلد آنے کی ہدایت کی۔ وہ تھوڑی دیر میں آگیا۔ اس نے آنٹی شکنتلا کا توجہ سے معائنہ کیا اور بولا۔ ''محض کمزوری ہے اور کچھ نہیں تم تو خواہ مخواہ پریشان ہوجاتے ہو۔ خیر میں انہیں ایک ٹانک لکھے دیتا ہوں۔ اسے پابندی سے پلاتے رہنا۔''

اس نے اپنا پیڈ کھول کر بال پوائنٹ سے کچھ لکھا اور مجھے تھمادیا۔ اس کے بعد وہاں سے چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد آنٹی نے آنکھیں کھولیں اور نحیف سی آواز میں کہا۔ ''نرگس کہاں ہے؟''

''آپ اسے نرگس کیوں کہتی ہیں؟ میں نے آپ کو بتایا تو تھا کہ وہ میری اصلی بیوی......''

''خاموش رہو۔ مجھے تنگ نہ کرو۔'' انہوں نے فہمائش کی۔ ''تمہیں اپنی بیوی کو وقت دینا چاہیے۔ معلوم نہیں تمہاری مصروفیت کا دائرہ کار کیا ہے۔ تمہارے منہ سے بدبو آرہی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے تم نے پی رکھی ہے۔ آخر تم اتنی کیوں پینے لگے ہو؟ اب تمہارا نروس بریک ڈاؤن رہنے لگا ہے۔'' انہوں نے بہت سی باتیں کر ڈالیں۔

میں نے ان سے وعدہ کیا کہ میں اب شراب کو ہاتھ نہ

لگاؤں گا۔ کم از کم میں اتنی تو احتیاط کر سکتا تھا کہ جب پریم نگر میں داخل ہوں تو منہ صاف کر لوں، تاکہ میری بداعتدالیوں کا انہیں پتا نہ لگ سکے۔

تھوڑی دیر بعد موبائل کی بیل بجی تو میں نے اسے کان سے لگایا۔ دوسری طرف سے راجندر بات کر رہا تھا۔ وہ بولا۔ ''یہ لڑکی جسے تم اپنی بیوی ماننے سے انکار کر رہے ہو، اس کا پولیس کے پاس پہلے سے کوئی ریکارڈ نہیں ہے۔''

''گویا وہ جرائم پیشہ نہیں ہے؟'' میں نے اندازہ لگایا۔

''ہاں۔ آگے تمہاری مرضی ہے۔'' اس نے فون آف کر دیا۔

میں چونکہ تھکن محسوس کر رہا تھا اس لیے اپنے کمرے میں چلا گیا اور بستر پر دراز ہو گیا۔ وہ فائر کا دھماکا تھا جس سے میری آنکھ کھلی تھی۔ میں نے اسے اپنے واہمے سے تعبیر کیا۔ فوراً ہی دوسرا فائر ہوا تو میرا واہمہ جاتا رہا۔ میں لپک کر اپنی میز تک گیا اور میں نے اس کی نچلی خفیہ دراز میں ہاتھ ڈالا تاکہ ریوالور نکال سکوں لیکن وہ وہاں نہیں تھا۔

میں لاؤنج میں گیا تو میں نے اوپری منزل کو جانے والے زینوں پر کسی کو جاتے دیکھا۔ تاریکی کی وجہ سے میں اندازہ نہ لگا پایا۔ میں اس کے پیچھے دوڑا تو کسی چیز سے الجھ کر گر پڑا۔ وہ کوئی انسانی جسم تھا۔ میرے رگ و پے میں سنسنی دوڑنے لگی۔ میں سوئچ بورڈ کی طرف گیا اور اسے ٹٹول کر سوئچ آن کر دیا.... ایک آدمی جو خون میں لت پت تھا جس کی ناک طوطے کی طرح لمبی اور مڑی ہوئی تھی۔ اس کے رخسار پر زخم کا ایک لمبا سا نشان تھا۔ اسے پہچاننے میں مجھے دیر نہ لگی۔ وہ وہی تھا جس نے آخری بار نرگس اور میرے ساتھ بار میں پی تھی۔ وہ حالتِ کرب میں تھا۔ سب سے زیادہ حیرت انگیز چیز میرا ریوالور تھا جو اس کے قریب پڑا تھا۔ اسے کس نے قتل کیا تھا؟ میں نے نہتی حالت میں اوپر جانا مناسب نہیں سمجھا۔ وہ ملحقہ چھت پر بھی جا سکتا تھا اور وہاں سے آسانی کے ساتھ فرار ہو سکتا تھا۔

میں اپنا ریوالور اٹھانے کے لیے جھکا ہی تھا کہ مجھے خیال آ گیا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس پر کسی کی انگلیوں کے نشانات ہوں۔ میں نے اپنا ارادہ ملتوی کر دیا۔ دفعتاً مجھے لڑکی کے کمرے سے فون پر باتوں کی آواز سنائی دی۔ میں لپک کر اس طرف گیا اور میں نے ناب گھمائی۔ دروازہ کھل گیا۔ وہ فون کے پاس کھڑی کہہ رہی تھی۔ ''ہاں۔ راجیش نے قتل کیا ہے۔ میں نے فائر کی آواز خود سنی ہے۔ وہ......''

میں نے اس کے نزدیک پہنچ کر اس کے ہاتھ سے ریسیور جھپٹ لیا اور اسے کریڈل پر پٹخنے کے بعد لڑکی کے رخسار پر ایک تھپڑ رسید کر دیا۔ وہ تیورا کر بستر پر گری اور چیخنے چلانے لگی۔ ''تم نے اسے قتل کیا ہے۔ کیا اب تم میرے ساتھ بھی یہی سلوک کرنے والے ہو؟ دور ہو جاؤ۔ یہاں سے بھاگ جاؤ۔'' وہ ہذیانی انداز سے بول رہی تھی۔ مجھے خیال آیا کہ اس نے پولیس کو بھی ایسا ہی کچھ بتایا ہوگا۔

''مرنے والا کون تھا؟'' میں نے درشتی سے پوچھا۔

''مجھے معلوم نہیں۔'' وہ سسکتے ہوئے بولی۔

''میں اس شخص کو پہلے بھی دیکھ چکا ہوں۔'' میں نے دانت پیس کر کہا۔ ''میرے خلاف کوئی سازش کی جا رہی ہے۔ تم پولیس سے یہ کہو گی کہ میں نے اسے ہلاک نہیں کیا ہے۔''

''میں پولیس کو سچ بتا دوں گی۔'' اس نے مجھ سے مرعوب ہوئے بغیر کہا۔

تھوڑی دیر بعد باہر ایک گاڑی رکنے کی آواز سنائی دی۔ اس کے بعد دروازے پر دستک دی گئی۔ میں نے خواب گاہ سے نکل کر دروازہ کھولا تو انسپکٹر راجندر اور پولیس انچارج ونود کو کھڑے پایا۔ ان کے علاوہ جیپ میں دو کانسٹیبل بھی تھے۔ میں نے ایک طرف ہٹ کر انہیں اندر آنے کا راستہ دیا۔ پھر انہیں اس پُراسرار شخص کی طرف لے گیا۔ ونود لاش کا معائنہ کر ہی رہا تھا کہ خواب گاہ کا دروازہ کھلا اور لڑکی لاؤنج میں آ گئی۔ اس نے میری طرف انگلی اٹھا کر کہا۔ ''راجیش نے اس شخص کو ہلاک کیا ہے۔''

''اس کی بات پر یقین نہ کرنا۔'' میں نے راجندر سے کہا۔ ''مقتول وہی ہے جس کے بارے میں میں نے تمہیں پہلے بتایا تھا کہ وہ میری اور نرگس کی میز پر بن بلائے آ گیا تھا اور کافی دیر تک ہمارے ساتھ رہا تھا۔ ایک بار اس نے میرا تعاقب بھی کیا تھا۔''

''ہاں، میں اسے جانتا ہوں۔'' ونود بولا۔ ''پولیس کے پاس اس کی ہسٹری شیٹ ہے۔ یہ رشی چوپڑا ہے۔ سینتیس برس پہلے ممبئی کے انڈر ورلڈ میں اس کی کافی دھوم تھی۔ پولیس اس کے نام سے کانپتی تھی۔ پھر وہ اچانک غائب ہو گیا۔ سی آئی ڈی نے اسے بہت تلاش کیا اور انٹرپول سے بھی مدد لی لیکن اس کا پتا سراغ کہیں نہ ملا۔''

''میں نے اس کیس کی فائل پڑھی ہے۔'' ایک کانسٹیبل رام راؤ نے کہا۔ ''رشی چوپڑا کا خاندان ٹھیک اسی

کوٹھی میں رہتا تھا جہاں اس وقت ہم کھڑے ہیں۔"

"یہ ریوالور کس کا ہے۔" ونود نے اشارہ کر کے کہا۔

"یہ راجیش کا ہے۔ میں نے ان کی میز پر کئی بار رکھا دیکھا تھا۔" لڑکی نے معلومات فراہم کیں۔

"یہ لائسنس یافتہ ریوالور تھا اور میں نے اسے جہاں چھپا کر رکھا تھا وہاں سے غائب ہو گیا۔ اب میں اسے لاش کے قریب دیکھ رہا ہوں۔" میں نے کہا۔

"تم کیا کہتی ہو؟" انچارج ونود نے پوچھا۔

"بیماری کے بعد ان کا رویہ میرے ساتھ درست نہیں ہے۔" اس نے معصومیت سے کہا۔ "ان کا نروس بریک ڈاؤن رہتا ہے۔ محض اس وجہ سے کہ یہ ان دنوں شراب حد سے زیادہ پینے لگے ہیں۔"

"اس واقعے کے بارے میں بتایئے۔ یہ کیسے پیش آیا؟"

"میرے شوہر راجیش کہیں گئے ہوئے تھے اس لیے میں شوبھا ڈے کا ایک ناول پڑھنے لگی۔ اس اثنا میں مجھے نیند آ گئی۔ مجھے معلوم نہیں کہ کب ناول میرے ہاتھ سے گر گیا۔ جب پورچ میں کار رکنے کی آواز آئی تو میں سمجھ گئی کہ یہ واپس آ گئے ہیں۔ میں وقفہ دے کر اٹھی تو میں نے فائرنگ کی آواز سنی۔ میں نے دروازے میں درز پیدا کر کے دیکھا۔ میرے شوہر اس شخص پر گولیاں چلا رہے تھے۔ اس کے بعد انہوں نے ریوالور پھینک دیا اور اپنے ہاتھ صاف کر لیے۔" اس نے کہا اور پھر اپنا چہرہ ہتھیلیوں میں چھپا کر سسکیاں لینے لگی۔ "مجھے اب ان سے ڈر لگنے لگا ہے۔ اب میں ان کے ساتھ نہیں رہوں گی۔"

بلاشبہ وہ بہت اچھی اداکارہ تھی۔ اگر میرے پاس کوئی ایوارڈ ہوتا تو میں اسے پیش کر دیتا۔

"اور تم کیا کہتے ہو؟" اس نے مجھ سے پوچھا۔

میں نے یہ سوچے بغیر کہ وہ میری کہانی پر یقین کرے گا یا نہیں۔ بلاکم و کاست سارا واقعہ بیان کر دیا۔

"تمہیں ہمارے ساتھ تھانے چلنا ہوگا۔" ونود نے کہا۔

میں جانتا تھا کہ وہ بالآخر یہی کہے گا۔ اگر میں اُن کے ساتھ چلا جاتا تو وہ میرے گلے میں پھندا ڈالنے سے باز نہیں آتے۔ مجھے اس چیز سے بچنا تھا۔ وہ ہتھکڑیوں کا جوڑا لے کر میری طرف بڑھنا چاہتا تھا کہ میں نے سرعت سے ریوالور اٹھا لیا جو لاش کے قریب پڑا تھا۔

"خبردار کوئی آگے آیا تو......" میں نے سب کو للکارا۔ "ابھی تک میں نے کسی کو ہلاک نہیں کیا ہے۔ لیکن اگر کسی نے میری طرف بڑھنے کی کوشش کی تو میں اسے ضرور ہلاک کر دوں گا اور کوئی لحاظ نہیں کروں گا۔" یہ جملہ خاص طور پر میں نے راجندر کے لیے کہا تھا تاکہ وہ عقل مند بننے کی کوشش نہ کرے۔

"راجیش تم اچھا نہیں کر رہے ہو۔" راجندر نے کہنا چاہا لیکن میں نے اسے ڈپٹ دیا۔

"میں نے تم سے مدد چاہی تھی مگر تم نے مجھے ہی مجرم سمجھنا شروع کر دیا انسپکٹر صاحب۔ اب میں خود ہی اس مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کروں گا۔"

میں ان لوگوں کو کور کیے ہوئے ڈرائنگ روم میں داخل ہوا۔ اس کا دروازہ بند کرنے کے بعد میں دوسرے دروازے سے کچن میں گیا اور اس کے عقبی دروازے سے مکان کے پچھلے حصے میں پہنچ گیا۔ اس کے بعد پورچ کی جانب جانا دشوار ثابت نہ ہوا۔ لاؤنج کی طرف سے ایک فائر ہوا اور گولی میرے کان سے چھوتی ہوئی گزر گئی۔ پھر راجندر نے چیخ کر کہا۔ "راجیش! حماقت نہ کرو۔ مارے جاؤ گے۔"

میں نے اس کے انتباہ کی پروا نہیں کی اور کار میں بیٹھ کر اسے اسٹارٹ کر دیا۔ اس بھاگ دوڑ میں ریوالور میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور کار کے باہر جا پڑا۔ اس وقت اتنی مہلت نہیں تھی کہ میں اسے اٹھاتا۔ چنانچہ میں نے اس کی پروا نہیں کی۔ جب تک وہ لوگ پورچ میں آئے، میں خاصی رفتار سے وہاں سے نکل آیا۔ کافی دیر تک سڑکوں پر بے مقصد ڈرائیونگ کرنے کے بعد میں نے مڑ کر دیکھا پولیس کی جیپ کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ اب خیال آیا کہ کہاں جانا بہتر ہوگا؟ اس وقت کون میری مدد کر سکتا ہے؟

دماغ نے ایک مشورہ دیا کہ مجھے اس وقت کامنی کے فلیٹ پر جانا چاہیے۔ میں نے اپنی کار کا رخ اس طرف کر دیا۔ کار کو کافی فاصلے پر پارک کر کے میں اپسرا اپارٹمنٹ کی طرف چل دیا۔ جب میں نے اطلاعی گھنٹی بجائی تو دروازہ نہیں کھلا اور اس کے بجائے بائیں جانب والی پڑوسن نے جھانک کر پوچھا۔ "کیا بات ہے؟"

"مجھے کامنی سے ملنا ہے۔"

"وہ کل رات سے فلیٹ پر نہیں ہے۔" اس نے جواب دیا۔ "پولیس کو بھی اس کی تلاش ہے۔ انہوں نے ہدایت کی ہے کہ میں ملاقاتیوں کے نام درج کروں۔ آپ کا کیا نام ہے جناب؟"

''انسپکٹر راجندر۔'' میں نے کہا اور زینے طے کرکے نیچے چلا گیا۔

سوچ کی طنابیں ایک بار پھر کھنچنے لگیں۔ اب میں کہاں جاؤں؟ دماغ نے صلاح دی کہ مجھے ڈاکٹر گوپال کے مکان پر جانا چاہیے۔ مجھے امید تھی کہ بہت سے سوالات کا جواب اس کے پاس سے مل جائے گا۔ میں اس کے کلینک اور مکان کی طرف چل پڑا۔ میں نے پورچ میں اپنی کار کھڑی کی اور اتر آیا۔ مجھے یقین تھا کہ کار کی آواز سن کر وہ دروازے تک آجائے گا۔

میں نے توقف کیا اور جب کوئی ردِعمل ظاہر نہیں ہوا تو میں دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔ مریضوں کے حصے میں اس وقت سناٹا تھا۔ میں نے کہا۔ ''ڈاکٹر! تم کہاں ہو؟''

مکان کے اندرونی حصے سے کوئی جواب نہیں آیا۔ بدستور سناٹے کی حکمرانی تھی۔ مجھے حیرت ہوئی کہ وہ کہاں چلا گیا؟ پھر خیال آیا کہ ممکن ہے پولیس اسے تفتیش کے لیے تھانے لے گئی ہو۔ مریضوں کے بیٹھنے کے لیے جو کمرا تھا اس میں ایک چھوٹا سا دروازہ تھا۔ میں نے اسے کھولا تو ایک راہ داری نظر آئی۔ میں نے اس میں قدم رکھ دیا۔ راہ داری طے کرنے کے بعد پھر ایک دروازہ نظر آیا۔ ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ کدھر کو جاؤں کہ اچانک دھپ دھپ کی آواز آنے لگی۔ جیسے کوئی بستر پر ٹانگیں چلا رہا ہو۔ اس کے بعد ایک گھٹی گھٹی سی آواز سنائی دی۔

میرا جذبۂ تجسس بیدار ہوگیا کہ وہ کون ہوسکتا ہے؟ کیا اسے کمرے میں قید کیا گیا ہے؟ میں نے خاصی بلند آواز میں پوچھا۔ ''اندر کون ہے؟''

جواب میں دھپ دھپ کی مزید آوازیں سنائی دیں۔ میں نے دروازے کا ناب گھمایا لیکن وہ نہ کھلا اس لیے کہ دروازہ لاک تھا۔ میں نے دو قدم پیچھے ہٹ کر شانے سے دروازے پر ٹکر ماری۔ اس کے قبضے جھنجھنا گئے۔ دوسری ٹکر پر وہ مزید ڈھیلا ہوگیا اور تیسری ٹکر پر اس کا لاک ٹوٹ گیا اور وہ کھل گیا۔

کمرے کے وسط میں ایک میز پر کامنی لیٹی تھی۔ اس کے ہاتھ پاؤں بندھے تھے اور منہ پر ٹیپ چڑھا تھا۔ وہ غوں غوں کرکے مجھے متوجہ کررہی تھی۔ مجھے حیرت ہوئی۔ میں نے اس سے پہلے گوپال کے کلینک میں وہ کمرا نہیں دیکھا تھا۔ میں نے اس کے ہونٹوں سے ٹیپ علیحدہ کردیا۔ وہ گلوگیر آواز میں بولی۔ ''راجیش! میں چھتیس گھنٹوں سے یہاں قید ہوں۔ ان ظالموں نے......''

''ٹھہرو۔ میں تمہاری بندشیں کھول دوں، اس کے بعد اپنی کہانی سنانا۔''

میں نے اس کے ہاتھ پاؤں کھول دیے۔ دیر سے بندھے ہونے کے سبب اس کے ہاتھوں اور پیروں پر رسی کے نشانات بن گئے تھے اور وہاں خون کی گردش رک گئی تھی۔ میں نے ان جگہوں کی مالش کی تو اسے افاقہ ہوا۔ اس میں زندگی کے آثار دکھائی دینے لگے۔ پھر میں نے اسے پانی پلایا۔ اس نے رک رک کر بولنا شروع کردیا۔

''راجیش! میں ایک بار پھر تمہارے مکان پریم نگر پر گئی تھی۔ میں اطلاعی گھنٹی بجا رہی تھی کہ عقبی حصے میں آہٹ سنائی دی۔ میں اس طرف گئی تو میں نے ایک شخص کو چاروں ہاتھ پاؤں سے چلتے دیکھا۔ وہ مکان میں داخل ہونے کی کوشش کررہا تھا اور احتیاط برت رہا تھا کہ کسی کی اس پر نظر نہ پڑے۔ مجھ پر نگاہ پڑتے ہی اس نے غیظ و غضب کے عالم میں جیب سے ریوالور نکال لیا اور مجھ پر تانتے ہوئے حکم دیا کہ میں اس کی کار میں بیٹھ جاؤں۔ میں نے اس کے حکم کی تعمیل کی۔ اس نے مجھے یہاں لاکر قید کردیا۔''

''وہ آدمی کون تھا؟ اس کا حلیہ کیسا تھا؟''

''اس کی ناک بے حد لمبی تھی اور دائیں رخسار پر زخم کا لمبا سا نشان۔''

''اس کا مطلب ہے کہ وہ رشی چوپڑا تھا۔ انڈر ورلڈ کا بدنام شخص۔'' میں نے اسے بتایا۔ ''مگر ڈاکٹر گوپال کہاں گیا؟''

''معلوم نہیں۔'' اس نے بے چارگی سے کہا۔ ''یہاں سناٹا تھا۔ وہ شخص جس کا نام تم چوپڑا بتا رہے ہو، بہت غصے میں تھا اور اس کا کہنا تھا کہ وہ ان سب سے نمٹ لے گا۔ وہ ذہنی مریض معلوم ہوتا تھا۔ مجھ سے آنکھیں ملا کر بات نہیں کررہا تھا اور مسلسل بڑبڑا رہا تھا۔ اپنی الجھنوں میں گرفتار۔ اپنے اردگرد کے ماحول سے ناآشنا۔''

پھر اس نے مجھ سے پوچھا کہ میں اب تک کیا کرتا رہا ہوں؟ میں نے اسے اپنی کہانی سنائی۔ اس کے بعد کہا۔ ''اس کمرے کو دیکھ کر مجھے حیرت ہورہی ہے۔ اس لیے کہ ڈاکٹر سرجن نہیں ہے۔ پھر وہ کن لوگوں کے آپریشن کرتا رہا ہے؟''

''ممکن ہے ضرورت پڑنے پر مریضوں پر نشتر زنی کرتا ہو۔''

''اس کے ہاں ایسے کون سے مریض آتے تھے؟'' میں نے الجھن آمیز لہجے میں کہا۔

''میرے پاؤں میں ایک ہی سینڈل ہے۔'' کامنی نے بتایا۔ ''ایک میں نے تمہارے مکان پریم نگر کے لان میں اتار دی تھی، تاکہ تم حالات و واقعات کا کچھ اندازہ لگالو۔''

''وہ مجھے مل گیا تھا، لیکن میری الجھنوں میں مزید اضافہ ہوگیا۔ میں سمجھ ہی نہ پایا کہ تم کہاں ہوسکتی ہو اور تمہیں کہاں تلاش کیا جاسکتا ہے۔'' میں نے کہا پھر اس کے ساتھ ڈاکٹر کے آفس میں گیا۔ میں نے اس کے کاغذات کا جائزہ لیا اور بہت سی کتابوں پر ہاتھ مارا، لیکن کوئی کارآمد چیز ہاتھ نہ لگی۔

''تمہیں کس چیز کی تلاش ہے؟'' کامنی نے پوچھا۔

''یہ تو مجھے خود معلوم نہیں ہے۔'' میں نے لاچاری سے کہا۔ ''بس اس امید پر جائزہ لے رہا ہوں کہ کوئی ایسی چیز ہاتھ لگ جائے کہ میں کوئی سراغ لگاسکوں۔''

باتوں ہی باتوں میں جب میں نے ڈاکٹر گوپال کی میز کی نچلی دراز کھولی تو ایک پرانا سا رجسٹر نظر آیا۔ اسے کھول کر دیکھنے پر میں چونک پڑا۔ اس میں ان سارے مریضوں کے نام تھے جن کا گوپال نے علاج کیا تھا۔ اس میں سب سے پہلا مریض رشی چوپڑا تھا۔ وہی شخص جو انڈر ورلڈ کا بادشاہ ہوا کرتا تھا۔ میرے جسم میں سنسنی دوڑنے لگی۔ میں اس رجسٹر کو شروع سے آخر تک دیکھنا چاہتا تھا اور اس کے لیے پریم نگر سے اچھی کوئی جگہ نہیں تھی۔ اس لیے کہ گوپال تو کسی وقت واپس آسکتا تھا۔

''پریم نگر کی طرف چلنا چاہیے۔''

''اگر ہم پولیس اسٹیشن چلیں تو زیادہ بہتر ہوگا۔ تم نے جو کچھ معلوم کرلیا ہے، وہ تم پولیس کو بتادو۔''

''پہلے میں پریم نگر جاؤں گا۔'' میں نے اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔ ''آؤ چلتے ہیں۔''

باہر نکل کر میں نے چاروں طرف کا جائزہ لیا اور جب پولیس کی کوئی جیپ نظر نہیں آئی تو میں مطمئن ہوگیا۔ کامنی پسنجر سیٹ پر بیٹھ گئی تو میں نے کار اسٹارٹ کردی۔ تاریک گلی کوچوں میں گھومتا گھماتا ہوا میں پریم نگر پہنچ گیا۔

''ارے! یہ کیا؟ راجیش وہ دیکھو۔'' کامنی نے سرگوشی میں کہا۔

پریم نگر کے پورچ میں روشنی ہو رہی تھی اور ڈاکٹر گوپال اور وہ پُراسرار لڑکی، آنٹی شکنتلا کو مکان کے اندر سے باہر لارہے تھے۔ میں نے اپنی کار نزدیک جاکر روکی اور اتر کر چیخا۔ ''یہ تم لوگ کیا کررہے ہو؟''

میری آواز سن کر آنٹی کے جسم میں توانائی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ انہوں نے کم زور آواز میں کہا۔ ''راجیش! میرے بیٹے۔ جلدی سے پولیس کو بلاؤ۔ یہ سب گوپال کا کیا دھرا ہے۔''

گوپال نے آنٹی کو چھوڑ دیا اور لڑکی کو ہدایت دی۔ ''اسے پکڑے رہنا۔ یہ جانے نہ پائے۔''

پھر وہ ڈرامائی انداز سے میری طرف مڑا۔ تب میں نے دیکھا کہ اس کے ہاتھ میں ایک ریوالور ہے جس کی نال میری طرف اٹھی ہوئی ہے۔ گوپال کے ہونٹوں پر سفاکانہ مسکراہٹ تھی۔ ''بہت ہوشیاری دکھالی۔ اب اندر چلو۔'' اس نے غراتے ہوئے کہا۔

''کامنی تم بھاگ جاؤ۔'' میں نے آہستہ سے کہا۔

گوپال نے میرا جملہ سن کر کہا۔ ''خبردار اپنی جگہ سے ہلنے کی کوشش نہ کرنا، ورنہ میں تمہیں گولی ماردوں گا۔'' اس کی دھمکی سن کر کامنی اپنی جگہ پر ساکت ہوگئی۔ ''اب اندر چلو۔'' گوپال بولا۔

گوپال ہم سب کو کور کیے رہا اور ہم آنٹی کو اٹھا کر اندر لے آئے۔ ان سے بیٹھا نہیں جارہا تھا اس لیے میں نے ایک دیوان پر لٹادیا۔ وہ بے نام لڑکی گوپال کی طرف دیکھ کر غراتی ہوئی بولی۔ ''اب تم کیا کروگے؟ تم نے کھیل کو بگاڑ کر رکھ دیا۔ اگر تم صرف......''

گوپال نے اسے خشمگیں نظروں سے گھورا۔ وہ لڑکی اپنا جملہ مکمل نہ کرسکی اور خاموش ہوگئی۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ گوپال پر اس وقت جنونی کیفیت طاری ہے۔ اگر اسے مناسب طریقے سے ہینڈل نہ کیا گیا تو وہ ہماری جان کے درپے ہوجائے گا۔ کامنی دروازے کے قریب کھڑی تھی۔ میں نے سوچا کہ اگر وہ دروازہ کھول کر وہاں سے نکل جائے تو پولیس کے پاس پہنچ کر مدد طلب کرسکتی ہے۔ پھر گوپال پر قابو پایا جاسکتا ہے۔

اس وقت سب ساکت تھے، ایسا معلوم ہورہا تھا جیسے ہم سب پتھر کے ہوگئے ہوں۔

''گوپال تم آخر کیا چاہتے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''تم خاموش رہو، ایڈیٹ۔'' میری نام نہاد بیوی نے مجھے جھڑکی دی۔ پھر اس نے گوپال کی طرف مڑ کر کہا۔ ''تم نے چوپڑا کو گولی مار کر غلطی کی ہے۔''

''ہاں۔'' گوپال نے اعتراف کیا۔ ''ضرورت پڑی تو میں تمہیں بھی ہلاک کردوں گا۔''

''راجیش!'' آنٹی نے نحیف سی آواز میں مجھے پکارا۔

میں بے اختیار اُن کی طرف بڑھا تو گوپال غرایا۔
''خبردار! اپنی جگہ پر ساکت کھڑے رہو۔ اسے چیخنے چلانے دو۔'' اس نے توقف سے کہا۔ ''اس مسئلے کا کوئی حل سوچنا پڑے گا۔''
''سانپ کے منہ میں چھچھوندر۔'' وہ لڑکی چیخی۔ ''پہلے تم نے کہا تھا کہ اس معاملے میں کوئی قتل نہیں ہوگا۔ مگر تم نے اس لڑکی کو ہلاک کر دیا۔ اس کے بعد چوپڑا اپنی جان سے گیا۔ کاش اس معاملے میں میں نے تمہارا ساتھ نہ دیا ہوتا۔''
''ایسے منصوبوں میں یہی کچھ ہوتا ہے، احمق!'' اس نے تہدیدی انداز سے کہا۔ ''میں نے اپنے سفر کا آغاز کر دیا ہے، اب میں اپنی منزل پر پہنچ کر ہی دم لوں گا۔''
میں دماغ پر زور دینے کے باوجود کڑیاں نہیں جوڑ پا رہا تھا۔ معلوم نہیں وہ کس چکر میں تھا؟ میں نے کہا۔ ''گوپال تمہارا کاروبار بے حد گھناؤنا ہے۔ میں تمہیں خدمت کرنے والا ایک نفیس ڈاکٹر سمجھتا تھا، لیکن تم تو مجرم نکلے۔ تم نے ناجائز بچے جننے کا کام بھی شروع کر دیا، لعنت ہے تم پر۔''
''میرا اصل پیشہ ڈاکٹری نہیں بلکہ یہی ہے۔'' وہ سکون سے بولا۔ ''میں مصیبت میں گرفتار ماؤں کو ان کی اذیت سے نجات دلا دیتا ہوں۔ مگر تمہیں یہ کیسے معلوم ہوا؟''
''میں تمہارے کلینک میں وہ خفیہ کمرا دیکھ آیا ہوں جہاں تم یہ شیطانی کام کرتے ہو۔''
''تمہاری معلومات کے لیے یہ بھی بتا دوں کہ تمہاری بیوی نرگس نے بھی میری خدمات حاصل کی تھیں۔ میں نے اس کی شادی تم سے ایک منصوبے کے تحت کرائی تھی اس لیے کہ میں اسے عرصے سے جانتا ہوں۔''
''مگر تم نے اپنے منصوبے پر خود ہی پانی پھیر دیا، تم نے چوپڑا کا خون کر کے پولیس کو اس طرف متوجہ کر دیا۔'' وہ لڑکی پھر جلے بھنے لہجے میں بولی۔
''مادھوری کیا تم تھوڑی دیر کے لیے اپنی زبان کو تالا نہیں لگا سکتیں؟'' گوپال نے سفاکانہ لہجے میں کہا۔
مجھے پہلی بار معلوم ہوا کہ اس لڑکی کا نام مادھوری ہے۔ وہ لڑکی گوپال کی خوفناک آواز سن کر پھر سہم کر خاموش ہو گئی۔ تاہم اس کی نگاہوں میں گوپال کے لیے نفرت تھی۔
''مگر تم نے میری شادی نرگس سے کیوں کرائی تھی؟''
''اس لیے کہ منصوبے کے مطابق نرگس جب شکنتلا سے لڑائی جھگڑا شروع کر دیتی تو تم یہ مکان چھوڑ کر کہیں اور چلے جاتے۔ اس طرح سے میں یہاں آزادی سے آ جا سکتا تھا۔ اس دوران میں، میں شکنتلا کے دل میں جگہ بنا لیتا اور اس سے شادی کر لیتا۔ بہرحال ابھی تک تو وہ آمادہ نہیں ہوئی تھی۔'' اس نے متاسفانہ انداز میں سانس لی۔ اس کے چہرے سے تھکن مترشح تھی۔ وہ اس وقت ہارا ہوا جواری لگ رہا تھا۔
''مگر پھر چوپڑا نے نرگس کو کیوں قتل کر دیا؟'' میں نے حیرت کا اظہار کیا۔
''اس کا خیال تھا کہ اگر وہ تمہارے ساتھ ہنی مون منانے گئی تو اس کی غیر موجودگی میں، میں اور چوپڑا سارا مال ہضم کر جائیں گے۔'' گوپال نے کسی بھیڑیے کی طرح اپنے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے کہا۔ ''وہ بہرحال جسم فروش تھی۔ اس لیے اس کا دھیان دولت کی طرف لگا رہتا تھا۔ جب اس نے پولیس میں جانے کی دھمکی دی تو چوپڑا نے اسے ٹھکانے لگا دیا۔''
''مگر تمہارے ہاتھ بھی خون میں رنگے ہوئے ہیں۔'' مادھوری نے کہا۔ ''میں تمہارا ساتھ دے کر پچھتا رہی ہوں۔ معلوم نہیں ہمارا انجام کیا ہوگا۔ راجیش میں تمہیں ساری بات بتائے دیتی ہوں۔'' وہ مجھ سے مخاطب ہوئی۔
میرے لیے اس سے اچھی بات اور کیا ہو سکتی تھی۔
''تمہاری مہربانی ہوگی اور مجھے رات کو گہری نیند آ سکے گی۔''
''چوپڑا نے تمہاری شراب میں بے ہوشی کی دوا ملا دی۔ جب تم پی کر بے ہوش ہو گئے تو وہ نرگس کو اٹھا کر لے گیا اور اس سے تمہارے بارے میں معلوم کیا۔ اس نے اپنی زبان نہیں کھولی تو چوپڑا نے اس پر تشدد کیا۔ اس نے سب کچھ بتا دیا۔ اس کی روشنی میں، میں نے نرگس کی جگہ لے لی۔ مگر اب میں محسوس کر رہی ہوں کہ احمق ہوں۔ میں نے ایسا کیوں کیا؟ اس کا کیا انجام ہوگا؟''
''راجیش! انہیں بتا دو۔ انہیں بتا دو کہ.....'' آنٹی شکنتلا نے کم زور آواز میں کہنا چاہا۔ مگر اپنا جملہ مکمل نہیں کر سکیں۔
''کیا بتا دوں آنٹی؟'' میں نے پوچھا۔
ان پر پھر غنودگی چھا گئی اور وہ خاموش ہو گئیں۔
''یہ سب کچھ جانتی ہے اور میں اس سے معلوم کر لوں گا۔'' گوپال نے وحشت زدہ لہجے میں کہا۔
''کیا جانتی ہیں؟'' میں نے حیرت سے کہا۔ میں اس پر چھلانگ لگا کر اس کے ہاتھ میں دبا ہوا ریوالور چھین لینا چاہتا تھا۔ لیکن جب میں اس کی آنکھوں کی طرف دیکھتا تھا تو ڈر لگنے لگتا تھا۔ ''میں ابھی تک تاریکی میں ہوں کہ تم کس چیز

کے پیچھے پڑے ہوئے ہو اور تم نے نرگس کو ہلاک کر کے مادھوری کو میرے پیچھے کیوں لگایا ہے؟ اگر کوئی حرج نہ ہو تو اس سے پردہ اٹھا دو۔''

میں اسے باتوں میں لگا کر سوئچ بورڈ کی طرف بڑھ رہا تھا، تاکہ سوئچ آف کر کے تاریکی کر دوں اور اس سے بچ نکلوں۔

''میں ایک ناآسودہ اور نامطمئن شخص ہوں۔ میں نے میڈیکل تو پاس کر لیا مگر اپنے اس خواب کی تعبیر حاصل نہ کر سکا کہ میں بے حد دولت مند بن جاؤں۔ انہی دنوں میرے پاس رشی چوپڑا کا باپ بلراج چوپڑا آیا۔ یہ سب جانتے تھے کہ وہ انڈرورلڈ کے لیے کام کرتا تھا۔ اس کے پاس بہت دولت تھی مگر وہ اسے بینکوں میں رکھنے کا عادی نہیں تھا۔ اس کے علاوہ وہ ساری رقم ناجائز دھندوں سے حاصل کی گئی تھی اس لیے وہ اسے مکان میں چھپا کر رکھ دیتا تھا۔ اس کے پاس سونا اور ہیرے جواہر بھی بہت تھے۔ وہ جانتا تھا کہ حکومت اگر نوٹ تبدیل کر دے گی تو وہ مارا جائے گا۔ خیر جب وہ میرے پاس آیا تو بہت زخمی تھا اور اسے گولی لگ چکی تھی۔ غالباً کسی پولیس مقابلے میں۔ اس نے مرتے ہوئے اتنا بتایا کہ اس نے اپنی ساری زندگی کی کمائی اپنے مکان پریم نگر میں رکھی ہوئی ہے۔ میرے لاکھ پوچھنے پر بھی اس نے جگہ کا نام نہیں بتایا۔ میں نے اس کے جسم سے گولی تو نکال دی مگر خون زیادہ بہہ جانے کی وجہ سے وہ جانبر نہ ہو سکا۔ میں نے اس کا مکان پریم نگر تلاش کر لیا۔ اب میں چاہتا تھا کہ اسے خرید لوں یا پھر کرائے پر لے لوں تاکہ اس کی چھپائی ہوئی دولت کو تلاش کروں۔ جب میں نے دولت جمع کر لی اور اس مکان کو خریدنا چاہا تو معلوم ہوا کہ تمہاری آنٹی نے مجھ سے پہلے اسے خرید لیا ہے۔ میں نے انہیں بھاری سے بھاری پیش کش کی لیکن انہوں نے انکار کر دیا۔ تب میں نے کوشش کی کہ وہ مجھ سے شادی کر لیں۔ وہ اس پر بھی رضامند نہ ہوئیں۔ میں نے سوچا کہ اگر میں دولت جمع کر لوں تو ہو سکتا ہے وہ اس بات سے متاثر ہو کر میری طرف مائل ہو جائیں۔ چنانچہ میں نے اسقاط حمل کا پیشہ اپنا لیا۔ بڑے گھرانوں کی لڑکیاں میرے کلینک پر زیادہ آتی تھیں اس لیے بھاری رقومات دے جاتی تھیں۔ کچھ عرصہ پہلے بلراج کا لڑکا رشی چوپڑا شہر میں وارد ہوا۔ اس نے پتا لگا لیا کہ مرتے وقت اس کے باپ کا علاج میں نے کیا تھا۔ اس لیے وہ میرے پاس آیا۔ اس نے انکشاف کیا کہ باپ کی دولت پریم نگر میں ہے اور اسے وہ میرے تعاون سے حاصل کرنا چاہتا ہے۔ میں نے منصوبہ بنایا اور نرگس سے تمہاری شادی کرا دی۔ لیکن جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں کہ وہ لانچ میں آ گئی۔ اسے ہلاک کر کے مادھوری کو اس کی جگہ دی گئی۔ یہ میرے منصوبے کے خلاف تھا۔ اس لیے کہ میں کوئی ہلاکت نہیں چاہتا تھا۔ رشی نے معاملہ خراب کر دیا۔''

''مگر تم نے رشی کو کیوں قتل کر دیا؟''

''اس لیے کہ مادھوری اور رشی میرے خلاف ہو گئے تھے۔ یہ مجھے راستے سے ہٹانا چاہتے تھے۔ میں نے رشی کا کام تمام کر دیا۔ بہرحال اب اس دولت کو حاصل کرنے سے مجھے کوئی نہیں روک سکتا۔ تمہاری آنٹی کب تک زبان نہیں کھولے گی؟''

میں اس اثنا میں سوئچ بورڈ تک پہنچ چکا تھا۔ میں نے پھرتی سے وہ سوئچ آف کر دیے۔ لاؤنج میں تاریکی پھیل گئی۔ میں بے تحاشا اوپر جانے والے زینوں کی طرف بڑھا۔ گوپال میرے پیچھے آ رہا تھا۔ میں نے چیخ کر کامنی سے کہا۔ ''تم باہر نکل جاؤ اور پولیس کو اطلاع دو۔''

گوپال ہاتھ میں ریوالور لیے ہوئے اوپر آ رہا تھا۔ اس کے ریوالور کا رخ میرے سینے کی طرف تھا۔ لاؤنج میں تاریکی تو تھی لیکن اسٹریٹ لائٹ کھڑکی کے ذریعے سے اندر آ رہی تھی، اس لیے بے حد ہلکی روشنی ہو رہی تھی اور گوپال اس روشنی سے فائدہ اٹھا رہا تھا۔ ''راجیش! تم مجھ سے بھاگ نہیں سکتے۔'' وہ درندوں کی طرح غرایا۔ ''اگر جنبش کی تو میں تمہیں گولی مار دوں گا۔''

میرے رگ و پے میں خوف کی ایک لہر دوڑ گئی۔ موت میرے اس قدر قریب آ چکی تھی۔ یہ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ میری دھڑکنیں اتنی تیز ہو چکی تھیں کہ مجھے اپنی سماعت میں سنائی دے رہی تھیں۔ مجھے شدت سے اپنی ریوالور کی یاد آ رہی تھی۔ اگر وہ اس وقت میری جیب میں ہوتا تو گوپال مجھے دھمکیاں نہیں دے سکتا تھا۔

کامنی دروازہ کھول کر باہر جا چکی تھی۔ آواز ہونے پر گوپال نے ایک فائر دروازے کی طرف بھی کیا تھا۔ لیکن گولی کامنی کو نہیں لگی تھی۔ نیچے سے مادھوری چیخنے چلانے لگی۔ ''گوپال تم کیا کر رہے ہو؟ ہماری جانیں خطرے میں ہیں۔ فائرنگ کی آواز سن کر لوگ اس مکان کی طرف آ رہے ہیں۔ بھاگ چلو اور اپنی جان بچانے کی فکر کرو۔'' وہ زینے طے کر کے اوپر آ گئی اور اضطراب میں گوپال کا کوٹ تھام کر کھینچنے لگی۔

گوپال اس وقت دیوانہ ہو رہا تھا۔ اس نے پلٹ کر مادھوری پر فائر کیا۔ گولی اس کے بالوں کو چھوتی ہوئی گزر گئی۔ تاہم وہ کچھ اتنی خوف زدہ ہوئی کہ اس کے قدم لڑکھڑا گئے اور وہ زینے پر گر کر لڑھکتی ہوئی نیچے چلی گئی۔ اس دوران گوپال کی توجہ میری طرف سے ایک لمحہ بھی نہ ہٹی۔ وہ مجھے کور کیے ہوئے دو زینے مزید اوپر چڑھ آیا۔ معلوم نہیں کیا ہوا کہ اسٹریٹ لائٹ بجھ گئی اور وہاں مکمل طور پر تاریکی چھا گئی۔

میں پوری طرح سے ہوشیار تھا۔ میں نے اس کے ریوالور سے ہونے والے فائر گن لیے تھے۔ وہ چار فائر کر چکا تھا۔ گویا اسے تین فائر مزید کرنا تھے۔ چھت پر دو کمرے اسٹور کی حیثیت سے استعمال ہوتے تھے۔ میں نے ان میں سے ایک کا دروازہ کھول کر زور سے بند کیا۔

گوپال نے اندازے سے اس طرف فائر کر دیا۔ گولی مجھے نہیں لگی اس لیے کہ میں زینے کی سائڈ سے چپکا کھڑا تھا۔ اس کا بے حد ہلکا سا سایہ دکھائی دے رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ''راجیش! تمہارے بچنے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ خود کو میرے حوالے کر دو۔''

وہ مزید دو زینے چڑھ کر اوپر آ گیا۔ میں سانس روکے اس کا منتظر تھا۔ وہ جوں ہی اسٹور کے دروازے تک پہنچا اور اس نے دروازہ کھولنے کے لیے لات ماری تو میں نے عقب سے جا کر اس کی گدی پر زوردار مکا مارا۔ اس کے حلق سے ایک کریہہ چیخ نکلی اور وہ فرش پر گر پڑا۔ میں نے اسے مہلت نہ دی اور اسے چھاپ لیا۔ میں نے اس کا سر کئی بار فرش سے ٹکرا دیا۔ جس کے نتیجے میں وہ بے سدھ اور بے جان ہو گیا۔ اس کا ریوالور ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا لہٰذا میں نے اٹھا کر اسے اپنی جیب میں ڈال لیا۔

اس کے بعد میں نے اس کا کوٹ تھاما اور اسے گھسیٹتا زینے سے لڑھکاتا ہوا نیچے تک لے آیا۔ وہاں میں نے روشنی کر دی۔ سب سے پہلے میری نگاہ مادھوری پر پڑی۔ وہ مر چکی تھی۔ زینے پر سے لڑھکنے کی وجہ سے اس کی گردن ٹوٹ گئی تھی۔ اس کے ہاتھ پیر بے ہنگم زاویوں پر مڑے ہوئے تھے اور منہ کھلا ہوا تھا۔

میری آنٹی بدستور آنکھیں بند کیے دیوان پر لیٹی تھیں۔ آہٹ ہونے پر انہوں نے آنکھیں کھول دیں اور اشارے سے مجھے قریب بلایا۔ میں ان کے نزدیک گیا تو انہوں نے شکستہ سی آواز میں کہا۔ ''راجیش! میں تمہیں کچھ بتانا چاہ رہی تھی۔''

اچانک دروازہ کھلا اور کامنی، انسپکٹر راجندر کے ساتھ اندر آ گئی۔ ''راجیش! مجھے کامنی نے سب کچھ بتا دیا ہے۔'' وہ بولا۔ ''اس لڑکی کو کس نے ہلاک کیا ہے؟'' اس نے مادھوری کی طرف اشارہ کیا۔

''گوپال نے۔'' میں نے سکون سے جواب دیا۔

''اس پر قابو پانے میں تمہیں چوٹ تو نہیں آئی؟'' اس نے دوستانہ لہجے میں پوچھا۔

''نہیں۔'' میں نے آہستہ سے کہا پھر میں آنٹی کی طرف دوبارہ متوجہ ہوا۔ آپ کی طبیعت کیسی ہے؟''

''میرا خیال ہے کہ گوپال مجھے غلط دوائیں دے رہا تھا۔ اب میں دوسرے کسی ڈاکٹر کا علاج کروں گی تو صحت یاب ہو جاؤں گی۔'' وہ بولیں۔ ''راجیش! میں تمہیں ایک اہم بات بتانا چاہتی ہوں۔ تم میری طرف متوجہ کیوں نہیں ہو رہے ہو؟''

''میں ہمہ تن گوش، بلکہ خرگوش ہوں۔''

''راجیش، جس دولت کے پیچھے یہ لوگ اتنی تگ و دو کر رہے ہیں، وہ مجھے مل چکی ہے اور اس کا بہت کم حصہ اب باقی بچا ہے۔ دراصل تمہارے دادا نے زیادہ جائداد نہیں چھوڑی تھی بس ایک یہی مکان خرید کر مجھے دے دیا تھا۔ پریم نگر میں آنے کے بعد ہی مجھے اتفاق سے وہ خزانہ مل گیا تھا جسے میں نے کسی پر ظاہر نہیں کیا اور تحمل مزاجی سے خرچ کرتی رہی۔ اسی کی بنا پر میں نے ملکاؤں جیسی زندگی بسر کی ہے۔ تمہیں تعلیم دلائی ہے اور کاروبار کے لیے رقم دی تھی۔ ان الو کے پٹھوں سے کہہ دو کہ اس کے پیچھے اپنے ہی ساتھیوں کو ہلاک نہ کریں۔''

''اسے کہتے ہیں حالات کی ستم ظریفی۔'' میں نے ہنس کر کہا اور کامنی کا ہاتھ تھام لیا۔

راجندر اپنے موبائل پر انچارج صاحب ونود کھنہ کو رپورٹ دے رہا تھا۔

''بالآخر قدرت نے ہمیں پھر ملا دیا، راجیش!'' وہ سرگوشی میں کہہ رہی تھی۔ ''تمہیں قدرت پر یقین ہے نا؟'' کامنی نے کہا۔

''جب تک تمہارا ہاتھ میرے ہاتھ میں ہے تب تک ضرور ہے۔'' میں نے بھی سرگوشی میں جواب دیا اور اسے لے کر آنٹی شکنتلا کے نزدیک چلا گیا۔ میں انہیں بہت کچھ بتانا چاہتا تھا مگر ان کے ہونٹوں پر پھیلی مطمئن مسکراہٹ سے معلوم ہوتا تھا کہ انہیں پیشگی بہت کچھ معلوم ہے۔

وحشت گرد

سلیم فاروقی

انسان کا اصل وجود وہی قرار پاتا ہے... جو سب کے لیے ہو... اور سب کے ساتھ ہو... اس طرح کہ جو کچھ وہ یک و تنہا آج کرتا ہے... اس کی بازگشت کل پورے عالم میں گونجے... انسانی وجود کے ارزاں اور بے مول ہونے کی داستان... ناپاک عزائم رکھنے والوں کی یکجائی اور اٹوٹ ارادوں سے لبریز کوششوں کا ہولناک شاخسانہ... ان کے وجود غیر قوم و ملک سے تعلق رکھنے کے باوجود سرزمینِ پاک میں گڑے ہوئے تھے... اس کھیل کا آغاز نہ جانے کب سے شروع تھا... مگر انجام تک پہنچانے والے زندہ وجود بن کے نمودار ہو چکے تھے...

ہوس و درندگی، لہو کی ارزانی اور رعونت کا احوال

رات انتہائی سرد تھی۔ خنکی گویا ہڈیوں میں گھسی جارہی تھی۔ نوید نے اپنی چرمی جیکٹ کی زپ بند کی، سر پر ہیلمٹ لگایا اور بائیک اسٹارٹ کر دی۔ ہیوی بائیک جھٹکے سے آگے بڑھی اور سڑک پر فراٹے بھرنے لگی۔

اسی وقت اندھیرے میں کھڑی ہوئی ایک ڈبل کیبن پک اَپ بھی حرکت میں آئی تھی۔ اس کے ہیڈ لیمپس آف تھے اور وہ بہت مہارت سے نوید کا تعاقب کر رہی تھی۔ پک اَپ والے ہر ممکن احتیاط سے کام لے رہے تھے۔

نوید نے بیک ویو مرر میں دیکھا۔ اسے تاریکی میں ایک ہیولا سا نظر آیا۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے بائیک کو اسپیڈ دی اور گیئر بدل کر انتہائی تیز رفتاری سے موٹر سائیکل دوڑانے لگا۔ وہ جانتا تھا کہ ڈبل کیبن پک اَپ میں جو لوگ سوار ہیں، وہ اس کی جان کے دشمن ہیں۔ وہ اپنا کام پورا کیے بغیر ان لوگوں کے ہاتھ نہیں آنا چاہتا تھا۔ اس نے بلا مقصد بائیک کو مختلف سڑکوں پر موڑا، خوفناک حد تک رفتار بڑھا دی لیکن ڈبل کیبن پک اپ کسی آسیب کی طرح اس کا تعاقب کر رہی تھی۔ ڈبل کیبن پک اپ کا ڈرائیور تو ماہر تھا ہی، نوید کا خیال تھا کہ پک اپ کے انجن میں کچھ ترمیم کی گئی تھی۔ اس لیے وہ مسلسل نوید کا تعاقب کر رہی تھی ورنہ نوید جانتا تھا کہ اس کی ہیوی بائیک کو زمین پر چلنے والی کوئی سواری نہیں پکڑ سکتی تھی۔

نوید نے تیز رفتاری سے ایک موڑ کاٹا اور بائیں طرف کی سروس روڈ پر ایک خالی پلاٹ پر گاڑی کھڑی کر دی۔ وہ اب اس تعاقب کو ختم کرنا چاہتا تھا۔ اس نے بائیک بہت تیزی سے ایک بنگلے کی دیوار کے ساتھ لگائی اور خود دوسرے کونے پر گھات لگا کر بیٹھ گیا۔ اب اس کے ہاتھوں میں پوائنٹ تھری ایٹ کے کولٹ ریوالور تھے جن پر سائیلنسر فٹ تھے۔ آج کل مارکیٹ میں انتہائی جدید قسم کے پسٹل اور گنز دستیاب تھیں لیکن نوید اب بھی پوائنٹ تھری ایٹ کا ریوالور ہی استعمال کرتا تھا۔ اس ریوالور سے وہ اندھیرے میں محض آواز پر بالکل درست نشانہ لے سکتا تھا۔

اسے مین روڈ سے اس خالی پلاٹ تک پہنچنے اور گھات لگانے میں بمشکل ایک منٹ لگا ہوگا۔

فوراً ہی ڈبل کیبن پک اپ غراتی ہوئی اس ذیلی سڑک پر نمودار ہوئی اور نوید سے کچھ فاصلے پر ٹھہر گئی، اتنے فاصلے پر کہ نوید کو گاڑی میں سوار افراد کی آوازیں واضح طور پر سنائی دے رہی تھیں۔

''کہاں گیا مردود؟'' کوئی جھلا کر بولا۔ ''یہاں تو دور دور تک نظر نہیں آرہا ہے۔''

''تم نے اسے اس طرف مڑتے دیکھا تھا؟'' دوسری آواز بھی خاصی کرخت تھی۔ ''ہوسکتا ہے وہ آگے والے موڑ

پر مڑا ہو؟"

"میری آنکھیں ابھی اتنی کمزور نہیں ہوئی ہیں جان محمد۔" پہلی آواز سنائی دی۔

"ہوسکتا ہے وہ کسی بنگلے میں گھس گیا ہو؟" تیسری آواز سنائی دی۔

"کسی بنگلے میں کیسے گھس سکتا ہے۔ اس کے انتظار میں کوئی گیٹ کھولے تو نہیں کھڑا ہوگا۔" پہلی آواز میں جھنجلاہٹ تھی۔ پھر وہ کچھ سوچ کر بولا۔ "یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ وہ کسی خالی پلاٹ میں کسی بنگلے کی دیوار کے ساتھ چھپ کر کھڑا ہو؟"

"ایک خالی پلاٹ تو یہ سامنے ہے۔" دوسری آواز میں بیزاری سی تھی۔ "جان محمد! ڈیش بورڈ سے ٹارچ نکال۔"

"نہیں۔" پہلی آواز میں سختی تھی۔ "ہم ٹارچ جلانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے۔ وہ مردود شارپ شوٹر ہے۔ میں اندھیرے میں ہی اس کا ہیولا دیکھ لوں گا۔"

پھر نوید کو گاڑی کے دروازے کھلنے اور بند ہونے کی آواز سنائی دی۔ اس سلسلے میں بھی ان لوگوں نے بہت احتیاط کی تھی لیکن نوید نے وہ آواز بھی سن لی اور دیوار کے ساتھ زمین پر لیٹ گیا۔ وہ اس انداز میں لیٹا تھا کہ لیٹے لیٹے بھی انہیں نشانہ بنا سکتا تھا۔ اسے ہلکے ہلکے قدموں کی چاپ سنائی دے رہی تھی۔ اس کے اعصاب بری طرح تن گئے تھے۔ اس کے دونوں ہاتھوں میں ریوالور تھے اور وہ پلک جھپکتے میں انہیں نشانہ بنا سکتا تھا۔

وہ لوگ بھی بلی کی طرح دبے پاؤں ادھر بڑھ رہے تھے پھر نوید کو اندھیرے میں ان کے سر نظر آئے اور تیزی سے پیچھے غائب ہو گئے پھر اچانک کسی نے بے آواز فائر کر دیا۔ نوید گولی کی رینج سے دور تھا۔

اچانک پہلے آدمی کی غراتی ہوئی کرخت آواز سنائی دی۔ "فائر کرنے کی کیا ضرورت تھی بے وقوف؟" وہ سرگوشی میں بولا لیکن اس کی سرگوشی میں بھی غصے کا طوفان تھا۔ "اب اگر وہ یہاں ہوا تو جوابی فائر کرے گا۔"

"وہ یہاں نہیں ہے استاد۔" جان محمد کی آواز سنائی دی۔ "ورنہ وہ اتنا انتظار نہیں کرتا۔"

وہ لوگ مطمئن ہو گئے تھے اس لیے اچانک سامنے آ گئے۔ نوید نے بجلی کی سی سرعت سے تین فائر کیے۔ فوراً ہی فضا میں تین اذیت ناک چیخیں ابھریں اور وہ تینوں گر پڑے۔

اچانک گاڑی اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی تو نوید چونکا اور مرنے والوں کی لاشیں پھلانگتا ہوا باہر بھاگا۔ گاڑی بہت تیز رفتاری سے ریورس میں چل رہی تھی۔ ڈرائیور نے بوکھلاہٹ میں گاڑی کے ہیڈ لیمپس روشن کر لیے تھے۔ پھر

فوراً ہی بند کر دیے۔ نوید نے انداز ے سے ڈرائیور کی کھوپڑی کا نشانہ لیا اور فائر کر دیا ایک اذیت ناک چیخ گونجی اور پک اپ ایک دم بے قابو ہو کر الیکٹرک پول سے ٹکرا کر رک گئی۔ گاڑی پول سے ٹکرائی تو اچھا خاصا دھما کا ہوا تھا۔ نوید پلٹ کر اپنی بائیک کی طرف بھاگا اور اسے اسٹارٹ کر کے باہر نکل آیا۔ وہ ایک لمحے کو گاڑی کے پاس رکا اور اندر جھانک کر دیکھا۔ اندر صرف ڈرائیور کی لاش تھی۔ نوید نے بائیک کو بندوق سے نکلی ہوئی گولی کی طرح وہاں سے نکالا اور آنِ واحد میں مین روڈ پر پہنچ گیا۔ مین روڈ پر کچھ دور انتہائی تیز رفتاری سے جانے کے بعد اس نے رفتار کم کر دی کہ مبادا تیز رفتاری کے باعث اسے پولیس کی کوئی موبائل روک لے۔

بھاگ دوڑ میں تو اسے سردی کا احساس نہیں ہوا تھا لیکن کھلی فضا میں آتے ہی اسے شدید سردی کا احساس ہوا لیکن وہ چلتا رہا۔

وہاں سے سیدھا اپنے اپارٹمنٹ پہنچا۔

بلڈنگ کے داخلی دروازے سے کچھ فاصلے پر ایک فقیر گدڑی اوڑھے فٹ پاتھ پر سو رہا تھا۔ ہیوی بائیک کے انجن کی آواز سن کر اس نے نوید پر نظر ڈالی اور آہستہ آہستہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ گدڑی اب بھی اس کے جسم کے گرد لپٹی ہوئی تھی۔

اس کی طرف دھیان دیے بغیر نوید بلڈنگ میں داخل ہو گیا۔ اس نے مخصوص جگہ پر بائیک کھڑی کی اور محتاط انداز میں اردگرد کا جائزہ لے کر لفٹ کی طرف بڑھ گیا۔ لفٹ میں داخل ہوتے ہوئے اس نے ریوالور نکال لیا تھا۔

نوید ایک کثیر المنزلہ عمارت کے ساتویں فلور پر رہتا تھا۔ ساتویں فلور پر پہنچ کے وہ اپنے اپارٹمنٹ کی طرف بڑھا۔ ریوالور اب بھی اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے بائیں ہاتھ سے دروازے کا قفل کھولا اور چند لمحے انتظار کرنے کے بعد بہت غیر محسوس انداز میں اپارٹمنٹ کا دروازہ کھولا اور خود تیزی سے فرش پر بیٹھ گیا۔ پھر بیٹھے بیٹھے وہ اندر داخل ہوا اور دروازے کے نزدیک دبک کر محتاط نظروں سے اردگرد کا جائزہ لینے کی کوشش کرنے لگا۔ پھر وہ آہستگی سے اٹھا اور ایک دم لائٹ آن کر دی۔ وہ اس کے فلیٹ کا طویل کوریڈور تھا۔ اس نے جھک کر غور سے دیکھا اور اس کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اندرونی دروازے پر بہت باریک سا سیاہ دھاگا بندھا تھا۔ کوئی اس کے فلیٹ میں گھسنے کی کوشش کرتا تو وہ دھاگا ٹوٹ جاتا اور گھسنے والے کو احساس بھی نہ ہوتا۔

شدید اعصابی کشیدگی کے باعث سردی میں بھی اسے پیاس لگ رہی تھی۔ اس نے فریج کھول کر پانی کی بوتل نکالی اور چند گھونٹ پی کر بوتل تپائی پر رکھ دی۔

بیڈروم میں پہنچا اور کمپیوٹر آن کر دیا پھر کچھ سوچ کر کچن میں گیا اور کافی کے لیے پانی رکھ دیا۔ وہ دوبارہ بیڈرم میں پہنچا اور کمپیوٹر پر کچھ ٹائپ کرنے لگا۔ وہ کسی کو ای میل کرنے ہی والا تھا کہ ٹھک کی آواز آئی اور گولی اس کی پشت میں پیوست ہو گئی۔ اس نے سنبھلنے کی کوشش کی لیکن سنبھل نہ سکا اور الٹ کر فرش پر گر پڑا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا رہا تھا اور سانسیں اکھڑنے لگیں۔

کمرے کے دروازے کے سامنے وہی گدڑی والا فقیر کھڑا تھا۔ پھٹی پرانی رضائی کے بجائے اس وقت اس کے جسم پر جینز اور جیکٹ تھی۔ اس نے نفرت سے نوید کے مردہ جسم کو دیکھا اور اپنا پسٹل جیب میں رکھ کر واپسی کے لیے مڑ گیا۔

نوید بالکل ساکت پڑا تھا پھر اس نے گہری سانس لی اور اس کے پپوٹوں میں خفیف سے حرکت پیدا ہوئی اور اس نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھول دیں۔ اس نے اٹھنا چاہا لیکن نقاہت کے باعث اٹھ نہ سکا۔ اس کے نزدیک ہی وہ تپائی رکھی تھی جس پر پانی کا گلاس رکھا تھا۔

نوید نے جسم کی پوری قوت مجتمع کر کے ہاتھ بڑھایا اور لرزتے ہوئے ہاتھ میں پانی کا گلاس اٹھالیا۔ اس کے ہاتھوں پر خون تھا۔ اس خون سے گلاس بھی رنگین ہو گیا۔ کچھ پانی چھلک گیا۔ اس نے گلاس بمشکل تمام ہونٹوں سے لگایا اور پانی پینے کی کوشش کی۔ اس کوشش میں کچھ پانی اس کے حلق میں گیا، باقی اس کی ٹھوڑی اور گردن سے ہوتا ہوا فرش پر گر گیا۔ پانی پی کر اس نے بایاں ہاتھ فرش پر ٹکایا اور اٹھنے کی کوشش کی۔ اس کوشش میں اسے شدید تکلیف ہوئی لیکن وہ کسی نہ کسی طرح فرش پر گری ہوئی کرسی کے سہارے بیٹھ گیا۔ اب اس کا ہاتھ کمپیوٹر کے کی بورڈ تک پہنچ سکتا تھا۔ اس نے مطلوبہ ایڈریس نکالا اور ماؤس کے ذریعے کلک کر دیا۔ اتنی سی مشقت کرنے میں اس کا جسم پسینے میں شرابور ہو گیا تھا، ای میل بھیجنے کے بعد اس نے طویل سانس لیا اور ایک مرتبہ پھر فرش پر لڑھک گیا۔ اس کے گرنے سے ماؤس بھی جھٹکے سے نیچے آ گیا پھر اس کی سانسیں تھم گئیں اور آنکھیں ساکت ہو گئیں۔

☆☆☆

دانیال صبح سے نوید کو ٹیلی فون کر رہا تھا لیکن وہ کال ریسیو نہیں کر رہا تھا جب پانچویں دفعہ بھی نوید نے کوئی جواب نہیں دیا تو دانیال نے اکبر کو ٹیلی فون کیا۔ اکبر لاہور ہی میں رہتا تھا اور ان کے چھوٹے موٹے کام کر دیتا تھا۔ اس نے اکبر سے کہا۔ ''تم ذرا نوید کے گھر جاؤ، مجھے لگتا ہے کہ وہ کسی مشکل میں ہے۔''

اکبر کو روانہ کرنے کے بعد اس نے اپنی ای میلز چیک کیں۔ نوید کی طرف سے آئی ہوئی میل موجود تھی، اس نے لکھا تھا۔ ''اس کھیل میں پانچ آدمیوں کا ہاتھ ہے۔ سیٹھ ستار شیشہ والا، رستم جی، ملک انور خان، شہزاد خان اور عبدالمالک اعوان! یہ پانچوں ملک کے بہت بڑے آدمی ہیں۔ کل تک ان کے بارے میں مجھے مزید تفصیلات مل جائیں گی۔ ابھی کچھ ٹھوس ثبوت بھی ہیں جو میرے پاس یو ایس بی میں محفوظ ہیں۔''

نوید کی میل پڑھ کر دانیال کا سر گھوم گیا۔ ان پانچ بڑے آدمیوں کو ملک کا بچہ بچہ جانتا تھا۔ ان لوگوں کے نام پڑھ کے... دانیال کا دماغ بھک سے اڑ گیا لیکن جب نوید نے ان کی نشاندہی کی ہے تو یقیناً اس کے پاس کچھ ثبوت بھی ہوں گے۔ ان ثبوتوں کے باوجود ان لوگوں کے خلاف کچھ ثابت کرنا لوہے کے چنے چبانے کے مترادف تھا۔

ٹیلی فون کی گھنٹی بجی تو دانیال بری طرح چونک اٹھا۔ اس نے سیل فون کے اسکرین پر نظر ڈالی، اکبر کی کال تھی۔ اس نے بٹن دبا کر سیل فون کان سے لگا لیا اور بولا۔ ''ہاں اکبر، کیا رپورٹ ہے؟''

''رپورٹ کچھ اچھی نہیں ہے دانیال صاحب! کل رات کو نوید صاحب کا مرڈر ہو گیا ہے۔''

''وہاٹ؟'' دانیال چیخ کر بولا۔

''جی دانیال صاحب۔'' اکبر نے کہا۔ ''میں خود ان کے اپارٹمنٹ پر گیا تھا۔ وہاں پولیس موجود تھی۔ آس پڑوس والوں سے معلوم ہوا کہ نوید صاحب کو گولی مار کے ہلاک کر دیا گیا ہے۔''

''ٹھیک ہے اکبر۔'' دانیال نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا اور سیل فون کا سلسلہ منقطع کر دیا۔ دانیال کا دماغ سائیں سائیں کر رہا تھا۔ اسے نوید کی موت سے بہت صدمہ پہنچا تھا۔ وہ یو ایس بی نوید نے نہ جانے کہاں رکھی ہوگی؟ دانیال نے سوچا۔

اگر اس کے اپارٹمنٹ میں ہوئی تو اب تک پولیس کے قبضے میں جا چکی ہوگی یا ممکن ہے نوید کا قاتل اسے اپنے ساتھ لے گیا ہو۔ اب دانیال کے پاس صرف ان پانچ بڑوں کے نام تھے۔ اب اسے نئے سرے سے ان لوگوں کے خلاف ثبوت حاصل کرنا تھے۔

اس کے سیل فون کی گھنٹی دوبارہ بجی۔ اس مرتبہ دانیال کے پاس شاہد علی خان کی کال تھی۔ اس نے سیل فون کان سے لگایا تو شاہد خان کی آواز سنائی دی۔ ''ہیلو دانیال! تم اس وقت کہاں ہو؟''

''میں گھر پر ہوں سر!'' دانیال نے جواب دیا۔

''تم آدھے گھنٹے میں میرے پاس پہنچو۔'' شاہد کا لہجہ تحکمانہ تھا۔

''اوکے سر۔'' یہ کہہ کر دانیال نے سیل فون جیب میں رکھ لیا۔ اس نے گاڑی کی چابی اٹھائی اور اپنی گنز چیک کرتا ہوا اپارٹمنٹ سے باہر نکل گیا۔ اس کا ذہن ابھی تک نوید میں الجھا ہوا تھا۔ وہ بیس منٹ میں کلفٹن پہنچ گیا۔ شاہد خان کلفٹن ہی میں رہتا تھا۔

شاہد خان عالمِ اضطراب میں ٹہل رہا تھا۔ دانیال کو دیکھتے ہی اس نے کہا۔ ''ایک بری خبر ہے دانیال۔''

''میں جانتا ہوں سر۔'' دانیال نے کہا۔ ''مجھے بھی ابھی ابھی اطلاع ملی ہے۔''

''کیا اطلاع ملی ہے اور کس سے؟'' شاہد نے حیرت سے پوچھا۔

''سر! وہ کل رات نوید کا مرڈر ہو گیا۔'' دانیال نے کہا۔

''وہاٹ؟'' شاہد خان بری طرح چونکا۔ ''اور یہ بات تم مجھے اب بتا رہے ہو؟''

''سر! مجھے بھی ابھی اطلاع ملی ہے۔ اس نے رات کو تقریباً ڈھائی بجے مجھے میل کی تھی۔ میں نے وہ ای میل صبح دیکھی تھی اس کے بعد......''

''وہ ای میل کہاں ہے؟'' شاہد نے اس کی بات کاٹ دی۔

''سر! میں نے اس کا پرنٹ آؤٹ تو نہیں نکالا۔'' دانیال نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ''لیکن ابھی نکال دیتا ہوں۔''

''تم لوگ کوئی بھی کام ڈھنگ سے نہیں کر سکتے۔'' شاہد نے جھنجلا کر کہا۔ ''نوید تم سب میں سب سے زیادہ ذہین تھا، اب وہ بھی نہیں رہا۔''

دانیال اس وقت تک کمپیوٹر پر بیٹھ چکا تھا۔ اس نے اپنی آئی ڈی کھول کر نوید کی ای میل نکالی اور اس کا پرنٹ

آؤٹ شاہد خان کے حوالے کر دیا۔ دانیال نے اپنے لیے بھی ایک پرنٹ آؤٹ نکال لیا تھا۔

شاہد نے نوید کی ای میل کا گہری نظروں سے جائزہ لیا، پھر خود کلامی کے انداز میں بولا۔ ''نہ جانے وہ یو ایس بی کہاں ہوگی؟ ممکن ہے اب تک پولیس کے ہاتھ لگ گئی ہو۔''

''سر! جہاں تک میں نوید کو جانتا ہوں، یو ایس بی اس نے کسی محفوظ مقام پر رکھی ہوگی۔ جیب میں لیے نہیں گھوم رہا ہوگا۔''

''سارا پلان چوپٹ ہو گیا۔'' شاہد خان پھر بڑبڑایا، پھر وہ دانیال سے مخاطب ہوا۔ ''اب وہ یو ایس بی تلاش کرنا تمہاری ذمے داری ہے۔ تم نے لاہور میں اس کے ساتھ کام کیا ہے، تمہیں یہ بھی علم ہوگا کہ نوید اپنے ضروری کاغذات اور دوسری اہم چیزیں کہاں رکھتا ہے؟''

''سر! نوید نے کبھی مجھ سے تذکرہ نہیں کیا کہ وہ ضروری کاغذات اور ڈی ویز کہاں چھپاتا ہے۔''

''یہی تو تمہیں معلوم کرنا ہے۔ تم چاہو تو ماریہ کو اپنے ساتھ لے جا سکتے ہو۔ اگر اب تک وہ یو ایس بی پولیس کے ہتھے نہیں چڑھی ہے تو کوشش کرنا کہ پولیس ان خفیہ چیزوں تک تم سے پہلے نہ پہنچ جائے۔''

''او کے سر۔'' دانیال نے مستعدی سے کہا۔

''لاہور جانے کی تیاری کرو، ماریہ بھی تھوڑی دیر میں تمہارے اپارٹمنٹ پر پہنچ جائے گی۔'' شاہد خان نے کہا اور اٹھ کر کمرے کا دروازہ کھول دیا۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ اب آپ تشریف لے جا سکتے ہیں۔

دانیال خاموشی سے باہر آ گیا۔ وہ گزشتہ تین سال سے شاہد کے لیے کام کر رہا تھا۔ اسے اب تک یہ اندازہ نہیں ہو پایا تھا کہ وہ لوگ اصل میں ہیں کیا؟ کبھی کبھی تو دانیال کو ایسا لگتا تھا کہ شاہد علی خان کسی بیرونی طاقت کا ایجنٹ ہے، کبھی وہ اپنی باتوں اور کام سے انتہائی محب وطن نظر آتا تھا۔ شاہد نے کئی اچھے کام بھی کیے تھے لیکن دانیال کی نظروں میں وہ ملک دشمن تھا۔ شاہد علی خان اسلحے اور منشیات کی تجارت میں بھی ملوث تھا اور وہ اکثر اس کے خلاف بھی کام کرتا تھا۔

دانیال کو وہ وقت اچھی طرح یاد تھا جب وہ یونیورسٹی سے فارغ ہونے کے بعد ملازمت کی تلاش میں دھکے کھا رہا تھا۔ دفتروں کے چکر لگا لگا کر اس کے جوتے گھس گئے تھے۔ کبھی کبھی تو وہ سوچتا تھا کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر کہیں فرار ہو جائے۔ اس سے ابو کی بے بسی اور بہن بھائیوں کی محرومی نہیں دیکھی جاتی تھی۔

اسے ملازمت کے لیے دھکے کھاتے ہوئے ایک سال سے زیادہ ہو چکا تھا۔ اس دن وہ ایک مرتبہ پھر امید کا دامن تھامے گھر سے انٹرویو کے لیے نکلا تھا۔ گلی سے نکل کر مین روڈ پر آیا تو سامنے سے آنے والے دو موٹر سائیکل سواروں نے اس کا راستہ روک لیا اور پچھلی سیٹ پر بیٹھا ہوا نوجوان اچھل کر اس کے سامنے آ گیا اور آواز کو گرج دار بناتے ہوئے بولا۔ ''اپنا پرس اور موبائل نکال۔''

دانیال نے بہ غور ان کا جائزہ لیا۔ وہ لباس اور حلیے سے اچکے نہیں لگتے تھے۔ اس نے اطمینان سے کہا۔ ''پرس تو میں رکھتا ہی نہیں ہوں۔ پرس میں رکھنے کے لیے بھی کچھ چاہیے نا، رہا موبائل تو وہ بہت سستا سا ہزار بارہ سو روپے کا ہے اور تمہارے کسی کام کا نہیں ہے۔''

''بکواس بند کر۔'' نوجوان کو اچانک غصہ آ گیا۔ اس نے اپنی شرٹ تھوڑی سی اوپر اٹھائی تاکہ دانیال بیلٹ میں لگا ہوا پسٹل دیکھ لے، پھر وہ بولا۔ ''پرس نکالتا ہے یا......'' اس نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ کر دانیال کو گھورا۔

''نہیں نکالوں گا۔'' دانیال جھنا کر بولا۔ ''جو کر سکتے ہو، کر لو۔''

اس نوجوان نے تپ کر اچانک گن نکال لی۔ دوسرا نوجوان بولا۔ ''دفع کر یار، اس کنگلے کے پاس کچھ نہیں ہے۔''

وہ اسے کیسے دفع کرتا، دانیال نے تو اس کی انا کو چیلنج کر دیا تھا۔ اس نے پسٹل نکالا ہی تھا کہ دانیال نے اس کے ہاتھ پر جھپٹا مارا، پسٹل اس کے ہاتھ سے نکل کر دور جا گرا۔ دانیال نے ہاتھ میں پکڑا ہوا فولڈر وہیں پھینکا اور جھپٹ کر اس لڑکے کا گریبان پکڑ لیا۔ اس کے چہرے پر اب خوف تھا۔ دانیال نے اس کے چہرے پر زوردار گھونسا مارا تو اس کے منہ سے خون بہنے لگا۔ شاید اس کا ایک آدھ دانت بھی ٹوٹ گیا تھا۔ دوسرا گھونسا دانیال نے اس کی پیشانی پر مارا۔ وہ الٹ کر گر پڑا۔ دانیال دوسرے لڑکے کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ بوکھلاہٹ میں بائیک اسٹارٹ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ دانیال نے اچھل کر اس کی کمر پر زوردار لات رسید کر دی۔ وہ لڑکھڑا کر گرا تو بائیک اس کے اوپر جا پڑی۔

دانیال درشت لہجے میں بولا۔ ''اب تم لوگ نکالو، تمہاری جیب میں کیا ہے؟''

اس دوران میں اِکا دُکا گاڑیوں نے رکنے کی کوشش

کی، پھر وہ زخمی نوجوان کا خون آلود چہرہ دیکھ کر وہاں سے کان دبا کر نکل گئے۔ ان دنوں شہر کے حالات ہی ایسے تھے کہ تماشائی لپیٹ میں آجاتے تھے۔ کبھی پولیس انہیں گرفتار کر لیتی تھی، کبھی وہ لڑنے والوں کی گولی کا شکار ہو جاتے تھے۔

موٹر سائیکل کے نیچے دبے ہوئے لڑکے نے اٹھنے کی کوشش کی تو دانیال کی ایک لات میں وہ پھر ڈھیر ہو گیا۔ دانیال چیخ کر بولا۔ ''تو نے سنا نہیں، میں نے کیا کہا ہے؟ اپنا پرس اور موبائل نکال۔''

شاید ان دونوں کے پاس پسٹل صرف ایک ہی تھا ورنہ دوسرا لڑکا بھی پسٹل نکال چکا ہوتا۔

دانیال کے جارحانہ رویے سے دونوں لڑکے بری طرح خوف زدہ ہو گئے تھے۔ موٹر سائیکل کے نیچے دبے ہوئے لڑکے نے کانپتے ہاتھوں سے اپنا پرس نکالا اور دانیال کی طرف بڑھا دیا۔

''موبائل۔'' دانیال نے سرد لہجے میں کہا۔

لڑنے نے پھر جیب میں ہاتھ ڈالا اور موبائل نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔ وہ جدید ماڈل کا بہت قیمتی موبائل تھا۔

اچانک موبائل کی گھنٹی بجنے لگی لیکن آواز لڑکے کی جیب سے آرہی تھی۔

دانیال نے چونک کر اس کی طرف دیکھا، پھر کرخت لہجے میں بولا۔ ''میں نے کہا تھا کہ موبائل میرے حوالے کر دو۔''

''میں نے موبائل دے تو دیا ہے۔'' لڑکے نے مرجھائے ہوئے انداز میں کہا۔

''تو پھر یہ تیری جیب میں کیا ہے؟''

''یہ...... یہ تو میرا اپنا موبائل ہے۔'' اس نے بوکھلا کر کہا اور دانیال کے تیور دیکھ کر وہ موبائل بھی نکال کر اسے دے دیا۔

اس سارے واقعے کا چشم دید گواہ سڑک کی دوسری جانب کھڑا ہوا ایک نوجوان تھا۔ اس کی گاڑی شاید خراب ہو گئی تھی۔ وہ گاڑی کا بونٹ کھولے کھڑا تھا۔ بیٹری کا ٹرمینل ڈھیلا ہو گیا تھا جس کی وجہ سے گاڑی اسٹارٹ نہیں ہو رہی تھی۔ ٹرمینل درست کرنے کے بعد وہ بونٹ بند کرنے ہی والا تھا کہ دانیال کو ان لڑکوں نے گھیر لیا تھا۔

وہ دلچسپی سے سارا واقعہ دیکھتا رہا۔ جب دانیال نے موٹر سائیکل سوار سے پرس چھینا تو اس نے گاڑی کا بونٹ بند کر دیا اور انجن اسٹارٹ کر کے سڑک کی دوسری طرف پہنچ گیا تھا۔ اس نے دبنگ لہجے میں کہا۔ ''یہ کیا ہو رہا ہے؟''

دانیال اس دن شاید اپنی زندگی ہی سے بیزار تھا۔ اس نے منہ بنا کر کہا۔ ''تمہیں نظر نہیں آرہا ہے کہ کیا ہو رہا ہے؟''

وہ نوجوان گاڑی کا دروازہ کھول کر اچانک باہر آگیا اور بولا۔ ''نظر تو مجھے بہت کچھ آرہا ہے لیکن ابھی کچھ دیر بعد تجھے کچھ نظر نہیں آئے گا۔'' اس نے تیزی سے اپنا ریوالور نکالا اور ایک جھلک دکھا کر دوبارہ جیب میں رکھ لیا۔

''او بھائی، جا اپنا کام کر۔ ان لوگوں نے بھی یہی کھلونا دکھانے کی کوشش کی تھی۔''

وہ نوجوان اچکوں سے مخاطب ہوا۔ ''او کے، چلو تم لوگ بھاگو یہاں سے۔'' اس نے بائیک اٹھاتے ہوئے کہا۔

اس نوجوان کو بھی اب ہوش آچکا تھا۔

موٹر سائیکل کے نیچے دبنے والے لڑکے نے بائیک اسٹارٹ کی تو وہ بھی اچھل کر عقبی نشست پر بیٹھ گیا۔

گئی تو ان کی مدد کے لیے آنے والا نوجوان کہیں اپنا ارادہ نہ وہ جانے لگے تو دانیال چیخ کر بولا۔ ''اے، ٹھہرو......'' اس کی آواز سن کر موٹر سائیکل کی رفتار ایک دم تیز ہو گئی اور وہ دونوں وہاں سے فرار ہو گئے۔

''بھاگ گئے بزدل! اپنا پرس اور دونوں موبائل بھی چھوڑ گئے۔'' پھر وہ گاڑی والے کی طرف متوجہ ہوا۔ ''اب تم کیا چاہتے ہو؟ پولیس والے ہو تو مجھے پولیس اسٹیشن لے چلو، ان دونوں کی طرح اچکے ہو تو یہ دونوں موبائل اور پرس لے لو۔'' اس نے پرس کا جائزہ لیا اور بولا۔ ''پرس میں پندرہ بیس ہزار کی رقم ہے۔''

''میں اچکا نہیں ہوں۔'' گاڑی والا مسکرا کر بولا۔ ''میں اس واقعے کا چشم دید گواہ ہوں۔ ان لوگوں نے تمہیں لوٹنے کی کوشش کی تھی، یار تم تو بہت نڈر آدمی ہو۔''

''میں نڈر ضرور ہوں لیکن اتنا بھی نڈر نہیں ہوں جتنا تم سمجھ رہے ہو۔ اصل میں مجھے اپنی جان کی پروا نہیں رہی ہے۔''

''کیوں بھئی، زندگی سے اتنی بیزاری کیوں؟'' پھر وہ مسکرا کر بولا۔ ''آؤ، کہیں بیٹھ کر چائے پیتے ہیں۔''

دانیال نے گھڑی دیکھی، پھر مایوسی سے بولا۔ ''اس

چکر میں دیر ہوگئی۔ اب تو وہاں جانا فضول ہی ہے۔''
''چلو گاڑی میں بیٹھو۔'' نوجوان نے اپنائیت سے کہا۔ ''میرا نام نوید ہے اور میں ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں جاب کرتا ہوں۔''
''میرا نام دانیال ہے۔'' دانیال تلخی سے مسکرایا۔ ''اور میں بے روزگار ہوں۔''
وہ دونوں وہاں سے کچھ فاصلے پر چائے کے ایک ہوٹل پہنچ گئے۔ نوید نے چائے کے ساتھ ساتھ پراٹھے بھی منگوا لیے۔
دانیال نے ایک ہی لقمہ لیا تھا کہ اس کے چہرے پر افسردگی چھا گئی۔ اس نے ہاتھ کھینچ لیا اور چائے کا کپ اٹھالیا۔ نوید بہت غور سے دانیال کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس نے کھانے سے ہاتھ کھینچا تو نوید نے کہا۔ ''کیا ہوا دانیال! کیا پراٹھے میں کوئی خرابی ہے؟''
''ایسی کوئی بات نہیں ہے بھائی۔'' دانیال نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''پراٹھا کھاتے ہوئے مجھے اپنے بہن بھائیوں اور ماں باپ کا خیال آگیا۔ جب آپ کے پیارے بھوک سے نڈھال ہوں تو دنیا کا لذیذ ترین کھانا بھی حلق سے نہیں اتر سکتا۔''
''اچھا بے روزگار ہو؟'' نوید نے یوں پوچھا جیسے بے روزگار ہونا بھی کوئی قابلِ فخر بات ہو۔
''بے روزگار تھا۔'' دانیال نے کہا۔ ''لیکن اب نہیں رہوں گا۔ جب وہ بزدل اچکے بغیر محنت کے پیسا کما سکتے ہیں تو میں کیوں نہیں۔''
''یہ باتیں چھوڑو، آؤ میرے ساتھ میں تمہاری جاب کا بندوبست کرتا ہوں۔'' پھر وہ چونک کر بولا۔ ''تم رہتے کہاں ہو؟''
''لائنز ایریا میں۔'' دانیال نے کہا۔
''لائنز ایریا تو یہاں سے نزدیک ہی ہے۔'' نوید نے کہا۔
''ہاں، میں گھر سے نکل کر ایک آفس میں انٹرویو کے لیے جا رہا تھا کہ ان اچکوں نے گھیر لیا۔''
نوید نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور پرس نکال کے اس میں سے ہزار ہزار کے کچھ نوٹ نکالے اور بولا۔ ''ایسا کرو، تم یہ پیسے اپنے گھر دے آؤ۔''
''کیا تم ترس کھا کر مجھے خیرات دے رہے ہو؟'' دانیال نے درشت لہجے میں کہا۔
''کوئی کسی پر ترس کھا کر دو چار سو روپے سے زیادہ نہیں دیتا۔ یوں بھی یہ پیسے اگر میری جیب میں رہے تو تم چھین لو گے۔ تم یہی تو کرنے والے تھے۔'' پھر وہ ہنس کر بولا۔ ''تمہاری جاب آج سے پکی۔ یہ کچھ پیسے میں ایڈوانس میں دے رہا ہوں۔ جاؤ، گھر جا کر دے آؤ۔ میں یہیں گاڑی میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔''
دانیال کے چہرے پر خوشی سے زیادہ حیرت تھی۔ وہ رقم لے کر خاموشی سے اتر گیا۔ نوید وہیں رک کے اس کے آنے کا انتظار کرنے لگا۔

☆☆☆

''یہ میرے باس شاہد خان صاحب ہیں۔'' نوید نے دانیال سے شاہد کا تعارف کرایا۔ وہ دانیال کو شاہد خان کے بنگلے پر لے آیا تھا پھر وہ شاہد خان سے مخاطب ہوا۔ ''سر یہ دانیال ہے، انتہائی نڈر اور ذہین آدمی ہے۔''
شاہد نے دانیال سے کہا۔ ''میرا کام کچھ ایسا ہے کہ میں بہت چھان بین کے بعد کسی کو ملازمت دیتا ہوں۔ لیکن نوید کا خیال ہے کہ تم اس جاب کے لیے مناسب ہو تو میں تمہیں ایک موقع دے رہا ہوں اگر تمہاری کارکردگی اچھی رہی تو ایک مہینے بعد تمہیں مستقل کر دوں گا۔ ابھی تمہاری سیلری پچاس ہزار روپے ہوگی۔ اگر تم نے محنت سے کام کیا تو تمہاری سیلری بڑھا دی جائے گی۔''
''تھینک یو سر، تھینک یو ویری مچ۔'' مارے خوشی سے دانیال کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ پھر فوراً ہی اس نے اپنی کیفیت پر قابو پالیا اور بولا۔ ''سر! مجھے کب سے جوائن کرنا ہوگا؟'' دانیال کے لہجے سے خوشی پھوٹی پڑ رہی تھی۔
''تمہیں آج سے بلکہ ابھی سے جوائن کرنا ہوگا۔'' شاہد خان نے کہا۔ ''اور تمہیں رہنا بھی یہیں ہوگا۔''
''یہیں رہنا ہوگا؟'' دانیال نے حیرت سے پوچھا۔
''ہاں۔'' شاہد نے کہا۔ ''کام کی نوعیت کچھ ایسی ہے کہ تم اپنے گھر والوں سے جتنا دور رہو، اتنا ہی بہتر ہے۔ پھر تمہیں ٹریننگ بھی کرنا ہوگی۔'' پھر وہ دانیال کے چہرے پر تردد کے آثار دیکھ کر بولا۔ ''ایسا کرو، تم ابھی جا کر اپنے گھر والوں سے مل آؤ۔ ان سے کہہ دینا کہ ملازمت کے سلسلے میں تم کراچی سے باہر جا رہے ہو۔''
''او کے سر۔'' دانیال نے کہا۔
''تمہیں ڈرائیونگ آتی ہے؟'' شاہد نے اچانک پوچھا۔
''جی سر، ڈرائیونگ میں نے کالج کے زمانے میں

سیکھ لی تھی۔"

"نوید تمہیں یہاں کے دوسرے ممبرز سے ملوا دے گا۔"

وہیں دانیال کی ملاقات یوسف، مراد، ہارون اور ماریہ سے ہوئی تھی۔

اگلے چھ مہینے میں شاہد خان نے دانیال سے ایسے ایسے کام لیے تھے کہ دانیال کا شک یقین میں بدل گیا تھا کہ شاہد خان ملک دشمن سرگرمیوں میں ملوث ہے۔

اب دانیال کو وہاں جوائن کیے ہوئے دو سال ہو چکے تھے۔ اب وہ خاصا سینئر ہو گیا تھا۔ اس کے بعد اس کی طرح کے ضرورت مند اور پڑھے لکھے تین لڑکے مزید ان کی ٹیم میں شامل ہوئے تھے۔ وہ خاور، سلطان اور اجمل تھے۔ ان لڑکوں میں اسے خاور اور سلطان پسند آئے تھے۔

دانیال کو یہاں قانونی اور غیر قانونی کام کرتے ہوئے دو سال سے زائد گزر چکے تھے لیکن وہ آج بھی شاہد خان کے اغراض و مقاصد سے لاعلم تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ باہر سے آنے والا جو کنسائنمنٹ اس نے وصول کیا ہے، اس میں کیا ہے؟ اسلحہ ہے یا ادویات؟

اچانک شاہد بہت ایکٹیو ہو گیا تھا۔ چھ مہینے بعد الیکشن ہونے والے تھے اس لیے اس کی مصروفیات بہت زیادہ بڑھ گئی تھیں۔ پھر اس نے نوید کو ایک خاص مشن پر لاہور بھیج دیا۔ وہ دو دن لاہور میں گزارتا تھا، بقیہ دن اسلام آباد میں گزرتے تھے۔ اس دوران میں کچھ عرصے تک وہ بھی نوید کے ساتھ رہا تھا۔ پھر شاہد خان نے اسے واپس بلا لیا تھا۔

اب اچانک نوید کا قتل ہو گیا تھا اور اسے لاہور جانا تھا۔

اپنے اپارٹمنٹ پر پہنچ کر اس نے ضروری پیکنگ کی اور ٹی وی کھول کر بیٹھ گیا کیونکہ لاہور کی فلائٹ میں ابھی بہت وقت تھا۔

وہ ٹی وی دیکھتے ہوئے کافی پی رہا تھا کہ اطلاعی گھنٹی کی آواز گونج اٹھی۔

"اس وقت کون آ گیا؟" دانیال خود کلامی کے انداز میں بولا اور دروازہ کھول دیا۔ اس کے سامنے ماریہ کھڑی تھی۔ اس نے ہینڈ کیری کا ہینڈل پکڑ رکھا تھا۔ جسم پر جدید فیشن کا چست لباس تھا لیکن اس کے چہرے پر خشونت تھی۔ وہ خود کو ہر آدمی سے برتر سمجھتی تھی اسی لیے دانیال کو اس سے چڑ تھی۔

"کیا تم مجھے یہیں کھڑا رکھو گے؟" ماریہ نے درشت لہجے میں کہا۔

دانیال کچھ کہے بغیر اندر کی طرف مڑ گیا۔ ماریہ بھی ہینڈ کیری کھینچتی ہوئی اس کے پیچھے پیچھے لاؤنج میں آ گئی۔ دانیال کو فرشی نشست زیادہ پسند تھی۔ وہ ٹی وہ ہمیشہ نیچے بیٹھ کر دیکھتا تھا۔ ماریہ نے برا سا منہ بنا کر دانیال کو دیکھا اور صوفے پر بیٹھ گئی۔ دانیال خاموشی سے کافی پیتا رہا۔

"تم تو ابھی تک غیر مہذب ہو۔ تمہیں اتنے بھی ایٹی کیٹس نہیں آتے کہ گھر آئے مہمان کو کافی یا چائے دی جاتی ہے؟"

"مہمان کو؟" دانیال نے کافی کا ایک اور گھونٹ لیا۔ "یہاں مہمان کون ہے؟ کافی کی اتنی ہی طلب ہے تو کچن میں جاؤ اور کافی بنا لو۔"

"یہ تم مجھ سے بات کس لہجے میں کر رہے ہو؟" ماریہ اچانک آپے سے باہر ہو گئی۔

"تو پھر کس لہجے میں کروں؟" دانیال بھی بھنا گیا۔

"تم کیا چاہتے ہو، میں واپس چلی جاؤں؟"

"میں نے تمہیں آنے کے لیے کہا تھا، نہ جانے سے روکوں گا۔" دانیال نے کہا۔

"میں تمہارے ساتھ نہیں جا سکتی۔" ماریہ کا پارا بڑھتا ہی جا رہا تھا۔

"یہ بھی تم باس ہی کو بتاؤ۔" دانیال کے لہجے میں بے نیازی تھی۔

"ٹھیک ہے، میں باس سے بات کرتی ہوں۔" اس نے غصے میں اپنا بیگ کھولا اور سیل فون نکال کر نمبر ڈائل کرنے لگی۔

پھر وہ چند لمحوں بعد بولی۔ "سر! یہ دانیال تو بہت تکلیف دہ ہوتا جا رہا ہے۔ میں اس کے ساتھ نہیں جا سکتی...... میرے ساتھ دانیال کے بجائے خاور کو بھیج دیں...... جی یہیں موجود ہے۔ او کے۔" اس نے دانیال سے کہا کہ باس تم سے بات کرنا چاہتا ہے۔

دانیال نے سیل فون اس سے لے لیا اور بولا۔ "ہیلو۔"

"دانیال!" دوسری طرف سے باس کی آواز سنائی دی۔ "آخر تمہارا پرابلم کیا ہے؟"

"پرابلم میرا نہیں باس، ماریہ کا ہے۔" دانیال نے ماریہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "پھر وہاں ماریہ کی ضرورت ہی کیا ہے؟ میں نوید کی ڈیڈ باڈی لینے جا رہا ہوں اور......"

"صرف ڈیڈ باڈی ہی نہیں لانا ہے اور بھی کام کرنے

ہیں۔" باس نے کہا۔ "میں خاور کو بھیج رہا ہوں۔ اب تمہارے ساتھ خاور جائے گا۔ تم سیل فون ذرا ماریہ کو دو۔"
ماریہ نے چند لمحے بات کی، پھر دانیال کو قہر آلود نظروں سے گھورتی ہوئی چلی گئی۔

نوید کا کوئی قریبی یا دور کا رشتے دار نہیں تھا۔ دانیال نے ضروری خانہ پُری کی اور نوید کی لاش اسپتال سے اس کے اپارٹمنٹ لے آیا۔ باس کے حکم کے مطابق اسی شام اس کی تدفین کر دی گئی۔

پولیس نے نوید کا اپارٹمنٹ عارضی طور پر سیل کر دیا تھا۔ وہ اپارٹمنٹ بھی کلیئر کر دیا گیا۔

دانیال نے لاہور پہنچنے سے پہلے ہی سیل فون پر اکبر سے رابطہ کیا تھا اور اسے بتایا تھا کہ میں لاہور آ رہا ہوں۔ تم مجھ سے ملنے کی کوشش مت کرنا بلکہ دور رہ کر میری نگرانی کرنا، دانیال کی چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ لاہور میں اسے خطرہ ہے۔

پولیس سے اپارٹمنٹ کی چابی ملتے ہی دانیال نے سب سے پہلے نوید کے کمپیوٹر کا جائزہ لیا۔ کمپیوٹر کے کی بورڈ اور ماؤس پر اب بھی خون کے دھبے تھے۔ دانیال نے کمپیوٹر آن کیا تو اسے کوئی خاص بات نظر نہیں آئی۔ کمپیوٹر کی کسی فائل اور کسی فولڈر میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔

دانیال کمپیوٹر کا تفصیلی جائزہ لے چکا تھا اور اسے بند کرنے ہی والا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ خاور اس کے نزدیک ہی بیٹھا سگریٹ پھونک رہا تھا۔ اس نے اٹھ کر دروازہ کھولا تو دو آدمی اسے دھکیلتے ہوئے اندر آ گئے۔ انہوں نے دانیال اور خاور کو گن پوائنٹ پر لے لیا۔

دانیال جھنجلا کر بولا۔ "کون ہو تم لوگ؟"

"یہ پی سی ہمارے حوالے کر دو۔" ان میں سے ایک نے کہا۔ "اس کی فکر میں مت پڑو کہ ہم کون ہیں؟ اور ہم سے کسی رعایت کی توقع مت رکھنا، ہم نے جیسے نوید کو قتل کر دیا، اسی طرح تم لوگوں کو بھی مار دیں گے۔" پھر وہ اپنے ساتھی سے مخاطب ہوا۔ "یہ کمپیوٹر اٹھا لو۔"

"تم معمولی سے اس کمپیوٹر کے لیے ہمیں قتل کی دھمکیاں دے رہے ہو؟" دانیال نے حیرت کا مظاہرہ کیا۔

"ہم صرف دھمکی نہیں دیتے ہیں۔" گن بردار غرایا۔ "اس پر عمل بھی کرتے ہیں۔"

اس کے دوسرے ساتھی نے کمپیوٹر سے تمام لیڈز نکالیں اور کمپیوٹر اٹھا لیا۔

اسی وقت دروازہ بہت آہستگی سے کھلا اور دانیال کو

ترک نوجوان کی محبت کا انجام

عضدالدولہ کے امرا میں ایک ترک نوجوان تھا۔ وہ اپنے پڑوسی کی بیوی پر عاشق ہو گیا۔ جب اس کا پڑوسی کاروبار پر چلا جاتا تو وہ طرح طرح سے اس کی بیوی کو لبھانے اور رجھانے کی کوشش کرتا۔ بیوی نے اپنے شوہر سے شکایت کی۔ شوہر نے گھر میں گڑھا کھودا۔ بیوی سے کہا کہ میں سامنے سے جا کر پیچھے والے دروازے سے اندر آ جاؤں گا۔ جب ترک دروازے پر آئے تو اسے اشارے سے اندر بلا لینا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ جونہی ترک اندر داخل ہوا، اس کے پڑوسی نے اسے گڑھے میں ڈال کر پورے گڑھے کو مٹی سے پاٹ دیا۔ عضدالدولہ کے ہاں جب کئی روز تک ترک نہ پہنچا تو اسے پریشانی لاحق ہوئی۔ اس نے اس کے پڑوس کے مؤذن کو اپنے دربار میں بلایا اور صبح سے لے کر رات گئے تک اپنے ہاں روکے رکھا۔ پھر اسے رخصت کرتے ہوئے کہا۔ "تم سے جو شخص یہ پوچھنے آئے کہ میں نے تمہیں کیوں بلایا تھا۔ اس کا نام مجھے بتا دینا۔"

مؤذن آدھی رات کو جب مسجد میں پہنچا تو اس نے ایک شخص کو اپنا منتظر پایا۔ اس نے محبت جتاتے ہوئے دریافت کیا کہ آج خلافِ معمول خلیفہ کے ہاں تمہاری طلبی کیوں ہوئی تھی؟" مؤذن نے اِدھر اُدھر کے بہانوں سے اسے ٹال دیا۔ اگلے روز خلیفہ نے اطلاع ملنے پر اس شخص کو بلایا اور تخلیے میں پوچھا۔ "ہمارے ترک امیر کے متعلق جانتے ہو کہ وہ کہاں ہے؟" وہ شخص سر سے پاؤں تک لرز گیا اور ہاتھ جوڑ کر از اول تا آخر پوری کہانی خلیفہ کو سنا دی اور کہا کہ میں قابلِ گردن زدنی ہوں۔ خلیفہ نے کہا۔ "جاؤ نہ تم نے کچھ کہا اور نہ ہم نے کچھ سنا۔"

مرسلہ: راحیل اشرف، کوہاٹ

اکبر کا چہرہ نظر آیا۔ اس کے ہاتھ میں پسٹل بھی تھا اور وہ گن بردار پر فائر کرنے کو تیار تھا۔

''فائر مت کرنا۔'' خاور بلند آواز میں بولا۔

''یہ طریقہ اب پرانا ہو گیا ہے۔'' گن بردار طنزیہ انداز میں مسکرایا۔

''یہ طریقہ آج بھی اتنا ہی کارآمد ہے جتنا پچاس سال پہلے تھا۔'' خاور نے کہا۔

''بکواس بند کرو اور مجھے الماری تک لے چلو۔'' وہ گن لہرا کر بولا۔

''اپنی گن پھینک دو۔'' اکبر نے بلند آواز میں کہا۔

گن بردار یوں اچھلا جیسے اس کا... پاؤں بجلی کے ننگے تار پر پڑ گیا ہو۔ ''جلدی کرو، ورنہ گولی چل جائے گی۔''

گن بردار نے گن پھینک دی۔

''تم بھی یہ پی سی رکھو اور اپنے ہاتھ سر پر رکھ لو۔'' اکبر نے دوسرے آدمی کو حکم دیا۔

اس نے بھی فوراً کمپیوٹر ٹیبل پر رکھ دیا اور ہاتھ سر پر رکھ کے کھڑا ہو گیا۔

دانیال نے بھی تیزی سے ریوالور نکال لیا تھا۔ اس نے درشت لہجے میں کہا۔ ''خاور! ان دونوں کے ہاتھ پیر باندھ دو۔''

خاور بیڈ روم سے ٹیلی فون کا کیبل نکال لایا اور ان دونوں کے ہاتھ پشت پر باندھنے کے بعد ان کے پیر بھی باندھے اور انہیں بے رحمی سے فرش پر گرا دیا۔

''اب بتاؤ، تم لوگوں کو یہاں کس نے بھیجا ہے؟''

وہ دونوں خاموش رہے۔

دانیال نے انہیں گھورتے ہوئے اکبر سے کہا۔ ''اکبر! ان کا منہ کھلواؤ۔ اگر کچھ نہ بتائیں تو انہیں گولی مار کے لاشیں کسی کوڑے کے ڈھیر پر پھینک دینا۔''

اکبر ان دونوں کو جانوروں کی طرح گھسیٹتا ہوا بیڈ روم میں لے گیا اور بولا۔ ''اگر تم نے زبان نہ کھولی تو میں تمہیں ماروں گا نہیں بلکہ تمہارے ہاتھ پیر توڑ کر تمہیں ہمیشہ کے لیے معذور کر دوں گا۔'' اس نے اردگرد دیکھا، پھر ماربل کا ایک بھاری گلدان اٹھا لیا۔

وہ دونوں خاموشی سے اکبر کو دیکھتے رہے۔ ان میں سے وہ آدمی کچھ زیادہ ہی بزدل تھا جس نے کمپیوٹر اٹھایا تھا۔

اکبر پہلے اسی کی طرف بڑھا اور بولا۔ ''چلو اب شروع ہو جاؤ۔''

''اگر ہم نے بتا دیا تو وہ ہمیں زندہ نہیں چھوڑے گا۔''

''اور اگر نہ بتایا تو میں تمہیں ہمیشہ کے لیے معذور کر دوں گا۔'' یہ کہتے ہوئے اکبر نے بھاری گلدان سے اس شخص کے گھٹنے پر وار کیا۔

وہ اذیت ناک انداز میں چیخا اور بری طرح تڑپنے لگا۔ اکبر نے دوبارہ گلدان اٹھایا تو وہ کراہ کر بولا۔ ''مجھے مارنا مت...... میں بتاتا ہوں۔''

''روشو!'' دوسرا آدمی چیخا۔ ''اگر تو نے زبان کھولی تو باس تیرے ٹکڑے کر دے گا۔''

''تو وفاداریاں نبھاتا رہ جانو۔'' روشو نے کراہتے ہوئے کہا۔ ''باس کو ہماری اتنی ہی پروا ہے تو اب ہمیں بچاتا کیوں نہیں؟''

اکبر نے جانو کے بھی گھٹنے پر زوردار وار کیا تو اس کے حلق سے بھی چیخ نکل گئی۔ اکبر نے کرخت لہجے میں کہا۔ ''تم اپنی زبان بند رکھو۔'' پھر وہ روشو کی طرف متوجہ ہوا۔ ''ہاں، تم بولو، تمہیں یہاں کس نے بھیجا تھا اور کیوں؟''

''وہ بہت بڑا آدمی ہے۔'' روشو نے کہا۔ ''تم نے اگر اس کا نام جان بھی لیا تو اس کا کچھ نہیں بگاڑ پاؤ گے۔''

''روشو!'' جانو پھر چیخا۔ ''اپنی زبان بند رکھ مردود ورنہ تیرے ساتھ میں بھی کتے کی موت مارا جاؤں گا۔''

''اس کا نام...... روشو کہتے کہتے رک گیا اور بولا۔ ''وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا۔''

''میں بہت دیر سے تمہاری بکواس سن رہا ہوں۔'' اکبر بپھر گیا اور ایک مرتبہ پھر گلدان اٹھا لیا۔

''اس کا نام رستم جی ہے۔'' روشو جلدی سے بولا۔

''کون رستم جی؟'' دانیال کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولا۔

''وہ بہت بڑا بزنس مین ہے اور......''

''وہ فائیو اسٹار ہوٹلوں کا مالک؟'' دانیال نے پوچھا۔

''ہاں، وہی۔'' روشو نے جواب دیا۔ ''اس نے کہا تھا کہ نوید کے اپارٹمنٹ پر جاؤ اور وہاں سے اس کا کمپیوٹر لے آؤ۔ اگر وہاں کوئی رکاوٹ بنے تو اسے گولی مار دینا۔''

''اب تیرے ساتھ میں بھی مارا جاؤں گا روشو۔'' جانو نے کہا۔

''کیا رستم جی تم لوگوں کو خود ہدایات دیتا ہے؟'' دانیال نے پوچھا۔

''وہ خود کبھی سامنے نہیں آتا۔'' نوشو کے بجائے جانو نے جواب دیا۔

''میں خواہ مخواہ کسی کی جان لینا نہیں چاہتا۔'' دانیال نے کہا۔ ''اس لیے تم لوگوں کو چھوڑ رہا ہوں۔''

''یہ مہربانی مت کرو۔'' جانو نے کہا۔ ''تم اگر چھوڑ بھی دو گے تو رستم جی کے آدمی ہمیں نہیں چھوڑیں گے۔''

''یہ تمہارا پرابلم ہے۔'' دانیال نے کہا۔

''ہاں، اگر تم یہ کمپیوٹر ہمیں دے دو تو ہم بچ سکتے ہیں۔'' جانو کچھ سوچ کر بولا۔

''یہ کمپیوٹر بھی لے جاؤ۔'' دانیال نے دریا دلی سے کہا۔ ''یہ ہمارے کس کام کا ہے۔''

''اب نکلو یہاں سے۔''

اکبر نے آگے بڑھ کر ان کے ہاتھ پاؤں کھول دیے۔ وہ دونوں بمشکل تمام لنگڑاتے ہوئے اٹھے اور لاؤنج میں پہنچے جہاں کمپیوٹر رکھا تھا۔ جانو کچھ سوچ کر بولا۔ ''میں کمپیوٹر لے جانے کے بجائے اس کی ہارڈ ڈسک نکال لیتا ہوں۔''

''تم لوگ بیٹھو۔'' اکبر نے کہا۔ ''میں اس کی ہارڈ ڈسک نکال دیتا ہوں۔ اس نے کمپیوٹر کا کور کھولا اور اس میں سے ہارڈ ڈسک نکال کر جانو کے حوالے کر دی۔

پھر وہ دونوں لنگڑاتے ہوئے اپارٹمنٹ سے باہر نکل گئے۔ دانیال کے اشارے پر اکبر بھی ان کے پیچھے روانہ ہو گیا۔

ان کے جانے کے بعد دانیال نے خاور سے کہا۔ ''یار! اس چکر میں تو مجھے شدید بھوک لگ گئی ہے۔ کچھ کھانے کو لے آؤ۔''

''کھانا تو میں پہلے ہی لے آیا تھا۔ مجھے خود بھوک لگ رہی ہے۔ میں ابھی کھانا نکالتا ہوں۔'' ان کے اطمینان میں کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ وہ اس طرح کے معمول کے عادی تھے۔

کھانا کھاتے ہوئے خاور نے کہا۔ ''دانیال صاحب! آپ مجھ سے زیادہ سینئر ہیں۔ مجھے یہاں کی بہت سی باتیں سمجھ میں نہیں آئیں۔''

''تو پھر تم یہاں جاب کیسے کر رہے ہو؟'' دانیال نے کہا۔

''یہ بھی اپنی جگہ حیرت انگیز ہے۔'' خاور نے کہا۔ ''میں آرمی سے ریٹائرڈ ہونے کے بعد ایک سیکیورٹی ایجنسی میں معمولی سی جاب کر رہا تھا۔ ایک دفعہ میری ڈیوٹی ایک بڑے ڈپارٹمنٹل اسٹور پر تھی۔ اچانک وہاں ڈاکو آ گئے ہیں اس وقت سامنے والے کیبن سے سگریٹ لے رہا تھا ورنہ میں ڈاکوؤں کے ہاتھوں مارا جاتا۔ میں سگریٹ لے کر واپس آیا تو مجھے گڑبڑ کا احساس ہوا۔ پھر میں نے دو ڈاکوؤں کو مار گرایا، دو کو بری طرح زخمی کر دیا۔ ان کا پانچواں ساتھی فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا تھا لیکن بعد میں اسے بھی گرفتار کر لیا گیا تھا۔ اس واقعے کے دو دن بعد ماریہ ہمارے آفس آئی تھی۔ اسے سیکیورٹی گارڈ کی ضرورت تھی اور وہ صرف مجھے ہی ہائر کرنا چاہتی تھی۔ ایجنسی نے میری خدمات اسے دے دیں۔ پھر ماریہ نے مجھے بہت زیادہ سیلری کا لالچ دے کر اپنے پاس ملازم رکھ لیا بس پھر میں وہی کرتا گیا جو باس نے چاہا۔''

''اس نام نہاد ٹاسک فورس سے وابستہ ہر فرد کی یہی کہانی ہے۔'' دانیال نے کہا۔ ''یہ لوگ اسے ٹاسک فورس کہتے ہیں۔ لیکن میں اسے مافیا سمجھتا ہوں۔'' پھر وہ کچھ سوچ کر بولا۔ ''میری ایک بات یاد رکھنا۔ اس ٹاسک فورس کے کسی بھی فرد کے سامنے یوں بے تکلفی سے کوئی بات مت کرنا ورنہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دوسرے دن تمہاری لاش کوڑے کے کسی ڈھیر پر پڑی ہو۔''

''آپ مجھ سے بہت سینئر ہیں دانیال صاحب!'' خاور نے کہا۔ ''کیا آپ نے کبھی یہ کوشش نہیں کی کہ اس ٹاسک فورس یا مافیا کے اصل کرتا دھرتا کے بارے میں معلوم کیا جائے؟''

''میں معلوم کر چکا ہوں۔'' دانیال نے مسکرا کر کہا۔ ''اس کے بعد سے بہت زیادہ محتاط ہو گیا ہوں۔ میں اپنے طور پر اس شخص کے خلاف ثبوت بھی حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہوں لیکن ابھی تک مجھے کامیابی نہیں ہوئی ہے۔ جس دن مجھے اس کے خلاف کوئی ٹھوس ثبوت مل گیا، اس دن اس شخص سمیت شاہد خان اور اس کی نام نہاد ٹاسک فورس سلاخوں کے پیچھے ہو گی۔''

''نوید صاحب کا مرڈر کون کر سکتا ہے؟'' خاور نے پوچھا۔

''نوید بھی گزشتہ دو سال سے شاہد خان اور ماریہ سے برگشتہ ہو گیا تھا۔ وہ بھی ان کے خلاف......'' دانیال بولتے بولتے اچانک خاموش ہو گیا پھر بولا۔ ''ممکن ہے نوید کے ہاتھ ان لوگوں کے خلاف کوئی ثبوت لگ گیا ہو برادر...... خاور!'' دانیال پرجوش لہجے میں بولا۔ ''نوید نے کسی یو ایس بی کا بھی تذکرہ کیا تھا لیکن وہ ابھی تک مجھے نہیں ملی۔''

"نوید صاحب کے مرڈر کے بعد یو ایس بی یقینی طور پر پولیس کے ہاتھ لگ گئی ہوگی۔"

"نوید اتنا احمق نہیں تھا کہ وہ یو ایس بی اپنی جیب میں لے کر گھومتا۔ اگر وہ پولیس کے ہاتھ لگی ہے تو یہ بھی معلوم ہو جائے گا۔ اکبر کے کچھ جاننے والے ہیں پولیس ڈپارٹمنٹ میں۔" دانیال نے کہا۔

"اکبر کو بھی میں نے پہلی دفعہ دیکھا ہے...... یہ......"

"اکبر میرا آدمی ہے۔" دانیال مسکرا کر بولا۔ "اکبر میرا بہت پرانا دوست ہے۔ بہت نڈر اور ذہین آدمی ہے اور آئی ٹی کا ماہر ہے۔"

کھانے سے فارغ ہو کر وہ دونوں پھر لاؤنج میں آ گئے۔ خاور نے کہا۔ "آپ نے کسی یو ایس بی کا تذکرہ کیا تھا۔"

"ہاں۔" دانیال چونک کر بولا۔ "مجھے سوچنے دو کہ نوید وہ یو ایس بی کہاں چھپا سکتا ہے۔ اس کے بیڈ روم میں ایک الماری ہے۔ ہم وہیں سے شروع کرتے ہیں۔"

بیڈ روم میں پہنچ کر دانیال نے الماری کھولی تو چونک گیا۔ الماری میں کپڑے بے ترتیبی سے ٹھونسے گئے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی نے الماری کی تلاشی لی ہو اور کپڑوں کو دوبارہ یونہی ٹھونس دیا ہو۔ دانیال چند لمحے وہاں کھڑا الماری کو گھورتا رہا، پھر اس نے الماری بند کر دی۔ پھر اس نے کچن کا جائزہ لیا۔ ایک ایک کیبنٹ کی تلاشی لی۔ اسے وہاں بھی ناکامی ہوئی۔ وہاں سے اس نے ڈرائنگ روم کا رخ کیا۔ دانیال نے ڈرائنگ روم کا بھی اچھی طرح جائزہ لیا۔ اسے وہاں بھی ناکامی ہوئی۔ نہ جانے نوید نے یو ایس بی کہاں چھپائی تھی۔ اس نے جیب سے سیل فون نکالا اور اکبر کا نمبر ڈائل کر دیا۔ اکبر نے دوسری ہی گھنٹی پر کال ریسیو کر لی۔ اس نے کہا۔ "اکبر! کل صبح تمہیں ایک ضروری کام کرنا ہے۔ یہ معلوم کرو کہ نوید کے مرڈر کے بعد پولیس کو نوید کی کوئی یو ایس بی تو نہیں ملی ہے؟"

"یہ میں پہلے ہی معلوم کر چکا ہوں۔" اکبر نے کہا۔ "پولیس کی تحویل میں چند ڈی وی ڈیز، کچھ کاغذات اور نوید کا سیل فون ہے۔ پولیس کو وہاں سے کوئی یو ایس بی نہیں ملی۔"

"تم نے جانو اور روشو کا تعاقب کیا تھا؟" دانیال نے پوچھا۔

"جی ہاں، میں نے ان لوگوں کا تعاقب کیا تھا۔ روشو تو اس سے الگ ہو کر کہیں چلا گیا تھا۔ جانو وہاں سے ایک فائیو اسٹار ہوٹل پہنچا تھا۔ وہاں وہ پانچویں منزل کے کسی کمرے میں گیا تھا۔ پھر چند منٹ بعد ہی وہاں سے نکل آیا تھا۔"

"اس کا مطلب ہے کہ اس نے وہ ہارڈ ڈسک ہوٹل میں مقیم کسی شخص کو پہنچائی ہے۔" میں نے پُرخیال انداز میں کہا۔

"میں نے اپنے طور پر معلوم کرنے کی کوشش کی تھی لیکن معلوم نہ ہو سکا۔" اکبر نے کہا۔ "میں ابھی آپ کو کال کرنے ہی والا تھا کہ آپ کا فون آ گیا۔"

"ٹھیک ہے، مجھے ضرورت پڑی تو میں تمہیں کال کرلوں گا۔" دانیال نے کہا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔ پھر خاور کو بتایا کہ اکبر نے معلوم کر لیا ہے، پولیس کی تحویل میں کوئی یو ایس بی نہیں ہے۔ پولیس یقینی طور پر نوید کی ڈائری بھی لے گئی ہوگی ورنہ اس کے ذریعے اندازہ ہو جاتا کہ نوید کن خطوط پر کام کر رہا تھا۔" پھر دانیال اٹھتے ہوئے بولا۔ "آؤ، ذرا اس فائیو اسٹار ہوٹل تک چلتے ہیں۔ میں ذرا کپڑے بدل لوں۔ میں نے الماری میں نوید کے کئی بہت قیمتی سوٹ دیکھے ہیں۔ اس کا اور میرا سائز تقریباً ایک تھا۔"

دانیال تیار ہو کر بیڈ روم سے باہر نکلا تو اس کی سج دھج ہی نرالی تھی۔ جسم پر انتہائی قیمتی سوٹ تھا اور سفید بے داغ شرٹ پر سوٹ کی ہم رنگ ٹائی بہت اچھی لگ رہی تھی۔

خاور بھی تیار تھا۔ دانیال، نوید ہی کی گاڑی استعمال کر رہا تھا۔ وہ گاڑی پولیس نے اپنی تحویل میں نہیں لی تھی کیونکہ نوید ہیوی بائیک استعمال کرتا تھا۔

وہ ہوٹل پہنچے تو رات کا ایک بج رہا تھا۔ دانیال سیدھا کاؤنٹر پر پہنچا اور بہت پُراعتماد انداز میں استقبالیہ لڑکی سے بولا۔ "مجھے مسٹر ارشد علی خاکوانی سے ملنا ہے۔"

استقبالیہ کلرک نے سامنے رکھے ہوئے مانیٹر پر نظر ڈالی اور کچھ ٹائپ کرنے لگی۔ پھر وہ سر ہلا کر بولی۔ "سوری سر، اس نام کا کوئی گیسٹ ہمارے ہوٹل میں نہیں ہے۔"

"نہیں ہے؟" دانیال نے حیرت کا مظاہرہ کیا۔ "ابھی کچھ دیر پہلے ٹیلی فون پر ان سے بات ہوئی ہے۔ انہوں نے بتایا تھا کہ ففتھ فلور پر مقیم ہیں۔ روم نمبر میرے ذہن سے نکل گیا ہے۔"

استقبالیہ کلرک نے ایک مرتبہ پھر ایل سی ڈی پر نظر ڈالی۔ کچھ بٹن دبائے اور بولی۔ "سوری سر، ففتھ فلور پر اس نام کے کوئی گیسٹ نہیں ہیں۔"

دانیال نے پریشانی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

''میں کیسے معلوم کروں، ان کا سیل فون بھی اس وقت آف ہے۔''

''آئی ایم سوری سر۔'' استقبالیہ لڑکی نے کہا۔ ''مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکی۔''

''کوئی بات نہیں۔'' اس نے کہا۔ ''میں اب ان سے صبح ہی ملاقات کروں گا۔'' یہ کہہ کر دانیال کاؤنٹر سے ہٹ گیا۔

اسی وقت اسے مراد نظر آیا۔ وہ لفٹ سے نکل کر ہوٹل کے دروازے کی طرف جارہا تھا۔ اس کی نظر دانیال اور خاور پر نہیں پڑی تھی۔

''یہ مراد یہاں کیا کر رہا ہے؟'' خاور خود کلامی کے انداز میں بولا۔

''آؤ، اسی سے معلوم کرتے ہیں۔'' دانیال نے کہا اور باہر کی طرف بڑھا۔

مراد پارکنگ لاٹ کی طرف جارہا تھا۔ مراد کو وہاں دیکھ کر دانیال کو شدید حیرت ہوئی تھی۔ وہ تینوں پارکنگ لاٹ میں آگے پیچھے داخل ہوئے۔ دانیال نے قدرے بلند آواز میں کہا۔ ''مراد!''

مراد بری طرح چونکا اور گھوم کر دیکھا۔ پارکنگ لاٹ میں روشنی ناکافی تھی لیکن اتنی کم بھی نہیں تھی کہ مراد، دانیال کو نہ پہچان سکتا۔ دانیال کو دیکھ کر وہ تیزی سے ان کی طرف آیا اور بولا۔ ''دانیال صاحب! آپ...... یہاں؟''

''ہاں، میں ایک ضروری کام کے سلسلے میں لاہور آیا تھا۔'' دانیال نے کہا۔ ''تم یہاں کیا کر رہے ہو؟''

''میں یہاں خواجہ صاحب سے ملنے آیا تھا۔''

''خواجہ صاحب، وہ تو نہیں جو ملتان سے آئے ہیں اور سیکنڈ فلور پر مقیم ہیں۔''

''نہیں خواجہ صاحب تو ففتھ فلور پر مقیم ہیں، روم نمبر پانچ سو دو میں۔''

''اچھا...... اچھا۔'' دانیال نے سرسری انداز میں کہا۔ ''اب تم کہاں جارہے ہو؟''

''میں میڈم ماریہ کے ساتھ آیا تھا۔ وہ ڈیفنس میں ٹھہری ہوئی ہیں۔'' پھر وہ کچھ سوچ کر بولا۔ ''اگر آپ کی میڈم سے ملاقات ہو تو انہیں مت بتایئے گا کہ میں نے ان کے بارے میں آپ کو کچھ بتایا ہے۔''

''فکر مت کرو۔'' دانیال مسکرا کر بولا۔ ''گاڑی نہیں ہے تو میں ڈراپ کر دوں؟''

''نہیں سر۔'' مراد نے کہا۔ ''میرے پاس گاڑی ہے۔''

اس کے جانے کے بعد وہ لوگ بھی اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گئے۔

''یہاں نہ جانے کیا چکر چل رہا ہے؟'' دانیال نے کہا۔ ''مراد یہاں کیوں آیا تھا اور ماریہ اپنی آمد کو خفیہ کیوں رکھنا چاہتی ہے؟'' پھر اس نے جیب سے سیل فون نکالا اور اکبر سے رابطہ کرنے کے بعد بولا۔ ''اکبر! میں نے معلوم کر لیا ہے کہ پانچویں فلور پر جانوکس سے ملا تھا۔ وہ شخص خواجہ کے نام سے روم نمبر پانچ سو دو میں مقیم ہے۔''

''آپ اس وقت کہاں ہیں؟'' اکبر نے پوچھا۔

''میں اس وقت اسی ہوٹل کی پارکنگ لاٹ میں ہوں۔''

''ٹھیک ہے، آپ واپس چلے جائیں، میں وہاں پہنچتا ہوں۔''

وہ لوگ گھر پہنچے تو دانیال بہت بیزار بیزار سا تھا۔ اس نے کہا۔ ''لگتا ہے، ہم اندھیرے میں دھکے کھا رہے ہیں۔ کوئی سرا ہاتھ ہی نہیں آرہا۔''

دانیال کپڑے بدلنے کے لیے بیڈ روم میں چلا گیا۔ اس نے کوٹ اتارنے سے پہلے حسبِ عادت اس کی جیبوں کی تلاشی لی۔ اس نے کوٹ کی اندرونی جیب میں ہاتھ ڈالا تو اس کی انگلیاں کسی چیز سے ٹکرائیں۔ وہ کوئی بہت چھوٹی سی چیز تھی لیکن دانیال کی انگلیوں نے اسے محسوس کر لیا۔ اس نے وہ چیز باہر نکال لی۔ وہ بہت چھوٹا میموری کارڈ تھا۔ کارڈ دیکھ کر دانیال کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ اس نے کوٹ بیڈ پر پھینکا اور تیزی سے باہر لپکا۔

اس کا جوش و خروش دیکھ کر خاور چونک اٹھا اور بولا۔ ''کیا ہوا دانیال صاحب؟''

''ہمیں جس چیز کی تلاش تھی، وہ مل گئی ہے۔'' دانیال کی آواز میں بھی دبا دبا جوش تھا۔

اس نے چٹکی میں پکڑا ہوا میموری کارڈ غور سے دیکھا۔ وہ آٹھ جی بی کا میموری کارڈ تھا۔ اس میں ایک تو کیا، بہت سی فائلیں ٹرانسفر ہو سکتی تھیں۔

''خاور! میں نے کمپیوٹر ٹرالی کی دراز میں ایک کارڈ ریڈر دیکھا تھا۔ وہ ذرا نکالو اور میرا لیپ ٹاپ لے آؤ۔''

خاور نے کمپیوٹر ٹرالی میں سے کارڈ ریڈر نکال کر دانیال کو دیا اور اس کا لیپ ٹاپ اٹھا لایا۔

دانیال نے میموری کارڈ، کارڈ ریڈر میں لگایا اور اسے لیپ ٹاپ میں لگا دیا۔ ان دونوں کی نظریں لیپ ٹاپ

کے اسکرین پر لگی ہوئی تھیں۔ اچانک لیپ ٹاپ اسپیکرز سے گانے کی آواز ابھری۔ ''اے بی سی ڈی پڑھ لی بہت، اچھی باتیں کرلیں بہت......'' دانیال نے جھنجلا کر وہ گانا بند کردیا اور گانا سن کر اسے اس جھنجلاہٹ میں بھی ہنسی آگئی۔ خاور بھی ہنسنے لگا، پھر بولا۔ ''سر! دوسرے فولڈر بھی چیک کریں۔''

دانیال نے دوسرا فولڈر کھولا تو چند سیکنڈ تک اسکرین پر چھائیاں اور لائنیں آتی رہیں۔ پھر نوید کی آواز ابھری۔ ''دانیال! تم میری آواز سن رہے ہو؟ اگر یہ میموری کارڈ واقعی تمہیں ملا ہے تو یہ میری بہت بڑی کامیابی اور اس ملک کی خوش قسمتی ہے اور اگر ایسا نہیں ہے تو ملک کو خدانخواستہ شدید نقصان پہنچنے والا ہے۔ اب میری بات غور سے سنو۔ میں تمہیں ملک کے چند بڑے لوگوں کے نام بھیجوں گا۔ یہ ان لوگوں کو بھنکانے کے لیے ہوں گے جو ملک کے خلاف ایک گھناؤنی سازش میں ملوث ہیں۔ وہ پانچوں لوگ بہت نیک نام ہیں۔ محض ناموں سے ان کا کچھ نہیں بگڑ سکتا، ہاں سازشی عناصر ضرور گمراہ ہو سکتے ہیں۔ یہ تو تمہیں علم ہوگا کہ ہم سب شاہد خان کی جس ٹاسک فورس کے لیے کام کرتے ہیں، وہ کوئی ٹاسک فورس نہیں بلکہ دہشت گردوں کی ایک تنظیم ہے۔ وہ لوگ بھاری معاوضے دے کر ملک کے نوجوانوں کو اپنا آلہ کار بنا رہے ہیں۔ پھر انہیں بلیک میل کر کے اپنے تمام غیر قانونی کام ان سے کراتے ہیں۔ میں نے اس گھناؤنی سازش میں مزید ان کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا تو شاہد آپے سے باہر ہو گیا اور بولا کہ تم چاہو بھی تو ہمیں نہیں چھوڑ سکتے۔ میرے پاس تمہارے ان تمام قتل، اور غیر قانونی کاموں کی وڈیوز موجود ہیں جو تم اب تک کرتے رہے ہو۔ میں غصے میں پاگل ہو گیا اور بمشکل تمام اپنے غصے پر قابو پا کر بولا۔ ''دھمکیاں مت دو باس! میں نے تو یونہی ایک بات کہی تھی، ٹاسک فورس چھوڑنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے میرا؟ اس دن کے بعد شاہد خان میری طرف سے محتاط ہو گیا۔ ایک بات اور سنو، شاہد خان کا اصل نام سنجے کپور ہے۔''

دانیال اس انکشاف پر بری طرح چونکا۔ خاور بھی پھٹی پھٹی آنکھوں سے خالی اسکرین کو گھور رہا تھا کیونکہ میموری کارڈ میں صرف نوید کی آڈیو تھی۔ دانیال ایک مرتبہ پھر لیپ ٹاپ کی طرف متوجہ ہو گیا۔ شاہد خان کی طرح مار یہ بھی بھارتی ایجنٹ ہے۔ اس سے زیادہ ہولناک بات یہ ہے کہ ان کا سرپرست ملک کا ایک بہت بڑا آدمی ہے۔ اس کا نام سن کر تمہیں یقین نہیں آئے گا۔ پہلے مجھے بھی یقین نہیں آیا تھا۔ اس کا نام ملک محمد یاسین خان ہے۔ گزشتہ حکومت میں یہ وزیر تھا۔ یہ بہت بڑا جاگیردار ہے۔ اس کی سرپرستی میں بہت سے رفاہی ادارے چلتے ہیں۔ ملک کے بڑے شہروں میں اس نے اسپتال بھی بنائے ہیں اور اسکول بھی۔ اس کا اصل نام راجیش شکلا ہے۔ شکلا گزشتہ تیس سال سے ہمارے ملک میں مقیم ہے۔ نہ صرف مقیم ہے بلکہ ہر دور میں حکومت کے اعلیٰ عہدوں پر بھی رہا ہے۔ اس کے اسکولوں میں پاکستان دشمن پرورش پاتے ہیں۔ میں تو چکرا کر رہ گیا ہوں۔ اسکولوں میں پڑھانے والے اساتذہ بھی مسلمان نہیں ہیں لیکن نظر ایسے آتے ہیں جیسے ان سے بڑا کوئی مسلمان نہ ہو، ان کا تعلق ''را'' سے نہیں ہے۔ یہ بھارت کی کسی مذہبی انتہا پسند تنظیم کے لوگ ہیں۔ اب سب سے ضروری بات سنو، فروری میں بھارتی وزیراعظم پاکستان کے سرکاری دورے پر آرہے ہیں۔ بھارت کی مذہبی انتہا پسند تنظیموں کو یہ بات پسند نہیں آئی ہے کہ پاکستان اور بھارت میں اچھے تعلقات ہوں۔ بھارتی وزیراعظم پاکستان پہنچیں گے اور اسی دن انہیں ہلاک کر دیا جائے گا۔ اس کے بعد کیا ہوگا، اس کا اندازہ تم بھی لگا سکتے ہو، پاکستان پوری دنیا میں بدنام ہو جائے گا اور دنیا بھر کی ہمدردیاں بھارت کے ساتھ ہوں گی۔ آج دسمبر کی دس تاریخ ہے، بھارتی وزیراعظم بائیس فروری کو پاکستان پہنچیں گے۔ ہمیں اس عرصے میں اپنا پلان ترتیب دینا ہے۔ میں نے احتیاطاً یہ باتیں ریکارڈ کر دی ہیں کہ ممکن ہے میرے ساتھ کوئی حادثہ پیش آجائے۔ میں اگلے ہفتے کراچی آؤں گا تو اس موضوع پر تفصیل سے بات کریں گے۔''

دانیال گم صم سا اپنی جگہ پر بیٹھا رہ گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اپنے ملک کو ان بھیڑیوں سے کیسے بچائے۔ خاور بھی دم بخود تھا۔

''اگر شاہد خان بھارتی ایجنٹ ہے تو ہم بھی خطرے میں ہیں۔'' دانیال نے کہا۔ ''اسے نوید پر شبہ ہو گیا تھا اس لیے اسے راستے سے ہٹا دیا گیا۔ ہمیں بہت محتاط رہنا ہوگا۔ ابھی ہمارے پاس دو مہینے ہیں۔''

''اتنے بڑے لوگوں کے خلاف ہم کارروائی کیسے کریں گے؟'' خاور نے کہا۔

''اس میموری کارڈ میں یاسین اور دیگر لوگوں کے خلاف ثبوت بھی ہوں گے۔ نوید اتنے بڑے بڑے الزامات یونہی نہیں لگا سکتا۔''

دانیال نے سوچا کہ میموری کارڈ کے دوسرے فولڈرز

بھی چیک کر لیے جائیں۔ اس نے لیپ ٹاپ آن کر کے دوبارہ کارڈ ریڈر اس میں لگایا ہی تھا کہ اس کے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ دوسری طرف اکبر تھا۔

''ہاں اکبر۔'' دانیال نے کہا۔

''میں اس ہوٹل کے کمرا نمبر پانچ سو دو تک پہنچ گیا تھا لیکن اس سے پہلے ہی کسی نے وہاں مقیم شخص کو قتل کر دیا۔''

''کیا؟'' دانیال بری طرح چونکا۔ ''تم اس وقت کہاں ہو؟''

''میں ابھی کچھ دیر پہلے ہوٹل سے نکلا ہوں۔ مجھے وہاں سے کچھ اہم سراغ بھی ملے ہیں۔ صبح آپ کے پاس آؤں گا۔ آپ کہیں تو ابھی آجاؤں؟''

''ہاں، تم ابھی آسکتے ہو۔'' دانیال نے کہا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔

''کون تھا؟'' خاور نے پوچھا۔ ''اکبر؟''

''ہاں، وہی تھا۔ وہ ابھی تھوڑی دیر میں یہاں پہنچ رہا ہے۔ یہ لیپ ٹاپ اٹھا کر رکھ دو۔'' دانیال نے کارڈ ریڈر نکالتے ہوئے کہا۔ ''اب میں اکبر کے جانے کے بعد چیک کروں گا۔'' پھر وہ ہنس کر بولا۔ ''تم ذرا کافی ہی بنا لو۔''

''ابھی بناتا ہوں۔'' خاور نے کہا اور اٹھتے ہوئے بولا۔ ''آج سردی کچھ زیادہ ہی ہے۔''

اس کے جانے کے بعد دانیال نے اپنے سیل فون سے میموری کارڈ نکالا اور اس کی جگہ نوید والا میموری کارڈ لگا دیا۔ اور اپنا میموری کارڈ ریڈر میں لگا دیا۔ یہ بھی کوئی محفوظ طریقہ نہیں تھا لیکن فوری طور پر محفوظ تھا۔

آدھے گھنٹے بعد اکبر وہاں پہنچ گیا۔ اس نے بتایا کہ ہوٹل کے کمرا نمبر پانچ سو دو میں جو شخص مقیم تھا، اس کا نام ارون گپتا تھا۔''

''ارون گپتا؟'' خاور نے حیرت سے کہا۔ ''اس کا مطلب ہے کہ وہ ہندو تھا۔ مراد کہہ رہا تھا کہ وہاں خواجہ نام کا کوئی شخص مقیم ہے۔''

''میں ارون گپتا کا پاسپورٹ اور دوسرے اہم کاغذات لے آیا ہوں۔'' اس نے پلاسٹک کا ایک لفافہ دانیال کی طرف بڑھا دیا اور اٹھتے ہوئے بولا۔ ''میں اب چلتا ہوں۔''

اس کے جانے کے بعد دانیال نے بھی کچھ دیر کمر سیدھی کرنے کا ارادہ کیا۔ کمرے میں صرف ایک بیڈ تھا اور ایک ہی کمبل تھا۔ دانیال نے الماری کے نچلے حصے میں ایک اور کمبل بھی دیکھا تھا۔ خاور وہی کمبل اوڑھ کر بیڈروم میں

صوفے پر لیٹ گیا۔ اس نے ہیٹر بھی آن کر دیا تھا اس لیے کمرے کا درجۂ حرارت خوش گوار تھا۔
فوراً ہی دانیال کو نیند آ گئی مگر اچانک ہی اس کی آنکھ کھل گئی۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ وہ آدھا گھنٹا سویا یا ایک گھنٹا۔ کمرے میں گھپ اندھیرا تھا۔ دانیال نے لائٹ آن نہیں کی تھی۔ وہ لائٹ آف کر کے سونے کا عادی نہیں تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر اپنا سیل فون اٹھایا اور اس کا اسکرین آن کر دیا۔ اس کی مدھم روشنی میں اس نے کمرے کا جائزہ لیا تو چونک اٹھا۔ خاور اپنی جگہ پر نہیں تھا۔ باتھ روم کا دروازہ بھی کھلا ہوا تھا۔ وہ باتھ روم میں بھی نہیں تھا۔
''خاور کہاں جا سکتا ہے؟'' دانیال منہ ہی منہ میں بڑبڑایا اور اٹھ کر کمرے سے باہر نکل آیا۔ اسے کچن کی طرف سے بہت خفیف سی آوازیں سنائی دیں۔ دانیال دبے پاؤں کچن کی طرف بڑھا۔ اس کا خیال تھا کہ کوئی دشمن گھر میں گھس آیا ہے اور کچن میں چھپا بیٹھا ہے۔ وہ کچن کی کھڑکی کے پاس پہنچا تو آوازیں واضح ہو گئیں۔
خاور کسی سے کہہ رہا تھا۔ ''نہیں، وہ یو ایس بی تو نہیں، دانیال کو ایک میموری کارڈ ضرور ملا ہے۔ اس میں آپ کے خلاف، میڈم کا نتا کے خلاف اور تنظیم کے تمام لوگوں کے خلاف ثبوت ہیں۔ ہاں اس میموری کارڈ کو میں نے اپنے قبضے میں لے لیا ہے...... ہاں...... دانیال اس وقت سو رہا ہے۔ گولی مار دوں۔ نہیں سر، میں چاہ رہا تھا کہ وہ دوسرا آدمی بھی یہاں موجود ہو تو دونوں کو ایک ساتھ گولی ماروں......نہیں...... دانیال کو مجھ پر شک نہیں ہوا ہے...... ٹھیک ہے، میں اپنا کام کر کے نکلتا ہوں۔''
دانیال دبے قدموں بیڈ روم میں پہنچا اور اپنا ریوالور لوڈ کر کے پہلو میں رکھ لیا۔
تھوڑی دیر بعد خاور بھی کمرے میں پہنچا اور لائٹ آن کر دی۔ دانیال سرعت سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ خاور لائٹ آن کر کے پلٹا تو دانیال نے سرد لہجے میں کہا۔ ''تم کہاں گئے تھے؟''
''میں...... کہیں بھی نہیں...... میں پانی پینے گیا تھا کچن تک۔'' خاور جلدی سے بولا اور اپنی جیب میں ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی۔
''نہیں۔'' دانیال ڈپٹ کر بولا اور خاور پر ریوالور تان لیا۔ ''اپنے ہاتھوں کو قابو میں رکھو۔''
خاور ٹھٹک کر رک گیا اور بولا۔ ''کیا ہو گیا ہے دانیال صاحب؟''
''اپنے دونوں ہاتھ سر پر رکھو۔'' دانیال نے چیخ کر کہا۔
خاور نے دونوں ہاتھ سر پر رکھتے ہوئے کہا۔ ''آپ شاید نیند میں ہیں، میں......''
''بکومت۔'' دانیال نے اسے جھڑک دیا۔ ''ابھی تم کس سے بات کر رہے تھے؟''
''میں کس سے بات کروں گا دانیال صاحب؟'' خاور نے کہا۔ ''میں نے بتایا تو ہے کہ......''
''ابھی تم سیل فون پر کس سے بات کر رہے تھے؟'' دانیال نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔
''بس......سیل فون پر......وہ میں......''
''دیکھو خاور۔'' دانیال نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''مجھے سب کچھ سچ سچ بتا دو۔ جھوٹ بولو گے تو جان سے جاؤ گے۔'' دانیال کا لہجہ سرد اور سفاک تھا۔ ''ابھی تم کس سے بات کر رہے تھے؟'' یہ کہتے ہوئے دانیال نے اس کی جیب میں ہاتھ ڈال کر اس کا سیل فون نکال لیا۔ ''بتاؤ کس سے بات کر رہے تھے؟''
''میرا ایک دوست تھا۔'' خاور نے کہا۔
''دوست کا نام بتاؤ۔'' دانیال نے درشت لہجے میں پوچھا۔
خاور نے اچانک اچھل کر اس کے ہاتھ پر لات ماری۔ دانیال کے ہاتھ سے ریوالور نکل گیا۔ خاور نے اس پر چھلانگ لگائی لیکن دانیال نے اچانک اپنی جگہ چھوڑ دی۔ خاور اپنے ہی زور میں بیڈ کی پشت سے ٹکرایا۔ دانیال نے ایک دم گھوم کے اس کی گردن دبوچ لی اور اسے پوری قوت سے دبانے لگا۔ خاور بری طرح تڑپنے لگا۔ اس کی آنکھیں حلقوں سے باہر نکل آئیں۔ دانیال نے اسے فرش پر دھکیل دیا اور لپک کر اپنا گرا ہوا ریوالور اٹھا لیا۔
خاور فرش پر پڑا اپنی گردن مسل رہا تھا۔ دانیال نے ریوالور اس کی کھوپڑی پر رکھ دیا اور ڈپٹ کر بولا۔ ''میں نے تجھے ایک دفعہ تو چھوڑ دیا لیکن بار بار نہیں چھوڑوں گا۔ بتا، تو کس سے بات کر رہا تھا؟''
''اب تم سمجھ ہی گئے ہو تو تمہیں کیا بتانا۔'' خاور نے کھانستے ہوئے کہا۔ ''میں باس سے بات کر رہا تھا، شاہد خان سے۔''
''شاہد خان نہیں، سنجے کپور کہو۔'' دانیال نے درشت لہجے میں کہا۔
''ہاں، سنجے کپور سے۔'' خاور نے بے خوفی سے کہا۔

''اور یہ کاشنا میڈم شاید ماریہ ہے؟'' دانیال نے پوچھا۔
''ہاں۔'' خاور نے کہا۔
''اب تم جلدی سے اپنا نام بھی بتادو اور عہدہ بھی۔''
''میرا نام جان کر کیا کرو گے؟'' خاور نے کہا۔''میں جانتا ہوں، تم مجھے زندہ نہیں چھوڑو گے۔''
''ہاں۔'' دانیال نے سرد لہجے میں کہا۔''لیکن میں خاور کو نہیں، اس ہندو کو مارنا چاہتا ہوں جس نے خاور کا بھیس بدل رکھا ہے۔''
''میرا نام پرکاش ہے۔'' خاور نے کہا۔
''اپنا عہدہ بتاؤ۔'' دانیال نے پوچھا۔
''اگر تم یہ سمجھ رہے ہو کہ میرا تعلق ''را'' سے ہے تو تم غلط سمجھ رہے ہو۔ میرا تعلق پہلے آر ایس ایس سے تھا، اب ایک اور تنظیم سے ہے۔ بھئی اس سے زیادہ میں کچھ نہیں بتاؤں گا۔''
''وہ میموری کارڈ میرے حوالے کرو۔''
''میموری کارڈ۔'' خاور ہنس کر بولا۔''اب وہ تمہیں نہیں مل سکتا۔''
''میں مارنے سے پہلے تمہارے بدن کی کھال کھینچ لوں گا۔'' دانیال نے ترش لہجے میں کہا۔
''تم میرے ٹکڑے بھی کر دو، میرا قیمہ بنا دو لیکن میموری کارڈ تمہیں نہیں مل سکتا۔ میں نے اسے جلا کر اس کی راکھ بھی بہا دی۔'' یہ کہہ کر خاور پاگلوں کی طرح ہنسنے لگا۔
''مجھے معلوم تھا کہ اس میں ہمارے خلاف ثبوت بھی ہوں گے۔ ان ثبوتوں کے بغیر تم کچھ ثابت نہیں کر سکو گے۔ لوگ تمہیں پاگل سمجھیں گے بلکہ پاکستان سرکار تو خود تمہیں پاگل خانے بھجوا دے گی۔'' خاور ایک مرتبہ پھر پاگلوں کی طرح ہنسنے لگا۔
دانیال نے مٹھیاں بھینچ کر اپنی بے بسی کا مظاہرہ کیا پھر بولا۔''چلو، تم مجھے زبانی ہی بتا دو۔ میری بات پر کوئی یقین نہیں کرے گا۔''
''افسوس۔'' خاور نے طنزیہ لہجے میں کہا۔''ملک یاسین تیس برس سے تمہارے سینوں پر مونگ دل رہا ہے۔ تمہارے ساتھ کھاتا پیتا ہے تمہارے ساتھ نمازیں پڑھتا ہے لیکن تم لوگوں کو احساس بھی نہ ہوا۔ سنجے کپور پچھلے پندرہ سال سے یہاں ہے، اس نے اب تک تمہاری حکومت کے کئی اہم راز اپنی تنظیم تک پہنچائے ہیں۔'' پھر وہ مسکرا کر بولا۔''اور پوچھو، کیا پوچھنا ہے؟''
''جب تمہارے پرائم منسٹر یہاں آئیں گے تو انہیں نشانہ کون بنائے گا؟''
''یہ تو مجھے بھی معلوم نہیں۔'' خاور نے جواب دیا۔ اس کے لہجے میں سچ تھا۔''شاید کیا بلکہ یقیناً نوید کو معلوم ہوگا اور اس میموری کارڈ کے کسی فولڈر میں بھی موجود ہوگا لیکن وہ فولڈر تو...... '' وہ پھر پاگلوں کی طرح ہنسا۔
دانیال نے اچانک ریوالور اس پر تان لیا اور طنزیہ لہجے میں ہنس کر بولا۔''پرکاش جی! اب جو کچھ میں تمہیں بتاؤں گا، تم اس پر واقعی پاگلوں کی طرح ہنسو گے، تمہیں بناوٹ کرنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ تم کیا مجھے اتنا ہی الو کا پٹھا سمجھتے ہو کہ میں اس میموری کارڈ کی طرف سے یوں غافل ہو جاؤں گا۔ وہ میموری کارڈ اب بھی میرے پاس محفوظ ہے۔ کارڈ ریڈر میں تو میں نے فضول سا ایک کارڈ لگا دیا تھا۔ نوید کا کارڈ آٹھ جی بی کا تھا۔ میں نے جو کارڈ اس کی جگہ رکھا تھا وہ چار جی بی کا تھا۔ یقین نہ آئے تو تم وہ کارڈ نکال کر دیکھ سکتے ہو۔ میں جانتا ہوں، تم نے وہ کارڈ ضائع نہیں کیا ہے۔''
پرکاش (خاور) پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے گھور رہا تھا۔ اس کے چہرے پر عجیب تاثرات تھے۔ پھر وہ چیخ کر بولا۔''یو باسٹرڈ...... تو مجھ سے بلف کر رہا تھا...... مجھ سے...... بلف تو ہم نے تیرے ساتھ کیا ہے...... حرام زادے...... چھل کپٹ میں ہم سے زیادہ کون ہے...... ہم اپنے پردھان منتری (وزیراعظم) کو قتل کیوں کرتے لگے۔ نوید خود کو عقلِ کل سمجھتا تھا۔ ہمارے ہی لوگوں نے اسے یہ بتایا تھا ورنہ ہمارا پلان کچھ اور ہے...... اس مرتبہ ہم پاکستان کو ایسا زخم لگائیں گے کہ وہ مدتوں نہ بھر سکے گا۔''
دانیال کے چہرے پر بے بسی کے تاثرات تھے۔
''میں تمہیں ایک ٹپ دے سکتا ہوں۔'' پرکاش گویا دانیال کی بے بسی سے لطف اندوز ہوتے ہوئے بولا۔ ''لیکن اس ٹپ سے تم لوگ اور پاگل ہو جاؤ گے بلکہ پاگل کتوں کی طرح ایک شہر سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے کی طرف بھاگو گے۔'' پھر پرکاش لہجہ بدل کے بولا۔''ہم پاکستان کے کسی بڑے اسکول پر ہلا بولیں گے اور وہاں موجود سنپولیوں کو کچل کر رکھ دیں گے۔ وہ بچے سنپولیے ہی تو ہیں۔ جب ایک ساتھ ایک ہزار بچوں کے جنازے اٹھیں گے تو تمہارے تمام میزائل، ٹینک اور راکٹ لانچر بھی تمہارے کام نہ آسکیں گے۔'' یہ کہہ کر وہ پاگلوں کی طرح

ہنسنے لگا۔

دانیال غصے سے گویا پاگل ہو گیا اور اس نے پرکاش کے منہ پر زوردار لات رسید کر دی اور ڈپٹ کر بولا۔ ''تم لوگ پیدائشی بزدل ہو...... مردوں کا مقابلہ تو کر نہیں سکتے، عورتوں اور بچوں ہی پر تمہارا بس چلتا ہے۔'' دانیال نے اس کے منہ پر دوسری لات ماری۔ ''بتاؤ تم لوگوں نے ہمارے کس شہر کو خون میں نہلانے کا پروگرام بنایا ہے؟''

''یہ بات میں مر کے بھی نہیں بتاؤں گا۔'' پرکاش مکروہ انداز میں مسکرایا کیونکہ دانیال کی زبردست لات سے اس کے کئی دانت ٹوٹ گئے تھے اور منہ سے خون بہہ رہا تھا۔

''میں تجھ پر اپنی گولی ضائع نہیں کروں گا بلکہ تیری کھال کھینچ لوں گا۔''

''اس کے جوتے بھی بنوا لینا۔'' پرکاش نے طنزیہ لہجے میں کہا اور کن انکھیوں سے دیوار گیر گھڑی دیکھی۔

دانیال اس کی اس حرکت پر چونک اٹھا۔ اسے اچانک خیال آیا کہ پرکاش اسے باتوں میں لگا کر وقت ضائع کر رہا ہے اور اسے کسی کی آمد کا انتظار ہے۔

دانیال اچانک کھڑا ہو گیا۔ اس نے تیزی سے پرکاش کے ہاتھ پشت پر باندھے اور خود بھی بہت عجلت میں کپڑے بدل لیے۔ اس نے اپنے دونوں ریوالور بغلی ہولسٹرز میں ڈالے اور پرکاش کو کھینچتا ہوا باہر لے چلا۔

''یہ...... یہ...... تم کیا کر رہے ہو؟'' دانیال کو پہلی دفعہ پرکاش کے لہجے میں خوف محسوس ہوا۔

صبح ہونے میں زیادہ دیر نہیں تھی۔ تمام اپارٹمنٹس میں تاریکی اور سناٹا تھا۔ دانیال، پرکاش کو گھسیٹتا ہوا گاڑی تک لے گیا اور اسے پسنجر سیٹ میں ٹھونس دیا۔ کمپلیکس کے صدر دروازے پر کاہل سا ایک چوکیدار بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ دانیال نے احتیاطاً گاڑی صاف کرنے کا میلا کپڑا اٹھا کر پرکاش کے منہ میں ٹھونس دیا۔

اسی وقت بلڈنگ کے صدر دروازے پر ایک لینڈ کروزر رکی اور اس میں سے چار آدمی باہر نکل کر گیٹ کی طرف بڑھے۔ ان میں سے ایک نے چوکیدار سے کچھ پوچھا۔ پھر وہ چاروں لفٹ کی طرف بڑھ گئے۔

دانیال کو یقین تھا کہ پرکاش کو انہی لوگوں کا انتظار تھا۔ وہ فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ پرکاش کو لے کر نکلے یا ان لوگوں کا شکار کرے۔ پھر اس نے لمحوں میں ان لوگوں کو گھیرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس نے ریوالور کے دستے کی ایک نپی تلی ضرب پرکاش کے سر پر ماری۔ وہ بیٹھے بیٹھے ایک طرف لڑھک گیا پھر اس نے جیب سے سیل فون نکال کر اکبر کو کال کی اور مختصراً اسے بتایا کہ وہاں کیا صورتِ حال ہے۔

دانیال کو یہ بھی اندازہ تھا کہ ان کا ایک آدمی گاڑی میں بھی بیٹھا ہو گا۔ گاڑی میں ایک سے زیادہ افراد بھی ہو سکتے تھے۔ دانیال نے پرکاش کی طرف سے اطمینان کیا کہ وہ کم سے کم آدھے گھنٹے تک ہوش میں نہیں آئے گا، ہوش میں آ بھی جاتا تو وہ گاڑی میں سے نکل نہیں سکتا۔

کمپلیکس کے مین گیٹ پر ہلکی روشنی کا ایک بلب روشن تھا۔ دانیال دبے پاؤں گیٹ کی طرف بڑھا اور آہستہ سے باہر نکل گیا۔ پھر وہ چکر کاٹ کر لینڈ کروزر تک پہنچا۔ سردی کی وجہ سے گاڑی کے شیشے چڑھے ہوئے تھے اس لیے اسے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ وقت بہت تیزی سے گزر رہا تھا۔ وہ لوگ کسی بھی وقت واپس آ سکتے تھے۔ دانیال نے انگلی سے گاڑی کا شیشہ بجایا۔ فوراً ہی گاڑی کا شیشہ سرکنے کی آواز آئی اور اندر بیٹھے ہوئے آدمی نے مشکوک نظروں سے دانیال کو گھورتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا بات ہے؟''

دانیال نے اچانک ریوالور اس کے سامنے کر دیا اور بولا۔ ''یہ بات ہے۔''

''کک...... کون ہو تم اور......''

دانیال نے کچھ کہے بغیر اس کی کھوپڑی پر ریوالور کا دستہ رسید کر دیا۔ وہ بے ہوش ہو کر پسنجر سیٹ کی طرف لڑھک گیا۔ دانیال گھوم کر گاڑی کی دوسری طرف گیا اس کے دو ٹائر ناکارہ کر دیے۔ کمپلیکس کے باہر کئی دوسری گاڑیاں بھی کھڑی تھیں۔ دانیال انہی میں سے ایک گاڑی کے پیچھے چھپ گیا۔ وہاں سے اسے کمپلیکس کا مین گیٹ بالکل صاف نظر آ رہا تھا۔

اس نے پھر سیل فون نکال کر اکبر کا نمبر ملایا تو وہ بولا۔ ''دانیال صاحب! میں بس دو منٹ میں پہنچنے والا ہوں۔ آپ کہاں ہیں؟''

''تم کمپلیکس کے باہر ہی رہنا۔ مین گیٹ کے سامنے ایک لینڈ کروزر کھڑی ہے۔ حملہ آور اسی میں آئے ہیں اور اس وقت اپارٹمنٹ کی تلاشی لے رہے ہوں گے۔ ان کے ڈرائیور کو میں نے بے ہوش کر دیا ہے۔ اب ان کا انتظار کر رہا ہوں۔''

اسی وقت کچھ فاصلے پر اسے بائیک رکنے کی آواز سنائی دی۔ بائیک کی آواز سن کر دانیال سمجھ گیا کہ اکبر آ گیا

ہے۔

اچانک عمارت کی طرف سے کچھ لوگ گاڑی کی طرف بڑھتے ہوئے نظر آئے۔ دانیال نے ریوالور پر سائیلنسر فٹ کرلیا اور آنے والوں کی گھات میں بیٹھ گیا۔ دانیال جانتا تھا کہ وہ لوگ وہاں سے بھاگنے میں کامیاب نہیں ہوں گے، ہاں، پیدل فرار ہوئے تو بات دوسری تھی۔

وہ لوگ گاڑی کے نزدیک پہنچے تو دانیال کو ان کی آوازیں بھی سنائی دینے لگیں۔ ان میں سے ایک بولا۔ ''اس مردود پرکاش نے فضول میں ہماری دوڑ لگوا دی۔ وہاں نہ دانیال تھا، نہ وہ میموری کارڈ۔''

''ہوسکتا ہے پرکاش کو انہی لوگوں نے وہاں سے ہٹا دیا ہو یا پھر......''

''ہونے کو تو کچھ بھی ہوسکتا ہے۔'' پھر وہ ٹھٹک کر بولا۔ ''ارے...... اسے کیا ہوا؟ غلام حسین...... غلام حسین......'' وہ شاید ڈرائیور کو آوازیں دے رہا تھا۔

''یہاں سے نکل چلو شیوا۔'' بولنے والے کی آواز میں تشویش تھی۔ ''مجھے تو لگتا ہے کہ غلام حسین کو کسی نے بے ہوش کر دیا ہے۔'' وہ دوسروں سے مخاطب ہوا۔ ''چلو بیٹھو گاڑی میں۔''

ڈرائیور کو ایک طرف دھکیل کر وہ خود اسٹیئرنگ پر بیٹھ گیا۔ اور گاڑی کا انجن اسٹارٹ کر دیا۔

دوسری طرف سے اچانک کوئی چیخا۔ ''رک جاؤ شیوا۔'' ''گاڑی کے دو ٹائر بھی برسٹ ہیں۔''

شیوا گاڑی سے نکلا اور ایک دم زمین پر لیٹ گیا۔ دانیال کو افسوس ہوا کہ اس نے پہلے شیوا کا نشانہ کیوں نہ لیا۔

''تم لوگ اپنے ہاتھ اٹھا کر کھڑے ہو جاؤ۔'' سناٹے میں اکبر کی گرج دار آواز گونجی۔ ''تمہیں چاروں طرف سے گھیر لیا گیا ہے۔'' اس مرتبہ اکبر کی آواز دوسری طرف سے آئی۔ ''اس لیے بھاگنے کی کوشش مت کرنا ورنہ مارے جاؤ گے۔'' چند لمحے بعد اکبر کی آواز پھر گونجی۔ ''جلدی کرو ورنہ......''

اسی وقت ایک بے آواز فائر ہوا۔ جوابی طور پر اکبر نے بھی ان پر فائر کر دیا۔ اس نے بھی اپنی گن پر سائیلنسر فٹ کرلیا تھا۔ چند لمحوں کے وقفے سے اکبر کی طرف سے دوسرا فائر ہوا اور فضا میں کسی کی چیخ ابھری۔ اس کے ساتھ ہی گاڑی کے دروازے کھلنے اور بند ہونے کی آواز سنائی دی۔ گاڑی کا انجن اسٹارٹ ہوا اور وہ دو ٹائروں پر لڑکھڑاتی ہوئی وہاں سے روانہ ہوگئی۔ گاڑی میری طرف آرہی تھی۔ میں نے اندازے سے نشانہ لے کر فائر کر دیا۔ ونڈ اسکرین کا شیشہ ٹوٹنے کا چھناکا سنائی دیا لیکن گاڑی رکی نہیں۔ وہ اسی طرح لڑکھڑاتی ہوئی اور کھڑکھڑاتی ہوئی وہاں سے گزر گئی۔ وہاں سے کچھ فاصلے پر جا کر اچانک گاڑی رک گئی اور کسی نے اس کی طرف فائر کیا لیکن گولی کئی فٹ دور سے گزر گئی۔ شاید ان لوگوں نے بھی بھاگنے کے بجائے مقابلہ کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ انہیں یہ بھی اندازہ ہوگیا ہوگا کہ انہیں چاروں طرف سے گھیرا نہیں گیا تھا ورنہ اب تک وہ سب مارے جا چکے ہوتے۔ وہ لوگ وقفے وقفے سے فائرنگ کررہے تھے۔ اتنی فائرنگ اگر سائیلنسر کے بغیر ہوتی تو اس وقت اس علاقے میں کہرام مچ چکا ہوتا۔ گاڑی کا ونڈ اسکرین ٹوٹنے سے کچھ فلیٹوں کی کھڑکیاں ضرور کھلی تھیں پھر فوراً ہی بند ہوگئی تھیں۔ حالات ہی کچھ ایسے تھے کہ لوگ اپنے خول میں سمٹ کر رہ گئے تھے۔

اچانک کسی گاڑی کا انجن اسٹارٹ ہوا پھر وہ گاڑی تیزی سے روانہ ہوگئی۔ دانیال کو اچانک احساس ہوا کہ اب ان لوگوں کی طرف سے فائرنگ نہیں ہورہی ہے پھر وہ اچانک اچھل کر کھڑا ہوگیا اور محتاط انداز میں لینڈ کروزر کی طرف بھاگا۔ لینڈ کروزر میں کوئی نہیں تھا۔ پلک جھپکتے میں دانیال کی سمجھ میں ساری بات آگئی۔ ان لوگوں نے ایک آدمی کو فائرنگ پر لگایا تاکہ دانیال آگے نہ بڑھ سکے۔ ان کا ایک آدمی وہاں کھڑی ہوئی کسی گاڑی کا لاک کھولنے کی کوشش کررہا تھا۔ لاک کھلتے ہی اس نے اگنیشن وائر ڈائریکٹ کر کے گاڑی اسٹارٹ کی ہوگی اور وہ سب وہاں سے فرار ہوگئے ہوں گے۔ وہ اپنے ساتھ بے ہوش ڈرائیور کو بھی لے گئے تھے۔

''مجھ سے بہت زبردست حماقت ہوگئی۔'' دانیال خود کلامی کے انداز میں بولا۔ ''ان لوگوں کو اسی وقت نشانہ بنانا چاہیے تھا جب وہ گاڑی کی طرف آرہے تھے۔''

اسے اندھیرے میں اکبر کا ہیولا دکھائی دیا۔ وہ بھی گاڑی کی طرف آرہا تھا۔

''واپس چلو اکبر۔'' دانیال نے کہا۔ ''اس وقت تو مجھ سے بہت بڑی حماقت ہوگئی ہے۔''

''وہ لوگ دو گاڑیوں میں تھے کیا؟'' اکبر نے پوچھا۔

دانیال نے اسے بتایا کہ وہ لوگ وہاں سے کیسے فرار ہوئے ہیں۔

وہ دونوں واپس پہنچے تو او گھنے والا چوکیدار اب چاق و چوبند گیٹ پر کھڑا ہوا تھا۔ دانیال اس اپارٹمنٹ میں پہلے بھی کئی مہینے نوید کے ساتھ رہا تھا اس لیے چوکیدار اسے پہچانتا تھا۔ اس نے دانیال کو سلام کیا اور بولا۔ ”آپ پیدل کدھر سے آرہا ہے صاحب؟“

پھر وہ کچھ سوچ کر بولا۔ ”صاحب! ابھی یہاں کچھ گڑبڑ ہوا ہے۔“

”کیسی گڑبڑ؟“ دانیال نے پوچھا۔

”میں نے گاڑی کا شیشہ ٹوٹنے کا آواز سنا تھا، پھر وہ گاڑی اِدھر سے گیا تو ایسا لگ رہا تھا کہ اس کا کوئی ٹائر پنکچر ہے۔“

دانیال نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور خاموشی سے اندر کی طرف بڑھ گیا۔ اندھیرے میں جا کر ان کا رخ پارکنگ کی طرف ہو گیا۔

”میرے قبضے میں ابھی تک پرکاش ہے۔“ دانیال نے کہا۔ ”تمہارے پاس کوئی ایسی جگہ ہے جہاں اس سے تفتیش کی جا سکے؟“

”جی ہاں، ایسی ایک جگہ ہے۔“

”چلو، تم اسٹیئرنگ پر بیٹھو۔“ دانیال نے اسے چابی دیتے ہوئے کہا۔ اکبر نے گاڑی کا دروازہ کھولا تو اندر کی لائٹ روشن ہو گئی۔ پسنجر سیٹ پر پرکاش غیر فطری حالت میں پڑا تھا۔ اس کے چہرے پر مردنی چھائی ہوئی تھی۔ دانیال نے اس کی نبض دیکھی، پھر ناک کے آگے ہاتھ لہرایا اور بولا۔ ”اف...... یہ بھی مر گیا۔“

اکبر نے اس کے منہ میں ٹھنسا ہوا کپڑا نکال دیا۔ دانیال کو پسنجر سیٹ پر اچانک خون دکھائی دیا تو وہ چونک اٹھا اور بولا۔ ”آج کا دن ہی برا ہے۔ اس کی کھوپڑی پر ہاتھ کچھ زیادہ ہی زور سے پڑ گیا۔ یہ کھوپڑی کی چوٹ سے نہیں مرا ہوگا تو دم گھٹنے سے مر گیا ہوگا۔ گاڑی میں کہیں ہوا کا گزر نہیں ہے اور اس کے منہ میں کپڑا بھی ٹھنسا ہوا تھا۔ جاؤ، اب اسے ٹھکانے لگا کر آؤ۔“

☆☆☆

وہ لوگ سر جھکائے ماریہ کے سامنے کھڑے تھے اور وہ چیخ رہی تھی۔ ”تم سب لوگ نکمے ہو گئے ہو۔ ایک آدمی تمہارے قابو میں نہیں آرہا؟“

”میڈم! وہ اکیلا نہیں تھا بلکہ اس کے ساتھ تین چار آدمی اور بھی تھے۔“ ان میں سے ایک آدمی منمنا کر بولا۔

”بکومت۔“ ماریہ چیخی۔ ”میں دانیال کو اچھی طرح

جانتی ہوں۔ وہ تو اپنے سائے پر بھی اعتبار نہیں کرتا، پھر وہ زیادہ بھیڑ بھاڑ پسند نہیں کرتا، اس کے ساتھ تین چار آدمی کیسے ہو سکتے ہیں۔ وہ کراچی میں ہوتا تو میں مان لیتی، لاہور میں اتنے آدمی وہ کہاں سے لائے گا، جن پر وہ اعتماد بھی کر سکے۔''

''اب تو جو ہو گیا، وہ ہو گیا کانتا۔'' سنجے خان نے کہا۔''پرکاش کی فکر کرو۔ وہ دانیال کو کچھ بتا نہ دے۔''

''پرکاش مر جائے گا لیکن زبان نہیں کھولے گا۔'' کانتا نے پُریقین لہجے میں کہا۔''مجھے تو اس میموری کارڈ کی فکر ہے۔''

''میموری کارڈ میں بھی وہی کچھ ہوگا جو ہم نے نوید تک پہنچایا تھا۔ وہ لوگ ان پانچ آدمیوں کے پیچھے پڑے ہوں گے جن کے نام ہمارے ہی آدمی نے نوید تک پہنچائے تھے۔''

''نوید تو مر گیا۔'' سنجے نے کہا۔''اب صرف ہمارے راستے کی رکاوٹ دانیال ہے۔ میں پولیس کو اس کے پیچھے لگا دیتا ہوں۔ اسے بلیک میل کرنے کے لیے میرے پاس بہت کچھ ہے۔''

''اب اس کا کوئی فائدہ نہیں۔'' کانتا نے کہا۔ ''پولیس دانیال کو پکڑے گی تو وہ ہمیں بھی ساتھ میں لپیٹ لے گا۔ میں اس وقت کسی قسم کا پرابلم نہیں چاہتی ہوں۔'' ایسا لگ رہا تھا جیسے سنجے، کانتا کا ماتحت ہو۔ وہ اس سے بھی اسی تحکمانہ لہجے میں بات کر رہی تھی۔''مجھے اگر پہلے پتا ہوتا کہ یہ دانیال ہمارے لیے اتنا بڑا خطرہ بن جائے گا تو میں اسے لاہور آنے سے پہلے ہی ختم کرا دیتی۔'' پھر وہ ان لوگوں سے مخاطب ہوئی۔''تم لوگ سب کام چھوڑ دو، بس کسی طرح دانیال کو ٹھکانے لگا دو۔''

''یس میڈم۔'' ان میں سے ایک بولا۔

پھر وہ سب باہر نکل گئے۔ کانتا اور سنجے کمرے میں تنہا رہ گئے۔

''دانیال کی کوئی ایسی دکھتی رگ بھی نہیں ہے جس پر ہاتھ رکھا جا سکے۔'' سنجے نے کہا۔''ماں باپ، بہن بھائی، بیوی یا محبوبہ۔''

''وہ حرام زادہ بہت چالاک ہے۔'' کانتا نے کہا۔ ''اپنے ماں باپ اور بہن بھائیوں کو اس نے بہت پہلے دبئی بھجوا دیا تھا۔ اس نے اب تک شادی نہیں کی ہے اور کوئی محبوبہ بھی نہیں ہے۔''

''بس ایک تسلی کی بات ہے۔'' سنجے نے کہا۔''اس کے بعد میں دانیال سے بھی نمٹ لوں گا۔''

''بس وہ بدبخت اپنی خفیہ ایجنسی کے کسی افسر تک نہ پہنچ جائے۔''

''اسے پہنچنے دو۔'' سنجے نے کہا۔''اس کی بات کا یقین کون کرے گا۔ وہ افسر ہی اسے پاگل خانے بھجوا دے گا۔''

اس بات پر کانتا مسکرانے لگی۔

سنجے جلدی سے بولا۔''یہ باتیں تو ہوتی رہیں گی۔ چلو اب کچھ دیر آرام کر لیں۔ جانتی ہو، تم مسکراتی ہوئی کتنی حسین لگتی ہو۔''

''جانتی ہوں۔'' کانتا نے سرد لہجے میں کہا۔''لیکن اس وقت مسکرانے کا بالکل موڈ نہیں ہے۔''

''گوپال کب تک پہنچ رہا ہے؟'' سنجے نے کہا۔

''گوپال کل صبح تک یہاں پہنچ جائے گا۔ وہ اپنے ساتھ بارہ شارپ شوٹرز لا رہا ہے۔ وجے نے ان لوگوں پر بہت محنت کی ہے۔''

''افسوس کی بات یہ ہے کہ وہ سب لوگ مارے جائیں گے۔''

''اس میں افسوس کی کیا بات ہے؟'' کانتا نے کہا۔ ''ہم میں سے کوئی بھی، کسی وقت بھی مارا جا سکتا ہے۔'' پھر وہ اٹھتے ہوئے بولی۔''میں کچھ دیر سونا چاہتی ہوں۔ کل سے مسلسل جاگ رہی ہوں۔''

☆☆☆

''یہ تو نوید نے بہت بھیانک انکشافات کیے ہیں۔'' اکبر نے کہا۔ وہ دونوں اکبر کے گھر میں بیٹھے تھے اور ابھی میموری کارڈ کے تمام فولڈرز چیک کر کے فارغ ہوئے تھے۔

''یہ تو معلوم ہوا کہ وہ لوگ کراچی کے کسی اسکول کو نشانہ بنائیں گے۔ نوید نے پانچ اسکولوں کے نام لکھے ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی ہو سکتا ہے۔ ان کے علاوہ بھی کوئی ہو سکتا ہے۔'' دانیال نے پُرتشویش لہجے میں کہا۔''میں یہ کام اکیلا نہیں کر سکتا۔ مجھے کسی سرکاری افسر سے بات کرنا ہوگی۔ ہو سکتا ہے، وہ اس میموری کارڈ کی باتوں پر قائل ہو ہی جائے ورنہ میں تو اپنے طور پر آخری دم تک کوشش کرتا رہوں گا۔'' دانیال نے اچانک اکبر سے کہا۔''پاکستان کی خفیہ ایجنسی میں تمہارا کوئی جاننے والا نہیں ہے؟''

اکبر بے ساختہ مسکرایا اور بولا۔''جاننے والے بہت ہیں۔ دانیال صاحب۔''

دانیال نے چونک کر اسے دیکھا۔ ''جاننے والے بہت ہیں؟''

''مجھے حکم ملا ہے کہ اب میں آپ کو سچ سچ بتا دوں کہ......''

دانیال نے بجلی کی سی سرعت سے ریوالور نکال لیا اور چیخ کر بولا۔ ''اپنی جگہ سے حرکت مت کرنا ورنہ تم جانتے ہو کہ میں گولی چلانے میں دیر نہیں کرتا۔''

اکبر حیرت سے آنکھیں پھاڑے اسے یوں دیکھ رہا تھا جیسے دانیال کا ذہنی توازن بگڑ گیا ہو۔ اس نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔ ''کیا ہوا دانیال صاحب...... کیا میں نے......''

''بکو مت۔'' دانیال چیخ کر بولا۔ ''اب میں مزید دھوکا کھانے کو تیار نہیں ہوں۔''

''لیکن میں نے آپ کو کون سا دھوکا دیا ہے؟'' اکبر کے لہجے میں حیرت برقرار تھی۔

''مجھ سے زیادہ بکواس مت کرو۔'' دانیال چیخ کر بولا۔ ''اپنے دونوں ہاتھ سر پر رکھو اور دیوار کی طرف گھوم جاؤ۔''

''میں پھر پوچھوں گا کہ آخر......''

''تم نے سنا نہیں، میں نے کیا کہا ہے؟'' دانیال چیخ کر بولا۔

''دیوار کی طرف گھومنے کے لیے مجھے اٹھنا پڑے گا۔'' اکبر نے کہا۔

''تو اٹھ جاؤ۔'' دانیال درشت لہجے میں بولا۔ ''لیکن اپنے دونوں ہاتھ سر پر رکھ لو۔''

اکبر نے اپنے دونوں ہاتھ سر پر رکھتے ہوئے کہا۔ ''دانیال صاحب! میں آپ کی بہت عزت کرتا ہوں کہ آپ بہت پُراعتماد اور باہمت شخص ہیں۔''

''میری عزت تو وہ پرکاش بھی بہت کرتا تھا۔'' دانیال نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''لیکن اب مجھے اپنی عزت کرانے کا کوئی شوق نہیں ہے۔'' اس نے آگے بڑھ کر لیپ ٹاپ سے کارڈ ریڈر نکال لیا۔

''آپ تو مجھے بہت غلط سمجھ رہے ہیں دانیال صاحب۔'' اکبر کا لہجہ بھی سرد ہو گیا۔

''اب تک میں تمہیں غلط ہی سمجھتا رہا۔'' دانیال نے کہا۔ ''یہ میری بدقسمتی ہے کہ میں نے جن لوگوں پر بھروسا کیا، انہی لوگوں نے مجھے ڈسنے کی کوشش کی۔''

''اچھا، اب میں سمجھا۔'' اکبر نے کہا۔

سیر کو سوا سیر

ایک دن ملا نصیرالدین کے پاس ایک ہندو چل کر آیا تا کہ مولانا کو نیچا دکھایا جائے۔ اس نے کہا۔ ''آپ ہر شخص کا مسئلہ حل کر دیتے ہیں، لہٰذا میرا بھی مسئلہ حل کریں۔'' مولانا نے کہا۔ ''کیوں نہیں۔'' ہندو بنیے نے کہا۔ ''مجھے ایک گھوڑا لا دیں جس کا رنگ نہ لال نہ پیلا نہ کالا نہ سفید اور نہ ہی کتھئی ہو۔'' مولانا یکدم گویا ہوئے۔

''مل جائے گا مبلغ سو اشرفیاں جمع کرواتے جائیں۔'' بنیے نے اشرفیاں دیں اور پوچھا۔

''مولانا! کس دن لے جاؤں؟'' مولانا نے کہا۔

''جس دن نہ جمعہ ہو نہ ہفتہ نہ اتوار نہ سوموار نہ منگل نہ بدھ نہ جمعرات۔''

وحید عزیز، راولپنڈی

برنارڈ شا

ایک صحافی نے جارج برنارڈ شا سے انٹرویو کے دوران پوچھا۔

''آپ کی طویل العمری کا راز کیا ہے؟'' برنارڈ شا نے جواب دیا۔ ''میں ہمیشہ سر ٹھنڈا اور پاؤں گرم رکھتا ہوں۔'' انٹرویو شائع ہوا تو برنارڈ شا کے لاکھوں مداحوں نے پڑھا اور پھر ہزاروں لوگوں نے سر پر برف رکھنا شروع کر دی اور پاؤں بھی سینکنے شروع کر دیے۔ نتیجہ میں کسی کو سرسام ہو گیا تو کسی کو بخار۔ چنانچہ ایک ہفتے کے بعد لوگوں کا ایک بہت بڑا جلوس مظاہرہ کرتا ہوا برنارڈ شا کے دروازے پر پہنچا تو برنارڈ شا نے مظاہرین سے کہا۔

''بیوقوفو! تم نے جو کچھ کیا غلط ہے۔ میرا مطلب وہ نہ تھا جو تم سمجھ بیٹھے ہو۔ دراصل سر ٹھنڈا رکھنے کا مطلب یہ ہے کہ میں کبھی غصے میں نہیں آتا اور پاؤں گرم رکھنے سے میری مراد یہ تھی کہ میں ہمیشہ پیدل چلتا ہوں۔ یہی میری طویل العمری کا راز ہے۔''

عکس فاطمہ کا کراچی سے تعاون

"باتوں میں وقت ضائع مت کرو۔" دانیال چیخ کر بولا اور آگے بڑھ کر اکبر کی جیب سے پسٹل نکال لیا۔ "اب بتاؤ، تم لوگوں کا کیا پروگرام ہے؟"

"کیسا پروگرام؟" اکبر نے کہا۔

"مجھ سے اڑنے کی کوشش مت کرو اکبر۔" دانیال نے کہا۔ "پرکاش نے بھی اڑنے کی کوشش کی تھی۔ بتاؤ، تم لوگ کہاں حملہ کرو گے؟"

"مجھے نہیں معلوم۔" اکبر نے سنجیدگی سے کہا۔

"میرے پاس ضائع کرنے کو وقت نہیں ہے۔" دانیال نے کہا۔ "میں تم سے آخری دفعہ پوچھ رہا ہوں کہ......"

"میں بھی آپ کو آخری بار بتا رہا ہوں کہ آپ کی طرح میں بھی لاعلم ہوں۔"

"او کے۔" دانیال نے کہا۔ "اب اگر تم مسلمان ہو تو کلمہ پڑھ لو اور ہندو ہو تو اپنے بھگوان کو یاد کر لو۔" دانیال کا لہجہ سرد اور سفاک تھا۔

اکبر کی ریڑھ کی ہڈی میں سرد سی لہر دوڑ گئی۔

"اچھا، اور میں نے بتا دیا تو کیا آپ مجھے چھوڑ دیں گے؟" اکبر نے کہا۔ "مجھے مرنا ہی ہے تو بتانے کا فائدہ؟"

دانیال کھوئی کھوئی نظروں سے گھورتا رہا۔ وہ شاید فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ اکبر کو مار دے یا اس سے معلومات حاصل کرے۔

اس وقت دانیال کی پشت دروازے کی طرف تھی۔ اکبر نے دیوار کی طرف منہ کیا ضرور تھا لیکن پھر فوراً ہی دانیال کی طرف گھوم گیا تھا۔ اس نے پھر دانیال سے پوچھا۔ "دانیال صاحب! مجھے مارنا ہی ہے تو پھر انتظار کیا کر رہے ہیں؟" پھر وہ دروازے کی طرف دیکھ کر اچانک چیخا۔ "ویری گڈ موہن۔"

دانیال نے صرف ایک لمحے کو مڑ کر دیکھا تھا۔ اکبر نے اچانک اس پر جست لگائی اور اس کا ریوالور چھین کر دانیال کی پیشانی پر لگا دیا۔ "میں ابھی آپ کی غلط فہمی دور کر دیتا ہوں۔" اس نے دانیال کی جیب میں ہاتھ ڈال کر دوسرا ریوالور بھی نکال لیا۔

دانیال اسے نفرت بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

اکبر نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور اپنا والٹ نکال لیا، پھر اس میں سے ایک کارڈ نکال کر دانیال کی طرف پھینک دیا۔

دانیال نے ایک اچٹتی ہوئی نظر کارڈ پر ڈالی، پھر اکبر کی تصویر دیکھ کر چونک گیا اور بلند آواز میں بولا۔ "کیپٹن ارسلان احمد فرام......"

"جی، میں اکبر نہیں بلکہ کیپٹن ارسلان ہوں۔"

"لیکن...... تم...... آئی مین کیپٹن صاحب آپ......"

"نہیں دانیال صاحب۔" ارسلان جلدی سے بولا۔ "میں نے آپ کو ہمیشہ اپنا بڑا بھائی سمجھا ہے۔ مجھے اسی طرح مخاطب کریں جیسے کرتے آئے ہیں۔"

دانیال نے ایک مرتبہ پھر اس آئی ڈی کارڈ کو غور سے دیکھا اور بے ساختہ بولا۔ "آئی ایم سوری کیپٹن...... پلیز، مجھے معاف......"

"یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟" ارسلان نے برا مان کر کہا۔

"نہیں، مجھے کہنے دو ارسلان۔" دانیال نے کہا۔ "میرا ذہن پے در پے رونما ہونے والے واقعات سے ماؤف ہو کر رہ گیا ہے۔ میں...... میں...... اگر تمہیں گولی مار دیتا تو......" دانیال بری طرح رونے لگا اور روتے روتے ارسلان سے لپٹ گیا۔

"ایک لمحے کو تو مجھے بھی آپ کی آنکھوں میں دیوانگی کی جھلک دکھائی دی تھی۔" ارسلان ہنس کر بولا۔ "اور واقعی میں نے کلمہ پڑھ لیا تھا۔"

"اصل میں، جب تم نے یہ کہا کہ مجھے اوپر سے حکم مل چکا ہے تو میرا ذہن ماؤف ہو گیا۔ مجھے یہ سوچ کر ہی شدید صدمہ پہنچا تھا کہ خاور کی طرح تم بھی دشمنوں کے آدمی ہو۔"

"میں تو آپ کو سب کچھ بتانا چاہتا تھا، آپ نے تو مجھے موقع ہی نہیں دیا۔ بس، زندگی... تھی جو بچ گیا۔"

"اس کا مطلب ہے کہ تم سے میری ملاقات اتفاقیہ نہیں تھی؟" دانیال ہنس کر بولا۔

"بالکل نہیں تھی۔" ارسلان نے کہا۔ "جب سنجے کپور اور کانتا ہماری نظروں میں آئے تو ہم لوگ متحرک ہو گئے۔ ہمیں حیرت تھی کہ یہ کیسی ٹاسک فورس ہے جو ہر جائز اور ناجائز کام کرتی ہے اور ملک کا ایک بڑا سیاست داں اس کی پشت پناہی کرتا ہے؟ پہلے ہمارے ایک آدمی نے نوید صاحب سے ملنے کی کوشش کی لیکن وہ اس معاملے میں بہت زیادہ محتاط تھے اس لیے انہوں نے ہمارے آدمی کو زیادہ لفٹ نہیں دی۔ ہمیں یہ تو معلوم تھا کہ نوید صاحب بہت ذہین، نڈر اور محب وطن ہیں لیکن یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ خود سنجے کپور اور کانتا کے بارے میں کیا سوچتے ہیں پھر آپ ہماری نظروں میں آئے۔ میں نے ایک منصوبے کے تحت

آپ سے ملاقات کی، پھر دو تین ملاقاتوں کے بعد میں نے آپ سے کہا کہ میں بہت ضرورت مند ہوں، مجھے کہیں جاب دلا سکتے ہیں تو دلا دیں۔ ہمارا خیال تھا کہ آپ مجھے بھی اپنی So called ٹاسک فورس میں شمولیت کی دعوت دیں گے لیکن آپ تو کچھ اور سوچ رہے تھے۔ آپ نے اپنے طور پر مجھے جاب آفر کر دی۔"

"یہ سب باتیں تو میں جانتا ہوں۔" دانیال نے کہا۔

"لیکن آپ یہ نہیں جانتے ہوں گے کہ مجھے یہ مشورہ بریگیڈیئر سجاد صاحب نے دیا تھا۔"

"بریگیڈیئر صاحب مجھے جانتے ہیں؟" دانیال نے پوچھا۔

"بہت اچھی طرح جانتے ہیں اور اب تو کچھ زیادہ ہی جانتے ہیں۔ میں انہیں یہاں کی رپورٹ دیتا رہا ہوں۔" پھر وہ ہنس کر بولا۔ "چلیے میں آپ کو بریگیڈیئر صاحب سے ملواتا ہوں۔ آپ ان ہی سے ڈسکس کیجیے گا کہ اب کیا کرنا ہے۔ آپ مجھ سے پوچھ رہے تھے نا کہ خفیہ ایجنسی میں میرا کوئی جاننے والا ہے؟"

"اچھا، میں ذرا فریش ہو جاؤں۔" دانیال نے کہا۔ "تم اس وقت تک بہت اچھی سی کافی بنا کر رکھو۔"

☆☆☆

بریگیڈیئر سجاد دراز قد اور ورزشی جسم کے مالک تھے۔ ان کے چہرے پر بڑی بڑی آنکھیں بہت زیادہ پُرکشش لگتی تھیں۔

وہ دانیال سے تفصیل سن چکے تھے۔ دانیال خاموش ہوا تو وہ بولے۔ "ملک یاسین سے تو بعد میں نمٹا جائے گا پہلے تو ہمیں شہر کو خون رنگ ہونے سے روکنا ہے۔ آپ نے جن اسکولوں کا نام لیا ہے، ہم نے وہاں کام شروع کر دیا ہے۔ اور انشاء اللہ شام تک معلوم کر لیں گے کہ ان لوگوں کا ٹارگٹ کون سا اسکول ہے۔ میں شام تک خود بھی وہاں جا رہا ہوں۔"

"سر! اگر آپ کی اجازت ہو تو میں بھی چلوں؟" دانیال نے کہا۔

اس کی بات سن کر بریگیڈیئر صاحب مسکرائے اور بولے۔ "دانیال صاحب! وہ آپ کا شہر ہے، آپ مجھ سے اجازت کیوں مانگ رہے ہیں؟"

"سر! میرا مطلب ہے...... کہ...... میں بھی...... اس آپریشن میں آپ کے ساتھ رہوں۔"

بریگیڈیئر صاحب کچھ دیر سوچتے رہے پھر بولے۔

"آپ ان اسکولوں تک تو نہیں جائیں گے، میرا مطلب ہے کہ فی الحال کیونکہ آپ کی اس نام نہاد ٹاسک فورس کے افسران ادنیٰ و اعلیٰ سب ہی آپ کو پہچانتے ہیں۔ آپ کی موجودگی سے انہیں فوراً اطلاع مل جائے گی کہ ہم ان کے ٹارگٹ تک پہنچ گئے ہیں۔ وہ فوری طور پر اپنا پلان تبدیل بھی کر سکتے ہیں۔"

اسی وقت ایک باوردی سپاہی کمرے میں داخل ہوا، بریگیڈیئر صاحب کو زوردار سیلوٹ کیا اور بولا۔ "سر! کیپٹن طارق کی رپورٹ۔"

بریگیڈیئر صاحب نے سر ہلایا تو سپاہی دو قدم پیچھے ہٹا پھر زوردار انداز میں سیلوٹ کیا اور اباؤٹ ٹرن کے انداز میں گھوم کر لیفٹ رائٹ کرتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔

بریگیڈیئر صاحب نے اس کی لائی ہوئی فائل پر سرسری سی نظر ڈالی، پھر چونک کر اسے غور سے پڑھنے لگے اور ارسلان سے بولے۔ "کیپٹن طارق کی رپورٹ یہ ہے کہ دہشت گردوں کا ایک گروپ بلوچستان کے راستے پاکستان میں داخل ہوا ہے۔" پھر وہ خودکلامی کے انداز میں بولے۔ "ان لوگوں کو بہت ڈھیل دے دی گئی ہے۔ اب مزید ڈھیل کی گنجائش نہیں ہے۔ انہوں نے ریسیور اٹھا کر کوئی نمبر ڈائل کیا اور بولے۔ "جمیل! KSK کی کیا خبر ہے؟...... اچھا...... کب...... اوکے......"

"KSK کراچی روانہ ہو چکے ہیں۔" بریگیڈیئر صاحب بولے۔

"KSK۔" دانیال نے الجھ کر پوچھا۔

ارسلان مسکرایا اور بولا۔ "K کا ننا کے لیے اور SK سنجے کپور کے لیے۔"

دانیال چونک کر بولا۔ "اس کا مطلب ہے کہ نوید کا اندازہ درست تھا۔ وہ لوگ کراچی ہی کو ٹارگٹ کرنا چاہتے ہیں۔"

"اس کا مطلب ہے کہ مجھے بھی فوری طور پر نکلنا ہو گا۔" بریگیڈیئر صاحب نے کہا۔ "دانیال صاحب! اگر آپ کو بھی میرے ساتھ چلنا ہے تو تیاری کر کے آ جائیں۔"

"مجھے کیا تیاری کرنا ہے سر۔" دانیال نے کہا۔ "لیپ ٹاپ میرے پاس ہے اور فلائٹ پر گن لے جا نہیں سکتا۔"

"گنز اگر لائسنس والی ہوں تو لے جا سکتے ہیں۔" بریگیڈیئر صاحب مسکرائے۔

"میرے پاس تو ان کا لائسنس نہیں ہے۔" دانیال

نے کہا۔

''نہیں ہے تو ابھی آدھے گھنٹے میں بن جائے گا۔'' پھر وہ ارسلان سے مخاطب ہوئے۔ ''کیپٹن! مسٹر دانیال کو ریکریشن روم میں بٹھاؤ، اس وقت تک میں ان کی گنز کا لائسنس بنوالوں اور کچھ ضروری ٹیلی فون کالز کرلوں...... اور ہاں، تم بھی میرے ساتھ جارہے ہو۔''

''او کے سر۔'' ارسلان نے فوجیوں والے مخصوص انداز میں کہا۔ ''میں بالکل تیار ہوں۔''

وہ دانیال کو لے کر بریگیڈیئر صاحب کے آفس سے باہر آگیا اور وہ دونوں ریکریشن روم (تفریح کا کمرا، جہاں چائے کے ساتھ ساتھ مختلف ان ڈور گیم بھی ہوتے ہیں اور ٹی وی، ریڈیو اور انٹرنیٹ بھی) میں جا بیٹھے۔ ارسلان نے ویٹر سے چائے منگوالی اور دانیال سے بولا۔ ''دانیال صاحب! کچھ کھانا ہو تو منگوالیں کیونکہ فلائٹ پر ہمیں کھانا نہیں ملے گا۔''

دانیال مسکرایا۔ ''کون سی دنوں یا ہفتوں کی فلائٹ ہے۔ مشکل سے دو گھنٹے لگیں گے۔''

''دو گھنٹے؟'' ارسلان مسکرایا۔ ''اس خصوصی فلائٹ میں مشکل سے ایک گھنٹا لگے گا۔''

☆☆☆

وہ لوگ کراچی پہنچے تو دوپہر کا ایک بجا تھا۔ دانیال نے سوچا کہ اپنے اپارٹمنٹ پر چلا جائے لیکن بریگیڈیئر صاحب نے اس بات کی سختی سے مخالفت کی اور بولے۔ ''وہ KSK اور ان کے آدمی تمہاری بو سونگھتے پھر رہے ہیں۔ مشن مکمل ہونے تک تم ہمارے ساتھ رہو گے۔''

وہ لوگ اس وقت ملیر کینٹ کے ایک بنگلے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ یہاں بھی ان کے سامنے کئی ٹیلی فون سیٹ رکھے تھے۔ ان کے علاوہ دو سیل فون بھی وہاں موجود تھے۔ انہوں نے ٹیلی فون پر کسی میجر خرم کو بلایا۔

چند منٹ بعد ایک چاق و چوبند جوان ان کے سامنے تن کر کھڑا ہوگیا۔

''میجر خرم! KSK کیس میں تم مجھے اسسٹ کررہے ہو۔''

''یس سر۔'' میجر خرم بولا۔

''یہ دانیال صاحب ہیں، یہ تمہارے ساتھ رہیں گے۔''

''او کے سر۔'' میجر خرم نے کہا پھر مجھ سے بولا۔ ''آیئے سر۔''

دانیال تلخ انداز میں مسکرایا۔ ''میں اور سر؟ مجھے اتنی عزت نہ دیں۔'' دانیال نے کہا۔ ''میں تو معمولی سا ایک دہشت گرد ہوں۔''

''آپ دہشت گرد سے زیادہ وحشت گرد ہیں۔'' بریگیڈیئر صاحب مسکرا کر بولے۔ ''یہ آپ کے اندر کی وحشت ہی تو ہے جس کی وجہ سے آج ہم اس قابل ہیں کہ ملک دشمنوں کے خلاف ایک بڑا آپریشن کرسکیں۔''

''وحشت گرد۔'' دانیال ہنس کر بولا۔ ''یو آر رائٹ سر! میں واقعی وحشت گرد ہوں۔''

☆☆☆

شام تک آرمی والے ان پانچوں اسکولوں کے چوکیداروں اور چپراسیوں کو وہاں لے آئے۔ بریگیڈیئر صاحب نے ملیر کینٹ ہی کے ایک بنگلے کو اپنا ہیڈ آفس بنالیا تھا۔

''کوئی بھی ڈکیتی یا بڑی کارروائی وہاں کے ملازمین کے ساتھ مل کر ہی کی جاتی ہے۔'' ارسلان نے کہا۔

ایک گھنٹے بعد رپورٹ ملی کہ ایک بڑے اسکول کے سیکیورٹی گارڈ نے اپنا جرم قبول کرلیا ہے۔ اسے ایک لاکھ روپے نقد اور ایک ٹیکسی کا لالچ دیا گیا تھا۔ میجر خرم نے اس شرط پر اسے معاف کردیا کہ وہ اپنی زبان بند رکھے گا اور معمول کے مطابق ڈیوٹی پر جائے گا۔ خرم نے اس کی بیوی اور دو بچوں کو ضمانت کے طور پر بنگلے پر رکھ لیا۔

ابھی دہشت گردوں کے آپریشن میں دو دن تھے۔

دوسرے دن اچانک کانتا اور سنجے آرمی کے ہتھے چڑھ گئے۔ اس کے ساتھ ہی آرمی نے ملک یاسین کو بھی اٹھا لیا لیکن پریس کو ان گرفتاریوں کی کوئی خبر نہیں دی گئی۔ میڈیا کو بعد میں بریف کرنے کا پلان طے پا گیا تھا۔ پورا دن کراچی، لاہور اور کوئٹہ سے کانتا کے آدمیوں کی گرفتاریاں ہوتی رہیں۔ اس دن دانیال کو احساس ہوا کہ آرمی کو اگر فری ہینڈ دیا جائے تو وہ جرم کو جڑ سے اکھاڑ پھینک سکتی ہے۔

☆☆☆

اسکول بچوں کی آوازوں سے گونج رہا تھا۔ دانیال وہیں ایک جگہ اسکول کے چپراسی کے روپ میں بیٹھا تھا۔ اسے اپنا بچپن یاد آرہا تھا۔ وہی شور غل کی آوازیں، وہی ٹیچرز کی ڈانٹ اور پیریڈ کے گھنٹے کی ٹن ٹن! وہ بظاہر کھیل کا میدان صاف کررہا تھا لیکن اس کی نظریں گھڑی پر تھیں۔ اس نے ڈھیلا ڈھالا شلوار سوٹ پہن رکھا تھا۔ سر پر ٹوپی بھی اور آنکھوں پر نظر کا چشمہ۔ چشمے کے شیشے زیرو پاور کے

تھے۔ اس کے دونوں ہولسٹرز میں گنز تھیں۔ وہ وہاں سے ٹہل کر اسکول کے صحن میں آ گیا۔

میجر خرم، کیپٹن ارسلان اور ان کے لوگ اسکول میں مختلف جگہ مورچا بند تھے۔ بریگیڈیئر صاحب پرنسپل کے کمرے میں موجود تھے۔ صرف اسکول کی پرنسپل کو اعتماد میں لیا گیا تھا۔

اچانک گیٹ کی طرف سے فائر کی آواز سنائی دی پھر دو آدمی اندھا دھند فائرنگ کرتے ہوئے اندر آ گئے اور انہوں نے دروازہ پورا کھول دیا۔

فوراً ہی دس بارہ مزید اسلحہ بردار اندر داخل ہو گئے۔ ان لوگوں نے اب تک ہوائی فائرنگ کی تھی۔ دانیال کے اعصاب کشیدہ ہو گئے۔ مضطرب ہو کر اس کے ہاتھ بار بار اپنی گنز کی طرف جا رہے تھے لیکن ابھی تک میجر خرم کی طرف سے انہیں ایکشن لینے کا حکم نہیں ملا تھا۔ پھر وہ لوگ تین تین کی ٹکڑیوں میں بٹ کر اسکول کے گراؤنڈ میں داخل ہو گئے۔ ان کی خونی شکلیں دیکھ کر بچے تو بچے ٹیچرز بھی بوکھلا گئیں۔

اسی وقت میگا فون پر میجر خرم کی آواز گونجی۔ ''ایکشن۔''

آواز کے ساتھ ہی ہر کلاس روم کا دروازہ بند ہو گیا اور ذرا سی دیر میں سناٹا چھا گیا۔

حملہ آور بوکھلا کر اردگرد دیکھنے لگے۔ دانیال بھی ایک کیاری کی آڑ میں زمین پر لیٹا ہوا تھا۔

اچانک میجر خرم کی آواز گونجی۔ ''فائر۔''

فوراً ہی کئی رائفلیں شعلے اگلنے لگیں۔ بہت سے حملہ آور پہلے ہی ہلّے میں مارے گئے۔ بچ جانے والے برآمدے میں ایک طرف سمٹ گئے۔ اور سنبھل کر جوابی فائر کرنے لگے۔ قوم کے محافظ انہیں تاک تاک کر مار رہے تھے۔

اچانک دو حملہ آور ایک بند دروازے کی طرف دوڑے اور اسے ایک ہی جھٹکے میں گرا دیا۔ اندر نرسری کے بہت چھوٹے بچے تھے۔ وہ سہم کر رونے لگے۔ دانیال کے جسم پر چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔ اس نے اپنی جگہ سے جست لگائی اور پلک جھپکتے میں برآمدے میں پہنچ گیا۔ جوش میں اسے یہ بھی خیال نہ رہا کہ برآمدے میں بھی کئی حملہ آور موجود ہیں۔ برآمدے میں پہنچتے پہنچتے اس نے دونوں ریوالور نکال لیے تھے۔ برآمدے میں موجود ایک حملہ آور نے اسے نشانہ بنانے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔ دانیال سرعت سے زمین پر گر گیا تھا۔ لیٹے ہی لیٹے اس کے ریوالور نے دو حملہ آوروں کو جہنم رسید کر دیا۔ اسے بچوں کا خیال آیا تو وہ پھر اٹھ کر کمرے کی طرف بھاگا۔ اس مرتبہ حملہ آور نے اپنا کام کر دیا۔ اس پر کلاشنکوف کا پورا برسٹ مار دیا۔ دانیال برقت ایک طرف جھک گیا۔ اس کے باوجود کئی گولیاں اس کی پسلیوں، دائیں ہاتھ اور دائیں پاؤں میں لگیں۔ اس کے جسم سے خون بہنے لگا۔ وہ لڑکھڑا کر گرا۔ جسم کے دائیں حصے میں گویا انگارے سے دہک رہے تھے۔ اسے پھر بچوں کا خیال آیا اور وہ اپنے زخموں کی پروا کیے بغیر پھر دوڑتا ہوا کلاس روم کی طرف بڑھا۔ اس کا ایک ہاتھ زخمی تھا لیکن ریوالور اب بھی اس کے ہاتھ میں تھا۔ اندر کھڑے ہوئے حملہ آور حیرت سے اس جنونی آدمی کو دیکھ رہے تھے جو زخمی ہونے کے باوجود دوڑا دوڑا چلا آ رہا تھا۔ ان کی حیرانی ہی ان کی موت بن گئی۔ دانیال نے بیک وقت دو فائر کیے اور دونوں حملہ آوروں کی کھوپڑیاں بکھر گئیں۔

پیچھے سے کسی نے ایک برسٹ اور مارا جو دانیال کی کمر اور نچلے حصے پر لگا۔ وہ پھر لڑکھڑا کر گر پڑا۔ فوراً ہی کئی رائفلیں گرجیں۔ انسانی چیخیں گونجیں اور سکوت چھا گیا۔

دانیال کے جسم سے پانی کی طرح خون بہہ رہا تھا۔ کلاس روم کے بچے اس کے اردگرد جمع ہو گئے تھے۔

پھر بھاگتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنائی دیں اور ارسلان اور میجر خرم وہاں پہنچ گئے۔

دانیال کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا رہا تھا۔ اس نے اپنے نزدیک بیٹھے ہوئے ایک بچے کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ''اللہ تمہیں ہمیشہ آباد رکھے۔'' اسے اطمینان تھا کہ نہ صرف دہشت گردوں کا پلان ناکام ہو گیا بلکہ وہ سب مارے بھی گئے۔ ملک یاسین سمیت تمام غیر ملکی دہشت گرد عسکری تحویل میں تھے۔

دانیال نے ایک نظر ارسلان پر ڈالی جو اس پر جھکا ہوا کچھ کہہ رہا تھا لیکن اب دانیال کو کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ اس نے ارسلان کو دیکھ کر مسکرانے کی کوشش کی، پھر آہستہ سے کلمہ پڑھا اور سر زمین پر ڈال دیا۔

ارسلان اس پر جھکا بلک بلک کر رونے لگا۔ بریگیڈیئر سجاد نے اپنی ٹوپی اتار کر اس کے سامنے سر خم کیا اور پیچھے ہٹ گئے۔

اسماء الحسنیٰ۔ کامیابی کا راستہ

دین اسلام کی روشنی میں آپ کے مسائل کا مکمل حل

پیر شاہ محمد قادری

پیر شاہ محمد قادری تاجی ہاشمی گذشتہ 25 برسوں سے اسماء الحسنیٰ کے حوالے سے زندگی میں درپیش تمام مسائل اور پریشانیوں کے حل کے لئے اسماء الحسنیٰ کی تلقین کرتے ہیں اور آیات قرآنی کے ذریعے روحانی علاج کے حوالے سے دنیا بھر میں شہرت یافتہ ہیں۔ آپ کے پروگرام اسماء الحسنیٰ ۔کامیابی کا راستہ کروڑوں ناظرین دیکھتے رہتے ہیں۔ آپ اپنے مسائل اور پریشانیوں میں براہ راست ان سے بذریعہ خط اور ملاقات راہ نمائی لے سکتے ہیں۔

اولاد نرینہ کی۔طلب

O میرے دونوں بیٹے پیدا ہونے کے تین ماہ زندہ رہے اور فوت ہوگئے۔ اللہ کی رحمت تین بیٹیاں ہیں وہ بالکل صحیح سلامت ہیں اللہ ان کی حیاتی رکھے لیکن اولاد نرینہ کی بڑی خواہش ہے۔ آپ کے روحانی علاج کی بہت شہرت ہے آپ پر سرکار داتا حضور اور سیدنا غوث الاعظمؒ کی بڑی عنایت ہے آپ اسماء الحسنیٰ بھی تلقین کیجئے اور روحانی علاج بھی تجویز کردیجئے۔ مجھے آپ سے ملنے کا بھی بے حد اشتیاق ہے۔ فیس بک پر آپ کی زیارت ہوتی رہتی ہے۔ آپ کا تابعدار۔غائبانہ مرید۔نسیم اختر شیخوپورہ

☆ اللہ تعالیٰ کے ہاں دیر ہے لیکن ناممکن کچھ بھی نہیں، اللہ تعالیٰ ہر دعا کو پورا کرنے پر قادر ہے۔ جب وہ ابراہیم علیہ السلام کو چھیانوے برس میں اولاد عطا کر سکتے ہیں تو آپ کو عطا کرنا اس کے لئے کیا ناممکن ہے۔ اپنا ایمان قائم رکھئے۔ ہر نماز کے بعد 101 مرتبہ درود شریف ابراہیمی پڑھ کر دعا کیجئے۔ آپ کی فرمائش پر علاج ود عظیم اولاد نرینہ کے لئے ارسال کیا جارہا ہے۔ آپ بروز اتوار محفل درود شریف میں آیئے دعا کے بعد ملاقات ہوجائے گی۔ انشاءاللہ

ڈپریشن۔والدہ کی بے بسی

O رات رات بھر جاگتی ہوں لیکن نیند نہیں آتی ہے۔ بظاہر کوئی پریشانی نہیں ہے لیکن سکون قلب میسر نہیں ہے۔ مال واولاد سب حاصل ہے لیکن دل بالکل مردہ ہے۔ ڈپریشن، غصہ، ناکامی، اداسی جیسی کیفیات طاری رہتی ہیں۔ کئی حکیموں، ماہر نفسیات کو دکھا چکی ہوں لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا بلکہ دوائیں کھا کھا کر السر کی مریض ہوچکی ہوں کیا میری اس بے بسی کا علاج ہے؟ نصرت آرا۔کراچی

☆ بہن! آپ کی بیماری جسمانی نہیں روحانی ہے آپ کے حوالے سے جو چیز استخارے کے ذریعے سامنے آئی اس نے میرا دل دہلا دیا اور آنکھوں کو آنسوؤں سے بھر دیا، آپ نے اپنی والدہ کا دل بہت دکھایا ہے، وہ آپ کو آخری لمحوں تک یاد کرتے کرتے، آپ کا انتظار کرتے کرتے اس جہاں سے گذر گئی تھیں لیکن آپ نے ان کی کوئی خبر نہیں لی، آپ کی والدہ نے، مجھے سو فیصد یقین ہے کوئی بددعا نہیں دی ہوگی، لیکن ان کے صبر اور بے بسی نے آپ کو جکڑ لیا ہے، آپ ان کے لئے ایصال ثواب کریں، ممکن ہو تو ان کی قبر پر جا کر باقاعدہ معافی مانگیں۔ ''سورۃ الملک'' پڑھ کر ان کو ہدیہ کریں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنے والدین کی اطاعت اور ان کی دعائیں سمیٹنے والا بنائے۔ (آمین)

ہر بار۔مزید قرضدار

O گذشتہ کئی برسوں سے جو کاروبار بھی کرتا ہوں وہ شروع میں تو اچھا چلتا ہے لیکن پھر آہستہ آہستہ کم ہوتے ہوئے نقصان میں آکر ختم ہوجاتا ہے اور میں مزید قرض دار ہوجاتا ہوں، پہلے بیگم کا زیور، پھر پلاٹ، آخر میں گھر اور گاڑی بھی بک گئی اور ہم ڈھائی سو گز سے 64 گز کے معمولی سے کرائے کے گھر میں آگئے ہیں، ہزار ہا کوشش کی لیکن کامیاب نہیں ہوتا، بہت عمدہ پلاننگ ہوتی ہے جو دوسروں کو بتاتا ہوں وہ ہٹ ہوجاتا ہے جو خود کرتا ہوں پٹ جاتا ہے، کوئی کہتا ہے جادو ہے تعویز ہے، کیا کروں۔ آپ کے متعلق بہت سنا ہے، اللہ کے واسطے میرا مسئلہ حل کر دیجئے۔ دعا گو رہوں گا۔ نصیر احمد۔کراچی

☆ بھیا! دو باتیں ہیں آپ بہت اچھے منتظم اور اچھے پلانر ہیں لیکن آپ کا جو اسکل ہے وہ بڑے پیمانے پر کام کرنے کا ہے۔ آپ اپنے کاروبار کی بجائے کسی بڑے ادارے میں جاب کے لئے اپلائی کیجئے، دوسرے آپ کی ناکامی کی وجہ یہ بھی ہے کہ آپ ۱۷ برس پہلے بیمار ہوئے تھے۔ اس کا جسمانی علاج نہیں ہوا تھا بلکہ آپ کا روحانی علاج ہوا تھا لیکن اس کے بعد آپ جسمانی طور پر تو صحت مند ہوگئے لیکن بداثرات کے دائرے سے نہیں نکل پائے۔ آپ ''سورۃ یٰسین'' سات مبین والی بعد نماز عشاء پڑھنی شروع کردیں معاملات اچھے ہوجائیں گے۔ آپ کی خصوصی فرمائش پر لوح مشتری برائے کامیابی

اور روپے پیسے میں برکت کے لئے ارسال کی جارہی ہے۔

حالات اچھے تھے۔تو بھول گیا

O میں آپ کا ایک مرید ہوں اور معافی کا خواہش گار ہوں کہ جب حالات اچھے تھے تو بھول گیا اب برے ہوئے ہیں تو پھر آپ کے پاس حاضر ہوں، میں نے اپنے ایک دوست کے ہمراہ کاروبار شروع کیا۔ اس نے سارا لین دین عملاً اپنے ہاتھ میں رکھا مگر ساری بینک ٹرانزیکشن میں کرتا تھا۔ چار سال کاروبار بہت اچھا چلا ہم لوگوں نے خوب پیسے کمائے۔ ہمارے کاروبار کی بہتری کو دیکھ کر میرے پارٹنر نے مجھے کچھ لوگوں سے ملوایا کہ یہ ہمارے کاروبار میں سرمایہ کاری کرنا چاہتے ہیں۔ ہمیں اپنے ایک کام کے لئے چودہ لاکھ کی ضرورت تھی۔ انہوں نے ہم سے معاہدہ کر کے ہمیں 20 لاکھ ادا کر دیئے جو میں نے بینک میں جمع کروا دیئے، چند دنوں میں کام کی پے منٹس کے سلسلے میں پارٹنر نے تمام رقم نکال لی اور مجھے معلوم ہی نہ ہوا اس میں 6-6 ماہ کے 8 لاکھ کے بارہ تیرہ چیک بھی تھے۔ پھر اچانک۔ تھوڑے ہی عرصے میں جن لوگوں نے رقم دی تھی انہوں نے تقاضا شروع کر دیا اور جنہوں نے مال ہمیں بیچا تھا ان کے چیکس واپس ہونا شروع ہو گئے، گھر بار ہر چیز بک گئی مگر میرے اوپر قرض کا پہاڑ کھڑا ہے۔ کبھی ایک چیک کی ضمانت کرواتا ہوں، کبھی حوالات کی سیر کرتا ہوں۔ عزیز رشتے دار منہ موڑ چکے ہیں بیوی ساتھ دیتی ہے۔ بچے بری طرح سہم گئے ہیں کیا کروں سمجھ نہیں آتا۔ وہ پارٹنر ایسا غائب ہوا ہے کہ جیسے زمین کھا گئی ہو یا آسمان نگل گیا ہو۔ کیا کروں کبھی کبھی تو دل چاہتا ہے خودکشی کر لوں۔ کیا ایک بار پھر نظرِ کرم نہیں کریں گے۔ دعا کا طالب۔ محمد طالب حسین۔ حیدر آباد

☆ اچھے میاں! ہمارا ناراضگی یا غصے سے کیا علاقہ، محبت اور مروت ہمارا مشرب ہے۔ اللہ تعالیٰ تمام معاملات کو بہتر کرنے والا ہے۔ میرے رب کی رحمت سے پہاڑ جیسا قرض بھی ہو تو ادا ہو جائے گا۔ ''سبحان اللہ وبحمدہ، سبحان اللہ العظیم'' کثرت سے پڑھا کرو۔ بروز جمعرات ایک روٹی کا صدقہ کیا کرو اور اتوار کے دن ٹھیک 2 بجے تا 4 بجے گھر والوں کے ساتھ درود شریف پڑھا کرو اور پیر خانے کی دعا جو پونے چار بجے شروع ہوتی ہے اس وقت دعا شروع کرو پیر خانے میں بھی دعا ہوگی۔ تمام بہن بھائی جو کسی وجہ نا آسکیں یا بیرونِ ملک اشہر ہوں ان کو بھی تاکید ہے کہ 2 بجے تا 4 بجے محفل درود شریف منعقد کیا کریں۔ تمہارے کاروباری مسائل کو دیکھتے ہوئے لوحِ تسخیر خاص ارسال کی جارہی ہے۔

معاملہ ختم۔صحت بحال

O میری بیٹی ماشاء اللہ خوبصورت قد بُت کی ہے، ماسٹرز کیا ہے۔ مگر جب بھی اس کے رشتے کی بات فائنل ہونے لگتی ہے وہ بیمار پڑ جاتی ہے۔ چہرے کی رنگت نچڑ جاتی ہے سانس پھولنے لگتا ہے، ہاتھ پیروں میں ٹھنڈے پسینے آنے لگتے ہیں۔ چہرے پر پانی والے دانے نکلنے شروع ہو جاتے ہیں۔ اسکن سپیشلسٹ، ماہر نفسیات سب کو دکھایا، لیکن افاقہ نہیں ہوتا۔ مگر جونہی شادی کا معاملہ ختم ہو جاتا ہے صحت بحال ہونا شروع ہو جاتی ہے، لوگ کہتے ہیں جادو تعویز کا اثر ہے۔ اگر ایسا ہے تو علاج عنایت کیجئے تاکہ شادی کا مسئلہ حل ہو جائے۔ آپ کی بہن دعا گو

☆ اچھی بہن! معاملہ تو واقعی تشویشناک ہے۔ آپ کی صاحبزادی آسیبی کیفیت کا شکار ہیں۔ شریعت قطعی برہنہ ہو کر نہانے سے منع کرتی ہے۔ اسی لئے شریعت نے قضائے حاجات کے لئے مسنون دعائیں تلقین کی ہیں لیکن بدقسمتی سے ہم احتیاط نہیں کرتے، جس کا نتیجہ ہمیں بھگتنا پڑتا ہے۔ آپ کو نظر بد، جن اور آسیبی معاملات کے لئے ایک ورد، پینے کے، غسل کے، جلانے کے تعویز بذریعہ ڈاک بھیجے جارہے ہیں۔ اس پر پابندی سے عمل کیجئے۔ انشاء اللہ بچی کے معاملات 90 روز میں بہتر ہو جائیں گے۔

مطلبی مرید۔ نامیاں نا

O بیرونِ ملک جانے کی بڑی خواہش ہے مگر کئی برسوں کی کوشش کے باوجود بھی مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ ہزاروں روپے ایجنٹوں کے چکر میں برباد کر چکا ہوں، ایک بار بڑی مشکل سے یونان پہنچا مگر ڈی پورٹ کر دیا گیا۔ والد صاحب کا کہنا ہے کہ یہیں کوئی کام کرلو مگر میری بھی یہی ضد ہے کہ کام باہر ہی کروں گا۔ اس وجہ سے ابا بھی ناراض رہتے ہیں۔ کیا اس کا کوئی حل ہے آپ کے روحانی اور قرآنی اعمال کا بہت سنا ہے آپ میرا کام کر دیں تو میں آپ کا مرید ہو جاؤں گا۔ رضوان محمود۔ نواب شاہ

☆ نامیاں نا! ہمیں مطلبی مریدوں کی ضرورت نہیں۔ اللہ پاک آپ کے معاملات حل فرمائے۔ ترکیب ہم بتا دیتے ہیں۔ ایجنٹوں کا چکر چھوڑیں جو ابا کہتے ہیں مان لیں اور کاروبار شروع کر دیں جب ابا خوش ہو جائیں تو ان کی مرضی سے بیرونِ ملک کے لئے اپلائی کر دیں، کامیاب ہو جائیں گے، یاد رکھیں والد کا غضب اللہ کا غضب اور والد کی اطاعت اللہ کی خوشنودی ہے۔ آپ کی بے حد فرمائش پر لوحِ تسخیر خاص ارسال کی جارہی ہے۔

شادی۔ ورنہ خودکشی

O کئی دنوں سے ایک ایسی پریشانی میں پھنس گئی ہوں کہ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں، میرا بیٹا میری بہو کی بہن کو پسند کرتا ہے مگر وہ کسی اور کو پسند کرتی ہے آپس میں رشتے داری کی وجہ سے کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ مطلب یہ کہ شادی طے ہے۔ مگر میرے بیٹے کی ضد یہی ہے کہ وہ روزینہ ہی سے شادی کرے گا۔ دو مرتبہ خودکشی کی کوشش کی مگر اللہ کے فضل نے اسے بچا لیا۔ میرے دو بیٹے اور ایک ہی بیٹی ہے بہو اور بیٹے کا رویہ بدل گیا ہے، بیٹا کہتا ہے کہ اس بے عزتی سے بہتر ہے کہ میں علیحدہ

ہو جاؤں، دوسری طرف وہ لوگ بھی ہم سے ناراض ہو رہے ہیں کہ ہم اپنے بیٹے کو سمجھاتے نہیں ہیں مگر ہم کیا کریں، سچی بات تو یہ ہے بھائی صاحب کہ اگر میرے بیٹے کو محبت کا حق حاصل ہے تو ان دونوں کو بھی یہی حق حاصل ہے پھر یکطرفہ محبت سے فائدہ کیا؟ اذیت کے علاوہ کیا ملتا ہے۔ لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں۔ اس کے لئے کوئی ایسا روحانی حل تجویز کریں کہ یہ سب خوش رہیں۔ سلمٰی پروین۔ راولپنڈی

☆ عزیز بہن! اللہ تعالیٰ تمام والدین کو اولاد کے دکھ سے محفوظ رکھے۔ آپ ہر نماز کے بعد 140 مرتبہ "یا کریم یا سلام یا حادی یا مانع" پڑھ کر دعا کیا کریں اول آخر 9 مرتبہ درود شریف۔ بیٹے کی اصلاح کے لئے لوح تسخیر خاص ارسال کی جا رہی ہے۔ بیٹی کے امتحانات میں کامیابی کے لئے لوح عطارد ارسال ہے۔

آیا امتحان۔ ہوگئی چڑچڑاہٹ

O میری بیٹی اور بیٹا نویں، دسویں کے طالب علم ہیں ٹیسٹ میں ان کے نمبر بہت اچھے آتے ہیں مگر امتحان کے دنوں میں طبیعت سست، بے چین ہو جاتی ہے چڑچڑے ہو جاتے ہیں نیند بہت آنے لگتی ہے جو یاد کرتے ہیں وہ بھول جاتے ہیں پتا نہیں کہ بچوں کو نظر لگ گئی ہے یا کوئی جادو ہے۔ آپ کوئی روحانی علاج تجویز کر دیجئے۔ عذرا آفتاب۔ فیصل آباد

☆ بہن! ہر نماز کے بعد 13 مرتبہ "سورۃ الم نشرح" پانی پر دم کر کے پلائیں، بے وجہ نصیحتوں اور دباؤ سے گریز کریں۔ دونوں کو 7 باداموں پر "یا علیم یا قوی" 100 مرتبہ دم کر کے دے دیا کریں آپ کی فرمائش پر لوح عطارد ارسال کی جا رہی ہے۔ گیارہویں شریف کے لئے آپ کے ہدیے کا شکریہ

میاں۔ اڑیل مزاج

O میری شادی کو 9 برس ہو گئے ہیں مگر کوئی سکھ نصیب نہیں ہوا۔ میاں عجیب سے اڑیل مزاج ہیں جو بات منہ سے نکل جائے بس وہی ہونا ہے۔ چاہے غلط ہو یا سہی ہر معاملے میں ٹانگ اڑانا اپنا فرض سمجھتے ہیں پہلے رشتے دار ناراض تھے اب سگے بہن بھائی بھی ملنا چھوڑ رہے ہیں۔ دوسروں کی بیویوں کو ٹوکنا لازمی سمجھتے ہیں سب میرے پیچھے پڑ جاتے ہیں کہ تم سمجھاتی کیوں نہیں ہو اپنے میاں کو، مگر میری کوئی اوقات ہو تو میں سمجھاؤں، بس ایک نوکرانی ہی ہوں، ضرورت کے تحت میرے پاس آتے ہیں اور اس میں بھی رویہ ایسا ہوتا ہے کہ ذہن اور بدن احساسِ ذلت سے سلگ جاتا ہے، نہ نماز نہ روزہ اوپر سے دین کی من مانی تشریح جو صرف اپنے مفاد کے مطابق ہو۔ جاہل نہیں ہیں اپنے مضمون کے پی ایچ ڈی ہیں دنیا ان کے علم و فضل کی دیوانی اور گھریلو معاملات میں صفر، کبھی کبھی جی چاہتا ہے کہ خودکشی کرلوں مگر پھر سوچتی ہوں میرے بچوں کا کیا قصور اگر باپ کی شفقت نہیں ملتی تو ماں کی ممتا سے کیوں محروم کروں۔ کیا اس کا علاج ہے آپ کے پاس میں تو دعائیں کر کر کے تھک گئی ہوں ایک بزرگ کی طرح میری مدد فرمائیں۔ شاہین اسلم۔ کراچی

☆ بیٹی جیتی رہو! تم جیسی بچیوں سے معاشرہ سلامت ہے تمہارے میاں اصل میں احساسِ کمتری کے مریض ہیں، اوپر سے اللہ تعالیٰ نے انہیں اعلیٰ تعلیم اور نوکری سے نواز دیا۔ چنانچہ ان کا خیال ہے کہ ہر شخص خصوصاً خاندان والے چونکہ ان کی خامیاں کمزوریاں ان کے علم میں ہیں لہٰذا ان کا فائدہ اٹھا کر تضحیک کرنا اپنا شعار بنالیا ہے۔ ہرگز خودکشی کی نہ سوچنا اللہ میاں بہت غفور الرحیم ہے۔ ہر نماز کے بعد صرف 14 مرتبہ "درود شریف تاج" پڑھ کر ان کا تصور کر کے دم کر دیا کرو خصوصاً جب "دافع البلاء والوباء والقحط والمرض والالم" تک پہنچو تو تین بار تکرار کرو اصلاح کے لئے لوح تسخیر خاص اور نقوش زعفران ارسال کئے جا رہے ہیں۔ یقین رکھو اللہ پاک اچھا اجر دیں گے۔

اسکول کی لڑکی۔ خواب میں آئے

o میرے ساتھ کچھ عرصے سے عجیب سا واقعہ ہونا شروع ہو گیا ہے۔ جس کی وجہ سے میرا سکھ چین غارت ہو گیا ہے، میں اپنے گھر، بیوی، بچوں سے بے حد خوش ہوں، مگر گزشتہ ڈیڑھ سالوں سے میرا ہر پل عذاب ہو گیا ہے ہم میرپور خاص میں رہتے تھے، پھر والد صاحب کے تبادلے کے ساتھ یہاں آ گئے، تعلیم وغیرہ سب یہیں حاصل کی، شادی ہو گئی۔ ایک دن اچانک بازار میں پرانے شہر کے ایک واقف مل گئے بچپن میں ہم سب ایک ہی گلی میں رہتے تھے، وہ میرے گھر آئے میں ان کے گھر گیا تو معلوم ہوا ان کی شادی ہماری ہی ایک سکول فیلو سے ہو گئی تھی، سچی بات تو یہ کہ مجھے اس کی شکل تک یاد نہیں تھی، مگر جب انہوں نے ملوایا تو ایک عجیب سا احساس ہوا، مجھے یاد آیا کہ وہ کالی سی سوکھی سی مریل سی لڑکی ہوا کرتی تھی مگر اب وہ ایک بھرپور خاتون تھی، ملاقات چائے، کھانے کے بعد ہم گھر واپس آ گئے مگر وہ میرے ذہن سے چپک

گئی، اب ہر رات خوابوں میں آتی ہے، میں اندر ہی اندر گھلتا جا رہا ہوں وہ میرے دوست کی بیوی ہے، پھر میرا اس کا تعلق ہی کیا مگر جس قدر بھی نظر انداز کروں اس کے خیال کو کچلوں وہ میرے اعصاب پر سوار ہے، خدا کے لئے میرا گھر تباہ ہونے سے بچا لیجئے۔ محمد جنید۔ کراچی

☆ عزیزم! پریشان ہونے کی ضرورت نہیں یہ ایک ذہنی صدمے کا ردعمل ہے بقول آپ کے وہ کالی سوکھی مریل سی لڑکی کو آپ اس روپ میں دیکھنے کو تیار ہی نہیں تھے مگر جب آپ نے اس کو اچانک دیکھا اس کی جاذبیت نے آپ کو اپنی گرفت میں لے لیا یہ توجیہ آپ کے مسئلے کی توجیح روحانی حل یہ ہے آپ رات سونے سے قبل بکثرت "ایاک نعبد وایاک نستعین اھدنا الصراط المستقیم" پڑھا کریں۔ آپ کے لئے لوح زہرہ ارسال ہے۔

ٹیچر کی محبت۔ گرفتار

بات اچھی تو نہیں ہے مگر جب مشورہ لیا جائے تو سچ کہے بغیر چارہ نہیں اور آپ سے تو ویسے بھی میں جھوٹ بولنا گناہ سمجھتی ہوں، آپ کی فیس بک اور ویب سائٹ بہت پسند ہے میں غائبانہ آپ کی مرید ہوں ۔ میرا مسئلہ یہ ہے کہ مجھے اپنے ٹیچر سے محبت ہوگئی ہے وہ مجھے بہت اچھے لگتے ہیں حالانکہ وہ شادی شدہ ہیں اور دو بچوں کے باپ ہیں ۔ ہمارے اور ان کے درمیان بہت فاصلہ ہے، وہ پانچ مرلے کے کرائے کے پورشن میں رہتے ہیں اور ہمارا گھر دو کنال پر ہے، اس سے آپ اندازہ لگا لیں، مگر دل کا کیا کروں کہ وہ میرے قابو میں نہیں ہے، ان کی نرمی، محبت اور توجہ نے مجھے ان کی محبت میں گرفتار کر لیا ہے۔ مگر وہ میری طرف توجہ ہی نہیں دیتے، ایک بار میں نے ان سے کہنے کی کوشش کی تو انہوں نے صرف اتنا کہا کہ جو چیز میں افورڈ نہیں کر سکتا اس پر نا توجہ دیتا ہوں اور نا ہی اسے حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہوں، ان کی اس بے نیازی نے مجھے اور بھی ان پر مائل کر دیا ہے، میں کیا کروں؟ کہا جاؤں؟ دن رات ان کے فراق میں تڑپتی رہتی ہوں، آپ مدد کر دیں۔ نوشابہ۔ شہر نامعلوم

☆ کریم آقا حضرت محمد ﷺ کی حدیث مبارک کا مفہوم ہے، آدمی کے تین باپ ہیں، ایک وہ جس کے صلب سے وہ پیدا ہوتا ہے ایک وہ جو اسے تعلیم دیتا ہے اور ایک وہ جو اس کو بیٹی دیتا ہے، آپ کی محبت درست ہے مگر زاویہ درست نہیں، اپنا نقطہ نظر بدل لیجئے، زندگی آسان ہو جائے گی، آپ کے لئے لوح زحل ارسال کی جا رہی ہے، آپ ہماری بیٹی ہیں اور بیٹیوں سے ناراض نہیں ہوتے، مرید ہونے کے لئے اپنے والدین کے ہمراہ آئیں۔